

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں  
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔



منجانب .

سپیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان



۷۸۶  
۹۲۱۱۰  
یاساب الزماں اور کئی



# لبیک یا حسینؑ

مذہب عباس  
خصوصی تعاون  
رضوان رضوی

## اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری

SABIL-E-SAKINA

Unit 08,

Latifabad Hyderabad

Sindh, Pakistan.

[www.sabeelsakina.page.tl](http://www.sabeelsakina.page.tl)

[sabeelsakina@gmail.com](mailto:sabeelsakina@gmail.com)

NOT FOR COMMERCIAL



# تاریخ شیعیانِ علم



# تاریخ شیعیانِ علم

مؤلفہ علی حسین رضوی

# تاریخ شیعیانِ علم



Download Shia Urdu & English Books  
[www.ShiaMultimedia.com](http://www.ShiaMultimedia.com)



# تاریخ شیعیان علیؑ

ایک تحقیقی دستاویز

jabir.abbas@yahoo.com

# تاریخ شیعیانِ علیؑ



مؤلفہ  
علی حسین رضوی



مطبوعہ  
امامیہ اکیڈمی کراچی

jabir.abbas@yahoo.com



جملہ حقوق محفوظ

# تاریخ شیعیان علیؑ

## انتساب

دور ابتلاء کے لامتناہی تسلسل میں پروان چڑھنے والی قوم کی تاریخ لکھنا کچھ آسان نہ تھا مگر توفیقات الہی کے سہارے نوحہ گروں کی مستند داستان پیش کر رہا ہوں، معترف ہوں کہ حق ادا نہیں ہوا اس لئے معنون کرتا ہوں :-

ان ارباب حل و عقد کے نام

جو تشنہ رہ جانے والے گوشوں کا مواد فراہم کر سکیں

ان نوجوان قارئین کے نام

جو میرے بعد اپنی تاریخ کا ترسیم شدہ ایڈیشن شائع کر سکیں

مؤلف

اشاعت اول	:	۱۹۹۲ء
اشاعت چہارم	:	۲۰۰۶ء
کمپوزنگ	:	سید گرافکس
پرینٹنگ با اہتمام	:	سید اینڈ سید (پبلشرز) کراچی
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	280 روپے

سول ایجنٹ  
محفوظ بک ایجنسی  
مارٹن روڈ کراچی

# نقش اول

”ہمارے عقائد: ہماری تاریخ“ کا آخری باب حضرت حجت کی غیبت پر بند ہو گیا تھا لیکن محبان علی کا دور استلاء بدستور کھلا رہا۔ بنی امیہ کے بعد بنی عباس کے نصف سے زائد عہد تک شیعہ اسی حالت میں رہے پھر انحطاطی عہد میں ان کو تدریجی اطمینان کی سانس لینے کا موقع ملا اس کے بعد غزنوی، سلجوقی، ایوبی اور ترکان عثمانی کی سنگلاخ زمینوں پر مجبور شیعوں کے کارواں گزرنے لگے اور زمانے کا ستم آفریں سلسلہ صحرائے نجد سے جا کر مل گیا۔

بنی عباس نے جب بنی امیہ کی نسلوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالا تھا خلفاء کی قبروں کو کھود کر ہڈیاں تک باہر نکال پھینکی تھیں تب بھی ہم نے اسے درندگی قرار دیا تھا پھر جب وہ بنی امیہ کے عملی جانشین بن گئے تب بھی ہم انہیں برا کہتے رہے اور جب نجدیوں نے اکابر ملت کی قبریں زمین کے برابر کر دیں تب بھی ہم نے ان کے خلاف آوازیں بلند کیں۔ یہ فلسفہ کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ظالم بھی مقدس اور مظلوم بھی مقدس۔ اس کا شاید بڑا سبب یہی ہے کہ ہم مظلوم کے ماننے والے ہیں اور ہر زمانے میں خود بھی نشانہ ستم بنتے رہے ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب کبھی ہم نے کسی مسلم حکومت کے استقرار پر شادیانے بجائے تو اسی حکومت نے ہم سے اپنوں کی صف ماتم ہتھیوادی، ایساہی کچھ ہندوستان میں بھی مغل سلطنت کے بیشتر ادوار میں پیش آیا اور اورنگزیب عالمگیر نے تو منصور کی یاد تازہ کر دی۔

وہ تاریخیں کہاں ہیں؟ بہت پڑھے لکھے لوگ نام تو بتا سکتے ہیں، تاریخیں نہیں دکھا سکتے پھر وہ عربی میں ہیں اور پکھلی کئی صدیوں سے تو جو تاریخی کام کیا گیا ہے اس میں ہمارا کوئی ذکر نہیں ہے اور شخصیات میں سے تو ہم کسی کو شیعہ کہہ ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ سب کے سب تقیہ میں زندگیاں گزارتے چلے گئے۔

اور فی زمانہ تو یہ ستم ڈھایا جا رہا ہے کہ جن کتابوں سے ہمارا تعلق نہیں ہے ان میں بھی اہل بیت کے حق میں اگر کوئی روایت ہے تو وہ نئے ایڈیشنوں میں نکالی جا رہی ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ الحاقی ہے، شیعوں نے شامل کرادی، کتاب کس زمانے میں لکھی گئی، اور اس زمانے میں شیعوں کی کیا حالت تھی، وہ کہیں تھے بھی یا نہیں؟ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں سوچتا مگر یہ کام ہمارے علمائے کرام کا ہے وہ کوئی راستہ نکالیں گے کہ اس حربے کا دفاع کیونکر کیا جائے؟

دوسرا عام انداز یہ ہے کہ شیعہ مشاہیر کو سنی بتایا جا رہا ہے، بیرم خان سنی تھا، ٹیپو سلطان سنی تھا، غالب سنی تھا، یہ بات ہے تاریخ کی اور اسی کے لئے زیر نظر کتاب لکھی گئی ہے۔

بڑا مشکل کام تھا ان اسباب و عوامل کو یکجا کرنا جو ہماری بقاء کی ضمانت بنے اور اس سے زائد مشکل تھا تاریخ کے انسانی جنگل سے محبان علی کو چھانٹ نکالنا جو تقیہ میں برسر عمل رہے پھر بھی توفیقات الہی کے سہارے ہزاروں منتشر صفحات کا پنچوڑ چند سو صفحات میں سمو کر پیش کر رہا ہوں جس کی حیثیت نقش اول کی ہے مگر اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ اپنے بیشتر تاریخی کردار روشنی میں آجائیں گے اور واضح ہو جائے گا کہ کون محب اہل بیت تھا اور کون دشمن علیؑ

بلاشبہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ ہم میں سے کوئی اقتدار کے لئے خروج نہیں کرے گا تو آپ کے جانشینان برحق میں سے کسی نے اس مقصد کے لئے تلوار نہیں اٹھائی لیکن کر بلا میں امام حسینؑ نے ایک راستہ یہ بھی دکھایا تھا کہ مجبور بن کر سروں کو کٹوا دینا ہی شیوہ مردانگی نہیں ہے بلکہ حق کی خاطر ناطاقتی کا احساس کئے

ماضی بعید میں اگر سادات کے خون کا گارا بنایا جاتا تھا تو اس کا ایک سبب تھا کہ غاصب حکومت اصل حقدار کو ختم کئے بغیر اپنے کو محفوظ تصور نہ کرتے لیکن اس کے بعد آل رسول کے ماننے والوں سے دشمنی کیوں؟ اور یہ دشمنی ثبوت کی محتاج نہیں۔ بعض سنی مورخین نے خود لکھا ہے کہ فلاں فلاں بادشاہ کو شیعوں سے سخت نفرت تھی۔ جو اللہ کو نہیں مانتا، جو رسولؐ کو نہیں مانتا، جو اسلام کو نہیں مانتا، اس سے کوئی عناد نہیں مگر شیعہ گردن زدنی ہیں کیونکہ وہ امام منصوص من اللہ کا عقیدہ رکھتے ہیں، انسان ساز خلافت کے قائل نہیں اس لئے ان سے ہر زمانے میں بحیثیت شیعہ زندہ رہنے کا حق چھین لیا گیا۔

نسلوں پر نسلیں گزرتی چلی گئیں، تقیہ میں رہنے والا اپنے بڑے بیٹے کو بھی بتا نہ سکا کہ اس کا عقیدہ کیا ہے؟ شیعہ خاندان کے خاندان جاوہ سادات سے ہٹ کر مسلک شاہی پر چلنے لگے۔ قبیلے کے قبیلے ترک وطن کر گئے اور جو زہر آگیا وہ تلوار کے گھاٹ اتر گیا۔ ان حالات کے باوجود عالم اسلام میں شیعوں کی آبادی کا تناسب ایک پانچ ہے اس کے اسباب و عوامل تحریر خیز ہیں۔

ارباب علم سے جب کبھی استفسار کیا گیا تو کسی نے صوفیاء کو بتادیا، کسی نے علماء کا حوالہ دیدیا، کسی نے بعض حکومتوں کے نام لے لئے لیکن صوفی عموماً نہ سنی ہوتے تھے، نہ شیعہ، وہ تو صرف نعرہ اہل بیت لگاتے تھے لہذا اس حد تک ان کی خدمات کا اعتراف ہے۔ رہ گئے علماء تو سب سے پہلے زبانیں انہیں کی قطع ہوتیں، دارپردہ ہی چڑھائے جاتے، ان کے لئے کھلی تبلیغ کے مواقع کم تھے البتہ انہوں نے نہایت خاموشی سے ذخیرہ روایات اور افکار آل محمدؐ کا اتنا مواد یکجا کر دیا ہے کہ وہ نہ ہوتا تو ہمیں اپنے دعوے ہی کے دلائل نہ ملتے۔

چھوٹی بڑی حکومتوں اور شخصیات کی حد تک ہمارے لئے بڑی دشواری یہ آہڑی کہ بعض قدیم تاریخوں میں تو کچھ مٹا ہے کہ کس علاقے کا حکمران شیعہ تھا لیکن



# ترتیب کتاب

۱۰۵	حکومت زیدیہ: آغاز و انجام	شیعیت اور بساط اسلام
۱۰۷	خاندان حمدانیہ	شیعیت کی اساس
۱۱۰	آل بویہہ: تعارف	شیعان علی کون کون تھے؟
۱۱۴	بنی حمدان اور آل بویہہ کے معرکے	صابرین
۱۱۶	شاہینی حکومت	اسلام میں گروہ بندی
۳۰	سلطان معز الدولہ: ایک عظیم حکمراں	کب شروع ہوئی؟
۱۱۹	تبرہ	علی کا موقف
۱۲۱	جلوس عزہ	اہل السنۃ والجماعت
۱۲۴	بنی حمدان کا نامور شمشیر زن	خلافت و امامت
۱۲۸	بوسہین کا شیرازہ حکومت	اسلام کے مسالک فقہ
۱۳۰	بنی حمدان کی باہمی نیرد آزمائی	آغاز تاریخ
۱۳۲	بنی بویہہ کا دوسرا معمار	امامیہ فرقے
۱۳۵	عالم اسلام کا پہلا شہنشاہ	فقہ کی فکری بنیادیں
۱۳۷	بوسہین کا زوال	تاریخ میں تبرہ
۱۴۰	علاقائی حکومتیں	پیغمبری یا فرمانروائی
۱۴۰	بطحیہ	شیعوں کا دائرہ اقتدار
۱۴۰	حکومت مردان	عراق و ایران
۱۴۱	بنی عقیل	حکومت طاہریہ
۱۴۲	بنی مزید	حکومت صفاریہ
۱۴۳	امارت بنی حسنویہ	حکومت علویہ
۱۴۴	دولت بنی مرداس	حکومت سامانیہ
۱۴۵	بنی عمار	طاہری اور صفاری حکومتوں کا اختتام
۱۴۷	غزنوی اور سلجوقی	حکومت علویہ کا خاتمہ

بغیر قلم کے پہاڑوں سے نکلنا بھی عین شجاعت ہے۔ اس نظیر سے وقت کے مادی تقاضوں کے تحت بعض طالع آزمائوں نے فائدہ اٹھایا اور ظلم کے استیصال کے لئے میدانوں میں نکل پڑے۔ یقیناً ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے مگر حضرت مختار ثقفی نے ہمارے مقاصد کو پورا کیا ہے لہذا آج بھی ہمارا سرعقیدت سے ان کے ذکر پر جھک جاتا ہے۔ آگے چل کر بعض اقبال مند لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لئے ابھر کر سامنے آئے اور انہوں نے لوح تاریخ پر:

ہو کی دھار سے عنوان لکھا فسانے کا  
ہوائے تیغ سے الٹا ورق زمانے کا

علماء و فقہاء اور صوفیائے کرام مجموعی حیثیت سے شیعیت کو سر بلند کرتے رہے ہیں، ہمارے منارہ ہائے ہدایت نے کرامات و معجزات سے ذہنوں کو منقلب کیا ہے، نجف و کربلا و مشهد کے گنبدوں سے طلوع ہونے والا نور آج بھی جلا بخش قلوب ہے اور مجلسیں اور جلوس ہائے عزاء تو حشر تک ہمارا نشان عظمت ہیں لہذا ان سب کو دامن کتاب میں جگہ دی گئی ہے پھر بھی بہت کچھ باقی ہے، کتاب کی تنگ دامانی نے جس کی اجازت نہیں دی۔

پھر یہ خیال بھی پیش نظر ہے کہ قارئین کرام مطالعہ کے لئے کتنا وقت نکال سکیں گے لہذا کم سے کم پراکتفاء کی گئی ہے، خدا کرے، یہ حقیر کاوش قلم مقاصد تحریر کو پورا کر سکے۔

مولف

۲۹۰	ایک جائزہ	۲۷۸	آق بوتائی
		۲۷۹	امیر شیخ حسن نوریان
	<b>سلطنت صفویہ</b>	۲۷۹	امیر حسن کوچک
۲۹۲	خاندانی پس منظر	۲۷۹	ملک اشرف چوپانی
۲۹۳	استقرار حکومت	۲۷۹	اولیس بن حسن
۲۹۵	شاہ اسماعیل صفوی	۲۸۰	سلطان حسین بن اولیس
۲۹۶	شاہ طہسپ اول	۲۸۰	سلطان احمد جلار
۲۹۷	شاہ اسماعیل ثانی	۲۸۱	آل مظفر
۲۹۸	محمد مرزا	۲۸۲	مبارز الدین محمد
۲۹۸	شاہ عباس اعظم	۲۸۲	جلال الدین
۳۰۰	شاہ صفی	۲۸۳	زین العابدین
۳۰۱	شاہ عباس ثانی	۲۸۳	منصور
۳۰۱	شاہ سلیمان مرزا		<b>سرب داران (خراساں)</b>
۳۰۱	شاہ حسین مرزا		خواجہ عبدالرزاق
۳۰۲	محمود خاں غلزئی	۲۸۴	خواجہ وجیہ الدین
۳۰۲	اشرف خان	۲۸۴	محمد تیمور
۳۰۲	شاہ طہسپ	۲۸۴	کلوا سفندیار
۳۰۳	شاہ عباس ثالث	۲۸۴	شمس الدین
	<b>افشاریان</b>	۲۸۴	شمس الدین علی
۳۰۳	نادر شاہ	۲۸۴	خواجہ یحییٰ
۳۰۷	علی شاہ	۲۸۵	خواجہ ظہیر الدین
۳۰۷	ابراہیم شاہ	۲۸۵	حیدر پہلوان
۳۰۷	شاہ رخ	۲۸۵	لطف اللہ
	<b>خاندان زند</b>	۲۸۵	پہلوان حسن
۳۰۸	کریم خان	۲۸۵	خواجہ علی موید
۳۰۹	ابوالفتح خان	۲۸۶	خاندان تیموریہ

۱۳۸	اقتدار کی جنگ یا خودکشی	۲۳۳	ابوعلی منصور آمر با حکام
۱۵۱	ملک گیری یا جہاد	۲۳۴	عبدالحمید میمون حافظ لدین اللہ
۱۵۴	تکواروں کی جھنکار	۲۳۶	ابو منصور اسماعیل ظافر بامر اللہ
۱۵۸	بویہی اقتدار کے آخری معرکے	۲۳۶	ابوالقاسم عیسیٰ فائز بنصر اللہ
۱۶۵	بغداد کا آخری متولی	۲۳۸	ابو محمد عبداللہ علی عاضد لدین اللہ
	<b>باقیات الصالحات</b>	۲۴۳	فاطمین مصر کے نقوش قدم
۱۷۲	سیف الدولہ صدقہ	۲۴۶	شیخ الجبال
۱۷۵	”صدقہ“ کی حمیت و شجاعت	۲۵۱	اشراف سعدین
۱۷۸	وہیں بن صدقہ	۲۵۳	اشراف فلائی حکماء
۱۸۱	سلجوقیوں کا جنگی فریب	۲۵۶	<b>مغل سلطنت</b>
۱۸۳	شجاع ابن شجاع	۲۵۸	بغداد کی تباہی
۱۸۵	ساحل فرات کے ساکن	۲۶۱	مغل تہذیب کے دھارے پر
	<b>شیعہ مراقش و مصر میں</b>	۲۶۸	مغلوں کا مرکز حکومت
۱۹۶	تارکان وطن	۲۶۹	ابا قاخان
۱۹۷	مراقش	۲۷۰	نکو دار بن ہلاکو
۲۰۲	افریقہ پر ایک نظر	۲۷۱	ارغون خان
۲۰۴	فاطمی تحریک	۲۷۱	کیخا تو خان
۲۰۶	خلفائے فاطمین	۲۷۲	بایدو خان
۲۰۶	عبید اللہ المہدی	۲۷۲	غازا خان
۲۰۷	محمد القائم، بامر اللہ	۲۷۲	الجاتو خان
۲۱۰	اسماعیل المنصور باللہ	۲۷۳	ابوسعید بہادر خان
۲۱۲	ابو تمیم المعز لدین اللہ	۲۷۵	معز الدین ارپا خان
۲۱۶	ابو المنصور رزار العزیز باللہ	۲۷۵	محمد خان
۲۲۳	ابوالحسن علی الظاہر عزاز دین اللہ	۲۷۵	ساقی بیگ
۲۲۵	ابو تمیم معد مستنصر باللہ		<b>طوائف المملوکی</b>
۲۳۲	ابوالقاسم احمد مستعلی باللہ	۲۷۸	امیر چوپان

۱۴

۳۱۰	علی مراد خان	۳۳۳	یعقوب شاہ
۳۱۰	جعفر خان	۳۳۶	کشمیری قسمت کا فیصلہ
۳۱۰	لطف علی خان	۳۳۹	انتقام کا دھارا
	<b>خاندان قاجار</b>	۳۴۱	چک بادشاہوں پر ایک نظر
	آقا محمد خان	۳۴۲	افغان اور سکھ
	فتح علی شاہ	۳۴۳	ڈوگرے
	محمد علی شاہ اول	۳۴۴	شیعوں کی خانقاہیں اور مساجد
	ناصر الدین		<b>سندھ</b>
	مظفر الدین	۳۴۸	سندھ اور اہل بیت
	محمد علی	۳۵۵	سندھ میں اموی حکومت
	احمد شاہ	۳۵۸	سندھ میں عباسی حکومت
	<b>پہلوی سلطنت</b>	۳۶۰	ہباری حکومت
	احمد رضا شاہ	۳۶۱	محمود کے حملوں کی نوعیت
	محمد رضا شاہ	۳۶۲	سلطان محمود اور ملتان
		۳۶۴	سلطان محمود اور منصورہ
	<b>شیعان کشمیر</b>		
	کشمیر میں شیعیت	۳۶۵	<b>سومرہ حکومت</b>
	کشمیر کا جیالا سپاہی	۳۶۶	سومرہ فرمانروا
	شیعوں کی بے چارگی	۳۶۹	خاندان سمہ
	قبیلہ چک کا دوسرا جرنیل	۳۶۹	جام آنر
	چک بادشاہ غازی شاہ	۳۷۰	جام تماچی
	حسین شاہ	۳۷۰	جام جونہ
	علی شاہ	۳۷۰	جام تماچی ثانی
	یوسف شاہ	۳۷۱	جام صلاح الدین
	سید مبارک بیہقی	۳۷۱	جام نظام الدین
	لوہر خان	۳۷۱	جام علی شیر

۱۵

۳۷۱	جام کرن	۳۹۰	میاں محمود خاں
۳۷۱	جام سکندر	۳۹۰	میاں غلام نبی
۳۷۱	جام فتح خان	۳۹۲	میاں عبدالنبی
۳۷۲	جام تغلق	۳۹۴	صادق علی خاں
۳۷۲	جام مبارک		<b>ٹالپر فرمانروائے سندھ</b>
۳۷۲	جام رائڈنہ	۳۹۹	حسب و نسب
۳۷۲	جام بنجر	۳۹۹	میر فتح خاں
۳۷۳	جام نندہ	۴۰۱	میر غلام علی خاں
۳۷۳	جام دریا خان	۴۰۲	میر کرم علی خاں
۳۷۴	جام فیروز	۴۰۳	میر مراد علی خاں
	<b>ارغون خاندان</b>		<b>میر نور محمد خاں و میر محمد نصیر خاں</b>
	شاہ بیگ	۴۰۵	سندھ اور انگریز
	مرزا شاہ حسن	۴۰۹	میران سندھ ایک نظر میں
	ہمایوں کی سندھ میں آمد	۴۰۹	حیدر آباد
	<b>ترخان دور</b>	۴۱۰	خیر پور
	مرزا باقی	۴۱۱	میر علی مراد خاں
	مرزا جانی بیگ	۴۱۲	میر پور
	محمود بھکری		<b>ہندوستان</b>
	<b>سندھ کے مغل گورنر</b>		
	مرزا غازی بیگ	۴۱۸	غزنی
	مرزا عیسیٰ خان	۴۱۹	غور
	کلہوڑا دور حکومت	۴۲۲	غزنی و غور
	محمد مراد یاب خاں		<b>پہلا مسلمان فرمانروا</b>
	میاں غلام شاہ	۴۲۶	قطب الدین ایبک
	میاں محمد سرفراز خاں	۴۲۶	شمس الدین التمش
		۴۲۷	غیاث الدین بلبن



۱۷		۱۶	
میسور		غیاث الدین تغلق	۴۲۷
حیدر علی	۴۹۴	خضر خاں	۴۲۸
ٹیپو سلطان	۴۹۸	مبارک شاہ	۴۲۹
بنگال	۵۰۳	علاء الدین	۴۲۹
علی وردی خاں	۵۰۳	بہلول لودھی	۴۲۹
سراج الدولہ	۵۰۵	سکندر لودھی	۴۲۹
جنگ پلاسی	۵۱۵	ابراہیم لودھی	۴۲۹
بنگال کی فرمانروائی	۵۲۰	شاہان شرقیہ	۴۳۰
جنگ بکسر	۵۲۳	مبارک شاہ	۴۳۰
سلطنت اودھ	۵۳۰	ابراہیم شاہ	۴۳۱
صفدر جنگ	۵۳۳	محمود شاہ	۴۳۳
شجاع الدولہ	۵۳۷	محمد شاہ	۴۳۴
آصف الدولہ	۵۳۸	حسین شاہ	۴۳۵
سعادت علی خاں	۵۳۹	شرقی سلطنت کے بعد	۴۳۷
غازی الدین حیدر	۵۴۱	مغل سلطنت	۴۳۹
نصیر الدین حیدر	۵۴۱	ظہیر الدین بابر	۴۳۹
محمد علی شاہ	۵۴۵	نصیر الدین ہمایوں	۴۴۰
امجد علی شاہ	۵۴۸	جلال الدین اکبر	۴۴۵
واجد علی شاہ	۵۵۰	نور الدین جہانگیر	۴۵۲
منار ہائے ہدایت	۵۵۰	شہاب الدین شاہجہاں	۴۵۶
تولیت کعبہ	۵۵۰	اورنگزیب عالمگیر	۴۶۰
نقطہ آغاز	۵۵۱	تبرہ	۴۶۳
غزنوی اور سلجوقی	۵۵۴	شہزادی زیب النساء	۴۶۹
زنگی اور ایوبی	۵۵۹	نہ ظالم نہ شکر	۴۷۱
		بہادر شاہ اول	۴۷۳
		جہاں دار شاہ	۴۷۴
سلطنت عادل شاہیہ		فرخ سیر	۴۷۴
یوسف شاہ		سادات بادشاہ گر	۴۷۴
اسمعیل عادل شاہ		سادات کاغلبہ	۴۷۶
ملو عادل شاہ		شاہجہان ثانی	۴۷۸
ابراہیم عادل شاہ		محمد شاہ	۴۷۸
علی عادل شاہ		نادر شاہ کا حملہ	۴۸۱
ابراہیم عادل شاہ		احمد شاہ ابدالی	۴۸۳
سلطنت نظام شاہی		عالمگیر ثانی	۴۸۴
نظام الملک بحری		شاہ عالم	۴۸۵
برہان نظام شاہ		دکنی ہندوستان	۴۸۶
حسین نظام شاہ		بہمنی سلطنت	۴۸۶
مرتضیٰ نظام شاہ		محمد شاہ	۴۸۸
میران حسین		مجاہد شاہ	۴۸۸
اسمعیل نظام شاہ		داؤد شاہ	۴۸۸
برہان شاہ		محمود شاہ	۴۸۸
ابراہیم شاہ		غیاث الدین	۴۸۸
احمد شاہ		فیروز شاہ	۴۸۹
چاند بی بی		احمد شاہ	۴۹۰
بہادر شاہ مرتضیٰ ابن علی شاہ		علاء الدین	۴۹۰
حکومت بریدیہ		ہمایوں شاہ	۴۹۲
سلطنت قطب شاہی		نظام شاہ	۴۹۲
سلطان قلی		محمد شاہ	۴۹۲
جمشید قطب شاہ		محمود شاہ	۴۹۳
ابراہیم قطب شاہ		احمد شاہ	۴۹۳
محمد قلی قطب شاہ		علاء الدین شاہ	۴۹۳
دکن کے آخری حصار		ولی اللہ شاہ	۴۹۳
اورنگزیب اور دکن		کلیم اللہ شاہ	۴۹۳

## شیعیت اور بساط اسلام

شیعیت کی اساس
اسلام میں گروہ بندی
اسلام کے مسالک فقہ
آغاز تاریخ
پیغمبری یا فرمانروائی

۶۹۲	کر بلائے معلیٰ	۶۲۴	ترکان عثمان
۷۰۷	روضہ عباس	۶۲۷	سلاطین نجد
۷۰۸	کاظمین شریفین	۶۳۵	کر بلائی تاراچی
۷۰۹	سامرا	۶۳۶	انہدام مدینہ
۷۱۰	دمشق	۶۳۹	صوفیاء کرام اور شیعیت
۷۱۲	مشہد مقدس	۶۴۵	فقہائے امامیہ
۷۱۶	مشہد: ایک شہر	۶۴۸	ابو جعفر برقی
۷۱۸	روضہ اقدس	۶۴۸	محمد بن یعقوب کلینی
۷۲۰	حرم کی ساخت	۶۴۹	شیخ صدوق
۷۲۶	حضرت عبدالعظیم	۶۵۰	شیخ مغنید
۷۲۹	حسین نیکری	۶۵۰	سید مرتضیٰ
۷۳۲	پاک دامناں	۶۵۱	ابو جعفر طوسی
۷۴۱	اہل بیت اور مترق بعید	۶۵۲	نصیر الدین طوسی
۷۴۶	صراط مستقیم	۶۵۵	علامہ حلی
۷۴۶	ماہم حسین	۶۵۵	شہید اول
۷۴۹	پہلی مجلس	۶۵۶	شہید ثانی
۷۵۲	پہلا جلوس عزاء	۶۵۶	شہید ثالث
۷۵۵	پہلا ام باڑہ	۶۵۸	علامہ مجلسی
۷۵۷	تعزیه	۶۵۹	بعض علمائے اکابر
۷۶۲	قدیم دلی کا محرم	۶۶۶	علامہ طبرسی
۷۶۹	باون ڈنڈے کا تعزیه	۶۶۷	غفران مآب
۷۷۱	دکنی قبائل میں عزاداری	۶۶۸	علمائے مابعد
۷۷۳	گوالیار کی عزاداری	۶۷۰	علمائے لکھنؤ
۷۷۸	خلاصہ کلام	۶۸۲	مشاہد سادات
		۶۸۲	نجف اشرف

بسم الله الرحمن الرحيم

## شیعیت اور بساط اسلام

علامہ سیوطی تفسیر در منثور میں ابن عساکر جابر ابن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں۔

”ہم رسالت مآب کی خدمت میں حاضر تھے کہ سامنے سے علی نمودار ہوئے۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کو دیکھ کر فرمایا: قسم ہے اس پاک پروردگار کی جو میری جان کا مالک ہے کہ قیامت میں یہ اور ان کے شیعہ ہی کامیاب رہیں گے۔“

علامہ ابن حسن نجفی نے صواعق محرقہ صفحہ ۹۳ اور انفسول المہمہ صفحہ ۱۲۲ کا تائیدی حوالہ دیا ہے اور ابن عباس کا قول ابن عدی کی زبان سے نقل کیا ہے کہ حضرت ختمی مرتبت نے علیؑ ابن ابی طالب سے ارشاد فرمایا:

”اس سے مراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں جو قیامت میں خوش و غرم ہوں گے۔“ ابن مردویہ نے خود حضرت علیؑ سے سن کر اس روایت کو نقل کیا ہے۔ ابن حجر مکی نے جناب ام سلمہؓ سے حدیث کو لیا ہے۔ ابن ہشیر نے بسلسلہ لفظ ”فتح“ لکھا ہے کہ رسول کریمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

”بارگاہ لہزدی میں جب جاضری ہوگی تو تمہارے ساتھ تمہارے شیعہ بھی شاد کام آئیں گے اور دشمنوں کا یہ حشر ہوگا کہ غضب میں ہتلا اور ہاتھ پس گردن سے بندھے ہوں گے۔“ اس کے بعد آنحضرتؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن کے پیچھے لے جا کر بتایا کہ دیکھو، ”یوں بندھے ہوں گے۔“

زمنشری کی ربیع الا برار، مسند احمد ابن حنبل اور خصائص نسائی میں بھی ایسی روایتیں ملتی ہیں جن سے علیؑ کے شیعوں کی تخصیص ہو جاتی ہے اور اس میں



ابن عبدود نے آکر لکارا ہے تو آپ نے ایک ایک کا نام لے کر مقابلے پر جانے کی دعوت دی تھی۔ آخر حضرت عمر کو کہنا پڑا کہ اس کے سامنے کون جائے، اس نے تو ایک بڑے گروہ کے مقابلہ میں بچہ شتر کو سپر کی طرح ہاتھ میں لے لیا تھا اور تن تنہا سب کو مار بھگایا تھا۔

پھر جنگ خیبر میں ایک مرتبہ حضرت ابو بکر اور دو مرتبہ حضرت عمر کو بھیجا گیا تھا اور جب یہ سب ناکام ہو کر واپس آئے تھے تب علی کو علم دیا گیا تھا۔ مکہ میں سورہ برأت کا شرف بھی حضرت ابو بکر کو دیا تھا مگر وحی الہی پر واپس بلایا تھا۔ خدا کی مرضی نہیں تھی تو رسول کیا کرتے!

بہر حال علی کی افضلیت مسلم تھی لہذا جب حضور نے علی کا شرف بیان کیا تو ہر ایک نے سر تسلیم خم کر دیا حتیٰ کہ غدیر خم میں سارے مسلمانوں کا مولیٰ بنایا تو حضرت عمر نے مبارک باد تک دی۔

ان حالات میں معیار لیمان و نفاق پر افراد کو تولانا جاسکتا اس لئے حضور کے جیتے جی شیعہ اور غیر شیعہ کا اعلان ممکن نہ تھا۔ ایسی کوئی کوشش کی جاتی تو سب کے سب علی کے پیچھے جا کھڑے ہوتے لیکن سنہ ۱۱ھ میں جب حضور کی حالت غیر ہوئی اور آپ نے تاکید فرمائی کہ علی کے سوا ہر ایک اسامہ بن زید کے لشکر کے ساتھ جائے گا تو پہلی بار ایک اندازہ ہوا کہ شیعہ کون ہے اور غیر شیعہ کون؟ لشکر روانہ ہو گیا اور ایک جماعت نافرمانی کی مرتکب ہو کر نہیں گئی کیونکہ علی رک رہے تھے۔ رسول کا آخری وقت تھا۔ ان سب کی عدم موجودگی میں علی کی نیابت کا اعلان ہو جاتا اور خلافت کا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔ کہا جاسکتا ہے کہ جو چلے گئے، وہ مطیع رسول بھی اور شیعہ علی بھی اور جو نہیں گئے وہ باغی۔

بعض مورخین اس کی تاویل کرتے ہیں کہ جانا خلافت مصلحت تھا۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ اس کے بعد ہی حضرت ابو بکر اپنے گھر روانہ ہو گئے اور پلٹ کر آئے تو حضور رحلت فرما چکے تھے لہذا حضرت ابو بکر حضرت عمر، ابو عبیدہ اور دوسرے لوگوں کو لیکر سیدھے سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے جہاں کسی سابقہ اعلان کے مطابق لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ علم باری میں ایک گروہ تھا جو شیعیان علی کہے جانے کا مستحق تھا اور جس کی تصدیق خود آنحضرت نے فرمائی تھی۔ اس طرح اس طبقہ کا وجود حضور کی زندگی میں مسلم ہو جاتا ہے اور وہ طبقہ بھی متعین ہو جاتا ہے جو شیعہ علی نہ تھا لیکن سب کے سب باگاہہ نبوی کے مقرب تھے اور سرور کائنات ہر ایک کو شیعہ علی بن جانے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ "صحاح ستہ" میں باب فضائل علی میں جتنی بھی احادیث نقل کی گئی ہیں اور دوسری کتب میں ترجمان مشیت کی زبان سے علی کے لئے جو ارشادات گرامی موجود ہیں، وہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ان تمام روایتوں کو چھوڑ کر مرزا محمد جعفر نے صرف ایک روایت کو "معیار لیمان و نفاق" بنایا ہے۔

"جو علی سے محبت کرے وہ مومن اور بغض رکھے تو منافق۔" (۱)

علی کے لئے فرمودات رسالت کی ایک طویل فہرست ہے اور یہ روایت تو الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ صد ہا کتب میں موجود ہے جو شیعہ اور غیر شیعہ کا امتیاز کرتی ہے اور قیامت تک کے لئے محبت علی کو شیعیت کی میزان بنادیتی ہے دشمن علی کی جگہ کیا ہے؟ اس کے لئے کسی صراحت کی ضرورت نہیں۔

### شیعیان علی کون کون تھے؟

رسول اکرم کے حین حیات تو اس کا فیصلہ ذرا مشکل تھا کیونکہ ہر شخص علی کی برتری اور افضلیت کا قائل تھا۔ حضور نے جو کچھ فرمایا، سب نے تسلیم کیا۔ سورہ برات لیکر جب حضرت ابو بکر کو بھیجا گیا اور پھر واپس بلا کر علی کے ذریعہ اس کا اعلان کرایا گیا تو کسی میں چوں و چرا کرنے کی ہمت نہ تھی..... اور ہوتی بھی کیونکر؟ علی کا علم و فضل، علی کی طاقت و شجاعت اور علی کا کردار و جبروت ناقابل انکار تھا۔

کہنے کے لئے حضور نے ہر موقع پر صحابہ کی یہ شکایت دور کرنے کی کوشش کی تھی کہ اپنے بھائی کو آگے بڑھا دیتے ہیں اور شاید اسی لئے "خندق" میں جب عمر

وصیت اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ حضور کا ہاتھ قبضہ ذوالفقار پر رکھا ہوا ہے۔" (۲)

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت علی کو چاہتی تھی تو میدان میں کیوں نہیں آگئے؟ اس کا جواب مختلف مقامات پر دیا جا چکا ہے اور یہ واضح کرنا بے محل نہ ہو گا کہ عرب کی بھیدیں تو صرف بنی ہاشم کے شیروں ہی کا سامنا نہ کر سکتیں اور اصحاب کبار اور صحرائی حق پرست سب یکجا ہو جاتے تو یثرب کی سرزمین ان کا بوجھ اٹھانہ سکتی جبکہ ان میں کوئی عمر ابن عبدود یا مرحبہ و عنتر جیسا شجاع بھی نہ تھا۔ یقیناً بعض لوگ تھے جو کمین گاہوں سے حملہ کرنے کے ماہر تھے لیکن فریب سے تو صرف دو ہی چار کو ٹھکانے لگا سکتے تھے جس کے بعد وہ کفر کردار کو پہنچنے تو ان کا حال عبرتناک ہوتا۔

کسی ایسی قیاسی جنگ کا انجام وہی ہوتا ہے جو غزوات نبوی کا ہوا تھا، اولاد فاطمہ کو اس کا حق مل جاتا اور علی بعد رسول اقتدار کی پہلی جنگ کے فاتح بن جاتے مگر حکومت کے بھوکے عرب علی کی زبان میں مرتد بن جاتے۔

اس اندیشے کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ آگے چل کر دین پیغمبر کا نام تو اسلام ہی رہا لیکن اس کی صورت اتنی بگاڑ دی گئی کہ خود سرور کائنات نے اسے دیکھا ہو گا تو پہچان نہ سکے ہوں گے کہ یہ انہیں کا دین ہے۔

بہر طور امام برحق نے اپنے دامن کو ہوس حکمرانی میں ملوث نہ ہونے دیا اور ان کے ہوا خواہ قلم و ستم کا شکار ہوتے رہے۔ یہ سب شیعہ علی تھے اور حضور کا ارشاد گرامی انہیں لوگوں کے لئے تھا۔

## صابرين

ہماری تاریخِ صابریں کے ناموں سے بھری ہوئی ہے۔ حسین کربلا، زینب کبریٰ اور عظیم المرتبت زین العابدین اور اسی طرح کی کتنی ہی گرانقدر شخصیتیں لیکن علی ابن ابی طالب ان میں سرفہرست ہیں۔ خیر شکنی کی طاقت بازوں میں موجود، برش ذوالفقار آب و تاب دکھانے کو بیقرار، رستم عصر اصحاب سرفروشی کو

سقیفہ کا ایک طرفہ انتخاب ایک علیحدہ موضوع ہے لیکن وہاں جو لوگ متوقع دھاندلی کو بچانے کے لئے اپنے طور پر پہنچ گئے تھے اور جنہوں نے علیؑ کی عدم موجودگی میں علیؑ کے حق میں آواز اٹھائی وہ یقیناً شیعان علیؑ تھے، جن میں سعد بن عبادہ سرفہرست ہیں۔

سقیفہ کی سازش تاریخ اسلام کا پہلا المیہ ہے جو کر بلا پر جا کر منج ہوا اور پھر اس کا سلسلہ آج تک تک پہنچتا ہے۔

بات ہے شیعیان علی کی توپورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ رسول کی میت کو چھوڑ کر استعمار حکومت کے لئے چلے گئے تھے، وہ علی کے شیعہ ہر گز نہ تھے۔ شیعہ تو وہ تھے جو کفن دفن میں شریک ہوئے اور جنہوں نے کھلے بندوں علی کی اہلیت کا اعلان کیا۔

افق ماضی پر ایک اچھلتی ہوئی نگاہ ڈالی جائے تو یثرب و بطحی کے علاوہ نواحی قبائل میں ہزاروں بزرگ انتخاب خلافت کے شاطرانہ نتائج پر مشتمل نظر آئیں گے ان کی مکمل فہرست مرتب کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف چیدہ چیدہ اصحاب رسول کے نام گنوائے جائیں تو وہ سیکڑوں تک پہنچ جائیں گے ان سیکڑوں کے زیر اثر کتنے لوگ ہوں گے، اس کا تخمینہ صاحبان فہم خود کر سکتے ہیں۔

”سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار یاسر، خنیزہ، ذوالشہادتین، ابوالتہیان، حذیفہ مانی، زبیر، فضل ابن عباس، عبداللہ ابن عباس، ہاشم بن عتبہ مرقال، ابویوب انصاری، ابان و خالد پسران سعید بن الحاص اموی، ابی بن کعب انس بن الحرث وغیرہ وغیرہ۔“

یہ سب کے سب اکابرینِ وقت میں گئے جاتے۔۔۔۔۔ سعد بن عبادہ سقیفہ سے دل شکستہ ہو کر چلے گئے تھے لیکن قیس بن سعد موجود تھے۔ ان کے علاوہ ”عثمان بن حنیف، سہل ابن حنیف، ابو سعید خدری، بریدہ اسلمی، براہ ابن عازب، خباب ابن الارت، رفاعة ابن مالک، عامر ابن وائل، وغیرہ تین سو اصحاب کبار تھے جو رسول کی تدفین کے بعد سے خانہ سیدہ زہرا پر حاضری دیتے رہتے اور پیغمبر اسلام کے نائب برحق کی چشم و ابرو کو دیکھتے رہتے لیکن وقت کا امام خاموش تھا۔ حضور کی

لیکن یہ نام رواج نہ پاسکا۔ بنی امیہ کی بساط سیاست کے مہرے اموی کہہ کر ہی پکارے جاتے رہے۔

علی کے محور صداقت پر اب بھی شیعوں کی کمی نہ تھی۔ پرانے لوگوں کی جگہ نئے سرفروشنوں نے لے لی تھی لیکن سیاست اسلام اور سیاست عرب کا مقابلہ تھا جس میں مکرو فریب صداقت پر بازی لے گیا اور وعدہ جنت پر یقین رکھنے والے جنت کو سدھار گئے۔ مالک اشتر اور محمد بن ابی بکر سازشوں کا شکار ہو گئے۔ نمایاں لوگوں میں اب صرف قیس بن سعد اور چند دوسرے بزرگ رہ گئے تھے جن کو لے کر علی باطل کی سرکوبی کے لئے نکلنے والے تھے کہ والی شام کے فرستادہ ابن بطم مرادی نے حالت نماز میں آپ کو شہید کر دیا۔

جھوٹ کو سچ پر دوسری بار فتح حاصل ہوئی جس کے بعد حق گوئی کے لئے دارورسن اور زنداں کے دروازے کھل گئے اور شیعان علی کے خون کی اتنی ارزانی ہوئی کہ:

جب کوئی قصر ستم آرا بنا  
خون سے سادات کے گارا بنا

باطل کا یہ غلبہ بے چارگی میں اہل لیمان کا امتحان تھا۔ اس میں بھی اکثریت کامیاب ہوئی۔ شاذ و نادر ہی کوئی نظیر ڈھونڈنے سے ملے گی کہ کسی شیعہ نے دنیا کے لئے دین کو قربان کر دیا ہو۔ استغناء ضرور ہوا کہ افراد کونوں کھدروں میں جا چھپے، تقیہ کر کے گھنی آبادیوں میں روپوش ہو گئے اور ایک تعداد ترک وطن کر گئی۔

اس طرح زندہ گیوں کو بچالے جانا بزدلی نہ تھی۔ اسلام نے اسی دن کے لئے تقیہ کو جائز کیا تھا۔

تاریخ کا یہ انقلاب اس قدر نتیجہ خیز تھا کہ عراق و شام شیعان علی سے خالی ہو گئے۔ کوفہ و بصرہ میں کھلے عام کوئی اہلبیت کا نام لیوا باقی نہ رہ گیا البتہ جب کربلا میں مسمیٰ بھر مجاہدوں نے مذی دل کے مقابلے پر حریت کا آواز بلند کیا اور عزت نفس کی ایک نظیر قائم کی تو اندر ہی اندر بیداری کی ایک ہر دہلنے لگی پھر بھی

تیار، حضر موت اور دوسرے صحرائی قبائل گوش برآواز لیکن امامت کی ذمہ داریوں نے ہاتھ باندھ دیئے تھے اور علی کے صبر کی آزمائش قبر رسول سے شروع ہو چکی تھی۔

رسول کا نائب ازلی اپنے شیعوں کے لیمان کو جانتا تھا۔ اس نے ان سب کو جہاد بالسیف کے بجائے جہاد اکبر کی منزل میں لاکھڑا کیا۔ بھرے دربار میں صدیقہ طاہرہ کو بھٹلایا گیا۔ آگ سے ڈرنے والے بھی پیسے باب سیدہ پر آگ لیکر پہنچ گئے، خود علی کے گلے میں رسی باندھی گئی۔ باؤفا اصحاب کے ہاتھ قبضہ شمشیر پر پہنچ گئے لیکن آپ نے آنکھوں کے اشارے سے ان سب کو روک دیا کیونکہ یہ خود ان کا اور ان کے اصحاب کے صبر کا امتحان تھا۔

انجیل نے حضرت عیسیٰ کی گرفتاری کا ایک منظر پیش کیا ہے کہ ایک حواری نے مشتعل ہو کر ایک سپاہی کو تلوار مار دی تھی اور اس کا ایک کان اڑ گیا تھا پھر وہ ابن مریم کے روکنے پر رک گیا اور عیسیٰ کے ساتھ خود بھی پکڑ لیا گیا۔

کتنے صابر اور صاحبان لیمان تھے شیعان علی کہ آزمائش صبر کی منزل میں بھی ان کے پاؤں ڈگر گانہ سکے۔

رسول کی اولاد محرومیوں کی زد پر تھی۔ احباب ایک ایک کر کے قتل گاہ وفا میں سرخرو ہوتے رہے تھے حتیٰ کہ مالک بن نویرہ نے شہید محبت امیر المومنین ہونے کا شرف حاصل کر لیا اور خالد بن ولید نے ان کی حسین بیوی سے نکاح کے نام پر زنا کا ارتکاب کیا اور سچے مسلمان ہونے کا ثبوت دیدیا مگر علی کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔

حضرت ابوذر کا ربذہ کی طرف خارج البلد ہونا امیر المومنین کے صبر کا امتحان تھا مگر اس میں بھی آپ پورے اترے اس طرح شیعان علی کا وہ کاروان جو رسول کی زندگی میں مرتب ہوا تھا، آہستہ آہستہ ختم ہوتا رہا۔ سلمان فارسی نے مدائن کو دائمی مستقر بنالیا اور بچے کچے لوگ عرصہ صفین میں مومنیت کا ثبوت دے کر درجات شہادت پر فائز ہو گئے، جن میں عمار یا سراور اویس قرنی بھی تھے۔

اب شیعان علی کے مقابلے پر جو گروہ تھا، اس کا نام شیعان معاویہ رکھا گیا



منتشر اقلیت جانیں دینے کے سوا کچھ کر نہ سکی۔

وقت اپنے محور پر گھومتا رہا۔ قلم کامیابی پر کامیابی حاصل کرتا رہا۔ تاریخ فتح و ظفر کے پرچم اڑاتی رہی۔ سبہاں تک کہ جابر فرماں رواؤں کی دوسری نسل مظلوموں کے نام کا سہارا لے کر برسر اقتدار آگئی اور بنی عباس نے بنی امیہ کی جگہ لے لی مگر شیعان علی کے لئے پہلے کی طرح دن رات برابر رہے۔

اب میدان عباسیوں کے ہاتھ میں تھا اور شیعہ نزدیک و دور معروف و غیر معروف بستیوں میں بڑے ہوئے تھے جو روستم کے نئے نئے باب و اتھے مگر شاہی کا استقرار منحصر تھا مہمان علی کی مکمل بیخ کنی پر لہذا منصور دوانیقی نے اہل بیت کے مقابلے پر ایک دارالعلوم قائم کر دیا، ہارون رشید نے امام جعفر صادق کے ایک شاگرد ابو حنیفہ کو امام اعظم کا لقب دے کر خود استاد کا مد مقابل بنا دیا۔ چل کر ماموں رشید نے ابو حنیفہ کے فتاوے کو مرتب کر کے اس کو فقہ حنفیہ کا نام دیدیا۔ اکتفاء صرف اتنے ہی پر نہیں کی گئی بلکہ طرفہ ستم یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام کے بتائے ہوئے مسلک پر چلنے والوں کی فقہ کو فقہ جعفری کہہ کر پکارنے کا حکم بھی دیدیا گیا۔ وہ وقت ہے اور آج کا دن کہ فقہ امامیہ کو فقہ جعفری ہی کہا جاتا ہے مگر باقی رہ گیا تھا ابھی لفظ شیعہ، جس کے مقابلے پر اس وقت صرف عباسی تھے لہذا اسی عظیم خلیفہ نے معاویہ کا تجویز کردہ نام اہل سنت و الجماعت ڈھونڈ نکالا اور اس کو شیعان علی کے مد مقابل بنا دیا۔

خلیفہ کا مسلک معتزلی تھا اور اعتزال سرکاری مذہب، جو متوکل تک جاری رہا لیکن بغداد کی شاہی کو شیعان علی سے اتنی کد تھی کہ ان کی ضد میں ایک باقاعدہ فقہ مرتب کروادی، امامت کا ایک نیا سلسلہ قائم کر دیا اور ایک نئی جماعت کی مکمل تنظیم کر دی جو آج تک اہل سنت و الجماعت کہلاتی ہے۔

پھر امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل کی فقہیں دیکھا دیکھی وجود میں آگئیں..... اور ایک ہزار سال بعد محمد بن عبد الوہاب کا وہابی مسلک بھی..... یہ سب اس عباسی خلیفہ کا کارنامہ ہے جو تاریخ میں مامون اعظم کہلاتا ہے۔ درحقیقت مسلمانوں میں بنیادی طور پر صرف دو گروہ تھے ایک شیعان

علی دوسرا غیر شیعہ۔ بنی امیہ کچھ دنوں تک شیعان معاویہ رہے پھر اموی بن گئے اور ان کی جگہ عباسیوں نے لے لی..... لیکن اہل سنت و الجماعت کے وجود میں آنے کے بعد سے مسلسل مسالک فقہ بنتے رہے اور نئی فرقہ وارانہ جماعتیں سامنے آتی رہیں جن کی تعداد حدیث رسول کے مطابق بہتر (۷۲) ضرور ہو جائے گی۔ صدیوں پر صدیاں گزر چکی ہیں۔ عقائد موروثی ہو چکے ہیں۔ ہر مکتبہ فکر اپنے کو برحق سمجھتا ہے۔ ایسے میں جھوٹ چچ کا فیصلہ ممکن نہیں پھر مسلمانوں کی تاریخ متفاد روایات کا مرکب بھی بن چکی ہے جس سے صحیح مفردات کا الگ کرنا محال ہے پھر بھی چشم بینا اصل و نقل کا امتیاز کر سکتی تھی لیکن وراثت میں آیا ہوا عقیدہ اپنی حمایت میں منطقی استدلال کا سہارا لے لیتا ہے لہذا رواداری کا تقاضا یہی ہے کہ تنازعہ مسائل کو چھوڑ دیا جائے۔

شیعان علی ہمیشہ سے اتحاد ملت کے خواہاں رہے ہیں اور حضرت علی کی آزمائش صبر کے موقف پر قائم ہیں، کاش اسے ہماری کمزوری سمجھانے جائے اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا جائے!

## اسلام میں گروہ بندی

### کب شروع ہوئی ؟

گروہ بندی عرب میں انسان کے اجتماعی وجود سے پائی جاتی تھی۔ تاریخ نے جب آنکھ کھول کر دیکھا تو عرب فحاشی اور فسق و فجور میں لتنے آلودہ تھے کہ انہیں ان غلاظتوں سے نکالنا کسی ہادی مطلق کا کام ہی ہو سکتا تھا اور اسی کے لئے علیم و بصیر نے اپنے آخری بنی کو مقدر کیا تھا جو بروقت اس ریگزار میں مبعوث ہوا اور اس نے ریت کے ذروں میں صدیقی شعور کی تجلیاں پیدا کر دیں۔

جنگ و جدل صحرائی عربوں کی جبلت، قبائلی عداوت، انفرادی اور اجتماعی کینہ پروری قومی مزاج تھا۔ مرسل برحق کی سیرت نے اثر پذیری کا وہ معجزہ دکھایا کہ ریگستان کے بھیڑیے آہوان ختن کے سانچے میں ڈھل گئے۔ کس نے رحمت لالعالمین کا کتنا اثر قبول کیا؟ یہ ذاتی صلاحیت کی بات تھی لیکن مجموعی طور پر انسان کے پیکر میں اکثر انسان ہی دکھائی دینے لگے۔

جس طرح ہر زمین باران رحمت کا یکساں اثر قبول نہیں کرتی، اسی طرح عرب بھی فیضان اسلام سے مختلف سطحوں پر بہرہ ور ہوئے۔ کوئی سلمان، ابوذر اور مقداد بن گیا، کوئی عبداللہ بن ابی، ابوسفیان اور ابولہب رہا، ہر ایک نے نفوذ دین کی سعادت بقدر ظرف حاصل کی پھر وہ وقت بھی آیا کہ مسلمان راح، نیم مسلمان اور منافق سب پرچم اسلام کے نیچے نظر آنے لگے۔

اسلام میں گروہ بندی کا نقطہ آغاز اسی دور کو قرار دیا جاسکتا ہے، جب مدینہ کے آفتاب رسالت کی شعاعیں دور دور تک سنگلاخ چٹانوں اور پہڑ زینوں پر پڑ رہی تھیں اور چڑھتے سورج کی پرستش عام ہو رہی تھی۔ ابوسفیان نے فتح مکہ کے دن حضرت عباسؓ سے کہا تھا: "جہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بڑی شاندار ہو گئی ہے؟" حضرت عباسؓ نے جواب دیا تھا: "یہ بادشاہت نہیں رسالت ہے۔"

بادشاہت اور رسالت کے دو تصور اسی مقام سے واضح ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں رسالت کا عقیدہ مرتسم ہو چکا تھا، وہ بھی اور جو علاقائی تسخیر کو توسیع مملکت سمجھتے تھے وہ بھی سب اپنی اپنی سطح سے جو پائے تقرب ہو گئے۔ بادشاہ عرب کی خوشنودی اور نبی مرسل کی رضا، بیک وقت دو سطح نظر ایک ہی سمت میں کار فرما تھے اور ہر ایک حضور کی بزم عرش منزلت میں کوئی ممتاز مقام حاصل کرنے میں کوشاں تھا، اس لئے ہر ممکن پیش کش اور انتہائی جدوجہد کر رہا تھا۔

مقرعین بارگاہ کی کوئی قطعی طبقاتی تقسیم نہیں ہو سکتی اور نہ مساوات محمدی اس کی اجازت دیتی ہے لیکن ان سب میں ایک نمایاں حیثیت آل ابو طالب کو حاصل ضرور تھی جس کے عوامل میں دیرینہ اور موجودہ خدمات بھی شامل ہوں گی اور خود آنحضرتؐ کے بقول مرضی الہی بھی۔ علیؑ ہر محاذ پر پیغمبر اسلام کے نمائندے، ہر جنگ میں مرد غیر فرار، ہر مقابلے میں حامل ذوالفقار تھے۔ خود حضور نے بیٹی سے پہلے علیؑ کی پرورش شروع کی تھی اور بساط پیغمبری پر گھٹینوں چلنا سکھایا تھا لہذا اگر حضورؐ بغیر وحی بات نہ کرتے تو علیؑ جو قدم اٹھاتے وہ صرف رضائے پیغمبرؐ کو دیکھ کر ہی۔

ان حالات میں علیؑ کی قدر افزائی ناگزیر تھی۔ آنحضرتؐ نے درجہ بہ درجہ دوسروں کی تالیف قلب بھی کی لیکن اس سے مزاجوں کا تکدر دور نہ ہو سکا، حالانکہ ذرا بھی انصاف پسندی کو دخل دیا جاتا تو اس شرف نوازی کا سبب سمجھ میں آجاتا اور لداکاری و شجاعت کے آئینے میں اپنی شکلیں پہچاننے میں دقت نہ ہوتی لیکن یہ کرتا تو وہ جس کو افضل و مفضل میں فرق کرنے کی تیز ہوتی یا جس کی حق شناسی اپنی کمتری کے اعتراف کی تاب لا سکتی لہذا ایک گروہ دل ہی دل میں لاطمہ زہر کے یگانہ روزگار شوہر سے جلتا رہا۔

یہ تھا نظری خاکہ خدا کے پیغمبرؐ مرسل کی صحبت میں بیٹھنے والوں کا..... امہات المومنین کی کیفیت اس کے کچھ مختلف نہ تھی۔ حضورؐ کی پہلی شریک حیات اپنی واحد یادگار کو شریک کار رسالت بنا کر چھوڑ گئی تھیں جو ماں کی نائب بھی تھیں

باپ کا مرکز محبت بھی اور سیرت و کردار میں مقبول مشیت بھی۔

موجودہ اہمات المؤمنین میں اکثریت مزاج رسالت اور رضائے نبوت کی پابند تھی مگر چند ایسی بھی تھیں جو حضور کو صرف جہت بیوی کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ ان میں حضرت عائشہ سرفہرست تھیں، آپ کو چاہ کے ساتھ آنحضرت کی زبان پر خدیجہ الکبریٰ کا ذکر بھی گوارا نہ ہوتا اور جناب فاطمہ کی عزت و تکریم تو قابل برداشت تھی ہی نہیں لہذا حضرت عائشہ کا برتاؤ فاطمہ زہرا کے ساتھ واقعی سوتیلی ماں کا تھا جس سے عاجز ہو کر جناب فاطمہ نے دیوار میں بنا ہوا وہ روزن بند کرا لیا تھا جو آپ کے اور حضرت عائشہ کے جردوں کے درمیان واقع تھی اور حضور حضرت عائشہ کی باری آنے پر جس کے قریب کھڑے ہو کر بیٹی سے بات چیت کر لیا کرتے تھے۔

فاطمہ زہرا کی فضیلت آیات و احادیث کی روشنی میں دلیل کی محتاج نہیں اور حضرت عائشہ سے آپ کی بیزاری پر بھی پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جن لوگوں کو آپ نے اپنے جنازے میں شریک نہ کرنے کی وصیت کی تھی ان میں جناب عائشہ بھی تھیں۔

اس طرح رسول اکرم کے حین حیات اندر اور باہر دونوں جگہ ایک گروہ بندی ہو رہی تھی اور اس کی بنیاد تھی علی اور زہرا کی فضیلت۔

علی کے سلسلے میں بعض لوگوں کو اعتراض تھا کہ ہر موقع پر انہیں کو آگے بڑھا دیتے ہیں لیکن حضور جب کسی کو موقع دیتے تو وہ بے نیل مرام واپس آ جاتا۔ کبھی یہ اعتراض کیا جاتا کہ دونوں بھائی تنہائی میں نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے ہیں؟ حضور بتاتے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں، حکم خدا سے کرتے ہیں۔ اس پر شاید کسی کو یقین نہ آتا کیونکہ پھر وہی اعتراض دہرایا جاتا۔

واضح رہے کہ آنحضرت نے مدینے میں ایک دوسرے کو بھائی بنا دیا تھا۔ علی کو خود اپنا بھائی بنایا تھا۔ برگزیدہ صحابی یہ بھی نہ سوچتے کہ وہ جس سے حسد کر رہے ہیں، وہ حضور کا بھائی ہے۔ اس پر طرفہ ستم یہ ہوا کہ قاتل المشرکین کے ہاتھوں عرب کے بڑے بڑے سورما موت کے گھاٹ اتر گئے اور قبائلی کینہ پروری

نے مختلف قبیلوں کو علی کا دشمن بنا دیا جو مسلمان ہونے کے باوجود اپنے جذبہ انتقام کو دبانے کے اور علی کی مخالفت کا ایک جال اندر ہی اندر بچھتا رہا۔

ایک طرف یہ گروہ بندی ہو رہی تھی، دوسری طرف آنحضرت اسلام اور اہل اسلام کے مستقبل کا فیصلہ سنار ہے تھے جس سے ایک گروہ جل بھن کر کباب ہو چکا تھا مگر ایک دوسرا گروہ اور بھی تھا جس نے ایسا ہر فیصلہ برحق بڑی طمانیت کے ساتھ سنا ہی دوسرا گروہ "شیعیان علی" کہلایا۔

تعداد کس کی زیادہ تھی؟ اس کا اندازہ چودہ سو برس بعد لگانا مشکل ہے مگر یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ بادشاہ عرب کی جانشینی کا فیصلہ اگر تجہیز و تکفین کے بعد طے کیا جاتا تو نتیجہ وہ نہ نکلتا جو حینکا مشتی کر کے سقیفہ میں نکالا گیا۔ اس حقیقت کا احساس غالباً باب حل و عقد کو پہلے سے تھا اور انہوں نے آنحضرت کو صرف بادشاہ عرب قرار دیا تھا تب ہی تو میت کی آخری رسوم ادا ہونے سے قبل تخت نشینی کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے تاکہ اس سے فراغت کر کے تدفین کے فرائض انجام دیں اور فرماں روا کے وقت کی میت نئے بادشاہ کے ہاتھوں قبر میں اتاری جائے۔

لیکن جس کی نظر میں آنحضرت صرف ختم المسلمین تھے، نئے بادشاہ کی واپسی سے پہلے ہی وہ آپ کو سپرد خاک کر چکا تھا۔ اس کے بعد کس میں ہمت تھی کہ ایک پیغمبر کو عرب کا بادشاہ قرار دے سکے..... سب نے اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر فاتحہ خوانی کی اور اگلے قدم پلٹ پڑے۔

### علی کا موقف

بلاشبہ خدا کے برگزیدہ نبی نے ریگزار کے بہت سے نخلستانوں کو مسخر کیا تھا اور سارے مقبوضات نے مل جل کر چھوٹی سی مملکت کی شکل اختیار کر لی تھی لیکن اس کا مقصد صرف تبلیغ دین تھا۔ اگر مشرکین کی طرف سے اشاعت اسلام میں مزاحمت نہ کی جاتی تو آنحضرت کبھی تلوار نہ اٹھاتے اور ایک بھی دفاعی جنگ وقوع میں نہ آتی۔

قتیل میں نصرا لے نجران کو لیا جاسکتا ہے جن کو حضور نے ہر طرح کا

خود رانی کو دخل دیا اس کے ہاتھوں شریعت کا خون ہو گیا۔  
روایات شاہد ہیں کہ بعض لوگوں کو اپنے ظالمانہ عمل پر ندامت ہوئی مگر  
بعد از وقت۔ تاہم یہ ادوار خیر و شر کے مخلوط راستوں سے گزرتے رہے اور علی  
ایک مسلک خاموش میں مددین قرآن کے ساتھ ساتھ امت کو وہ راستہ دکھاتے  
رہے جو انہیں عرفان الہی تک لے جاتا۔

ابتدائی دنوں میں بیت فاطمہ زہرا کے دروازے آنے والوں کے لئے وا  
رہتے تھے پھر حضرت علی نے مسجد نبوی کو درس گاہ امامت بنالیا۔ رموز دین کے  
شیدائی وقت معین پر جمع ہو جاتے اور اپنے دامن گہر علوم سے بھر کر واپس ہوتے  
..... یہ تھے شیعیان علی جو وقت کے محور پر زمانے کے فصل کو طے کرتے رہے۔  
ابتداء میں ان کے نام تھے سلمان، ابوذر، مقداد، عمار یاسر، ابوایوب انصاری،  
حذیفہ مانی، برید اسلمی، خالد بن سعید، ابو الہسین بن تیہان، عثمان بن حنیف، خزیمہ  
بن ثابت، ابی بن کعب آگے چل کر مسجد کوفہ میں ان کی جگہ کچھ نئے لوگوں نے  
لی لی اور بزرگ صحابہ کے دوش بدوش امیر المومنین کا حق رفاقت ادا کرنے لگے

باونا اصحاب رسول میں جو بقید حیات تھے، وہ کوفے آگئے انہیں کی صف  
میں سلیمان بن صرد غزامی، مالک اشتر نخعی، مسیب بن نجبه، عدی بن حاتم،  
عبداللہ بن بدیل، جبر بن عدی، نضار بن ابی عبیدہ، ہانی بن عروہ، سہم تمار کو جگہ ملی  
جن کے ذیل میں ان گنت لوگ شامل تھے اور اس اعتبار سے اس زمانے میں  
کوفہ و بصرہ شیعیان علی کے گڑھ کہے جاتے تھے۔

ان کے مقابلے پر دمشق اور دوسرے مقامات پر جو گروہ تھا، وہ شیعیان  
معاویہ کہہ کر پکارا جاتا مگر شیعیان علی اپنے جذبہ لسانی اور معلومات دینی میں نمایاں  
اور ممتاز تھے لہذا اس نام کو قبول عام حاصل ہو گیا اور معاویہ کے شیعہ "اموی"  
عنوان کے تحت گنے جانے لگے جن میں مدینہ اور دوسرے علاقوں کے وہ لوگ بھی  
شامل تھے، بغض علی جن کی گھٹی میں پڑا تھا۔

یہی سبب تھا جو حضرت معاویہ کو اپنے حلقے کا نیا نام تجویز کرنا پڑا اور انہوں

تحفظ دیا۔ سہاں تک کہ گرجاؤں کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا کیونکہ وہ آپ کا پیغام  
بگوش ہوش سننے کو تیار تھے اور آپ کا مقصد اولین ذہنوں کی تسخیر تھا جو پورا ہو رہا  
تھا اس لئے زبان کا کام تلوار سے لینے کی ضرورت نہ تھی۔ کفار قریش نے یہی رویہ  
اختیار کیا ہوتا تو نہ ہجرت مدینہ کی نوبت آتی اور نہ جنگ بدر و خندق واقع ہوتی۔  
تلوار تو محض دفاع کا ایک ذریعہ تھی ورنہ منزل صرف اشاعت اسلام تھی اسی کے  
لئے جنگ بھی کی گئی اور صلح بھی۔

یہی سبب تھا کہ جب مسلمانوں نے فرمانروائی کے لئے کسی نہ کسی طرح  
اپنے قائد کا انتخاب کر لیا تو علی نے تلوار کو بے نیام نہیں کیا کیونکہ دفاع کا کوئی  
موقع پیدا ہی نہیں ہوا تھا لیکن جب حضرت معاویہ نے اسلام پر حملہ کیا تو خیبر میں  
چمکنے والی ذوالفقار ایک بار پھر فضا میں کوندنے لگی اور علی شرع کی حدود میں دین  
کا تحفظ کرنے کے لئے میدان میں آگئے۔

یہ حالات بدیہی طور پر سقیفہ کے انتخاب سے پیدا ہوئے تھے، ان سے خانہ  
زہرا بے طرح متاثر ہوا تھا اور ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا تھا کہ پیغمبر عرب کی زندگی  
کے دو مستقل پہلو سامنے آگئے تھے۔ ایک حکمرانی کا، دوسرے ہادیانہ قیادت کا۔  
حکمرانی کا فیصلہ یکطرفہ ہو چکا تھا اور حضرت ابو بکر تخت خلافت پر بیٹھ چکے تھے۔  
بات رہ گئی تھی مسند پیغمبری کی تو سلسلہ نبوت اختتام کو پہنچ چکا تھا، کسی نبی کو  
تاقیام قیامت آنا نہیں تھا اس لئے خلیفہ کو ایسے اختیارات بھی حاصل تھے۔ ہمارے  
عقیدے میں ختم رسالت کے بعد نبوت کے بجائے سلسلہ امامت مقدر تھا  
اور حضرت علی اللہ کی طرف سے مامور تھے جنہیں اسلام کو آگے بڑھانا تھا۔ یہی سبب  
تھا جو علی نے خلافت ظاہری کی پر انہیں کی۔ انہیں دنیا سے کیا سروکار تھا، وہ تو  
دین کے لئے خلق ہوئے تھے اور یہ منصب کوئی ان سے چھین نہ سکتا۔

بادی النظر میں مسائل شریعت بھی خلیفہ وقت سے وابستہ تھے مگر یہ  
سعادت بزر و باز و حاصل نہ کی جاسکی اس کے لئے دینی مرحلوں میں کبھی عبداللہ  
ابن مسعود کو بلایا گیا، کبھی علی کے شاگرد رشید عبداللہ ابن عباس کو اور جب  
بالکل ہی مجبوری ہو گئی تو امام وقت حضرت علی سے رجوع کیا گیا اور جس کسی نے

پڑتے جا رہے تھے۔ عرب کے ہادی مرسل کی سیرت میں سیرت شیخین پہلے ہی مدغم ہو چکی تھی۔ تیسرے شیخ کی طویل المدت سیرت اس میں ضم ہوئی تو وہ اسلام اور جاہلیت کے عرب ذہن کا آمیزہ بن گئی اور اس کا نام سنت رسول رکھا گیا..... بالکل اسی طرح جیسے شام کے مسلمان نبی امیہ ہی کو پیغمبر عرب کا راست وارث اور صحیح جانشین سمجھتے تھے اور ان کی سیرت کو عین اسلام قرار دیتے۔

علی کی آواز مدینے کی مسجد نبوی سے گونجتی رہی تھی پھر مسجد کوفہ کے وسیع و عریض صحن سے بلند ہوئی مگر ایوان دمشق کے درودیوار سے ٹکرا نہ سکی۔ پھر حضرت معاویہ نے خانہ جنگی کی وہ صورت حال پیدا کر دی کہ اشاعت اسلام کے مواقع کم سے کم تر ہو گئے اور علی کی شہادت کے بعد امام حسن کو اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ وہ شام میں پیش کی جانے والی اسلام کی مخشہ تصویر کے داغ دھبے ہی دور کر سکتے۔

امام حسن رسول کے لب و لہجہ میں مفسر دین کا فرض ادا کرتے مگر وقت اتنا بدل چکا تھا کہ چند نفوس کے علاوہ کوئی اس کا سننے والا نہ تھا..... ستر ہزار منبروں سے علی پر تبرا بھیجا جا رہا تھا۔ تاج و تخت کا ہر عمل اسلام سے تعبیر کیا جا رہا تھا اور حاکم وقت کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ حکم قرآنی کے مترادف قرار دیا جاتا تھا۔

ایسے میں دمشق کے داخلہ پر ایک نام کندہ کیا گیا "احل السنۃ والجماعت" یہ سنت سیرت رسول سے عبارت لی گئی تھی مگر دراصل وہ مرکب تھی خلفائے ثلاثہ اور معاویہ کے اعمال کا، جماعت کا عطف اپنے گروہ کے اظہار کے لئے کیا گیا تھا لیکن یہ لفظ رواج نہ پاسکا۔ حجر بن عدی، عمرو بن حمق غزالی اور دوسرے مقدس اصحاب رسول کے خون سے اس عنوان پر اتنی تہیں جم گئیں کہ منصور دوانیقی سے لے کر مامون کے عہد تک انہیں کھرچا گیا تب وہ پڑھے جانے کے لائق ہو سکا۔

### خلافت و امامت

۱۱ھ میں مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے والے کو خلیفہ کہہ کر پکارا گیا اور انہ کی طرف سے متعین کئے ہوئے نائب رسول کو امام کہا گیا۔ اولاد رسول کے

نے اس کو اہل السنۃ والجماعت کا عنوان دیا لیکن یہ نام مقبول نہ ہو سکا اور مدینے سے دمشق تک ایک گروہ علی کے دوستوں کا، دوسرا دشمنوں کا باقی رہا، علی کے دوست شیعان علی کہے جاتے اور باقی غیر شیعہ۔ آگے چل کر لفظ شیعہ کا مطلب ہی محب علی ہو گیا۔

### اہل السنۃ والجماعت

یہ نام حاکم شام کے ذہن میں کیوں آیا، اس کا تجزیہ کیا جائے تو حضور کی رحلت سے اس وقت تک کا پورا ماضی سامنے آجاتا ہے۔ انتخاب خلافت اگرچہ صرف نظم و نسق کے لئے نہ ہوا تھا لیکن عملی زندگی میں بدیہی طور پر خلافت و امامت کی تقسیم ہو گئی اور مسائل شریعہ کیلئے کل لیمان کی احتیاج مانگ زیر ہو گئی۔ باب زہرا حیات پیغمبر میں بھی لیمان کا محور تھا۔ پدر زہرا کی سرپرستی میں اجرائے لیمان تربیت پاتے رہے تھے اور آج پیغمبر کے بعد بھی اسلام اسی دروازے پر تھا۔ علی کی محتاجی اور باب سیاست کو گوارا نہ تھی مگر وہ اسلام کا جو اکاندھے سے اتارے بغیر دور نہ ہو سکتی اور یہ شاید کسی کو منظور نہ تھا۔

پھر یہ مجبوری بھی تھی کہ اسلام کا نام کچھ اور رکھ دیا جاتا تو قائد کس حلقے کے رہ جاتے اسلئے ایک خیال یہ پیدا ہوا کہ اس درہی کو پھونک دیا جائے جس سے مطلق العنانی میں فرق آتا ہے مگر مسئلہ اس سے بھی حل نہ ہوا لہذا قیاسی فیصلوں پر انحصار کیا گیا۔

استنادی طور پر حضرت ابو بکر سے کئی غلطیاں ہوئیں اور حضرت عمر نے تو اتنے جارحانہ اقدامات کئے کہ ان کا پر تو آج تک اسلام میں پایا جاتا ہے..... اسی کا نام سیرت شیخین رکھا گیا تھا جس پر نبی کے نائب ازلی سے مہر تصدیق ثبت کرانے کے لئے خلافت کی پیش کش کی گئی تھی۔ علی نے نیابت پیغمبری کے منصب سے اس کی تردید کر دی۔ ایک تیسرے شیخ نے بڑھ کر اسے قبول کر لیا اور سیرت شیخین کی ایسی دھجیاں اڑائیں کہ سنت رسول بھی زلدار کر کے رکھ دی۔ جھوٹی روایات کی تخلیق اسی تیزی سے ہو رہی تھی کہ سچی روایات پر پردے



ایرانی سطوت و جاہ کی وسعت پیدا کی، پھر بغداد پہنچ کر اس کے پھیلاؤ میں بہت اضافہ ہو گیا اور اس طرح مدینے کی دینی ٹکسال کا یہ سکھ افریقہ و یورپ میں اپنی آب و تاب اور چمک دمک بڑھاتا رہا۔ آخر کمال اتحرک کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وقت کی بھٹی میں گلا دیا گیا۔

ہندوستان میں یہ لفظ اپنے سابقہ مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ اکھاڑوں کے کنارے بیٹھے ہوئے پہلوان کو خلیفہ کہہ کر پکارتے سنا گیا، حجام کا اعزاز بڑھانے کے لئے خلیفہ کے لقب سے مخاطب کیا گیا اور جولاہوں کے چودھری کو بھی بعض لوگ خلیفہ کہنے لگے۔

دوسرے لفظ "امام" کی بے وقعتی زیادہ نہیں ہوئی، شاید مسلمانوں کو اتنا احساس تھا کہ نماز پڑھانے والے کو خلیفہ نہیں کہا جاسکتا، نماز کا قائد تو امام ہی ہوتا ہے لہذا ہر مسجد کے پیش امام کو "امام صاحب" کہا گیا، خواہ وہ جاہل مطلق ہی کیوں نہ ہوتا۔ خدا کرے، یہ لفظ اس سے زائد بگڑنے نہ پائے۔

خلافت کے اس طویل سلسلے کا آغاز یقیناً اتنا بد شکل نہ تھا کہ اس کو ہادی اسلام سے نسبت نہ دی جاسکتی مگر اس کے نتائج بڑے بھیانک نکلے۔ تاہم کوئی منزل ایسی نہیں آئی جب وہ خانوادہ رسالت کی رہنمائی سے بے نیاز رہی ہو۔ یہ خلافت کی مجبوری تھی جس کا احساس قدم قدم پر ہوتا رہا اسی لئے جب خلافت کی باگ ڈور حضرت معاویہ کے ہاتھوں میں آئی تو انہوں نے دین کا ہیولہ بدل ڈالا جس کے بعد خلافت کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہدایت خواہی کی ہر زنجیر ٹوٹ گئی۔

اب اسلام اور خلافت اسلام کا مرکز دمشق تھا۔ مدینے کا کچھ احترام کیا جاتا تو صرف اس لئے کہ وہاں رسول اور اصحاب رسول کی ابدی آرام گاہیں تھیں اور خانوادہ رسول اقامت پذیر تھا جس سے بیشتر صحابہ کرام کی اولاد بھی مربوط ہو گئی تھی۔ فاطمہ کے دونوں بیٹے عزت گزینی میں رقوم خمس پر گزارا کر رہے تھے جو انتہائی نامساعد حالات میں بھی بچے کچے شیعان علی پیش کر دیتے تھے..... بحیثیت مجموعی دمشق سے جو سنوک اہل مدینہ کے ساتھ کیا جاتا وہ مراحم خسروانہ کی تعریف میں تھا اب دمشق کی خلافت نام نہاد علماء کی مدد سے شرعی فیصلے خود کرتی۔ اس

غلاموں نے نہ پہلے خلافت کو مانا تھا، نہ آج مانتے ہیں اور علی کے ماننے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قصے کہانی کو تاریخ بنا کر پیش کر دینے سے اہل نظر کی آنکھوں میں دھول جھونکی نہیں جاسکتی۔ خلافت ابوسفیان کی زبان میں بادشاہت تھی جس کو اسکے بیٹے معاویہ نے ثابت کر دیا..... اور پھر یہی خلافت عباسیوں سے گزرتی ہوئی فاطمین، مسرمتک اور اس کے بعد ترکوں تک پہنچی اور انجام کار اتنا ترک کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوئی۔

نیابت رسول کا یہ تقدس کہاں سے چلا کب تک باقی رہا؟ اس کا فیصلہ اب تک نہ ہو سکا۔ کوئی عبداللہ ابن زبیر کو پانچوں خلیفہ راشد قرار دیتا ہے، کوئی عمر بن عبدالعزیز کو۔ خلافت کے اس سلسلے میں چار پانچ راشد ہیں، باقی غیر راشد لیکن غیر راشد تو کسی کو کہا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ جو تھے خلیفہ راشد سے بغاوت کرنے والا بھی خطا کار نہیں تھا وہ بھی مجتہد تھا، جس سے خطائے اجتہادی سرزد ہو گئی ویسی ہی خطا جو حجر بن عدی اور دوسرے اصحاب نبی کے قتل میں سرزد ہوتی رہی۔

پھر بنی عباس کے عہد میں منصور دوانیقی اور ہارون رشید تو فتنہ حنفی کے مربی ہیں اور مامون تو مدون فتنہ ہے، اس کو کیونکر غیر راشد قرار دیا جاسکتا ہے..... اور خونخوار متوکل تو محسن اعظم ہے۔ اس نے پہلی بار اس فتنہ کو سرکاری مسلک کا شرف دیا۔ وہ سادات کے خون سے بھرے ہوئے پیالوں کو زینت دستر خوان بنالے تب بھی مقدس اور برگزیدہ رہے گا۔ بہر حال خلافت اولاد فاطمہ کے خون میں غوطہ لگاتی ہوئی بڑھی ہو یا آل رسول کی لاشوں پر سے گزرتی ہوئی مگر تھی خلافت، جس کا پہلا پتھر سقیفہ بنی ساعدہ میں رکھا گیا تھا اسی لئے جب بابائے ترکان نے اس پر آخری ضرب لگائی تو بعض سربراہان مسلمان تڑپ اٹھے اور احیائے خلافت کی تحریک چلانے کے لئے میدان میں آگئے، جیسے اس خلافت نے اسلام اور اہل اسلام کے لئے بڑے کار نمایاں انجام دیئے ہوں۔

خلافت کا لفظ پہلے پہل نیابت رسول کے مفہوم میں استعمال ہوا تھا پھر دمشق میں اس کے معنی بدل گئے اور وہ عام مسلمان بادشاہ کے لئے استعمال ہونے لگا۔ زمانے کے فصل سے اسی دمشق نے اس میں مطلق العنانی اور رومی و

منصور دوانیقی کو جب استقرار سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا تو اس نے اولاد رسول پر ستم رانی کا آغاز کیا۔ یہ زمانہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا تھا چنانچہ وہ قید میں ڈال دیئے گئے اور انکی عمر کا بڑا حصہ زندان تنگ و تاریک میں گزر گیا امام محمد باقر نے اپنے دادا کی جس درس گاہ کو نشاۃ ثانیہ عطا کی تھی، وہ پھر اجڑ گئی اور اپنے سرپرستوں کی طرح ایک بار اجڑ کر پھر آباد نہ ہو سکی تاہم اس درس گاہ سے نکلے ہوئے تلمذہ کے کارناموں کے سبب اس کا نام لیا جاتا رہا اور چند برسوں کے اندر تدریس کے جو چراغ روشن ہوئے تھے، ان کی روشنی پھیلی رہی۔

ابو حنیفہ کوفہ کے باشندے تھے۔ مدینے اور دوسرے مقامات کے چکر لگا کر وہ کوفہ واپس آئے تو انہوں نے خود اپنی درس گاہ کھولی۔ ان کے دل میں اہل بیت کی بڑی عظمت تھی۔ انہوں نے نفس ذکیہ کے حق میں بھی فتویٰ دیا تھا جس کی سزا انہیں منصور دوانیقی کے ہاتھوں بھگتنا پڑی لیکن ان میں حکومت سے ٹکر لیتے رہنے کی طاقت نہ تھی لہذا اس کے بعد انہوں نے ایک مصالحانہ رویہ اختیار کر لیا اور ہارون رشید نے انہیں امام اعظم اور عالم دہر کے خطابات دے کر شعبہ دینیات کا سربراہ بنا دیا۔

حضرت علی کے حلقہ بگوش پہلے دن سے اعلان کر رہے تھے کہ خلافت و امامت دنیا و دین کے علیحدہ علیحدہ مناصب ہیں مگر اس کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ آج خلیفہ ہارون رشید کا عمل اس کی تصدیق کر رہا تھا کہ شیعیان علی سچے ہیں..... پھر مامون نے امام ابو حنیفہ کے شاگردوں امام ابو یوسف اور الشیبانی سے امام ابو حنیفہ کے نظریات اور فتاوے مرتب کرا کے اس کا نام فقہ حنفیہ رکھا اور اس کے پیروؤں کو اہل السنۃ و الجماعت کہہ کر پکارنے کی ہدایت کی جبکہ مامون خود واصل بن عطا کا مقتدر رہا، کئی نسلوں تک عباسی تخت خلافت سے مسک اعتراف کی تبلیغ کی جاتی رہی۔

حکومتوں نے اسلام کے خال و خد بدل کر اس کی صورت بگاڑ دی تھی اور اس کو اہل بیت رسالت کی اجارہ داری سے نکال کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا پھر بھی امامت ان کے لئے خدائے بخشنہ کی دین تھی اور فقہ اسلامی گھر کی بات۔

نے مسلمانوں کے لئے اہل بیت سے وابستگی اور شرعی قیادت کو بے ضرورت بنا دیا تھا اور اس مجبوری کو دور کر لیا تھا جو ماضی کی فرماں روائی میں ناگزیر رہی تھی۔ وقت کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ نبی کے گھر کی بے وقعتی بڑھتی رہی پھر یزید بن معاویہ کے ہاتھوں سبط رسول کا سر قلم ہو گیا، فاطمہ زہرا کا خاندان در بدر پھرایا گیا۔ کعبے کی بے حرمتی، مدینے کی تار لچی ہوئی اور ایسا کچھ عمل میں آیا، تاریخ بھی جس کی توقع نہ کر سکتی..... اس قلم و شقاوت کے مرتکب بنی امیہ کہے جاتے ہیں، ان کا نام "اہل السنۃ و الجماعت" نہیں تھا۔

پھر بھی بنی عباس نے اپنے اقتدار کے دوسرے مرحلے میں اسی امام سے زمین ہموار کی، علماء کے ایک گروہ کو منظم کیا اور ہارون رشید نے ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کو اس کا سربراہ بنایا۔

حضرت علیؑ نے اپنے مرشد کامل کی تقلید میں رشد و ہدایت کا ایک سلسلہ جاری رکھا تھا، وہ حسینؑ کے دور میں بھی باقی رہا مگر اس کی رفتار سست تھی پھر امام زین العابدینؑ کے زمانے میں بھی محمود کم نہ ہو سکا البتہ امام باقرؑ نے اس درس گاہ کو زندہ کیا جس سے حضرت نعمان بن ثابت اور حضرت مالک بن انسؒ نے استفادہ کیا پھر امام جعفر صادقؑ کے عہد میں بھی دونوں بزرگوں نے فیض حاصل علی کے جانشینوں کو تدریس کے یہ مواقع صرف اس لئے مل گئے کہ بنی امیہ کی حکومت میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ عبداللہ ابن زبیر کے فروج اور مختار ثقفی کے انتقام کے بعد آپس کی چپقلش اور محلاتی سازشیں شروع ہو گئی تھیں۔ پھر بنی عباس نے نبو فاطمہ کے نام سے اپنی تحریک چلائی لہذا اموی سادات کشی پر زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد ان کا استیصال کلی ہو گیا۔

بنی عباس کے برسر اقتدار آنے کے کچھ ہی دنوں بعد نفس ذکیہ میدان میں آ گئے اور ابراہیم کے مقابلے میں منصور دوانیقی کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن علی کے پیروؤں نے مفرورین کو قتل نہیں کیا اور بھاگی ہوئی عباسی سپاہ کچھ ہی دور جا کر پلٹ پڑی..... اس اثناء میں ابراہیم اچانک ایک تیر گن کے سبب ٹھوڑے سے گر گئے اور سادات میں ایک ہر اس پیدا ہو گیا۔ انجام کار فتح شکست میں بدل گئی۔

## اسلام کے مسالک فقہ

اس کو ان حالات کا کرشمہ سازی کہنا چاہئے جو بنی امیہ نے پیدا کر دیئے تھے  
ہنگامہ غار دیکھا جائے تو

”بنی امیہ، جن میں بہت سے قبول اسلام کے بعد بھی دل سے مشرک رہے  
اپنے آباؤ اجداد کی طرح قسمت کے قائل تھے۔“ وہ بہم بن صفوان کے جبریہ  
نظریے کے معتقد تھے یا شاید اپنا نظریہ انہوں نے بہم بن صفوان سے پیش کرایا تھا  
کہ ”انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں کیونکہ اس کے اعمال خدا کی طرف سے  
ہوتے ہیں۔ نہ اس میں عمل کی قوت فیصلہ ہوتی ہے اور نہ ارادہ کرنے کی قوت۔  
وہ اپنے اعمال میں خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا محکوم ہے، نہ قوت عمل رکھتا ہے،  
نہ قوت ارادی اور نہ قوت انتخاب۔ خدا اس کے اندر اسی طرح فعلیت پیدا کرتا ہے  
جس طرح وہ غیر ذی روح چیزوں میں کرتا ہے۔ انسانی اعمال کی جڑ و سزا کا  
دار و مدار خدا کی حاکمیت مطلقہ پر ہے۔“ (۳)

خدا کی ذات و صفات کے بارے میں بنی امیہ کے الگ الگ قیاسی نظریات  
تھے۔ ابوسفیان نے کھلم کھلا پیغمبری کو بادشاہی قرار دیا تھا اور اسلام کو وہ  
سیاست کا ایک کھیل سمجھتا تھا۔ معاویہ ہوشیار، کنہوس مگر ضرورت کے وقت بڑا  
فیاض، بظاہر مذہبی امور کا پابند مگر اپنی حرص و آز کی تجاویز کی تکمیل کے وقت کسی  
شخص یا خدائی حکم کی پرواہ نہ کرنے والا۔ (۴) اعمال و کردار کے لحاظ سے معاویہ  
نے خلافت اسلام کو صرف ملوکیت سمجھا اور روایت سازی کی بدعت کو دیکھ کر تو  
مخاطب دائرے میں انہیں مسلمان ثابت کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

مذید بن معاویہ کا قول لوح تاریخ پر نقش ہے ”نہ کوئی وحی آئی، نہ فرشتہ  
نازل ہوا، پیغمبری بنی ہاشم کا ایک کھیل تھا۔“

مامون نے دمشق کے پہلے خلیفہ کا خواب پورا کیا اور ان دونوں امتیازات پر سیاست  
کا لیبل لگا کر عباسی تاج و تخت سے ہمرشتہ کر لیا اس کے بعد تاریخ نے خدا ساز آئمہ  
کے مقابلے میں پہلے ایک خلافت ساز امام کو ایستادہ پایا پھر ان کی تعداد بڑھنے لگی۔  
پہلی منزل پر خلافت نے امامت کے وجود ہی سے انکار کر دیا تھا مگر امامت کی ساتویں  
منزل پر آکر خود امامت سازی کی اور آٹھویں منزل پر تو شیعیان علی کے مد مقابل  
ایک جماعت لاکھڑی کی جس کا نام اہل سنت و الجماعت تھا۔ ستم ظریفی کی بات یہ  
ہے کہ مامون نے اس جماعت کو حق پر سمجھتا تھا اور نہ اس فقہ کو صحیح قرار دیتا کیونکہ  
ایسا ہوتا تو وہ خود اس کی پیروی کرتا اور اس کی اشاعت میں حکومت کے ذرائع  
استعمال میں لاتا مگر اس نے یہ کچھ نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس وہ خود معتزلی رہا  
اور مسلک اعتزال کو حدود خلافت میں رائج کرتا رہا۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ فقہ حنفی کی مدوین اور آئمہ  
سازی دونوں خلافت کے سیاسی کھیل تھے جو آل محمد کے خلاف کھیلے گئے تھے جس  
کے بعد آئمہ اثنا عشر کے مقابل حکومت سازی یا خود ساختہ امام پیدا ہوتے رہے۔  
شیعیان علی کے سامنے ایک گروہ اہل سنت و الجماعت کے نام سے آگیا اور امام  
ابوحنیفہ کی قیاسی فقہ، اس فقہ کا بدل قرار پائی جو اہل بیت نبوت سے مختص تھی پھر  
اس فقہ کو بھی مامون نے فقہ جعفریہ کا نام دیدیا گویا وہ بھی اسی دور کی مرتبہ تھی  
حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس پر آنحضرت یا علی کے عہد سے عمل ہوتا رہا تھا۔

کی تنگ خیالی، نہ شافعی مسلک کی پیش پا افتادہ روش، انہوں نے مملکت اسلامیہ کے لئے ایک نیا مسلک ایجاد کیا جو تمام و کمال حدیث پر مبنی تھا۔ امام ابو حنیفہ نے بیشتر متداول حدیثوں کو مسترد کر دیا تھا، امام احمد بن حنبل نے اپنے نظام فقہ میں بہت سی تناقضات، مستبعد اور عقل کو خیرہ کر دینے والی روایتیں شامل کیں جو اہل بے جوڑ تھیں اور بدیہی طور پر گڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اسی وقت سے ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے طرفداروں سے ایک شدید چھٹکاش شروع ہو گئی۔

”ابن حنبل نے صفاتیہ کے انتہاء پسندانہ خیالات کو قبول کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ذات باری کو آنکھوں سے دیکھنا ممکن ہے۔ اس کی تمام صفات اس کی ذات سے علیحدہ ہیں۔ یہ بیان کہ خدا عرش بریں پر مستکن ہے، لغوی معنوں میں صحیح ہے۔ انسان کسی لحاظ سے مختار نہیں۔ ہر فعل انسانی بلا واسطہ فعل الہی ہے۔ انہوں نے علوم عقلی و تجربی کو مذموم قرار دیا۔“ (۵)

مسلمانوں کی یہ جو تھی فقہ متضاد ہے فقہ امامیہ سے اور معتزلی نظریات سے اور محسوس ہوتا ہے کہ اس پر دور بنی امیہ کے جہم بن صفوان کی چھاپ ہے..... اس کے برعکس حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔

”جس نے ذات باری کے علاوہ صفات مانے، اس نے خدا کا ساتھی مان لیا اور دوئی پیدا کی۔ جس نے دوئی پیدا کی اس نے وحدہ لا شریک کے جزو مان لئے اور جس نے جزو مان لئے وہ اسے پہچان نہ سکا اور جس نے نہیں پہچانا اس نے اسے اشارے کے لائق سمجھا اور جس نے اس کی طرف اشارہ کیا اس نے اسے محدود کر دیا اور جس نے محدود کر دیا وہ اسے شمار کے قابل سمجھا۔ جس نے یہ پوچھا کہ خدا کس چیز میں ہے اس نے اس کو چیز کے ضمن میں قرار دیا اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز پر ہے اس نے دوسرے مقام کو اس سے خالی سمجھا۔“ (۶)

مسئلہ قضا و قدر بھی اسی ذیل میں ہے۔ عبید بن کعب نے حضور کی ایک حدیث بیان کی ہے، آپ نے فرمایا۔

”سب سے خوشحال شخص وہ ہے جو اپنی محنت سے خوشحال بنے اور سب سے بدحال شخص وہ ہے جو اپنے اعمال کے طفیل بنے۔“

عمر بن عبد العزیز کے علاوہ بنی امیہ کے بیشتر خلفاء کے ہاتھوں قرآن کی بے حرمتی، ارکان اسلام کی تضحیک، اصحاب رسولؐ اور مقدس لوگوں کا قتل، کیا کچھ نہیں ہوا اور ان سب کے نتیجے میں بنی عباس کی فاطمی تحریک کامیاب ہوئی اور عباسیوں نے ان کا قلع قمع کر دیا۔

عباسی اس بساط فقہ سے اٹھ کر آئے تھے جو پیغمبر اسلامؐ نے اساسی طور پر مدینہ میں بکھائی تھی لیکن استتار حکومت کے لئے اصل حقداروں کی بیخ کنی بھی ضروری تھی۔ پھر فرمانروائی کے نشے نے روا و ناروا اور جائز و ناجائز کی تیز بھی ختم کرادی۔ انہوں نے اہل بیت کے عناد میں اسلام کو بھی پامال کر دیا۔ یہی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ عداوت کے اندھے جذبے میں انہوں نے امامت کے مقابلے میں امامت، شیعان علی کے سامنے اہل السنۃ و الجماعت، فقہ اسلامی کو فقہ جعفریہ کا نام دے کر اس کے مد مقابل فقہ حنفی لاکھڑی کی پھر بھی حنفی فقہ امامیہ سے زیادہ مختلف نہ تھی اختلاف صرف خلافت اور قیاسی استدلال کا تھا تو اس سے کوئی خاص تصادم نہ ہو سکتا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ امام ابو حنیفہ اس شریعت کے مزاج داں تھے جس کی دعوت اہل بیت نبوت کی طرف سے دی جاتی تھی۔

امام مالک نے اس کے بعد اپنے مسلک کا اعلان کیا۔ وہ مدینہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات فراہم کیں اور امام ابو حنیفہ کے استنباط اور استخراج کو مسترد کر کے اس مسلک کو رائج کیا جس کی نظیریں سیرت رسولؐ سے ملتی تھیں۔ قدامت پرستی اس مسلک کا شیوہ امتیاز تھا۔

اسی زمانے میں امام شافعی منظر عام پر آئے۔ انہوں نے فقہ امامیہ، حنفیہ، اور مالکیہ کے نچوڑ پر اپنی فقہ کی بنیاد رکھی جس میں اصلاح پذیری کی بڑی گنجائش تھی

امام احمد بن حنبل اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ وہ اگرچہ امام شافعی کے شاگرد تھے لیکن انہیں نہ حنفی مسلک کی فریسیانہ آزاد منشی پسند آئی، نہ مالکی مسلک

تھے لیکن اس کے علاوہ بہت کچھ اختلافی تھا جس سے اسلام کی روح متاثر ہوتی لہذا شیعیان علی کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ مامون اعظم فقہ حنفی اور اہل السنۃ والجماعۃ کا معمار تھا اور مقصدی طور پر اس نے فقہ اسلامی اور اہل اسلام میں دو مستقل دھڑے بنا دیئے تھے لیکن خود اختیار کیا تھا واصل بن عطا کا مسلک اور اسی کی اشاعت اپنی حدود و سلطنت میں بھی کرتا رہا۔

اس کے بعد عہد متوکل سے پہلے تک تمام خلفائے عباسیہ معتزلی رہے۔ متوکل نے پہلی بار امام ابو حنیفہ کی فقہ کو اپنی سرپرستی میں رواج دیا پھر یہ مسلک اقتدار کے بل پر پروان چڑھتا رہا۔

امام ابو حنیفہ کے نظریات اساسی طور پر فقہ امامیہ کے بالکل برعکس نہ تھے۔ ان میں اتنی لچک تھی کہ ہر تصادم نظر انداز ہو سکتا تھا لیکن امام احمد بن حنبل کے واشق کی قید میں مرجانے کے بعد حنبلی زاویہ ہائے نگاہ جب حنفیت پر اثر انداز ہوئے اور خدا کے تصور کے ساتھ خلق قرآن کا اختلافی نظریہ بھی درمیان آگیا تو خلیج گہری ہوتی چلی گئی۔

عہد مامون میں کہا گیا تھا کہ قرآن مخلوق نہیں ہے تو بعض علماء نے سوال اٹھایا تھا کہ مخلوق نہیں ہے تو کیا خالق اور ابدی ہے؟ اور اگر ابدی ہے تو کیا خدا کی طرح ابدی ہے؟ اس پر خون خرابے کی نوبت آگئی تھی۔ اب خدا کو قابل دید بنا دیا گیا تھا۔ رسول اکرم کی زندگی کے دور رخ پہلے پیش کئے جا چکے تھے ایک بحیثیت پیغمبر، دوسرا بحیثیت انسان۔ اس طرح توحید، رسالت اور قرآن سب مختلف فیہ بن گئے۔ کاش اہل السنۃ والجماعۃ صرف امام ابو حنیفہ کے نظریات کے پیرو رہتے! بنی امیہ اور بنی عباس کے تمام ادوار میں اہل بیت نبوت پر زمین سخت اور آسمان دور رہا تھا اور علی کا ہر ماننے والا تقیہ میں چھپ چھپا کر جی رہا تھا اسی طرح ان کا مذہب بھی زندہ تھا۔ سنہ ۲۶۰ھ میں جب بارہویں امام غیبت صغریٰ میں چلے گئے تو ماحول پر پوری یاسیت طاری ہو گئی۔ اب نیابت رسول کی ذہنی سرپرستی کا آسرا بھی ختم ہو گیا تھا۔ اسی دور سے تحفظ مذہب کی ذمہ داری علمائے امامیہ پر آہڑی روایات و احادیث کا ذخیرہ حضرت علی کے دور سے کیا جاتا رہا تھا لیکن خود اولاد

جنگ صفین سے واپسی پر ایک شخص نے حضرت علی سے پوچھا۔  
"شاید قضا مسلمانوں کو ملک شام سے لائی تھی؟"  
آپ نے اس کو جواب دیا۔

"تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ تقدیر ربی اٹل ہے، اللہ کا کوئی حکم بدلا نہیں جاسکتا اگر ایسا ہوتا تو جہرا و سزا کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ ثواب کا وعدہ اور عذاب کی دھمکی دونوں بے سود ہوتے۔ خدا کی طرف سے نہ گنہگار پر نغزیں اور نہ نیکو کار پر آفرین ہوتی اور نہ نیکو کار بدکار کے مقابلے میں جہرا کا زیادہ مستحق ہوتا اور نہ بدکار نیکو کار کی بہ نسبت زیادہ سزاوار۔ تم نے جو کہا، وہ کلمہ ہے اخوان الشیاطین کا، بت پرستوں کا، خدائے رحیم و رحمن کے دشمنوں کا، ان لوگوں کا جو باطل کی تائید کرتے ہیں اور ان لوگوں کا جو اپنے معاملات میں حق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں جیسے تقدیر پرست اور مجوسی۔ خدا نے انسان کو اختیار دیا ہے اور انہیں مایوس ہونے کو منع کیا ہے۔ اس نے انسانوں پر فرائض کو جبراً عائد نہیں کیا اور نہ صرف تفنن طبع کی خاطر پیغمبر بھیجے ہیں..... ایسا عقیدہ کافروں کا ہے۔ ان پر جہنم میں عذاب الیم نازل ہوگا۔" (۷)

حضرت علی کی صراحت توحید اور مسئلہ قضا و قدر میں اہل بیت کے موقف کی ترجمان ہے جو کسی طرح امام احمد بن حنبل کے نظریات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ایسا ہی کچھ نظریہ معتزلہ کا بھی تھا۔

"وہ اپنی ذات میں عالم کل ہے، اپنی ذات میں حی و قیوم ہے، اپنی ذات میں قادر مطلق ہے۔ اس لئے نہیں کہ علم، حیات اور قدرت اس کی صفات قدیمہ کی حیثیت سے اس میں موجود ہیں کیونکہ علم، حیات اور قدرت تو اس کی ذات کے اجزاء ہیں۔ اگر بصورت دیگر ان صفات کو وجود باری کی صفات قدیمہ خیال کیا جائے تو یہ متعدد قدیم وجودوں کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا..... کلام اللہ مخلوق ہے اور مخلوق ہونے کی حیثیت سے الفاظ اور اصوات کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔"

خدا، قرآن، جبر و قدر کے سلسلے میں معتزلی نظریات فقہ امامیہ کے قریب



ابن تو مروت افریقہ لے گیا جہاں مراقش میں اس کی پذیرائی ہوئی اور مالکیوں کے علاوہ کوئی اس کا مد مقابل نہ رہ گیا۔

پھر ابو حامد امام غزالی کی قدامت پسندی جہاں دیگر مسکوں پر اثر انداز ہوئی وہاں اس نے اشعریت کو بھی نہ چھوڑا اور فلسفہ اور تصوف کو ایک نئی شاہراہ مل گئی لیکن عقلیت اور سائنسی افکار پر بڑا برا اثر پڑا جس نے عقلی تخلیقات کے دھارے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ امام ابن تیمیہ کی اصلاحات اس پر مستزاد تھیں اور امام فخر الدین رازی کا اصلاحی فلسفہ اپنی نوعیت کا ایک اضافہ۔

خالص اسلامی نقطہ نظر سے مامون کی آزاد خیالی کو سراہا نہیں جاسکتا اور بحیثیت خلیفۃ المسلمین اس کے دور کو مفید قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن مادی زاویہ ہائے نگاہ سے اس نے انسان اور انسانیت کی بڑی خدمت کی۔ یونانی اور سنسکرتی علوم عربی میں منتقل کرائے۔ فلسفہ، منطق، طب اور کیمیا سے مسلمانوں کو آشنا کرایا اور حریت فکر کو اپنا آزاد کر دیا کہ اس کے بعد ہر دس بیس آدمی کے بعد جو شخص ملتا، وہ اپنے معتقدات میں مختلف ہوتا، جس کے نتیجے میں کوئی مانی کے نظریے سے متاثر نظر آتا کوئی شنیویت کا قائل اور کوئی مزدک کا مقلد۔

مسالک اسلام بھی شش جہت ہو گئے۔ متوکل نے حنفی فقہ کو سرکاری مذہب قرار دے کر کسی حد تک یکسوئی کر دی تھی مگر لوگوں کے خیالات کو زنجیروں میں جکڑ دینا اس کے امکان سے باہر تھا۔ انجام کار کبھی عقائد میں اتنی سستی پیدا ہوئی کہ وہ گویا ناہید ہو گئے اور کبھی اتنی تیزی کہ آپس میں ٹکرائے لگے اور مختلف العقائد لوگوں کا خون مباح قرار دیا جانے لگا۔

ایسے میں اخوان الصفا نام کی ایک انجمن بصرہ میں قائم ہوئی جو تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں پر مشتمل تھی۔ اس انجمن نے فلسفہ اخلاق اور سائنس پر رسائل شائع کئے۔ تمدنی اور سیاسی مضامین لکھ کر لوگوں میں انسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کچھ لوگوں پر اس کا اچھا اثر پڑا مگر مذہبی بے لگامی جو پیدا ہو گئی تھی، وہ دور نہ ہو سکی۔

اسلام ایک بار اپنے در محکم سے بہکا تو ٹھو کریں ہی کھاتا رہا، کبھی ایک در

فاطمہ اور پروان اہل بیت کی جانیں تک محفوظ نہ تھیں تو علمی سرمایہ کس طرح محفوظ رہ سکتا اور دشمنوں کو بڑی عداوت تو اس سے تھی لہذا دشمن کو جس مقام پر جو کچھ ملا وہ اس نے نذر آتش کر دیا پھر بھی علی کے دیوانے قید خانوں میں اور سردار تفصیل بیان کرتے رہے اور کوئی نہ کوئی ان کو محفوظ کرتا رہا۔

بعض خاندانوں نے نسلاً در نسل، بعض نے انفرادی طور پر روایات صحیحہ کو قلم بند کیا جن کو محمد بن یعقوب کلینی، شیخ ابو جعفر محمد طوسی، شیخ صدوق، شیخ مفید، سید مرتضیٰ، سید رضی اور علامہ مجلسی وغیرہ نے جمع کر کے مرتب کیا اور وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ دوسرے بزرگ اس جہاد بالقلم میں شامل ہوتے رہے لیکن وقت اب بھی اتنا مساعد نہ تھا کہ اپنی ہوئی تلواروں کی چھاؤں سے ہٹ کر کوئی علمی اور دینی خدمت انجام دی جاسکتی۔ تاہم آئمہ کے نقوش قدم مشعل راہ تھے۔ علماء کا کاروان ہدایت آگے بڑھتا رہا اور قلم کے نئے مجاہد اس میں شامل ہوتے رہے۔

اس کے برعکس حنفی فقہ دوسری فقہوں کی آمیزش کے ساتھ حکومتوں کے زیر سایہ پھلتی پھولتی رہی پھر اس پر ابو الحسن الاشعری کی اصلاحات نے رنگ آمیزی کا کام کیا۔ ان کا اعتقاد تھا۔

”خدا کی صفات ازلی اور اس کی ذات میں موجود ہیں لیکن وہ شخص اس کی ذات نہیں بلکہ اس پر ایک اضافہ ہیں۔“

”ہر فعل یا تو خدا کی طرف سے صادر ہوتا ہے یا اس کا کسی شخص سے ارتکاب خدا کی طرف سے مقدر ہوتا ہے۔ چونکہ یہ شخص اکتساب کی قابلیت رکھتا ہے اس لئے وہ فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ فعل اولاً خدا کا فعل ہوتا ہے پھر بندے کا۔“

ان نظریات کی مختلف تفسیریں کی گئیں مگر ان سے وضاحت کے بجائے الجھنیں پیدا ہوتی رہیں پھر بھی یہ مسلک اثرو نفوذ میں دوسرے مسالک سے آگے بڑھ گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ امام احمد بن حنبل کی فقہ سے کافی مطابقت رکھتا تھا۔ احناف نے بھی اس کو قبول کر لیا تھا۔ ایوبیوں نے اس کو شام و مصر میں پھیلایا، عراق سے

## آغاز تاریخ

شیعان علی کی تاریخ حضرت جنت کی غیبت کے بعد معتمد عباسی کے دور سے شروع ہوتی ہے لیکن اس کا نقطہ آغاز اس دن کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے جب آنحضرت اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے یا پھر ۱۵ شعبان ۳۲۹ کو عہد متقی باللہ میں جب سے غیبت کبریٰ واقع ہوئی..... اور ایک لحاظ سے یہی تاریخ صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے بعد امام سے بالواسطہ استصواب یا استفتاء کا امکان ہی ختم ہو گیا تھا اور پھر امام آخر کا کوئی نائب بھی نہ رہا۔

نائب امام کی اصطلاح ایک شرعی مسئلہ ہے اور امور فقہ بلکہ مسائل فروعیہ میں کسی عالم یا علم کی تقلید اس کے ذیل میں آتی ہے لیکن تاریخی طور سے یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ غیبت کے بعد شیعہ علماء نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ منظر عام پر امام کی عدم موجودگی پیروان علی بلکہ سوگواران حسین کو محسوس نہ ہونے دی یہ لوگ حقیقتاً نائب امام کہے جانے کے اہل ہیں ان پر حضور کی یہ حدیث صادق آتی ہے کہ میرے دین کے علماء انبیائے بنی اسرائیل کے برابر ہیں۔ ان علماء کو لغوی معنی میں اگرچہ تاریخ ساز نہیں کہا جاسکتا لیکن وہ محافظ تاریخ ضرور تھے۔ انہوں نے اس صراط مستقیم پر اپنے نقوش ثبت کیے ہیں جو ازل سے حضرت مہدی آخر زماں تک آیا تھا اور ابد تک جانے والا تھا پھر وہ فقہ کی ان آندھیوں کے سامنے سینے تان کر کھڑے رہے جو امام ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں محمد بن عبد الوہاب کے جلو میں اٹھیں اور جن کی راست ضرب تعلیمات رسالت اور افراد خانہ زہرا پر پڑ رہی تھی۔

قلم کا مقابلہ قلم اور تلوار کا تلوار سے ہوتا ہے، ہمارے عالموں کے پاس صرف قلم تھا جس سے وہ خدا کے فرستادہ آئمہ کے علوم لدنی کے خاکے بناتے رہے

پر گیا کبھی دوسرے پر اور آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ در یوزہ گری میں جو جو ملا اس کے مرکب کا نام اسلام پڑ گیا۔

ان سب سے قطع نظر ہمارے آئمہ کی تعلیمات کو دیکھا جائے تو توحید، رسالت اور قرآن ہر ایک کیلئے اہل فیصلے ہیں جو پہلی منزل سے چل کر بارہویں منزل تک غیر متغیر اور مستقل پائے جاتے ہیں۔ فلسفے کے براہین اور منطق کا استدلال بھی انہیں ڈانوا ڈول نہیں کر سکتا۔ مقدر ساز بھی مرضی رب کا پابند اور بے عمل قابل پاداش، اسرار کائنات کی جستجو فریضہ انسانی، مادے کی تحقیق مجملہ مقاصد حیات، آدمی کہیں مجبور کہیں مختار۔

اس لئے رموز کائنات کے خبر ثانی نے مسجد کوفہ میں اعلان کیا تھا۔

”پوچھ لو، جو پوچھنا ہے، قبل اس کے کہ میں تم میں نہ رہوں!“

مگر پوچھنے والے نے سوال بھی کیا تو کیا.....؟

”میرے سر میں کتنے بال ہیں؟“

وہ پوچھتا تو زمین کی کشش، سیاروں کی چال، ذرات کے تجزیے کا اصول، سب کچھ اسے بتا دیا جاتا پھر نہ اخوان الصفا کی ضرورت ہوتی اور نہ کوئی اشعری ذہن انسانی کے ارتقاء کو قید کرنے کی ہمت کر سکتا۔

بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ ہوتا رہا لیکن علی کے پیروں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

وہ ہر ذہنی تغیر سے بے نیاز ایشیا اور افریقہ کے مختلف گوشوں میں زندگی کی سانسیں لیتے رہے۔ موسم بار بار بدلے مگر انہوں نے صرف اس سورج کی روشنی سے حرارت لی جو فاطمہ زہرا کے گھر سے طلوع ہوا تھا، جس کی حدت میں الہیات کا فلسفہ بھی تھا اور طبعیات و کیمیا کی روشنی بھی لہذا جہاں انہیں کچھ موقع ملا، وہاں انسان اور انسانیت کی خدمات انجام دیں اور توحید کے پیغامات بھی سنائے، کبھی علی الاعلان اور کبھی چہروں پر تعقیہ کے نقاب ڈال کر.....!

اور شمشیر بکف کاغذی حربوں کا جواب دیتے رہے اور جب اکثریت کی ملخار، معقولات سے عاجز ہو کر اقتدار کا سہارا لے کر آگے بڑھی تب بھی آئمہ برحق کی تاسی میں پیچھے نہیں ہٹے، ظلم و تشدد میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ دیا اور ہٹ دھرم دنیا اس پر بھی باز نہ آئی تو گردنوں کی شہرہ رگیں تلوار کی دھاروں پر رکھ دیں جس کا سبق کر بلا کے ریگزار سے ملتا تھا اور جس میں آج بھی ہماری بقاء کا راز چھپا ہوا ہے۔

ایک طویل فہرست ہے ان شہیدوں کی، جن میں شہید اول حضرت شیخ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد، شہید ثانی زین العابدین علی، شہید ثالث حضرت قاضی نور اللہ شستری وغیرہ بھی شامل ہیں۔

جہاد بالسیف اساسی طور پر جنگ بدر سے شروع ہوا تھا اور کر بلا سے جا کر مسلسل ہو گیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام اس کی درمیانی کڑی تھے لیکن آپ مرشد ازل کی ہدایت کے پابند تھے لہذا آپ نے ابتداءً حصول اقتدار کے لئے تلوار نہیں اٹھائی جس کی تاسی ہمارا ہر امام کرتا رہا..... لیکن جب تحفظ اسلام ناگزیر ہو گیا تو علیؑ کے قبضہ شمشیر پر رکھا ہوا آنحضرت کا ہاتھ خود بخود ہٹ گیا اور حیدر کی ذوالفقار بے نیام ہو گئی۔

یہ جنگ تخت و تاج حاصل کرنے کے لئے نہ تھی بلکہ نائب رسول پر ابوسفیان کا بیٹا حملہ آور ہوا تھا اس لئے اس کو بتانا تھا کہ پیغمبر اسلام کے جانشین حق پر آئیں آتے دیکھ نہیں سکتے۔ اسی کی تقلید امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں نے کی امام حسنؑ نے اعلان کیا کہ خلافت اگر جاہ و منصب کا نام ہے تو اس پر وہ ٹھوکر مار سکتے ہیں۔ ان کا کام تو اسلام کا تحفظ ہے جس کو وہ کرتے رہیں گے۔ امام حسینؑ کا بھی یہی نظریہ تھا انہیں اس خلافت کی ضرورت نہ تھی جس پر شاہی کا اطلاق ہوتا ہو مگر دین کی حفاظت ان کا مقصد تخلیق تھا لہذا دنیا کو بتانا ضروری تھا کہ بنی امیہ جس دین کو اسلام کہہ رہے ہیں وہ اسلام نہیں ہے، خود ان کا ساختہ و پرداختہ مذہب ہے۔

پھر محض کر بلا کے بعد تو یہ حقیقت بالکل آئینہ ہو گئی کہ اسلام دو ہیں: ایک وہ جو خانوادہ رسالت سے پیش کیا جاتا ہے، دوسرا وہ جس کو نام نہاد خلفاء ایوان شاہی سے پیش کرتے ہیں اور جس پر زر غرید علماء سے مہر توثیق ثبت کرائی جاتی ہے۔ اول الذکر اسلام کے پیرو آج تک شیعان علی کہے جاتے ہیں۔

ان کا یہ جرم کسی عہد میں قابل معافی نہیں رہا اور نتیجے میں ان کی بے نام زندگیاں تقیہ میں گزرتی چلی گئیں لیکن اکثر انہوں نے پایہ زنجیر ہو کر دار پر چڑھنے کے بجائے میدان جنگ کی موت کو ترجیح دی، کبھی زید شہید بن کر، کبھی نفس ذکیہ کے روپ میں اور کبھی مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی کے نام سے۔

ہمارے آئمہ سے ایسی تحریکوں کا کوئی تعلق نہ تھا، وہ پیغمبر عرب کے جانشین تھے، ان کا تاج امامت اور تخت اسلام تھا۔ صبر و شکر ان کی سیرت اور قناعت ان کا غرہ تھا لیکن کر بلا کی درس گاہ کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ قلم جب حد سے بڑھ جائے تو میدان میں سرکنا نا ہی فرض عین ہوتا ہے۔ حسینؑ کی یہ سیرت شیعوں کے لئے شمع ہدایت تھی اس لئے وہ ہر انتشار سلطنت میں گوشوں سے نکل نکل کر باہر آتے رہے اور اپنی زنگ آلود تلواروں کے وہ جوہر دکھاتے رہے کہ ان کی شجاعت آج بھی لوح زمانہ پر ثبت ہے۔ عرب و عراق، ایران و شام، مصر و عراق میں جا بجا بنے ہوئے مقابر شہادت دیتے ہیں کہ ان میں وہ یگانہ روزگار محو استراحت ہیں جن کی تلواروں نے مڈی دل فوجوں کے منہ پھرا دیئے، جن کی بہادری نے رستم و سہراب کی یاد تازہ کر دی، جن کے کئے ہوئے گلوں سے خیبر شکن کا نام بلند ہوتا رہا، جن کی شہرہ رگوں سے چھوٹتے ہوئے خون کے فواروں نے فضائے بسیط میں ایک نام لکھ دیا! حسین ابن علی!

خلافت عباسیہ کے کمزور پڑنے پر شیعان علی کا یہ عمل تیز سے تیز تر ہو گیا۔ امام آخر غیبت صغریٰ میں جا چکے تھے اور علیؑ کے نام لیوا تین سو سال میں اس نکتے کو سمجھ چکے تھے کہ رسولؐ نے اشاعت اسلام کے لئے تلوار اٹھائی تھی تو انہیں بقائے اسلام اور تحفظ حیات کے لئے اس کا استعمال کرنا چاہئے اور یوں بھی تقیہ کی زندگی کہاں تک گزارتے لہذا انہوں نے حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور متوکل

دیکھنے لگتے کوئی ہمت افزائی نہ ہوتی تو تامل کر رہ جاتے اور اندر کی گھٹن انہیں چین لینے نہ دیتی۔

حضرت علی علیہ السلام کی اولاد میں کر بلا کے بعد محمد حنفیہ بزرگ خاندان تھے، مگر وہ امام نہ تھے لہذا ان سے ایسی تحریک کی اجازت ملنے کا امکان تھا۔ کسی امید پر ایک دن حضرت محمد حنفیہ کے آزاد غلام کیسیان نے ان کی امامت کا اعلان کر دیا پھر اس کے ہم خیال بھی پیدا ہو گئے جو محمد حنفیہ کے بعد ان کے بیٹے ابو الہاشم کو امام مانتے رہے۔

ابو الہاشم کے بارے میں کہا نہیں جاسکتا کہ ان کے دل میں کیا تھا؟ مگر وہ ہشام بن عبد الملک کے مقرب بن گئے تھے اور دمشق میں ان کے عقیدہ مندوں کا ایک بڑا حلقہ تھا جس سے خود کیسیانی تو فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن عباسی تحریک کے پہلے داعی محمد بن علی نے ابو الہاشم کی اچانک موت پر دمشق ہی میں اپنی امامت کا خفیہ اعلان کر دیا..... کہا جاتا ہے کہ ابو الہاشم اپنے مقلدین سے بنو فاطمہ کے لئے بیعت لیتے تھے۔

محمد بن علی جب ۹۶ھ میں ایک منصوبہ بنا کر ابو الہاشم کی پناہ میں پہنچے تو انہیں دنوں ہشام نے زہر دیکر ابو الہاشم کو مار ڈالا، محمد بن علی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے حق میں ان کی وصیت کا اظہار کر دیا اس طرح ابو الہاشم کی خفیہ تحریک عباسیوں کے ہاتھ آ گئی۔

شیعوں کا دوسرا فرقہ زیدیہ ہے۔ حضرت زید امام زین العابدین علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ سلسلہ امامت کے جاری رہنے تک تاج و تخت سے سادات کا کوئی سروکار نہ رہے گا اور اس کو حاصل کرنے کے لئے وہی تدابیر درکار ہوں گی جو اہل سقیفہ نے اختیار کی تھیں اس لئے امام زین العابدین کے بعد انہوں نے اپنی امامت کا اعلان کر دیا اور اپنے مسلک سے ان نظریات کو وابستہ کر لیا جن پر اہل سنت کے مذہب کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ پیٹو کا انتخاب شوریٰ کے ذریعے، افضل کی موجودگی میں مغضول کی اطاعت وغیرہ لیکن ان کا ساتھ دینے والوں نے صرف خاندان رسالت کے نام پر ان کی حمایت کی اور وہ

کے بعد آہستہ آہستہ اپنے مسلک کا اعلان کرنے لگے۔

حکومت کے کسی شعبے میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی اس لئے ایک تعداد تو تقیہ میں موجود رہی مگر عام زندگی میں گروہ اہل بیت کی حیثیت سے بھی ان کا وجود ہر شہر میں پایا جاتا رہا۔ بالخصوص بغداد میں تو انہوں نے اپنا ایک محلہ قائم کر لیا تھا: کرخ۔

آبادی کا یہ سلسلہ بہت پہلے سے چلا آ رہا تھا لیکن مامون کے دور سے مختلف الاعتقاد لوگ مختلف شہروں میں جا بجا پائے جاتے لہذا کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ کس کا عقیدہ کیا ہے؟ اس کا اندازہ دور حاضر میں اس جگہ سے لگایا جاسکتا ہے جہاں صرف ایک دو شیعہ رہتے ہوں اور باقی سب مختلف المسک لوگ: وہ بھی ایسے جو شیعہ کی پرچھائیں بھی برداشت نہ کر سکتے ہوں تو شیعوں کو قلم سے پہنچنے کے لئے اپنا عقیدہ چھپانا پڑے گا۔ یہی صورت حال دور عباسیہ میں بھی برسوں سے چلی آ رہی تھی۔

مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی سلطنت عباسیہ کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا اور حکومت کی حدود ایک دائرے میں مرکز کی طرف سمٹنے لگیں تو دوسروں کی طرح بعض شیعان علی نے بھی طالع آزمائی کی۔ تین سو سال بعد پہلی بار وہ حالات پیدا ہوئے کہ اپنی کوئی حکومت بنا کر شیعہ عقائد کا اعلان کیا جاسکتا

### مسلک امامیہ کے ذیلی فرقے

ان فرقوں کے وجود میں آنے کا بنیادی نکتہ اقتدار تھا مگر ختم المرسلین کے نائب برحق نے امامت کے لئے جو خدائی منشور دیا تھا، اس میں اقتدار کے لئے تلوار اٹھانے کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن خانوادہ رسالت پر ستم رانی کا سلسلہ بند ہونے کو نہ آتا تھا۔ انجام کار بعض جوانوں کی رگوں میں خون اس تیزی سے دوڑنے لگتا کہ ہاتھ خود بخود قبضہ شمشیر پر پہنچ جاتا وہ اجازت طلبی کی نگاہ سے بزرگوں کی طرف

یہ فرقہ نہایت خاموشی سے اپنی تبلیغ کرتا رہا اس کے عقائد عام شیعوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں لیکن سلسلہ امامت امام جعفر صادق کے بعد ایک نئی شاخ میں منتقل ہو جاتا ہے اور اسی مناسبت سے آگے چل کر عقیدے میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ بھی بنی عباس کا نشانہ ستم تھے اس لئے بڑی احتیاط اور لگن سے اپنے نظریات کی اشاعت کرتے تھے۔

ان کے ایک داعی "عبد اللہ ابن میمون" نے شام میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی جو عیسوی غناسطیت کا مرزوم تھا۔ وہاں انہوں نے اپنے نظریوں کے خاکے میں رنگ بھرے اور "حمدان" کو اپنا ہم عقیدہ بنایا، جو قرمط کے نام سے اسلام کی تاریخ میں رسوا ہے۔" (۸)

حمدان المعروف بہ قرمط اور اس کے قبیلہ پر وقتی طور پر اسمعیلیت غالب آ گئی لیکن جلد ہی اس نے یہ جو اکاندھوں سے اتار پھینکا اور عجیب و غریب عقائد ساتھ منظر عام پر آ گیا۔ کہا نہ جاسکتا کہ یہ فرقہ عیسائی تھا یا مسلمان مگر حقیقتاً عقائد کے لحاظ سے اسمعیلیوں سے بہت دور چلا گیا تھا اور اہل تشیع سے تو اس کا کوئی تعلق ہو ہی نہ سکتا، حالانکہ وہ محبت اہل بیت کا دعویٰ کرتا تھا لیکن اہل بیت کی تعلیمات سے اس کا کوئی سروکار نہ تھا۔

قرامطہ نے العشاء اور البحرین کو اپنا مرکز بنایا۔ بعض شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ خارجی بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ ان علاقوں میں انہوں نے کئی قلعے فتح کر لئے اور ان سے نکل نکل کر عباسی علاقوں کو تاخت کرتے رہے۔ اکثر مقابلوں میں انہوں نے بنی عباس کو شکست بھی دی اور تقریباً ایک صدی تک امن و سکون غارت کرتے رہے۔

یہ غارت گری آہستہ آہستہ مکہ تک پہنچ گئی اور وہ سنگ اسود تک اٹھالے گئے۔ ۳۱۷ھ میں انہوں نے حج کے دوران مکہ میں حجاج کا قتل عام کیا۔ یہ نتیجہ تھا سلطنت عباسیہ کی کمزوری کا قرامطہ و بابائی کیزوں کی طرح عراق و عرب میں پھیل گئے تھے۔ آخر معتز بن ہاشم نے کئی سال کی مسلسل جنگوں کے بعد ان کا قلع قمع کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اسمعیلیت مراقش میں اپنے قدم جما کر مصر کی

جوار کوفہ میں امویوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے..... حضرت زید شہید کے عقائد کا مسئلہ اختلافی ہے لیکن یہ بات مسلم ہے کہ ان کی تحریک سے امام باقر کا کوئی تعلق نہ تھا۔

یحییٰ بن زید امام جعفر صادق کی مخالفت کے باوجود میدان میں آئے اور خراساں میں قتل ہوئے۔

پھر زیدیوں کا خاندان واسط اور خراساں میں سکونت پذیر ہو گیا جہاں مختلف اوقات میں قلم و ستم کا شکار ہوتا رہا۔ صرف اس لئے نہیں کہ حضرت زید نے بنی امیہ کے خلاف خروج کیا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ رسول کی اولاد میں تھے۔

حضرت زید کے عقائد ان کی زندگی میں بھی قبول نہیں کئے گئے اور بعد میں تو ان کے مقلدین کی اکثریت اصل مسلک امامیہ پر آ گئی۔

تیسرا باغی فرقہ عباسیوں کا تھا جنہوں نے نفس ذکیہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے تحریک بنو فاطمہ کا آغاز کیا مگر کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہی اپنی حکومت کا اعلان عقیدہ اور مسلک امور مملکت کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ ابو العباس اور ابو جعفر منصور نفس ذکیہ اور ابراہیم کا سہارا لے کر آگے بڑھے تھے مگر تخت پر بیٹھتے ہی ان دونوں کے دشمن جانی ہو گئے۔ امام جعفر صادق نے زید شہید اور یحییٰ شہید کی طرح نفس ذکیہ اور ابراہیم کو بھی منع کیا تھا مگر نفس ذکیہ نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا اور تھا بھی ان کا وہ کردار کہ زہد و تقویٰ کو ان پر ناز تھا اور عبادت کو ان پر فخر ہو سکتا اسی لئے حضرت نعمان بن ثابت اور حضرت مالک بن انس نے ان کے حق میں فتاوے دئے تھے مگر دونوں درجات شہادت پر فائز ہو گئے۔

چوتھا فرقہ اسمعیلیوں کا ہے جو امام جعفر صادق کے بیٹے اسمعیل سے نسبت رکھتے ہیں۔ اسماعیل حضرت جعفر صادق کے بڑے بیٹے تھے جو امام کی حیات ہی میں انتقال فرما گئے تھے اس لئے آپ کے بعد آپ کے دوسرے بیٹے حضرت موسیٰ کاظم منصب امامت پر فائز ہوئے جس کو ایک گروہ نے تسلیم نہیں کیا اس نے محمد بن اسمعیل کو امام مانا جو محمد المکرم کہے جاتے ہیں۔



سے دوسرے میں منتقل ہوا ہو تو بعد مکانی کا اثر انداز ہونا خارج از فہم نہیں، جیسا کہ نصرانیت یا بدھ مت کے لئے پیش آیا مگر اسلام تو ایک محدود علاقے میں اپنے محور بدل کر گھومتا رہا، اس میں تو اتنے تغیرات ہونا نہ چاہئے تھے، سامنے کا ایک سوال ہے کہ ایسا کیوں اور کیونکر ہوا؟

آنحضرت کی ایک پیشین گوئی مسلمانوں میں مستحق علیہ ہے کہ میری امت میں بہتر فرقہ ہوں گے جن میں ایک فرقہ ملجی ہو گا یعنی صرف وہی فرقہ حضور کی تعلیمات پر عمل کرے گا باقی صراطِ مستقیم سے بہک جائیں گے..... چنانچہ ہر فرقہ دعویٰ دار ہے کہ اس کا مسلک حضور کے ارشادات کے مطابق ہے۔ اگر ان ارشادات کی تحقیق ہو جائے تو غلط اور صحیح کا پتہ چل جائے گا لیکن تحقیق ہو تو کیسے ہو؟ ہر فرقے نے روایات کے مطابق ہی اپنے مذہب کو تشکیل دیا ہے۔

اور روایات اتنی متضاد ہیں کہ جن روایتوں کو ایک فرقہ معتبر کہتا ہے، دوسرا ان کو غیر معتبر قرار دیتا ہے لہذا یہ مسلم ہو جاتا ہے کہ صحیح روایات میں فرضی روایتیں شامل کر دی گئی ہیں۔ اس کے لئے بھی ایک فریق دوسرے کو مہتمم کرتا ہے۔ اہل سنت کا کہنا ہے کہ شیعوں نے روایتیں گڑھ کے مشہور کرا دیں اور جامعین روایات نے انہیں بھی اپنے مجموعوں میں شامل کر لیا لہذا بات یہاں پر ٹھہرتی ہے کہ اصل مجرم وہ ہیں جنہوں نے مقصدی طور پر وضع روایات کی مہم شروع کی اور رسول کی زندگی اور اسلام میں اتنے پہلو پیدا کر دیئے کہ آج ہر صداقت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔

اس کا سراغ اگر کچھ لگ سکتا ہے تو تاریخ کے تدریجی ارتقاء سے اور اس حقیقت تک پہنچ کر کہ روایت سازی سے کس کی اغراض وابستہ تھیں؟ نتیجے پر پہنچنے سے قبل کسی روایت کو جھوٹا قرار نہیں دیا جاسکتا۔

تحقیق کا یہ سلسلہ اس وقت سے شروع کرنا پڑے گا جب آنحضرت نے ایک بوڑھے سامی کی پشت پناہی میں اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا۔ آپ کے ایک پہلو میں سن رسیدہ ہی مگر وقت کی حسین ترین ملکیت العرب تھی، دوسری جانب ایک بچہ

طرف بڑھ رہی تھی اور اس فاطمی خلافت کی داغ بیل پڑ رہی تھی جس نے خلافت عباسیہ کی طرح علوم و فنون کے چراغ روشن کئے۔

اسمعیلی عقیدے کے ذیل میں ایک عقیدہ وہ بھی آتا ہے جس کی تعلیم شیخ الجبل حسن بن صباح نے دی تھی۔ یہ عقیدہ سلسلہ امامت کی ایک منزل پر پہنچ کر اسمعیلیوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ دوسرے نظریات بھی اسمعیلیوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ شیخ عالم ہونے سے زائد فلسفی تھے۔ انہوں نے مانی و مزدک کے افکار کو جزو عقائد بنادیا۔ توحید و رسالت میں انکا عقیدہ شیعوں سے ملتا جلتا ہے مگر علی کی ذات گرامی کے سلسلے میں وہ نصیریوں کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ فی زمانہ ان کے پیرو آغاخانی یا اسمعیلی کہلاتے ہیں۔

ان کے علاوہ بعض فرقے مختلف اوقات میں اور پیدا ہوئے لیکن وہ چل نہ سکے اور اب تو سارے کے سارے فرقوں کے صرف نام ہی رہ گئے ہیں۔ سب آہستہ آہستہ پھر مسلک اثنا عشری اختیار کر چکے ہیں، البتہ اسمعیلی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں جو بوہری کہے جاتے ہیں یا خوجہ جو اپنے کو آغاخانی کہتے ہیں۔

اہل السنۃ و الجماعت میں بھی اکثریت حنفی فقہ کی پابند ہے جو دراصل خالص فقہ حنفی نہیں ہے بلکہ اشعریت اس کا جزو غالب ہے۔ اس کے بعد مالکی اور شافعی فقہوں کے پیرو پائے جاتے ہیں پھر امام احمد بن حنبل کے اہل حدیث اور نوزائیدہ مسلک وہابیت کے مقلد۔ ان کے علاوہ علی محمد باب کے بابی اور بہاؤ الدین کے بہائی بھی کبھی اہل السنۃ تھے مگر اب ان مسالک کے ماننے والے کم ہی رہ گئے ہیں البتہ ایک فرقہ قادیانی نمایاں طور پر موجود ہے جس کو خارج از اسلام قرار دیا جا چکا ہے مگر قادیانی اب بھی اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے ہیں۔

### مسالک فقہ کی فکری بنیادیں

اسلام میں گروہ بندی اور فقہی اختلافات ایک عام آدمی کے لئے تحیر خیز ہیں کیونکہ اس مذہب کے نفاذ کو ابھی صرف چودہ سو سال ہوئے، کسی طویل مدت میں نظریات کا صبح ہو جانا تو عقل میں آسکتا ہے اور اگر کوئی مذہب ایک خطہ ارض

خندق میں عمرو ابن عبدود کی لٹکار پر مسلمانوں نے سانسیں روک لی تھیں کہ عمرو تیز سانس کی آواز سن کر اندر نہ آجائے، مقابلے پر گئے تو علی ہی دوسری جنگوں کی تفصیل بھی ایسی ہی کچھ ہیں جس سے یہ مسلم ہو جاتا ہے کہ شجاعت میں علی کا کوئی ہم سر نہ تھا۔

اب بات آتی ہے علم و فضل کی تو ادوار خلافت اسکی شہادت دیتے ہیں کہ سب کی نظر میں علی کی افضلیت یکساں تھی۔ حضور نے دوسرے صحابہ کی قدر افزائی بھی فرمائی تھی لیکن اس میں کسی کو شک نہ تھا کہ آنحضرت کے بعد علی ہی ان کے جانشین ہوں گے جس کو بدیہی اسباب کی بنا پر ایک حلقہ ماننے کو تیار نہ تھا لہذا پہلے سے اس کی تیاری کر رہا تھا کئی روایتیں ذہنی طور پر تصنیف کر لی گئی تھیں اور ان کے راوی بھی متعین ہو چکے تھے حالانکہ علی کی فضیلت میں جو آیات نازل ہوئیں ان میں سے اکثر پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

آیہ تطہیر، آیہ صالح المؤمنین، آیہ ولایت، آیہ مباہلہ، آیہ نجوی، آیہ اذن واعیہ آیہ اطعام، آیہ بلغ۔

حضورؐ نے جو کچھ فرمایا، وہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی مورخ انکاری نہیں۔

حدیث مدنیہ، حدیث سفینہ۔ حدیث نور، حدیث منزلت، حدیث خیبر، حدیث خندق، حدیث طبر، حدیث ثقلین، حدیث غدیر۔

دوسرے بزرگوں کے شرف میں بھی اسی طرح کے اقوال ملتے ہیں جن کی حقیقت کو تاریخ نے واضح کیا ہے لیکن رسول اکرم کی زندگی میں مورخین کے بیان متواتر سے واضح ہوتا ہے کہ رسول کے فوراً بعد کوئی علی کا شین نہ تھا لہذا فی الوقت دو مفروضہ حدیثوں کو مستقبل کی بنیاد بنایا گیا جن کو اگلی احادیث کا پیش خیمہ کہا جاسکتا ہے۔

ایک میں قائد کا انتخاب شوری کے ذریعہ طے کرنے کی بات ہے، دوسری میں "حدیث توریث" کے ذریعہ اولاد رسول کو وراثت سے محروم کیا گیا ہے۔ اس حدیث کی خصوصیت یہ ہے کہ حدیث اس تحریری مہمہ نامے کی تردید

آپکی انگلی پکڑے ہوئے ہا۔

اس سامی نے سفر و حضر، سوتے جاگتے، اندر باہر ہر جگہ اور ہر طرح پیغمبر اسلام کی حفاظت کی، بالفاظ دیگر اسلام کے لئے اپنی جان و مال، نسلی روابط اور پورا خاندان داؤں پر لگا دیا مگر خود علی الاعلان اسلام قبول نہیں کیا تاکہ قریش منہ کی مروت میں اس پر ہاتھ اٹھا نہ سکیں اور وہ اپنے بھتیجے کا سنیہ سپر بنارہے۔ اس دور اندیشی اور تدبیر کو تقیہ کا نام دیا جاسکتا ہے اور اس کو اس انداز پر بھی سوچا جاسکتا ہے کہ اگر ابوطالب اول دن کھلے بندوں اسلام قبول کر لیتے تو کیا وہ خدمات انجام دے سکتے جو انہوں نے دیں؟ اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اکثر بزرگوں کے آباء کافر تھے لہذا انہیں یہ ضد پیدا ہوئی کہ ابوطالب کو بھی کافر ثابت کیا جائے۔ یہ پہلا جھوٹ ہے جو مقصدی طور پر بولا گیا۔ اس کے خلاف عبداللہ ابن عباس نے شہادت دی کہ مرتے وقت انہوں نے اپنے کانوں سے ابوطالب کو کلمہ طیبہ پڑھتے سنا تھا تو کہہ دیا گیا کہ عبداللہ ابن عباس کا سن بارہ تیرہ سال تھا اس لئے شہادت محتر نہیں..... حالانکہ یہی ابن عباس دور خلافت میں فقہی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں تو ان کے فیصلے کو حرف آخر سمجھ لیا جاتا ہے..... بات یہ ہے کہ ابوطالب کا اسلام اگر تسلیم کر لیا جاتا تو کوئی دوسرا بزرگ مسلم اول ہونے کا دعویٰ کر ہی نہ سکتا۔ اگر مسلمانوں سے یہ سوال کیا جائے کہ کیا ابوطالب کی تجہیز و تکفین اسلام کے طریقے پر نہیں ہوئی؟ تو اس کا جواب ملتا ہے کہ رحمۃ اللعالمین کا کرم تھا۔ اس ہٹ دھرمی کے پس پردہ صرف اس جذبے کی کار فرمائی نظر آتی ہے کہ علی کے باپ کو بھی اپنے باپ کی طرح غیر مسلم قرار دے دیا جائے لہذا یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہیں کہ ابوطالب کے سلسلے کی ہر روایت وضعی اور جھوٹی ہے اس کا راوی کون ہے؟ مورخین جانتے ہیں۔

اس کے بعد حضور کی عملی زندگی میں بیٹے نے باپ کی جگہ لی۔ لوگ کہتے ہیں کہ حضور نے ابوطالب کے احسان کا بدلہ چکایا اور علی کو ہر منزل پر آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس گستاخی کو برداشت کر لیا جائے تو اس کا جواب کیا ہے کہ خیبر میں حضرت ابوبکر بھی جا کر لڑے اور حضرت عمر بھی مگر ہزیمت یاب ہوئے۔

شوری کا خا خسانہ صرف علی کو محروم خلافت کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا تھا کیونکہ ایہا کے بعد یہ اصول ہمیشہ کے لئے پس پشت پڑ گیا۔ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کو نامزد کر دیا اور حضرت عمر نے چند اژد کو اختیار دیدیا کہ وہ کسی کو منتخب کر دیں۔ انہوں نے حضرت عثمان کو چن لیا اور ان کے بعد عوام نے خود حضرت علی کو یہ منصب قبول کرنے کے لئے مجبور کر دیا جنکو حضرت معاویہ نے حکمت عملی سے عالم نماز میں قتل کرادیا اور خلافت پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح مسلمانوں کی بادشاہت ابو سفیان کے خاندان میں منتقل ہو گئی انہوں نے روایت سازی کے سلسلے میں جو کار نمایاں انجام دیے ہیں وہ ثبوت کے محتاج نہیں۔ متعصب مورخ کو بھی اعتراف ہے کہ آیات کی غلط تفسیر، احادیث کی تنسیخ و تصنیف پر ایک دینار فی حدیث مقرر تھا اور اہل بیت کے خلاف روایت بیان کرنے پر انعام و اکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔ یہ حدیثیں اصل حدیثوں سے ٹکر لیتی ہیں۔ اس طرح برسوں کی مسلسل جدوجہد میں ہزاروں احادیث کا ذخیرہ ہو گیا مسلمانوں کی تاریخ بھی مرتب ہوئی اور وہ مسالک فقہ تشکیل پائے جو ہمیشہ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہیں گے۔

جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے، ان کا شیرازہ ادوار خلافت سے بکھرنا شروع ہوا تو کوئی ربدہ میں، کوئی مدائن میں، کوئی دمشق میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا اور حضرت معاویہ کے عہد سے تو ان پر عرصہ حیات ہی تنگ ہو گیا۔ ان کے لئے حقیقی احادیث کا محفوظ رکھنا ہی مشکل تھا تو وہ جھوٹی روایتیں کس طرح گڑھتے اور انہیں ضرورت بھی کیا تھی اللہ مدح علی میں غلو کر سکتے تھے تو زبان کس جگہ کھولتے؟ منظر عام پر آتے تو جان سے ہاتھ دھوتے۔ ایک کام شیعوں نے ضرور کیا کہ سردار اور قیدی خانوں میں شنائے اہل بیت کرتے رہے مگر اس میں بھی حق شفاء ادا نہ کر سکے کیونکہ زبان کھلتے ہی انہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں ایک نکتہ اور قابل غور ہے کہ جامعین میں بیشتر بزرگوں نے تو شیعہ راویوں سے احادیث کو لیا ہی نہیں اور جنہوں نے ان کی روایتوں کو نقل کر دیا ہے، انہیں غیر معتبر کہہ دیا جاتا ہے لہذا روایت سازی میں شیعوں کو

کرتی ہے جو باغ فدک کے سلسلے میں حضور نے اپنی بیٹی فاطمہ زہرا کو لکھ کر دیا تھا اور جس پر بعض صحابہ کی قلمی شہادتیں بھی تھیں۔ گویا آنحضرت نے پہلے تو بیٹی کو ہمہ نامہ لکھ دیا پھر عائشہ کی موجودگی میں حضرت ابو بکر سے کہہ دیا کہ انبیاء کی میراث اس کی اولاد کو نہیں ملتی..... ہم جس پیغمبر کو مانتے ہیں، وہ کبھی دورغ مصلحت امیر کا مرتکب بھی نہیں ہو سکتا۔ نعوذ باللہ!

پہلی حدیث عرب کے رسم و رواج کے مطابق ہے کہ قبیلے کی قیادت کے لئے بزرگ افراد اپنے لائق اور بزرگ ترین فرد کو منتخب کرتے تھے۔ اس وضعی حدیث پر عمل کرنے کے لئے پہلی بیوفائی اور گستاخی یہ کی گئی کہ رسول کی میت چھوڑ کر انتخاب کے لئے چلے گئے۔ کل تک جو لوگ مقرب ترین تھے ان سے مشورہ تو درکنار منہ تک نہ چھوا، دوسری چالاکی یہ کی گئی کہ رسول کے قبیلے کو انتخاب میں شرکت کا موقع نہیں دیا گیا کہ ان لوگوں کے جانے سے منصوبہ کہیں الٹ نہ جائے بنی ہاشم اپنے سردار اور پیغمبر کو بے گور و کفن چھوڑ نہ سکتے، یہ سب کو معلوم تھا لہذا حضور کی حالت غراب ہوتے ہی سارے انتظامات کر لئے گئے تاکہ آپ کی رحلت ہوتے ہی اپنا کام کر لیا جائے۔

حدیث توریث کا علم صرف ابو بکر کو تھا، حضرت عمر کو بھی نہ تھا، ان سے روایت ہے۔

”جب ابو بکر نے اس حدیث کا ذکر کیا تو علی اور عباس نے ان کو جھوٹا،

گنہگار اور خائن ٹھہرایا۔“ (۹)

صحیح مسلم کی یہ روایت کسی شیعہ کی گڑھی ہوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب آل فاطمہ کا دور ابتلاء شروع ہو چکا تھا اور اسی مقصد کے لئے حدیث کی تصنیف بھی کی گئی تھی۔ اس کے بعد یا تو علی اور عباس کو دروغ گو ٹھہرایا جائے یا حدیث کو وضعی قرار دیا جائے۔ حدیث کے وضعی ہونے کے ثبوت میں حضرت عثمان، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور بعض خلفائے بنی عباس کو پیش کیا جاسکتا ہے جن کا عمل باغ فدک کے سلسلے میں حضرت ابو بکر کے عمل کی نقیض ہے۔ ان حالات میں یہ فیصلہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ وضعی احادیث کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا؟

اہمیت حاصل نہیں لہذا صرف خلافت کے ماننے نہ ماننے پر نجات اخروی کا انحصار نہیں ہو سکتا اور اگر یہ بات اتنی ہی اہم ہے تو بنی امیہ کے ستر ہزار منبروں سے علیؑ پر تبرا کرانے والے کے خلاف کوئی فتویٰ دینا بڑے گاکہ وہ جہنمی ہے یا جنتی؟

### تاریخ کی شہادت میں تبرا کارواج

”حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ہم لوگ یعنی انصار منافقوں کو حضرت علیؑ کے بغض سے پہچانتے تھے۔“

”حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسول خدا کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا کہ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ مجھ پر اور جو کچھ میں لایا ہوں اس پر لمان رکھتا ہے درحالیکہ وہ علیؑ سے بغض رکھتا ہے، تو ایسا شخص جھوٹا ہے، ہرگز مومن نہیں ہے۔“

حضرت علیؑ سے منافق محبت نہیں کرے گا اور مومن بغض نہیں رکھے گا (امام احمد بن حنبل)

تبرائ بنی امیہ کے بیشتر خلفاء نے جاری رکھا پھر دور بنی عباس میں بھی اکثر اس کا اعادہ کیا جاتا رہا۔ کیا بگاڑا تھا علیؑ نے ان سیاہ قلب فرمانرواؤں کا، یہی ناکہ انہیں اس تحلی کی حماد میں چلانا چاہتے تھے جس نے پہلی بار غار حرا کو منور کیا تھا..... اظہار بیزاری بنی عباس کے بعد سلجوقیوں، ایوبیوں اور غزنویوں میں کیا جاتا رہا۔ تاریخ نے شہاب الدین غوری کے فخریہ الفاظ لوح زمانہ پر ثبت کر دیے ہیں کہ غور میں کبھی علیؑ اور اولاد علیؑ پر تبرا نہیں کیا گیا۔

سلاطین مابعد نے اس میں اتنی تبدیلی کر دی کہ علیؑ کے بجائے علی کے پیروں کے نام لینے لگے۔ تبرائی محفلوں میں ایک شخص منبر پر جاتا اور آواز لگاتا: ”فلاں ابن فلاں رافضی بود!“ حاضرین جواب دیتے: ”بر پدرش لعنت!“

صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں اور علیؑ کے غلام یہ سب دیکھتے سنتے رہے۔ آخر وہ وقت بھی آیا کہ انتزاع سلطنت عباسیہ پر جہاں مختلف حصوں میں جداگانہ سلطنتیں قائم ہوئیں، وہاں ایشیا و افریقہ میں بعض چھوٹی بڑی شیعہ حکومتیں بھی وجود میں آئیں۔

حصہ دار بنانا انتہائی بڑا قلم ہے جو چودہ سو برس تک ان پر روار کھا گیا ہے۔ عدل و انصاف شاید دنیا سے اٹھ ہی گیا ہے کہ ماضی کی تاریخ بھی شیعوں کے خون سے رنگین کی جاتی رہی اور اب لپٹے ہی خون کا الزام بھی انہیں کے سر رکھا جاتا ہے۔ روایتیں جس کے خلاف گڑھی گئیں، واضح روایات بھی انہیں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ پہلے اقتدار کی ہوس نے دین اور حامیان دین کا خون کیا، اب اکثریت کا زعم عزت کی موت سے ڈراتا ہے۔ تخت سلطنت پر متمکن جابر بادشاہوں نے اگر ستم کے پہاڑ توڑے تو انہیں حکومت ملی لیکن حکومتوں کی پروردہ نسلیں کیوں لپٹے کو ظالموں کی اولاد ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں؟

اسلام کی تاریخ سے کسی کو ذرا بھی مس ہوگا تو وہ تسلیم کرے گا کہ رسول اکرم کے بعد ان کی اولاد جو روقلم کا شکار ہوتی رہی۔ ہم انہیں مظلوموں کے نام لیوا ہیں، اکثریت ہمیں ستاتی رہی تو ماضی کے ظالموں میں اس کا شمار ہوگا۔ رہ گئی بات ہمارے عقائد کی تو خلافت کا قصہ ایک گئی گزری بات ہے۔ اس کو کیوں چھیدا جائے جو ہم سچی بات کہہ دیں۔ ہتھیہ ہوگا کہ مذہبی مسائل میں پہلے حنفیت، مالکیت، شافعییت، حنبلیت، اشعریت اور وہابیت آپس میں فیصلے کر لے، توحید، رسالت اور قرآن کی بابت اپنے نظریات کو ہم آہنگ بنالے، تب ہم پر معترض ہو۔ شیعوں کا مسلک شروع ہی سے واضح ہے۔ اس میں کوئی ترمیم و اضافہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہونا ممکن ہے وہ لوگ جو شیعہ دشمنی میں تو متحد ہیں لیکن ان کے درمیان نہ توحید مشترک ہے، نہ شخصیت رسول کی نوعیت، نہ قرآن کی حیثیت و مفہوم، وہ شیعوں پر کس منہ سے اعتراض کرتے ہیں۔ کیا خلافت اسلام کی ان بنیادی چیزوں سے زیادہ اہم ہے کہ خدا، محمد مصطفیٰ اور کلام الہی کو مجروح کرنے والا تو قابل معافی ہے اور خلافت کا منکر گردن زدنی۔ دعوت عام ہے احتاف ذوی الاحترام کے لئے کہ ہر مسلک کے خدا اور رسول کی معرفت حاصل کریں۔ انہیں خود پتہ چل جائے گا کہ کس کا عقیدہ کیا ہے؟ اور یہی عقیدہ فرقہ ملیح کا فیصلہ بھی کر دے گا۔

امامت شیعوں کے اصول دین میں ہے، سنیوں میں خلافت کو کوئی خاص

مشورہ دیا کہ صرف معاویہ کے نام کی تصریح کی جائے اور ان کے نام کے بعد  
 - والظالمین لآل محمد - یعنی آل محمد پر قلم کرنے والوں کا فقرہ بڑھا دیا جائے۔  
 معزالدولہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ غالباً تبراک اس منافقانہ شکل کی ابتداء اسی  
 سے ہوتی ہے۔" (۱۱)

شاہ معین الدین ندوی نے اس کو "منافقانہ شکل کی ابتداء لکھا ہے لیکن وہ  
 بھول گئے کہ یہ منافقانہ شکل صدیوں پہلے سے پائی جاتی تھی اور اس کو منافقین  
 اول کی ممتاز فرد ابو سفیان کے بیٹے نے تشکیل دیا تھا جس کی جوابی ابتداء معزالدولہ  
 نے کی، دوسرے اس کی تقلید کرتے رہے، خود شاہ ندوی اپنی تاریخ میں لکھ کر  
 بھول گئے "امیر معاویہ نے اپنے زمانے میں برسر منبر حضرت علی پر سب و شتم کی  
 مذموم رسم جاری کی تھی اور ان کے تمام عمال اس رسم کو ادا کرتے تھے۔" (۱۲)  
 فاضل مورخ کا بنی بودہہ پر یہ الزام کھلے ہوئے تعصب پر مبنی ہے۔  
 معزالدولہ سے شیعوں کو صرف یہ فائدہ پہنچا تھا کہ ان پر قلم و ستم بند ہو گیا تھا اور  
 انہیں مذہبی آزادی مل گئی تھی لیکن اتنی ہی آزادی سنیوں کو بھی حاصل رہی اور  
 جب دونوں میں لڑائی ہوئی تو حکومت نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔

دو طرفہ تبراسو ڈنڈہ سو برس تک ہوتا رہا پہلا مصرعہ کچھ دنوں بعد اپنے  
 محبوب صحابہ کو بچانے کے لئے حذف ہو گیا اور تھوڑے عرصے تک صرف دوسرا  
 مصرعہ ہی پڑھا جاتا رہا اور جب مسلمان اقتدار سے بالکل محروم ہو گئے تو دوسرا  
 مصرعہ بھی بند ہو گیا۔

پچھلی صدی سے یہ تبراسو طرح شروع کیا گیا ہے کہ رسول کے پارہ ہائے  
 جگر پر کچڑا چھالی جا رہی ہے۔ مشرکوں اور بے دینوں کے اعمال کو عین اسلام قرار  
 دیا جا رہا ہے لہذا ضرورت ہے تاریخ کی وہ تصویر دکھانے کی جس سے خیر و شر کے  
 خال و خد واضح ہو سکیں تاکہ ہماری جوان نسل اپنے ماضی سے نا آشنا نہ رہے۔

تاریخ کے تدربچی ارتقاء پر ایک اچھٹی نظر ڈالی جائے تو ہر منزل پر الٹا چور  
 کو توال کو ڈانٹتا نظر آتا ہے۔ سقیفہ میں جو کچھ ہوا، اگر اتنے ہی پر اکتفاء کی جاتی تو  
 عرب کے بوریہ نشین پیغمبر کی اولاد صبر و شکر کے ساتھ رشد و ہدایت کی فیض

شیعوں کے ضبط کا ہیما نہ ہر عہد میں چمکتا رہا تھا مگر انہیں مجبوری تبراک کی  
 آوازیں سننا پڑی تھیں۔ اب جو اظہار خیال کی آزادی ملی تو انہوں نے بھی نام بدل  
 بدل کر تبراخوانوں کی آوازوں میں آوازیں ملا دیں اور ان کی آواز بازگشت اطراف  
 و جوانب میں سنائی دینے لگی۔

تقریباً چار سو سال تک صرف ایک مصرعہ پڑھا گیا تھا، اس پر دوسرا مصرعہ  
 لگا تو شعریت پیدا ہو گئی اور سامعین پھڑک اٹھے۔ اب شیعوں پر ہتک صحابہ کا  
 الزام بھی لگا دیا گیا۔ گویا ان صحابہ کی قیمت تھی اور علی کی کوئی قیمت نہ تھی۔

شام کی حدود مملکت میں حضرت علی پر تبرا ہونے کا تذکرہ بیشتر مورخین  
 نے کیا ہے۔ اسی لئے امام حسن نے معاویہ سے صلح کی شرائط میں یہ شرط رکھی تھی کہ  
 آئندہ حضرت علی پر سب و شتم نہ کیا جائے گا لیکن حضرت معاویہ نے عمل اس کے  
 بالکل برعکس کیا اور علی سے بدعت کو اپنی بیعت کا جزو بنایا۔ اس پر بنی تسم کے  
 ایک شخص نے کہا۔

"امیر المؤمنین! ہم زندوں کی اطاعت کریں گے مگر مردوں سے برأت نہیں  
 کریں گے۔"

"اس پر معاویہ زیاد کی طرف متوجہ ہوا اور بولا، "اس شخص کو اچھائی کی  
 وصیت کر۔" (۱۳)

چنانچہ اس کو زیاد نے اسی وقت قتل کر دیا تاریخ کی روشنی میں وقت کی  
 تدربچی ترقی کے ساتھ جب صحیح معنی میں پہلی شیعہ حکومت قائم ہوئی تو معزالدولہ  
 نے خلفاء کی قوت ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں شیعیت کی تبلیغ شروع کر دی  
 اور ۳۵۱ھ میں بغداد کی جامع مسجد کے پھانک پر لکھوا دیا۔

"معاویہ بن ابی سفیان، غاصبین فدک، امام حسن رضی اللہ عنہ کو روضہ  
 نبوی میں دفن کرنے سے روکنے والوں، حضرت ابوذر کو جلا وطن کرنے والوں،  
 عباس کو شوریٰ سے خارج کرنے والوں پر لعنت ہو۔"

"خلیفہ میں اس بدعت کو روکنے کی طاقت نہ تھی، کسی سنی نے رات کو یہ  
 عبارت مٹا دی۔ معزالدولہ نے پھر لکھوانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے وزیر مہلبی نے



اصل منابع کو دیکھنے نہ پائیں لہذا پہلے تو ان سب کو رستے سے ہٹا دیا پھر ان پر تبرا شروع کرا دیا تاکہ شام و عراق کے انجان مسلمان غلط فہمی میں پڑے رہیں کہ یہ لوگ اتنے برے تھے تب ہی تو ان پر لعنت کی جاتی ہے۔

ان حقائق کو اکثر قدیم مورخوں نے قلم بند کیا ہے لیکن اس صدی کے تاریخ نگار جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو چھ سو برس تک ہونے والے اس شرعی قلم کو چھپا جاتے ہیں تاکہ ان دشمنان اسلام کو مسلم ثابت کر سکیں۔

شاہ معین الدین ندوی نے تو یہ بھی غضب ڈھایا کہ صلح حسن کی آٹھ نو شرطوں میں سے صرف تین کو لکھا کیونکہ ساری شرائط لکھتے تو تبرانہ کرنے کی شرط بھی لکھنا پڑتی..... یہ عوام کو انجان رکھنے کی وہی پالیسی ہے جس کی حیثیت پہلے سیاسی پتھر کی ہے۔

کیا حضرت علیؑ اور ان کی اولاد اطہار کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والے درگزر کے لائق ہیں اور اگر کوئی اس کے بعد بھی علیؑ کے ان دشمنوں کی قصیدہ خوانی کرتا ہے تو کیا اس کو علیؑ کا نام لینے کا حق رہ جاتا ہے۔ یقیناً وہ بھی علیؑ کا دشمن قرار پائے گا اور علیؑ کے دشمن کے لئے حضورؐ کی جو حدیث ہے، وہ اس پر صادق آنے کی تہرا سننے والے سنتے رہے اور اس کی آواز تاریخ میں گونجتی رہی مگر جب شیعوں نے اسی لب و لہجہ میں طبع آزمائی کی تو بدعت کے فتاوے صادر ہونے لگے۔ کیا چار سو سال تک یہ بدعت داخل ثواب تھی جو مفتیوں کے منہ کھل نہ سکے۔ اب شیعہ بولے تو سب جہنم پڑے۔

مکاتیب فقہ کی تاریخ کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ شیعہ فقہ اور شیعیان علیؑ پہلے روز سے موجود تھے اور دو سو برس تک تعداد سے قطع نظر مسلمانوں میں صرف دو گروہ پائے جاتے تھے، ایک علیؑ کا دوست، دوسرا علیؑ کا دشمن۔ مور ہر دو صورت میں علیؑ ہی تھے۔ قلم و ستم کے دھارے میں شیعوں کی تعداد تو نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی لیکن شیرازہ بندی اور اصول و فروع فقہ پر کوئی حرف نہیں آیا کیونکہ ہر زمانے میں شیعوں کا امام موجود تھا جس کو ارباب سیاست نے محسوس کیا تو مقابلے کی فقہ اور امام دونوں بناوٹے اور اہل سنت و جماعت کو تشکیل کر کے

رسانی کر کے اپنی تسلیں گزارتی رہتی اور شاید دنیا کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ فرمانروائی کی وراثت کس نے چھینی اور سجادہ نبوت کی نمائندگی کا اعزاز کس کو ملا؟ لیکن ستم یہ ڈھایا گیا کہ بزدلوں کو بہادر، جھوٹوں کو سچا اور منافقوں کو کھرا مسلمان ثابت کرنے کے لئے قلم کا دروازہ کھول دیا گیا اور جب خلافت مدینے سے دمشق اور بغداد منتقل ہو گئی تو صادقین کا قتل عام معمول بن گیا۔

عوام آج کی طرح شروع ہی سے ان پڑھ اور کانوں کے کچے رہے ہیں اور ان کا حافظہ ہمیشہ کمزور پایا گیا ہے۔ یہ راز گنبد اسلام کے نام نہاد پروہتوں کو معلوم تھا لہذا اول دن سے ایک پالیسی اختیار کی گئی کہ صرف سامنے کی باتیں عام لوگوں کو بتائی جائیں رنگ بھری ہوئی تصویر منظر عام پر لائی جائے، اصلی خال و خد کسی کے سامنے آنے نہ پائیں۔ اس پالیسی پر آج تک عمل ہو رہا ہے اور اپنے محبوب کرداروں کو بدلی ہوئی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی قلم کا ذمہ دار مظلوم کو، قتل کا سزاوار مقتول کو ٹھہرایا جاتا تھا اور آج بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ ہر مورخ پہلے تو حالات کو سمجھ کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر بن نہیں پڑتا تو لکھ دیتا ہے کہ مزید جب جنگی تلوار لئے گھوم رہا تھا تو امام حسینؑ اس کے سامنے گئے کیوں؟ واقعہ حرہ کے سلسلے میں شاہ معین الدین ندوی لکھتے ہیں۔

”مدینتہ الرسول کی تباہی یزید کا سب سے سیاہ کارنامہ ہے لیکن اس کی ذمہ داری سے اہل مدینہ بھی بری نہ تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ انکی مخالفت کا انجام یہی ہو گا اگر ابتداء سے وہ بیعت کر لیتے تو اس کی نوبت نہ آتی۔“ (۱۳)

اس سے ایک تو خلافت کی قیمت، دوسرے بیعت کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے اور سب سے اہم نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ خلیفہ یزید ہو یا اس سے بھی برا ابوبہب کا سا کوئی بھی، اگر اس کی طرف سے جان و مال کے خطرات ہوں تو صداقت کا راستہ چھوڑ دینا چاہئے یا پھر تقیہ کر لینا چاہئے۔

بات تھی مسلمانوں کے قائدانہ انداز کی کہ وہ عوام کو تاریکی میں رکھ کر بقائے حکومت کی تدابیر کر رہے تھے۔ مقصد صرف اتنا تھا کہ لوگ روشنی کے

## پیغمبری یا فرمانروائی

مورخین نے حضور سرور کائنات کی شخصیت کے مختلف پہلو متعین کئے ہیں ایک بحیثیت پیغمبر، دوسرے فرمانروا، تیسرے بحیثیت سپہ سالار وغیرہ۔  
تدبر، اصلاح معاشرہ اور تبلیغ انسانیت پیغمبرانہ شخصیت کے ذیلی محاسن ہیں، فرماں روائی بھی اس کا ایک رخ قرار پاتی ہے لیکن اس میں دنیاوی سیاست کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کی نوعیت بالکل الگ ہو جاتی ہے اور وہ ہوس اقتدار اور ملک گیری کی تابع ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں شروع ہی سے مسلمانوں کے دو نظریے رہے ہیں۔ ایک اسلام کو خالص روحانی مذہب قرار دیتا ہے اور تشکیل مملکت کو اشاعت مذہب کی ناگزیر ضرورت سمجھتا ہے، دوسرا اس کو خالص سیاسی مذہب۔ یہ دونوں نظریے رسول کی حیات طیبہ سے ذہنوں میں پرورش پا رہے تھے اور حضور کی آنکھ بند ہوتے ہی کھل کر سامنے آ گئے۔

سپہ سالار اور اس طرح کی دوسری حیثیتیں ہوس فرمانروائی کا شاخسانہ ہیں مگر اس سے حضور کی صلاحیت ذات پر روشنی پڑتی ہے اور آپ کی پیغمبرانہ بصیرت کا حسن بھی جاسکتی ہے۔

اس طرح ضمنی تفصیلات کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام کی صرف ایک انسانی حیثیت رہ جاتی ہے اور وہ ہے فرمانروائی کی۔ جس کو صحیح معنی میں تبلیغ دین کا مقصدی لوازم قرار دینا بے محل نہ ہوگا۔

غزوات نبوی دو غیر متوازن یا کسی حد تک متوازن طاقتوں کے معرکے تھے جو بغض اسلام کے سبب وقوع میں آئے تھے۔ اس میں کی ہر جنگ بانی اسلام پر مسلط کی گئی تھی اور آپ نے ہر جنگ میں اسلام کو بچانے کے لئے تلوار اٹھائی، از خود کسی بے خطر اور مستعد گروہ پر حملہ نہیں کیا تھا۔ لہذا پیروان اسلام کے

مقابلہ لاکھڑا کیا۔

اس کے بعد کوئی ہم کو جھوٹا کہے تو اس کو سوچنا چاہئے کہ آنحضرت سے مامون کے دور تک ہم جو کہتے آئے تھے، کیا اب اس کے علاوہ کچھ کہتے ہیں؟ اس کے برعکس دور بنی امیہ میں جہم بن صفوان نے کیا کہا، عہد عباسیہ میں واصل بن عطا کے نظریات کیا تھے اور پھر حکومت ساز امام اعظم کے ارشادات قابل غور ہیں لیکن موخر الذکر دو سے ہمارے اختلافات اتنے شدید نہ تھے، جتنے آگے چل کر الاشعری اور امام احمد بن حنبل کی تنبیغات و ترمیمات سے ہوئے۔ گویا ان بزرگوں سے قبل نظریات احتلاف صحیح نہیں تھے اور وہ بھی ہماری ہی تعریف میں آتے تھے۔  
اور وہابی مسلک کے بعد تو شیعہ بھی جھوٹے اور سنی بھی جھوٹے۔

لوگ سنیوں کو بڑا بھائی کہتے ہیں جو غلط ہے، وہ شیعوں سے ٹٹھ سو برس چھوٹے ہیں اور وہابی ایک ہزار سال چھوٹے۔ یہ اور بات ہے کہ وہابیوں نے ہم دونوں کے نظریات توحید، اعتقاد رسالت اور دوسرے ہر موقف کو باطل قرار دیدیا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اسلام سے یا ان کا رشتہ ہے یا ہمارا کیونکہ اتنے تضادات کی موجودگی میں دونوں کو صراط مستقیم پر تو کہا نہیں جاسکتا۔

مذہب امامیہ، حنفیہ، مالکیہ، اور شافعیہ بالترتیب افکار قدیمہ کے حامل ہیں۔ ان میں فقہ امامیہ پونے دو سو سال زیادہ پرانی ہے۔ ان سب نے توحید، رسالت اور قرآن کے بارے میں جو نظریات پیش کئے ہیں، وہابیت ان سب کی تردید کرتی ہے جو محققین سلف کے لئے ایک لنگار ہے۔ بالفاظ دیگر ہزار گیارہ سو برس تک مسلمان جس خدا کو اور جس رسول کو مانتے رہے، وہ غلط تھا۔ اتنی طویل مدت کے بعد ایک شخص ان حقائق کو سمجھ سکا۔ جس کی تہہ تک صدیوں کی بساط پر پھیلے ہوئے جمید عالم پہنچ نہ سکے۔ ان میں حاملان علم لدنی ہمارے آئمہ بھی تھے، فاضلان روزگار علماء بھی اور یگانہ عصر فقہا بھی۔

ابن رشد اور ابن عربی وغیرہ ان کے علاوہ ہیں اور عظیم المرتبت صوفیاء ان پر مستزاد ہیں۔ فکری اور تاریخی تحقیق کا یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہا تو خدا مادیت کے سانچے میں ڈھل جائے گا اور یزید پیغمبری کی سطح کو چھونے لگے گا۔

لئے لڑائی کی شرط اولین یہ قرار پائی کہ مقابلہ صرف اس وقت کرنا چاہئے جب مذہب پر آج آرہی ہو۔ اسی اصول پر جانشین پیغمبر علی ابن ابی طالب اور ان کی برگزیدہ اولاد نے پیغمبر کا استعمال صرف اس وقت کیا جب اسلام نے انہیں اپنے تحفظ کی دعوت دی۔

یہی سنت آج تک پیروان علی کا لائحہ عمل رہی ہے۔

### ایک پیغمبر! ایک فرمان روا!

یہ دو حیثیتیں اگرچہ ایک دوسرے کا جزو لاینفک رہی ہیں لیکن مادی آنکھ سے جب فرمانروائی تو دیکھا گیا تو ابو سفیان حضرت عباس سے کہے بغیر نہ رہا۔ "تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بہت عظیم ہو گئی ہے!"

"یہ بادشاہت نہیں پیغمبری ہے۔" حضرت عباس نے ایک تہدید آمیز جواب دیا جس میں حضرت ابو طالب کے لب و لہجہ کی کھنک تھی۔ ابو سفیان نے ابو طالب کی لکار بار بار سنی تھی مگر کبھی سر نہیں جھکایا تھا، آج اطاعت قبول کر لی کیونکہ اب پیغمبری کے ساتھ فرمانروائی بھی شامل تھی۔ ابو طالب کی سرپرستی میں جو دعوت اسلام دی جاتی رہی تھی، اس میں صرف دین کی چمک تھی، کوئی دنیاوی جاہ و جلال نہ تھا، آج وقت کے ماتھے پر محکومیت کے بجائے حاکمیت کی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں جو العرب الجاہلیہ کے مدبر کی نگاہ سے چھپی نہ رہیں اور اس نے سر اطاعت خم کر دیا۔

ابو سفیان کا قبول اسلام خلوص سے خالی تھا۔ اس میں بے چارگی اور مصلحت اندیشی کے سوا کچھ نہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے پیغمبری کے بجائے فرمانروائی کا طوق اپنے گلے میں ڈالا تھا جو مستقبل میں دمشق کے تاج و تخت کی زینت بنا۔

اس طرح روایتی عرب کے دو نمائندہ کرداروں نے دو جداگانہ حیثیتوں سے ہادی اسلام کے سامنے گردنوں کو جھکا دیا۔ ایک نے پیغمبری کی خاموش تائید کر کے دوسرے نے برائے نام کلمہ پڑھ کر بلکہ ایک نے پیغمبر مان کر اور دوسرے نے

ریگزار کا فرمانروا سمجھ کر۔ یہی دو کردار جو ابو طالب اور ابو سفیان کے ناموں سے موسوم تھے، اسلام کے تاریخ ساز کہے جاسکتے ہیں۔

پیغمبر کی حیات طیبہ ہی میں ذہنی طور پر دونوں قسم کے کردار دانستہ یا نادانستہ طور پر پرورش پاتے رہے اور دور رسالت ختم ہوتے ہی کھل کر سامنے آگئے۔ ایک نے ابو طالب کی تاسی کی، دوسرے نے فرمانروائی پر قبضہ کر لیا اور پیغمبر کی سیرت و کردار سے، چونکہ اس کا کوئی تعلق نہ تھا لہذا اس نے خود اپنی سیرت کو سیرت پیغمبر کا نام دیدیا اور اس کا نام اسلام رکھا۔

اس اسلام کو اساس بنانا آسان نہ تھا کیونکہ دور نبوی کے برگزیدہ اصحاب زندہ تھے لہذا ایک اقدام تو یہ کیا گیا کہ ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جو جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی جرأت کر سکتے، باقی لوگوں کو غریب لیا گیا۔ دوسرا اہم قدم یہ اٹھایا گیا کہ ارشادات پیغمبر کو مسخ کرنے کی مہم شروع کر دی گئی اور وضعی اسلام کی تائید میں اتنی حدیثیں گڑھی گئیں کہ اصل اقوال مشتبہ نظر آنے لگے جن کی تصاویر آج کے مجموعہ احادیث میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

ان ریشہ دوانیوں کا ایک اجمالی خاکہ "ہمارے عقائد : ہماری تاریخ" میں پیش کیا جا چکا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وفات ختمی مرتبت کے بعد مسلمانوں کے دو نمایاں گروہ سامنے آگئے: ایک گروہ سیرت پیغمبر کے ورثہ داروں کا، ہمنوا، دوسرا وہ جس کے دنیاوی مفادات حکومت کے ساتھ تھے۔

"سقیفہ بنی ساعدہ" میں ساٹھ ستر یا زائد سے زائد سو آدمیوں کا ایک طرفہ فیصلہ ریگزار کی پوری قوم کے مستقبل پر مہر لگانا سکتا جبکہ یہ لوگ مختار مجاز یا نمائندے بھی نہ تھے لیکن مشکل یہ آہڑی تھی کہ حضرت رسالت مآب کا جانشین اقتدار کے لئے تلوار بھی اٹھانے سکتا جس کے بہت سے اسباب تھے۔ ان اسباب کو امیر المومنین نے مختلف مواقع پر واضح کیا ہے۔ ایک بدیہی بات یقینی طور پر یہ سامنے آتی ہے کہ شکست خوردہ عنصر اسلام سے روگردان ہو جاتا۔ وہ گروہ، جو خود پیغمبر کی میت کو پیٹھ دکھا کر چلا آیا تھا، وہ اقتدار سے محرومی کے بعد تعلیمات پیغمبر کی پرواہ کیا کرتا۔ پھر خانہ جنگی کا ایک حاصل یہ بھی ہو سکتا کہ کہنے والے حکمرانی کو

کار نامہ ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مسلمانوں کی تاریخ کا خونچکان باب ہے۔  
اب دمشق کی خلافت مدینے کی دینی اجارہ داری سے آزاد ہو چکی تھی۔  
اسلام پر امویت غالب آچکی تھی۔ دارالفتاویٰ شام کے اسلحہ خانے کا ایک جزو تھا۔  
مدینے میں اولاد رسول پر عرصہ حیات تنگ تھا۔ علی کا نام لینا گردن زدنی تھا۔ نام  
لیا جاتا تو حکومت کے منبروں پر سب دشتم کے لئے۔ کوفہ، بصرہ اور دمشق میں  
محبان علی کا خون اریاں تھا جس کسی پر اہل بیت کی دوستی کا شبہ بھی ہوتا اس کو  
دار پر چڑھا دیا جاتا۔ کوئی علی، حسن اور حسین کے ناموں پر بچوں کے نام نہ رکھ  
سکتا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ نام نہاد مملکت اسلامیہ اولاد رسول اور اس کے ماننے  
والوں سے خالی ہو چکی تھی۔ اہل لیمان یا تو تقیہ چلے گئے تھے یا دور دراز قبائل میں  
جا بے تھے۔

پھر کر بلا کے بعد اہل بیت کی اسیری نے خواہیدہ حمیت اسلامی کو جھنجھوڑ کر  
رکھ دیا۔ انتقام کی ایک ہراٹھی اور عین الورہ میں محبان اہلبیت کے خون کی  
ندیاں بہہ گئیں لیکن انتقام کی دوسری کروٹ نے افتار ابن ابی عبیدہ ثقفی کو  
کامیابی سے ہمکنار کیا اور قاتلان کر بلا چن چن کر قتل کر دیئے گئے۔

حضرت علی ابن ابی طالب کے نقش قدم پر چلنے والے ائمہ حصول اقتدار کی  
خاطر تلوار اٹھانے کے قائل نہ تھے لیکن امام حسین علیہ السلام نے کر بلا میں ایک  
نظیر پیش کر کے اس نکتہ کی صراحت کی کہ اسلام پر آنچ آتی ہو تو جہاد باللسان فرض  
عین بن جاتا ہے اور رسن بستہ ہو کر تہ تیغ ہو جانا ہی جہاد نہیں بلکہ انجام سے بے  
نیاز ہو کر اسلام دشمن طاقتوں سے ٹکرانا بھی لیمان کا راستہ ہے۔

اس نظیر نے محبان علی کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی روانی کو تیز کر  
دیا تھا اور مظلوموں کے انداز فکر میں یہ تبدیلی آگئی تھی کہ باطل کی لٹاکار کا جواب  
میدان جنگ میں سرفروشی سے دینا بھی آئمہ کی تاسی ہے۔ امام وقت کی طرف سے  
اس کی اجازت ملنا ممکن نہ تھا کیونکہ اس کے پس پردہ استعمار حکومت کا مقصد دھکا  
چھپانہ رہتا اس لئے سب سے پہلے حضرت محمد حنفیہ کا سہارا لیا گیا اور مختار نے  
میدان میں آکر اولاد رسول کے قاتلوں سے انتقام لے کر امام زین العابدین کی

مقصود پیغمبری قرار دے دیتے اس لئے حضور اکرم کی ذات گرامی کو جس نے جیسا  
سمجھا تھا، اس نے اسی پر اکتفاء کی۔ ایک تبلیغ و اشاعت اسلام میں لگ گیا،  
دوسرے نے حکومت کی باگ ڈور لےنے ہاتھ میں لے لی لیکن دوسرا گروہ مسائل  
دینی میں پہلے کا محتاج رہا۔

یہ صورت حال تاریخ اسلام کا سب سے بڑا المیہ ہے جس کی واضح تصویر  
جنگ صفین میں نظر آتی ہے: ایک طرف صنادید عرب کے نمائندے کا بیٹا معاویہ  
بن ابی سفیان حرص و آڑ کے حواریوں کو لئے ہوئے، جبر و تشدد کے پرچم اڑاتا ہوا  
آگے بڑھتا نظر آتا ہے، دوسری طرف کلید بردار کعبہ اور پشت پناہ محمد کا جانشین علی  
ابن ابی طالب، جس کے جلو میں نبی کے مقدس صحابی عمار یاسر، ابوایوب انصاری  
عدی بن حاتم، حجر بن عدی اور ان سب کے ساتھ کہن سال اویس قرنی نشان اسلام  
کے سائے میں علامت لیمان کے طور پر فروکش ہیں۔

میزان جنگ کے دونوں پلے اسلام کا توازن و تقابل کر رہے تھے لیکن  
حقیقی اسلام صرف ایک طرف تھا جس کا فیصلہ وقت نے کر دیا اور دلوں کے  
کھوٹ نے بھی اس کے خلاف زبان ہلانے کا یار نہ دیا تو یہ کہہ دیا گیا کہ معاویہ سے  
خطائے اجتہادی ہو گئی۔ ایک غیر مجتہد کا اجتہاد بھی تاریخ کا مجبوس ہے!

حضرت عمر نے بھی کئی اجتہادات کئے تھے: جی علیٰ خیر العمل اذماں سے نکلوا  
کر صبح کی نماز میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا انصاف کرایا، متعہ کو حرام قرار دیا، رمضان  
میں تراویح کو رائج کیا، دور رسول کے معمولات میں ترمیم و تنسیخ نہ صرف گستاخی  
تھی بلکہ بدعت بھی یا شرع اسلامی اسے جو کچھ بھی کہے لیکن ان تمام باتوں کا کوئی نہ  
کوئی جواز تو پیش کیا جاتا ہے جو اگرچہ صرف تاویل ہے مگر اس کو غور طلب تو کیا جا  
سکتا ہے، خلیفہ وقت سے معاویہ کی بغاوت کی تاویل ممکن نہیں ہے جس کا کم سے  
کم نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ وہ نام نہاد اسلام کھل کر سامنے آگیا جس پر اب تک شرافت  
ظاہری کے پردے پڑے ہوئے تھے۔

پھر مسجد کوفہ میں امیر المومنین کی شہادت کے بعد امام حسن کو خلافت  
ظاہری سے دست برداری پر مجبور کر دینا حضرت معاویہ کی شاطرانہ سیاست کا

دلوں میں پرورش پا رہی تھی اور دور دراز چھوٹے چھوٹے حلقوں پر شیعوں کا اثر بڑھ رہا تھا جس سے فاطمی تحریک کو فائدہ پہنچا۔ یہی تحریک آگے چل کر عباسی تحریک بن گئی۔

بنی عباس بنی ہاشم کی ایک شاخ تھے اور انہوں نے قصر معاویہ کے خاکستر پر اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی مگر اصل حقدار کے لئے وہ اپنے پیش رووں سے زیادہ سفاک ثابت ہوئے اور انہوں نے امویوں کا استیصال کلی کرنے کے بعد علویوں کے ساتھ پہلا جیسا یا اس سے بدتر سلوک روا رکھا لیکن ۲۰ محرم ۹۱ھ کو فضائے کربلا میں امام حسین کا جو استغاثہ بلند ہوا تھا، اس کی آواز بازگشت ہر شیعہ کے کان میں گونج رہی تھی، وہ تعداد کا احساس کئے بغیر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکراتے اور اپنے خون سے تاریخ کا ایک روشن عنوان تحریر کر جاتے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جو انصاف کا خون کیا گیا، روح اسلام کے گلے پر چھری پھیری گئی اس سے اقتدار طلب اور جاہ پسند حلقے کو ایک راستہ مل گیا اور آنے والی نسلوں تک ایک پیغام پہنچا کہ جو بڑھ کر خود اٹھائے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔ اس پر عبداللہ ابن زبیر اور مختار ابن ابی عبیدہ کے بعد سب سے پہلے زید شہید نے عمل کیا پھر یہ مزاج حریت نسل بعد نسل منتقل ہوتا رہا۔

عہد عباسیہ میں نفس ذکیہ نے اس پر عمل کیا۔ ان کا انجام بھی زید شہید سے مختلف نہ ہوا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ بہادروں کی موت مارے گئے مگر انہوں نے لوح زمانہ پر ایک مہر دوام نگاہی اور دوسروں کے لئے لسنے گہرے نقوش قوم چھوڑ گئے کہ کتنے ہی سربف قافلے ان پر پاؤں رکھتے ہوئے چلے تو منزل سے ہٹنا نہ ہو سکا۔ ۱۶۹ھ میں حسن شہنشاہ کی اولاد میں حسین بن علی نے آل ابی طالب کو اپنے پرچم تلے جمع کیا اور عباسی لشکر کو شکست فاش دی۔ بنی ہاشم کے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔ مدینے پر کسی حد تک ان کا قبضہ تھا لیکن بغداد سے تازہ دم فوج آگئی اور رچ کے لئے آئے ہوئے عباسی بھی ان کے شریک ہو گئے، مکے سے کوئی دس میل ہٹ کر

خوشنودی حاصل لی پھر برسوں کے فصل سے حضرت زید شہید نے تلوار کو بے نیام کیا حضرت زید شہید کی سرفروشی فقہی اور سیاسی اعتبار سے جو حیثیت بھی رکھتی ہو مگر مظلوم بنی ہاشم نے دشمنان دین کو یہ بتا دیا کہ علی کے وارثوں کی تلوار ابھی زنگ آلود نہیں ہوئی ہے، وہ تہذیب کے علم بردار بھی ہیں اور زرم گاہ کے شیر بھی

پھر یحییٰ بن زید نے شمشیر آبدار کی ایک آزمائش کی اور آپ کے حسد بے سرنے شہر ہنہ کے کنگرے پر لٹک پر اپنی سربلندی کا اعلان کیا۔

زندہ رہنے کی اس جدوجہد میں چھوٹے بڑے گروہ سروس سے کفن باندھ کر مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں نکلتے رہے اور عرب و عراق، شام و ایران میں اپنے نقوش دوام ثبت کرتے رہے۔

کہنے کو حد نظر بلکہ حد علم تک شیعہ علی نام کا کوئی متنفس نہیں پایا نہ جاتا جو جس مقام پر بھی تھا، دھیمی دھیمی سانس لیتا ہوا جی رہا تھا، انفرادی اور اجتماعی قتل کا معمول جاری تھا پھر بھی آئے دن کہیں نہ کہیں چند سید زادے بے چارگی سے قتل ہونے پر قالموں کو موت کا مزہ چھکا کر مرجانے کو ترجیح دیتے تھے۔

یہ جذبہ کربلا سے سیدانیوں کے کارواں کے ساتھ چلا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دور دور تک پھیلتا گیا تھا کہ نہ اس کو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی اور نہ حجاج بن یوسف کی درندگی۔ واقعات کربلا کا بیان اس کو مسلسل ہوا دیتا رہا اور وہ غیر محسوس طریقے پر کسی دہلی ہوئی چنگاری کی طرح اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ معلوم اس وقت ہوتا جب کوئی گروہ کسی چھوٹے بڑے آتش فشاں کی طرح اچانک پھٹ پڑتا، ظلم کی پرچھائیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتا اور چند شہیدوں کی قبریں بنا کر سرد پڑ جاتا۔

اموی دور میں اس کی رفتار نے شدت اختیار نہیں کی لیکن مختلف مقامات پر بغاوتیں ہوتی رہیں۔ مروان بن حکم کے ہاتھوں بنی امیہ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد، بادی النظر میں میدان شیعان علی سے خالی ہو چکا تھا، مگر ایک انقلابی روح



اس میں خود غرضی شامل ہو گئی اور ہو سکتا ہے کہ خود ابو سرایا کی نیت میں بھی کھوٹ ہو۔ بہر حال اس کا انجام شکست، گرفتاری اور قتل ہوا۔

حسین افسس اب تک مکہ اور مضافات پر قابض تھے۔ ابو سرایا کے قتل ہو جانے کی خبر سن کر حسین افسس کو گھبراہٹ پیدا ہوئی اور محمد بن جعفر الصادق کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی۔

”یہ موقع مناسب ہے، لوگوں کے قلوب آپ کی طرف مائل ہیں۔ آئیے میں آپ کی بیعت کیے لیتا ہوں کوئی شخص آپ کی مخالفت نہ کرے گا۔“

محمد بن جعفر الصادق نے اس درخواست کو منظور کرنے سے انکار کر دیا مگر یہ اور ان کا لڑکا علی پر اصرار کرتا رہا۔

”بالاخر محمد بن جعفر الصادق ان لوگوں کے کہنے سننے میں آگئے اور طوعاً و کرہاً بیعت خلافت لینے پر آمادہ ہو گئے۔ لوگوں نے انکی خلافت کی بیعت کی اور امیر المومنین کے لقب سے پکارنے لگے“ (۱۴)

ابن خلدون نے اس سلسلے میں حسین افسس، ان کی اولاد اور خود محمد بن جعفر الصادق کے بیٹوں پر کچھ اچھالی ہے جو قابل یقین نہیں ہے مگر اتنا تو ماننا پڑے گا کہ خانوادہ رسالت کے بعض افراد پر ہوس دنیا غالب آگئی تھی اور وہ اپنی نسلی منزلت کا احساس کئے بغیر ایسی حرکتیں کر جاتے تھے جو انہیں کسی طرح زیب نہ دیتیں۔

جہاں تک محمد دیباج کا تعلق ہے، خود ابن خلدون نے انہیں عالم وزاہد اور نیک سیرت لکھا ہے۔ وہ مسلسل مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ہارون کی خلافت ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ انجام کار عیسیٰ الجلودی کے ہاتھوں مدینہ اس طرح تاراج کرایا گیا کہ کربلا کی غارت گری کی یاد تازہ ہو گئی۔

اس طرح کے واقعات ملک کے طول و عرض میں آئے دن پیش آتے رہے اور حوصلہ مند چھپے ہوئے حب اہل بیت کے جذبے کو ہوا دے کر قسمت آزمائی کرتے رہے مگر بہت کم لوگوں کو قیام حکومت میں کامیابی ہو سکی۔ ان میں سے چند خاندان قابل ذکر ہیں: طاہری، علوی، زیدی، بنی بوہسہ، بنی مزید، آل حمدان وغیرہ

زنج میں دو غیر متوازن فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ امام حسن کی اولاد بے جگری سے لڑی مگر سولاشیں گر گئیں تو حوصلے پست ہو گئے اور باقیوں نے جانیں بچانے کے لئے میدان چھوڑ دیا۔

ان میں ایک شہزادہ اور یس بن عبد اللہ عباسی افسر مواصلات صالح بن منصور کی مدد سے مراقش پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کے ہاتھوں مغرب اقصیٰ میں پہلی شیعہ حکومت وجود میں آئی۔

حسین بن علی بن حسن مثلث کی شہادت کے تیس سال بعد ۱۹۹ھ میں حسن شنی کے پوتے محمد ابن طباطبائی نے رقبہ میں ظہور کیا۔ انہیں بنی عباس کے ایک باغی کی حمایت حاصل ہو گئی جس نے تھوڑی سی جمعیت فراہم کر لی تھی۔ یہ دونوں ایک منصوبہ بنا کر کوفہ پہنچے، جہاں آل محمد کے نام پر ایک کثیر تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی اور انہوں نے کوفہ کے گورنر کو شکست دے کر بھاگایا۔

انہیں دنوں ابن طباطبائی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور زید شہید کی نسل کے ایک شاہزادے کو ان کا جانشین بنادیا گیا۔ پھر ابو سرایا کا مقابلہ زبیر بن مسیب سے ہوا جو دس ہزار کے تازہ دم لشکر کے ساتھ آیا تھا وہ بھی ہزیمت یاب ہوا اس طرح کئی معرکوں میں ابو سرایا کامیاب ہوا اور بصرہ و واسطہ پر بھی قابض ہو گیا پھر ایک سخت لڑائی کے بعد مدائن بھی فتح کر لیا گیا لیکن عباسی اس کا پیچھا چھوڑنے والے نہ تھے۔ وہ فوجوں پر فوجیں بھیجتے رہے۔ آخر ابو سرایا کو کوفہ میں پناہ لینا پڑی مگر ہرثمہ کے لشکر نے کوفہ کا محاصرہ کر لیا اور ابو سرایا قادیسیہ کی طرف بھاگ نکلا ابو سرایا کا کردار مورخین نے سچ کر کے پیش کیا ہے۔ پھر بھی سیاسی اسباب و عوامل سے قطع نظر ابو سرایا آل محمد کا طرفدار ضرور تھا۔ اس نے بصرہ میں عباس بن محمد کو، یمن میں ابراہیم بن موسیٰ کو، فارس میں اسمعیل بن موسیٰ کو، اہواز میں زید بن موسیٰ کو عامل مقرر کیا تھا اور ملک کا نظم و نسق حسین افسس بن حسن بن امام زین العابدین کے سپرد کیا تھا۔ اس طرح عراق کے بڑے حصے کی امارت امام زادوں یا ان کے بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی۔

بلاشبہ یہ تحریک ایک رواجی جذبے سے شروع کی گئی تھی لیکن آگے چل کر

## شیعوں کا دائرہ اقتدار

عراق و ایران  
باقیات الصالحات  
شیعہ عراق و مصر میں  
خلفائے فاطمیین  
مغل سلطنت  
سلطنت صفویہ  
شیعان کشمیر  
سندھ  
ہندوستان

## عالم اسلام

مسلمانوں نے جب اپنی تسخیری مہمات کا آغاز کیا تو عراق و ایران، شام و لبنان، عراق و مصر، افریقہ و اندلس تک اپنے پھر ہرے ہراتے چلے گئے اور اطالیہ و یورپ کے بعض علاقوں پر بھی قابض ہو گئے۔ پھر ہندو سندھ اور مشرق بعید تک سلطنت کی حدود کو وسعت دی۔

دو ڈھائی سو سال بعد جب شیعہ ظلم و ستم کے تنگ دائروں کو توڑ کر باہر لکے تو بھی انکی کشور کشائی کا میدان تھا، اسی میں انہوں نے اپنی ہوئی تلواروں کے جوہر دکھائے اور دجلہ و فرات اور نیل کے ساحلوں پر اپنی ہمت و شجاعت کی داستانیں قلم بند کیں۔

# شیعوں کا دائرہ اقتدار

## عراق و ایران

### حکومت طاہر بن

شیعوں کی تشریف رزی کا مقصد استقرار حکومت ہو یا نہ ہو لیکن انہیں اپنی بقا کے لئے کوئی پناہ گاہ درکار تھی۔ برسوں سے وہ دلوں میں محبت اہل بیت چھپائے جی رہے تھے، کبھی نام بدل کر کبھی اپنا عقیدہ اپنی ذات تک محدود رکھ کر پتہ چھپانے اموی اور عباسی حکومتوں کے ہر دور میں ایسے افراد پائے جاتے جو بظاہر خلفائے وقت کے آلہ کار تھے مگر حقیقتاً سینوں میں ولائے علی کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نام طاہر بن حسین کا بھی ہے۔

ابو مسلم خراسانی کا نام اس سلسلے میں حرف اول کا درجہ رکھتا ہے جس کی تلوار نے حقوق اہل بیت کی خاطر بنی امیہ کا استیصال کلی کیا لیکن بنی عباس نے اپنی فتانت سے فائدہ اٹھایا اور پیغمبر اسلام کی اولاد دائرہ محرومی سے باہر نہ نکل سکی۔ دوسرا نام طاہر بن حسین کا لیا جاسکتا ہے اس پیمانے پر نہ ہی مگر طاہر کی حکمت عملی اور سیاست سے ایک علاقے میں عجمان علی کو عافیت ضرور میر آگئی اور وہ بنی عباس کا نشانہ ستم بننے سے قدرے محفوظ رہے۔

ہارون رشید کے بعد جب امین و مامون کے درمیان حصول سلطنت کی کشمکش ہوئی تو طاہر بن حسین مامون کا طرفدار تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ مامون کی کامیابی میں خود اسکی سیاست و فراست کے ساتھ طاہر کی مدبرانہ شجاعت کو بھی دخل تھا۔ مامون کو اس کا احساس تھا لیکن اس کو اپنے لئے بھی بے خطر نہ سمجھتا۔ خود طاہر بھی مامون کی طرف سے چوکنا رہتا چنانچہ اس نے حکمت عملی سے خراسان کی گورنری حاصل کر لی اور خلیفہ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

طاہر یقیناً مامون کا وفادار تھا لیکن بنی عباس نے اولاد رسول سے جو سلوک روا رکھا تھا، اس کو کوئی محب اہل بیت برداشت نہ کرتا، چنانچہ بقول ابن خلدون "طاہر خراسان گیا اور ۲۰۹ھ تک ٹھہرا ہوا۔ بعد ازاں خلافت سنیہ کی مخالفت کی ہوا دماغ میں سمائی، ایک روز خطبہ دینے کو کھڑا ہوا تو خلیفہ کے لئے دعا نہ کی۔ منبر سے نیچے اتر آیا۔" (۱۵)

اسی دوران طاہر کا انتقال ہو گیا اور عبداللہ بن طاہر اس کا جانشین ہوا، اور سلیمان بن طاہر اور محمد بن عبداللہ مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ طاہر کی نسل میں چلتا رہا۔ ایک عرصے تک طاہری حکمران خلفائے بنی عباس کے تابع رہے اور ان کے احکام کی بجا آوری کرتے رہے کیونکہ ان میں خلافت سے ٹکر لینے کی سکت نہ تھی۔ اگر ان میں سے کوئی یہ غلطی کر جاتا تو حکومت طاہریہ کے قیام کا امکان ختم ہو جاتا لہذا کسی نے عباسی پرچم کے مقابل اپنا پھر ہرا نہیں لہرایا لیکن جب سلطنت عباسیہ کمزور سے کمزور تر ہو گئی تو انہوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور وہ بادشاہ کہے جانے لگے۔

مامون کے ارادوں میں اول دن سے طاہر کے لئے کھوٹ تھا بلکہ طاہر کے ہاتھ سے نکل جانے پر افسوس تھا۔

"ایک دن اس نے احمد بن ابی خالد کو طلب کر کے فرمایا: چونکہ تم ہی اس کے ضامن ہوئے تھے اب جاؤ اور اس کو میرے پاس لاؤ۔" منور احمد بن ابی خالد کی روانگی کی نوبت نہ آئی تھی کہ اس کے اگلے دن طاہر کی موت کی خبر آگئی۔ خلیفہ مامون نے یہ خبر سن کر ارشاد فرمایا: "الحمد لله الذی قد مدد و اخرنا" (۱۶)

عبداللہ بن طاہر کو باپ کا قائم مقام بنانے میں خلیفہ کو تکلف تھا لیکن مصلحتاً ۲۰۹ھ میں بعض مناصب پر فائز کیا پھر آہستہ آہستہ عبداللہ نے اپنا خاندانی وقار واپس لے لیا۔

### حکومت صفاریہ

سلطنت عباسیہ کے انحطاط کے ساتھ ساتھ مختلف صوبوں میں خود مختاری کا

ذہن پرورش پا رہا تھا۔ خراساں میں عبداللہ بن طاہر عہد معتمد میں انتقال کر چکا تھا اور اپنے بیٹے طاہر بن عبداللہ کو نیشاپور کا والی بنا گیا تھا جو آخر بادشاہ بن بیٹھا پھر طاہر کی جگہ محمد بن طاہر نے لے لی لیکن ان میں سے کسی ایک کو زیادہ دن چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا کیونکہ بغداد کی مرکزی سلطنت اپنے دائرے کے اندر سمٹتی جا رہی تھی اور طاہریوں کی دیکھا دیکھی نت نئی حکومتیں وجود میں آرہی تھیں جن میں ایک حکومت صفاریہ بھی تھی۔

طوائف الملوکی کے اس دور میں محبان اہل بیت میں سے ایک بزرگ صالح بن نصر کنعانی المعروف بہ صالح مطوعی نے خارجیوں کے مقابلے کے لئے رضا کاروں کا ایک لشکر تیار کیا جس کی قیادت درہم بن حسن کے سپرد کی۔ اس فوج نے کئی ابتدائی کامیابیاں حاصل کیں حتیٰ کہ آگے چل کر خراسان کا ایک حصہ طاہریوں سے خالی کر لیا مگر صالح کی وفات کے بعد درہم دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور رضا کاروں نے ۲۵۱ھ میں یعقوب بن لیث کو اپنا امیر بنالیا۔

یعقوب بن لیث اور عمرو بن لیث بھستان میں تانبے پستل کا کاروبار کرتے تھے انہوں نے تنظیم رضا کاران میں داسے درے قدمے ہر طرح سے حصہ لیا تھا۔ یہ لوگ صرف کاروباری ہی نہ تھے۔ شجاع اور بلند ہیر بھی تھے۔ ایک مختصر سی مدت میں انہوں نے کافی بڑے علاقے کو زیر کر لیا اور ہوش مندی یہ کی کہ خلیفہ کی خدمت میں تابع فرماں رہنے کے لئے عرضداشت روانہ کر دی۔

بھستان میں اپنی حکومت کی داغ بیل ڈال کر یعقوب کرمان کا عازم ہو گیا۔ علی بن حسین بن شبیل فارس کا نیم خود مختار گورنر تھا اس نے خلیفہ معتمد کو اطلاع دی۔ کمزور مگر چالاک خلیفہ نے دونوں کو علیحدہ علیحدہ اپنی طرف سے گورنری کی اسناد بھجوا دی وہ دونوں کی حقیقت سے واقف تھا اور چاہتا تھا کہ یعقوب اور علی بن حسین آپس میں ٹکرائیں پاش پاش ہو جائیں۔

اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانے میں ایک مخصوص علاقے کے اندر اقتدار کی لڑائیاں شیعان علی کے مابین واقع ہوئیں جن میں سادات کی ایک حکومت بھی شامل تھی لیکن کسی کی فتح کو دیرپائی میسر نہیں ہوئی پھر بھی بھستان،

سلطنت عباسیہ کے انحطاط کے ساتھ ساتھ شیعوں کا دائرہ اقتدار بڑھ رہا تھا۔ صوبوں کے عامل تقریباً خود مختار ہو رہے تھے لیکن وہ اپنے کو مصلحتاً دربار بغداد سے وابستہ رکھنے کی کوشش کرتے جن میں شیعہ حکمران بھی تھے۔ ان سب کے سامنے حصول اقتدار اور ہوس حکمرانی کے سوا کچھ نہ تھا لہذا وہ ایک دوسرے سے بھی متصادم ہو جاتے۔ انجام کار بختان، ولیم، طبرستان وغیرہ کے سرحدی علاقے کبھی ایک کے قبضے میں چلے جاتے کبھی دوسرے کے، لیکن وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ حکومت صفاریہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا چنانچہ ۲۶۲ھ میں موفق و صفار کا نکلنا بھی ہو گیا جس میں یعقوب کو نقصان اٹھانا پڑا مگر ہندی دونوں میں صلح ہو گئی۔ اسی سن میں احمد بن عبداللہ بختانی نے بنو طاہر کی حکومت کا بڑا حصہ فتح کر لیا لیکن ایک سال بعد ۲۶۳ھ میں یعقوب صفار نے ابواز کو اس کے قبضے سے نکال کر اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

یعقوب کا سلسلہ فتوحات نہایت تیزی سے جاری تھا کہ ۲۶۵ھ میں عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور عمرو بن لیث اس کا جانشین ہوا۔ خلیفہ نے بھی غراسان، اصفہان، بختان، سندھ، کرمان اور پولیس بغداد پر اس کی حکومت تسلیم کر لی۔

یعقوب بن لیث سلطنت صفاریہ کا بانی ہی نہیں تھا معمار بھی تھا، غیر مسلم قوتوں کے مقابلے میں وہ لوہے کی دیوار بن جاتا۔ خارجیوں کے استیصال میں اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، ان کی بدولت اسے قبول عام حاصل تھا پھر صفاری حکومت کے استقرار میں اس کی پامردی نہیم النظر ثابت ہوئی۔

بختان کے نزدیک و دور اسلام دشمن قوتوں کا اس نے جس طرح قلع قمع کیا، وہ اس کے جذبہ اسلامی اور ذاتی شجاعت پر ولادت کرتا ہے کابل کی ناقابل تسخیر پہاڑیوں میں اس کی جوانمردی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ رتبیل کے فولادی آدمیوں کو اس نے جس طرح پارہ پارہ کر دیا، وہ اس کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس مہما سے اس نے خلیفہ کی خدمت میں چند بت بھی بھیج دیے کے طور پر بھیجے تھے۔

”کابل کا علاقہ گو بنی امیہ کے ابتدائی زمانے میں بلکہ خلافت راشدہ ہی کے دور سے اسلامی حکومت کا باغکزار بن گیا تھا لیکن وہ عراق و ایران کی طرح اسلامی

طبرستان اور غراسان پر تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں شیعوں کی حکمرانی رہی۔ بہر حال یعقوب بن لیث کو کرمان میں طوق بن غلس کا مقابلہ کرنا پڑا اور طوق اس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ شیراز کا دوسرا مقابلہ بہت سخت تھا۔ علی بن حسین کے ساتھ پندرہ ہزار کا جنگ آزمودہ لشکر تھا لیکن وہ یعقوب کے جیالے سپاہیوں کے سامنے ٹھہرنے سکا اور علی بن حسین بھی پابہ زنجیر کر لیا گیا تاہم یعقوب بختان کی طرف واپس ہو گیا اور فارس کا نیا گورنر دربار خلافت سے بھیج دیا گیا۔

چونکہ عباسی خلافت کا بھرم ابھی باقی تھا لہذا خاندان طاہریہ کی طرح یعقوب لیث نے بھی بغداد سے کھلی بغاوت خلافت مصلحت کبھی اور فارس فتح کر لینے کے باوجود اس پر قبضہ نہیں کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ محمد بن عبداللہ بن طاہر عراق و سواد کا گورنر تھا۔ ۲۵۳ھ میں اس کی وفات پر اس کا بھائی عہد اللہ گورنر ہوا مگر تھوڑے ہی عرصے بعد خلیفہ معتز نے اسکو معزول کر کے سلیمان بن طاہر کو گورنر بنا دیا۔ ان تغیرات کے باوجود طاہری خاندان بڑی حد تک مختلف جہتوں سے امور سلطنت میں دخل تھا اور اس وقت کا منتظر تھا جب وہ خود اپنی بادشاہی کا اعلان کر سکے

یعقوب لیث اس حقیقت سے واقف تھا اس لئے اس نے جلدی نہیں کی لیکن ۲۵۶ھ میں جب محمد بن واصل نامی ایک شخص نے کردوں کی مدد سے فارس پر قبضہ کر لیا تو ۲۵۷ھ میں محمد بن یعقوب نے فارس پر ہلہ بول دیا مگر خلیفہ موفق نے مصلحت وقت سمجھ کر یعقوب کو بلخ و طخارستان کی سند امارت عطا کر کے بہلایا اور یعقوب لیث نے اسی سلسلے میں کابل پر بھی تصرف حاصل کر لیا۔

اسی زمانے میں حسن بن زید نے محمد بن طاہر کے متعدد مقبوضات حاصل کر لئے اور آل طاہر کی ہزیمت یابی سے ان کے خاندانی وقار کو بڑا دھچکا لگا۔ یہ وہ دور ہے، جب مصر براہن طولون فتح کے پرچم لہرا رہا تھا اور وادی نیل مہمان علی کے لئے تنگ ہو رہی تھی۔

۲۶۰ھ میں یعقوب صفار اور حسن بن زید کا راست مقابلہ ہوا جس میں حسن بن زید کو شکست ہوئی۔



حد تک غلو رکھتا۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے وہ ایک شیعہ جرنیل نظر آتا۔ روزانہ نماز فجر کے بعد فوج کی پریڈ لیتا اور لشکر کی ہدایت اور ہمت افزائی کے لئے چند کلمات ضرور کہتا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ایک صبح فوجی پریڈ کے بعد اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور منہ سے نکل گیا

”کاش یہ لشکر عاشور کو کر بلا میں موجود ہوتا.....!“

شجاعت کے ساتھ اس میں تدبیر کی بھی کمی نہیں تھی۔ رموز مملکت کو کماحقہ سمجھتا تھا۔

اس کو وراثت میں ایک مضبوط حکومت ملی تھی جس پر اس نے اول دن سے توجہ کی اور اسی کے ساتھ ساتھ بغداد پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں کوشاں رہا۔ ۲۶۶ھ میں اس نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن طاہر کو پولیس بغداد پر، احمد بن عبد العزیز بن ابی دلف کو اصفہان میں اور حرمین اور طریق مکہ میں محمد بن ابی اساج کو متعین کیا۔ یہ سب اس کے معتمد علیہ تھے لیکن ۲۶۷ھ میں خلیفہ معتمد نے سلطان محمد بن عبد اللہ بن طاہر کو مع اہل و عیال قید کر دیا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ وہ نجستانی و عمرو لیث کی جنگ میں نجستانی اور حسین بن طاہر سے خفیہ خط و کتابت کرتا تھا۔ اسی سنہ میں نجستانی نے محمد بن طاہر کا نام خطبہ سے نکوا دیا، خلیفہ معتمد کے بعد اپنے نام کو داخل کیا اور اپنے ہی نام کا سکہ بھی چلایا۔

نجستانی ۲۶۸ھ میں انتقال کر گیا اور اس کی سپاہ بنو طاہر کے نامور سپہ سالار رافع بن ہرثمہ سے جا ملی جس نے بلا و خراسان اور خوارزم پر قبضہ کر لیا۔

بعض مورخین حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عباسی خلیفہ ایک لحظے کے لئے عمرو بن لیث سے مطمئن نہ تھا۔ ۲۷۱ھ میں معتمد نے خراسان کی حکومت اس سے لے کر محمد بن طاہر کو دیدی۔ اس نے رافع بن ہرثمہ کو اپنا نائب مقرر کر دیا اس لئے خلافت بغداد اور عمرو کی مخالفت شروع ہو گئی۔ خلیفہ نے احمد بن عبد العزیز کو اس کے مقابلے پر روانہ کیا اور عمرو کو شکست ہوئی

۲۷۴ھ موفق نے خود فارس کا رخ کیا۔ عمرو بن لیث بھی مقابلے پر آئے۔

ملک نہ تھا۔ صفاریوں نے اس کو اسلامی قلمرو میں شامل کر کے اسلامی ملک بنادیا (۱۷)

شاہ معین الدین ندوی نے ابن خلکان کے حوالے سے لکھا ہے کہ:-

”صفار اپنی شجاعت و شہامت، تدبیر و سیاست اور انتظامی قابلیت کے لحاظ سے بے نظیر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ: جس شخص کو میں چالیس دن ساتھ رہنے کے بعد نہ پہچان سکوں، اس کو دوسرا شخص چالیس سال تک نہیں پہچان سکتا۔ حسن بن زید علوی اس کی شجاعت و استقلال کی وجہ سے اس کو ”سدان“ کہتے تھے۔ اس کی تدبیر و سیاست کے بہت سے واقعات مورخین نے نقل کئے ہیں۔“

ان محاسن کے ساتھ ساتھ وہ حد درجہ ذہین و طباع بھی تھا اور صاحب ذوق

بھی۔ کہا جاتا ہے:-

”ایک دن یعقوب کا چھوٹا بچہ اغروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اغروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڈھے میں چلا گیا۔ بچے کی زبان سے بے ساختہ نکلا ”غلطان غلطان“ ہی رد و تاب گور۔“ یعقوب موجود تھا۔ بچے کی زبان سے اس کو یہ کلام بہت پسند آیا لیکن، چونکہ اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے اس لئے شعراء کو بلا کر اس نے پوچھا کہ یہ کون سی بحر ہے انہوں نے کہا: ہزج ہے، پھر تین مصرعے لگا کر پوری رباعی کردی اور دو بیت نام رکھا، پھر دو بیت کے بجائے رباعی کہنے لگے (۱۸)“

یعقوب نے اپنی عسکری زندگی کا آغاز ایک رضا کار کی حیثیت سے کیا لیکن جب وہ سفر آخرت کا عازم ہوا تو ایران و عراق کا بیشتر حصہ اور کابل اس کے تابع فرمان تھا۔ کہنے کو وہ خلافت بغداد کے ماتحت تھا مگر حقیقتاً اس کی حیثیت کسی بادشاہ کی سی تھی جس کی رعایا خوشحال اور جس کا ملک شاداب تھا۔

بلاشبہ اس کی عمر کا بڑا حصہ گھوڑے کی پیٹھ پر گزر گیا پھر بھی اس نے بہت سے رفاہی کام کئے اور تھوڑی سی مدت میں اتنی شاندار حکومت بنالی کہ جب عمرو بن لیث نے اس کی جگہ سنبھالی تو وہ وقت کا سب سے طاقتور حکمران تھا۔

عمرو بن لیث یعقوب لیث کا لائق جانشین تھا بلکہ محبت اہل بیت میں کسی

نئی شاخیں پیدا ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ ہر دور میں جاری رہا۔  
اس کے اسباب و عوامل میں صداقت اور صرف صداقت کی کارفرمائی تھی۔  
تاریخ کا ایک سطحی جائزہ لیا جائے تب بھی اس کے پس منظر میں رسول کے پاک  
باطن صحابیوں اور خود امیر المومنین کے ہجرے نظر آئیں گے جن میں عمار یا سر،  
سلمان فارسی اور ابوذر غفاری سرفہرست ہیں۔ ان مقدس بزرگوں نے کیا کچھ  
نہیں کیا، محتاج بیان نہیں، مدائن اور اس کے گرد و نواح میں حضرت سلمان  
فارسی کا لیمان آج بھی خورمذ ہے۔ شام میں جبل عامل پر حضرت ابوذر غفاری کی  
صداقت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں اور حاتم طائی کی سرزمین یمن میں خود امیر  
المومنین نے قبیلہ طے کو جو روشنی دکھائی تھی اس کو سیکڑوں سال بعد بھی عدی  
بن حاتم کی اولاد نشان منزل بنائے ہوئے ہے۔

حقوق آل محمد کے نعرے اکثر ایسے ہی علاقوں سے بلند ہوتے رہے اور  
انہیں کی گھائیوں سے نکل کر بعد کر بلالیمان کے ستوالے داد شجاعت دیتے رہے  
جن سے بنی عباس نے فائدہ اٹھایا..... ابو مسلم کی تلوار اٹھی تھی آل محمد کی حمایت  
اور بنی امیہ کی دشمنی میں لیکن شاطران سیاست نے بساط کے مہروں کو اس  
چابکدستی سے استعمال کیا کہ جیت ان کے حق میں ہوئی اور پھر انہوں نے اپنے کو  
امویوں کا لائق وارث ثابت کر دیا۔

اس طرح اولاد رسول کی محرومی بدستور اپنی جگہ پر رہی اور ایک وقتی  
ٹھہراؤ کے بعد مجاہدان علی کے محسوسات کا تلاطم آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ امیر المومنین  
نے رحلت نبی کے بعد صبر و سکون کی جو تلقین کی تھی ان کے وارثوں کا لائحہ عمل  
اب بھی وہی تھا لیکن خاندان کے اکثر افراد شدت قلم سے بے قابو ہو کر میدان میں  
نکل آتے اور رزم گاہ کی موت کو گھٹ گھٹ کر مرنے پر ترجیح دیتے۔ ان میں  
ابو الحسن یحییٰ بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید شہید بھی تھے، جنہوں نے عرب  
بادیہ نشینوں کو جمع کر کے کوفہ پر قبضہ کر لیا لیکن خلافت بغداد کے حکم پر محمد بن  
عبدان بن طاہر کے ایک جنرل نے ابو الحسن کو شکست دی اور وہ لڑتے ہوئے  
مارے گئے۔

مگر کچھ سوچ کر کرمان اور بھستان کی طرف چلا گیا، پھر کچھ عرصہ بعد اس نے خلیفہ کی  
خوشنودی حاصل کر لی۔

عمرو بن لیث کی کوشش اول دن سے یہ ہی رہی تھی کہ خلیفہ سے اس کا  
براہ راست ٹکراؤ نہ ہونے پائے لیکن سلطنت کے مختلف حصوں میں مختلف طاقتیں  
توسیع مملکت میں کوشاں تھیں جو ایک دوسرے سے بھی متصادم ہوتیں اور جس  
طاقت کا پلڑا بھاری پڑتا، خلیفہ کا جھکاؤ اس کی طرف ہو جاتا۔ یہ صورت حال یعقوب  
بن لیث کے اٹھان اور استقرار حکومت سے پائی جاتی لیکن ۲۴۶ھ کے بعد عمرو کو بھی  
یہ خدشہ لگا رہتا کہ مبادا خلیفہ نے تمام مخالف قوتوں کو اس کے خلاف یکجا کر لیا تو وہ  
مقابلے کا متحمل نہ ہو سکے گا لہذا دونوں قیام حکومت کے لئے دلوں میں گنجائش نہ  
ہونے کے باوجود آپس میں متحد تھے۔

محمد بن طاہر نے ۲۴۱ھ میں رافع بن ہرثمہ کو خراساں میں اپنا نائب بنا دیا  
تھا لیکن اس کا خود سزا نہ رویہ دیکھ کر خلیفہ اس سے ناراض ہو گیا اور اس نے عمرو  
بن لیث کو خراساں کی سند دیدی۔ عمرو سے اس کی متعدد لڑائیاں ہوئیں اور اس  
نے ہر مرتبہ شکست کھائی، آخر رافع خوارزم کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

ابو سعید والی خوارزم نے فریب دے کر رافع کو پکڑ لیا اور اس کا سر عمرو  
بن لیث کی خوشنودی کے لئے ۲۸۳ھ میں اس کو بھیج دیا..... عمرو نے وہ سر خلیفہ  
معمد کی خدمت میں پیش کر دیا۔

### حکومت علویہ

شیعوں کی تاریخ دقت کے کسی موڑ پر اپنے آغاز سے بے تعلق نہیں رہی  
بلکہ بنگاہ غائر دیکھا جائے تو آنحضرت کی مقدس زندگی میں اور اس کے بعد محبت آل  
رسول کا جو بیج جہاں کہیں بویا گیا تھا وہ پہلے پودا بنا پھر تناور درخت۔ جبر و تشدد کے  
طوفانوں نے اکثر ان درختوں کو اکھاڑ پیچھا مگر ان کی جڑیں اندر ہی اندر پھیلتی  
رہیں۔ سازگار آب و ہوا میں کونپلیں پھونکتی رہیں پھر ہوا کے تند و تیز جھونکوں سے  
مر جھاتی رہیں مگر قوت نموا نہیں تازہ کرتی رہی۔

درخت تنوں سے کاٹے گئے، شاخیں قطع کی گئیں مگر پرانی شاخوں کی جگہ

حسن بن زید بڑی بہادری سے لڑے، علوی تیغ زنی کے جوہر دکھائے مگر انجام کار انہیں طبرستان چھوڑ کر ولیم میں پناہ لینا پڑی پھر وقت کے تھوڑے فصل سے حسن نے اپنے مقبوضات کا بڑا حصہ واپس لے لیا۔

### حکومت سامانیہ -

سلطنت عباسیہ کے زوال پر مذکورہ بالا حکومتوں کے دوش بدوش بنی سامان کی ایک حکومت بھی وجود میں آئی جو بخارا، سمرقند اور خوارزم پر مشتمل تھی..... اسد بن سامان کے خاندان نے مامون رشید کے دور میں عروج حاصل کیا، اس کے چار بیٹے نوح، احمد، یحییٰ اور الیاس کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔ طاہر بن حسین نے اپنے عہد حکومت میں ان سب کو نوازا پھر عبداللہ بن طاہر نے نصر بن احمد کو سمرقند کی گورنری پر بحال رکھا۔

خراسان کی حکومت جب یعقوب بن لیث کے ہاتھ آئی تو نصر سے اس کا مقابلہ ہوا اور نصر شکست کھا کر بخارا آگیا جہاں اس کا بھائی اسمعیل سامانی حکمران

اسد بن سامان کے بیٹے یقیناً بدو اور شجاع تھے لیکن تاریخی شواہد کی رو سے اس کی توسیع میں ترکوں کی تلوار کو بڑا دخل ہے اور اسپتگین کا نام جس کا تاریخی عنوان قرار دیا جاسکتا ہے، پھر اس کے غلام سبتگین نے اپنے آقا کے منصب کو سنبھالا۔ اس کے بعد محمود بن سبتگین نے باپ کی جگہ لی..... بنی سامان کی فتوحات بہر طور اس خاندان کی مرہون منت ہیں۔

عراق و ایران کے افق تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو دو سو سال کی مسلسل سرفروشی کے بعد شیعوں کی پہلی مستقل پناہ گاہ طاہر بن حسین کی حکومت تھی جس میں طاہر کی گورنری سے آل طاہر کی بادشاہت تک کوئی پچھتر سال اس مظلوم فرقے نے اطمینان کا سانس لیا پھر علویہ اور صفاری حکومتیں قائم ہوئیں اور علاقائی طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ علی کے نام لیواؤں کو بھی جینے کا حق ہے۔

استقرار حکومت کی ایسی ہر جدوجہد بلاشبک و شبہ واقعہ کر بلا کا نتیجہ تھی مگر ایسی کوئی تحریک اس انداز پر چلائی نہیں گئی جس کا درس امام حسینؑ نے دیا تھا

حصول اقتدار کی یہ جدوجہد ان آبادیوں میں عام تھی جن میں علیؑ کی اولاد اور ان کے ماننے والے بستے تھے بلاشبہ اس کی ذمہ داری حد سے زائد تشدد پر عائد ہوتی ہے لیکن جنگ کی نوعیت کو استقرار حکومت کی مساعی کے سوا کوئی نام نہیں دیا جاسکتا چنانچہ ولیم و طبرستان میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی..... دربار خلافت سے محمد بن عبداللہ بن طاہر کو طبرستان میں جاگیر عطا ہوئی اس کا نائب جاگیر پر قبضہ کرنے کے لئے پہنچا تو ولیم کے شیعان علی نے مزاحمت کی کیونکہ وہ زمینوں کو چراگاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ بات زیادہ آگے بڑھی تو محمد و جعفر پسران رستم نے "رے" پہنچ کر حسن بن زید بن محمد بن اسمعیل بن حسن بن زید بن حسن سبط سے ملے اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کر کے ۲۵۰ھ میں ایک علیحدہ ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔

"آمد" میں حسن زید کا مقابلہ محمد بن اویس سے ہوا جس نے شکست کھائی اب حسن نے ساریہ کا رخ کیا۔ سلیمان عامل ساریہ نے ایک میدان میں روکا مگر حسن کے چند دستے ایک چکر کاٹ کر شہر میں داخل ہو گئے اور گھبرا کر سلیمان بن طاہر نے میدان چھوڑ دیا دوسرے دن حسن نے سلیمان کے اہل و عیال کو اس کے پاس جرجان روانہ کر دیا۔

"بیان کیا گیا ہے کہ سلیمان نے ارادتاً شکست کھائی تھی اس وجہ سے کہ کل بنی طاہر کا میلان تشیع کی جانب تھا۔"

اب حسن نے اپنے لشکر کو باقاعدہ مرتب کیا اور محمد بن جعفر بن عبداللہ عقیقی بن حسین بن علی بن زین العابدینؑ کو سپہ سالاری کا منصب عطا کیا جنہوں نے کچھ دنوں بعد رے کو فتح کر لیا مگر محمد بن میکل بنی طاہر کی طرف سے مقابلے پر آیا تو وہ ہزیمت یاب ہو کر گرفتار ہو گئے پھر حسن بن زید کے دوسرے افسر فوج واجن نے ابن میکل پر فتح پائی اور رے پر دوبارہ قبضہ کر لیا..... جنگوں کی تفصیلات سے قطع نظر، ایک وقت وہ بھی آیا جب خراسان اور دوسرے علاقوں پر علویوں نے اپنے پرچم ہرا دیئے۔

لڑائیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ بغداد سے یکے بعد دیگرے کئی لشکر آئے،

ہیں، انہیں میں طاہریوں، علویوں اور صفاریوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان سب نے جو کچھ کیا، اس میں جہانبانی اور حکمرانی کے جذبے کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ محب اہل بیت تھے اور ان کی بدولت شیعہ ایک عرصے تک مظالم و ستم کا شکار ہونے سے بچے رہے۔

تلوار اور زہر کے مراحل کا منبع دمشق کا اسلحہ خانہ رہا تھا جس نے بنی امیہ کے بعد بنی عباس کے عہد میں ہارون رشید تک اپنا راستہ نہیں بدلا مامون نے سادات کشی کے لئے کھلے بندوں تلوار کا استعمال نہیں کیا کیونکہ اس سے ملک کے مختلف گوشوں میں ہونے والی شیعوں کی بغاوتیں بڑھ جانے کا خطرہ تھا لہذا ہر اور زہر آلود پالیسی کو بروئے کار لانا اس کے نزدیک عین مصیبت قرار پایا تھا۔

اس کا یہ منصوبہ کامیاب رہا اس نے چند ماہ کے لئے امام رضا کو ہلاک کر دیا۔ اسے ہٹا دیا اور مسلک امامیہ، جو اس کی راہ کا سب سے بڑا کاٹھا تھا، اس کے مقابلے پر اس نے اتنے مسالک فقہ لاکھڑے کئے کہ اسلام اس کی ضرب سے آج تک کراہ رہا ہے۔ مسلک اعتزال اس کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ فقہ حنفیہ اس کی شکر گزار ہے۔ اسی کے حکم پر امام ابو یوسف نے اس کو مرتب کیا، اہل السنن و الجماعت کی تشکیل و ترویج اس کا کارنامہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کی جو آزادی اس نے عام کی تھی، اس کے نتیجے میں قرامطہ اور زنج جیسے کتنے ہی فرقوں نے جنم لیا۔ یہ وہی پالیسی ہے جو حضرت معاویہ یا ان کے حاشیہ نشینوں نے خارجیوں کو پیدا کرنے میں استعمال کی تھی۔

طاہر بن حسین، مامون کی سلطنت کا معمار تھا۔ اس کا انجام بھی ہرثمہ بن اعین سے مختلف نہ ہوتا لیکن طاہر مامون کے ارادوں کو بھانپ کر خراساں کی گورنری پر چلا گیا اور مامون کو امور سلطنت نے اتنی مہلت نہ دی کہ طاہر جیسے مضبوط دشمن پر توجہ کر سکتا۔

عباسی خلیفہ کی اسی دانشمندانہ روش نے اس کو مامون اعظم تو بنا دیا لیکن اسکے بعد سلطنت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ آخر عراق و ایران کی طرح مادراء النہر میں سلطنت سامانیہ کی داغ بیل پڑ گئی۔ اس سلطنت نے طاہری، علوی اور

البتہ ایک ذہنی انقلاب جو آیا تھا، وہ یہ کہ جب جرم صداقت میں گردن کٹوانا ہی ہے تو زید شہید اور نفس ذکیہ کی موت کو لبیک کیوں نہ کہا جائے!

اس سلسلے میں اگر آغاز تاریخ کے باب اول کا جائزہ لیا تو نیابت پیغمبری اور فرمانروائی کی تقسیم کے بعد شیعوں کا فرمانروائی میں کوئی حصہ نہ رہا تھا اور وہ قطعاً کوئی حصہ بھی نہ لیتے، بشرطیکہ انہیں طرح طرح سے ستایا نہ جاتا اور ان پر عرصہ حیات استیانتگ نہ کر دیا جاتا کہ ان کی چیخیں نکلتیں تو وہ خود اپنی ہی آوازیں سن کر رہ جاتے۔

غضب حقوق کی پہلی منزل سے بحان علی تین مرحلوں سے گزرتے رہے تھے: تلوار، زہر اور وضعی روایات..... روایات تو روح اسلام پر راست حملہ تھیں جن سے خود اختیاری عمل کو دین کا نام دیا جاسکتا تھا اور یہ مقصد پورا ہو چکا تھا تو سب سے پہلے کسی بھی بے خطر اور مستمن ملک پر حملہ جہاد کی تعریف میں آچکا تھا اور ایسی جنگوں کا ہر تسمیر زن غازی اور مقتول شہید قرار پا چکا تھا، حالانکہ غزوات نبوی کے علاوہ کسی لڑائی میں شرکت کرنے والے کو غازی کہنا غلط ہی نہیں بلکہ بدعت ہے۔

ابتدائے خلافت کے محاربات کو زیر بحث نہ لایا جائے تو بھی اس کے بعد کی بیشتر جنگیں غیر اسلامی قرار پائیں گی۔ صرف ان جنگوں کا کوئی جواز پیدا ہو سکتا ہے جن میں کسی دوسری قوم کی طرف سے مسلمانوں پر حملے کا خطرہ ہو۔

مسلمانوں کے مستقبل کی تاریخ اس کی بے شمار نظیریں پیش کرتی ہے۔ خود سبکتگین نے جب غزنی میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کی تو ہندوستان پر اس کا حملہ اور اس کے بعد محمود کی سترہ جارحانہ یلغاریں جہاد تو نہیں قرار دی جاسکتیں۔ پہلے حملے کا جواز پیدا کرنے کے لئے اگر یہ مان لیا جائے کہ بے پال کی نیت میں فتور تھا تو بعد کے تمام حملوں کے لئے کیا کہا جائے گا، بالخصوص سومنات کے مندر کی تار لٹی محمود کو بت فروش کے بجائے بت شکن نہیں بنا سکتی۔

اسی طرح سلجوقیوں اور ایوبیوں کے وہ معرکے جو صرف مسلمانوں ہی سے ہوئے اور جن کو ملک گیری کی ہوس کے سوا کچھ کہا نہیں جاسکتا، اسی تعریف میں

صفاری حکومتوں کو اپنی پیٹ میں لے لیا اور آگے چل کر طاہریوں اور صفاریوں کی طرح خلافت بغداد پر چھا گئی۔

سامانی حکومت کا دورانیہ ایک سو تیس سال سے زائد نہیں ہے جس میں گیارہ فرمانروا برسر حکومت رہے لیکن دوسری حکومتوں کی طرح یہ حکومت بھی ابتدائی چند دہائیوں کے بعد زوال پذیر ہو گئی اور دھیرے دھیرے غزنویوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

### طاہری اور صفاری حکومتوں کا اختتام

حکومت طاہریہ شیعی اقتدار کا سنگ میل تھی اور طاہر بن حسین کے وقت سے شیعوں کا مستقر بنتی جا رہی تھی۔ عبداللہ بن طاہر نے اس حکومت کو چار چاند لگا دیے لیکن ۲۵۰ھ میں جب سے بھستان کے ملحق حسن بن زید کی حکومت اور ۲۵۳ھ میں ویلی حکومت وجود میں آگئی، اس وقت سے طاہری حکمران برابر جنگ و جدل میں الجھے رہے۔

عبداللہ کے بعد محمد بن طاہر کے وقت سے طاہری بادشاہت زوال پذیر ہونے لگی۔ محمد بن طاہر سے علویوں کے معرکے بھی ہوئے اور صفار کے بھی، جن میں طاہری کبھی کامیاب رہے اور کبھی شکست یاب ہوئے لیکن ان کی طاقت کمزور ہوتی رہی۔

یعقوب بن لیث صفار ایک محاصر حکمران تھا مگر اس کو طاہریوں سے کوئی خاص پر خاش نہ تھی لیکن ۲۵۷ھ میں جب یعقوب نواح بھستان کے غیر مسلم فرماں رواؤں سے مصروف پیکار تھا تو اس کے ایک حریف عبداللہ سنجر نے نیشاپور کا محاصرہ کر لیا۔ محمد بن طاہر نے اپنے کو کمزور پاکر اور بعض علماء کے دباؤ میں آکر اس کو طہین اور بھستان کا حاکم بنا دیا۔

یعقوب کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے محمد سے مطالبہ کیا کہ عبداللہ سنجر کی گرفتار کر کے اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ محمد بن طاہر نے انکار کیا تو یعقوب خود نیشاپور پر چڑھ دوڑا۔ صفار اپنے دور کا سب سے طاقتور حکمران تھا، محمد بن طاہر مقابلے کی تاب نہ لاسکا اور یعقوب نے محمد اور اس کے خاندان کو گرفتار کر لیا۔

اس طرح پچاس پچپن سال تک شاہانہ طمطراق کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد خاندان طاہریہ کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی جاگیریں باقی تھیں، وہ بھی آگے چل کر امتداد زمانہ کے ہاتھوں ملیا میٹ ہو گئیں۔

### حکومت صفاریہ کا انجام

یعقوب بن لیث نے طاہریوں کے علاقے اپنی مملکت میں شامل کر لئے تھے لیکن بچے کچھے چھوٹے مقبوضات سے اس نے کوئی تعرض نہ کیا اور نہ ان کی بد حالی کے درپے ہوا اس نے عبداللہ سنجر کا بیٹا چھوڑا جو نیشاپور سے بھاگ کر حسن بن زید کی پناہ میں چلا گیا تھا۔ یعقوب ۲۶۰ھ میں طبرستان چلا ہوا۔ حسن بن زید سے اس کا سخت معرکہ ہوا جس میں حسن کو شکست ہوئی اور یعقوب فتح و ظفر کے پرچم اڑاتا ہوا عبداللہ کے تعاقب میں رے کی طرف چل پڑا حاکم رے نے عبداللہ کو گرفتار کر کے اس کے حوالے کر دیا اور یعقوب اس کو قتل کر کے بھستان آگیا۔

لیکن یعقوب کو اس کے بعد بھی چین سے پیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ جلد ہی اس کو بھستانی کی سرکوبی کے لئے نکلنا پڑا جس نے نیشاپور پر قبضہ کر لیا تھا۔ طاہریوں کا ایک بڑا گروہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ ۲۶۲ھ میں یعقوب صفار اور عمرو بن لیث کو کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ بھستانی ۲۶۸ھ میں اپنے غلاموں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

یعقوب کی نظر میں حسن بن زید کا احترام تھا مگر امور مملکت نے ایک کو دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا چنانچہ حسن بن زید نے محاصرہ نیشاپور میں صفار دشمن عناصر کی مدد کی تھی لہذا یعقوب و حسن کا پھر مقابلہ ہوا اور حسن کو ہزیمت یاب ہو کر تادان ادا کرنا پڑا۔ ۲۶۴ھ میں یعقوب نے بلا مزاحمت اہواز پر قبضہ کر لیا اور ۹ شوال ۲۶۵ھ کو جند ساہور میں قیام کے دوران انتقال کیا۔

”خلافت بغداد سے عمرو کو یعقوب صفار کا جانشین تسلیم کر لیا گیا، خراسان اصفہان، بھستان، سندھ، کرمان کی حکومت، پولیس بغداد اور سرمن رائے کی افسری کی اسناد عطا کی گئیں۔“ (۱۹)

۲۷۱ھ میں خلیفہ نے عمرو بن لیث کو معزول کر دیا۔ حجاج خراسان سفر مکہ



عمرو نے روز روشن میں محاصرے کو توڑ کر نکل جانے کی کوشش کی اس کی فوج بڑی جانبازی سے لڑی، محصور ہونے کے باوجود دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اسمعیل جانتا تھا کہ اس کا مقابلہ کسی معمولی آدمی سے نہیں ہے، اس نے جان بوجھ کر ایک طرف نکلنے کا راستہ دیدیا۔ عمرو اس فریب میں آگیا اور اس طرف بڑھنے لگا جہاں سپاہیوں کی ایک تعداد جال لئے ہوئے موجود تھی۔ اس نے جال پھینک کر عمرو بن لیث کو گرفتار کر لیا۔ سپاہ اپنے فرمانروا کا یہ انجام دیکھ کر فرار ہونے لگی اور اسمعیل سامانی کے لشکریوں نے قتل عام شروع کر دیا پھر بھی ایک تعداد بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

اسمعیل نے عمرو بن لیث کو پابہ زنجیر کر کے پہلے قید کیا پھر خلیفہ معتضد کے پاس بھیج دیا جس نے زندان میں ڈلوادیا۔ گویا یہی اس کا منشاء تھا اور اسی لئے اس نے عمرو بن لیث کو ماروا، النہر بھیجا تھا۔ اسمعیل کے اس کارنامے پر دربار خلافت سے اس کو عمرو کے تمام مقبوضات کی سند حکومت عطا فرمائی گئی۔

عمرو بن لیث معتضد کے حین حیات قید میں رہا۔ مکملی نے ۲۸۹ھ میں تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اس کو قتل کر ادیا شاید قید ہونے کے باوجود اس کی طرف سے کچھ اندیشہ تھا۔

اب سامانی حکومت کا تقریباً پورے عراق و ایران پر قبضہ تھا اور وہ طاہریوں اور صفاریوں کی جگہ لے چکی تھی پھر بھی صفار کی اولاد نے شیروں کی گود میں پرورش پائی تھی، وہ بے دست و پا ہو کر نہ بیٹھ سکی۔ عمرو کی گرفتاری کے بعد اس کے پوتے طاہر بن محمد بن عمرو بن لیث نے فارس سے طاہری حاکم کو نکال کر اس پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ معتضد نے اپنے غلام بدر کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، طاہر بن محمد میں لڑنے کی طاقت نہ تھی وہ محاذ سے مل گیا۔

اس دوران بنی صفار ہوس اقتدار میں باہم لڑتے رہے۔ آخر طاہر بن محمد نے دوبار خلافت میں حاضر ہو کر فارس کی حکومت چھیکے پر لے لی۔ اس طرح صفار کی اولاد مزید دس سال تک کسب نہ کسی انداز پر برسر حکومت رہی اور عمرو بن لیث

سے واپس آئے تو انہیں اس کی معزولی اور محمد بن طاہر کی تقرری سے آگاہ کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ برسر منبر عمرو بن لیث پر لعنت کی جائے۔ (۲۰) اس حکم کے نتیجے میں متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ آخر عمرو نے ایک وفد بھیج کر خلیفہ کی خوشنودی حاصل کر لی۔

پھر رافع بن ہرثمہ کا سر جب اس نے خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا تو ماروا، النہر کی حکومت کا خواستگار ہو گیا۔

”یہ علاقہ مدتوں سے سامانی خاندان کی موروثی حکومت میں چلا آتا تھا اور اس کے فرمانروا دوسرے خود سر موروثی والیوں کے مقابلے میں زیادہ مطیع و منقاد تھے۔ اس کے برعکس عمرو پر اس کو پورا اعتماد نہ تھا اس لئے اس نے عمرو کو اسمعیل سے لڑا کر عمرو کی قوت توڑنے کے لئے اس کی درخواست قبول کر لی اور اسکو ماروا، النہر پر قبضہ کی سند لکھ کر دیدی۔“ (۲۱)

شاہ معین الدین ندوی کا یہ خیال بالکل درست ہے خلیفہ نے جان بوجھ کر عمرو بن لیث کو طاقتور دشمن کے منہ میں ڈھکیلا تھا جس کو عمرو سمجھ نہ سکا اور اپنی طاقت پر غیر معمولی اعتماد کرتے ہوئے بلا کسی مزید تیاری کے بڑھتا چلا گیا۔

اسمعیل سامانی کو خلیفہ کے حکم کی اطلاع مل چکی تھی یا کر دی گئی تھی وہ عمرو کی آمد کا منتظر تھا اور دریائے جیحوں کو پار کر کے مورچے بنا چکا تھا۔ عمرو نے اپنی روایتی شجاعت کے ساتھ حملہ کیا مگر سپاہو اور میدان چھوڑ کر بخار آگیا پھر نیشاپور پہنچ کر دم لیا۔

اس مقام پر اس نے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو واپس لانے کی کوشش کی سامان جنگ بھی فراہم کیا اور بلخ کا عازم ہوا۔

اسمعیل پہلے سے جال بچھا چکا تھا، نہر عبور کرنے کی کشتیاں پہلے ہی غائب کرادی تھیں اور عمرو کشتیاں ساتھ لیکر آیا نہیں تھا، لہذا مجبوراً نہر کے اس طرف بڑاؤ ڈال دیا۔ اسمعیل اسی کا منتظر تھا۔ اس نے سارا انتظام پہلے سے مکمل کر رکھا تھا اور ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا جس کے مطابق اس نے راتوں رات ایک اور مقام سے نہر کو عبور کیا اور تین طرف سے صفاری لشکر کو گھیرے میں لے لیا۔

حسن کی رگوں میں نسل فاطمہ کا خون تھا اور اسوہ علی اس کا مسلک حیات لیکن ان سب سے زائد اس کے پیش نظر ایک حکومت کا قیام تھا..... ویسی ہی حکومت جیسی طاہر بن حصین، یعقوب بن لیث نے قائم کی تھی اس لئے اس کی حکومت اور اس کی ذات سے تقدس کو وابستہ کر دینا ہمارے انداز فکر کے خلاف ہوگا

حسن بن زید ہوں یا یعقوب بن لیث، وہ صرف فرماؤں والے تھے۔ ہم تو انہیں پسند اس لئے کرتے ہیں کہ انہوں نے علی کے نام لیواؤں کو اپنے طور پر جینے دیا، مسلک آل محمد پر چلنے کے مواقع فراہم کئے اور عقیدت کی جو شمعیں انہوں نے جلائیں ان کی روشنی پھیلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

ہمارا موقف یہ کبھی نہیں رہا کہ کوئی اولاد فاطمہ کی لاشوں پر سے گزر کر تخت سلطنت پر آکر بیٹھے اور اس سے دو چار اچھے کام بھی سرزد ہو جائیں تو ولی اللہ، کوئی نبی کے نواسے کی قبر کھدوا کر کسی فتنہ کا نفاذ کرے تو محی الدین و الملت، کوئی کسی متمدن قوم پر طمع زر میں غارت گری کرے تو مجاہد و غازی، کوئی باپ اور بھائیوں کا خون بہا کر جبر و ظلم کی داستان دہراوے اور کسی خاص عقیدے کیلئے سینہ سپر ہو جائے تو رحمتہ اللہ علیہ، ہم تو صرف اقتدار کی خاطر بنی نوع انسان کے ہر خونی کو قاتل قرار دیتے ہیں۔ ہاں اگر یہ خونریزی استقرار دین کے لئے عمل میں آئے تو جہاد ہے۔

اسی معیار پر طاہر بن حصین، یعقوب صفار اور حسن بن زید کو بھی پرکھتے ہیں تو انہیں خیر و شر کا مجموعہ پاتے ہیں تاہم جاہ طلبی کے نظریے سے حسن کی سوجھ بوجھ اور دلاوری فراج تحسین لئے بغیر نہیں رہتی۔

ہمارا مقصود کسی پر اعتراض ہرگز نہیں بلکہ ہمیں تو بتانا صرف یہ ہے کہ جہاد وہ ہے جو دُعا یا خالص تبلیغ اسلام کے زاویہ نگاہ سے غیر مسلمین کے خلاف کیا جائے مگر بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کو پسندیدہ کرداروں کی پردہ پوشی اتنی مرغوب ہے کہ جنگ صفین کے دونوں فریق حق پر، امام حسین کے قاتل حق پر..... دلیل یہ ہے کہ امام زید پر آئے ہی کیوں جو قتل ہو گئے۔

کے بعد یعقوب، عمرو، طاہر بن محمد، لیث بن علی اور معد بن علی علاقائی طور پر حاکم رہے۔ ۲۹۸ھ میں سامانیوں کے ہاتھوں ان کا خاتمہ ہو گیا۔

صفاری دور حکومت پر ایک اچھتی نگاہ ڈالی جائے تو اس کے اقتدار کا دورانیہ پینتالیس سال سے زائد نہیں ہے اور اس مدت میں صرف دو شجاع و مدبر نظر آتے ہیں جنہوں نے لوح زمانہ پر اپنے نقوش ثبت کئے ہیں: ایک یعقوب بن لیث دوسرا عمرو بن لیث۔ یعقوب کے حصے میں کامیابیاں تھیں، عمرو کو قسمت کا ہنسا قرار دیا جاسکتا ہے مگر وہ استنا بہادر تھا کہ فاتحین عالم کی صف میں اس کو کھرا کیا جائے تو اس کی تلوار میں دوسروں سے زائد آب و تاب دکھائی دے گی۔ ابن خلدون نے اس کو فراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”عمرو بن لیث نہایت مدبر و منظم شخص تھا۔ بڑے بڑے صوبے اس کے زیر حکومت تھے۔ لشکریوں کی بہت زیادہ خاطر داری کرتا اور سپہ سالاروں کی کامل نگرانی رکھتا۔ تمام ممالک مقبوضہ میں اس کے پرچہ نویں پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی حال اور واقعہ ایسا نہ ہوتا جس کی اطلاع اس کو نہ ہوتی۔ بہت رعب و داب کا آدمی تھا۔ کسی شخص کی یہ مجال نہ تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کرتا جو شکایت جس کو جس سے پیدا ہوتی اس کی حاجب سے شکایت کرتا اور حاجب اس قضیے کو اس کے روبرو پیش کرتا۔“ (۲۲)

### حکومت علویہ کا خاتمہ

سادات کی حکومت صفاری حکومت سے تین چار سال قبل عمل میں آئی تھی اور اول دن سے اس کو مخالفین کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پہلے طاہریوں سے ٹکرا ہوئی جو استقرار حکومت کے مرحلہ اول کی بات تھی لیکن حسن بن زید کی تنظیمی صلاحیت اور شجاعت ہر مخالفت کو جھیل گئی اور حکومت ایک مرکزی جگہ سے پھیلی تو پھیلی ہی رہی۔

اس میں عوام کے حب اہلبیت اور حسن بن زید کی قیادت دونوں کو دخل تھا..... حکومت صفاریہ بن جانے کے بعد حسن کا سب سے بڑا حریف یعقوب بن لیث تھا جس سے قدم قدم پر حسن زید کو نپٹنا پڑا۔



حد یہ ہے کہ مسلم بن عقبہ کی تاریخی مدنیہ بھی جائز: بقول شاہ معین الدین ندوی، اگر مدینہ والے پہلے ہی بیعت کر لیتے تو یہ نوبت کا ہے کو آتی!

خدا مبارک کرے دوسروں کو ایسا ذہن، ہم تو دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کہنے کے قائل ہیں اور شیعہ حکمرانوں سے جو تحفظ حقوق اہلبیت کے کام ہوئے ہیں، ان کو نظر اتنان سے دیکھتے ہیں اور ان کی ہوس ملک گیری ہمارے نزدیک ویسی ہی ہے جیسے سلطان محمود کے ہندو سندھ پر حملے۔

اس لحاظ سے حسن بن زید بھی ایک حکمران تھا جو اپنے ہم مشربوں سے متصادم ہوتا رہا البتہ بغداد کی خلافت سے اس کا کوئی اتحاد نہ ہو سکا۔ اس کا کھلا ہوا سبب یہ تھا کہ حسن کا عقیدہ روز روشن کی طرح عیاں تھا اور عباسی خلیفہ ایک لحظے کے لئے بھی اس پر اعتماد نہ کر سکتا اور خود حسن کو بھی اس کی طرف سے اطمینان نہ ہو سکتا پھر بھی خلافت میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ وہ حسن کی طاقت کو پاش پاش کر سکتی لہذا علوی حکومت مسلسل گھنٹی بڑھتی رہی۔

۲۶۵ھ میں حسن کو یعقوب صفار کے ساختہ پرواختہ احمد بن عبد اللہ نجستانی سے جنگ کرنا پڑی۔ نجستانی پوری تیاری سے مقابلے پر آیا تھا لہذا حسن کو شکست فاش ہوئی اور حسن نے بتقاضائے مصلحت تادان دے کر جان چھڑائی۔

حسن زید کا دم خم اب بھی ویسا ہی تھا مگر اب اس پر بڑھاپے کے آثار طاری ہوتے جا رہے تھے، ادھر یعقوب صفار کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور عمرو بن لیث اس کی جگہ لے چکا تھا جو بڑے بھائی کا لائق جانشین تھا۔

صفاریوں سے حسن کی معاصرانہ چشمک تھی لیکن اس زمانے میں معمولی جہیزوں کے علاوہ کوئی بڑا معرکہ پیش نہیں آیا حتیٰ کہ رجب ۲۷۰ھ میں بیس سال حکومت کر کے حسن اپنے خالق حقیقی سے جا ملا اور محمد بن زید نے بھائی کا منصب سنبھال لیا۔

محمد، حسن سے کم بہادر نہ تھا مگر حسن کا سیاسی ذہن وہ کہاں سے لاتا! خاندانی شرافت کی اس میں کوئی کمی نہ تھی مگر افسران لشکر پر حسن کا سارعب و داب نہ رکھ سکا..... ایک بڑا تغیر یہ بھی ہوا تھا کہ خلافت عباسیہ میں کچھ جان پڑ

گئی تھی اور ماوراء النہر کی سامانی حکومت بھی خلافت کے لئے موجب تقویت بن گئی تھی عباسی خلافت کے لئے یہ کہنا غلط ہو گا کہ اس نے جان بوجھ کر شیعوں کو برداشت کیا تھا خلیفہ کے ارادے جو عمرو بن لیث کے لئے تھے، وہی محمد بن زید کے لئے لہذا حسن بن زید کی وفات کے بعد ہی سے اندر اندر سازشیں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ ۲۷۲ھ میں قزوین کے حاکم اذکو تکین نے اچانک رے پر حملہ کر دیا۔ محمد بن زید بھی مقابلے کے لئے نکلا۔ گھمسان کاران پڑا مگر محمد بن زید کو شکست ہوئی۔ اس نے بھاگ کر جرجان میں پناہ لی..... قصبے کے بعد رے میں اذکو تکین کے مظالم ایک قالم فاتح کا ثبوت ہیں۔

اس کے بعد ہی عمرو بن لیث کو بغداد سے معزول کیا گیا اور محمد بن طاہر کو گورنر خراسان بنایا گیا۔ ۲۷۵ھ میں اس کے نائب رافع بن ہرثمہ نے جرجان پر چڑھائی کر دی۔ محمد بن زید میں لڑنے کی طاقت نہ تھی۔ اس نے راتوں رات بھاگ کر استرabad میں پناہ لی۔ رافع نے اس شہر کا محاصرہ بھی کر لیا۔ محمد بن زید دو برس تک حصار سے نکل نکل کر مقابلہ کرتا رہا لیکن دو سال کے محاصرے سے اکتا کر ایک شب بھیس بدل کر نکل بھاگا۔

رافع نے پتھما نہ چھوڑا۔ محمد کی طاقت پارہ پارہ ہو چکی تھی مگر وہ بزدل نہ تھا اس نے بار بار رافع کو منہ توڑ جواب دیا آخر ۲۷۷ھ میں رجع ہو کر طبرستان کو چھوڑ دیا اس دوران محمد بن زید کا ایک افسر رستم بن قارن رافع سے جا ملا اور علی بن کافی دالی "سالوس" نے بھی رافع کی اطاعت کر لی۔ محمد بن زید عسکری لحاظ سے کمزور پڑ چکا تھا پھر بھی اس نے سالوس کا محاصرہ کر لیا اور کافی مدت بعد جب رافع اس کو بچانے کے لئے پہنچا تو محمد و یلم کی طرف کوچ کر گیا۔

عراق و ایران کی جنگی بساط پر اب بھی علوی اور صفاری مہرے موجود تھے لیکن عباسی عمال اور بنی سامان کا پڑا بھاری پڑ رہا تھا۔ ۲۸۸ھ میں جب عمرو بن لیث کا خاتمہ ہو گیا تو مخالفین کی ہمتیں بڑھ گئیں اور ان کی نگاہیں و یلم و طبرستان پر گرو گئیں۔

محمد بن زید کی فوجی طاقت مقابلاً خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ اس کے بہت سے افسر دشمنوں سے جا ملے تھے پھر بھی شیر شیر ہی ہوتا ہے، عمرو کے بعد اس نے اپنے دیرینہ علاقے جرجان کا رخ کیا۔ اسمعیل سامانی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مزاحم ہوا کیونکہ اب وہ نہ صرف خراسان، بھتان بلکہ طبرستان تک پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ محمد اسمعیل کی دھمکی کو خاطر میں نہیں لایا۔

اسمعیل پہلے سے اس کے لئے تیار تھا اس نے ایک لشکر جہاز مرتب کر رکھا تھا جو محمد بن ہارون کی سرکردگی میں فوراً روانہ ہو گیا۔ باب جرجان پر دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا، محمد بن زید نے زندگی اور موت کی لڑائی لڑی، خود خون میں نہا گیا مگر میدان کو دشمنوں کی لاشوں سے پاٹ دیا۔ آخر اسمعیل لشکر شکست کھا کر پسا ہو گیا۔

تاریخ نے جنگ احد کا ایک منظر دیکھا تھا۔ مسلمان فحیاب ہوتے ہی لوٹ میں لگ گئے تھے اور کمین گاہ میں چھپے ہوئے خالد بن ولید مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے..... ایسا ہی ایک منظر اس جنگ میں بھی نظر آیا:

"محمد بن زید کی سپاہ مال غنیمت کی لوٹ میں لگ گئی۔ محمد بن ہارون نے یہ دیکھا تو اپنے بھانجے ہوئے سپاہیوں کو روکا اور ایک تعداد کے ساتھ پلٹ کر بھرپور حملہ کر دیا۔ اس غیر متوقع یلغار سے فتح شکست میں بدل گئی۔ محمد بن زید کے آدمی بیدریغ قتل ہونے لگے اور ایک انتشار و ابتری میں بھاگنے لگے، محمد بن زید نے فرار کو عار سمجھا، تھوڑے سے وفاداروں کے ساتھ حملے کو روکنے کی کوشش کی، زخمی پہلے ہی سے تھا ایک کا مقابلہ دس بیس سے ہوا تو زخموں کی تاب نہ لا کر گر گیا اور قید ہو کر کچھ ہی دنوں بعد مر گیا۔" (۲۳)

"محمد بن زید شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ زاہد و پاکباز اور عالم و فاضل تھے۔ جس کی تصدیق شاہ معین الدین ندوی نے اپنی تاریخ میں کی ہے۔

قیدیوں میں محمد بن زید کا بیٹا زید بن محمد بھی تھا جس کو ابن خلدون کے بیان کے مطابق اسمعیل نے آرام سے رکھا پھر رہا کر دیا۔

۲۸۹ھ میں اسمعیل نے طبرستان پر قبضے کے بعد ولیم پر فوج کشی کی اور

کامیاب ہوا اس طرح سامانی حکومت خراسان و طبرستان تک پھیل گئی۔ طبرستان کا ایک حصہ آل زید کے قبضے میں رہا۔ زید بن محمد بن زید اس پر حکومت کرتا رہا پھر اس کا بیٹا حسن اس علاقہ کا فرمانروا ہوا آہستہ آہستہ اس نے جاگیر کی شکل اختیار کی اور حکومت کے بجائے حکومت کے آثار باقی رہ گئے۔

### حکومت زیدیه: آغاز و انجام

چوتھی صدی ہجری کا اٹھان حکومت سامانیہ کے شباب کا تھا اور ماوراء النہر سے خراسان تک اس کے پرچم لہرا رہے تھے۔ طبرستان و ولیم بھی اس کے تابع تھا لیکن شیعوں میں بیداری کی جو لہر دوڑی تھی، وہ حکومت کے روکے رک نہ سکی اور انفرادی کوششیں جاری رہیں ان کوشش کرنے والوں میں اطروش نامی ایک بزرگ بھی تھے۔

"اطروش کا نام حسن تھا جو علی بن حسین بن علی بن عمرو بن زین العابدین کا بیٹا تھا۔ محمد بن زید کی شہادت کے بعد وہ ولیم چلا گیا۔ تیرہ برس تک وہیں ٹھہرا رہا اور اسلام کی دعوت و تعلیم دیتا رہا اور وہاں لوگوں سے عشر لینے پر اکتفا و قناعت کرتا رہا۔ ولیم کا بادشاہ ابن حسان اسکی مدافعت اور روک تھام کرتا پھر بھی ولیم کا ایک بڑا گروہ اس کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اطروش نے ولیم کے بلاد میں مسجدیں بھی بنوائیں اور لوگوں کو مذہب شیعہ زید یہ کی تعلیم بھی دی۔" (۲۴)

اس دوران سامانی حکومت کی طرف سے کئی عامل متعین ہوئے جنہوں نے اہل ولیم پر خوب ستم ڈھائے۔ آخر ابو العباس محمد بن ابراہیم تعینات کیا گیا وہ بھی عوام کے لئے بہت ظالم ثابت ہوا جنگ آکر ولیم والوں نے اطروش کو حملے کی دعوت دی۔

ابو العباس سے اطروش کا سخت معرکہ ہوا جس میں ابو العباس کو شکست ہوئی، اس عرصے میں اطروش کا داماد حسن بن قاسم بھی مدینے سے آگیا اس نے اکثر محصورین کو قتل کر دیا، ۳۰۱ھ میں "الناصر" کے لقب سے طبرستان پر قبضہ کر لیا۔



سامانی عامل کی پناہ میں چلا گیا تھا جو فی الوقت جرجان پر قابض تھلاس کی مدد سے ابو علی حسین بن اطروش نے طبرستان پر قبضہ کیا..... آگے چل کر اسفار خود جرجان کا سامانی حکمران بن گیا۔

اس سے اور اولاد اطروش سے متعدد معرکے ہوئے، جن میں فریقین کامیاب اور ہزیمت یاب ہوتے رہے پھر اطروش کے بیٹے اور پوتے باہم دست و گریبان ہوتے رہے، ماکان بن کافی کبھی ایک کا ساتھ دیتا، کبھی دوسرے کا، نتیجے میں کبھی ایک کسی علاقے پر قابض ہو جاتا کبھی دوسرا۔ ۳۲۱ھ میں ابو علی بن اسمعیل بن جعفر اطروش طبرستان کا حکمران تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ مروادج رے پر قابض تھلاس نے ابو جعفر بن محمد بن ابوالحسن احمد بن اطروش کی حمایت کی ماکان کو طبرستان سے نکال دیا، اور ابو جعفر کو تخت نشین کیا۔

اس کے انتقال پر اس کا بھائی "الثائر" کے لقب سے فرمانروا بنایا گیا جس نے دشمنوں سے شکست کھائی اور پہاڑوں میں جا کر پناہ گزین ہوا اور اپنی حکومت کے تیس سال بعد ۳۵۵ھ میں وفات پا گیا۔ حسن بن جعفر (الناصر کے لقب سے) بھائی کا جانشین ہوا۔ حاکم جبل نے اس کو گرفتار کر کے خلیفہ بغداد کے پاس بھیج دیا۔ اس طرح اطروش کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

### خاندان حمدانیہ

انتزاع خلافت میں طاہری، علوی، صفاری اور سامانی جو بھی آزاد حکومتیں قائم ہوئیں ان سب کا بنیادی تعلق کسی نہ کسی طرح خلفائے عباسیہ سے قائم رہا اور ہر حکمران اس کے لئے مجبور تھا کیونکہ گئے گزرے حالات میں بھی عوام کے ذہنوں پر خلافت کے تقدس کا غلبہ تھا اور عسکری طاقت کے لحاظ سے بھی مرکز خلافت اتنا کمزور نہ ہوا تھا کہ اس کو آسانی سے شکست دی جاسکتی اس لئے طاہری بادشاہ اور صفاری تاجدار ہر ایک نے کوشش کی کہ بظاہر خلیفہ وقت کا ہوا خواہ بنائے اس انداز کو موصل اور حلب کے حمدانی بادشاہوں نے بھی اپنائے رکھا اور مرکز خلافت کا سہارا لے کر حکومت کی بنیادیں مضبوط کیں۔

۳۰۲ھ میں بمقام سالوس ابو العباس اور الناصر کا مقابلہ ہوا۔ اس میں بھی ابو العباس ہزیمت یاب ہوا، ۳۰۲ھ میں سعید بن نصر خود غراسان کا لشکر عظیم لیکر نکلا، اطروش اس کی تاب نہ سکا اور میدان جنگ میں کام آیا۔

اطروش کے تین بیٹے تھے، ابو القاسم، حسن اور حسین، چوتھا داماد حسن بن قاسم تھا جو صحیح معنوں میں اطروش کا پیر و تھا اور داعی صغیر کہا جاتا تھا۔

۳۰۸ھ میں اس نے ولیم کے سالاران لشکر میں سے لیلیٰ ابن نعمان کو جرجان میں مامور کیا جو "المویدلین المنتصر لال رسول اللہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا۔ اس کی نیشاپور کے سامانی عامل قراٹکین سے کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں لیلیٰ کو کامیابی نصیب ہوئی، حسن بن قاسم کا نیشاپور پر قبضہ ہو گیا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکے بھی جاری کر دیا۔

سعید بن نصر کو بخارا میں اس کی خبر ملی تو وہ غصے میں کھول گیا۔ اس نے ایک لشکر جہاز مرتب کیا، نامی گرامی بہادروں کو اس لشکر میں شامل کیا۔ حمویہ بن علی کو سپہ سالار بنایا اور لشکر کو مفتوحہ علاقے واپس لینے کے لئے روانہ کر دیا

لیلیٰ بن نعمان ان تیاریوں سے بے خبر تھا وہ طوس میں مقابلے پر آ گیا۔ عسکری طاقتوں میں کوئی تناسب نہ تھا پھر بھی لیلیٰ بڑی بہادری سے لڑا مگر شکست یاب ہوا، بھاگ کر آمد ہنچا لیکن دشمن نے پہچانہ چھوڑا اور آمد میں گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔

حسن بن اطروش استرabad میں مقیم تھا اس نے وٹلی سردار ماکان بن کافی کو نظم و نسق کا منظم اعلیٰ بنار کھا تھا۔ سعید بن نصر نے غراسان سے چار ہزار سوار روانہ کئے، حسن نے دو گنی طاقت سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور بھاگ کر استرabad آیا۔ وہاں ماکان کو اپنا ناقہ مقام بنا کر ساریہ کا عازم ہو گیا۔

سعید بن نصر نے ایک دوسرا لشکر استرabad کی طرف بھیج دیا اور ماکان نے ساریہ پہنچ کر پناہ لی مگر ۳۱۴ھ میں دوبارہ استرabad کو حاصل کر لیا۔

وٹلی سرداروں میں اسفار بن شیرویہ، سیکری، مروادج اور سولویہ، ماکان بن کافی کے ساتھیوں میں تھے مگر اسفار کسی بات پر ناراض ہو کر نیشاپور کے



ان میں سے بیشتر بڑے بہادر، ادیب و شاعر، علم پرور تھے لیکن ان میں سے کسی نے شیعیت کی کوئی خدمت نہیں کی، البتہ ان کے دور میں مقبوضہ علاقوں کے شیعہ قلم و تشدد سے محفوظ رہے۔

اسی دور میں بنی عقیل کی حکومت وجود میں آئی اور سلطنت بنی ہاشمہ کی داغ بیل پڑی، ماور النہر کی سامانی حکومت اپنے انجام کو پہنچی اور اس کے بجائے عزنی میں سبکتگین بن الہتکین نے ایک نئی حکومت قائم کر لی۔

بنی حمدان اس اعزاز کے باوجود ہر طرح خلافت عباسیہ کے تابع تھے لیکن دولت و اقتدار میں رشک و حسد لازم ہوتا ہے، آل حمدان بھی اس سے خالی نہ رہے اور رشتے ناتوں کا لحاظ کئے بغیر ایک دوسرے سے حکومت چھین لینے کی کوشش کرنے لگا۔

ناصر الدولہ ابو محمد حسن موصل و دیار ربیعہ کا والی تھا لیکن اس کے چچا ابو العلاء نے اس کے خلاف سازش کی اور خلیفہ راضی سے بھتیجے کی پوری مملکت کو ٹھیکے پر لے لیا۔ ناصر الدولہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ موصل سے مل گیا پھر دوسرے راستے سے موصل پہنچ کر ابو العلاء کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ یہ بات راضی کو ناگوار گزری۔ اس نے ابن مقلہ کو ناصر الدولہ کی تادیب کے لئے روانہ کیا۔ ناصر الدولہ اس کی زد سے ہٹ گیا اور جب ابن مقلہ موصل میں اپنے نائب چھوڑ کر واپس چلا گیا تو اس نے دونوں کو موصل سے نکال دیا اور خلیفہ کو ہموار کر کے پھر امارت کا پروانہ حاصل کر لیا۔

زوال پذیر حکومتیں ہمیشہ محلاتی سازشوں کا شکار ہوتی رہی ہیں۔ عباسی دربار بھی اس سے خالی نہ تھا۔ امیر یاقوت ابو عبد اللہ بریدی کے ہاتھوں قتل ہو گیا واسط و بصرہ کا امیر ابن رائق موقع سے فائدہ اٹھا کر امیر الامراء بن گیا، کچھ عرصے کے لئے اس کی جگہ حکم نے لی پھر ابن رائق اپنی جگہ پر آ گیا۔ اسی دوران خلیفہ متقی فوج کا مطالبہ پورا نہ کر سکا اور فوج ابن بریدی سے جا ملی، خلیفہ نے بغداد سے بھاگ کر موصل میں پناہ لی۔ ناصر الدولہ نے ابن رائق کو قتل کر دیا اور خلیفہ نے ناصر الدولہ کو امیر الامرائی کے عہدے پر فائز کر دیا اور اس کے بھائی ابو الحسن علی کو

عرب کے قبیلہ تغلب کی یہ شاخ کسی مدت سے نواح موصل میں آباد تھی اور عقیدے کے لحاظ سے آل رسول کو حق بجانب تصور کرتی تھی۔ اس کا رابطہ عباسی خلفاء سے بھی تھا۔ ۲۸۱ھ میں اس کے ایک سردار قبیلہ محمد بن حمدان بن حمدون نے مار دین پر قبضہ کر لیا مگر ایک ہی سال کے بعد مسموم عباسی کی سپاہ نے اسے مار بھگایا پھر ابو الہیجا عبد اللہ بن حمدان کو موصل کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

مرکز خلافت سے اس قبیلے کے تعلقات خوشگوار تھے، اس نے ۳۰۷ھ میں ابراہیم بن حمدان کو دیار ربیعہ کا عامل بنا دیا، سعید بن حمدان کو ۳۱۲ھ میں نہادند کی حکومت عطا ہوئی۔ ابو الہیجا اور بعض دوسرے بزرگ عموماً بغداد میں رہتے۔ ان کے بیٹے اور بھتیجے بزرگوں کی نیابت میں نظم حکومت کی دیکھ بھال کیا کرتے۔ چنانچہ حسن بن ابو الہیجا ایک لائق حکمران ثابت ہوا۔ اس نے اچھے انتظام سلطنت کے ساتھ ساتھ خلیفہ کی نظر میں بھی وقار حاصل کیا اور ۳۳۰ھ میں ناصر الدولہ کے خطاب سے نوازا گیا۔

حسن کا بھائی علی واسط کا گورنر تھا اور ایک شجاع اور مدبر حکمران تھا اس نے حلب اخشیدیوں سے چھین لیا اور کئی معرکوں میں یونانیوں کو ہرا کیا۔ دربار خلافت سے اس کو سیف الدولہ کا خطاب دیا گیا۔

حمدانیوں کا شمار چوتھی صدی ہجری کے چند مقتدر خاندانوں میں ہوتا تھا اس کے افراد مرکزی حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز تھے اور بجا طور پر عباسی سلطنت کے انحطاط میں خود مختار بادشاہ بن جانے کے اہل تھے۔

یوں تو وہ تقریباً ۱۵۰ سال تک اقتدار سے وابستہ رہے لیکن صحیح معنی میں ان کا زمانہ حکومت ۳۱۷ھ تا ۳۹۴ھ قرار دیا جاسکتا ہے۔

موصل میں اس خاندان کے تین نامور حکمران گزرے: ناصر الدولہ، عضد الدولہ ابو تغلب اور ابو عبد اللہ حسین۔

حلب میں سیف الدولہ، ابو المعالی، سعید الدولہ، ابو الفضائل، ابو الحسن علی، ابو المعالی شریف۔

ہوا۔ ان کا ایک سردار لشکر ماکان بن کافی طبرستان پر قابض ہو گیا تھا مگر دوسرے سردار اسفار نے اس کو مار بھگایا پھر ۳۱۶ھ میں وہ خود لہسنے ہی امیر مروادج کے ہاتھوں شکست یاب ہو کر قتل ہوا، اسی زمانے میں خاندان بوہسہ کے جد اعلیٰ فوجی ملازمت میں داخل ہوئے۔

”ابو شجاع فنا خسرو بوہسہ یزدجرد بادشاہ فارس کی نسل سے تھا۔ اس کے بزرگوں نے ابتدائے ظہور اسلام میں عرب سے بھاگ کر گیلان میں سکونت اختیار کر لی تھی سچونکہ مدتوں ویلیوں میں رہے، خود بھی ویلی کہلانے لگے تھے۔ بوہسہ ایک مرد متوسط الحال بحیرہ کیسپین سے پھلیاں پکڑ کر گزارا کیا کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے، علی، حسن اور احمد۔ یہ ماکان کافی کے ملازم ہو گئے۔ ماکان کا حال بگڑ گیا تو انہوں نے ۳۱۸ھ میں مروادج کی ملازمت اختیار کر لی۔ مروادج نے علی کو ہمدان اور اصفہان کے درمیان علاقہ کرخ کا حاکم بنا دیا (۲۵) یہ ہے خاندانی پس منظر اور ارتقاء کی پہلی منزل بنی بوہسہ کی لیکن بعض متعصب مورخین نے انہیں مجہول النسب قرار دیا ہے اور نسب نامے پر قلم کی اتنی روشنائی گرا دی ہے کہ وہ پڑھانے کے پھر بھی ان کا عروج خاندانی مردانگی اور تدبیر کا بدیہی ثبوت ہے جسے چھپایا نہیں جاسکتا۔

علی نے کرخ میں اپنے بھائیوں اور اہل خاندان کے تعاون سے راعی اور رعایا کو شیر و شکر کر دیا اور عوام کو استناگر ویدہ بنالیا کہ اس کا دائرہ حکومت چھوٹی سی فوجی چھاونی بن گیا اور ۳۲۰ھ میں اس نے عباسی گورنر مظفر بن یاقوت سے اصفہان چھین لیا پھر ار جان فتح کیا، ۳۲۱ھ میں نوہند جان اور ۳۲۲ھ میں شیراز مسخر کیا اور شیراز کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا۔

اس طرح علی بن بوہسہ نے سادات زیدیہ کی مردہ حکومت کو ایک نئے نام سے نشاۃ ثانیہ عطا کی اور اس شیعہ حکومت کے لئے زمین بنائی جو عراق و عجم، کرمان و فارس، آذربائیجان اور خوزستان تک پھیل گئی پھر اس میں عرب، عمان، احساء، بحرین اور جزیرہ وغیرہ بھی شامل ہو گئے۔

اس حکومت کے جبروت اور سطوت کا یہ عالم تھا کہ خلفائے بغداد عملاً اس

سیف الدولہ کا خطاب دیا۔

ابن بریدی نے ابن رائق کی زندگی ہی میں بغداد پر قبضہ کر لیا تھا لیکن ناصر الدولہ جب خلیفہ کو لیکر بغداد کی طرف بڑھا تو ابن بریدی بھاگ کھڑا ہوا لیکن واسط میں قیام کر کے پوری تیاری سے واپس ہوا، سیف الدولہ نے اسے شکست دی اور ۳۳۱ھ میں اس پر چڑھ دوڑا۔ اس درمیان دو ترکی افسروں نے فوج اور توڑون نے بغاوت کر دی اور سیف الدولہ کے بڑاؤ پر حملہ کر دیا اور سیف الدولہ کو بغداد چھوڑنا پڑا تو ترکوں نے اس کی بغدادی قیام گاہ کو لوٹ لیا۔ اس طرح ناصر الدولہ کی امیر الامرائی کا خاتمہ ہو گیا۔

فوج اور توڑون میں فوج کی سپہ سالاری اور حکومت کی تقسیم ہو گئی تھی مگر کچھ عرصہ بعد دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور توڑون نے فوج کو گرفتار کر کے اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروادیں۔

خلیفہ متقی ناصر الدولہ کی پناہ میں تھے لیکن کچھ دنوں بعد انہوں نے حمدانیوں کی روش میں تبدیلی محسوس کی اور توڑون پر اعتماد کر کے بغداد آگئے، توڑون نے ان کو اندھا کر دیا اور ان کی جگہ مستغنی کو خلیفہ بنالیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بنی بوہسہ کی حکومت پوری توانائیوں کے ساتھ برسر عمل تھی لہذا ابن حمدان سے ان کا ٹکراؤ ناگزیر تھا جو پچھلے کئی برسوں سے ہو رہا تھا۔ وقت کی مدد ربحی ترقی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا کیونکہ فی الوقت دو ہی طاقتیں میدان میں تھیں: ایک حمدانی دوسری بوہسہ۔ دونوں مسلک کے لحاظ سے شیعہ تھیں لیکن اقتدار کی کشمکش میں مذہب و مسلک کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا اس لئے ایک دوسرے سے برسوں تک برسر پیکار رہا۔

### آل بوہسہ تعارف

اس خاندان کے عروج کا پہلا پتہ طبرستان کی حکومت زیدیہ کی بساط پر رکھا گیا..... حکومت زیدیہ تیسری صدی ہجری کے اواخر میں اپنے آغاز کے بعد جرجان سے، کاشان تک پھیل گئی تھی پھر آپس کے جھگڑوں کے سبب اس کا انحطاط شروع



کے دست نگر اور محکوم تھے کہنے کو وہ عباسی خلفاء کے امیر الامراء تھے مگر دراصل تھے خلیفہ گر۔ خلفاء کا روزِ نہ ان کی طرف سے مقرر تھا، تمام ملکی، فوجی اور مالی معاملات تاجدارانِ بویہ سے متعلق تھے۔ خطبہ اور سکے میں ان کے ساتھ خلیفہ کا نام شامل تھا اور وہ دکھانے کو خلیفہ کے سامنے بادبِ بیٹھتے تھے جو ویسی ہی مصلحت تھی جس کا سلسلہ خاندانِ طاہریہ سے شروع ہوا تھا۔

”شیراز پر قبضے کے بعد فوج نے علی سے روپے کا مطالبہ کیا، اس کے ہاتھ بالکل خالی تھے، وہ بہت مرتد ہوا۔ ایک دن وہ دارالامارہ میں بیٹھا اسی فکر میں ڈوبا تھا کہ ایک سانپ چھت سے نکل کر ایک سوراخ میں گھس گیا، علی نے فراشوں کو سوراخ کھودنے کا حکم دیا، اسے کھودا گیا تو ایک کھڑکی نظر پڑی، اس میں سے پانچ لاکھ اشرفی کا سامان نکلا، اس غیبی مدد سے علی کا بگڑا ہوا کام بن گیا۔“ (۲۶)

بنی بویہ کے پہلے حکمران کی شخصیت و حکومت دونوں مسلم ہو چکی تھیں پھر بھی اس نے عباسی خلیفہ سے توثیق کرانے کے لئے ایک زرِ سالانہ کی پیش کش کی اور اس کو ”راضی“ سے سند اور عماد الدولہ کا خطاب عطا ہوا اور خلعت و لوائے حکومت بھی دیا گیا۔

مرواوتحِ علی کا یہ اعزاز بہت گراں گزرا، وہ اس پر پوری طاقت سے حملہ آور ہو گیا، عماد الدولہ علی نے مصلحتِ وقت سمجھ کر صلح کر لی..... کچھ عرصے بعد مرواوتح کو خود اس کے ترک سپاہیوں نے قتل کر دیا۔

عراق و خوزستان کے بعض علاقے عباسی خلیفہ کی ذاتی جاگیر تھے۔ اس پر امیرِ یاقوت اور ابو عبد اللہ بریدی دونوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں چنانچہ اسی سلسلے میں امیرِ یاقوت اور عماد الدولہ کا تصادم ہوا اور عماد الدولہ نے یاقوت کو شکست دے کر صلح پر مجبور کر دیا اور راضی نے اس کو فارس، عراق، خوزستان کا باقاعدہ حکمران بنا دیا اور عماد الدولہ کی اس حکومت کا آغاز ہو گیا جو اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقت کہی جاتی تھی۔

عماد الدولہ علی نے سلطنت کی تقسیم اس طرح کی کہ شیراز کو مرکز حکومت بنا کر فارس کو براہِ راست اپنی ماتحتی میں رکھا، رکن الدولہ حسن کو ہمدان اور

قزوین سمیت اصفہان کا حکمران بنایا، تنبیرے بھائی معز الدولہ احمد کو کرمان، عراق کی حکمرانی عطا کی۔

تینوں بھائیوں کو خلافت پر غلبہ حاصل تھا، خطبے میں بھی ان کے نام لئے جاتے تھے۔ ان کی سلطنت عراق و عجم، آذربائجان و خوزستان، کرمان و فارس، عرب، عمان، احسا، بحرین اور جزیرہ تک پھیلی ہوئی تھی۔

خلیفہ ان کے وظیفہ خوار تھے، تمام ملکی، سیاسی اور مالی معاملات ان کے حیطہ اختیار میں تھے۔ ذاتی طور پر سب کے سب بڑے عالم و فاضل اور پاکمال تھے، عقیدتاً وہ شیعہ تھے مگر اپنے درباروں میں انہوں نے شیعہ سنی ہر مکتبہ فتنہ کے علماء کو جگہ دی تھی۔ ادیب، شاعر، فلسفی، سائنسدان، فقیہ، محدث اور مورخ اور دیگر کالمین فن کی سرپرستی کرتے، نظم و نسق اتنا اچھا تھا کہ زبردست کسی کمزور کو دبانہ سکتا، بادشاہ خود ہر فریادی کی داد رسی کرتا تھا۔

فوج کی تنظیم میں انہیں یہ طولی حاصل تھا اور اسی میں ان کی طاقت کا راز چھپا ہوا تھا۔

بعض مورخین نے بویہی عملداروں کے رعایا پر تشدد کے واقعات لکھے ہیں مگر وہ بھول گئے کہ شخصی حکومت کے ہر عہد میں اس کی نظریں پائی جاتی ہیں۔ سلجوقی، غزنوی اور ایوبی کوئی دور اس سے خالی نہیں تو صرف بویہیوں کو ہی مورد الزام کیوں قرار دیا جائے، بالخصوص معز الدولہ کو۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایک غالی شیعہ تھا لہذا اس کی شیعیت نے سارے محاسن کو ملیا میٹ کر دیا اور قالم و جابر کے القاب سے نوازا گیا۔ سلطان محمود کی خونخواری اور غارت گری کے باوجود اس کو محی الدین و الملک لکھا گیا لیکن معز الدولہ کو کسی مورخ نے سلطان بھی نہیں لکھا حد ہے عصبيت کی جبکہ ابن خلدون نے خود لکھا ہے کہ اس خاندان کے بیشتر فرماں رواؤں کو دربار خلافت سے سلطان کا لقب دیا گیا تھا۔

۳۸۸ھ میں ستاون سال کی عمر میں عماد الدولہ کا انتقال ہو گیا تو رکن الدولہ قبیلے کا رئیس اعظم ہوا اور اس کا بیٹا عضد الدولہ و صیت شیراز کا حکمران بنا۔ ”مورخین نے لکھا ہے کہ وہ نیک نہاد، عادل، حلیم، شجاع، مکارمِ اخلاق

توزوں اس مہم سے واپس ہی ہوا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا اور ابن شیرزاد اس کا جانشین ہوا۔

عراق کا بوہی حکمران ان تغیرات سے بے خبر نہ تھا۔ واسطہ کو فتح کرنے کے بعد وہ بغداد کی طرف متوجہ ہوا۔ مستکنی میں معز الدولہ امداد سے لڑنے کی طاقت نہ تھی لہذا معز الدولہ بآسانی بغداد پر قابض ہو گیا اور خلیفہ کی طرف سے اس کو سلطان کا لقب دیا گیا۔

”بنی بوہہ اور سلجوقیہ کا ہر وہ شخص جو سلطنت کے سیاہ و سفید کا اختیار رکھتا، سلطان کے لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔“ (۲۸)

ناصر الدولہ حمدانی کو اس کی خبر ہوئی تو وہ آگ بگولا ہو گیا کیونکہ وہ بغداد کو اپنا حق سمجھتا تھا لہذا وہ پوری فوجی تیاری کے ساتھ موصل سے چل پڑا۔ معز الدولہ مستکنی کو معزول کر کے مطیع کو تخت خلافت پر بٹھا چکا تھا اس نے پہلے اپنے سپہ سالاروں کو ناصر الدولہ کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا پھر خلیفہ مطیع کو لے کر خود بھی روانہ ہو گیا۔

عکبرا کے مقام پر معز الدولہ کے مقدمہ لشکر سے ناصر الدولہ کی فوجوں کا خونریز معرکہ ہوا۔ اس عرصہ میں خود معز الدولہ بھی پہنچ گیا اور اکاد کا لڑائیوں میں ناصر الدولہ کا تخت نقصان ہوا مگر ابن شیرزاد کی غداری سے معز الدولہ کے لشکر کے لئے رسد آنا بند ہو گئی جس سے وہ تخت مصیبت میں پھنس گیا مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس پامردی کے نتیجے میں ناصر الدولہ کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر موصل کا عازم ہو گیا۔

معز الدولہ نے اس کا بیچا نہ چھوڑا۔ آخر ناصر الدولہ نے مصطفت سمجھ کر معز الدولہ سے صلح کر لی لیکن لڑائیوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ معز الدولہ نے کئی بار موصل پر قبضہ کیا مگر ناصر الدولہ نے واکزار کر لیا۔ ۳۴۵ھ میں ناصر الدولہ نے بغداد پر حملہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۳۵۳ھ میں دونوں میں پھر صلح ہو گئی۔

سے آراستہ اور محاسن آداب سے پیراستہ تھا۔ عامرہ خلائق سے مرحمت و ملاطفت سے پیش آتا اور ضعفاء و رعایا کی دلجوئی کرتا۔ اس کے زمانہ حکومت میں رعایا مرفہ حال اور آسودہ رہی۔“ (۲۷)

### حمدان اور بوہیہ کے معرکے

شاہ معین الدین ندوی نے لکھا ہے: ”حمدانی نسلاً عرب اور مذہباً سنی تھے۔ یہ ایک پرانی ریت ہے، حسب ضرورت سنی کو شیعہ اور شیعہ کو سنی بنادینا قلمکاری کا کرشمہ رہا ہے جیسا کہ پچھلے دنوں پاکستان میں قائد اعظم محمد علی جناح کے لئے ہوا اور ایک مسلم شیعہ کے سنی ہونے کا دعویٰ کر دیا گیا۔

جہاں تک بنی حمدان کا تعلق ہے تو بلاشبہ وہ حلقہ امامیہ سے تعلق رکھتے تھے مگر خلافت بغداد سے وابستگی اور امور مملکت کے تحت انہوں نے شیعوں کی کھلی ہوئی سرپرستی نہیں کی اور نہ سنیوں سے کوئی تعصب برتا لہذا انہیں سنی کہہ دیا گیا حالانکہ اس سے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور افراد کے مغرضہ اضافے سے کسی حلقے کی وقعت نہیں بڑھتی۔ علی اپنی جگہ پر علی ہی رہتے ہیں شیخین کی سیاسی حیثیت شرعی نہیں بن جاتی جسکو علی نے اقتدار کی خاطر بھی تسلیم نہیں کیا۔

بنی حمدان شیعہ تھے اور شیعہ ہی رہے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہوس اقتدار میں انہوں نے بلا لحاظ مسلک کبھی جاہ طلبی کا راستہ نہیں چھوڑا اسی لئے ماضی کی طرح شیعہ طاقتیں اس دور میں بھی ٹکراتی رہیں اور بنی حمدان اور بنی بوہہ وقتاً فوقتاً نبرد آزما نظر آتے رہے۔

بغداد کی خلافت پچھلی دو دہائیوں سے موصل کی دست نگر رہی تھی مگر اب اس پر توزوں کا قبضہ تھا جو عبداللہ بن بریدی کے بھائی ابوالمسین بن بریدی کو خلیفہ مستکنی کے حکم سے قتل کرانے کے بعد مطلق العنان ہو گیا۔ ابن شیرزاد اس کا داہنا ہاتھ تھا۔ ناصر الدولہ ان حالات سے بے تعلق نہ تھا۔ وہ بغداد پر چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ توزوں خلیفہ مستکنی کو لے کر موصل کا عازم ہو گیا لیکن ۳۳۲ھ میں دونوں کے مابین صلح ہو گئی۔

## شاہین حکومت

عمران بن شاہین جامدہ کا ماہی گیر مگر بڑا دلیر اور باحوصلہ شخص تھا۔ ایک بار جامدہ کے علاقے میں اس نے بعض سرکاری محاصل وصول کر لئے اور گرفتاری کے خوف سے بطحہ آگیا۔ یہاں جنگی چشموں کے کنارے پھیلیوں اور پرندوں کے شکار پر گزر اوقات کرنے لگا جس میں بعض دوسرے لوگ بھی اس کے شریک ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھی موقع پا کر راہ گیاروں کو بھی لوٹ لیتے تھے۔ اس طرح جیالوں اور بہادروں کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہو گئی پھر وہ معزالدولہ کے مخالف ابوالقاسم بریدی سے جا کر مل گیا لیکن ۳۳۵ھ میں جب معزالدولہ نے ابوالقاسم کی طاقت ختم کر کے بصرہ پر قبضہ کر لیا تو عمران بن شاہین اس سے الگ ہو کر اپنی طاقت بڑھانے لگا اور آخر بطحہ کے بعض علاقوں پر قبضہ کر کے ایک چھوٹی سے حکومت بنالی۔

معزالدولہ نے اس کی سرکوبی کے لئے کئی بار فوجیں بھیجیں جنہوں نے اس کو شکستیں دیں مگر بعض مرتبہ اس نے بوہی لشکر کو پسپا کر دیا آخر معزالدولہ نے اس کی صلح کی پیش کش مان لی اور اس کو بطاح کا حاکم بنادیا۔

اس کے بعد بھی وہ نچلا نہ بیٹھ سکا، ایک بار اس نے ابوہزاع کا خراج چھین لیا، معزالدولہ اس کی قوت کو توڑ دینا چاہتا تھا لیکن اس کا ارادہ پورا نہ ہو سکا اور ابن شاہین کی باقاعدہ ریاست قائم ہو گئی جس کے بعد یکے بعد دیگرے آٹھ حکمران گزرے۔

## سلطان معزالدولہ : ایک عظیم حکمران

بوہی حکومت کا بانی بلاشبہ عمادالدولہ علی تھا لیکن اس کو سر بلند کرنے میں معزالدولہ احمد کو بڑا دخل رہا۔ اس نے حدود سلطنت کو اتنا وسیع کر دیا کہ وہ مغربی ایشیا میں عباسی سلطنت کی سابقہ وسعت کو چھونے لگی۔ ناصرالدولہ حمدانی اس کا سب سے بڑا حریف تھا جو خود معزالدولہ سے کم نہ

تھا لیکن بوہی حکمرانوں نے ہر میدان میں اس کے دانت کھٹے کر دیئے مگر ناصرالدولہ بھی آسانی سے مات ماننے والا نہ تھا، وہ صلح کرتا اور موقع پاتے ہی اس کو توڑ دیتا اور ایک بار پھر قسمت آزمائی کے لئے تلوار کو بے نیام کر لیتا۔

۳۳۶ھ میں جب ترک سردار تکیں نے ناصرالدولہ کے خلاف بغاوت کی تو ناصرالدولہ نے معزالدولہ سے مدد مانگی۔ معزالدولہ نے ایک فوج اپنے وزیر ابو جعفر ضمیری کی سرکردگی میں بھیج دی اور ناصرالدولہ نے تکیں کو گرفتار کر کے آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروادیں اور حسب قرار داد ابن شیرزاد کو گرفتار کر کے ضمیری کے حوالے کر دیا۔

پھر ناصرالدولہ کو دوسرے ترک سردار جہان کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ ناصرالدولہ نے بمشکل اس پر قابو پایا مگر اس کو یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ اس بغاوت میں ویلیوں کا ہاتھ ہے۔ اس کی خبر معزالدولہ کو بھی ہوئی اور دونوں طرف سے بدظنی نے شدت اختیار کر لی جس کے نتیجے میں طرفین جنگی تیاریاں کرنے لگے۔

۳۳۷ھ میں معزالدولہ بغداد سے روانہ ہوا، ناصرالدولہ موصل سے نصیبین کا عازم ہوا، معزالدولہ سید حاموصل پہنچا اور اس پر قبضہ کر لیا اسی دوران یہ خبر گوش گزار ہوئی کہ خراسان کی فوج نے بغاوت کر دی ہے۔ معزالدولہ نے اپنے بھائی رکن الدولہ کو خراسان روانہ کر دیا۔ اس وقفے میں ناصرالدولہ نے صلح کی پیش کش کی جس کو معزالدولہ نے قبول کیا اور چونسٹھ ہزار درہم سالانہ پر موصل جزیرہ اور شام کی سند حکومت اس کو عطا کی۔ شرائط صلح میں طے پایا کہ خطبات میں اس کا اور رکن الدولہ و عمادالدولہ کے نام بھی لئے جائیں گے۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ ذی الحجہ ۳۳۷ھ میں بغداد واپس ہو گیا۔

ناصرالدولہ نے ماضی کی طرح کچھ ہی دنوں میں علم بغاوت بلند کر دیا اور معزالدولہ نے ۳۳۸ھ کے درمیان پھر موصل پر قبضہ کر لیا ناصرالدولہ نصیبین چلا گیا اور چلتے وقت تمام مال و اسباب لیتا گیا جس سے بوہی فوج میں کھانے پینے کی بھی تنگی ہو گئی مگر معزالدولہ نے ناصرالدولہ کے آدمیوں کو توڑ کر یہ مشکل آسانی



## تجدد

یوں تو معزالدولہ کے عہد کی بہت سی خصوصیات ہیں مگر تبرا کو ان میں اہمیت حاصل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک صبح جامع مسجد بغداد کے پھانک پر لکھا پایا گیا۔  
"معاویہ بن ابی سفیان پر لعنت اور ان لوگوں پر لعنت جنہوں نے حقوق فاطمہ غصب کئے، جنہوں نے حسن کو نانا کے پہلو میں دفن ہونے نہیں دیا، جنہوں نے ابوذر کو خارج البلد کیا جنہوں نے عباس کو شوریٰ سے لکھوایا۔"

اگلی رات کسی نے پوری عبارت منادی۔ معزالدولہ دوبارہ لکھوانا چاہتا تھا مگر بعض مشیروں کے کہنے پر صرف معاویہ اور قاتلان آل رسول پر لعنت لکھ دی گئی۔  
بڑی جھجک کی جاتی ہے معزالدولہ کے اس عمل پر۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ معزالدولہ علی کے پیرو تھے، انہیں معاویہ کے فعل کی تقلید نہیں کرنا چاہئے تھی۔  
ابن ابی سفیان نے اگر علی پر ستر ہزار منبروں سے تبرا کر لیا تھا تو معزالدولہ کو معاویہ کے بجائے اپنے مہولی کی تاسی کرنا چاہئے تھی۔ جس طرح امیر المومنین نے اختیار رکھتے ہوئے بھی تلوار نہیں اٹھائی تھی اور صبر سے کام لیا تھا اسی طرح معزالدولہ کو بھی ایسا جواب نہیں دینا چاہئے تھا مگر معزالدولہ ایک دنیاوی حکمران تھا، وہ علی کا ظرف کہاں سے لاتا پھر صبر کا یہ مانہ بھی لہریز ہو چکا تھا، وہ ڈھائی سو برس تک سنتے رہے تھے، کہاں تک سنتے۔ آخر اسی لب و لہجہ میں جواب دینا پڑا جو بشریت کا تقاضا تھا۔

پھر معزالدولہ اور تمام شیعہ حکمران کوئی دینی رہنما تو تھے نہیں۔ انہوں نے آنحضرت کی وفات کے بعد سے سو سال تک دیکھ لیا تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیئے بغیر چارہ نہیں اور جو شرافت کی زبان نہیں سمجھتا، اس کو اسی کی زبان میں سمجھانا چاہئے۔

اس اصول پر اگر معاویہ پر لعنت کی گئی تو برا ماننے کی کیا بات ہے۔ معاویہ کیسے تو وہی کہا گیا ہے جو اس نے علی کے لئے کہا تھا۔

ایک بار پھر ناصرالدولہ کی طرف سے معافی کی استدعا کی گئی مگر معزالدولہ نے انکار کر دیا آخر بہت کہنے سننے اور سیف الدولہ کی ضمانت پر دو کروڑ نولاکھ درہم پر مصالحت کر لی اور عراق واپس ہو گیا۔

۳۵۳ھ میں ایک مرتبہ پھر معزالدولہ اور ناصرالدولہ میں ان بن ہو گئی، وعدے کے مطابق ناصرالدولہ کو دس لاکھ درہم سالانہ ادا کرنا تھے۔ باقیات کی ادائیگی کے لئے ناصرالدولہ نے اپنے بیٹے ابو تغلب مظفر کو یمن بھیجنے کی درخواست کی تو معزالدولہ شبہ میں پڑ گیا۔ اس نے موصل پر فوج کشی کر دی اور موصل پر قبضہ کر کے نصیبین کی طرف چل پڑا اور اس پر بھی اپنا پرچم لہرا دیا۔ اس عرصے میں ابو تغلب مظفر نے موصل پر ہلہ بول دیا مگر پسپا ہوا۔

ناصرالدولہ بھی گھات لگائے ہوا تھا وہ ایک چکر کاٹ کر موصل چاہتا تھا اور اس پر دوبارہ قابض ہو گیا اس کے ساتھ ہی اس نے بعض سرداروں کو قتل کر دیا اور ایک تعداد کو گرفتار کر لیا۔

اس مرتبہ ناصرالدولہ کا پڑا بھاری پڑ رہا تھا لہذا معزالدولہ نے مصطفیٰ صلح کی درخواست منظور کر لی۔ ناصرالدولہ نے مقررہ خراج دینا قبول کر لیا۔ قیدی رہا کر دیئے گئے اور معزالدولہ اس کو موصل، دیار ربیعہ اور صوبہ جات کی سند حکومت دے کر واپس ہو گیا۔

بلاشبہ بوہی حکمران کا سلطوت و جبروت تمام ممالک محروسہ میں مسلم تھا پھر بھی جا بجا باغی سراٹھاتے رہے اور معزالدولہ بڑی خوش اسلوبی سے انہیں فرد کرتا رہا۔ ۳۵۵ھ میں اس نے عمران بن شاہین والی بطائح کی سرکوبی کے لئے واسط کی طرف کوچ کیا لیکن عمان پر قرامطہ نے قبضہ کر لیا تھا لہذا ایک لشکر عمان کی سمت روانہ کیا جس نے عمان فتح کر لیا۔

اس کی فوجیں عمران بن شاہین کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں کہ وہ علیل ہو گیا اور محاصرہ ختم کر کے اور عمران سے اپنی شرائط پر صلح کر کے بغداد آ گیا یہ اس کی آخری فتوحات تھیں۔

### جلوس عزا

”روز عاشور شہادت امام حسینؑ پر سوگ منانا یزیدیوں کو ناگوار ہوتا تو قدرے تعجب خیز نہ تھا لیکن معزالدولہ نے جب اس کا حکم دیا تو شیعوں نے اس حکم کی بخوشی و خاطر تعمیل کی، اہل سنت دم تک نہ مار سکے کیونکہ زمام حکومت شیعہ کے قبضے میں تھی اور خلیفہ اس کا محکوم تھا۔ ماہ محرم ۳۵۳ھ میں پھر اس رسم کا اعادہ کیا گیا۔ اہل سنت برداشت نہ کر سکے۔ مابین ان کے اور شیعہ کے فتنہ و فساد برپا ہو گیا بہت بڑی خونریزی ہوئی، مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔“

اس کے معنی کھلے لفظوں میں یہ ہیں کہ سنیوں کو نہ علیؑ کے لئے حضورؐ کا کوئی فرمان پسند اور نہ حضورؐ کے نواسے کا غم شہادت برداشت۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا تجزیہ کیا جائے تو تان گروہ بندی پر جا کر ٹوٹے گی اور اس کا آخری کردار یزید بن معاویہ یہ قرار پائے گا مگر صاف گوئی سے اسلام کی مشترک رسی کڑور پڑنے کا خدشہ ہے لہذا صرف اتنی ہی گزارش کافی ہوگی کہ ہم کسی بات میں خوش ہیں تو آپ شریک نہ ہوں مگر ناخوش تو نہ ہوں۔ ہمیں آل رسولؐ کو بیدردی سے قتل کرنے کا صدمہ ہے تو آپ اتنے مشتعل نہ ہوں کہ ہم پر حملہ کر دیں اور اگر اس پر تلے ہوئے ہیں تو اعلان کر دیں کہ آپ قاتلان کر بلا کے ساتھ ہیں اور ان کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔

ہمارے نقطہ نگاہ سے معزالدولہ کا طرہ امتیاز ہے کہ اس نے عاشور کو کر بلا کی یاد میں پہلا جلوس عزاکالا۔

”شہر اور دیہات کے لوگ سیاہ ماتمی لباس میں شارع عام پر برآمد ہوئے، عورتیں شہیدوں کے نام لے لے کر بین کرتی، ماتم کنناں، چہروں پر خاک ملے، بال کھولے، رخساروں پر طمانچہ مارتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھتی نظر آئیں، شہر کے بازار سونے، دوکانیں بند، پھل پھل کی کوئی علامت نہیں۔ سوگوار فضا میں حسین حسین کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔“ (۲۹)

دیکھنے والوں پر تاثر کا یہ عالم کہ وہ پچھاڑیں کھانے لگے۔ نتیجے میں اولاد

رہ گئی حقوق فاطمہ غصب کرنے کی حقیقت تو اگر کسی نے حقوق غصب کیے تو وہ یقیناً قابل لعن اور اگر حقوق غصب نہیں کئے تو برا فروختہ ہونے کی ضرورت نہیں اور اس کے بعد بھی ناراضگی ہے تو گویا حقیقت غصب کو تسلیم کر لیا امام حسنؑ کو قبر کی جگہ نہ دینے کا حق شرعی طور پر کسی کو پہنچتا تھا تو لعنت غلط اور اگر نہیں پہنچتا تھا تو بالکل درست۔ اس کا فیصلہ اسلام کے قانون وراثت سے کیا جائے۔ اگر نبی میراث نہیں چھوڑتا تو سب بیویاں اور نواسے برابر، کسی بیوی کو کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

ابو ذرؓ کا جلا وطن کیا جانا ہر مکتبہ فقہ کی رو سے ناجائز ہے۔ حضرت علیؑ اور بعض صحابہؓ کی مشایعت جس کی تصدیق کرتی ہے۔

حضرت عباسؓ کا مجلس شوریٰ سے خارج کیا جانا شہادت دیتا ہے کہ شوریٰ سے خاندان رسولؐ کا ذرا سا تعلق بھی برداشت نہ تھا اس لئے ایسے عمل کو برا نہیں تو کیا اچھا کہا جائے گا؟

اور اگر یہ لعنت اتنی ہی بری تھی تو بعد کے سنی حکمرانوں کو مورخین روک لیتے جو باقاعدہ تبرائی مجلسیں منعقد کراتے تھے جن میں مجبان علیؑ تو درکنار ان کے آباء پر بھی لعنت کی جاتی تھی۔ کاش تاریخ کے قلمکار آنکھوں کے اندھے اور کانوں کے بہرے نہ ہوتے تو غزنی کے درو دیوار میں انہیں ”بر پدرش لعنت“ کی گونج ضرور سنائی دیتی۔

معزالدولہ کا دوسرا کارنامہ ہے عید غدیر کا جشن۔ اٹھارویں ذی الحجہ کو شہر میں چراغاں کیا جاتا، مکان سجائے جاتے، لوگ ذرق برق لباس پہننے اور خوشیاں مناتے کیونکہ اس دن پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ کی مولائیت کا اعلان کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے مبارک باد دیتے ہوئے تسلیم کیا تھا کہ اس دن کے بعد سے علیؑ ہر مسلمان کے مولیٰ ہو گئے جس کے ذیل میں حضرت ابو بکرؓ بھی تھے اور حضرت عمرؓ بھی اور تاقیامت ان کے تمام ماننے والے بھی۔

علیؑ کے شیدائی اگر اس دن اظہار مسرت کرتے ہیں تو اس میں ہر طبقہ کے مسلمانوں کو شامل ہونا چاہئے۔ انہیں اپنے مولیٰ کے جشن مولائیت پر تکلیف کیوں؟

پہران کا تعصب ظاہر ہونے لگا، دولت عباسیہ کے بہت سے وزراء اور متوسل عجمی اور شیعہ تھے لیکن ان میں سے کسی نے علانیہ شیعیت کی ترویج و اشاعت کی جرأت نہ کی تھی۔ معزالدولہ نے خلفاء کی قوت ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں شیعیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ (۳۰)

یہ انداز بیان عصبيت سے خالی نہیں تاہم اس کو خلاف واقعہ کہا نہیں جا سکتا۔ امیر المومنین کی شہادت کے بعد سے شیعہ جو تفسیر میں گئے تو عموماً اُس سے باہر نہیں نکلے اور وقت کی رفتار کو دیکھتے ہوئے دائرہ شریعت میں رہ کر مصیبت سے کام لیتے رہے۔ اموی عہد حکومت میں بھی جا بجا ایسے لوگ موجود تھے جو دلوں میں حب علی کی شمعیں جلائے ہوئے تھے مگر آنکھوں سے بھی اس کی روشنی کو ظاہر نہ ہونے دیتے اور عباسیوں کے سفاکانہ دور میں بھی کسی نے علی الاعلان آل محمد کی دوستی کا دم نہیں بھرا۔ وقت کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ دور دراز علاقوں میں ایک طرف ان کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں وجود میں آتی رہیں، دوسری طرف عقیدے کا اظہار کئے بغیر وہ حکومت میں داخل ہوتے رہے۔

موئے موئے نام گنوائے جائیں تو تعداد سیکڑوں تک پہنچ جائے گی: اسحق کاتب، ابو سلمہ خلیل، ابو عبد اللہ یعقوب ابن داؤد، فضل ابن سہل، حسن ابن سہل، حسن ابن علی، ابو الفضل جعفر، ابو الفتح فضل ابن جعفر، محمد ابن حصین زوالکفایتین، ابو الفتح علی ابن محمد، مہلبی ابو دلف غلی، ابو القاسم وزیر مغربی، ابو عبد اللہ حسین ابن زکریا، ابراہیم صولی، طالع ابن زریک، الفضل، ابن افضل، ابو الحسن جعفر ابن محمد، ابن فطیر، ابو المعالی، حسن ابن سلیمان وغیرہ کتنے ہی اسمائے گرامی ہیں جو شیعہ جلی یا خفی تھے اور نہایت خاموشی سے تاحیات خدمات اہل بیت کرتے رہے۔

چھوٹی بڑی حکومتوں کا ذکر زیر قلم ہے جو بڑی احتیاط سے مسلک آل محمد کی اشاعت کرتے رہے۔ ان میں آل حمدان کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے مگر انہوں نے بنی ظاہر کی طرح کھلے بندوں شیعیت کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اپنی حکومت کی ابتداء کے لئے کوشاں رہے اور آل بوہمہ سے مسلسل فکر لیتے رہے..... کیونکہ حکومت چہ

رسول کے قاتلوں سے ان کی نفرت کا بڑھ جانا یقینی تھا شاید یہی بات ایک گروہ کو گوارا نہ ہو سکی اور وہ جلوس پر حملہ آور ہو گیا۔

معزالدولہ کا یہ تاریخی اقدام وقت کے دھارے پر آگے بڑھتا رہا ہے اور آج تمام دنیا میں اس کی تائید کی جاتی ہے کوئی اسلام سے آشنا ہو یا نہ ہو لیکن یوم عاشور ہر خطہ ارض کو معلوم ہو جاتا ہے کہ چودہ سو سال قبل پیغمبر اسلام کا نواسا اپنی صداقت کے جرم میں بڑی بے رحمی سے شہید کر دیا گیا۔

ہم حشر تک معزالدولہ کے احسان مند رہیں گے کہ اس نے ہمیں وہ راستہ دکھایا جس پر عمل پیرا ہو کر ہم شہید اعظم کا پیغام دنیا تک پہنچاتے رہتے ہیں اور ہر مظلوم کو بتاتے ہیں کہ قالم کتنا ہی توانا ہو، اسکے آگے سر جھکا دینا جی نوع انسان اور انسانیت دونوں کی توہین ہے۔

مخالف مورخین اس بطل حریت کیلئے کچھ لکھیں لیکن زید شہید اور نفس ذکیہ کا یہ غلام مختار ثقفی کی وہ نظیریں پیش کر گیا جس کے نقش قدم پر شیعوں کے قافلے ہمیشہ رواں دواں رہیں گے۔

آخر اس کا انجام بھی ہر ذی روح کی طرح ہوا اور ربیع الاول ۳۵۹ھ میں طویل علالت کے بعد وہ بغداد میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا اور اس کا بیٹا معزالدولہ باپ کا جانشین ہوا۔

"خاندان بنی بوہمہ کا اصل بانی علی بن بوہمہ الملقب بہ عماد الدولہ والی فارس تھا۔ معزالدولہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے حصے میں کرمان کا علاقہ آیا تھا لیکن خلافت بغداد کی تولیت کا جلیل القدر منصب اس کی قسمت میں تھا۔ ۳۲۴ھ میں اس کو یہ منصب ملا، ۳۵۹ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس حساب سے اس نے گویا ۲۹ سال تک خلافت بغداد کی فرمانروائی کی۔"

ابن خلدون، معین الدین اور بعض دوسرے مورخین نے بوہمین کے کرداروں اور نظم و نسق میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کی ہے جن میں معزالدولہ سرفہرست ہے مگر حقیقت صرف اتنی ہے جس کو شاہ معین الدین دکھ گئے ہیں۔

"بنی بوہمہ نہایت متعصب شیعہ تھے سہندوں تک تو وہ خاموش رہے

کہ عیسائی بوکھلا گئے، عیسائیوں نے مشتعل ہو کر ایک بڑا لشکر فراہم کیا، حرث کے قریب فریقین کا سخت مقابلہ ہوا اور عیسائی ہزیمت یاب ہوئے۔ ہزاروں قیدی سیف الدولہ کے ہاتھ آئے، طرطوس کے عیسائی گورنر نے اطاعت کر لی۔ عیسائی بھی خاموش بیٹھنے والے نہ تھے، انہوں نے سیف الدولہ کے ہتھتے ہی طرطوس کو پامال کر ڈالا اور شکست کا بدلہ لے لیا۔

اس کے بعد سیف الدولہ نے عیسائی مملکت میں گھس کر بدلہ لے لیا مگر اس مرتبہ بھی واپسی پر عیسائیوں نے اپنے قیدی اور مال غنیمت چھین لیا۔ ۳۵۰ھ میں سیف الدولہ کا ایک سپہ سالار میافارقین کی طرف سے بلاروم میں گھس گیا اور عیسائیوں کو ایک سبق دے کر بعافیت واپس آگیا۔

ماہ محرم ۳۵۱ھ میں رومیوں نے پھر سر اٹھایا اور عین زریہ کے قریب ایک پہاڑی پر قبضہ کر لیا پھر شہر کو گھیر لیا۔ اہل شہر نے پناہ کے وعدے پر دروازے کھول دیے مگر عیسائیوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا کہ شہر کی سڑکیں خون سے رنگین ہو گئیں۔ ساز و سامان جو کچھ مل سکا، اس کو لے کر عیسائی واپس ہو گئے مگر قوساریہ میں اپنی فوجیں چھوڑ گئے۔

اس کے بعد ہی عیسائیوں نے حلب کا محاصرہ کر لیا۔ سیف الدولہ اس کے لئے تیار نہ تھا پھر بھی وہ بڑی بہادری سے لڑا۔ اہل شہر نے ساتھ دیا مگر شکست ہوئی عیسائیوں نے قتل عام شروع کر دیا، شہر کو جلا کر خاک کر دیا۔ شہریوں نے عیسائی بادشاہ کے بھانجے کو قتل کر دیا اس لئے بادشاہ نے غصے میں بارہ سو قیدیوں کو جیل سے نکلوا کر قتل کرادیا۔

سیف الدولہ نے ایسی شکست کے باوجود ہمت نہ ہاری، تھوڑے ہی دنوں میں لشکر کو درست کر کے نکلا۔ پہلے عین زریہ کو عیسائیوں سے چھینا پھر طرطوس پہنچ کر مزید تیاری کی اور روم کے کئی سرحدی شہروں پر حملے کر کے انہیں تباہ کر ڈالا رومیوں نے جواب میں قلعہ سبتہ پر چڑھائی کر دی، اس کو فتح کر کے کئی نواحی قلعوں پر قابض ہو گئے۔

اس اثناء میں سیف الدولہ کے غلام تاج نے ایک رومی لشکر کو شکست فاش

ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس میں رشتہ ناتہ اور عقیدہ کچھ دیکھا نہیں جاتا۔ بقول شاہ ندوی یہ صرف بومہین تھے جنہوں نے کھلم کھلا نعرہ اہل بیت لگایا اور معز الدولہ نے تو دھڑلے کے ساتھ فاطمہ اور آل فاطمہ کے حقوق کا اعلان کر دیا اور ان کے جانشین بھی اسی جادہ مستقیم پر قائم رہے۔

### بنی حمدان کا نامور شمشیر زن

تاریخ میں حمدانی حکومت کا عروج دو ناموں کا رہن منت ہے: ناصر الدولہ اور سیف الدولہ۔ یہ دونوں بھائی صحیح معنی میں تاریخ ساز تھے اور ان کے بعد ہی اس حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔

ناصر الدولہ کی عمر معز الدولہ سے جنگ و جدال میں گزر گئی جس میں سیف الدولہ بھی برابر کا شریک رہا لیکن وہ حلب اور سرحدی علاقوں کا حکمران تھا لہذا اسے بار بار عیسائیوں سے متصادم ہونا پڑا۔ وہ تنہا شخص ہے جس نے اس زمانے میں عیسائیوں کی بھرپور یلغاروں کو روکا اور انہیں پے در پے شکستیں دیں۔ اس لحاظ سے اس کو صلاح الدین ایوبی کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔

سیف الدولہ بھی بڑے بھائی ناصر الدولہ کی طرح اثنا عشری تھا لیکن فاطمین مصر کی اس کی نظر میں بڑی وقعت تھی وہ ان کا احترام کرتا تھا۔

جنگ آزمائی میں وہ ناصر الدولہ سے کسی طرح پیچھے نہ تھا بلکہ بڑھا چڑھا تھا ۳۳۵ھ میں اس سے قیدیوں کے تبادلے کے بعد رومیوں کی صلح ہو گئی تھی لیکن ۳۳۶ھ میں انہوں نے شہر مرعش پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا سیف الدولہ نے آگے بڑھ کر مقابلہ کیا مگر انہیں پسپا نہ کر سکا، لڑائیاں ہوتی رہیں

۳۳۷ھ میں سیف الدولہ رومی مقبوضات میں گھس گیا، ہزاروں قیدی اور مال غنیمت لے کر پلٹا مگر راستے میں عیسائی فوجوں نے گھیر لیا اور فتح شکست میں بدل گئی۔ سیف الدولہ تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ بچ نکلا۔

۳۴۱ھ میں عیسائیوں نے پھر یورش کی اور اسلامی علاقوں پر تاخت کی،

۳۴۲ھ میں سیف الدولہ نے جواباً رومی سرحدوں پر حملہ کیا اور اتنی غارت گری کی

”اس وقت یہی ایک فرمانروا مسلمان حکمرانوں میں بہادر اور باہمت تھا اس لئے تنہا ہی رومیوں کے مقابلے میں سینہ سپر ہوا اور برسوں ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ عباسی حکومت میں کوئی دم نہ تھا، وہ کوئی مدد نہ کر سکی۔“

”قیصر ارمانوس کا سپہ سالار تقشور (تیکوفورس) مسلمانوں کا سخت دشمن تھا اس نے بلقان کی تمام ریاستوں کو متحد کر کے شام و جزیرہ کی سرحد پر عام یورش کر دی اور ۳۳۶ھ سے لے کر ۳۶۲ھ تک مسلسل پچیس سال کی خونریز لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان میں لاکھوں مسلمان قتل اور گرفتار ہوئے۔ رومیوں نے سروج، عین زریہ، آذنا، مصیصہ، طرطوس، بہت سے سرحدی شہروں، فوجی چھاونیوں اور قلعوں پر قبضہ کر کے ان کو بالکل ویران کر ڈالا، ان کی پوری مسلمان آبادی تہہ تیغ کر دی۔ ہزاروں مسلمانوں کو قید کر کے لونڈی غلام بنا ڈالا۔ مسجدوں کو مسمار کر دیا اور بہت سے مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنالیا۔“

”ان مازک اور پر آشوب حالات میں تنہا سیف الدولہ ان کے مقابلہ پر سینہ سپر ہوا اور گودہ رومیوں کی یورش کو پوری طرح نہ روک سکا لیکن جب تک زندہ رہا، بڑی شجاعت اور دلیری سے مقابلہ کرتا رہا اور جہاں تک ہو سکا رومیوں سے ان کے ظلم و سفاکی کا انتقام بھی لیا۔“ (۳۱)

سیف الدولہ کی ناوقت موت کے بعد عیسائی شیر ہو گئے..... اور اس کے بیٹے ابولمعالی شریف اور اس کے اہل خاندان سے حلب کے لئے جنگ شروع ہو گئی اور مسلمانوں کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا۔

طرفہ ستم یہ ہوا کہ جمادی الاول ۳۵۵ھ میں ناصر الدولہ کو اس کے بیٹے ابو تغلب نے گرفتار کر کے موصل میں نظر بند کر دیا اور موصل و حلب دونوں حکومتوں میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی جو بنی حمدان کے زوال کا پیش خیمہ

### بویہین کا شیرازہ حکومت

عماد الدولہ علی اس خاندان کا سربراہ بھی تھا اور بانی حکومت بھی۔ وہ ۳۳۸ میں ساڑھے سولہ سال حکومت کر کے دنیا سے اپنا رشتہ منقطع کر گیا تو رکن

دی اور پانچ سو سپاہی گرفتار کر لئے۔ اس کے بعد فوری طور پر رومیوں کی یلغار رک گئی کیونکہ انہوں نے اپنے بادشاہ کو قتل کر ڈالا تھا۔

سیف الدولہ اور عیسائیوں کے معرکوں میں غالب و مغلوب کا فیصلہ کبھی نہیں ہو سکا۔ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ حمدانی بہادر کو قدرے اطمینان میسر آ جاتا تو وہ عیسائیوں کی طاقت کو اتنا توڑ دیتا کہ کل کے صلاح الدین ایوبی کو ان کی سرکوبی کے لئے اتنی محنت کرنا نہ پڑتی..... لیکن سیف الدولہ کو مسلسل اندرونی اور بیرونی تنازعات کا سامنا کرنا پڑا۔

عیسائیوں سے نہایت سکون کی سانس بھی لینے نہ پایا تھا کہ ناصر الدولہ کے بیٹے بختہ اللہ نے بغاوت کر دی۔ پھر اس کا غلام تجاخم ٹھونک کر میدان میں آگیا سیف الدولہ نے دونوں مرحلوں کو سر کر لیا تاہم اس کو وقت اور قوت دونوں صرف کرنا پڑیں۔

۳۵۳ھ میں عیسائیوں نے مصیصہ پر قبضہ کر کے تاراج کر ڈالا پھر ۳۵۴ھ میں یہی حال طرطوس کا بھی کیا۔ ان کی شہ پر اہل انطاکیہ نے بھی بغاوت کر دی۔ سیف الدولہ عیسائیوں کے مقابلے میں نکلنے ہی والا تھا کہ انطاکیہ کی خبر پہنچی لہذا وہ پہلے اسی طرف متوجہ ہو گیا۔ اہوازی اور وزیر اہل انطاکیہ کے سربراہ تھے۔ انہوں نے عرصے تک مقابلہ کیا۔ آخر گرفتار ہو کر مارے گئے..... اس کے بعد ہی سیف الدولہ کو مروان قرمطی کی بغاوت فرد کرنا پڑی۔

۳۵۵ھ میں عیسائیوں نے اپنی حدود سے نکل کر آمد کا محاصرہ کر لیا مگر اہل شہر نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا، مجبوراً وہ میافارقین کے قریب وارا کی طرف بڑھ گئے۔ سیف الدولہ نصیبین میں مقیم تھا اور بڑی تیزی سے فوجیں منظم کر رہا تھا۔ عیسائیوں پر سیف الدولہ کی شجاعت کا رعب پٹھا ہوا تھا وہ اس کی تیاریوں کی خبروں سے خائف ہو گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

پھر عیسائیوں نے انطاکیہ کے گرد گھیر ڈالا مگر اہل شہر کی مسلسل مدافعت سے مایوس ہو کر طرطوس کی جانب پلٹ گئے۔

اس کے بعد ہی ماہ صفر ۳۵۵ھ میں بمقام حلب سیف الدولہ کا انتقال ہو گیا



سرحدی شہروں کے مسلمان اپنے گھروں میں بھی محفوظ نہ رہے۔ بغداد کے باحمیت مسلمانوں نے عیسائیوں کے سد باب کے لئے ہنگامہ کیا لیکن فوج و وہ خلیفہ مجبور تھا لہذا ترکوں نے اس کے بجائے عبدالکریم طالع کو تخت خلافت پر بٹھا دیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اس دوران ناصرالدولہ کے دوسرے بیٹے بہتہ اللہ نے دیار بکر میں رومیوں کو شکست دے کر ان کے سپہ سالار کو گرفتار کر لیا تھا جس سے عیسائیوں کا زور گھٹ گیا تھا اور ان کی یلغار رک گئی تھی پھر بھی بغداد میں حالات ویسے ہی تھے۔ سبکتگین بدستور بغداد پر قابض تھا۔

عزالدولہ بختیار نے ان حالات کی خبر رکن الدولہ اور عضد الدولہ کو کر دی تھی۔ رکن الدولہ نے اپنے وزیر ابو الفتح کو روانہ کیا اور عضد الدولہ اپنے بھائی ابو عبد اللہ حسین کو لے کر چلا مگر ابو الفتح کو اس نے اہواز میں روکے رکھا اور ابو عبد اللہ تکریت پہنچ کر ٹھہر گیا۔

سبکتگین نے خلیفہ طالع کے ساتھ بغداد سے نکل کر واسطہ کا محاصرہ کر لیا لیکن انہیں دنوں اس کا وقت آخر آہنیا اور ترکوں نے اس کے بجائے شنگین کو اپنا امیر ابو عبد اللہ منصوبے کے مطابق بغداد چاہنچا اور اس پر بآسانی قابض ہو گیا عضد الدولہ نے واسطہ کا رخ کیا تو ترکوں نے محاصرہ اٹھا کر دینالی میں مورچہ قائم کر لیا، عضد الدولہ واسطہ سے عزالدولہ کو لیکر بغداد کا عازم ہوا۔ ترکوں نے مداین کے قریب اس کو روکنے کی کوشش کی مگر شکست کھائی اور وہ تکریت چلے گئے۔

ابو تغلب حمدانی بھی بغداد فتح کرنے کی فکر میں نکلا تھا مگر عضد الدولہ کی راہ میں بعض رکاوٹیں ڈالنے کے سوا کچھ نہ کر سکا اور بے نیل مرام موصل واپس ہو گیا عضد الدولہ کی نیت چھیرے بھائی عزالدولہ کے لئے نیک نہ تھی مگر رکن الدولہ کے ڈر کی وجہ سے وہ خاموش رہا البتہ فوج کو انعام کے مطالبہ کے لئے بھڑکا دیا اور عزالدولہ کو مشورہ دیا کہ رقم دینے کے بجائے حکومت سے بے تعلقی کا اعلان کہ دے۔ سادہ لوح عزالدولہ اس فریب میں آ گیا۔ خلیفہ طالع بھی عزالدولہ سے

الدولہ حسن کا بیٹا عضد الدولہ فارس کا حکمران ہوا کیونکہ عماد الدولہ کے کوئی اولاد نہ تھی اس نے اپنی زندگی میں مجملے بھائی کے بیٹے کو اپنا جانشین بنادیا تھا۔ ۳۵۶ھ میں جب معز الدولہ احمد کا انتقال ہوا تو عزالدولہ بختیار نے باپ کا منصب سنبھالا۔

رکن الدولہ حسن بقید حیات تھا جو عماد الدولہ کے بعد سے قبیلہ کا رئیس اعظم تھا۔ معز الدولہ نے جیتے جی اس کی اطاعت کی اور عزالدولہ بھی اس کے حکم کا پابند تھا۔ اس شریفانہ تہذیب میں رکن الدولہ نے ہر موقع پر اپنی بزرگانہ حیثیت کی لاج رکھی اور چھیرے بھائیوں میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہونے دیا۔ اب عزالدولہ عظیم معز الدولہ کے بجائے کرمان و عراق کا حکمران اور خلافت بغداد کا متولی تھا۔ بڑے باپ کے بیٹے اکثر نااہل ہوتے ہیں۔ عزالدولہ بختیار ایسا تو نہ تھا مگر اس میں معز الدولہ کا ساند بر اور سوچہ بودجہ نہ تھی لہذا اس کے غلط فیصلوں سے بغداد کی منظم بساط میں رخنہ پڑنے لگے اور ترک و دیالمہ دونوں اس کے خلاف ہو گئے۔

عباس بن حسین اس کا وزیر تھا، غرمانہ خالی ہونے کے سبب اس نے امراء کی جائیدادیں ضبط کیں اور عوام سے زبردستی رقوم وصول کیں، نتیجے میں بدامنی پھیل گئی۔ عزالدولہ کے اس عمل میں عباس کے مشوروں کو دخل تھا۔ وہ ذاتی طور پر ایسا کوئی اقدام شاید نہ کرتا جسکو بعد میں محسوس کیا اور ۳۶۲ھ میں اس نے عباس کو ہٹا کر ابن بقیہ کو وزیر بنایا، وہ بھی عام مخالفت کم نہ کر سکا۔

انہیں دنوں ویلی اور ترکی فوجیوں میں جھگڑا ہو گیا عزالدولہ نے دیالمہ کا ساتھ دیا جس کے سبب معز الدولہ کا وفادار حاجب سبکتگین بھی عزالدولہ کا مخالف ہو گیا اور اس نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ معز الدولہ اپنے بھائیوں سمیت واسطہ چلا گیا اس موقع پر سنیوں نے شیعوں سے بدلہ لیا کیونکہ ترک سنیوں کے حمایتی تھے۔ کافی کشت و خون ہوا اور شیعوں کے گھربار لوٹ لئے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم سرحدوں پر عیسائی حملے ہو رہے تھے۔ ۳۵۶ھ میں جب سیف الدولہ کا انتقال ہوا تو گویا عیسائیوں کو روکنے والا حصار ٹوٹ گیا اور

ابو تغلب بن ناصر الدولہ کو حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ایک عزیز ابو فراس کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جس کو شکست دے کر ابو تغلب نے صلح پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ہی ناصر الدولہ ۳۵۸ھ میں انتقال کر گیا اور موصل میں مدفون ہوا۔ حمدان سے ابو تغلب کی صلح ہو گئی تھی مگر دونوں کے درمیان بدگمانی باقی تھی۔ اس اثنا میں ابراہیم اور حسین حمدان سے مل گئے اور اس کے خلاف سازش کرنے لگے اور ان کے مابین معمولی جھڑپیں ہونے لگیں۔

عیسائیوں نے اس خلفشار سے فائدہ اٹھا کر انطاکیہ اور حلب کا محاصرہ کر لیا مگر مسلمان جب مقابلے کے لئے بڑھے تو وہ بھاگ گئے۔

موقع سے فائدہ اٹھا کر سیف الدولہ کے غلام قرعوبہ نے علم بغاوت بلند کر دیا اور ابو المعالی کو حلب سے نکال کر خود سر حکمران بن گیا۔ ابو المعالی نے پہلے حران کا رخ کیا اور وہاں داخل نہ ہو سکا تو میافارقین کا عازم ہوا۔ وہاں اس کی والدہ نے ٹھہرنے نہ دیا تو حماہ کی طرف روانہ ہوا۔

جب کوئی حکومت رو بہ زوال ہوتی ہے تو اس کے افراد چھوٹی چھوٹی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال حمدانیوں کا بھی تھا۔ اس افراتفری میں ابو تغلب میافارقین پر چڑھ دوڑا اور اپنی والدہ سے تاوان جنگ لے کر واپس ہوا۔ عیسائی پہلے ہی سے گھات میں لگے ہوئے تھے، انہوں نے انطاکیہ پر قبضہ کر لیا پھر حلب کو گھیرے میں لے لیا، آخر قرعوبہ نے خراج دینے کا وعدہ کر کے صلح کر لی نصف ۳۵۹ھ میں ابو تغلب حران پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں اپنا مہمانب چھوڑ کر موصل کی طرف واپس ہوا جس پر اس کی عدم موجودگی میں عزالدولہ بختیار نے قبضہ کر لیا تھا جو آپس کی مناقشت کا نتیجہ تھا۔ حمدان اور ابراہیم ابو تغلب کی عدوات میں بغداد جا کر عزالدولہ کو لائے تھے اور اب موصل کو اس کے قبضے سے نکالنا ابو تغلب کے بس کی بات نہ تھی۔

ابو تغلب نے حالات کو سمجھتے ہوئے عزالدولہ کے سامنے دامن مصالحت پھیلادیا جس کو عزالدولہ نے منظور کر لیا اور اپنی شرائط منوا کر بغداد واپس ہو گیا۔ اس طرح حمدانی حکمران کبھی غیروں سے مگر بیشتر انہوں سے لڑتے بھرتے

نالاں تھا وہ اس کے استعفی پر عضد الدولہ کی پناہ میں آ گیا پھر عضد الدولہ نے عزالدولہ بختیار کو بہانے سے گرفتار کر لیا۔

رکن الدولہ بیٹے کے اس فعل سے بہت برہم ہوا اور عضد الدولہ کے ہزار بہانوں کے باوجود نہ مانا۔ اس کو اپنے بھتیجے بیٹے سے کم عزیز نہ تھے آخر عضد الدولہ کو عزالدولہ بختیار کو بحال کرنا پڑا مگر اس میں کوئی اہلیت نہ تھی اس نے انصرام حکومت پھر ابن بقیہ پر چھوڑ دیے جو بہت چالاک آدمی تھا، آخر اس سے عزالدولہ کے تعلقات خراب ہو گئے۔

۳۶۵ھ میں رکن الدولہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے عضد الدولہ کو معاف کر دیا اور اس کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ دوسرے بیٹوں ابو الحسن، خضر الدولہ اور موند الدولہ کو حمدان اور اصفہان کی حکومتیں عطا کیں اور سب کو متحد و متفق رہنے کی وصیتیں کر کے محرم ۳۶۶ھ میں ملک عدم سدھا کر گیا۔

"رکن الدولہ بڑا جامع اوصاف فرمانروا تھا۔ اس میں تدبیر و سیاست اور محاسن اخلاق تمام خوبیاں جمع تھیں۔ عدل و انصاف میں بڑا اہتمام کرتا، اس کے دور میں کسی پر ظلم نہ ہونے پاتا، رعایا میں بہت مقبول و محبوب تھا، حتی الامکان خونریزی سے بچتا تھا، صرف مجبوری کی حالت میں تلوار اٹھاتا، بڑا مخیر و فیاض اور فقرا و مساکین کا ملجا و ماویٰ تھا، مزاج میں نرمی اور حلم غالب تھا، دشمنوں کے ساتھ بھی نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔" (۳۲)

بحیثیت مجموعی رکن الدولہ اہل خاندان اور رعایا کے لئے پدرانہ شفقت کا ایک مثالیہ تھا جس کو ہماری تہذیبی روایات آج بھی وقت کے ہر موڑ پر تلاش کرتی ہیں۔

### بنی حمدان کی باہمی نبرد آزمائی

ناصر الدولہ نے مین بیٹے چھوڑے تھے: ابو تغلب، ابو عبد اللہ اور ابو طاہر ابراہیم۔ سیف الدولہ کے بیٹے پوتوں کے نمایاں نام ابو المعالی شریف، اس کا بیٹا ابو الفضائل سعد اللہ، ابو الفضائل کا بیٹا ابو المعالی اور ابو الحسن علی وغیرہ تھے۔



رہے اور اپنی طاقت کو کمزور کرتے رہے۔

دمشق ایک عرصے سے مصر کے مقبوضات میں شامل ہو چکا تھا ابوالمعالی کے کئی مقابلے دمشق کے گورنر سے بھی ہوئے اور ایک موقع پر اس نے والی انطاکیہ سے مدد بھی حاصل کی۔ آخر وہ رقبہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا پھر دیار بکر کے بعض علاقوں پر قابض ہو گیا مگر اس کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ۳۹۱ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ سعید الدولہ ابو الفضل اس کا جانشین ہوا۔ اس کے ایام حکومت بھی لڑتے بھڑے گزر گئے۔ آخر سیف الدولہ کے غلام ابو نصر نے اپنے آقا کو معزول کر کے حلب پر قبضہ کر لیا اور وہاں مصر کے علوی حاکم کا خطبہ پڑھا دیا۔

اس کے بعد ابو الحسن بن ابو الفضل اور ابوالمعالی بن ابو الفضل نے بعض حصوں پر حکومت کی اور ۳۹۴ھ میں حمدانی حکومت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

### بنی بویہ کا دوسرا معمار: سلطان عضد الدولہ

عضد الدولہ کی آنکھیں شروع ہی سے بغداد کی جانب لگی ہوئی تھیں مگر اسے باپ کی وصیت اور فہمائش کا احترام تھا وہ از خود عزالدولہ بختیار کے خلاف کوئی اقدام نہ کرتا لیکن عزالدولہ نے خود اس کا موقع دیدیا۔ وہ عضد الدولہ سے مطمئن نہ تھا لہذا چچا کی وفات کے بعد سے فوجی تیاری میں لگ گیا اور اس کے ساتھ ہی امرائے رکن الدولہ، فخر الدولہ اور حسنویہ کردی وغیرہ سے ساز باز شروع کر دیا اور ابو تغلب اور عمران شاہین سے بھی مدد کا طالب ہو گیا۔

عضد الدولہ کو اس کی خبر لگی تو وہ اپنی فوجوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ عزالدولہ بختیار حسنویہ اور ابن حمدان کے فریب وعدہ پر اہواز جا پہنچا۔ دونوں میں ایک خونریز جنگ ہوئی اور عزالدولہ نے شکست کھا کر واسطی راہ لی۔ اس موقع پر عمران بن شاہین نے آلات حرب اور سامان سے مدد کی اور عزالدولہ اس کی پناہ میں چلا گیا پھر واسطی آ گیا۔

عضد الدولہ نے فتح پاکر ایک سپہ سالار بھیج کر بصرہ پر قبضہ کر لیا اور مضرو ربیعہ قبائل کی پرانی دشمنی کو ختم کرا کے دونوں میں میل کرا دیا۔ عزالدولہ

اس شکست سے مایوس نہ تھا اس نے نئے سرے سے فوج کو مرتب کیا اس دوران حسنویہ کے دو بیٹے ایک ہزار سواروں کے ساتھ اس کی کمک کو آگئے پھر بھی وہ عضد الدولہ کی طاقت سے خائف تھا۔

اس جنگ میں جن لوگوں نے عزالدولہ بختیار سے سازش کی تھی، ان میں رکن الدولہ کا وزیر ابو الفتح بن عمید بھی تھا، عضد الدولہ نے اس کو گرفتار کر کے آنکھیں پھڑوا دیں اور عزالدولہ بختیار سے کہلا بھیجا کہ اطاعت کی شرط پر وہ اس کو کہیں بھی چلے جانے کی اجازت دے سکتا ہے۔ عزالدولہ چار دن پانچ اس پر آمادہ ہو گیا اور عضد الدولہ کی ہدایت کے مطابق ابن بقیہ کو پکڑوا کر اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھرا دیں۔

اس کے بعد عضد الدولہ بغداد میں داخل ہوا۔ جامع مسجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور پھانک پر تین بار نوبت بجائی گئی جو کسی بادشاہ کی آمد کا اعلان تھا عزالدولہ باحال پریشان شام کا راہی ہوا۔ اس کے ساتھ حمدان بن ناصر بھی تھا جو اس کو موصل کی طرف لے چلا، حالانکہ عضد الدولہ نے ابو تغلب کے علاوہ کسی کے پاس چلے جانے کی اجازت دی تھی۔ وہی ہوا جس کا خطرہ عضد الدولہ کو تھا۔ ابو تغلب نے حمدان کو گرفتار کر اپنے کی شرط پر عزالدولہ سے مدد کا وعدہ کر لیا۔ نادان امیر اس بہلاوے میں آ گیا۔ اس نے حمدان کو پکڑوا دیا اور ابو تغلب بیس ہزار کی جمعیت لے کر اس کے ساتھ بغداد کی سمت چل پڑا۔

عضد الدولہ بھی مقابلے کے لئے بغداد سے نکل کھڑا ہوا، لشکروں میں گھمسان کی جنگ ہوئی اور حمدانی لشکر ہزیمت یاب ہوا۔ عزالدولہ گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔ ابو تغلب بھاگ نکلا۔

عضد الدولہ نے اس پر اکتفا نہ کی۔ اسی سلسلے میں موصل کی سمت پیش قدمی کی اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس مقام پر اطمینان سے ٹھہر کر اس نے ابو تغلب کی تلاش میں فوجی دستے روانہ کئے اور اس کے ایک سردار ابو الوفا نے ابو تغلب کو نصیب میں جا لیا۔ ابو تغلب بھاگ کر میافا رقبہ پہنچا اور ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے سے نکل گیا۔ اس طرح حسنویہ جا کر اس نے دم

لیا۔ بوہی فوج تعاقب میں وہاں پہنچی تو ابو تغلب روم بھاگ گیا..... طویل قیام کے بعد وہ مملکت اسلامیہ میں واپس ہوا تو آمد میں قیام کیا۔

ابو تغلب کے سلسلہ تعاقب میں جو مقامات پڑتے رہے، عضد الدولہ نے ان سب پر اپنے پرہرے ہرا دیئے، میافارقین، رجبہ، دیار مضر اور دوسرے تمام مقامات فتح کر لئے جو کبھی حمدانی حکومت کے شہر تھے۔

۳۶۸ھ میں ابو الوفا کو اس علاقے کا حاکم بنا کر عضد الدولہ بغداد واپس ہوا شام میں رملہ کے قریب بنی عقیل کی آبادی تھی۔ ابو تغلب آمد سے چل کر وہاں آگیا اور قبیلہ بنی عقیل میں آکر قیام پذیر ہوا۔ اس زمانے میں رقبہ پر ایک عرب سردار و غفل قابض تھا اس کو شبہ ہوا کہ ابو تغلب بنی عقیل سے مل کر اس کو ہٹا دینا چاہتا ہے لہذا اس نے حملہ کر کے ابو تغلب کو ختم کر ڈالا۔ بنی عقیل نے اس کے بیوی بچوں کو ابوالمعالی کے پاس بھجوا دیا۔

اب عضد الدولہ بغداد میں معز الدولہ کی یاد تازہ کر رہا تھا وہ کچھ روز آرام کرنا چاہتا تھا کہ کردستان میں خلفشار کی خبریں ملیں اور اس کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

یہ حکومت ۳۵۰ھ میں قائم ہوئی تھی اس میں اور بنی بوہہ میں پہلے سے کشمکش تھی اس کے فرمانروا بدر بن حسنویہ کے کئی بھائی تھے جو مختلف قلعوں پر قابض تھے اور آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہو رہے تھے۔ عضد الدولہ نے ۳۶۹ھ میں ایک ایک کر کے سارے قلعوں کو مسخر کر لیا اور اپنی طرف سے بدر کو ان سب کا حاکم بنا دیا۔

اب عضد الدولہ کے خاندانی مخالفین میں فخر الدولہ اس کی آنکھ میں کھمکتا تھا۔ اس نے عز الدولہ بختیار کا ساتھ دیا تھا، وہ ان دنوں ہمدان کا والی تھا۔ عضد الدولہ کو خطرہ تھا کہ کبھی اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑا ہو اس لئے اس نے اس کو ایک تادیبی خط لکھا جس کا جواب فخر الدولہ نے خاندانی لب و لہجہ میں دیا جو عضد الدولہ کو ناگوار گزر اور اس نے ہمدان پر فوج کشی کر دی۔ فخر الدولہ والی جرجان شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے پاس بھاگ گیا۔ عضد الدولہ نے اس

سے فخر الدولہ کا مطالبہ کیا۔ شمس المعالی نے منظور نہ کیا لہذا ۳۷۱ھ میں عضد الدولہ نے اپنے بھائی موید الدولہ کو روانہ کیا جس نے شمس المعالی کو شکست دی اور وہ مع فخر الدولہ نیشاپور میں پناہ گزین ہو گیا۔

سامانی حاکم نیشاپور کی درخواست پر امیر نوح بن منصور ان دونوں کی مدد کرنا چاہتا تھا اور لشکر جانے کو تیار بھی تھا مگر سامانی وزیر کے اچانک قتل ہو جانے کے سبب شمس المعالی اور فخر الدولہ مدد سے محروم رہ گئے۔

### عالم اسلام کا پہلا شہنشاہ

عضد الدولہ عرصے سے صرع کے مرض میں مبتلا تھا، شوال ۳۷۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اور نجف اشرف میں دفن کیا گیا۔ بغداد میں اس نے کل ساڑھے پانچ سال گزارے لیکن اس مختصر سی مدت میں اتنے گہرے نقوش چھوڑے کہ تاریخ اس کو یاد کرتی رہے گی، بقول شاہ معین الدین ندوی:

"عضد الدولہ ویلی خاندان کا گل سرسبد اور بڑا جامع اوصاف فرمانروا تھا، عقل و دانش، تدبیر و سیاست، شجاعت و شہامت، فضل و کمال، علم نوازی اور علماء پروری جملہ اوصاف جہانبانی میں یگانہ تھا اس نے اپنے دور میں ویلی حکومت اور خلافت بغداد دونوں کو علمی اور تمدنی حیثیت سے بڑی ترقی دی۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ وہ عاقل، فاضل، مدبر، باہمت، عالی ہمت، صائب الرائے، فضائل دوست، فضلاء نواز، بخشش کے موقع پر فیاض اور احتیاط کے موقع پر محتاط اور عاقبت اندیش فرمانروا تھا۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ملک کی وسعت، سلاطین اور حکومتوں پر غلبہ اور جاہ و جلال اور عظمت و شان میں پورے ویلی خاندان میں ممتاز تھا اس نے بہت سے ملک زیر نگین اور بہت سے فرمانروا مغلوب کئے۔"

"تاریخ اسلام میں وہ پہلا فرمانروا ہے جو شہنشاہ کے لقب سے ملقب ہوا اور بغداد کے منبروں پر اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ وہ فاضل اور علماء نواز تھا، بہت سے علوم میں اس کو دستگاہ حاصل تھی۔ علماء نے اس کے لئے کتابیں اور شعرا نے



خلیفہ نے اس کو از خود اتنے امتیازی اعزازات بخشے تھے جو اب تک کسی کو نصیب نہ ہوئے تھے۔ وہ سلطان کے ساتھ شہنشاہ بھی کہا جاتا تھا۔  
بالا اختصار شہنشاہ عضد الدولہ تمدن وثقافت کا علامہ اور کشور کشائی کا نشان تھا۔ اس کے عہد کو تاریخ بویہین کا درخشاں باب کہا جاسکتا ہے۔

### بویہین کا زوال

بہن بودہ کے زیریں عہد کا دورانیہ حقیقتاً پچاس سال کا تھا جو عماد الدولہ سے شروع ہو کر عضد الدولہ پر ختم ہو گیا۔ اس عرصے میں ان کی حدود سلطنت کسی بڑی سلطنت سے زائد تھیں۔ اس کے بعد حصول اقتدار کی خاندانی کشمکش شروع ہو گئی۔ اس مدت میں انہوں نے دنیا کو بڑا سبق یہ بھی دیا کہ اگر کوئی خاندان کسی ایک منصف مزاج اور شفیق بزرگ کا تابع ہو تو اس میں انتشار پیدا نہیں ہو سکتا۔

کہنے کو ۳۷۲ھ میں عضد الدولہ کی وفات پر مصمم الدولہ کی تخت نشینی سے ۳۸۷ھ میں ابو علی کیخسرو کے انتقال تک یعنی مزید ۱۵ سال حکومت خاندان میں باقی رہی لیکن صحیح معنی میں معز الدولہ اور عضد الدولہ کا سطوت و جبروت پانچویں سن ہجری کی پانچ سات دہائیوں تک باقی رہا اور آخر میں تو بویہی حکمران اتنے طاقتور ہو گئے کہ چھوٹے چھوٹے لشکروں سے شکست کھانے لگے اور نئی طاقتیں ان کے علاقوں کو ہڑپ کرتی رہیں جو نتیجہ تھا بھائی سے بھائی کے ٹکرانے کا۔ مصمم الدولہ کی جانشینی ۳۷۲ھ میں بظاہر باتفاق رائے ہوئی لیکن پانچویں سن سے تین بھائی خوش نہیں ہوئے اور پہلے ہی دن سے اندر اندر مخالفانہ ریشہ دو انیاں شروع ہو گئیں۔

سلسلہ خاندان کا جائزہ لیا جائے تو مزید پندرہ افراد ارتقائے وقت کے ساتھ برسر اقتدار آئے: مویہ الدولہ بن رکن الدولہ، فخر الدولہ بن رکن الدولہ، مصمم الدولہ بن عضد الدولہ، شرف الدولہ بن عضد الدولہ، بہاؤ الدولہ بن عضد الدولہ، مجدد الدولہ بن فخر الدولہ، شمس الدولہ بن فخر الدولہ، سماء الدولہ بن شمس الدولہ، سلطان الدولہ بن بہاؤ الدولہ، مشرف الدولہ بن بہاؤ الدولہ، جمال الدولہ

اس کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے۔ وہ ایک ماہر ادیب اور خوش گو شاعر تھا (۳۳)۔  
اپنے باپ، چچا اور دوسرے حکمرانوں کی متعدد چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ملا کر اس نے ایک متحدہ حکومت قائم کر دی۔ خلافت پر زوال کے ساتھ بغداد اجڑ گیا تھا اس کی علمی مجلس برہم ہو گئی تھی، عضد الدولہ نے اس کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس کی علم نوازی کی وجہ سے مختلف ملکوں کے علماء کھنچ کر بغداد میں جمع ہو گئے اور اس کے نام پر کتابیں لکھیں سہجناچہ نحو میں کتاب الایضاح والتکمید، قرأت سبعہ میں جتہ طب میں ملکی اور تاریخ میں تہذیب لکھی گئیں۔

رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیئے، بغداد مسلسل شورشوں اور سیاسی انقلاب سے اجڑ گیا تھا، اس کو دوبارہ آباد کیا، مدینہ طیبہ کے گرد شہر پناہ تعمیر کرائی حضرت علی کی قبر کا پتہ چلا کر اس پر عمارت بنوائی۔ سارے ممالک محروسہ میں شفا خانے، پل اور دوسری رفاہ عام کی عمارتیں بنوائیں۔

بغداد کا شفا خانہ، جو بیمارستان عضدی کے نام سے موسوم تھا، بڑا عظیم الشان تھا اس کے اغراجات کے لئے ایک خطیر رقم وقف کی۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ "اس سروسامان اور حسن انتظام کا کوئی دوسرا شفا خانہ دنیا میں نہ تھا۔"  
تفصیل مزید میں بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ہر سال کے آغاز پر ایک بڑی رقم صدقے کے طور پر نکالتا تھا اور اس کو علماء و فقہاء کے ذریعہ غریب عوام میں تقسیم کراتا تھا۔ جن لوگوں نے خوبیوں کے ساتھ عیوب بھی گنوائے ہیں، وہ خونریزی اور حصول دولت کے ذرائع پیدا کرنے کا الزام اس پر لگا سکے ہیں جس سے کوئی فاتح اور کوئی حکمران مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اگر کوئی بادشاہ اس سے بچنا چاہتا تو بادشاہت باقی ہی نہ رہتی۔

اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں عضد الدولہ کی ایک خصوصیت اور لکھی گئی ہے وہ یہ کہ خلیفہ طالع خود اس قدر کمزور اور نااہل تھا کہ اس نے تمام اختیارات اپنی طرف سے عضد الدولہ کو سونپ دیئے تھے اور اس کی قیمت خلیفہ کی نظر میں اتنی نہیں کہ جب وہ آتا تو بڑے اعزاز کے ساتھ اس کو بٹھاتے تھے حتیٰ کہ ۳۶۹ھ میں ملک العزیز والی مصر کی سفارت آنے پر خود طالع نے اپنے سامنے اس کو بٹھایا تھا۔



بن بہاؤ الدولہ، ابو کالجار بن سلطان الدولہ، ملک الرحیم بن ابو کالجار، ابو منصور بن ابو کالجار، ابو علی کینخرو بن ابو کالجار۔

ان میں سے آٹھ نے تولیت بغداد کا شرف پایا: مصمص الدولہ، شرف الدولہ، بہاؤ الدولہ، سلطان الدولہ، مشرف الدولہ، جلال الدولہ، حسام الدولہ، ابو کالجار، ملک الرحیم۔

بہی حکمرانوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو بیشتر اہل علم، دور اندیش، ہندو اور ملواری کے دھنی تھے مگر قبیلہ کی سربراہی کا نظام ختم ہو چکا تھا۔ عضد الدولہ کے بعد سے کوئی مرکزی شخصیت باقی نہ رہی تھی اس لئے ہر فرد مطلق العنان ہو گئی تھی۔ ہر شخص ہوس حکومت میں دیوانہ ہو رہا تھا اس کے لئے خود اپنیوں کا خون بہانے میں دریغ نہ کرتا، اور اپنی چھوٹی حکومت کو بڑی کرنے میں کوشاں رہتا۔

ایسے میں سرحدوں پر نئی طاقتیں ابھر کر سامنے آئیں اور اندرونی حصوں میں علاقائی حکومتوں نے جنم لیا جن میں غزنوی، سلجوقی، عقیلی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

بنی ہمدانیہ میں کچھ بھی اتحاد ہوتا تو نہ باہر سے کوئی ان کی طرف نظر اٹھا سکتا اور نہ اندر سرتابی کی جرات کر سکتا لیکن وہاں تو صورت حال یہ تھی کہ جب مصمص الدولہ نے پسران ناصر الدولہ، ابو الحسن احمد اور ابو طاہر کو فارس کا گورنر بنایا تو شرف الدولہ ان سے پہلے پہنچ گیا اور ملک پر قبضہ کر کے اپنے نام کا خطبہ جاری کر دیا۔ مصمص الدولہ نے ابو الحسن حاجب کو اس کے مقابلے کے روانہ کیا تو اس نے امیر و بیس کو بھیجا جس نے ابو الحسن کو مار بھگا دیا۔

۳۷۳ھ میں ایک بہادر کرد ابو عبد اللہ حسین المعروف بہ "باز" نے دیار بکر پر قبضہ کر لیا۔ مصمص الدولہ نے اس کی سرکوبی کے لئے کئی لشکر بھیجے مگر سب نے "باز" سے شکست کھائی۔ آخر مصمص الدولہ کو اس کا قبضہ تسلیم کرنا پڑا۔

۳۷۵ھ میں ایک ویلی سردار اسفار بن کردویہ نے شرف الدولہ کے اشارے سے بہاؤ الدولہ کو بغداد میں نائب بنانے کی کوشش کی، مصمص الدولہ کی طرف سے فولاد راندار نے اسفار کو شکست دی۔ بہاؤ الدولہ گرفتار ہوا مگر

مصمص الدولہ نے عزت کے ساتھ اس کو رہا کر دیا۔

اس ابتداء میں ابو الحسن نے اہواز پر اور ابو طاہر نے بصرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ شرف الدولہ نے ان دونوں مقامات کو بھائیوں سے چھین لیا اور ۳۷۶ھ میں واسط فتح کر کے عراق کی سرحد تک پہنچ گیا۔ اسی دوران مصمص الدولہ کی فوج میں بغاوت ہو گئی اور وہ شرف الدولہ کی اطاعت پر مجبور ہو گیا۔

اب بغداد کی تولیت شرف الدولہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے مصمص الدولہ کو قید کر دیا پھر فارس بھیج دیا اور وہاں لے جا کر رہا کر دیا۔ مصمص الدولہ کی مدت تولیت چار سال تھی مگر شرف الدولہ اس سے بھی کم وقت گزار سکا۔

ترک و دیالہ کی جو لڑائی مصمص الدولہ کے وقت سے جاری ہوئی تھی، شرف الدولہ نے اس کو دور کیا۔ دونوں میں صلح کرانی پھر نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوا اور بغداد کی ابتری کو دور کیا۔ بعض اصلاحی کام کئے، ایک عظیم الشان رصد گاہ تعمیر کرائی، مظالم کا سد باب کیا، لوگوں کی ضبط کی ہوئی جائیدادیں واپس کیں اور علی مجلسوں کو سرگرم کیا مگر اس کی عمر نے وفات کی، صرف دو سال چند ماہ حکومت کر کے جمادی الاول ۳۷۹ھ میں چل بسا۔

ابونصر بہاء الدولہ اس کی زندگی ہی میں بغداد کا نائب تھا، وہی شرف الدولہ کا جانشین ہوا اور خلیفہ نے اس کی امارت کو تسلیم کر کے خلعت، سیاہ عمامہ، طوق اور کنگن سے نواز دیا لیکن بہاء الدولہ کو فی الفور مشکلات سے دوچار ہو جانا پڑا اور اس نے طالع کے بجائے قادر باند کو خلیفہ بنا دیا۔

ابو الحسن اور ابو طاہر پسران ناصر الدولہ شرف الدولہ کے وقت سے بغداد میں مقیم تھے۔ بہاؤ الدولہ کے آغاز حکومت میں انہوں نے جانے کی اجازت طلب کی اور بہاء الدولہ نے منظوری دیدی اور وہ دونوں سیدھے موصل کے عازم ہو گئے۔ خواشاہذہ والی موصل نے انہیں داخل ہونے سے رد کیا مگر اہالیان موصل پرانے رشتوں سے ان کے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے والی موصل کو شکست دے کر نکال دیا، موصل پر دوبارہ آل حمدان کا پرچم نصب کر دیا اور ایک بار پھر موصل و

عرصے تک اس علاقے کا حاکم رہا۔  
ابو منصور کے بعد مزید تین حکمران اس خاندان کے گزرے: ابو نصر احمد بن مردان، ابو نصر کا پوتا نظام الدولہ اور منصور بن ابو نصر۔ ۳۷۸ھ میں سلجوقیوں نے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا۔

### بنی عقیل

بنی کعب عرب کا معروف قبیلہ تھا اس کی شاخیں آہستہ آہستہ شام، عراق، شمالی افریقہ اور اندلس میں پھیل گئیں۔ اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی منتفق خاندان معروفیہ کی سرپرستی میں بصرہ کے نواح میں بطیہ کے قریب آباد تھی۔  
ایک شاخ بنی خفاجہ صحرائے عراق میں رہنری کرتی تھی۔ ۳۲۷ھ کے بعد جب بنی عبیدہ اور بنی منتفق نے کوفہ، بصرہ اور واسطہ کے درمیانی علاقے میں سکونت اختیار کی تو بنی خفاجہ بھی ان سے آئے اور انہیں متحدہ شاخوں سے بنی عقیل کی بنیاد پڑی۔

چوتھی صدی ہجری میں شام و عراق کے عقیلی اس دور کے ممتاز حکمران حمدانیوں کو خراج ادا کرتے تھے۔ ان کے زوال کے وقت ۳۷۹ھ میں بنی عقیل میں سے ابو داؤد محمد نصیبین اور دیار بکر کا حکمران تھا۔ ۳۸۰ھ میں اس نے موصل کا اضافہ کیا۔ ۳۸۱ھ میں بوہیموں نے موصل خالی کر لیا مگر ابو داؤد کی وفات پر اس کے بھائی مقلد نے ۳۸۶ھ میں موصل فتح کر لیا۔ بوہیمی تاجدار نے معینہ خراج پر ملک کے مزید اضافے سے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

ابو المکارم مسلم بن قریش کے عہد میں اس کی مملکت کی حدود موصل و حلب سے بغداد کے مضافات تک پہنچتی تھیں۔ اس کے انتقال پر زوال شروع ہوا۔ ۴۸۹ھ میں ایک ترکی سردار قدام الدولہ کرہو تانے ان کا دارالحکومت بھی سلجوقی سلطنت میں شامل کر دیا۔

عقیلیوں کی مدت حکومت سو برس سے زائد رہی۔ اس مدت میں سات حکمران برسر اقتدار آئے: حسام الدولہ مقلد بن مسیب، معتمد الدولہ قرواش بن

حلب میں حمدانی کا۔ قائم ہو گئی۔ بہت ممکن تھا کہ حکومت کچھ دن باقی رہتی لیکن بد قسمتی سے باز بن مروان کی نئی حکومت دیار بکر میں قائم ہو چکی تھی جو اس کے لئے وبال جان بن گئی۔

### علائقائی حکومتیں

عمران بن شاہین کی حکومت معز الدولہ کے وقت سے قائم تھی جو بطیہ میں تقریباً مورثی ہو چکی تھی۔

### حکومت مروان

دوسری حکومت باز بن مروان کی دیار بکر میں صمصام الدولہ کے دور میں وجود میں آئی۔ صمصام الدولہ کی فوجوں سے اس کے کئی معرکے ہوئے، آخر صمصام الدولہ نے دیار بکر پر حکومت کی سند اس کو دیدی تھی۔

حالات کی ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے موصل پر ہلہ بول دیا، حمدانیوں نے مقابلہ کیا۔ باز گھوڑے سے گر کر مر گیا اور اس کے بھانجے ابو علی مروان نے پسپائی اختیار کی۔ ابو طاہر اور ابو عبد اللہ حمدانی نے دیار بکر پر فوج کشی کر دی مگر شکست کھائی اور ابو علی کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ ابو علی نے والی مصر کی سفارش پر دونوں کو چھوڑ دیلو والی مصر نے ابو عبد اللہ کو حلب کا حاکم بنا دیا جس پر وہ اپنی موت تک باقی رہا۔ ابو طاہر نے نصیبین جا کر پناہ لی جہاں عقیلیوں نے اس کو قتل کر دیا۔

باز بن مروان بنی حمدان کا ناٹھانی رشتہ دار تھا، یہ قرابت ابو علی کو بھی پہنچتی تھی لہذا کردوں اور بعض حمدانیوں کا تعاون اس کو حاصل تھا، اس نے آمد، ارزن، میافارقین اور کیفہ کو ملا کر ایک مضبوط حکومت بنالی تھی پھر تو سب مملکت کی ہوس میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ اس کے بعد ابو منصور بن مروان اس کا قائم مقام ہوا۔

ابو منصور کا پورا خاندان بنی بوہیمہ کی سرپرستی کو تسلیم کرتا تھا مگر ہوا کے رخ کو دیکھ کر یا عقیدت میں ابو منصور نے خلیفہ مصر کی اطاعت کر لی اور ایک



بہاؤ الدولہ منصور، سیف الدولہ صدقہ، نور الدولہ دبیس بن صدقہ، محمد بن دبیس اور علی بن دبیس۔ ان میں سے بہاؤ الدولہ منصور کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے ۴۹۵ھ میں جمیعہ کے مقام پر حملہ آباد کیا..... ۵۲۳ھ میں اس قبیلہ کو سلجوقیوں نے جلاوطن کر دیا اور اس سرزمین پر ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

#### امارت بنی حسنویہ

سریاح اور بزرگسال کے قلعوں کی ایک چھوٹی سی حکومت تھی جو حسنویہ بن حصین کروڑنے اپنے نانہال سے وراثت میں پائی تھی، انہیں کردوں میں ایک گروہ عباسی بھی تھا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اطراف وینور، ہمدان، نہادند وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور چوتھی صدی کے اوائل میں ایک حکومت قائم کر لی جو تقریباً نصف صدی تک باقی رہی۔

حسنویہ بہادر، منظم اور فیاض تھا۔ بوہبی حکومت کے قیام کے بعد وہ رکن الدولہ کے ہواخواہوں میں داخل ہو گیا اور اس کی طرف سے کئی جنگی خدمات انجام دیں۔

۲۶۹ھ میں حسنویہ کا انتقال ہو گیا تو بدر اس کا جانشین ہوا اس نے اپنے باپ کا نام اونچا کیا۔ عراق کی جنگی بساط پر اس نے بارہا اپنی جوانمردی کے جھنڈے گاڑے اور ناصر الدولہ کے لقب سے سرفراز ہوا۔ اس زندگی ہی میں ہلال نے نظم حکومت سنبھالنے کی کوشش کی اور باہمی جنگیں واقع ہوئیں۔ ۴۰۵ھ میں بدر کا قتل ہو گیا اور ہلال امیر مملکت ہوا، ہلال سے بوہبی کے کئی معرکے ہوئے۔

پھر طاہر نے ہلال کی جگہ لی۔ ابو الشوک کردوں کی دوسری شاخ کا امیر تھا، اس سے طاہر کی جنگ ہوئی، ابو الشوک کے جنگی کارنامے بھی تاریخ کا حصہ ہیں، اس کی نسل میں بھی کئی حکمران گزرے ہیں: سعدی بن ابو الشوک، مہاہل، بدر بن مہاہل۔ آخر سلجوقیوں کے ہاتھوں ان سب کا خاتمہ ہو گیا۔

حسام الدولہ، زعمیم الدولہ بن حسام الدولہ، حسام الدولہ کا پوتا علم الدولہ قریش، شرف الدولہ مسلم بن قریش، ابراہیم بن قریش، علی بن مسلم۔

#### بنی مزید

بنی عدنان کے قبیلہ بنی اسد نے عرب سے ترک وطن کیا تو قادسیہ و بغداد تک آباد ہو گئے۔ نعمانیہ ان کا مرکز تھا اور خویستان کے جزائر میں بنی دبیس بھی انہیں کے کہنے سے تھے، یہ جزیرہ اسی نسبت سے جزیرہ و بیسیہ کہلاتا تھا۔ ابو الحسن علی بن مزید اور اس کا بھائی ابو الغنائم رئیس قبیلہ تھے۔ ابو الغنائم بنی دبیس میں رہتا تھا۔ وہاں اس نے کسی بات پر ایک سردار کو مار ڈالا اور بنی دبیس سے بچنے کے لئے اپنے بھائی ابو الحسن علی کے پاس آ گیا۔ ابو الحسن نے ۴۰۱ھ میں دو ہزار سواروں سے بنی دبیس پر حملہ کیا مگر شکست کھائی ابو الغنائم قتل ہو گیا اور ابو الحسن بچ نکلا۔

۴۰۵ھ میں ایک لڑائی اور ہوئی اس میں ابو الحسن کامیاب ہوا اور جزیرے پر قبضہ کر لیا۔ پھر مضربن دبیس نے ابو الحسن پر شب خون مارا، ابو الحسن نے بھاگ کر بلد النیل میں پناہ لی اور مضربن نے اپنے جزیرہ پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد ہی سلطان الدولہ بوہبی کی طرف سے ابو الحسن کو جمیعہ کی حکومت مل گئی، ۴۰۸ھ میں وہ وفات پا گیا اور نور الدولہ اس کا جانشین ہوا۔ نور الدولہ دبیس کی تخت نشینی پر اس کے بھائی مقلد نے بغاوت کی اور ناکام ہو کر بنی عقیل کے پاس چلا گیا، دوسرا بھائی ثابت بھی مخالف تھا اس سے کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر اس کو ایک جاگیر دے کر منہ بند کر دیا گیا۔ ۴۲۱ھ میں اس نے واسط کی فوج کو شکست دی۔ کچھ دنوں بعد سلجوقیوں کی اطاعت کر لی، ۴۴۰ھ میں رحلت کر گیا۔

بوہبی حکومت کا ڈھلتا سورج تھا اور سلجوقیوں کا بھرپور اٹھان، دبسی فرمانرواؤں کو ابتداً بنی بیدہ سے سابقہ پڑا پھر سلجوقیوں سے۔ وہ سب کے سب مرد میدان تھے مگر بڑی طاقتوں کے مقابلے میں سربر نہ ہو سکے پھر بھی تقریباً ڈیڑھ سو سال ان کی حکومت جاری رہا۔ اس مدت میں آٹھ حکمران تخت اقتدار پر بیٹھے

وزیری قائل رہا۔ ۴۳۳ھ میں وزیری کا انتقال ہوا تو معزالدولہ شمال نے حلب کو حصار میں لے لیا اور چند ماہ بعد اس پر قبضہ کر لیا لیکن مصری فوج کے جتھے آئے دن پریشان کرتے رہتے تھے اس لئے معزالدولہ نے خود حلب کو مصر کے حوالے کر دیا۔ ۴۵۴ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد عطیہ بن صالح حلب کا حکمران ہوا لیکن بعض مفسدوں کے بھڑکانے سے محمود بن نصر سے اس کی ان بن ہو گئی اور محمود نے فوج کشی کر کے ہچا کو حلب سے نکال دیا۔

سلاجوقی عراق و شام پر قابض ہوتے چلے جا رہے تھے اور بنی مرواس ایک ایک شہر کے لئے آپس میں دست و گریبان تھے۔ آخر محمود نے سلاجوقیوں کی اطاعت کر لی پھر بھی حکومت زیادہ دن اس کے خاندان میں باقی نہیں رہی۔ ۴۶۲ھ میں اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

شجاعت اس قبیلے کی خصوصیات میں تھی۔ صلیبی محاربات کی ابتدائی جنگوں میں ۴۹۱ھ تک و ثاب بن محمد بن نصر بن صالح بن مرواس نام کے شہسوار کا نام پایا جاتا ہے جو ایک گھوڑ سوار دستے کا افسر تھا۔

اس قبیلے کی حکومت اپنے سو سال بھی پورے نہیں کر سکی مگر اپنے بعد شجاعت اور ادب پروری کی داستان چھوڑ گئی۔ یہ سب عقیدے کے اعتبار سے شیعہ تھے۔ (۳۴)

### بنی عمار

خلافت بنی عباس میں لبنان شام کا ایک حصہ تھا جس کی امارت بزرگان بنی عمار کے سپرد ہوئی تھی۔ بوہس کے عہد میں یہ قبیلہ ممتاز قبائل میں شمار ہوتا تھا اس نے لبنان بالخصوص طرابلس کو اتنی ترقی دی تھی کہ دور دور تک اس کی شہرت تھی، اس کو علم و ادب اور جہاد کا روشن ینار کہا جاتا تھا یہ حقیقت الحسن بن عمار کے دور حکومت کا طرہ امتیاز تھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ الحسن نے اس شہر کو دانشوران شام کا مرکز بنا دیا تھا اس نے ایک بڑی درس گاہ تعمیر کرائی تھی جس کے متصل کتب خانہ بھی تھا۔ یہ

### دولت بنی مرداس

صالح بن مرواس، عمرو بن کلاب کی اولاد میں تھا، اس کا خاندان اطراف حلب میں آباد تھا۔ بنی حمدان کے زوال پذیر ہونے پر "رحبہ" ابن مجکان کے قبضے میں تھا۔ صالح بن مرداس سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے اس نے اپنی بیٹی کا عقد اس سے کر دیا پھر دونوں میں ناچاقی ہو گئی اور ابن مجکان صالح سے برسر پیکار ہو گیا لیکن صالح نے خود اس کو قتل کر دیا اور رحبہ پر قبضہ کر لیا۔ اسد الدولہ صالح ایک مرد جنگ آزماتا تھا، اس طوائف الملوکی کے زمانے میں وہ اپنی حدود مملکت کو بڑھاتا رہا سہاں تک کہ ایک سخت جنگ کے بعد اس نے حلب ابی شعبان کے قبضے سے نکال لیا، پھر اس کی حکومت بعلبک اور عاصہ تک پھیل گئی اور حسان بن مفرج رملہ سے سرحد مصر تک قابض ہو گیا۔

مصر کے فاطمی خلیفہ نے ان دونوں کی سرکوبی کے لئے انوشکین دریدی کو تعینات کیا۔ اردن کے قریب اس سے ان دونوں کی ہولناک جنگ ہوئی جس میں صالح بن مرداس اور اس کا چھوٹا بیٹا لڑتا ہوا مارا، دوسرا بیٹا ابو کامل نصر بن صالح بچ کر نکل گیا اور حلب میں شبل الدولہ کے لقب سے تخت نشین ہو گیا۔

۴۲۱ھ میں ارمانوس، یورپ کے تمام عیسائی بادشاہوں کی تین لاکھ فوج لے کر حلب پر حملہ آور ہوا۔ شبل الدولہ میں اس مڑی دل کو روکنے کی طاقت نہ تھی مگر وہ بنی کلاب کی شجاعت کا ورثہ دار تھا اپنی پوری طاقت سمیٹ کر مقابلے پر آگیا۔ اب اس کو قسمت کی بات ہی کہنا چاہئے کہ عیسائی لشکر میں غلط فہمی کی بناء پر پھوٹ پڑ گئی، رومی بادشاہ نے ایک سردار ابن دوقس کو گرفتار کر لیا، نتیجے میں عیسائی لشکر واپس ہونے لگا۔ شبل الدولہ نے اس سے فائدہ اٹھا کر عیسائی کیپ پر حملہ کر دیا۔ عیسائیوں کا بہت نقصان ہوا، وہ تمام مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

۴۲۹ھ میں مصری لشکر حلب پر آور ہوا۔ شبل الدولہ نے مقابلہ کیا وہ میدان جنگ میں کام آیا اور اس کے لشکر کو شکست ہو گئی اس کا بھائی شمال بن صالح "رحبہ" میں معزالدولہ کے لقب سے تخت نشین ہوا اور حلب پر مصری سردار



کبھی کے مسلمان حکمران عیسائیوں کی رعایا بن گئے۔ بنی عمار شیعہ عقیدے کے مسلمان تھے۔ (۳۵)

### غزنی اور سلجوقی

شیعہ دور اقتدار میں صرف بخارا کی سامانی حکومت تھی جو صفاریوں یا بوہیوں کا مقابلہ کر سکتی لیکن سامانی طاقتور ہونے کے باوجود ان سوراؤں کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ امتداد زمانہ سے جب شیعوں کی چھوٹی بڑی حکومتیں آپس میں ٹکرا کر کمزور پڑ گئیں اور بوہیوں کا زوال بھی شروع ہو گیا تو سبکتگین غزنی میں اپنی حکومت مضبوط کر چکا تھا اور سرحد کے بوہی علاقوں پر تاخت کر رہا تھا۔

یہ بات چوتھی صدی ہجری کی ساتویں دہائی کی ہے۔ سبکتگین کے انتقال پر اس کا نامور بیٹا محمود تخت نشین ہوا پھر مسعود بن محمود۔ غزنی کی سلطنت سامانی سلطنت کے خاکستری بن تھی لیکن محمود کے عہد میں اس کی حدود پھیلیں تو بوہی علاقوں کو تاراج کرتی ہوئی بغداد تک پہنچ گئیں اور ایک وقت وہ آیا جب شہنشاہ عضد الدولہ کی کرسی پر غزنی کا سلطان محمود بیٹھا نظر آیا۔

محمود نسلا ترک تھا اور اسی قوم سے اس کا تعلق تھا جو سرحد چین پر خوارزم تک اور شاش، فرغانہ، ماوراء النہر، بخارا، سمرقند اور ترمذ میں آباد تھی اور سلجوق اس کا سردار تھا۔ محمود کی افواج سے ان کے کئی معرکے ہوئے، ایک گروہ نے محمود کی اطاعت کر لی، اس کو فوج میں داخل کر لیا گیا، ارسلان بن سلجوق کو گرفتار کر کے ہندوستان کے کسی قلعہ میں بھیج دیا اور یحیر نامی ایک شخص کو ان کا سردار بنا دیا۔ اس کے بیٹے کورے میں سکونت کی اجازت دے دی۔

محمود کے انتقال کے بعد ترکوں نے بغاوت کی اور کئی جنگوں کے بعد رے فتح کر لیا۔ اس گروہ کا نام عراقیہ تھا۔ دوسرا گروہ بوقا۔ کوکیش کی سرکردگی میں آذربائیجان ہوتا ہوا ۴۲۹ھ میں مراۃ پہنچ گیا۔ اس موقع پر کچھ لوگ ٹوٹ کر بوقا کے ساتھ رے آ گئے، کچھ منصور اور کوکیش کے ہمراہ ہمدان کی طرف بڑھنے لگے اور کرخ اور ہمدان پر قابض ہو گئے۔ اس طرح رے، دیار بکر اور موصل میں قتل و

درس گاہ آہستہ آہستہ دارالعلوم بن گئی۔ کتب خانے میں ۱۸۰ کاتب ملازم تھے جو کتابوں کی نقلیں کیا کرتے تھے۔

یہ خاندان صرف اہل قلم نہ تھا، صاحب سیف بھی تھا جس نے بارہا صلیبیوں سے اپنا لوہا منوایا تھا۔ کئی بہادروں کے نام تو نصرانی حلقے میں زبان زد عام تھے اور عمار بن محمد بن عمار کے ذکر پر تو انہیں پسینہ آ جاتا تھا۔ وہ اس سورا کو ملک الساحل کہہ کر پکارتے تھے۔

اہل صلیب کی نگاہیں یوں تو پورے عالم اسلام پر لگی ہوئی تھیں لیکن طرابلس تو ان کی آماجگاہ بن گیا تھا جس پر متعدد حملے کرنے کے باوجود وہ قبضہ نہ کر سکے تھے کیونکہ عمار بن محمد ان کے رستے کے دیوار بن کر کھڑا تھا جس سے سر ٹکرا کر وہ واپس جاتے تھے۔ آخر سنبل دی فرینک نے طرابلس کے رستے پر ایک ٹیلہ بنوایا۔ اس کے اوپر ایک قلعہ تعمیر کرایا جس کے مینار سے بہت دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کی خبر جب طرابلس پہنچی تو سپہ سالار فخر الملک تین سو سواروں کو لے کر طرابلس سے نکلا، محافظین قلعہ سے سخت جنگ ہوئی مگر وہ اس طوفان کو روک نہ سکے اور ان تین سو بہادروں نے قلعہ اور طلائی مینار کو جلا کر خاکستری بنا دیا۔ سنبل نے جلے ہوئے مینار کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا تو اس کا دل بیٹھنے لگا اس صدمے سے وہ ایسا بیمار پڑا کہ جانبر نہ ہو سکا۔

فخر الملک نے پانچ سال تک اہل صلیب کو روک رکھا۔ اس عرصے میں ان کی تعداد اور طاقت میں اضافہ ہوتا رہا لہذا فخر الملک نے محسوس کیا کہ اب ان کی یلغار کو روکنا اس کی طاقت سے باہر ہو گیا ہے اس نے خلیفہ بغداد سے مدد مانگی۔ سلجوقی عراق و ایران کے فرمانروا بن چکے تھے، خلیفہ نے ان کو توجہ دلائی اور صورت حال سے آگاہ کیا لیکن ان کے کان پر جوں نہ رسنگی۔ مجبوراً بنی عمار نے اپنے قوت بازو پر اعتماد کیا اور سروس سے بے نیاز ہو کر لڑتے رہے۔

غیر متناسب طاقتوں کی جنگوں کا جو انجام ہونا چاہئے تھا وہی ہوا فخر الملک لڑائی میں رستم و سہراب کی شجاعت کو مات کرتا رہا مگر تابہ کے! بہادروں کی تعداد کم سے کم ہوتی رہی۔ آخر ۵۰۳ھ ہجری میں طرابلس پر اہل صلیب کا پرچم لہرانے لگا اور

ویلیسوں کا تنازعہ ختم کرا کے فارغ ہوا تو اس نے فارس پر توجہ کی اور بغداد سے روانہ ہوا۔ مصمص الدولہ کی فوج نو بند جان کے قریب خیمہ زن تھی۔ بہاء الدولہ کے مقدمہ لشکر نے اس کو شکست دی مگر مصمص الدولہ کے ایک سپہ سالار نے جلد ہی اس کا بدلہ لے لیا اور بہاء الدولہ کے ہراول کو پسا کر دیا۔

اسی دوران یہی خواہان سلطنت نے درمیان میں پڑ کر صلح کرا دی اور بہاء الدولہ نے ۳۸۰ھ میں بلاد فارس و ارجان پر مصمص الدولہ کا قبضہ تسلیم کر لیا اور فوراً بغداد واپس ہو گیا جہاں شیعہ اور سنیوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ بہاء الدولہ نے واپس ہوتے ہی مصالحت کرا دی اور مصمص الدولہ نے بڑھ کر سوس پر قبضہ کر لیا جس کو ۳۸۴ھ میں بہاء الدولہ نے واکزار کرا لیا پھر ابو اوزیر یلخار کرائی اور اس کو بھی فتح کرایا۔

اس عرصے میں مصمص الدولہ بصرہ پر بھی قبضہ کر چکا تھا اور بہاء الدولہ کا لشکر بھی ایک طرف موجود تھا کہ عمران بن شاہین کا جانشین مہذب الدولہ بھی تسخیر کا امیدوار بن کر میدان میں آگیا۔ مختلف محاذوں پر کئی مقابلے ہوئے۔ آخر بہاء الدولہ کا ایک سردار شکرستان کو اہل شیر کا تعاون حاصل ہو گیا اور تینوں طاقتوں نے خونریزی سے بچنے کے لئے اس کا تسلط تسلیم کر لیا۔

اقتدار کی یہ لڑائیاں چھوٹے بڑے پیمانے پر جاری تھیں کہ بہاء الدولہ نے بدر بن حسنویہ کرد کو اپنی طرف ملا لیا مصمص الدولہ کی طاقت کم ہو چکی تھی کہ عزالدولہ کے بیٹے ابوالقاسم اور ابونصر کسی طرح قید سے آزاد ہو گئے اور ایک جمعیت فراہم کر کے اس کے مقابل آگئے۔ مصمص الدولہ اپنے ایک قلعہ میں پناہ لینے کے ارادے سے چلا کہ راستے میں کردوں نے اس کو لوٹ لیا۔ اب مصمص الدولہ نے قلعہ رودماں کا رخ کیا۔ والی رودماں نے گرفتار کر کے ابونصر کے حوالے کر دیا جس نے ۳۸۸ھ میں اس کو قتل کرا دیا۔

یہ خبر بہاء الدولہ کے لئے موجب طمانیت تھی لیکن ابھی عزالدولہ کے بیٹے سدرہ تھے پھر بھی بہاء الدولہ نے کئی قلعوں کو فتح کیا ابونصر اور ابوالقاسم نے کئی

غارت کا بازار گرم کیا۔

ترکوں کا ایک سردار ارسلان بن سلجوق ان کے ساتھ آیا تھا جو گرفتار کر لیا گیا تھا دوسرے سردار میکائل بن سلجوق کا بیٹا طغرل بک وطن ہی میں تھا۔ اس موقع پر قاصد بھیج کر ان ترکوں کے قائلانہ افعال پر احتجاج کیا گیا مگر اس نے مجبوری ظاہر کی پھر سلطان مسعود بن محمود سے طغرل بک کی ہولناک جنگ ہوئی۔ مسعود شکست یاب ہوا اور طغرل نے ۴۳۱ھ میں نیشاپور پر قبضہ کر لیا۔

یہ تھی ابتداء حکومت سلجوقیہ کی۔ اس کے بعد دائرہ حکومت پھیلتا رہا..... سلجوقی حکومت میں آٹھ فرمانروا گزرے۔ ۴۳۹ھ سے ۵۵۱ھ ۱۲۲ سال اس خاندان کے عروج کا زمانہ ہے اس کے بعد حصے بجزے ہو گئے اور آہستہ آہستہ ملک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گیا۔ آخری حکومت خوارزم کی تھی جو ۴۷۰ھ میں قائم ہو کر ۶۲۸ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔

سلطنت سلجوقیہ کے فرمانروا طغرل بیگ، الپ ارسلان، ملک شاہ، ناصرالدین محمود، برکیارق، ملک شاہ ثانی، محمد بن ملک شاہ اور سنجر بن ملک شاہ کے نام تاریخ میں روشن ہیں۔

### اقتدار کی جنگ یا خود کشی

موصل پر حمدانی قبضہ اور بنی حمدان کی حکومت کا خاتمہ بہاء الدولہ کے دور کی بات ہے۔ اس کی سلطنت میں اب پہلی سی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ باقی نہ تھا لیکن معزالدولہ اور عضدالدولہ کے نام اس سے وابستہ تھے اور پھر بہاء الدولہ بھی کوئی ناکارہ فرماں روا نہ تھا۔ اس میں اسلاف کا ساندہ اور شجاعت نہ رہی پھر بھی شیروں کے خاندان کا فرد تھا۔ وقت ساتھ دیتا تو وہ ماضی کی روایات کو برقرار رکھتا لیکن اس کو مسلسل اپنوں اور غیروں کی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کا مقابلہ وہ اپنی اکیلی طاقت پر نہ کر سکا اس لئے سلطنت کے حصے بجزے ہو نا شروع ہو گئے ۳۷۹ھ کے آخر میں شرف الدولہ نے مصمص الدولہ کو بغداد سے بے دخل کر کے فارس بھیج دیا تھا اس نے فارس پر قبضہ کر لیا..... بہاء الدولہ جب ترکوں اور

قتل کے بعد اس کا بیٹا قرواش جانشین ہوا۔ اس نے ۳۹۲ھ میں مدائن پر دھاوا بول دیا۔ عمید لیوش اور ابو جعفر نے انہیں پسپا کیا مگر دوبارہ وہ بنی مزید اور بنی اسد کو لیکر آگئے، بوہبی لشکر کو شکست دے دی اور بہت قتل و غارت کیا۔ ابو جعفر نے بڑی مشکل سے انہیں شکست دی اور قرواش کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔

۳۹۳ھ میں مہذب الدولہ والی بطیحہ کے درباریوں میں سے ایک شخص ابو العباس نے خروج کیا اور مہذب الدولہ کو بطیحہ اور بصرہ سے نکال دیا۔ بہاؤ الدولہ نے ابو علی عمید لیوش کو بھیج کر اس کی سرکوبی کی۔ وہ شکست کھا کر خوزستان کی طرف چلا گیا اور ابواز پر قابض ہو گیا اور بہاء الدولہ کی فوج نے لڑکر اس کو نکال دیا۔ ابو العباس کردستان کی طرف نکل جانا چاہتا تھا لیکن ایک ویلی سردار نے پکڑ لیا اور عمید لیوش نے اس کو قتل کر دیا۔

۴۰۲ھ میں بمقام ارجان بہاء الدولہ کا انتقال ہو گیا اور ابو شجاع سلطان الدولہ اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔

بہاء الدولہ کی مدت سلطنت چوبیس سال تھی لیکن وہ آہا و اجداد کا نام دشمن نہ کر سکا۔ اس کو صلاحیت کی کمی بھی کہا جاسکتا ہے اور نصیب کا کھوٹ بھی۔ اس کے وقت تک بوہہین کی سطوت و شوکت کچھ نہ کچھ باقی تھی اس کے بعد زوال پذیر سلطنت اتنے ٹکڑوں میں بٹ گئی کہ باہمی شیرازہ بندی ماضی کی کہانی بن کر رہ گئی

### ملک گیری یا جہاد

بدقسمتی سے آپس میں لڑنے والے سب شیعہ تھے اور غزنی کا سنی اقتدار لپٹائی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی حیثیت صرف اسی قدر تھی کہ ایک عقیدے والوں کی حکومت پر دوسرے عقیدے والے کی نگاہ تھی ورنہ ہمارے نظریے سے تو نہ کسی کی کوئی جنگ شرعی اور نہ کوئی محاربہ اسلامی۔ اسلام نے تو صرف ان جنگوں کو جہاد قرار دیا تھا جو تحفظ اسلام یا بقائے اسلام کے لئے لڑی جائیں۔ ملک گیری کی ہوس اور جہانبانی کی طمع میں اگر کوئی طاقتور کسی کمزور مسلم یا غیر مسلم پر چڑھ دوڑے تو وہ جنگ اسلام کی جنگ تو قرار نہیں دی جاسکتی

لڑائیاں لڑیں مگر کامیاب نہ ہو سکے بلکہ خود ان کا لشکر منتشر ہو گیا۔ ابو القاسم بدر بن حسنویہ کے پاس چلا گیا پھر بطیحہ جا کر وہیں کاہور ہا۔ ابو نصر و یلم کا عازم ہو گیا۔ وہاں سے ایک فوج مرتب کر کے اس نے کرمان کے اکثر مقامات مسخر کئے۔

بہاء الدولہ نے موفق بن علی کو اس کے مقابلے پر بھیجا اور ابو نصر میدان جنگ میں کام آیا۔ موفق کی یہ کارکردگاری بہاء الدولہ کی خوشنودی کا باعث تھی لیکن موفق کی طرف سے اس کو بعض غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ موفق نے سرکشانہ انداز اختیار کیا تو بہاء الدولہ نے اس کو قتل کر دیا۔

۳۸۰ھ میں حکومت بنی مروان قائم ہوئی۔ ۳۸۴ھ میں خراسان سے سامانی اقتدار ختم ہوا۔ ۳۸۹ھ میں ماوراء النہر سے بھی خاتمہ ہو گیا۔ ۳۸۸ھ میں حکومت بنی حسنویہ خراسان پر قابض ہوئی اور ۳۸۷ھ میں بنی مزید نے بہاء الدولہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا مگر شکست کھا کر اطاعت اختیار کر لی، ۳۹۲ھ میں پھر قرواش بن مقلد سے مل کر مدائن پر حملہ آور ہوا۔ بہاء الدولہ نے ابو جعفر کو متعین کیا اور یکے بعد دیگرے کئی جنگوں کے بعد ان کے مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔

بغداد کے فتنہ و فساد کے سلسلے میں بہاء الدولہ نے ابو جعفر کو معزول کیا اور وہ باغی ہوا تو بہاء الدولہ نے ابو علی عمید لیوش کو تعینات کیا جس نے سخت لڑائی کے بعد ابو جعفر کو شکست دی ..... ۳۹۷ھ میں ابو جعفر نے بدر بن حسنویہ اور ابو الحسن علی بن مزید اسدی اور کئی دوسرے قبائل کو ملا کر بغداد کا محاصرہ کیا مگر شکست کے آثار دیکھ کر ہٹ گیا۔ کچھ دنوں بعد ابو جعفر نے بہاء الدولہ کی اطاعت کر لی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ملک کے اطراف کئی چھوٹی چھوٹی محولہ حکومتیں قائم ہو گئی تھیں جو توسیع ملک کے لئے باہم ٹکراتی رہتیں اور مل کر بہاء الدولہ کے سامنے بھی آجائیں۔ بوہبی حکمران ان سب کا مقابلہ کرتا رہا۔ بنی عقیل کے ساتھ تو بہاء الدولہ کے بہت سے معرکے ہوئے۔ ۳۸۶ھ میں محمد بن مسیب عقیلی والی موصل کے انتقال پر مقلد اور عقیل دو بھائیوں میں ٹھن گئی۔ بہاء الدولہ کو بھی دخل دینا پڑا۔ آخر مقلد سے ادائے خراج کی شرط پر صلح ہو گئی۔ ۳۹۱ھ میں مقلد کے

مگر کسی کو کسی سے پر خاش نہ تھی، گردن زدنی تو صرف رسول کی اولاد، وہ بھی حکومت کی اصل حقدار ہونے کے سبب۔ غصب خلافت کی بات نہ ہوتی تو صرف بعض مسائل میں نظریاتی اختلاف ہوتا مگر فرقہ بندی کی کوئی صورت سامنے نہ آتی۔ وقت کے فصل نے اگر ایک طرف مسالک کی تفریق پیدا کر کے استقرار حکومت کے دھارے کا رخ موڑا تو دوسری طرف جہاد کی تعریف ہی بدل ڈالی۔

اب اگر ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف تلوار اٹھاتا تو جہاد، کوئی مسلمان بادشاہ تو سیع مملکت کے لئے حملہ کرتا تو جہاد، حتیٰ کہ کوئی سنی کسی شیعہ پر حملہ کر دیتا تو جہاد لیکن ہم نے کبھی ایسی کوئی منطق تسلیم نہیں کی اور کسی شیعہ نے کوئی حکومت بھی بنائی تو اس کے فعل کو اسلامی قرار نہیں دیا البتہ اس کا افادی نتیجہ اگر دائرہ شرع کے اندر ہوا تو اس کو مستحسن قرار دیا اس لئے ملک گیری اور حکومت سازی کسی دور میں بھی کی گئی تو خون انسانی کی ارزانی کو ہم نے اسلامی قید و بند کی زنجیروں میں اسیر نہیں کیا اور کسی ظالم و جارح کی خونریزی کو جہاد کے معنی نہیں پہنچائے۔

طاہری، علوی، صفاری سلاطین ہمارے نزدیک اموی اور عباسی بادشاہوں اور غزنوی، غوری اور سلجوقی سلاطینوں سے مختلف نہیں۔ ہاں ان میں جس کسی کی طرف سے دین کی کوئی خدمت ہوئی ہے اس کو بنگاہ استحسان دیکھا ہے اور شیعہ حکمرانوں کی طرف سے جہاں کہیں ہمارے تحفظ اور آل رسول کی حرمت کا التزام کیا گیا ہے وہاں ہم ان کو کلمات خیر سے یاد کرتے رہے ہیں..... یہی سبب ہے جو ہم نے ان کے کارناموں کو یکجا کر دیا ہے اور بڑے اختصار سے ان کی سیرتوں کے خاکے پیش کر دیئے ہیں تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ ہم صرف ملت گریہ کن نہیں ہیں تلوار کے دھنی بھی رہے ہیں اور اپنی ہوئی تلواروں سے ہم نے صرف اپنا خون ہی نہیں بہایا بلکہ سواد قلم سے جریدہ عالم پر مہر دوام بھی لگائی ہے۔

ہمارے مولیٰ علی نے ہمیں ایک لب و لہجہ دیا تھا۔ جب تک ہمارا سلسلہ امامت باقی رہا، ہم نے اسی لب و لہجہ میں بات کی لیکن دنیا نے اس کو ہماری کمزوری سمجھا اور ہماری گردنوں کو اپنی تلواروں کے لئے وقف کر لیا مگر جب ہمارا آخری امام

خود آنحضرت کے تمام غزوات و سریات دفاعی تھے ان میں سے کسی میں کوئی جارحانہ پہلو برآمد نہیں ہوتا اور ان کے بعد جو جنگی مہمات سر ہوئیں، وہ موضوع بحث ہیں، ان میں تحفظ یا تبلیغ دین کے عناصر منطقی فکر ہی سے نکالے جا سکتے ہیں۔ اس میں کامیابی نہ ہو تو ملک گیری کی ابتداء وہیں سے ہو جائے گی مگر خطائے بزرگانِ گزشتہ خطا است اس لئے جنگ صفین ہوس اقتدار کا سنگ بنیاد قرار پائے گی اور اس کے بعد مسلمانوں کی اکثر لڑائیاں اسی ذیل میں آئیں گی، خواہ وہ سنیوں کی ہوں یا شیعوں کی۔

امام حسن اور امام حسین کی جنگوں کا شمار دفاعی جنگوں میں ہے جن میں تحفظ و تبلیغ اسلام کے علاوہ کوئی اساسی مقصد ڈھونڈ کر بھی نکالا نہیں جا سکتا..... عام مسلمانوں کی بعض جنگیں بھی مستثنیات میں آتی ہیں جو غیر مسلمین کے جارحانہ حملوں کے خلاف واقع ہوئیں۔ ان میں محاربات قسطنطنیہ اور صلیبی جنگیں شامل ہیں اور سیف الدولہ و صلاح الدین ایوبی کے نام جن کا سرنامہ ہیں۔

یہ ہے ہمارا زاویہ نگاہ اور ہماری تحقیق میں شرع اسلام کا فیصلہ، ورنہ کہنے کو تو ہندوستان پر محمود غزنوی کی غارت گری میں بھی جہاد کے پہلو نکال لئے جاتے ہیں اور شیعہ و سنی لڑائیوں کے مقتول بھی شہید کہہ دیئے جاتے ہیں مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ حنفیوں، اشعریوں اور حنبلیوں کی لڑائیوں میں بغداد و قاہرہ کی سڑکوں پر جو خون کے دریا بہے، ان میں کس گروہ کے لوگ شہید اور کس گروہ کے لوگ ہلاک ٹھہرائے جائیں گے؟

فرقہ بندی کے اس کھیل میں دور حاضر تو صرف دو گروہوں کے نام لیتا ہے۔ شیعہ اور سنی۔ ماضی بعید میں بھی صرف دو نام ہی تھے بلی کا دوست اور علی کا دشمن۔ بالفاظ دیگر شیعہ اور غیر شیعہ۔ منصور و ہارون رشید نے اہل سنت کے نام کو زندہ کیا اور مامون نے فقہ حنفی مدون کرا کے اس پر مہر دوام ثبت کر دی مگر راج الوقت مسلک معتزلی ہی رہا۔ حنفی مذہب تو تیسری صدی ہجری کی چوتھی دہائی میں منظر عام پر آیا جب ظالم متوکل نے اس کو سرکاری مذہب قرار دیا۔

اس سے پہلے شافعی، مالکی اور حنبلی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں موجود تھے

لشکر تیار کر کے وہ آگے بڑھا اور ابو اوز پر قابض ہو گیا لیکن جلد ہی فخر الدولہ کی بدسلوکی کے سبب فوج میں بھوٹ پڑ گئی۔ وہ رے کی طرف پلٹ پڑا اور ابو اوز پر پھر بہاء الدولہ کی حکومت کا پرچم اڑنے لگا۔

ماہ شعبان ۳۸۵ھ میں فخر الدولہ کا انتقال ہو گیا اور تخت حکومت پر اس کا چھوٹا بیٹا مجدد الدولہ ابو طالب رستم مسکن ہوا اس کے بھائی شمس الدولہ کو ہمدان اور قریس کا حاکم بنایا گیا۔

مجدد الدولہ کی کم سنی کے باعث ماں اس کی اتالیق تھی مگر عملاً انتظام حکومت وزراء اور امراء کے ہاتھ میں تھا۔ شمس الدولہ نے بدر بن حسنویہ کو لے کر چڑھائی کر دی اور اس نے مجدد الدولہ کی جگہ لے لی۔ اس کے بعد ہی مادر مجدد الدولہ بدر کی طرف سے مشتبہ ہو گئی اور شمس الدولہ نے ماں کو حصار میں لے لیا مگر وہ کسی نہ کسی طرح نکل گئی۔

اسی زمانے میں بدر حسنویہ سے اس کے بیٹے کی ناچاقی ہو گئی۔ بدر نے بہاء الدولہ سے مدد مانگی۔ اس نے مدد تو کی لیکن فتح کے بعد تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا..... وقت کے فصل سے بنی عقیل اور دوسری طاقتوں میں محاربے ہوئے جن میں سلطان الدولہ بھی ملوث ہوا اور بنی مزید نے بعض مقامات کو تاراج کر ڈالا مجدد الدولہ اپنی ماں کے ساتھ نہادند میں مقیم تھا۔ اس درمیان تنخواہیں نہ ملنے کے سبب شمس الدولہ کی فوج نے بغاوت کر دی۔ وہ ہمدان واپس آ گیا اور رے پر پھر مجدد الدولہ کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد شمس الدولہ نے رے پر یلغار کرنے کی کوشش نہیں کی اور مجدد الدولہ ماں کی سرپرستی میں حکومت کرتا رہا۔

ملک کے مختلف حصوں میں جنگ و جدل کا بازار گرم تھا مجدد الدولہ جوانی کے دائرے میں داخل ہو کر علاقے کی خوشحالی اور اصلاحات میں لگا ہوا تھا۔ ماں ملک کی دیکھ بھال کرتی مگر ۴۱۹ھ میں جب وہ انتقال کر گئی تو نظم حکومت بگڑ گیا۔ بخارا کی سامانی حکومت شیعی اقتدار کے پہلے دن سے ان علاقوں کی گھات میں تھی مگر عمرو بن لیث کی شکست اور صفاری حکومت کے خاتمے کے بعد بھی وہ زیادہ دور تک اس طرف بڑھنے کی جرات نہ کر سکی اور مضبوط بوہی سلطنت قائم

پردہ غیب میں چلا گیا تو پابندیاں بدستور تھیں تاہم ہم نے حدود میں رہتے ہوئے اس لب و لہجہ میں بات کرنا شروع کی جس کو دنیا نے ہمیشہ سمجھا ہے اور یہ لب و لہجہ تھا تلوار کا۔

یقیناً ہم نے دشمنوں کی صفوں میں گھس کر اور ان میں اپنی جگہ بنا کر ان کا قلع قمع کیا ہے لیکن ہمارے ساتھ تو یہ شروع ہی سے کیا گیا تھا ہمارے گھر میں پناہ لے کر ہم پی کی کو گھر سے نکال باہر کیا گیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے آمنے کا تو یہ و طیرہ نہیں تھا مگر ہم امام کے پیرو ہیں، خود امام نہیں ہیں۔ دنیا کو حاصل کرنے کے لئے ہم کو دنیا والوں کی طرح بننا پڑا اور اس صراط عمل میں جو دین کی خدمت ہو سکی، ہمارے اکثر افراد نے وہ خدمت بھی کی۔

بلاشبہ یہ مظلوموں کا راستہ نہ تھا مگر ظلم پہننے کی بھی ایک حد ہوتی ہے لہذا مظلوم بھی گھات میں لگے رہے اور جیسے ہی موقع ملا، انہوں نے قالموں کے گھسانے میں ہاتھ ڈال دیا۔

### تلواروں کی جھنکار

یہ داستان بھی ماضی کے جیالوں کی۔ حال اس سے بالکل مختلف تھا، بلندیوں کی طرف پرواز کرنے والوں کی اولاد اب بڑے غرور کے ساتھ روایتی آن بان کا مذاق اڑاتی ہوئی نیچے کی طرف جا رہی تھی اور اس پر نادم بھی نہ تھی۔

رکن الدولہ بوہی ایوان کا دوسرا ستون تھا، فخر الدولہ اس کا بیٹا تھا جس کو خود عضد الدولہ کی طرح استحقاق حکومت تھا لیکن اس نے عز الدولہ کے مقابلے میں عضد الدولہ کا ساتھ نہ دیا لہذا عضد الدولہ نے برسر اقتدار آکر اس کو نیشاپور میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ۴۷۳ھ میں جب بڑے بھائی موید الدولہ کا انتقال ہوا تو اراکین سلطنت نے فخر الدولہ کو بلا کر صفہان ورے کا فرمانروا بنایا اور اس نے قدیم وفاداروں کی مدد سے انتظام سلطنت کا حق ادا کیا لیکن تولیت بغداد کا خیال وہ دل سے نکال نہ سکا۔

بدر بن حسنویہ اور ویلس بن عضیف اسدی اس کے ساتھ تھے چنانچہ ایک



حکومت علیحدہ کر لی تھی اور وہ اس پر قابض تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ سماء الدولہ اس کا بیٹا تھا اس نے کچھ دنوں بعد فرہاد بن مرواد تاج پر حملہ کیا۔ اس نے علماء الدولہ کا کوہ سے مدد مانگی جو شمس الدولہ کا ماموں تھا۔ ماموں بھانجے کے خلاف اس کے دشمن کی مدد پر تیار ہو گیا۔ سماء الدولہ جنگ کا ارادہ ترک کر کے واپس ہو گیا مگر علماء الدولہ نے جیٹھا نہ چھوڑا۔ آخر ایک سخت جنگ ہوئی اور سماء الدولہ کے سپہ سالار تاج الملک نے فرہاد اور علماء الدولہ کی متحدہ فوجوں کو شکست دیدی۔

اس درمیان علماء الدولہ نے تاج الملک کے ترک سپاہیوں کو توڑ لیا اور فتح شکست میں بدل گئی۔ علماء الدولہ نے دونوں کو گرفتار کر کے ہمدان پر قبضہ کر لیا۔ ماموں نے ایک بھائی کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا تو مجدد الدولہ اس سے کیا امید کر سکتا، دوسرے اعزاء و اقرباء میں ابو کالجار اور جلال الدولہ کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تھیں، غزنی کی یلغار پر مجدد الدولہ کس سے مدد طلب کرتا اور وہ خود اتنے بڑے لشکر سے لڑنے کے قابل نہ تھا لہذا عالم یاس میں جب غزنوی حاجب نے صلح کی بات بھیت کرنے کے لئے بلایا تو وہ اپنے بیٹے ابو ولف کو لے کر چلا گیا۔ غزنی کے شکاری نے شکار کے خود جال میں آجانے کے بعد نہ چھوڑا۔ دونوں گرفتار کر کے پابہ زنجیر کر لئے گئے اور خراسان لے جا کر قید کر دیئے گئے۔

فاتحین عالم تخریک کی خاطر انسانی زوایہ نگاہ سے حملے کا کوئی نہ کوئی جواز پیش کرتے رہے ہیں اور مسلمان بادشاہوں کے ہوا خواہ شرعی تاویلات میں ذہنوں کو الجھاتے رہے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسے مواقع آئے ہیں، جب حکومت کی تبدیلی عوام کی خدمت کی خاطر عمل میں آئی ہو اور کوئی تبدیلی اگر عام انسانوں کے لئے مفید بھی ہو تو بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے کہ اس سے پہلے کتنا خون بہتا ہے اور کس قدر غارت گری ہوتی ہے۔

بات حقیقتاً صرف شہ زور اور طاقت کی ہے اور توسیع مملکت کی ہوس ہمیشہ سے محض اس لئے سطح زمین کو رنگین کرتی رہی ہے کہ چار و انگ عالم میں اس کی فرمانروائی کا ڈنکا بجتا رہے..... مطمع نگاہ اگر صرف انسان کی فلاح ہو تو کسی چھوٹے سے علاقے میں بھی اتنی اصلاحات کی جاسکتی ہیں کہ دوسرے اس سے سبق

ہونے کے بعد اس طرف دیکھنے کا سوال ہی نہ تھا لیکن جب بوسہ ہی فرمانروا خود آپس میں ٹکرائے لگے تو امیر نوح بن منصور نے حالات سے فائدہ اٹھایا اور بوسہ سرداروں کی باہم چشمک میں ایک کا ساتھ دے کر سبکتگین اور محمود دونوں کو نیشا پور کی طرف روانہ کر دیا جنہوں نے لڑ بھڑ کر خراسان پر قبضہ کر لیا۔

۳۸۵ھ میں ابو علی اور فاتح دونوں سرداروں نے مل کر نیشا پور پر حملہ کیا اور محمود کو شکست دے کر نکال دیا۔ سبکتگین ہرات میں تھا، وہ اس خبر پر چل پڑا اور باپ بیٹے مل کر حملہ آور ہوئے۔ اب کی جنگ کا پانسہ ان کے حق میں پڑا اور ابو علی اور فاتح گرفتار ہو گئے..... کچھ دنوں تک وہ بخارا اور کاشغر میں قید رہے پھر رہا ہو کر خراسان کے پاس جرجان پہنچ گئے۔

۳۸۷ھ میں امیر نوح کا انتقال ہو گیا۔ سبکتگین طوس میں ٹھہر گیا اور اس نے مصلحتاً خراسان سے دوستی کر لی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد سبکتگین وفات پا گیا اور اسمعیل اس کا جانشین ہوا، محمود نے اس کو پکڑ کر قید کر دیا اور بخارا کو دار الحکومت بنا کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا جس کی سند اس نے خلیفہ قادر باللہ سے حاصل کر لی۔

بخارا میں نوح کے بعد ابو الحرث اور پھر عبدالملک کی حکمرانی تھی اور محمود ان کی طرف سے ایک بڑے علاقے کا حاکم تھا جس میں خراسان بھی شامل ہو چکا تھا جس کی وہ حدود بڑھاتا جا رہا تھا۔ اس دوران سیاوش تمکین سے اس کے کئی معرکے ہوئے، وہ ہندوستان پر بھی حملے کرتا رہا مگر اس کی مملکت پر زوال نہیں آیا حتیٰ کہ ۳۹۵ھ میں اس نے سلطنت سامانیہ کو ختم کر دیا۔

اب وہ غزنی کا مطلق العنان بادشاہ تھا اور اس کی نظریں ہندوستان پر گڑ گئی تھیں۔ کالجہ، سو منات، اجمیر وغیرہ کی فتوحات اسی دور کی ہیں، پھر وہ بوسہ سلطنت کے ملحق علاقوں کی طرف مائل ہوا..... سب سے پہلے اسے "رے" کی زبوں حالی کی خبر ملی اور اس نے ایک لشکر اپنے حاجب کی ماتحتی میں اس طرف روانہ کر دیا۔

مجدد الدولہ کے بڑے بھائی شمس الدولہ نے ماں کی زندگی میں ہمدان کی

کوئی مسلمان تخت سلطنت پر بیٹھ جانے سے مقدس ہو سکتا ہے تو امیر تیمور اس کا سب سے زیادہ اہل تھا۔ رہ گئی بات خلافت کے نام کی تو خلیفہ آج کن کن کو کہا جاتا ہے، سب جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ سب مقدس ہوں گے۔

ہمارے نزدیک تو بویہی سلاطین نے صرف عام مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا جو خلافت کے ماسور کو باقی رکھا اور نہ اس دور میں بھی آپریشن سے اس کا علاج ہو سکتا تھا..... بہر حال یہ خلافت گراب زوال پذیر تھا اور غزنی کا سلطان منصب خلافت گری حاصل کرنے کے لئے بازوؤں کو تول رہا تھا۔

بہاء الدولہ کے بعد جب ۴۰۲ھ میں سلطان الدولہ تخت نشین ہوا تو خود اپنے گھر کے دشمنوں کی زد پر تھا۔ بہلا دشمن خود اس کا بھائی ابو الفوارس تھا۔ وہ دیلمیوں کا ایک لشکر لے کر مقابل ہوا جس میں اس کو شکست ہوئی۔ مدد کے لئے اس نے غزنی کا رخ کیا اور محمود کی فوج لیکر پلٹا تو کرمان و شیراز پر قبضہ کر لیا۔

سلطان الدولہ کو اس کی خبر ملی تو تادمپ کے لئے روانہ ہوا اور اب کی ابو الفوارس کو شکست دی۔ ابو الفوارس نے بھاگ کر پہلے شمس الدولہ بن معز الدولہ والی ہمدان کے پاس پناہ لی پھر والی بطحیہ مہذب الدولہ سے طالب امداد ہوا۔ اس عرصے میں اس کے بھائی جلال الدولہ نے یحییٰ میں پڑ کر سلطان الدولہ سے صفائی کرا دی۔

۵۴۱ھ تک بویہی سلطنت کا وقار برقرار رہا لیکن سلطان الدولہ کو زیادہ دن چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے بعد ہی مشرف الدولہ بن بہاء الدولہ سے اس کی ان بن ہو گئی۔ مشرف الدولہ و بیس بن علی بن مزید کی کمک لے کر بڑھا۔ سلطان الدولہ نے ایک سپہ سالار ابن سہلان کو اس کے مقابلے پر بھیجا جو شکست یاب ہوا اور مجبوراً واسط مشرف الدولہ کے حوالے کر کے نکل کھڑا ہوا۔ ۴۱۲ھ میں دونوں بھائیوں کے مابین صلح ہو گئی اور طے پایا کہ عراق پر مشرف الدولہ کا قبضہ رہے گا اور کرمان و فارس پر سلطان الدولہ کا۔

ربیع الاول ۴۱۶ھ میں مشرف الدولہ بن بہاء الدولہ عراقی حکومت کے پانچویں سال وفات پا گیا اور اس کا بھائی ابو طاہر جلال الدولہ تولیت بغداد پر فائز

لیں لیکن ہوتا یہ رہا ہے کہ سکندر دارا کی سلطنت کو غارت کر دیتا ہے اور پنجاب میں داخل ہو کر پورس کے ہاتھیوں سے خود اس کی فوج روئدوا دیتا ہے تو تاریخ اس کے کارناموں کو حاشیہ چرمحا کر محفوظ کر لیتی ہے، کوئی یہ نہیں کہتا کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے قہر الہی تھا۔

یہی صورت مسلمانوں میں بھی پیش آئی۔ ابتدائی فتوحات کی رو "ہادیانہ قیادت" کے نقوش کو ملیا میٹ کر گئی تو بعد کے حکمرانوں کو موقع مل گیا اور وہ مسلمان اور غیر مسلمین پر حملوں کو مقصد اسلام قرار دینے لگے اور آج تک یہ طے نہ ہو سکا کہ کسی متمدن ملک بلاوجہ حملہ جائز ہے یا ناجائز۔

حاکم شام معاویہ کے جانشینوں کو جب بنی عباس نے بڑو شمشیر بخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تو انہیں بھی مقدس قرار دیدیا گیا حالانکہ ان میں سے اکثر بڑے قالم و خو خوار تھے۔

پھر وہ کمزور پڑے تو ایک طویل جدوجہد کے بعد بویہین نے انہیں دبا لیا اور اب بویہین کی طاقت ختم ہو رہی تھی، تو محمود غزنوی کا دست زبردست ان پر استنا زور ڈال رہا تھا کہ وہ زمین کا پیوند ہوئے جارہے تھے اور تاریخ محمود کو بنگاہ استحسان دیکھ رہی تھی وہ استنا ہی ستم گر اور جابر تھا جتنے بویہین۔ ہمارے خیال میں تو دونوں مخلوق الہی کے دشمن اور دونوں انسان کے خون کے پیاسے تھے جنہوں نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی خاطر انسان اور انسانیت کا خون ارزاں کر دیا اور پھر اسی انداز پر سلجوقیوں اور غوریوں نے ان کی جگہ لے لی۔

### بویہی اقتدار کے آخری معرکے

بعض مورخین نے بڑی واویلا کی ہے کہ بویہین نے عباسی خلفاء کے تقدس کو پامال کیا۔ کیسا تقدس، کیا وہ بڑے پاکباز تھے یا خدا نے ان مکاروں کو تخت خلافت ہی کے لئے پیدا کیا تھا؟ کہاں سے حکم آیا تھا کہ رسول کی مسند پر بیٹی کی اولاد کے بجائے ابو سفیان کے نسلی نمائندے بیٹھیں۔۔۔ اور پھر ان سے چالاکی اور تلوار کے بل پر حضرت عباس کے پوتے یہ جگہ چھین لیں۔



کا معرکہ مقلد بن ابوالاعز اور جلال الدولہ کے لشکر سے ہوا جس میں اس کو شکست ہوئی اور اس نے ابوستان غریب پہنچ کر پناہ لی۔ اس وقفے میں جلال الدولہ سے اس کی صلح ہو گئی۔

مقلد نور الدولہ کا پیچھا بھائی تھا مگر دونوں میں چلی ہوئی تھی لہذا مقلد نے ابو خفاجہ کو ملا کر، اس پر حملہ کر دیا، مطیر آباد، نیل اور سور کو تباہ کر ڈالا۔ نور الدولہ بھاگ کر دجلہ پار ابو الشوک کے پاس چلا گیا اس نے آپس میں صلح کرادی۔ ۴۲۱ھ میں جلال الدولہ نے "مدار" پر بلاتار کی ابو کالجار نے اس کے دفاع کے لئے اپنے حامی سرداروں کو روانہ کیا، بڑی سخت لڑائی ہوئی، شہر والوں نے ابو کالجار کا ساتھ دیا اور جلال الدولہ کی فوج دو طرفہ حربوں سے پس کر رہ گئی، اس کا اکثر حصہ کام آگیا، باقی ماندہ نے واسط پہنچ کر چائیں بچائیں۔

جلال الدولہ نے واسط کو اپنے بیٹے پر چھوڑا اور اپنے وزیر ابو علی کو بطارح کی طرف بھیجا جس نے بطارح سر کرنے کے بعد بصرہ کا رخ کیا۔ بصرے میں ابو کالجار کی طرف سے ابو منصور بن بختیار حاکم تھا اس کو ابدا شکست ہوئی۔ ابو علی نے تعاقب کیا مگر جب دریا میں ابو علی کی جنگی کشتیاں اس کی طرف بڑھیں تو ابو منصور نے پلٹ کر حملہ کر دیا اور جنگ کی بازی الٹ گئی فوج میں بھگدڑ پڑ گئی، ابو علی پکڑ لیا گیا اور ابو کالجار کی قید ہی میں اپنے ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

جلال الدولہ اس کے بعد خود بصرہ کی طرف بڑھا اور ابو کالجار کے لشکر کو پسپا کر دیا جس نے ابو منصور کے پاس ایلہ جا کر دم لیا اب کی ابو منصور نے خود آکر مقابلہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا، اور لڑائی میں کام آگیا۔

ابو کالجار سخت مزاج آدمی تھا، ان ناکامیوں کے ساتھ ہی والی بصرہ ابو القاسم سے بھی اس کی مخالفت ہو گئی اور اس نے جلال الدولہ سے ساز کر لیا جلال الدولہ نے اپنے بیٹے ملک العزیز کو روانہ کیا، اس نے ابو کالجار کی فوج کو بصرہ سے نکال دیا اور ابو القاسم کی حکومت کو برقرار رکھا لیکن ۴۲۵ھ میں ملک العزیز اس کی مخالفت ہو گئی اور ابو القاسم کو بصرہ سے نکال دیا گیا لیکن وہ اپنے آدمیوں کو جمع کر کے ملک العزیز سے لڑتا رہا اور ابو کالجار کی مدد سے پھر بصرے پر قابض ہو گیا۔

ہوا جو کچھ عرصہ بعد بصرہ کا عازم ہوا اس کی عدم موجودگی میں ابو کالجار بن سلطان الدولہ کے نام کا خطبہ پڑھ دیا گیا جو اس زمانے میں اپنے چچا ابو الفوارس سے مصروف پیکار تھا۔

جلال الدولہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بغداد واپس ہوا مگر اہل بغداد نے اس کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔

اس اثناء میں ابو کالجار ابو الفوارس کو شکست دے چکا تھا اور چچا بھتیجے میں صلح ہو چکی تھی مگر اس کے بغداد پہنچنے سے قبل جلال الدولہ کو بغداد والوں نے قبول کر لیا تھا۔ تاہم ترکوں نے اس کی مخالفت کی لیکن جلال الدولہ نے انہیں ہموار کر لیا۔

ابو کالجار بھی حالات سے غافل نہ تھا، اس نے بغداد جانے کے بجائے بصرہ دکرمان فتح کیا پھر واسط پر قابض ہو گیا اور ان تمام قلعوں پر تسلط حاصل کر کے ابواز کی سمت روانہ ہو گیا اور اثیر عنبر و قر و ش والی موصل کو بغداد کی جانب بڑھنے کی ہدایت کی۔ ان میں اثیر عنبر راستے ہی میں فوت ہو گیا۔

ان واقعات کی اطلاع جلال الدولہ کو بغداد میں ہوئی تو وہ لشکر لے کر ابو کالجار کے مقابلے کے لئے چل پڑا۔ ابو کالجار نے بھی بغداد کا رخ کیا اور وہیں اور ابو الشوک کو طلب کیا۔ وہیں کو اپنے ملک پر خفاجہ کے حملے کا خطرہ تھا لہذا اس نے ساتھ نہ دیا۔ ابو الشوک نے جواباً مطلع کیا کہ محمود بن سبکتگین کی فوجیں عراق کی طرف بڑھ رہی ہیں لہذا آپس کا جدال مناسب نہیں۔ ابو کالجار رک گیا اور وہ خط جلال الدولہ کو بھیج دیا مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے ابواز پہنچ کر اسکو لوٹ لیا، ابو کالجار کی والدہ اور اہل و عیال کو لے کر بغداد کا عازم ہو گیا۔

ابو کالجار بھی تعاقب میں روانہ ہوا، ربیع الاول ۴۲۱ھ میں دونوں کے مابین ہولناک جنگ ہوئی، تین روز تک معرکہ قتال گرم رہا، ابو کالجار کے دو ہزار آدمی کام آئے اور ہزیمت یاب ہو کر اس نے ابواز کی راہ لی۔

اس عرصے میں نور الدولہ وہیں کے بعض سرداروں میں بغاوت کے آثار رونما ہوئے، نور الدولہ نے ان کو گرفتار کر کے سزائیں دیں، پھر کسی بات پر اس

ایک طرف شمشیر و سنان کے یہ کھیل ہو رہے تھے، دوسری طرف محمود غزنوی رے کو فتح کر کے قزوین کی طرف بڑھ رہا تھا اس نے قزوین کے بعد شہر سادہ آدہ اور یافت کو بھی سخر کر لیا اور اس کے حاکم الکین کو گرفتار کر کے خراسان بھیج دیا، پھر فرقہ باطنیہ کے ایک بڑے گروہ کو قتل کیا، معتزلہ کو شہر بدر کیا، فلسفہ اور اعتزال کی کتب نذر آتش کیں اور حدود آرمینیہ تک قبضہ کرتا چلا گیا۔

اصفہان میں علاء الدولہ کا کوہ نے اس کی اطاعت کر لی رے پر اپنے بیٹے مسعود کو حاکم بنا کر وہ زنجان اور ابر کی طرف بڑھا اور ان دونوں مقامات کو فتح کر لیا پھر اصفہان کی طرف متوجہ ہوا اور علاء الدولہ کو بیدخل کر دیا۔ اس پر اہل اصفہان نے بغاوت کی۔ محمود نے نہایت بیدردی سے شہر کو پامال کر ڈالا۔ بقول ابن خلدون پانچ ہزار آدمی تہ تیغ کر دیئے۔

ارسلان بن سلجوق کو پہلے ہی ماوراء النہر سے گرفتار کر کے ہندوستان کے کسی قید خانے میں بھیج چکا تھا۔ اس زمانے میں اس کے قبیلے نے پھر سر اٹھایا، اصفہان، رے اور آذر بایجان میں لوٹ مار کی۔ غزنی کی فوجیں ان سے لڑتی رہیں مگر ان کا سیلاب رک نہ سکا۔

۴۲۰ھ میں بمقام غزنی سلطان محمود کا انتقال ہو گیا۔ مسعود اس کا بڑا بیٹا تھا جو اس وقت اصفہان میں تھا لہذا موقع سے فائدہ اٹھا کر اسمعیل تخت نشین ہو گیا لیکن مسعود نے غزنی پہنچ کر بزور شمشیر اس کو ہٹا دیا اور خود غزنی کا فرمانروا بن گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف تاتاری ملک کے مختلف مقامات پر قتل و غارت کر رہے تھے، دوسری طرف بوسہی شہزادے مختلف شہروں اور علاقوں کے اقتدار کے لئے باہم ٹکرا رہے تھے، خود غزنوی بھی کبھی ایک سے لڑتے کبھی دوسرے سے۔ سلطان محمود کے انتقال سے اس میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ علاء الدولہ نے اصفہان کے لئے ایک جنگ کی اور ہزیمت یاب ہو کر جلال الدولہ کے پاس پناہ لی۔

سلطان مسعود نے تمام علاقوں کو واپس لے لیا پھر کرمان پر حملہ کیا جو ابو کالجار کے قبضہ میں تھا۔ ابو کالجار کی طاقت جلال الدولہ سے لڑتے لڑتے ٹوٹ

چکی تھی وہ مسعود کا مقابلہ نہ کر سکا اور جبر وقت کی جانب فرار ہو گیا۔ اس کے ساتھی مسعودی لشکر کے تعاقب سے گھبرا کر ایک درہ کوہ میں گھس گئے۔

کچھ عرصے بعد علاء الدولہ اور فرہاد بن مرواویج نے متحد ہو کر غزنوی مقبوضات پر حملے کئے مگر شکست کھائی پھر دونوں نے اصفہان کا رخ کیا سخت لڑائی ہوئی، فرہاد میدان میں کام آیا، علاء الدولہ پہاڑیوں میں چھپ گیا۔ دوسری بار پھر قسمت آزمائی کی مگر پھر بھاگنا پڑا۔

ان سنین میں طغرل بیگ ترکمان اور اس کے ساتھیوں کی غارت گری جاری رہی۔ آخر مسعود نے ان کا منہ بھرنے کے لئے طغرل کو نسا کا اور اس کے بھائی جزئی داؤد کو دہستان کا حاکم بنا دیا۔ کچھ دنوں یہ لوگ خاموش رہے پھر پرانا طریقہ اختیار کر لیا۔ مجبوراً مسعود نے ان پر فوج کشی کی۔ ۴۲۹ھ میں ترکمان بھی مقابلے پر ڈٹ گئے اور باقاعدہ جنگ کرنے کے بجائے شیخوں مار کر سامان اور گھوڑے لوٹ لے گئے۔

اس طرح تین سال تک انہوں نے غزنوی لشکر کو الجھائے رکھا اور اس کو پریشان کیا، آخر ایک بار شکست دیدی اور سلطان مسعود کو بعض امراء کے ساتھ فرار ہو کر جان بچانا پڑی۔

۴۳۱ھ میں طغرل نے نیشاپور پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد بیخونے ہرات فتح کر لیا ۴۳۲ھ میں جزئی بیگ داؤد نے بلخ کو حصار میں لے لیا۔ سلطان مسعود نے ایک بڑا لشکر روانہ کیا جو بمشکل ہرات و بلخ کو واکزار کر سکا۔

سلجوقیوں کی یلغار سے اراکین سلطنت مسعود سے بددل ہو گئے۔ انہوں نے اس کو معزول کر کے سلطان محمد کو تخت نشین کر دیا پھر قید میں مسعود کا قتل ہو گیا تو اس کے بیٹے مودود نے چڑھائی کر دی۔ شعبان ۴۳۲ھ میں سلطان محمد مارا گیا اور مودود بادشاہ ہو گیا۔

ان تغیرات کے نتیجے میں کچھ شہر بوسہیوں نے واپس لے لئے اور باقی تمام پر آہستہ آہستہ سلجوقیوں نے قبضہ کر لیا۔

جلال الدولہ ہنوز بغداد کا متولی تھا۔ ۴۳۲ھ سے قاوہ باندھ کے بعد قائم



اس نے ابو کالنجر سے درخواست کی وہ ابو الحرب کے ساتھ اپنا لشکر لے کر بڑھا اور اصفہان کو گھیر لیا۔ ابو منصور نے خراج دینے کے وعدے پر اطاعت کر لی۔

سلجوقیوں نے خراسان اور رے کے بعد ہاتھ پاؤں نکالنا شروع کر دیے تھے ابو کالنجر نے کئی محاذوں پر انہیں روکا لیکن ایک بوزجی حکومت کے لئے نوخیز سیلاب کو روکنا آسان ثابت نہ ہوا۔ آخر ابو کالنجر نے مصطیٰ اسی میں کبھی کہ طغرل بیگ سے صلح کر لی جائے۔ طرفین نے اس پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اسی کے ساتھ دونوں میں رشتہ داری بھی عمل میں آگئی۔ ابو کالنجر کی بیٹی طغرل کو بیاہ دی گئی اور طغرل کے بھائی حجازی بیگ داؤد کی بیٹی ابو منصور فلاستون کے عقد میں آگئی ایک سال بعد ۴۴۰ھ میں ابو کالنجر اپنے بھائی ابراہیم نیال کی بغاوت فرد کرنے کے لئے نکلا تو خیاب پہنچ کر سفر آخرت کر گیا۔ بغداد میں اس کی حکومت کی مدت سو اچار سال تھی۔

### بغداد کا آخری متولی

ابو کالنجر کے چھ بیٹے تھے: ابو نصر، خرد فیروز، ابو منصور فلاستون، ابو طالب کامرو، ابو المظفر بہرام، ابو علی کینسرو اور ابو سعد خسرو۔ تین بیٹے ان کے علاوہ اور تھے۔ ابو کالنجر کی وفات کے وقت ابو منصور اس کے ساتھ تھا۔ ابو نصر بغداد میں تھا اس نے قائم سے بغداد کی تولیت اور عراق کی حکومت حاصل کر کے الملک الرحیم کا لقب اختیار کر لیا۔ بصرہ میں اس کا بھائی ابو علی کینسرو حکمران تھا جس کو اس نے بحال رکھا۔

ابو منصور فلاستون نے فارس جا کر شیراز پر قبضہ کر لیا تھا جس کو ملک الرحیم نے اپنے بھائی ابو سعد کو بھیج کر گرفتار کرایا۔ کچھ دنوں بعد ابو منصور قید سے چھوٹ گیا تو اس نے شیراز کی فوج کی مدد سے پھر شہر پر قبضہ کر لیا اور ابواز بھی لے لیا۔ کئی سال تک دونوں بھائیوں میں جنگ ہوتی رہی۔ کبھی میدان ایک کے ہاتھ رہتا کبھی دوسرے کے۔ آخر منصور کو شیراز کا حکمران مان لیا گیا اور ابواز کو اس کے قبضے سے نکال لیا گیا۔

بامر اللہ تخت خلافت پر ممکن تھا لیکن بغداد کے حالات ٹھیک نہ تھے امراء کی باہمی چپقلش نے امن و امان خطرے میں ڈال دیا تھا آخر ایک امیر بار سلطان کھل کر سامنے آگیا۔ جلال الدولہ سے اس کا محرکہ ہوا اور وہ گرفتار ہو کر قتل کیا گیا اس پر خلیفہ نے جلال الدولہ کو ملک السلوک کا خطاب دیا۔

۴۲۸ھ میں بعض بزرگوں کی تحریک پر جلال الدولہ سے ابو کالنجر کی صفائی ہو گئی اور اس کے بیٹے ابو منصور سے جلال الدولہ کی بیٹی کا عقد ہو گیا۔ ابو کالنجر مسلسل شکستوں کے بعد بصرہ اور کئی دوسرے مقامات پر قبضہ کر چکا تھا۔ خاندان کے دوسرے افراد بھی کئی مقامات پر اپنے چم بھرا چکے تھے کہ شعبان ۴۳۵ھ میں جلال الدولہ کی وفات ہو گئی۔ اس کا بڑا بیٹا ملک العزیز ان دنوں واسط میں تھا، بروقت بغداد نہ پہنچ سکا۔ ابو کالنجر ابواز میں تھا، وہ فوراً بغداد کی طرف چل پڑا، اس کے ساتھ ہی اس نے مخبر بھیج کر ملک العزیز کی فوج میں چھوٹ ڈلوادی۔

بغداد کے نئے بادشاہ کی طرف سے فوج اور خلیفہ کے مڈرمانے کا سوال بھی تھا اور ملک العزیز کے پاس روپیہ نہ تھا۔ ابو کالنجر کی یہ حیثیت تھی، اس نے مطالبات پورے کر دیئے اور خلیفہ نے اس کو محی الدین کے لقب کے ساتھ خلافت کا متولی بنادیا اور رمضان ۴۳۶ھ سے ابو کالنجر نے اس منصب کو سنبھال لیا۔ ملک العزیز نے دوبار اس کے مقابلے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ آخر وہ میافارقین میں نصر الدولہ کے پاس پناہ گزیں ہوا اور وہیں وفات پا گیا۔

بوسہی حکومتوں کا زوال انتہاء پر پہنچ چکا تھا تاہم ماضی کے اکابر کا استناد بد یہ تھا کہ نہ محمود و مسعود عراق پر قبضہ کرنے کی ہمت کر سکے اور نہ ان کے جانشین سلجوقی ان کی طرف آنکھ اٹھا سکے حالانکہ وہ خراسان پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے۔

علاء الدولہ ۴۳۳ھ میں انتقال کر چکا تھا، اس کی عملداری ہمدان سے اصفہان تک تھی۔ ابو منصور فرامرز اس کا بیٹا تھا، چھوٹا بھائی ابو الحرب بعض علاقوں کا دعویدار ہوا اور دونوں میں ٹھن گئی۔ ابو الحرب نے رے کے سلجوقیوں سے مدد لی اور جرجان فتح کر لیا مگر ابو منصور سے میدان داری میں شکست کھائی۔



پر حملہ کر کے قرواش والی انبار کو نکال دیا اور اس پر قابض ہو گیا تھا۔ ۴۳۶ھ میں قریش بن بدران والی موصل نے انبار پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر کے طغرل بیگ کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔

جنگ و جدل کے اس دور دورے میں خارجیوں نے عمان پر قبضہ کر لیا پھر بغداد میں بلوہ ہوا اور شیعہ آئمہ کی قبور تک کھدوا ڈالنے کا منصوبہ بن گیا مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔ نور الدولہ وہیں کو اس کی خبر ملی تو اس نے اپنی مملکت میں عباسی خلیفہ کا خطبہ بند کر دیا۔ مخالفین نے جواباً مشہد کو جلا دیا۔ صلح پسند لوگوں نے مداخلت کی۔ یہ تصادم ختم ہو گیا لیکن ۴۴۵ھ میں منافرت کی آگ پھر بھڑک اٹھی جس کو بڑی مشکل سے دبا یا جاسکا۔

بصرہ ابو کانبار کے مرنے کے بعد سے ابو علی کے قبضے میں تھا۔ انہیں دنوں اس کی طرف سے بغاوت کا شبہ پیدا ہوا۔ ملک الرحیم کی طرف سے بسا سیری کو بھیجا گیا جس نے ابو علی کو شکست دے کر بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ ابو علی نے شط عمان جا کر قرار لیا۔ بسا سیری نے تعاقب کیا اور شط عمان اور تشتہ پر قابض ہو گیا۔ غرض کہ نت نئی جنگیں بوہیہ افراد کے درمیان ہوتی رہیں۔ ملک الرحیم کا دائرہ اقتدار یقیناً بڑھتا رہا لیکن ابو علی کے سے لوگ طغرل بیگ کی پناہ میں بھی پہنچتے رہے۔

انہیں دنوں ابو منصور فلاتون نے شیراز لے لیا اور طغرل اور عبد الرحیم دونوں کے نام خطبے میں شامل کروا دیئے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کردوں اور عربوں کے گروہ بھی لوٹ مار میں لگ گئے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی خفاجہ نے حلہ کے شہروں پر تاخت کی۔ وہیں مقابلے کی تاب نہ لا سکتا۔ اس نے بسا سیری سے مدد مانگی بسا سیری ان کو ہار تا ہوا فرات عبور کر گیا، خطان کا محاصرہ کیا پھر اس کو فتح کر کے قلعہ سمارا دیا مگر اس پینار کو نہیں توڑوایا جو بیہ بن حطام نے زر کثیر خرچ کر کے کشیتوں کی رہنمائی کے لئے بنوایا تھا

ملک کی اس صورت حال اور سلجوقیوں کی کامیابیوں نے بغداد کے ترکوں کو بھی اکسایا۔ انہوں نے وزیر السلطنت سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر دیا اور رقم نہ ملنے پر بغداد اور مضافات کو لوٹنے لگے۔ وزیر السلطنت روپوش ہو گیا ہرک اس کو

ادھر سلجوقی حکومت ایران و عراق کے وسیع تر علاقوں پر محیط ہوتی جا رہی تھی۔ فرامرز بن علاء الدولہ نے طغرل بیگ کی اطاعت کر لی تھی لیکن سلجوق حکمران کو اس کا اعتبار نہ تھا۔ ۴۳۳ھ میں اس نے اصفہان اور رے پر مستقل قبضہ کر لیا تھا اور فرامرز کے لئے ایک جاگیر چھوڑ دی تھی۔ اس طرح ایک بوہیہ خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد طغرل نے خلیفہ بغداد سے سند حکومت حاصل کرنے کے لئے ایک وفد روانہ کیا۔ خلیفہ نے اسے بغداد آنے کی دعوت دی مگر اس نے بعض گرانقدر تحائف بھیج دینے پر اکتفاء کی اور دربار خلافت سے اس کو خلعت اور رکن الدولہ کے خطاب سے نوازا گیا۔

پچھلے دنوں ملک الرحیم نے ہزار سب والی رامہرز سے اس کا علاقہ چھین لیا تھا۔ ابو منصور نے اس کو ملاکر ابواز پر حملہ کر دیا۔ ملک الرحیم اس کے ملنے تیار نہ تھا۔ اس کو شکست ہو گئی اور اس نے واسط پہنچ کر دم لیا مگر اس کے بھائی ابو سعد نے انہیں دنوں اصطخر پر قبضہ کر لیا تھا ابو منصور نے ایک کامیابی کے بعد شیراز کی طرف رخ کیا لیکن ابو سعد کے مقابلے میں شکست کھائی اور ایک قلعہ میں جا کر چھپ گیا۔

پھر ابو منصور اور ہزار سب طغرل بیگ سے ایک ہزار فوج لیکر نئے سرے سے مقابلے پڑائے۔ اتفاق سے ملک الرحیم کا واپسی سپہ سالار عراق کی طرف گیا ہوا تھا۔ وہیں بن مزید بھی موجود نہ تھا۔ ملک الرحیم کے ساتھ تھوڑی سپاہ عسکر مکرم میں تھی۔ وہ ابواز کی طرف آگیا اور دشمنوں کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لئے اس نے ابو سعد کو فارس کی طرف روانہ کر دیا مگر یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ ابو منصور نے براہ راست اس کے سامنے پہنچ کر میدان میں نیزہ گاڑ دیا۔ ملک الرحیم کو پیٹھ دکھاتے شرم آئی، اس نے مقابلہ کیا مگر اس کو بھاگ کر پھر واسط میں پناہ لینا پڑی۔

۴۴۱ھ میں بسا سیری اور بنی عقیل کی ایک جنگ ہو چکی تھی اور زعمیم الدولہ بن مقلد سے سخت معرکہ پڑا تھا مگر وہ فیصلہ کن نہ تھا۔ اس کے بعد ہی انبار

میں ترک پیش پیش تھے۔ اس میں ملک الرحیم کو ملوث کر لیا گیا۔ طفزل بیگ کے بہت سے آدمی کام آگئے۔ اس نے خلیفہ سے کہلوایا کہ اگر ملک الرحیم اس میں شامل نہیں ہے تو اس کو میرے پاس بھیجا جائے۔

ملک الرحیم خلیفہ کے کہنے میں آگیا مگر جیسے ہی وہ طفزل کی قیام گاہ میں داخل ہوا، فوراً پکڑ لیا گیا۔ خلیفہ نے ہزار کہا مگر طفزل نے ملک الرحیم کو نہ چھوڑا البتہ اس کے کچھ آدمیوں کو رہا کر دیا جو بسا سیری کے پاس چلے گئے۔ اس طرح بوہیہ ایوان کا آخری سینار بھی گر گیا۔ طفزل بیگ تیرہ ماہ بغداد میں رہا، ملک الرحیم اور اس کے فوجیوں کا مال و متاع اور جائیدادیں سب اس نے ضبط کر لیں..... خلیفہ اس کے فعل سے کچھ دنوں اس سے ناراض رہا پھر اس نے اس کی خوشنودی کی خاطر اپنی بیٹی خدیجہ بنت داؤد کا عقد خلیفہ سے کر دیا۔

ابو منصور فلاستون سلجوقیوں کی طرف سے ۴۴۰ھ تک فارس کا حکمران رہا جس کو اس کے سپہ سالار نے قید کر دیا اور خود حکمران بن گیا تو سلجوقیوں نے اس کو گرفتار کر کے فارس پر قبضہ کر لیا۔

ابو علی یحضر والپ ارسلان کے پاس چلا گیا تھا اس نے نو بند جان اور کرمان کی جاگیریں اسے دیدی تھی۔ وہ ۴۸۷ھ میں مر گیا۔ پھر کوئی بوہیہ حکمران باقی نہ رہا اور اس عظیم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا جو تاریخ ساز بھی تھی اور خلیفہ گر بھی۔ ملک الرحیم ۴۵۰ھ میں وفات پا گیا۔

بسا سیری رجبہ سے نور الدولہ و بیس بن مزید کے پاس چلا گیا جو عقیدہ شیعہ تھا۔ حلد میں ٹھہر کر اس نے اپنی فوج کی ترتیب دی اور نور الدولہ کے تعاون سے ایک منصوبہ بنانے لگا۔

ملک الرحیم اہل بغداد کی اکثریت کا ہم عقیدہ نہ ہی لیکن اس وقت انہوں نے اس کو بہت یاد کیا۔ جب سلجوقی فوجیوں نے ان پر وہ مظالم ڈھائے جس کی توقع وہ اپنے محافظوں سے نہ کر سکتے۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کے عادی سلجوقی ان مواقع کو ضائع نہ کر سکتے جب ہتھے شہریوں کے گھرانے کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے اہل شہر کے مال و متاع کو مال غنیمت کی طرح لوٹا اور خلیفہ نے جب

ڈھونڈتے ہوئے خلیفہ تک پہنچ گئے..... آخر وزیر سلطنت نے یناہ گاہ سے باہر آکر ان کا مطالبہ پورا کیا۔

عرب اور کرد بچے ہی ہنگامے برپا کئے ہوئے تھے جن میں قریش بن بدران والی موصل بھی شامل ہو گیا۔ انہوں نے کامل بن محمد بن سبیب کو بھی جاغیرا۔ خود بسا سیری کے مویشی تک ہنگامے گئے۔ اسی سلسلے میں تاتاریوں کا ایک گروہ بھی نکل آیا اس نے مضافات اہواز کو تباہ کر ڈالا۔

بغداد میں بسا سیری نے دو آدمیوں پر شبہ کر کے گرفتار کر لیا اور ایک کو سولی پر لٹکا دیا۔ یہ دونوں آدمی وزیر سلطنت رئیس الروسا کے تھے۔

بات یہ تھی کہ "بسا سیری مذہباً باطنی شیعہ تھا اور بغداد کا رئیس الروسا سنی تھا، اس لئے دونوں میں مخالفت تھی۔ بسا سیری کو سلجوقیوں کا عروج، جو سنی تھے، سخت گراں تھا اور رئیس الروسا ان کا ہمدرد اور یہی خواہ تھا۔ بسا سیری اور موصل کی عرب حکومت میں بھی مخالفت تھی خصوصاً جب سے قریش بن بدران نے طفزل بیگ کی اطاعت قبول کر لی تھی اس وقت سے بسا سیری اس کے خلاف ہو گیا تھا۔ (۳۹)

نتیجہ میں ایک نے دوسرے پر الزام تراشی کی اور رئیس الروسا نے بسا سیری کے خلاف عمائدین کو ملا کر خلیفہ کے کان بھر دیے اور خلیفہ نے ملک الرحیم کو خط لکھا کہ بسا سیری خلافت مصر سے سازش کر رہا ہے۔ انجام کار اہواز سے بغداد کے راستے میں ملک الرحیم نے بسا سیری کو الگ کر دیا اور وہ رجبہ چلا گیا اور وہاں سے خلیفہ مصر سے خط و کتابت کرنے لگا۔

طفزل بیگ ۴۴۷ھ میں حج کے بہانے بغداد کی سمت روانہ ہو چکا تھا۔ ملک الرحیم کے بغداد پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ بھی آ پہنچا۔ ملک الرحیم میں بسا سیری کی علیحدگی کے بعد طفزل سے لڑنے کی طاقت نہ تھی لہذا خلیفہ کی وساطت سے اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور طفزل سے باہمی مصالحت ہو گئی کہ وہ بدستور اپنے منصب پر قائم رہے گا اور طفزل بیگ واپس چلا جائے گا۔

لیکن طفزل کے قیام بغداد میں اہل بغداد نے اس کی فوج پر حملہ کر دیا جس

یہ لڑائیاں پہلے پہل وقوع میں آئی تھیں کیونکہ اس سے قبل ہم کوئی جواب دینے کے قابل ہی نہیں تھے۔ مقابلتا اب بھی بہت کمزور تھے لیکن اب ہمارا مقابلہ عوام سے تھا۔ حکومت کی ننگی تلواریں ہمارے سروں پر نہیں تھیں، تاہم مجموعی طور پر نقصان ہمارا ہی ہوتا رہا۔

ہمارے وجود کو ابتداء ہی سے برداشت نہیں کیا گیا تھا تو ہماری حکومت کو کیونکر برداشت کیا جاتا لیکن دنیا طاقت کو پوجتی ہے۔ بوہیں میں جب تک کس بل رہا، ان کے سامنے لوگوں کے سروں پر طائرینٹھے رہے، کوئی سرتابی کی جرأت نہ کر سکا لیکن بغداد میں سلجوقی پرچم لہراتے ہی نگاہیں بدل گئیں۔ اب شیعوں کے لئے بنی امیہ کا اور منصور و مستوکل کا دور نئے سرے سے شروع ہونے والا تھا جس کے لئے وہ تیار تھے۔

طغرل سے شکست کی تو طغرل نے مجبوری کا اظہار کر دیا۔ آخر طغرل بیگ کو بغداد سے کوچ کرنا پڑا۔ وہ خلافت بغداد کا نیا متولی تھا اور ایک فاتحانہ شان کے ساتھ مرکز خلافت سے جا رہا تھا۔

تاریخ کی ہر سلطنت کا خاتمہ جس طرح ہوتا آیا ہے، عماد الدولہ کے خاندان کی حکومت بھی اسی طرح ختم ہوئی۔ جب تک خاندان کی کوئی مرکزی شخصیت باقی رہی، اس وقت تک ایک آواز پر ہر طرف سے لبیک کی آوازیں آتی رہیں اور جب سے شیرازہ منشر ہوا اس وقت سے ایک شیرازے کی لڑیاں خود آپس میں گھم گھما ہونے لگیں۔ ایسے میں کوئی کسی کی آواز کہاں سنتا ہے بلکہ لبیک کہنے کے بجائے زبان شمشیر سے جواب دیا جاتا ہے۔

بوہیں آپس میں دست و گریبان رہے اور غزنویوں نے ان کی باہمی لڑائی سے فائدہ اٹھایا اور جب وہ کمزور پڑے تو سلجوقیوں کی نئی طاقت ابھری اور اس نے آہستہ آہستہ بساط کے ایک ایک مہرے کو ہٹانا شروع کیا پھر ملک الرحیم نام کے شاہ شطرنج کو بھی مات دیدی اور بغداد ایک نئے سورج کو طلوع ہوتے دیکھنے لگا۔ وقت کا یہ انقلاب شیعوں کے لئے نیا نہ تھا وہ شروع ہی سے عصبیت کی چکی میں پستے آئے تھے۔ تاج و تخت سے کبھی ان کو کوئی تعلق نہ رہا تھا اللہ وہ صبر و سکون کے ساتھ اسلام کے اصول پر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے تھے جس کا موقع انہیں بوہیں سلطنت میں ملا تھا تو انہوں نے پرچم اہل بیت بلند کیا تھا جس کو ایک لحظے کے لئے برداشت نہیں کیا گیا۔

بوہیں انصاف پسند حکمران تھے۔ انہوں نے کبھی جانبداری سے کام نہیں لیا شیعوں کو اعلیٰ کے لکتہ الحق کا استحقاق ضرور دیا تو اس پر شیعہ سنی فساد ہو گیا اور پھر فساد ہوتا ہی رہا۔ قتل عام، آتش زنی، غارت گری لگ بھگ سالانہ معمول بن گیا ہمارے مشاہد جلائے گئے، کتب خانے نذر آتش کئے گئے لیکن اب ہم بکھرے اور منشر نہیں تھے۔ شیعہ حکومتوں کی برکت سے ہماری آبادیاں کرخ جیسے محلوں میں سمٹ آئی تھیں لہذا ہماری طرف سے بھی کچھ نہ کچھ کیا گیا پھر بھی اکثریت اور اقلیت کا فرق باقی رہا۔



پہلی مرتبہ طغرل سے خلیفہ کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اب کی حضوری کی عزت بھی ملی اور الملک المشرق والمغرب کا لقب بھی پایا۔

موصل میں وہ اپنے بھائی نیال کو نگران کے طور پر چھوڑ آیا تھا۔ وہ طغرل سے باغی ہو کر ہمدان چلا گیا۔ بسامیری اور قریش بن بدران یہ خبر ملتے ہی آگے اور موصل پر قابض ہو گئے۔

طغرل بغداد سے سیدھا موصل پہنچا مگر بسامیری اور قریش اس سے قبل ہی بغداد کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ آخر طغرل نے ہمدان کا رخ کیا مگر نیال کی قوت دیکھ کر اس کو اپنی شکست کا خدشہ پیدا ہو گیا اس لئے رنے کی طرف چل پڑا..... پھر اپنے بھتیجوں الپ ارسلان اور قاروت کو اپنے ساتھ شامل کر کے نیال کی طرف بڑھا اور اس کو شکست دے کر گرفتار کر لیا پھر قتل کر دیا۔

بغداد خالی تھا۔ وہاں کوئی بسامیری اور قریش کو روکنے والا نہ تھا۔ انہوں نے بسہولت شہر رقبہ کر لیا اور خلیفہ مستنصر علوی کا خطبہ جاری کر دیا اور خلیفہ کو اس کے چچیرے بھائی کے ساتھ حدیث بھیج دیا۔

مورخین متفق ہیں کہ بسامیری نے اہل بغداد کے ساتھ ہمت اچھا سلوک کیا، خلیفہ قائم کی ضعیف ماں کو ایک اچھے مکان میں منتقل کر کے کنیزوں کا انتظام بھی کر دیا اور وظیفے کے ساتھ ضروریات کی تمام اشیاء فراہم کر دیں۔

رئیس الروسا سے اس کی پرانی دشمنی تھی، اس کو محاف نہیں کیا اور تشہیر کر کے سولی پر لٹکا دیا۔ عمید عراق کو قتل کر دیا۔

طغرل نیال سے مصروف پیکار تھا۔ اس سے فراغت پا کر اس نے بغداد پر توجہ دی اور بسامیری کو بعض آسان شرائط پیش کیں مگر بسامیری اس کے فریب میں نہیں آیا۔ سلجوقی لشکر کے قریب پہنچنے سے قبل ہی وہ ذی قعد ۴۵۰ھ میں بغداد چھوڑ گیا۔

خلیفہ قائم اس کے بعد ہی بغداد آگیا۔ طغرل نے بغداد میں داخل ہو کر اس کی بڑی عزت و تکریم کی اور خلیفہ نے بھی اپنے ہاتھ سے اسکی کمر میں تلوار باندھی جو

## باقیات الصالحات

سلجوقی بوسہی سلطنت کے بیشتر علاقوں پر قابض ہو چکے تھے۔ جابجا چھوٹی چھوٹی حکومتیں باقی تھیں جن کا تعلق اگرچہ بوسہین سے نہ تھا لیکن وہ شیعہ تھیں اور سلجوقیوں سے اتحاد نہ کر سکتیں جیسے بنی و ہش اور بنی عقیل۔ بوسہی سپہ سالار بسامیری اندنوں حملہ میں نور الدولہ و ہش کے پاس مقیم تھا۔

۴۳۸ھ میں دونوں نے مل کر موصل پر حملہ کیا۔ قریش بن بدران نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور گرفتار کر کے نور الدولہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اس نے خلیفہ مستنصر علوی کا مصر سے منگوا یا ہوا غلعت پیش کیا جس کو قریش نے قبول کیا اور موصل میں اس کے نام کا خطبہ جاری کر دیا۔

طغرل نے واپس آتے ہی اپنے ایک امیر ہزار سب کو اعراب موصل کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا جس نے ایک سخت لڑائی کے بعد انہیں پسپا کیا۔ ایک بڑی تعداد ان میں سے کام آئی، قیدیوں میں سے اکثر کو طغرل بیگ نے قتل کر دیا

قریش و نور الدولہ کو موصل میں اس کی خبر ملی تو انہوں نے طغرل سے صلح کر لینا ہی وقت کا تقاضا قرار دیا۔ طغرل نے اس پیش کش کو منظور کیا اور دونوں کے بیشتر علاقے ان کے قبضے میں رہنے دیئے۔

بسامیری موصل سے رجب چلا گیا..... اس دوران طغرل دیار بکر اور جزیرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ابن مروان نے اطاعت قبول کر لی اس کے بعد ہی طغرل بیگ نے سنجار پر دھاوا بولا اور اس کو فتح کر کے وہاں کے حاکم کو قتل کر دیا۔ پھر بغداد کا عازم ہوا۔ خلیفہ کی خدمت میں بیش قیمت تحائف پیش کئے اور وہ خود اعزازات سے نوازا گیا۔



دو بیس ستاون سال حکومت کر کے ۴۷۴ھ میں دنیا سے کوچ کر گیا اور اس کا بیٹا بہاؤ الدولہ ابو کامل منصور باپ کا جانشین ہوا۔ اس نے بھی سلجوقی حکومت کی بالادستی قبول کی، خود جا کر الپ ارسلان سے سند حکومت لے آیا اور نہایت عدل و انصاف سے حکومت کرتا رہا۔

### سیف الدولہ صدقہ

ربیع الاول ۴۷۶ھ میں بہاؤ الدولہ نے سفر آخرت کیا۔ اس عرصے میں ملک شاہ، الپ ارسلان کی جگہ لے چکا تھا۔ سیف الدولہ صدقہ نے بہاؤ الدولہ کا منصب سنبھالا۔ خلیفہ نے نقیب العلومین کو بھیج کر صدقہ سے تعزیت کی اور سند حکومت عطا فرمائی جس کی توثیق ملک شاہ نے بھی کر دی۔

ملک شاہ کا انتقال ہونے پر جب برکیارق اور اس کے بھائی محمد بن ملک شاہ میں رزم آزمائی ہوئی تو سیف الدولہ نے برکیارق کا ساتھ دیا اور بعض جنگوں میں بذات خود شریک ہوا اور مالی اور فوجی مدد تو کرتا ہی رہا۔

برکیارق کی کامیابی میں اس کا ایک حصہ تھا لہذا ۴۹۴ھ تک اس کی عزت و توقیر کی جاتی رہی۔ اس کے بعد برکیارق کے وزیر ابو الحسن نے قاصد بھیج کر مطالبہ کیا کہ دس لاکھ دینار کا جو سامان اس کے پاس محفوظ کرایا گیا تھا، اس کو واپس کر دے ورنہ بزور شمشیر وصول کیا جائے گا۔

سیف الدولہ بہادروں کی اولاد میں تھا۔ اس لب و لہجہ کو انگیزہ سکا اس نے جواب سخت دیا اور برکیارق کا نام خطبے سے نکلوا دیا۔

سلطان برکیارق اپنے بھائیوں محمد اور سنجر سے ہزیمت یاب ہو کر بغداد پہنچا تھا کہ اس کو ان حالات کی خبر ملی۔ اس نے اپنے ایک امیر ایاز کو صدقہ کے پاس روانہ کیا۔

شبہات ایک بار دل میں گھور کرنے کے بعد نہیں نکلتے۔ صدقہ سلجوقیوں کا ماتحت ہی نہیں، وفادار دوست بھی تھا۔ اس نے حق رفاقت ادا کیا تھا۔ ایک دفعہ کی متکبرانہ بدسلوکی کو وہ بھول نہ سکا پھر امیر ایاز کا انداز بھی حاکمانہ تھا اس لئے بات بننے کے بجائے اور بگڑ گئی اور صدقہ نے کوفہ سے سلطان کے گورنر کو نکال کر اس پر

ایک بڑا اعزاز تھا۔

بسایری اور نور الدولہ و بیس عراق میں مقیم تھے۔ طغرل نے ان کے مقابلے کے لئے ایک بڑا لشکر روانہ کیا نور الدولہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی بطحہ کیطرف روانہ ہو گیا۔ بسایری ٹھہرا رہا۔ وہ گھوڑے پر سوار اپنی فوج کے ساتھ مد مقابل تھا۔ اچانک اس نے اپنے گھوڑے کو لایڈ دینا چاہی شاید فرار ہونے کا ارادہ تھا مگر قسمت ساتھ چھوڑ چکی تھی، کچھ ایسا ہوا کہ وہ گھوڑے سے گر پڑا، سلجوقیوں نے اس کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس کا سر طغرل کو پیش کیا گیا اور جسم بغداد لاکر تشہیر کرایا گیا۔

طغرل بیگ واسطے سے پھر بغداد آگیا..... بنی و بیس کا حکمران سیاسی صورت حال کو سمجھ چکا تھا اور اس نے اپنی قوت کا اندازہ بھی کر لیا تھا۔ اسی لئے بسایری کا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا تھا اس نے ہزار سب کے ذریعہ صلح کو مناسب قرار دیا۔ وہ ۴۵۲ھ میں نور الدولہ اور ابو علی بن کالجار کو لیکر بغداد پہنچا اور طغرل بیگ سے ان کی صفائی ہو گئی۔ خلیفہ قائم نے ان کے اعزاز میں دعوت دی اور طغرل کی موجودگی میں خلعتیں عنایت کیں..... اس زمانے کے چھوٹے چھوٹے شیعہ حکمرانوں کے لئے سلجوقیوں کی اطاعت کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا مگر کچھ دنوں بعد ان کے علاقوں کو کسی نہ کسی بہانے سلجوقیوں نے ہڑپ کر لیا۔

۴۵۳ھ میں بعض عمائدین کی تحریک پر طغرل کے ساتھ خلیفہ قائم کی بیٹی کا عقد ہوا مگر رخصتی نہ ہونے کی شرط پر۔ کچھ دنوں بعد طغرل بغداد سے واپس ہو گیا لیکن ۴۵۵ھ میں پھر بغداد گیا اور کینزوں کی موجودگی میں دولہن کا دیدار کر کے پلٹ آیا..... واپسی کے چھ ماہ بعد رمضان ۴۵۵ھ میں بمقام رے انتقال کر گیا۔

طغرل کے کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے اس کا بھتیجا سلیمان جانشین ہوا لیکن امراء نے اس کو تسلیم نہیں کیا، لہذا دوسرا بھتیجا الپ ارسلان تخت پر بٹھایا بنی و بیس سے سلجوقیوں کا پھر کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ نور الدولہ بن

پھر واسط میں منصب الدولہ بن ابوالخیر کو والی مقرر کیا اور حلہ کا عازم ہو گیا۔ اب برکیارق اور سلطان محمد میں صلح ہو گئی تھی۔ سلطان محمد نے صدقہ کے مقبوضات پر اس کی حکومت کی توثیق کر دی اور بصرہ پر قبضے کے لئے اپنے ایک نائب کو متعین کیا پھر ایک باغی کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہو گیا اور صدقہ کو بصرہ کے لئے مامور کر دیا۔ سلجوقی حکمران بصرہ اسماعیل بن ارسلان سیف الدولہ صدقہ کو خاطر میں نہ لایا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

صدقہ نے اس کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تو میدان حرب و ضرب گرم ہوا۔ قلعہ کے دوسری طرف سے صدقہ کی دوسری فوج حملہ آور ہو گئی اور دوطرفہ جنگ میں اسماعیل شکست کھا کر جزیرہ کی طرف بھاگ گیا پھر اس نے صدقہ سے امن کی درخواست کی، صدقہ نے اس کو مان لیا اور بصرہ پر اپنے دادا کے ایک مملوک سردار التونتاش کو حاکم بنا کر ۴۹۳ھ میں حلہ آگیا۔

التونتاش کے خلاف قبائل ربیعہ اور منتفق نے بغاوت کی تو سلطان محمد نے اپنی طرف سے ایک حاکم وہاں بھیج دیا۔

مہذب الدولہ صدقہ کی طرف سے واسط کا عملدار تھا لیکن نظم کو سنبھال نہ سکا۔ مجبوراً صدقہ نے اسے معزول کر کے حماد بن ابوالسید کے حوالے کر دیا اور وہ اپنے وطن بطحیہ چلا گیا۔

غیب اتفاق ہے کہ بویہین کے زمانہ اقتدار میں جو شیعہ طاقتیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی رہیں، زبوں حالی کے اس دور میں انہوں نے آپس میں رشتے قائم کر لئے تھے۔ مہذب الدولہ کی بیٹی بدران بن صدقہ کو بیاہی تھی اور بنی عقیل بھی کسی نہ کسی نوعیت سے سیف الدولہ صدقہ کی شخصیت سے وابستہ ہو گئے تھے کیونکہ اب تو ان سب کا لمبا و ماویٰ وہی رہ گیا تھا۔

مہذب الدولہ اور حماد بھی ایک ہی دادا کی اولاد تھے اور رشتے میں چچا بھتیجے ہوتے تھے لیکن واسط کی حکمرانی کے سلسلے میں ان کے درمیان چل گئی صدقہ حماد کے ساتھ تھا اس نے بطحیہ پر لشکر کشی کر دی۔ آپس میں کئی معرکے ہوئے۔ آخر مہذب الدولہ کے بیٹے کی درخواست پر صدقہ نے دونوں میں مصالحت کرادی۔

قبضہ کر لیا۔

۳۹۶ھ میں سلطان برکیارق نے اصفہان کا محاصرہ کیا تھا جہاں کا حاکم اس کا بھائی سلطان محمد تھا۔ وہ قلعہ بند ہو گیا تھا اور برکیارق ہمدان کی طرف واپس ہو گیا تھا۔ صدقہ امدنوں اپنی فوجوں کے ساتھ مصر میں مقیم تھا۔ ابوالنوازی اور سقمان دو سلجوقی سردار بھی سلطان محمد کے حامی تھے اور بغداد میں پہلے ہی طرح اسکے نام کا خطبہ پڑھوانا چاہتے تھے۔ وہ بغداد کے عازم ہو گئے۔ صدقہ کا تعاون بھی انہیں حاصل تھا۔ آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور بغداد میں سلطان محمد کے نام کا خطبہ جاری ہو گیا۔

سیف الدولہ صدقہ سلطان محمد کا کھلا حامی تھا۔ واسط میں سلطان برکیارق کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ صدقہ نے اس پر حملہ کیا اور فتح کر کے وہاں بھی سلطان محمد کا خطبہ پڑھوا دیا۔

۴۹۶ھ میں قائم بامر اللہ کی وفات کے بعد ۴۸۷ھ تک خلیفہ مقتدری بامر اللہ کا دور خلافت رہا۔ اب مستطہر خلیفہ تھا۔ سلجوقی سلاطین اس کے مطیع تھے مگر عملی طور پر بغداد سیف الدولہ کے تابع تھا جو ماضی کے شیعہ اقتدار کی آخری علامت تھا مگر وقت کی رفتار دیکھ کر سلاجقہ کا دست و بازو بنا ہوا تھا۔

بنی عقیل کی حکمرانی بھی صحیح معنی میں ختم ہو چکی تھی لیکن برکیارق نے بہاء الدولہ بن وہب کو "ہیت" کی جاگیر دیدی تھی۔ بنی عقیل کا ایک گروہ صدقہ کے ساتھ تھا۔ بہاء الدولہ اور صدقہ میں کسی بات پر ان بن ہوئی تو بنی عقیل نے صدقہ کا ساتھ دیا۔ بہاء الدولہ تلخ صورت حال میں حج بیت اللہ کو چلا گیا اور مقلد کی اولاد میں محمد بن رافع ہیت کا والی بن گیا۔ بہاء الدولہ کی واپسی پر صدقہ نے شہر خالی کر دینے کا مطالبہ کیا۔ منصور بن کثیر بہاء الدولہ کی طرف سے فوج لے کر نکلا۔ میدان کارزار گرم ہوا۔ اس دوران شہریوں نے شہر کا پھانک کھول دیا اور صدقہ کا لشکر اندر داخل ہو گیا۔

منصور نے اطاعت کر لی اور صدقہ نے اپنے بھتیجے بھائی ثابت بن کامل کو ہیت کا حاکم بنا دیا۔



نے پہلے واسطہ پر حملہ کیا پھر توسان پر یلغار کی۔ صدقہ کے سرداروں نے بڑی جہادری سے مقابلے کئے اور ثابت بن کامل نے سلجوقیوں کے ٹھکے چھڑا دیئے مگر آخر انہیں شکست ہوئی اور امیر محمد نے صدقہ کی عملداری کو تباہ و برباد کر ڈالا۔

بغداد کے قریب خود صدقہ اور سلطان محمد کی مدد بھیڑ ہوئی۔ سلطان اس جنگ کے لئے پہلے سے سازش کا چال نکھا چکا تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی عبادہ اور خفاجہ صدقہ کی صفوں کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ صدقہ نے آوازیں لگائیں۔

”آل خزیمہ، آل ناسرہ، آل عوف! یہ جنگ کا وقت ہے تم سب بڑا دو، اپنی تلواروں کی آزمائش کرو“

سیف الدولہ کی یہ آواز گونج کر رہ گئی! انہوں نے گھوم گھوم کر بھی دیکھا مگر پلٹے نہیں۔

بنی مروان کے کرد صدقہ کے پرچم تلے جمع ہو گئے تھے۔ صدقہ نے انہیں لٹکارا وہ سردھڑکی بازی لگا کر ٹوٹ پڑے۔ بنی وہبیس کا آخری وارث اپنی آخری جنگ میں اس طرح لڑا جیسے اسلاف کی ہر روایت اس کے ساتھ ہو لیکن فوج کے بازو ٹوٹ چکے تھے پھر بھی اس نے میدان نہ چھوڑا۔

سلطان محمد صدقہ کی بہادری سے واقف تھا جاننا تھا کہ اس کا مقابلہ آسان نہیں، دو گئے سلجوقی بھی مقابل ہوئے تو سربر نہیں ہو سکتے اس لئے اس نے تلوار کے بجائے سیاست کے تیر اپنے ترکش سے نکالے تھے، پہلے اس نے صدقہ کے ہراول کو توڑا پھر اس کی پوری فوج میں اپنے منبر پھیلا دیئے۔ انہوں نے عصبيت، تحریص و ترغیب، ہر حربے کا استعمال کیا اور اتنی خاموشی سے غداری کا زہر پھیلا یا کہ صدقہ کو بھٹک تک نہ مل سکی..... پھر بھی شیر کا مقابلہ تھا۔ صدقہ جیالے کردوں کے دوش بدوش لڑ رہا تھا اس کا رجز دور دور تک سنائی دے رہا تھا۔

”میں صدقہ ہوں، عرب کا بادشاہ!“

اس کی تلوار بجلی کی طرح کوند رہی تھی کہ منصوبے کے مطابق سلجوقی لشکر نے تیروں کی بارش شروع کر دی جس نے سیف الدولہ کے بہت سے سپاہیوں کو زخمی کر دیا۔ اس دوران پہلے سے متعین کئے ہوئے تازہ دم دستے صدقہ کی طرف

سیف الدولہ صدقہ پرسوں تک برکیارق کا جانباز رہا تھا پھر وزیر السلطنت ابوالمحسن کے تکبر کے باعث وہ سلطان محمد کی طرف چلا گیا اور اس کی حکومت کی جڑیں مضبوط کرتا رہا۔ برکیارق کے انتقال پر جب سلطان محمد پوری سلطنت کا بادشاہ بن گیا تو اس نے صدقہ کی خدمات کے عوض اسے بہت نوازا۔ اس کا یہ عروج اکثر عمائدین و امراء کو پسند نہ تھا۔ وہ اس کی طرف سے سلطان محمد کے کان بھرنے لگے۔ شروع میں سلطان محمد نے توجہ نہیں کی مگر تباہ کئے! آخر سلطان محمد کو اپنے وفادار شمشیر زن کی طرف سے سوء ظن پیدا ہونے لگا۔

### صدقہ کی حمیت اور شجاعت

اتفاق سے والی سادہ سرخاب بن کینخرو سے سلطان ناراض ہو گیا۔ سرخاب نے صدقہ کے دامن عاطفت میں پناہ لی۔ صدقہ کو امید تھی کہ وہ سلطان سے اس کی صفائی کرادے گا لیکن صدقہ کے دشمن حمید ابو جعفر محمد بلخی نے سلطان کو بتا دیا کہ وہ طیش میں آکر صدقہ پر چڑھ دوڑا اور اس سے سرخاب کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ صدقہ حدود سلجوقیہ کا مانا ہوا سردار تھا۔ اس کو اپنی طاقت پر بھی اعتماد تھا مگر اس کا بیٹا وہبیس سلجوقی حکومت سے ٹکرائے کے حق میں نہ تھا۔ سپہ سالار لشکر سعید بن حمید کو سلطان کی طرف سے سیف الدولہ کی اتنی توہین گوارا نہ ہو سکی۔ اس نے جنگ کا مشورہ دیدیا اور صدقہ نے پہلے کی طرح انکاری جواب دیدیا۔

طرفین میں سخت کشمکش ہوئی اور سلطان محمد نے ربیع الاخر ۵۰۱ھ میں جنگ کی تیاری شروع کر دی اور بغداد کے نواح میں سلجوقی فوجیں جمع ہونا شروع ہو گئیں۔

سیف الدولہ کی شجاعت اور تدبر مسلم لیکن اس موقع پر اس نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا پھر بد نصیبی سے اس نے مقدمۃ الجیش فضل بن ربیعہ کو مقرر کیا جو درپردہ سلطان محمد سے ملا ہوا تھا وہ مقابلے پر پہنچتے ہی سلطان سے جا ملا۔

میدان جنگ کی ذرا سی غلطی جنگ کا پانسہ الٹ دیتی ہے ایسا ہی کچھ صدقہ کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی ساکھ خراب ہو گئی۔ سلطان محمد نے اسکو اور خراب کرنے کے لئے امیر محمد بن بوقا کو صدقہ کے مقبوضات کی تاراجی پر متعین کیا جس

وہ ایک کمزور حکمران کو خاطر میں کیا لاتا جس کی طاقت کو سلجوقیوں کا چھوٹا دستہ بھی پامال کر سکتا تھا تاہم اس نے بتقاضائے احتیاط اس کو حلہ جانے نہیں دیا کیونکہ وہ بہر طور شیر کا بچہ تھا۔

سلطان محمد کی وفات پر ۵۱۱ھ میں جب سلطان محمود تخت نشین ہوا تو اس نے اس کو اپنی نگاہوں کے سامنے رہنے کی پابندی سے آزاد کر دیا اور وہیں حلہ آگیا..... یہاں وہی ہوا جس کا خطرہ سلجوقی تاجدار کو تھا، وہیں کے گرد کرد، عقیلی اور مزیدی سب جمع ہونے لگے۔

### دیس بن صدقہ

۵۱۲ھ میں خلیفہ مستظہر باللہ کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے مسٹرشد باللہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو ان کا بھائی کسی خوف سے چھپ چھپا کر مدائن چلا گیا اور وہاں سے حلہ جا کر پناہ گزین ہوا۔ خلیفہ نے وہیں سے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا وہی صورت حال پیش آگئی جس کا شکار سیف الدولہ صدقہ ہوا تھا عرب کی حمیت کسی طرح اس کی اجازت نہ دے سکتی کہ مہمان کو اس کے دشمن کے حوالے کر دے، وہیں نے خلیفہ کو جواب دیا کہ امیر ابو الحسن نے میری پناہ لی ہے، میں اس کو زبردستی نہیں بھیج سکتا، تاوقتیکہ وہ خود جاننا چاہے۔

خلیفہ کے سفیر نے سمجھا، سمجھا کر امیر ابو الحسن کو راضی کر لیا اور وہیں نے اس کو ضروریات کی تمام چیزیں فراہم کر دیں مگر وہ حلہ سے روانہ نہ ہوا تھا کہ بغداد سے ایک فوج برستی کی ماتحتی میں روانہ ہو گئی..... امیر ابو الحسن جس خطرے کے تحت بغداد سے بھاگا تھا وہ سربراہ گیا تو اس نے ماہ صفر ۵۱۳ھ میں خود بڑھ کر واسطہ پر قبضہ کر لیا۔

وہیں ایسے کسی جھگڑے میں پڑنا نہ چاہتا تھا لیکن خلیفہ نے حکم بھیجا کہ اب وہ تمہارا مہمان نہیں ہے اس کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔ بادل خواستہ وہیں نے اس پر عمل کیا اور امیر ابو الحسن کو اس کے ایک دستہ فوج نے گرفتار کر کے بغداد پہنچا دیا۔

بڑھے اور صفوں کو چیرتے ہوئے صدقہ تک جا پہنچے۔ عین اسی وقت ایک تیرا کر لگا اور صدقہ لڑکھڑا گیا تاہم اس کی تلوار چلتی رہی۔ ایک ترکی غلام گھات میں لگا ہوا تھا اس نے ایک پہلو سے کمر زور دے کر ڈھکیل دیا اور صدقہ گھوڑے سے زمین پر آ رہا غلام نے تلوار کا وار کر دیا اور سرتار لیا۔

اس طرح وسط ایشیا میں شیعوں کی شجاعت کا پرچم سرنگوں ہو گیا جس کے اسباب و عوامل میں مکر و فریب کا زیادہ دخل تھا۔

سیف الدولہ سلطان محمد کا حکومت ساز تھا، سلجوقی فرماں روا نے اس کے لئے اپنے عمل پر شرمندگی کا احساس کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن دل ہی دل میں وہ سوچتا ضرور ہو گا کہ ایسے با وفا کے لئے اس نے جو کچھ کیا، وہ اس کی خدمات کا بدل نہ تھا..... مگر سیاسی مصلحتوں میں ایسے انسانی افکار کی کبھی کوئی قیمت نہیں رہی۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ سلطان محمد صدقہ کو آزاد چھوڑ دیتا تو اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سلجوقیوں کے لئے بڑے سے بڑا خطرہ بن سکتی تھی پھر سلجوقی اکثریت ذہنی طور پر اتنی روشن خیال نہ تھی کہ شیعوں کے شکست خوردہ عناصر کو ایک مرکز پر جمع ہوتے دیکھ کر خاموش رہتی لہذا برکیارق اور سلطان محمد کی جنگ آزمائی ختم ہوتے ہی انہوں نے ضرور سوچا ہو گا کہ "حلہ" کو اسی مقام پر پاش پاش کر دینا چاہئے ورنہ پانی کا چھوٹا سا چشمہ کہیں دریائے قہار نہ بن جائے اور اپنے سیلاب میں سلجوقیت کو بہا نہ لے جائے۔

عصبیت کے اس ماحول میں کسی شیعہ کردار کا زندہ رہنا آسان نہ تھا اس کو تو مزیدی اور عقیلی وارشان وقت کی غیر معمولی صلاحیت کہنا چاہئے کہ انہوں نے اپنی سوچ بوجھ سے خود کو نشانہ ستم بننے سے بچائے رکھا۔

سلطان محمد نے سیف الدولہ صدقہ کو قتل کر دیا تھا اور خلیفہ کو اس کا سر نذرانے کے طور پر بھیج دیا تھا پھر بھی اس کو احساس ضرور تھا کہ صدقہ کی شمشیر براں اس کی محافظ رہی تھی اسی لئے جب صدقہ کی بیوہ حلہ سے آئی تو اس نے احترام کے ساتھ اس کا استقبال کرایا اور اس کے بیٹے وہیں کو حلہ کی جاگیر پر بحال کر دیا۔ وہیں اس کی اطاعت سے انحراف نہ کرنے کا عہد و پیمان نہ کرتا تب بھی



”اس کے بعد وہیں کے ہمراہیوں کا ایک گروہ واسط کی طرف آیا جس کو سلجوقیوں نے روک لیا۔ اب وہیں نے ایک فوج مہلہل بن ابی العسکر کی ماتحتی میں روانہ کی اور مظفر بن ابی الخیر کو اس کی کمک کے لئے روانہ کیا مگر مہلہل مظفر کے پہنچنے سے قبل سلجوقیوں سے ٹکرا گیا اور ہزیمت یاب ہو کر گرفتار کر لیا گیا۔

اس دوران دبیس کے ایک جعلی خط کے ذریعے مظفر کو دبیس سے برہم کر دیا گیا اور وہ واسطہ کی فوج سے جا ملا۔

مختلف مورخین کے بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ دبیس از خود افواج سلطانی سے ٹکرانا نہ چاہتا تھا اس نے سیف الدولہ صدقہ کے سے طاقتور کو روکا تھا تو خود چھوٹی سی فوج کے ساتھ لڑنے پر آمادہ کیا ہوتا مگر امیر ابو الحسن کو مہمان بنالینے کے جرم میں خلیفہ مسترشد جب اس کا دشمن ہو گیا اور اس نے سلطان کو اس کا مخالف بنا دیا تو ممکن ہے اس نے بعض اسراء کو بغاوت پر اکسایا ہو پھر بھی اس نے اپنے بھائی منصور کو پہلے مسترشد کے پاس بھیجا اور جب وہ درگزر سے کام لینے پر آمادہ نہ ہوا تو براہ راست سلطان محمود کی خدمت میں روانہ کیا جس نے منصور کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروادیں۔

دہیس کا باپ زرم گاہ میں عزت کی موت مارا گیا تھا، بھائی صلح کی درخواست لے کر گیا تھا تو سلجوقی طاقت کے زعم میں سلطان نے اس کا یہ حشر کیا ! اس کے بعد دہیس کا جو عالم ہونا چاہئے تھا وہ ہوا، وہ ایک بھڑا ہوا شیر بن گیا اور مقبوضات سلطانی کو نیم دیوانگی میں تاراج کرنے لگا..... سلطان نے بھی تو حلہ کو برباد کر دیا تھا۔

اس عرصے میں کئی سلجوقی امراء کے مابین میدان داری کی نوبت آگئی جس میں وہیں کو بھی شامل ہونا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان کو لڑوانا چاہتا تھا تا کہ کسی ایک طرف شامل ہو کر باپ کا سا وقار حاصل کر سکے..... مگر حقیقت یہ ہے کہ امیر ابو الحسن کے سلسلے میں خلیفہ مسترشد، وہیں سے سخت ناراض تھا اس نے سلطان کو لکھا تھا کہ وہیں اپنے باپ کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔

اتفاق یہ ہے کہ سلجوقی امراء میں کسی حد تک مطلق العنانی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ آذربائیجان کے حاکم مسعود نے علم بغاوت بلند کر دیا اور ربیع الاول ۵۱۴ھ میں بمقام استرآباد سلطان محمود کے لشکر سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں مسعود کو شکست ہوئی۔

پھر مسعود کے ایک بھائی نے سلطان محمود سے اس کا قصور معاف کرا دیا اور الزام و بیس پر آگیا کہ وہ سبقتی سرداروں کو ورغلا یا کرتا تھا۔ سلطان محمود خلاف توقع اس کی طاقت بڑھ جانے سے متوحش تھا۔ ان ریشہ دوانیوں کی خبر سے طیش میں آگیا اور اس نے حملہ پر ہلہ بولنے کا حکم دیدیا۔

وہیں ان دنوں عراق میں تھایاں کو ان سازشوں اور سلطان کے ارادے کی خبر ملی تو اس نے اہل و عیال کو بطیمہ بھیج دیا اور خود حملہ آگیا اور تمام مال و اسباب سمیت کرایلخازی بن ارتق کے پاس مار دین جا کر پناہ لی۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ وبیس نے خود حملہ کو تباہ کر دیا تھا لیکن یہ خلاف عقل ہے۔ اجداد کی آباد کی ہوئی بستی کو کوئی خود اپنے ہاتھوں سے کیونکر تباہ کر سکتا ہے، وبیس نے استنا ضرور کیا ہو گا کہ وہاں کچھ ایسا نہ چھوڑا ہو گا جو سلطان محمود کے کام آسکے۔ رہ گئی حملہ کی تار لٹی تو وہ ہر لحاظ سے سلطان محمود کا کارنامہ ہے جو بارہ گھنٹے کے اندر عمل میں آگیا۔۔۔۔۔ سیف الدولہ صدقہ بھی محلاتی سازش سے مارا گیا تھا اب اس کا بیٹا بھی اس زد پر تھا وہ بھی آسانی سے سرخم کرنے والا نہ تھا۔ اس نے صورتحال کو سمجھ کر اپنے بھائی منصور کو صحنہ سے ایک فوج کے ساتھ عراق کی طرف روانہ کیا جو حملہ اور کوفہ ہوتا ہوا بصرہ پہنچا اور وبیس کی ہدایت کے مطابق مصالحت کے لئے ایک وفد سلطان محمود کی خدمت میں روانہ کر دیا تاکہ حقیقت

کامیابی نہ ہونے پر طغرل بن سلطان محمد کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اس کو تسخیر عراق کا خواب دکھایا۔

دہلیس کی یہ مساعی یقیناً غدرانہ تھیں مگر وہ کرتا بھی کیا خود اس میں اتنی بڑی سلطنت سے لڑنے کی طاقت نہ تھی اور خلیفہ کسی قیمت پر اس کی جان بخشی پر تیار نہ تھے ان حالات میں اس کے لئے بجز اس کے کوئی راستہ ہی نہ تھا کہ خلیفہ اور سلطان کے خلاف خود انہیں میں سے دشمن پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

کاش کوئی عصبیت زدہ مورخ یہ بھی لکھ دیتا کہ وہیں اور کرتا کیا؟ پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے میں تو ڈال نہ سکتا۔ اس کی رگوں کا گرم خون ایسی اجازت نہ دے سکتا پھر وہ ایک بہادر کا بیٹا تھا اس کو تو لڑ کر ہی مرنا تھا۔

### شجاع ابن شجاع

آذر بایجان میں وہیں کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور طغرل ایک بڑی فوج کے ہمراہ فتح عراق کے لئے چل پڑا۔ مسترشد بھی ایک لشکر جہاز لے کر نکلا۔ دونوں فوجیں ایک لمبا چکر کاٹ کر قریب پہنچیں۔ وہیں نے تا مرا میں قیام کر کے کوچ کیا اور خلیفہ کی فوج کا سامان رسد لوٹ لیا۔..... پھر اتفاقاً خلیفہ مسترشد سے اس کی ملاقات ہو گئی وہ معافی کا طلبگار ہو گیا اور خلیفہ نے وزیر السلطنت جلال الدین بن صدقہ کی سفارش پر اس کو معاف کر دیا۔

وہیں جب طغرل کے پاس واپس آیا تو خلیفہ کی طرف سے دوسو سو میں تھا اور سلطان کی طرف سے تو اسے قطعی اطمینان نہ تھا کیونکہ امور مملکت میں مخالف کو مطمئن کر کے پھنسا لینا آئے دن کا کھیل رہا تھا۔ اس کا الو تو اس وقت سیدھا ہو سکتا تھا جب سبقتیوں میں باہم تلوار چلتی تو وہ کسی فریق کا ساتھ دے کر اپنی جگہ بناتا لہذا طغرل جب سلطان سنجر کے پاس خراسان پہنچا تو اس نے سنجر کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔

۵۲۲ھ میں سلطان محمود سے سلطان سنجر کی ملاقات ہوئی تو آپس کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ سنجر نے وہیں کو سلطان محمود کے حوالے کر کے کہا کہ اس کو عزت کے ساتھ اس کے شہر واپس کر دیا جائے، سلطان محمود اسے بغداد لے گیا اور

وہیں جانتا تھا کہ اس کے مٹھی بھر سرفروش افواج قاہرہ سے کب تک لڑ سکتے ہیں پھر بھی اس کے سامنے دو ہی راستے تھے عزت کی موت یا ذلت کی زندگی پھر خلیفہ اور سلطان کی روش سے یہ اندازہ بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کو ذلت کی زندگی کے بجائے ذلت کی موت ہی میر آئے گی۔ اپنے بھائی منصور کا انجام اس کے سامنے تھا لہذا اس نے عزت کی موت کو ترجیح دی اور اس کا راستہ اس نے اپنایا۔

سلطان کا بھائی مسعود اس سے لڑا تھا جو قابل معافی قرار پایا مگر بقول مورخین اس کو جنگ کے لئے ورغلانے والا وہیں تھا۔ اس کا قصور شاید مسعود سے زائد تھا تب ہی وہ محض نہیں کیا جاسکتا تھا۔

بات بالکل واضح ہے کہ وہیں کے خلاف مفروضہ جرائم تراش لینا تھے جو کرنے گئے اور وہیں بھی نوشتہ تقدیر پر شاکر ہو کر میدان میں آگیا۔ نہر ملک میں مسترشد کا جو مال و متاع تھا وہ سب اس نے لوٹ لیا اور نواحی شہروں کو یوں پامال کیا کہ شہری بھاگ بھاگ کر بغداد جا کر پناہ گزیں ہوئے۔

پچھلی جنگ میں وہیں نے خلیفہ کے ایک خادم کو گرفتار کر لیا تھا اس کو رہا کر کے وہیں نے ایک خط خلیفہ کو اس کے ذریعے روانہ کیا جس میں منصور کے ساتھ سلطان کی قائلانہ حرکت کا ذکر کیا اور اپنی طرف سے اطاعت کا وعدہ کیا مگر اس کی یہ کوشش بے سود ہوئی۔ مسترشد نے اس کو معاف کرنے کے بجائے پوری تیاریوں کے ساتھ ایک بڑا لشکر ترتیب دیا اور وہیں کو سبق دینے کے لئے چل پڑا۔

وہیں نے بھی منہ نہ موڑا۔ محرم ۵۱۷ھ میں سخت جنگ ہوئی مگر وہیں خلیفہ کے مڈی دل پر بازی نہ لے جاسکا اس کو شکست ہو گئی پھر بھی وہ ہمت نہ ہارا اور منتفق سے مدد لے کر بصرے کا عازم ہو گیا۔ شہر کو فتح کر کے اس کے سردار کو قتل کر دیلا اس درمیان خلیفہ کی ہدایت پر برستی اس کی طرف روانہ ہوا مگر اس کے پہنچنے سے قبل وہیں نے بصرہ چھوڑ دیا۔

۵۱۸ھ میں اس نے عیسائیوں کی مدد سے بصرہ کا محاصرہ کر لیا اور اس میں

سلطان مسعود کے تخت پر بیٹھتے ہی طغرل اور عماد الدین زنگی دونوں اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ سنجر کو ان دونوں کا سلطان مسعود سے لڑنا پسند نہ آیا اس نے عماد الدین کو بغداد کا تختہ بنادیا اور دبیس کو اس کا معاون مقرر کر دیا۔ اس پر سلطان مسعود سنجر اور طغرل دونوں سے جنگ پر آمادہ ہو گیا۔

خلیفہ مسترشد سلطان مسعود کی مدد کے لئے بغداد سے نکلا مگر عماد الدین زنگی اور دبیس کی فوجیں سدراہ ہوئیں۔ بغداد واپس ہو کر اس نے نئے سرے سے لشکر کو مرتب کیا اور عماد الدین و دبیس کا مقابلہ کیا اور دونوں کو ہرا کر دیا۔ دبیس نے حله جا کر دم لیا جس کے مضافات پر اقبال خادم کا تصرف تھا۔ خلیفہ مسترشد نے ایک فوج اقبال کی کمک کے لئے بھیجی۔ دبیس سے اس کا مقابلہ ہوا اور دبیس کو ہزیمت ہوئی وہ بھاگ کر واسط پہنچا تو اس کا بقیۃ السیف لشکر بھی کام آ گیا تاہم ابن الخیر والی بطحہ کی مدد سے اس نے واسط پر قبضہ کر لیا۔

بغداد سے پھر ایک لشکر بھیجا گیا۔ دبیس کی قوت ختم ہو چکی تھی پھر بھی اس نے مقابلہ کیا ایک خونریز جنگ ہوئی اور میدان اقبال خادم کے ہاتھ رہا۔ اس بار دبیس سلطان مسعود کی پناہ میں چلا گیا۔

اس اثناء میں طغرل وفات پا گیا اور خلیفہ مسترشد سے سلطان مسعود کا تنازعہ بہت بڑھ گیا دبیس نے بعض امراء کے ساتھ بغداد جا کر ایک بار پھر خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر دبیس پھر سلطان مسعود کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

خلیفہ مسترشد اس کی بے ادبی کی سزا دینے پر تزلزل گئے تھے وہ ایک بڑا لشکر لے کر نکلے اور بمقام عرج طرفین کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل خیمہ زن ہو گئے۔ آخر ایک سخت معرکہ پیش آیا جس میں مسترشد کو شکست ہوئی۔ وہ اور اس کے عمائدین گرفتار کر لئے گئے۔ سلطان مسعود نے خلیفہ سے فوج نہ رکھنے کی شرط کے ساتھ بعض شرائط منظور کرائے اور دونوں کے مابین صلح ہو گئی۔

سلطان مسعود کے قیام بغداد میں ذی قعدہ ۵۲۹ھ میں باطنیوں کے ہاتھوں خلیفہ مسترشد کا قتل ہو گیا اور خلیفہ راشد باند اس کے جانشین ہوئے اس قتل کا

خلیفہ سے اس کی معافی کی سفارش کی..... دبیس کا خدشہ غلط نہ نکلا، مسترشد اس کی غلطیوں سے درگزر کرنے پر تیار ہو گیا لیکن اس کا علاقہ واپس کرنے پر راضی نہ ہوا۔

سلطان محمود بغداد سے واپس ہو کر ہمدان میں مقیم ہوا۔ وہاں سے کوچ کرنے پر اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا پھر سلطان بھی بیمار پڑ گیا..... حله خلیفہ کے قصبے میں تھا۔ دبیس نے موقع پایا تو سلطان کے چھوٹے بیٹے کو لے کر فرار ہو گیا حله سے مسترشد کے متعینہ والی کو نکال دیا اور خود ۵۲۳ھ میں حله پر قبضہ کر لیا۔ سلطان نے اس کی اطلاع پا کر دبیس کے دونوں فسادوں کو بلایا۔ ان میں سے احمد بیلی دبیس کو لانے کے لئے روانہ ہو گیا پھر خود سلطان بھی عراق کی طرف چل پڑا۔

دبیس نے بہت سے بیش قیمت تحائف سلطان کی خدمت میں روانہ کئے سلطان نے انہیں قبول تو کیا مگر دبیس کی معذرت کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خود بغداد پہنچ گیا..... دبیس کو اپنے بارے میں خلیفہ کے ارادوں کا اندازہ تھا اس لئے بصرہ پر حملہ آور ہو گیا اور اس کو لوٹ کر قبضہ کر لیا۔

سلطان نے اس کے تعاقب میں فوجیں روانہ کیں تو بصرہ چھوڑ کر بریہ جا پہنچا وہاں سے شام کی طرف کوچ کیا۔ تاج الملک والی دمشق کو اطلاع ہوئی تو اس نے چالاکی سے دبیس کو گرفتار کر لیا۔

عماد الدین زنگی شام کے بعض علاقوں کا والی تھا، تاج الملوک کا بیٹا اور بعض امراء اس کے پاس نظر بند تھے۔ زنگی دبیس کا سخت ترین دشمن تھا اس کو خبر ہوئی تو اس نے تاج الملوک کے بیٹے اور امراء کے بدلے دبیس کو طلب کیا۔ تاج الملوک نے یہ سودا کر لیا مگر بہادر بہادر کی قدر جانتا ہے عماد الدین زنگی نے خلاف توقع دبیس کو رہا کر کے نوازش و اکرام سے نوازا اور اپنے ساتھ رہنے کی استدعا کی۔

۵۲۵ھ میں سلطان محمود نے انتقال کیا اور اس کا بیٹا ملک داد اس کی جگہ تخت نشین ہوا مگر اس کے بچا مسعود نے بزور شمشیر تخت پر قبضہ کر لیا اس وقت مسعود کا بھائی طغرل غراساں میں اپنے چچا سنجر کے پاس تھا۔

تھوڑی سی فوج اس کے ارد گرد تھی جس کے پاؤں اس بھرپور بلخار میں اکھڑ گئے اور سلطان کو شکست کھانا پڑی۔

امراء و عمائدین کی ایک تعداد فاتحین کے ہاتھوں گرفتار ہو گئی جن میں صدقہ بن و بیس اور عمر بن ابی العسکر بھی تھا۔ امراء کے ساتھ یہ دونوں قتل کر دیئے گئے۔

سلطان مسعود نے سنہ ۵۳۱ھ کے بعد محمد بن و بیس کو حلقہ کا والی بنا دیا اور مہملہ بن ابی العسکر کو مددگار کے طور پر متعین کیا۔ اس طرح حلقہ کی حکومت اس خاندان میں باقی رہی۔

والی فارس اور خوزستان وغیرہ مختلف شہروں پر دھاوے مار رہے تھے۔ آخر سلطان مسعود کو ان کی سرکونی کے لئے نکلنا پڑا۔ ۵۳۱ھ میں بغداد سے نکلے وقت اس نے امیر مہملہ بن ابی العسکر اور نظیر خادم کو بغداد کا نگران مقرر کیا۔ انہوں نے کسی شبہ پر یا کسی مصیبت سے علی بن و بیس کو قلعہ تکمیت میں قید کر دینے کی رائے دی۔ علی کو کسی طرح اس کی خبر ہو گئی وہ چند آدمیوں کے ساتھ نکل بھاگا اور حلقہ پہنچ گیا۔

یہ گویا ایک تحریک تھی دبے ہوئے زخموں کو ابھارنے کی یا اس منصوبے کو زندہ کرنے کی جو کبھی بروئے کار لایا گیا تھا۔ محمد بن و بیس مہملہ بن ابی العسکر کے باوجود علی کی بغاوت کا حامی نہ تھا۔ دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی اور علی نے حلقہ پر قبضہ کر لیا۔

مہملہ بن ابی العسکر کے ساتھ حلقہ کی سمت روانہ ہوا۔ سخت جنگ کے بعد مہملہ بن ابی العسکر ہوا۔ اس نے میدان سے فرار ہو کر بغداد میں آکر قرار لیا۔ خلیفہ مقتدی نے مہملہ بن ابی العسکر کی زیادتی پر علی کے حق میں فیصلہ دیا لیکن جب رعایا کے ساتھ علی کے برے سلوک کی اطلاع ملی تو سلطان نے اس کو معزول کر دیا اور حلقہ کو سالار کر دی جاگیر میں دیدیا۔

سالار کر دھلہ پر جا کر قابض ہو گیا اور علی طف میں تفسخ نجر کے پاس پہنچا۔ اس کی مدد سے علی نے سالار کو مار بھگایا اور وہ بغداد واپس ہو گیا۔

الزام و بیس کے سر رکھ دیا گیا اور سلطان مسعود نے بے خبری میں اس کا سر اتروا لیا جو سبکو قیوں کی دیرینہ آرزو تھی اور جس کی خاطر کئی بار بڑے بڑے جال بکھائے گئے تھے۔

حلقہ میں صدقہ بن و بیس کو اس کی خبر پہنچی تو باپ کے خون ناحق پر اس کا خون کھولنے لگا مگر اس نے بڑے تحمل سے کام لیا اور اتنی بڑی سلطنت سے متصادم ہو کر خود کشی نہیں کی بلکہ بعض وفاداروں کے ساتھ سلطان کی طرف چل پڑا۔ سلطان نے اس کو وہیں روک لیا کیونکہ ظالم اپنی پرچھائیں سے بھی ڈرتا دھتکتا ہے پھر صدقہ بن و بیس تو سیف الدولہ صدقہ کا پوتا تھا۔

صدقہ جبری ہونے کے ساتھ دانش مند بھی تھا۔ اس نے سلطان کے دل میں جگہ بنائی اور کچھ دنوں بعد حلقہ اس کو واپس مل گیا۔

خلیفہ راشد بغداد میں صرف خلیفہ تھے۔ کچھ دنوں بعد عماد الدین زنگی والی موصل کی گزارش پر موصل جا کر مقیم ہوئے۔ عماد الدین بڑی فرماں برداری سے پیش آیا اور بار بار سلطان مسعود کی زیادتیاں بیان کر کے خلیفہ کو سلطان سے برگشتہ کرتا رہا۔ سلطان مسعود کو اپنی طرف سے خلیفہ راشد کے خیالات کا علم ہوا تو اس نے اسے معزول کر دیا اور ۵۳۰ھ میں خلیفہ مقتدی لا مراند کے ہاتھ پر بیعت کر لی

سلطان مسعود ہمدان پہنچا تو صدقہ بن و بیس نے حلقہ آنے کی دعوت دی سلطان فوجوں کو اطراف میں بھیج کر حلقہ پہنچ گیا۔ صدقہ نے بڑے انکسار کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور بعض امراء کی تحریک پر اپنی بیٹی کا عقد اس کے ساتھ کر دیا جس کی داغ بیل شاید پہلے ہی پڑ چکی تھی۔

اسی زمانے میں خلیفہ راشد کے ارادوں کا علم ہوا۔ وہ اچانک اس کے سر پر چاہنچا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی اور سلطان نے ان سب کو شکست دیدی اور امیر منکبرس والی فارس کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

جنگ ختم ہی ہوئی تھی کہ والی خوزستان اور والی طحلال اپنی فوجوں کے ساتھ اکدم پلٹ پڑے۔ مسعود بڑے اطمینان کے ساتھ ایک مقام پر فرد کش تھا۔



خلیفہ مستنجد نے نظم حکومت سے فارغ ہوتے ہی پہلے خفاجہ کی سرزنش پر توجہ کی اور امیر ارغش اور امیر قیسر کو تعینات کیا جنہوں نے رجبہ تک ان کا تعاقب کیا۔ خفاجہ نے صلح کی پیش کش کی مگر امیر ارغش نے منظور نہ کیا۔ آخر قبیلہ خفاجہ نے دیگر قبائل سے مدد لی اور امیر ارغش کو رجبہ تک بھگالے گئے۔ امیر قیسر مارا گیا اور ارغش سخت زخمی ہوا۔ بغدادی لشکر کا ایک بڑا حصہ کام آگیا۔ اس سے خلیفہ کو ان کی طاقت کا اندازہ ہو گیا اور اس نے اطاعت کی شرط پر مصلحت کر لی۔

### ساحل فرات کے ساحل

دوسرا قبیلہ بنی اسد تھا جو سلجوقیوں کا تختہ مشق بھی بنا رہا پھر بھی اپنی شجاعت کا لوہا منواتا رہا۔ اس قبیلے میں حقیقتاً اسد ہی پیدا ہوتے تھے مگر اب وہ بے سردار کارہ گیا تھا۔ حلہ کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا۔ وہ کسی ایک پرچم کے نیچے جمع نہ ہو سکتے۔ بقول ابن اثیر ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے سلجوقی فرمانروا سلطان محمد کے محاصرہ بغداد کے وقت سلطانی لشکر کی مدد کی تھی اور یوں بھی خلیفہ کی نظر میں وہ ہمیشہ سے فتنہ و فساد پھیلاتے رہے تھے۔

خلیفہ مستنجد نے تیرون بن قماج کو ان کی سرکوبی پر متعین کیا لیکن اب وہ دریا کے کنارے آباد نہ تھے بلکہ پہاڑی دروں میں جا بسے تھے اور پہاڑی سلسلے میں ان کی آبادیاں منتشر تھیں۔ اس لئے فوج بغداد انہیں نقصان پہنچانے کے بجائے خود کم ہوتی رہی۔ مستنجد نے ضد میں آکر ابن معروف سردار شیعہ کو بھیجا۔ اس نے ان کا محاصرہ کر لیا اور کافی دنوں تک کامیاب نہ ہونے پر تیرون بن قماج کو مزید فوج لیکر روانہ کیا اور ابن معروف کو لکھا کہ شیعیت کے باعث وہ بنی اسد کے ساتھ رعایت کرتا ہے۔

نوعیت واقعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ ابن معروف نے ایسا کیا ہو گا لیکن وہ تیرون بن قماج کے ساتھ ضرور تھا۔ بہر حال مورخین بتاتے ہیں کہ بغدادی لشکر نے "ان کے پانی لانے کے راستے بند کر دیئے اور نہایت بے رحمی سے انہیں پامال کرنے کو بڑھے۔ چار ہزار اسد مارے گئے باقی ماندہ کے لئے حلہ سے جلا

۵۴۴ھ میں بغداد کے بعض امراء نے سلطان مسعود کے خلاف بغاوت کی۔ تفتشگر بھی ان میں شامل تھا۔ علی بن وہبیس کو احسان کا بدلہ چکانا تھا وہ بھی ساتھ ہو لیا۔ انہوں نے ملک شاہ بن سلطان محمود کی حکومت کا اعلان کر دیا مگر کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی وہ لوگ منتشر ہو گئے اور علی بن وہبیس نے سلطان مسعود سے جا کر صفائی کر لی۔

کچھ دنوں بعد علی بن وہبیس ایسا بیمار ہوا کہ صحت یاب نہ ہو سکا اور چند ماہ صاحب فراش رہ کر انتقال کر گیا۔ مہینوں کے فصل سے سلطان مسعود بھی چل بسا اور سلجوقی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سلطان ملک شاہ کہنے کو تخت نشین ضرور ہوا مگر اس کی حکومت چند روزہ اور برائے نام تھی۔

حلہ پر پہلے سالار کردنے قبضہ کیا۔ بغداد کا تختہ مسعود ہلاک اس کے ساتھ تھا۔ وہ سالار کردن کو ختم کرا کے خود حلہ کا حکمران بن گیا۔ خلیفہ مقتدی نے عون الدین بن ہبیرہ کو بھیجا۔ اس نے مسعود ہلاک کو تکریت کی طرف مار بھگایا۔ اس دوران ملک شاہ اور خلیفہ مقتدی کے مابین لشکر آزمائی ہوتی رہی۔ آخر ذی قعدہ ۵۴۷ھ میں خلیفہ مقتدی بغداد واپس آگیا۔

۵۴۸ھ میں سلجوقی امراء نے ملک شاہ کو گرفتار کر کے معزول کر دیا اور محمد بن محمود کو تخت پر بٹھا دیا مگر خلیفہ نے اس کو منظور نہ کیا۔ محمد بن محمود نے ۵۵۲ھ میں بغداد کا محاصرہ کر لیا مگر ناکام واپس ہونا پڑا۔

۵۵۵ھ میں خلیفہ مقتدی نے رحلت کی اور مستنجد لامراند اس کا جانشین ہوا اس نے بغداد میں سلجوقیوں کا خطبہ بند کر دیا۔

اب عباسی خلافت کسی حکمران کی تابع نہیں تھی۔ بغداد اور اس کے تمام نواحی علاقے اس کے قبضہ و تصرف میں تھے بلکہ عراق کا بیشتر رقبہ حدود خلافت میں آتا تھا۔ خلیفہ مستنجد بامراند ماضی کے عباسی بادشاہوں کی طرح صاحب، طبیل و علم بھی تھا اور ایک بڑے لشکر کا مالک بھی لہذا خلیفہ مستنجد نے سلجوقی تاجداروں کے بجائے احکام جاری کرنا شروع کر دیئے۔

جو بڑی سلطنت کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی گروہ اپنا مضبوط نہ ہونے پائے جو فرمانروا کے مد مقابل ہو سکے۔

خلیفہ مستنجد ان سے زائد سفاک نکلا۔ اس نے جڑی سے اکھاڑ پھینکنے کا منصوبہ بنالیا اور اس میں کامیابی حاصل کر لی۔

بچے کچھ عقیلیوں کی ایک تعداد بھی ان میں شامل تھی۔ خود اپنے قبیلے کی حیثیت سے تو ان کی طاقت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اور وہ چار منتشر ہو گئے تھے، کچھ لوگوں نے اس پناہ گاہ کو غنیمت سمجھا تھا۔ اب وہ بھی ترک وطن پر مجبور ہو گئے تھے کہا جاتا ہے کہ کبھی بحرین میں عقیلیوں کی حکومت بھی تھی، پھر وہ عراق آگئے تھے۔ اس واقعے کے بعد ایک گروہ بحرین پہنچا اور ایک عرصے تک بحرین کے ایک علاقے پر حکمران رہا۔

کہنے کو بنی اسد کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے محاصرہ بغداد میں سلطان محمد کی مدد کی تھی مگر اتنے سے قصور کی اتنی بڑی سزا خلاف عقل ہے۔ بات درحقیقت وہی تھی جو مستنجد نے ابن معروف کو لکھی تھی کہ وہ شیعیت کی وجہ سے بنی اسد کی موافقت کر رہا ہے اور اسی بنا پر مستنجد نے تیرون بن قماح کو بھیجا تھا۔ اگر ابن معروف اس کے بعد بھی کسی نرمی کا مظاہرہ کرتا تو اس کا حشر بنی اسد سے مختلف ہوتا ہماری نظر میں یہ دباؤ اس سفاکانہ اور ظالمانہ عمل میں شرکت کا جواز نہیں بن سکتا۔ ابن معروف کو معلوم تھا کہ اس مظلوم قبیلے کے خلاف لشکر کشی کیوں کی گئی ہے؟ اس کے بعد بھی وہ بیرحم خلیفہ کا آلہ کار بنارہا اور سبے گناہوں کے خون میں تیرون کے ساتھ اپنے ہاتھ بھی رنگے..... حکومت کا لالچ انسان کو کتنا اندھا کر دیتا ہے اس عمل کے بعد ابن معروف کو شیعہ تو نہیں کہا جاسکتا!

بنی اسد کی جلا وطنی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ مختلف العقیدہ ہونے کے جرم میں انہیں اپنے وطن سے نکال دیا گیا اور انکا اس قدر خون بہایا گیا کہ ایک مدت تک پہاڑی وادیوں کی زمین ان کے خون سے رنگین رہی..... قسی القلبی کی اس نظیر کو بڑے پیمانے پر دیکھا جائے تو اندلس میں عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر جو کچھ بیتا، اس میں خود اپنے عمل کی داستان

وطن ہو کر نکل جانے کی منادی کرادی گئی پتہ نہ وہ لوگ حملہ سے جلا وطن ہو کر اطراف میں پھیل گئے اور ان میں سے ایک تنفس بھی عراق میں نہ رہا۔ ان کے پہاڑی دروں اور ان کے مقبوضات پر تیرون اور ابن معروف قابض ہو گئے (۷۳۰ء)

بنی اسد کا یہ ظالمانہ استیصال تاریخ کا بڑا المیہ ہے۔ خطا ان کی یہ تھی کہ وہ اہل سیف اور بہادر تھے۔ بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی یہ کارروائی اگر دو دہائی قبل کی جاتی جب ان کا کوئی سردار بقید حیات تھا تو حکمران طاقت کو معلوم ہو جاتا کہ سابقہ کسی شجاع قبیلے سے بڑا ہے مگر منتخب اس برے وقت کو کیا گیا جب وہیں کا ہر وارث مرچکا تھا اور کوئی اس قبیلے کو منظم کرنے والا باقی نہ تھا، پھر بھی وہ ٹولیوں میں بٹ کر اس طرح لڑے کہ لشکر خلافت کو کاٹ کر رکھ دیا۔

مستنجد نے تیرون بن قماح کو ہدایت کی تھی کہ پانی بند کر کے پورے قبیلے کو مجبور کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے دروں سے باہر نکل آئیں۔ بنی اسد کے لئے یہ عمل انجانانہ تھا۔ ان کے اسلاف نے دیکھا تھا کہ مستنجد کے پیش رووں نے محرم ۱۱ھ میں پیغمبر اسلام کے نواسے پر پانی بند کر دیا تھا اور بھوک اور پیاس سے کمزور کر کے ان کا مقابلہ کیا تھا۔ حکومت کا مڈی دل کھلے میدان میں چند نفوس سے لڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔

ایسا ہی کچھ یہاں بھی کیا گیا۔ چونکہ قبیلے کی تنظیم ختم ہو چکی تھی۔ مختلف گروہ مختلف اوقات میں سروں سے کفن باندھ کر نکلے اور بے ٹکان حملوں میں لاشوں کے انبار لگا کر جام شہادت پی گئے۔ عزم و ہمت، صدق و ایمان، صبر و ایثار و وفا سب کو جوڑ لیں تو اپنی داستان بن جائے گی۔

کم سے کم چار ہزار بنی اسد قتل ہوئے۔ بغدادی لشکر کے مقتولین کی تعداد دس گنی سے کم نہ ہوگی جس کو مورخین نے تحریر نہیں کیا۔ بہر حال متعصب خلافت نے شیعوں سے یہ علاقہ صاف کرایا۔ وہ کہاں کہاں جا کر آباد ہوئے؟ اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا تاہم یہ بات مسلم ہے کہ ان کی اجتماعی طاقت ختم ہو گئی۔

سبکو قیوں کا مقصد بھی ایسا ہی تھا مگر وہ ان کو نا طاقت بنا کر رکھنا چاہتے تھے



اس حکومت کے کمزور پڑتے ہی پھر عیسائیوں نے سر اٹھایا تو موصل سے عماد الدین زنگی انگڑائی لے کر اٹھا تھا۔ اس میں شیعوں کا کوئی نمایاں حصہ نظر نہیں آتا مگر وہ نمایاں تھے بھی نہیں تو قابل ذکر کیونکر ٹھہرتے۔

سلجوقی دور میں عماد الدین زنگی کے کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ وہ ملک شاہ کا بچپن کا ساتھی اور ایک شجاع ترین مسلمان تھا۔ شام کے بعض علاقوں کا حاکم رہا پھر موصل کا عامل بنا دیا گیا۔ ۵۲۱ھ میں سلطان سنجر نے اس کو بغداد کی شہنگی پر مامور کیا تھا اور وہیں مزیدی کو اس کا معاون بنایا تھا۔

اب سلجوقی سلطنت حصوں بجزوں میں بٹ چکی تھی۔ عماد الدین زنگی نے اس میں سے بھی اپنا حصہ لیا اور مملکت کو بڑھاتا رہا۔ مسترشد کے عہد خلافت تک وہ تقریباً پورے کردستان کو صاف کر چکا تھا۔ اور صرف عماد الدین زنگی ہی نہیں اتسز بن محمد بھی خوارزم میں اپنی حکومت قائم کر چکا تھا جس کا لقب خوارزم شاہ تھا۔

آٹھ دس سال میں عماد الدین کی حکومت شام تک پھیل گئی۔ مسلم علاقوں کو ہتھیانے کے ساتھ ساتھ وہ عیسائیوں کی سرکوبی بھی کرتا رہا۔

بوتہ دور کے چھوٹے حکمرانوں میں ایک خاندان بنی مروان کا تھا۔ ان کا ایک قلعہ زنگی حکومت کے وسط میں پڑتا تھا۔ ۵۲۱ھ میں عماد الدین نے اس کا محاصرہ کیا مگر دوران محاصرہ اسکے کسی غلام نے اسکو قتل کر دیا۔

زنگی امیر کے کئی بیٹے تھے جن میں سے سیف الدین غازی موصل میں تخت نشین ہوا اور نور الدین نے حلب میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی مگر دونوں میں اتحاد رہا۔ ۵۲۴ھ میں سیف الدین زنگی کی حکومت کافی مضبوط ہو چکی تھی وہ اہل صلیب سے بہت ہی لڑائیاں لڑ چکا تھا اور اس کی حکومت کافی وسیع ہو گئی تھی۔

فاطمین مصر خلافت عباسیہ کے آخر دور میں روپہ زوال تھے اور مصر میں نور الدین زنگی کی مداخلت شروع ہو چکی تھی۔ آخر اس کے سپہ سالار شیر کوہ نے مصر پر حملہ کر دیا اور نظم حکومت میں دخیل ہو گیا۔ صلاح الدین نجم الدین ایوب نے شیر کوہ کی جگہ لی اور نور الدین کے انتقال پر شام و مصر کا فرماں روا ہو گیا

بڑھی جاسکتی ہے اور اس کو پڑھ کر دوسروں کے ساتھ خود ہماری آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں!

ظالم کسی عقیدے کا بھی ہو، ہماری نظر میں ظالم ہی ہے اور ہم اس کو قابل نفرت ہی قرار دیتے ہیں۔

مستنجد اور سلاجقہ کا موازنہ کیا جائے تو سلاجقہ کی پالیسی کینٹا شیعہ کش نہیں تھی۔ طغرل بیگ ایک متعصب سنی ضرور تھا۔ اس کے طور طریقے میں شیعوں سے نفرت کا انداز ٹھکتا ہے پھر بھی وہ مستنجد لا مرشد کا سا ذہن تو نہ رکھتا۔ اس کے عہد میں معتبر شیعہ بعض عہدوں پر موجود تھے البتہ اس نے اپنی حدود مملکت میں اہل سنت کی بالادستی کو مسلم کر دیا تھا حتیٰ کہ صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم شامل کر دیا تھا۔

الپ ارسلان اور ملک شاہ بھی اسی قسم کے حکمران گزرے۔ ان کے رفائی کام عالم آشکار ہیں پھر تقریباً شیعوں کے لئے یہی پالیسی عام رہی مگر جہاں کہیں کسی نے طاقت پکڑی، اس کو اسی جگہ کسی نہ کسی بہانے کھل دیا گیا جیسا کہ بنی و بیں کے ساتھ پیش آیا۔

اب سلجوقی سلطنت کے خاکستری موصل کے اتابکوں کا ایوان کھڑا ہو رہا تھا تو زمانہ شیعوں کے لئے مقابلتاً برا رہا تھا لیکن اب ان میں رہ ہی کیا گیا تھا جس پر وہ سر اٹھاتے یا ان سے کسی کو کوئی خطرہ پیش آسکتا۔ باصلاحیت افراد جا بجا ضرور پائے جاتے جو اپنے دماغی اور فنی امتیاز کے سبب نظر انداز نہ ہو سکتے مگر شیعوں کی کوئی جماعتی حیثیت نہ رہ گئی تھی۔ وہ بن امیہ اور بنی عباس کے ابتدائی ادوار کی طرح منظر عام سے بالکل ناپید تو نہ تھے، کہیں کہیں کونوں کھدروں میں موجود تھے اور اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے کھل کر سامنے نہ آتے۔

مسلم علاقوں پر عیسائی پلٹار تو بنی امیہ کے عہد سے شروع ہو گئی تھی۔ بنی عباس کے زمانے میں بھی جاری رہی مگر جب کبھی اس نے شدت اختیار کی تو کبھی سیف الدولہ حمدانی نے جواب دیا، کبھی لبنان کے بنی عمار نے اور کبھی بے بسی میں مسلمان پس کر رہ گئے۔ سلجوقیوں سے بھی عیسائیوں کے معرکے ہوتے رہے مگر

کس زمانے میں کتنے لوگوں نے اباہ و اجداد کی سرزمین کو خیر باد کہا تھا  
کس کس دور میں کون کون بلا وطن کیا گیا، صدیوں تک پھیلی ہوئی بساط وقت پر  
اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا لیکن مونے مونے نام تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ کر  
لئے ہیں جن میں ایک جلی نام "اوریس بن عبداللہ بن حسن شنی" ہے جنہوں نے  
مراقش میں پہلی شیعہ حکومت قائم کی۔

### مراقش

طلوع اسلام کے وقت مصر میں عیسائیت کا غلبہ تھا اور جاہلہ ہودیت بھی  
پائی جاتی تھی۔ مراقش میں اور بالخصوص بربروں میں آتش پرستی کو عروج تھا۔  
حضرت عمر کے عہد میں جب مصر فتح ہوا اور عمرو عاص نے مراقش کے بعض حصے  
زیر نگین کر لئے تو وہاں کے لوگ اسلام سے آشنا ہوئے..... اس اسلام شناسی  
کے تصور میں شمشیر آبدار کی چمک بھی شامل تھی۔

پھر درس و تدریس کے تسلسل سے حضرت علی کا نام ملحق ہوا اور مصر  
کے ساتھ مراقش نے بھی آل رسول کا نام سنا۔ چار سال کا مختصر دور ہوتا ہی کتنا ہے  
تاہم بعض حلقے اس حقیقت سے نا آشنا نہ رہے کہ اسلام تسخیر ممالک کا نام نہیں بلکہ  
اسلام نام ہے خدا شناسی کا اور خود شناسی کا جو آداب و تہذیب انسانیت کا ایک ابدی  
دستور ہے۔

لیکن اس تاخر کو دیر پائی میر نہ آنسکی۔ عبداللہ بن ابی سرح، معاویہ بن  
خدیج، عقبہ بن نافع اور ان کے نائبین نے سابقہ نظریات کو بحال کر دیا۔ جو سر  
تلواروں کی دھاروں سے قائم نہ ہو سکے، وہ خم تو ہو گئے مگر دل مسز نہ ہو سکے، عقبہ  
کی فوجیں بربر قبائل کو کائناتی چھانٹتی ہوئی مراقش کے سنگناخ علاقوں میں بھی گھسٹی  
چلی گئیں اور لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرتی رہیں مگر انہیں مسلمان کے  
بجائے خارجی بناتی رہیں اور پھر یہ سلسلہ جاری ہی رہا۔

یہ کہنا یقیناً صحیح نہ ہو گا کہ قبولیت اسلام میں سب بچکے ہوئے لوگ تھے لیکن  
اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بربر قبائل کی اکثریت میں خارجی نظریات ہی پھیلے اور

## شیعہ مراقش و مصر میں

### نارکان و وطن

عبان علی کے مدینے سے ترک وطن کا سلسلہ کب شروع ہوا اس کے لئے  
مختص وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے اسباب و عوامل میں شروع ہی سے  
امام اول کے اس اعلان کا غل پایا جاتا ہے کہ وہ اقتدار کے لئے مسلمانوں پر تلوار  
نہیں اٹھائیں گے۔ اس کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس کے  
بعد آپ کے جانشینوں نے جب تحفظ اسلام کی خاطر رزمگاہ میں قدم جمایا تو ان کے  
حریف مسلمان نہ تھے۔ اس کی صراحت مزید کے لئے اسنا کہا جاسکتا ہے کہ علی اور  
حسین سے لڑنے والوں کا صحیح اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر غفاری اور حضرت عمار یاسر کا ابتدائی  
ترک وطن اگرچہ مقصدی تھا مگر اس میں حضرت علی کی روش امامت کی کارفرمائی  
ضرور تھی چنانچہ عمار یاسر نے عراق و شام میں، حضرت ابوذر غفاری نے مضافات  
دمشق میں اور جناب سلمان فارسی نے مدائن میں حقوق آل محمد کے لئے نعرے بلند  
کئے اور حضرت سلمان مدائن ہی میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

حضرت ابوذر کو بھی شام کی سرزمین کا پیوند بنا دیا جاتا مگر شاید حاکم شام کو  
ڈر تھا کہ ابوذر کی قبر سے مرنے کے بعد بھی صداقت کی کرنیں پھونکتی رہیں گی اس  
لئے اس نے پابہ زنجیر کر کے مدینے واپس بھیج دیا تا کہ خلیفہ سوم ان کو کسی ویرانے  
میں دفن کرادیں جہاں کوئی جیتے جی یا پس شہادت ان کی آواز سننے والا نہ ہو۔

ترک وطن کا سلسلہ قلم و تشدد کے ارتقاء کے ساتھ بڑھتا رہا اور دیکھتے ہی  
دیکھتے وہ وقت آگیا کہ علی کا نام لینا حکومت و ملت سے بغاوت قرار دیا جاتا رہا۔



پھیلائے گئے تھے۔ سخت اور پہڑ علاقوں کے درشت خو اور تند مزاج لوگوں کو اسلام کے جو معنی بتائے گئے، اسی کو انہوں نے سمجھا اور وہی ان کا مسلک لسانی قرار پایا جس میں اہل بیت کی دشمنی بھی شامل تھی..... عہد عباسیہ میں یہ نظریات بدلتے رہے اور ان میں کہیں کہیں آل رسول کے لئے جگہ بنتی رہی۔

۱۶۹ھ میں جب بمقام رخ عباسیوں کے ہاتھوں اولاد حسن کا قتل عام شروع ہوا تو ادریس بن عبداللہ کو ان کا غلام راشد بچا کر نکال لے گیا..... بنی امیہ کے سفاکانہ عہد اور بنی عباس کے خون آشام دور میں تقیہ شیعوں کے بچنے کا واحد راستہ تھا اور اسی کا سہارا لے کر عہد بن علی حکومت میں پائے جاتے تھے چنانچہ شہزادہ ادریس بھی ایک افسر محصولات کی مدد سے طنجہ کے قریب شہر ولیل پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جس کو مشیت الہی کے سوا کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

افسر محصولات کو اس خفیہ مدد کا خمیازہ جان دے کر بھگتنا پڑا جو علی کے دوستوں کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔

اس طویل سفر میں دو سال سے زائد صرف ہوئے اور اس کو بھی حسن اتفاق ہی کہنا چاہئے کہ جس علاقے میں ادریس الاکبر نے پناہ لی وہاں نصرانیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کی اکثریت تھی اور وہاں کا حکمران اسحق بن محمد بھی آل رسول سے ناواقف نہ تھا۔ کچھ دنوں بعد جب اس کو ادریس کے آنے کا حال معلوم ہوا تو وہ عزت و احترام سے پیش آیا اور پھر ادریس نے روح اسلام کو ان پر منکشف کیا تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ادریس الاکبر کے قبول عام کا یہ عالم ہو گیا کہ لوگ پروانہ وار فدا ہونے پر تیار ہو گئے۔

خوش عقیدہ اسحق بن محمد نے ہارون رشید کے بجائے ادریس الاکبر کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور ادریس نے دین کی حقانیت اور بنی ہاشم کی فصاحت کے سہارے غیر مسلموں کو مسلمان بنانا شروع کر دیا پھر کچھ وقفے سے ۱۷۴ھ میں تلمسان فتح کر لیا اور اس حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا جو ایک صدی سے زائد تک مغرب اقصیٰ میں علوم اہل بیت کی روشنی پھیلاتی رہی۔

بغداد مراقش کی اس نئی حکومت سے بے خبر نہ تھا مگر لشکر کشی میں کامیابی کے امکانات نظر نہیں آرہے تھے کیونکہ ادریس الاکبر کا دائر فتوحات بڑھتا چلا جا رہا تھا اس لئے ہارون رشید نے اپنے معتبر غلام سلیمان شماغ کو متعین کیا کہ افریقہ پہنچ کر ادریس کے معتقدین میں شامل ہو جائے اور انہیں راستے سے ہٹا دے۔

سلیمان نے موقع پا کر ادریس کو زہر آلود منجن استعمال کروایا جس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔

ادریس نے اپنے بعد کوئی اولاد نہ چھوڑی تھی۔ صرف ایک کنیز حاملہ تھی لیکن باوفا غلام راشد حکومت کا نگران رہا اور کنیز کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوا اس کو تاج و تخت کا وارث قرار دیا گیا۔

اس کو ادریس الاکبر کی تعلیمات کا اثر ہی کہنا چاہئے کہ نوزائیدہ بچے کی بادشاہت پر اکثر ارباب حکومت متفق رہے۔ ۱۸۸ھ ہجری میں اس کی تخت نشینی عمل میں لائی گئی جبکہ اس کی عمر گیارہ سال تھی۔

راشد دو سال قبل، افریقہ کے عباسی حاکم ابراہیم بن اغلب کی سازش سے قتل ہو چکا تھا۔ ابو خالد مزید بن الیاس العبدی اس کی جگہ سربراہ مملکت تھائے بادشاہ کی فتوحات میں اس کے تدبیر کو بڑا دخل ہے۔

مراقش کی بلکہ دنیا کی پہلی شیعہ حکومت ادریس الاکبر کی زندگی میں اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ ان کے بعد ادریس اصغر کے بالغ ہونے تک کوئی اس پر ضرب نہ لگا سکا۔

ادریس الاصغر نے شروع ہی سے اندرونی استحکام اور بیرونی توسیع پر توجہ دی۔ دوسرے مقامات پر بسنے والے عربوں کو مراقش میں آباد کیا اور تمام طقت علاقوں کو مسخر کر کے پورے مغرب اقصیٰ پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ افریقہ کے بنی اغلب اور بغداد کی عباسی خلافت نے ہر حربہ استعمال کر ڈالا مگر ادریسوں نے حکومت کا استنا مضبوط ڈھانچہ بنایا تھا کہ اس پر کوئی اثر نہ پڑا بلکہ دن و نیاں اور رات جو گنی ترقی ہوتی رہی۔

۱۹۲ھ میں ادریس نے شہر فاس کی بنیاد ڈالی اور تلمسان سے اپنا

خارجی سے شکست کھائی اور امرائے اس کے بجائے یحییٰ بن قاسم کو بادشاہ بنایا۔ یحییٰ بن قاسم ایک بہادر حکمران تھا اس نے عبدالرزاق کو شکست دے کر اپنا علاقہ واپس لے لیا اور دور دور تک ان کا نام و نشان مٹا دیا لیکن وہ جلد ہی محلاتی سازش کا شکار ہو گیا۔ ۲۹۲ھ میں ربیع بن سلیمان نے اس کو قتل کر دیا۔

”یحییٰ بن ادریس بن عمر، یحییٰ بن قاسم کے بعد فاس کا بادشاہ بنایا گیا۔ اس نے عدل، علم، فضل اور حکومت میں وہ مرتبہ پایا کہ اس سے قبل اور بعد اس کے گھرانے میں کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ عالم، فقیہ، حافظ حدیث، خوش بیان، دین دار اور پرہیزگار شخص تھا۔ اقصائے مغرب پر کمال شان و شوکت سے حکومت کرتا رہا۔“ (۳۸)

یہ وہ دور تھا جب فاطمین مصر کی سلطنت مراکش تک پھیل رہی تھی۔ ان کے سپہ سالار مصالحہ نے فاس پر چڑھائی کر دی، یحییٰ ہزیمت یاب ہوا۔ اس نے فاطمیوں کی اطاعت کر لی اور فاس کا محدود علاقہ اس کے قبضہ میں رہ گیا مگر جلد ہی وہ بیدخل کر کے امیلا کی طرف بھاگ دیا گیا جہاں وہ کسمپرسی کی موت مر گیا اور اس کے ساتھ ہی بنی ادریس کا خاتمہ ہو گیا۔

بنی ادریس بلا وریف و غمارہ جا کر پناہ گزین ہوئے جہاں انہوں نے اپنی چھوٹی سی حکومت قائم کر لی۔ انہیں میں سے بنی حمود بھی تھے جنہوں نے ۴۰۳ھ میں بنی امیہ کے بعد اپنی حکومت قائم کی تھی مگر ان کے شیعہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ شاید انہوں نے اندلس کے ماحول میں مصلحتاً شیعیت کا اعلان نہ کیا ہو۔

سلطنت ادریسیہ کے تیسرے حکمران نے اپنی سلطنت کے نو حصوں میں تمام عزیز و اقارب کو حکمران بنایا تھا جو نسلاً بعد نسل فاس کے مرکز سے متوسل رہ کر حکومت کرتے آئے تھے۔ اس طرح ایک خاندان بہت سے حصوں میں بٹ کر سارے ملک میں پھیل گیا تھا۔ انتزاع سلطنت ہونے پر مختلف لوگوں کی چھوٹی چھوٹی طاقتیں ابھرتی رہیں۔ ۳۱۳ھ میں حسن بن محمد بن قاسم بن ادریس (حجام) نے فاس پر قبضہ کر لیا مگر ۳۱۵ھ میں فاطمیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہو گیا۔

بنی ادریس کچھ توریف کی طرف چلے گئے اور کچھ پہاڑوں میں جا چھپے تھے۔

دار الحکومت فاس میں منتقل کر دیا۔ اسی زمانے میں اس نے خارجیت کا استیصال کیا اور بیروں کی ایک بڑی تعداد کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ اس کی حکومت شروع ہی سے خود مختار رہی تھی۔ اب اس نے اپنی سلطنت کا علیحدہ سکہ بھی ضرب کرایا اور بے شمار دنیاوی اور دینی کام کر کے ۳۴ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

محمد بن ادریس ۲۱۳ھ میں باپ کے مرنے پر تخت نشین ہوا اس نے اپنی سلطنت کو نو حصوں میں تقسیم کر دیا چند بھائیوں اور بھتیجیوں کو حکمران بنایا، خود فاس کے مرکز کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔

کہنے کو مغرب اقصیٰ کی یہ سلطنت نو حصوں میں بٹی ہوئی تھی لیکن اتنی مضبوط شیرازہ بندی تھی کہ سب اپنے کو فاس کا ماتحت سمجھتے اسی لئے پورے ملک میں ہر طرف عدل و انصاف کا دور دورہ تھا، رعایا خوش حال اور راستے بے خطر تھے محمد نے رفاہ عام کے بہت سے کام کئے اور بڑے رعب و دبدبہ سے حکومت کر کے ۲۲۱ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

علی بن محمد نو سال کی عمر میں باپ کا جانشین ہوا چند ہی سال میں اس نے وفادار امراء کی مدد سے اپنے کو ایک لائق حکمران ثابت کر دیا اور ہر طرح محمد کی روایات کو برقرار رکھا۔ ۱۴ سال کی فرمانروائی میں اس نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ۲۳۴ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

یحییٰ بن محمد نے تخت نشین ہوتے ہی اصلاحات پر توجہ کی۔ فاس کی آبادی اور رونق اسکے عہد میں روز افزوں رہی، خوش حالی اور امن و امان کے سبب لوگ دوسرے مقامات سے آکر فاس میں آباد ہوئے۔ مسجد قرویین کی تعمیر اس کا کارنامہ ہے۔ ۲۵۰ھ میں اسکی وفات ہو گئی۔

یحییٰ بن یحییٰ کے خاتم و تعدی اور عیاشی سے بنی ادریس کی عظیم سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ اکابر حکومت نے تنگ آکر اس کو دالامارہ سے نکال دیا۔ اس نے بھاگ کر عدۃ اللاندلس میں پناہ لی اور اس صدے سے اسی رات مر گیا۔ عامل ریف علی بن عبداللہ اس کی بیوی کا باپ اور خاندان ادریس کے موقر افراد میں تھا۔ یحییٰ کے بجائے اس کو بادشاہ بنایا گیا مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے عبدالرزاق

۳۱۳ھ میں ابراہیم بن محمد کی سرکردگی میں قلعہ حجر النسر تعمیر کیا اور فاس اور اس کے ملحق مقامات کو فتح کیا۔

۳۳۷ھ میں اس کا انتقال ہونے پر قاسم بن محمد (کانون) اس کا جانشین ہوا جو ۳۶۳ھ میں فوت ہو لاس کا بیٹا حسن ۳۷۵ھ تک اس برائے نام حکومت کا والی ہوا پھر امویوں کے ہاتھوں مارا گیا اور یہ علاقہ سلطنت اندلس میں شامل ہو گیا۔ یہ چھوٹی سی حکومت سلطنت اور یسپہ کی عظیم سلطنت کے باقیات الصالحات میں تھی جو حقیقتاً چوتھی صدی ہجری کی دوسری دہائی میں ختم ہو چکی تھی۔ ۳۱۹ھ میں عبدالرحمن الناصر نے افریقہ پر چڑھائی کر کے مراکش کا بڑا حصہ فتح کر لیا تھا اور ادریسی شہزادوں کو قرطبہ لے آیا تھا اور عملی طور پر مغربی مراکش ہسپانوی خلیفہ کے قبضے میں اور مشرقی مراکش مصر کے فاطمی خلیفہ کے زیر تسلط آ گیا۔ (۳۹)

سلطنت ادریسیہ کے عروج و زوال کے مابین ڈیڑھ سو برس کا دورانیہ ہے اس مدت میں انہوں نے کتنی ہی معاشی، تمدنی اور وفاہی اصلاحات کیں۔ ادریسیوں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ نیم وحشی انسانوں کو انسان بنایا۔ وہاں کے رہنے والوں نے اسلام کا نام تو سنا تھا مگر وہ اسلام ماضی کے فاتحین کا مسخ شدہ تھا، بنی ادریس نے مراکش سے دور دراز علاقوں تک صحیح اسلام کی تصویریں پیش کیں اور خانوادہ رسالت کا ایسا تعارف کرایا کہ آج تک سبلماسہ اور دوسری صحرائی بستیوں میں آل رسول موجب برکت تصور کی جاتی ہے۔

یہ سلطنت کب کی ختم ہو چکی ہے مگر اس کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں..... اس کو بنی ادریس کا کارنامہ ہی کہنا چاہئے کہ ظہور مہدی کا تصور بربروں کے ذہن میں استنہ پختہ ہو گیا تھا کہ اس کے بعد مہدیت کے بیشتر وعوید اسی سر زمین میں پیدا ہوئے۔

### افریقہ پر ایک نظر

عرب و عراق کی طرح مصر و مراکش بھی شروع ہی سے مسلمانوں کی باہر نبرد آزمائی سے دوچار رہے۔ سلطنت عباسیہ کے عروج میں افریقہ کا گورنر ابراہیم بن اغلب تھا جس کو ہارون رشید کی طرف سے ایک باجگزار بادشاہ کے سے

اختیارارت حاصل تھے کیونکہ اس خاندان نے بنی امیہ کے خلاف ابو مسلم خراسانی کا ساتھ دیا تھا۔ اغلب بن سالم یقیناً ابو مسلم کی طرح محب اہل بیت تھا لیکن اس کی اولاد دوسروں کی طرح وقت کے دھارے پر چل پڑی تاہم وہ مذہبی معتقدات میں اتنے کڑے تھے کہ مصر کے ابن طولون کی طرح اولاد فاطمہ کے خون سے محلوں کے در و دیوار کو رنگین بنا دیتے اور زندانوں کو شمعان علی کی لاشوں سے پاٹ دیتے پھر بھی اول و آخر وہ عباسی ہی تھے۔

شمالی افریقہ کو جغرافیائی حیثیت سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: مصر و مراکش، مراکش کے تین حصے تھے۔ مصر سے ملحق طرابلس اور تیونس کا علاقہ جس کا پایہ تخت قیروان تھا، درمیان میں الجزائر جس کا مرکزی مقام تلمسان تھا، بالکل مغربی حصے کا دار الحکومت سبلماسہ تھا۔

انہیں تین حصوں میں اوقات مختلف میں حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ حتیٰ کہ تیسری صدی کے آخری عشرے میں سلطنت فاطمین کی داغ بیل پڑ گئی۔

jabir.abbas@yahoo.com



### فاطمی تحریک

محمد بن اسماعیل کی تحریک امامت کا آغاز امام جعفر صادق کی وفات کے بعد سے ہوتا ہے اور وہ جماعت اس کی داعی ہے جس نے امام موسیٰ کاظم کی امامت کو تسلیم نہیں کیا اور اسماعیل کے بیٹے محمد کو اپنا امام بنایا۔ یہ تحریک کیونکر شروع ہوئی؟ اس کا کچھ سچہ نہیں چلتا لیکن تاریخ اس کی شاہد ضرور ہے کہ خلافت عباسیہ سے محمد کا کچھ تعلق ضرور تھا اور جب دربار بغداد سے محمد کی طلبی ہوئی اور وہ مدینہ سے جانے لگے تو امام موسیٰ کاظم نے ان کو نصیحت کی تھی کہ وہ اپنی زبان کو خاندان کے خلاف استعمال نہ کریں۔ ہارون رشید سے محمد کی کیا گفتگو ہوئی اور طلبی کی غرض کیا تھی؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن اس کے بعد عملاً امامت کی یہ تحریک جز پکڑنے لگی لیکن خفیہ خفیہ اور بہت احتیاط کے ساتھ لہذا انہیں امام مکتوم یا امام مستور کہا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ امامت محمد بن احمد تک پہنچی جنہیں اپنی ہر دل عزیزی کے سبب حبیب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ تحریک کے راز میں رکھنے کا سبب اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ اسے عوام یا حکومت کی طرف سے خطرہ تھا۔ حبیب حمص کے قریب سلمیہ میں رہتے تھے۔ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہیں اتنے وسائل میر آگئے کہ وہ چہار جانب اپنے داعی بھیجنے لگے۔ یمن، پیامہ، بحرین، سندھ، مصر اور مرقش کوئی خطہ ایسا نہ تھا جہاں اسماعیلی داعی نہ پہنچے ہوں۔ انہیں میں ایک ابو عبد اللہ الحسین بن محمد بن زکریا المعروف بہ ابو عبد اللہ الشعی بھی تھا۔ دو داعی حلوانی اور سفیانی مرقش بھیجے تھے جنہوں نے الجزائر میں قبائل کتامہ کو اسماعیلی بنایا۔

یمن میں ابو القاسم حسین بن فرخ بن حوشب نے ایک جمعیت فراہم کر کے ۲۷۰ھ میں بعض علاقے سکڑ کر لئے تھے اور صنعا پر قابض ہو گیا تھا اس تحریک میں بھی نعرہ حقوق آل محمد کا لگایا جاتا مگر تان محمد الجبیب پر جا کر ٹوٹتی تھی۔

اس اثناء میں حلوانی اور سفیانی مرقش میں انتقال کر گئے اور ان کی جگہ

ابو عبد اللہ الشعی کو بھیجا گیا جو ۱۵ ربیع الاول ۲۸۸ھ کو کتامہ کے شہر انجان پہنچے، امامت اہل بیت کا اعلان کر دیا اور کئی علاقے فتح کر لئے۔ ابراہیم بن احمد غلبی کی طرف سے سد باب کے لئے ایک فوج بھیجی گئی جس نے ۲۸۹ھ میں بمقام مالوت انہیں شکست دی لیکن جلد ہی اس نے مسیدہ کے معرکے میں غلبیوں کو مار بھگایا۔ ابراہیم نے تیسری بار ایک تازہ دم لشکر مقابلے پر بھیجا مگر اس نے بھی شکست کھائی الشعی نے اس کے بعد ارد گرد کے تمام شہروں پر قبضہ کر لیا اور اعلان کر دیا کہ ظہور مہدی کا وقت آگیا ہے۔

اس دوران محمد الجبیب کا انتقال ہو چکا تھا اور عبید اللہ ان کے جانشین ہو چکے تھے۔ الشعی کی طرف سے انہیں ان حالات کی اطلاع ملی تو وہ اپنے بیٹے ابو القاسم محمد نزار اور دوسرے لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ الشعی کا بھائی ابو العباس سودا گروں کے بھیس میں آگے آگے تھا وہ ابراہیم کے قاتل مقام زیادہ اللہ کے ہاتھوں قیروان میں گرفتار ہو گیا، عبید اللہ دوسرے راستے سے بھماسہ پہنچے تو وہاں کے حاکم السبع نے ان کو پکڑ دیا۔

الشعی سطیف پر قبضہ کر چکے تھے پھر انہوں نے زیادہ اللہ کی چالیس ہزار فوج کو شکست دی اور علاقوں پر علاقے فتح کرتے چلے گئے پھر زیادہ اللہ کو مکمل شکست دے کر رقادہ پر قبضہ کر لیا، ابو العباس کو قید سے چھڑایا اور بھماسہ پر حملہ آور ہو گئے۔ ۲۸۹ھ میں رقادہ واپس ہوئے تو انہوں نے رقادہ اور قیروان میں عبید اللہ کی بیعت لی۔ اس طرح بنی اغلب بنی رستم اور بنی مدرار کی حکومتیں ختم ہو کر ان کی جگہ عبید اللہ المہدی کی سلطنت قائم ہو گئی جو بحر ظلمات سے صحرائے شام تک اور بحیرہ روم سے افریقہ کے صحرائے اعظم تک پھیل گئی۔

شروع شروع میں قیروان کے قریب مہدیہ اس سلطنت کا دار الحکومت قرار پایا۔ ۳۵۸ھ میں جب مصر فتح ہوا تو قاہرہ آباد کیا گیا اور مرکز سلطنت وہاں منتقل ہو گیا۔



## خلفائے فاطمیین

### عبید اللہ المہدی باللہ

عبید اللہ المہدی باللہ نے تخت پر بیٹھتے ہی بنی کتامہ کو بڑے بڑے عہدے دئے اور جاگیریں عطا کیں پھر جابجا دعائی روانہ کئے۔ طرابلس اور صقلیہ میں اپنے گورنر مقرر کئے۔ وقت کے فصل سے مسلمانان صقلیہ نے ۳۱۳ھ تک کلیریہ یعنی جنوبی اطالیہ میں کئی شہر ٹورنٹو، اوٹرنٹو وغیرہ فتح کر لئے اور لومبرڈی پر حملہ کر کے خیران اور ایرجہ کو فتح کر لیا پھر برابران علاقوں کے قبضہ کے لئے لڑتے رہے۔

الشیعی کا بھائی ابو العباس مہدی کو شاہ شطرنج کی طرح رکھنا چاہتا تھا اس نے اپنے اختیارات میں کمی پا کر بعض سرداران کتامہ سے سازش کی اور بدقت تمام اپنے بھائی ابو عبد اللہ کو ملا کر مہدی کے قتل کے درپے ہو گیا مگر راز کھل گیا اور مہدی نے دونوں بھائیوں کو قتل کرادیا اس کے بعد مشرق میں برقہ اور مغرب میں تاہرت بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔ ۳۰۱ھ اور ۳۰۷ھ میں قایم بن مہدی نے مصر پر حملہ کر کے سکندریہ اور مصر کے بعض علاقہ فتح کئے مگر مقتدر عباسی نے مونس خادم کی فوج بھیج کر اپنے علاقوں کو آزاد کرالیا۔ ۳۰۳ھ سے ۳۰۶ھ تک مہدی باللہ نے خارجیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے قیروان کے قریب ایک مضبوط شہر اور مستحکم قلعہ تعمیر کرایا اس کا نام مہدیہ رکھ کر دار الحکومت قرار دیا۔ ۳۰۵ھ میں فاس کے ادریسی بادشاہ کو مطیع کیا اور ۳۰۹ھ میں اسکے ملک کا الحاق کر لیا پھر حاکم سجلماسہ کی بغاوت کو فرو کیا۔ ۳۱۵ھ میں مغرب کے علاقہ میں بنی فاطمہ کی حکومت کمزور پڑی تو ابو القاسم محمد نے چرمہائی کر کے مختلف سرکش قبیلوں کو مغلوب کیا اور ریف پر حملہ کر کے کور فتح کر لیا پھر جرادہ کے حاکم حسن بن ابی العیش ادریسی کو مطیع کیا۔

عبید اللہ کے عہد کا آخری واقعہ یہ ہے کہ فاس و مغرب کا صوبہ دار اندلس کے بنی امیہ سے مل گیا تھا۔ اس نے فاطمیوں کا نام خطبہ سے نکال کر بنی امیہ کا نام داخل کر دیا تھا۔ مہدی نے اپنے سپہ سالار احمد بن بصلین کو اس کی سرکوبی کو روانہ کیا جس نے باغی گورنر کو شکست دے کر صحرائی طرف بھگا دیا اور تمام مغرب الاقصیٰ کو مسخر کر کے فاطمی سلطنت میں شامل کر دیا۔ اس کے بعد مہدی اندلس فتح کرنے کی تدبیر میں تھے کہ ملک الموت نے تمام آرزوں کا خاتمہ کر دیا۔

مہدی نے اپنی سلطنت اپنی حیات ہی میں سرحد مصر سے بحر ظلمات اور جزائر خالدا (کرنڈ) تک اور بحیرہ روم سے صحرائے اعظم افریقہ تک پھیلا لی تھی یہ حکومت زبردست اور فعال تھی۔ سیوطی جیسا کٹر سنی معترف ہے کہ عبید اللہ نے داد گستری اور فیاضی کے ساتھ سلطنت کی۔ لوگ ان کی طرف جھکے ہوئے تھے۔

### محمد القائم بامر اللہ

محمد القائم بامر اللہ بڑے جنگ آزمودہ اور ماہر سپاہی تھے۔ اکثر جنگوں میں خود فوج لے کر جایا کرتے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ سید امیر علی لکھتے ہیں کہ یہ پہلا فاطمی خلیفہ ہے جس نے بحیرہ روم پر حکومت و اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے جہازوں کا ایک زبردست بیڑہ تیار کیا۔ ۳۲۲ھ میں ایک شخص ابن طاہوت نامی نے مہدی کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کر کے طرابلس کا محاصرہ کر لیا مگر اس کا جھوٹ کھل جانے پر اسی کے آدمیوں نے اس کا سر کاٹ کر قائم کے پاس بھیج دیا۔

۳۲۳ھ میں پھر مغرب الاقصیٰ میں بغاوت ہو گئی، ۳۲۴ھ میں قائم نے اس بغاوت کو فرو کیا اور ریف کے بنی ادریس کو مطیع کیا۔ ایک عرصے سے اطالوی ڈاکو فاطمی خلیفہ کی بندرگاہوں پر لوٹ مار کرتے تھے لہذا قائم کے سپہ سالار نے جنوبی اطالیہ کو مقام گیٹا تک تاخت و تاراج کر ڈالا اور مارتا دھاڑتا شہر جنوہ تک جا پہنچا، شہر کو فتح اور بہت سے اطالیوں کو گرفتار کر لیا۔ شہر جنوہ ایک عرصے تک بنی فاطمہ کے قبضے میں رہا۔ پھر لومبرڈی کا ایک حصہ بھی مطیع کیا گیا۔ اگر قایم کی اپنی سلطنت میں ابو یزید خارجی کی زبردست بغاوت شروع نہ ہو جاتی جس میں ان کی



تمام دولت اور فوج صرف ہو گئی تو یقیناً وہ تمام ملک اٹالیہ کو مسخر کر لیتے پھر بھی اس بیڑے نے واپسی کے وقت سارڈینا پر حملہ کر کے فرنگیوں کو کئی بار شکست دی پھر قرطیسیا کا رخ کیا جو شام کے ساحل پر ہے۔ یہاں اس نے عباسیوں کے جہازوں کو جلا دیا اور بہت سامان غنیمت لے کر مہدیہ کی طرف مراجعت کی۔

۳۲۳ھ میں قایم کے خادم زیدان نے اسکندر یہ فتح کر لیا مگر بعد میں ایشیا والی مصر کی فوج نے آکروہاں سے نکال دیا۔ ۳۲۵ھ سے ۳۲۹ھ تک اہل صقلیہ نے سخت بغاوت کی اور متواتر شکستیں کھانے کے بعد ۳۲۹ھ میں انہوں نے قسطنطنیہ کے بیڑے کو مدد کے لئے بلایا مگر صقلیہ کے فاطمی گورنر نے ۳۲۸ھ میں قندھار اور فتح کر کے بحر جنت کا محاصرہ کر لیا پھر قایم کا بیڑا تونس سے جا کر رومی بیڑے کے مقابلے میں ڈٹ گیا اور ۳۲۹ھ میں اس کو تباہ کر ڈالا۔ یہ حالات دیکھ کر اہل بحر جنت نے اور ان کے بعد تمام اہل صقلیہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور تمام جزیرہ میں امن قائم ہو گیا۔

سب سے بڑی بغاوت جو خلیفہ قایم کے زمانہ میں ہوئی وہ ابو یزید خارجی کی بغاوت تھی۔ ابو یزید تو ذریعہ میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے نشوونما پائی تھی اور خوارج نکاریہ کی صحبت میں، جسکو صفریہ بھی کہتے ہیں، انھیں کا مذہب اختیار کر لیا۔ پھر تہرت میں آکر لڑکوں کو پڑھانے لگا۔ وہ دوسرے مذہبوں کی تکفیر کرتا اور سلطان پر خروج کرنا مباح بناتا تھا۔ ۳۱۶ھ میں وعظ کہنا شروع کیا اور بہت سے لوگوں کو اپنا پیرو بنالیا پھر اس نے مہدی کی وفات کے بعد جبل اور اس میں خروج کیا اور یسوع المومنین لقب اختیار کیا، ناصر اموی بادشاہ اندلس کا خطبہ پڑھ دیا۔ برابر کے بہت سے قبیلے اس کے ساتھ ہو گئے۔ چونکہ وہ سبزہ گدھے پر سوار ہوا کرتا تھا اس لئے صاحب الحمار کے نام سے بھی مشہور ہوا۔ ۳۲۲ھ میں اس نے تہسبہ مراجعت اور اربس اور سیسبہ فتح کر لئے۔

قایم کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے رقادہ اور قیروان کی طرف فوجیں روانہ کر دیں اور میسور خواجہ سرا کو ابو یزید کی سرکوبی کے لئے متعین کیا پھر ایک دوسری فوج اپنے خادم بشری کے ساتھ باجہ کی طرف بھیجی۔ ابو یزید نے بشری کو شکست

دے کر تونس کی طرف بھگا دیا اور باجہ میں داخل ہو کر مردوں بچوں کو قتل اور عورتوں کو اسیر کر لیا پھر تونس پر قبضہ کر لیا اور قیروان کی طرف بڑھا مگر بشری کے طلبہ نے ابو یزید کے طلبہ کو شکست دے کر ۴ ہزار قتل اور ۵ سو گرفتار کر لئے اس کے بعد ابو یزید نے ۳ لاکھ فوج کے ساتھ رقادہ اور پھر صفر ۳۳۳ھ میں قیروان فتح کر لیا۔ میسور نے شکست کھائی اور مارا گیا اسکے بعد ابو یزید کی فوج نے سوسہ بھی فتح کر لیا اور اس کے فوجی دستوں نے تمام افریقہ میں قتل و غارت و آتش زنی کا بازار گرم کر دیا۔ اس کے بعد اس نے مہدیہ کا محاصرہ کر لیا شہر کی ناکہ بندی کر دی، چھ مختلف حملوں میں سخت شکستیں کھاتا رہا۔

یہاں تک کہ ۳۳۴ھ کے شروع میں اس کے آدمیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ منتشر ہو گئے، صرف تیس آدمی اس کے ساتھ رہ گئے۔ صفر ۳۳۴ھ میں وہ قیروان کی طرف مراجعت کر گیا۔ شہروں اور قریوں کے لوگوں نے ابو یزید کے آدمیوں کے متفرق ہونے کا حال سن کر اس کے عاملوں کو قتل کر ڈالا، بعض کو پکڑ کر مہدیہ بھیج دیا اس کے بعد قایم نے اپنے گورنر روانہ کر دیئے۔ اہل سوسہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا مگر ابو یزید نے قیروان میں پہنچ کر پھر جمعیت کثیر بہم پہنچائی اور ان کو یہ حکم دے کر شہروں کی طرف روانہ کیا کہ قتل کرو، قید کرو، لوٹو جلاؤ، برباد کرو۔ چنانچہ اس کے لشکر نے ۲۰ صفر ۳۳۴ھ کو تونس میں داخل ہو کر شہر کو لوٹ لیا اور مردوں کو قتل کیا اور عورتوں بچوں کو اسیر کر لیا پھر مسجدوں کو بھی مہدم کر ڈالا۔ ربیع الاول ۳۳۴ھ میں قایم کی فوج جا پہنچی اور علی بن حمدون نے ابو یزید کی فوج کو پسپا کر کے تونس فتح کر لیا لیکن اسی اثناء میں ابو یزید کے بیٹے ایوب نے باجہ فتح کر لیا اور تونس پر حملہ کیا مگر قایم کی فوج نے مار مار کر قیروان کی طرف بھگا دیا۔ اس کے بعد علی بن حمدون نے کئی لڑائیوں میں اسے شکستیں دے کر تیجست اور باغایہ بھی چھین لیا۔ جمادی الاخر ۳۳۴ھ میں ابو یزید نے لشکر جمع کر کے سوسہ کا سخت محاصرہ کر لیا، یہاں قایم کا لشکر کثیر موجود تھا، روز لڑائی ہوتی رہی جس میں کبھی ایک کی فتح ہوتی، کبھی دوسرے کی۔ غرض سوسہ کا محاصرہ جاری تھا کہ ماہ شوال ۳۳۴ھ میں قایم کا انتقال ہو گیا۔



### اسماعیل المنصور باللہ

اسماعیل المنصور باللہ نے جب تک ابونزید کے غرض سے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیا قایم کی وفات کو چھپائے رکھا۔ خلیفہ کا لقب بھی اختیار نہیں کیا، سکہ و خطبہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس اثناء میں فرمانوں اور احکامات پر اپنے دستخطوں میں امیر اسماعیل و سید لکھتے رہے۔

اسماعیل بڑے شجاع، بہادر، عقیل، مستعد، مستقل مزاج، خوش خلق، ادیب لیب، شاعر مقرر، مبلغ اور نہایت منظم تھے، فی البدہہ خطبہ دیتے اور دریا کی روانی کی طرح بولتے تھے۔

ابونزید کی بغاوت سے سارے ملک میں تہلکہ تھا، ساحل بحر کے چند قلعہ بند شہروں اور مہدیہ کے علاوہ کچھ بھی قبضہ میں نہ رہا تھا۔ اندلس کے اموی خلیفہ ناصر نے مغرب الاقصیٰ پر قبضہ کر لیا تھا، اسے میں پھر سلطنت کو سنبھالنا اور اپنے آبائی ملک پر قابض رہ جانا اسماعیل کی لیاقت و قابلیت کا بڑا امتحان تھا لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔

قایم کی وفات کے وقت ابونزید سوسہ کا محاصرہ کئے پڑا تھا اور اہل سوسہ اس کو توڑنے میں زور مار رہے تھے، مگر انہیں کوئی کامیابی نہ ہو رہی تھی۔ اسماعیل نے بادشاہ ہوتے ہی ان کی مدد پر فوج روانہ کی۔ اس فوج نے سوسہ کی فوج کے ساتھ مل کر ابونزید کی فوج سے ایسی جنگ کی کہ وہ بدحواس ہو کر بھاگ نکلا۔ اس کے ہمت سے آدمی مارے گئے پھر اس کی چھاؤنی لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ ابونزید فرار ہو کر قیرواں پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اسے گھسنے نہ دیا اور اس کے عامل کو نکال دیا۔ ناچار آخر شوال ۳۳۴ھ میں وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قیرواں سے دو دن کی راہ پر سببہ آیا۔ ۲۴ شوال کو اسماعیل قیرواں میں پہنچے تو ابونزید نے پھر ایک جمعیت اکٹھی کر لی تھی، قیرواں پر چڑھائی کر دی، لڑائی ہوئی، پہلے دن شاہی فوج فتحیاب رہی مگر دوسرے دن شکست کھا کر مہدیہ اور سوسہ کی طرف بھاگ نکلی۔ پھر بادشاہ نے بذات خاص نہایت شجاعت سے جنگ کی اور اتنے آدمی قتل کئے کہ

ابونزید کا جی چھوٹ گیا۔ اس نے ذیقعد ۳۳۴ھ میں کوچ کا نثارہ بجا دیا مگر جلد ہی واپس آیا۔ ۱۵ محرم کو نہایت شدید جنگ کے بعد ابونزید شکست یاب ہوا، مقام فتح پر خلیفہ نے منصور یہ آباد کیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔

ربیع الاول ۳۳۵ھ میں منصور ابونزید کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اسے دباتا چلا گیا، جنگل، بیاباں، پہاڑ، وادی اور دلدلوں کی کچھ پروانہ کی بہاں تک کہ اس کے پیچھے بلاد سودان کے سے ویرانے میں پہنچ گیا، جہاں پانی کی ایک مشک ایک دینار میں ملتی تھی۔ سخت محنت کے باعث اس کو بیماری نے آگھیرا اور ناچار پلٹ کر کچھ عرصہ تک عمرت میں مقیم رہا، ابونزید نے موقع پا کر سیدہ کا محاصرہ کر لیا منصور صحت یاب ہونے کے بعد رجب ۳۳۵ھ کو پھر ابونزید کی طرف روانہ ہوا اور وہ محاصرہ چھوڑ کر قلعہ کتامہ میں مستحضر ہو گیا، منصور نے پہچان چھوڑا، ۲۵ محرم کو سخت لڑائی کے بعد ابونزید مارا گیا اور مصر کا خلیفہ سجدہ شکر بجالایا۔

ابونزید کی مہم سے فارغ ہو کر ۳۳۶ھ میں منصور نے مغرب الاقصیٰ پر چڑھائی کی جہاں کے گورنر نے ابونزید کی شورش کے زمانہ میں بغاوت کر کے اندلس کے اموی خلیفہ کا خطبہ پڑھ دیا تھا۔ خلیفہ نے باغی گورنر کو بھگا دیا اور تباہت فتح کر لیا اور جمادی الاول ۳۳۶ھ میں قیرواں کی طرف مراجعت کی۔ ابونزید کی سرکشی کے زمانے میں ۳۳۵ھ میں اہل صقلیہ نے بھی بغاوت کی تھی اور رومیوں نے بھی۔ وہ رومیہ دینا بند کر دیا تھا جس پر صلح قرار پائی تھی۔ منصور نے ۳۳۶ھ میں ابولفتح الحسن بن علی کلبی کو صقلیہ کا گورنر بنا کر روانہ کیا۔ اس نے باغیوں کی قرار واقعی سرکوبی کی۔ رومیوں کے راہب نے بھی ڈر کے مارے تین سال کا نہ دیا ہوا جزیہ داخل کر دیا مگر قسطنطنیہ کے بادشاہ نے سمندر کی راہ سے بہت سی فوج صقلیہ کی طرف روانہ کر دی جو شہر اور نت میں اتر گئی یہ خبر سن کر منصور نے بھی ایک بیڑا جہازوں کا حسن کلبی کی مدد کے لئے روانہ کر دیا۔ اپنی فوج کو شاہی فوج کے ساتھ ملا کر حسن قلور یہ پر چڑھ گیا اور رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ رومی بغیر بڑے بارہ کی طرف بھاگ گئے۔ حسن نے فوجی دستے قسور یہ میں قس و غارت کرنے کے لئے پھیلا دیئے اب جاڑا آگیا تو حسن نے مسینی کی طرف مراجعت



بالا تختصار المعز وہ عظیم فرمانروا تھا جس کی صلاحیت و تدبیر نے اس کی سلطنت کو عظیم بنا دیا۔

آغاز حکومت میں انہوں نے جبل اور اس اور باغیہ کی بغاوتوں کو فرد کیا۔ اندلس کے اموی خلیفہ ناصر لدین اللہ نے ایک ایسا تجارتی جہاز بنوایا تھا جس کی اس وقت تک کوئی مثال نہ تھی۔ ۳۴۲ھ میں اس جہاز کو بحر روم کے ساحلی شہروں سے تجارت کے لئے روانہ کیا گیا۔ اتفاق سے اسے صقلیہ کا ایک جہاز مل گیا جس پر گورنر صقلیہ کا قاصد کچھ خطوط لے کر المعز کی خدمت میں جا رہا تھا، اندلسی جہاز نے صقلیہ کے جہاز کو لوٹ لیا اور المعز کے نام کے خط اور تمام مال و اسباب لے کر فرار ہو گیا۔ المعز کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے بھی ایک بیڑا تیار کرایا اور اس کو حسن بن علی گورنر صقلیہ کی سرکردگی میں اندلس پر حملے کے لئے روانہ کر دیا۔

اس بیڑے نے مریہ کی بندرگاہ میں داخل ہو کر جتنے جہاز وہاں موجود تھے، سب کو پھونک دیا اور اس بڑے جہاز کو بھی گرفتار کر لیا پھر خشکی پر زبردست غارت گری کی اور مال غنیمت لے کر واپس ہو گیا۔

اس کے جواب میں ۳۴۵ھ میں خلیفہ ناصر نے اپنے امیر البحر غالب کی ماتحتی میں ستر جہازوں کا بیڑا بھیجا جو افریقہ کی بعض بندرگاہوں پر لوٹ مار کر کے چلا گیا، پھر بحری لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسی دوران مغرب الاوسط کے گورنر یعلیٰ بن محمد یفرنی نے مصر سے بغاوت کر کے اموی خلیفہ کی اطاعت کر لی اور مغرب الاقصیٰ کے بعض حاکموں نے بھی اندلسی خلیفہ کا خطبہ جاری کر دیا۔ اس پر فاطمی خلیفہ نے اپنے وزیر اور سپہ سالار اعظم ابو الحسن جوہر بن عبد اللہ کو ان سب کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ جوہر نے مغرب الاوسط پہنچ کر باغیوں کو قتل کیا اور ۳۴۸ھ میں بحر اوقیانوس کے ساحل تک کا پورا علاقہ مسخر کر لیا۔ اس طرح ۳۴۸ھ ختم ہوتے ہوتے حدود مصر سے ساحل بحر تک کے تمام ممالک پر فاطمیین کا قبضہ ہو گیا۔

کی۔ گرمی شروع ہوتے ہی حسن نے پھر قلیوریہ پر دھاوا کیا اور یوم عرفہ ۳۴۰ھ کو بمقام جراحہ رومیوں کو سخت شکست دی۔ قسطنطین بادشاہ روم نے مجبور ہو کر صلح کر لی اور حسن ریو کی طرف واپس ہوا تو شہر کے وسط میں اس نے نہایت عالیشان مسجد تعمیر کرا دی۔

شوال ۳۴۱ھ کو خلیفہ منصور کا انتقال ہو گیا اور ان کے صاحبزادے المعز لدین اللہ خلیفہ ہوئے تو حسن اپنے بیٹے احمد کو صقلیہ کا گورنر بنا کر خود خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

### ابو تمیم المعز لدین اللہ

اس خلیفہ کو مورخین نے دانا، مستعد، شجاع، سخی، عادل، کریم الاخلاق، سائنس و فلسفہ کا ماہر، مربی علوم و فنون، صائب الرائے، واقف قوانین ملک و ملت، ماہر نجوم و ہیئت اور سرپرست اہل علم تحریر کیا ہے اور مختصر لفظوں میں مغرب کا مامون قرار دیا ہے۔

اس کے عہد میں شمالی افریقہ کا تمدن عروج پر پہنچ گیا۔ عوام خوشحال اور فارغ البال تھے۔ مجموعی طور پر امن و امان تھا، اندرون ملک فساد اور ہنگامے سختی سے دبا دئے جاتے، نظم حکومت مستحکم تھا۔

پورے ملک کا نظام اصول پر قائم تھا، کام کے قواعد و ضوابط مقرر تھے۔ صوبے ضلعوں میں منقسم تھے اور ہر ضلع میں لائق و متدین افسر متعین تھے۔ استقرار امن کے لئے ایسے سپاہی بھرتی کئے گئے تھے جو ضرورت پڑنے پر فوج میں شامل کئے جاسکیں۔ منظم فوج اس کے علاوہ تھی جو پوری طرح تربیت یافتہ تھی۔

”المعز لدین اللہ بہت نرم دل اور نرم مزاج تھے۔ خدا نے ایک خاص شعور اور لیاقت انہیں عطا کی تھی۔ بعض سردار، جوان کے بزرگوں کے خون کے پیاسے رہے تھے، وہ خواہ ان سے محبت نہ کرتے ہوں مگر دوست ضرور تھے۔ المعز بھی ان سے بڑی مہربانی سے پیش آتے۔ اس طرح انہوں نے دشمنوں کو بھی اپنا حامی اور مددگار بنالیا تھا۔“ (ابن خلدون)



۳۵۱ھ میں جزیرہ قریطش کے مسلمانوں نے رومیوں کے خلاف المعز سے مدد مانگی۔ اس جزیرے میں ابو حفص عمر بن عثیب بلوطی کا خاندان حکمران تھا جس کو کسی زمانے میں حکم بن ہشام نے اندلس سے جلاوطن کیا تھا اور وہ اس جزیرے کو رومیوں سے چھین کر اس کا حکمران بن گیا تھا۔ ۳۵۱ھ میں جب رومیوں نے اس پر حملہ کیا تو ان لوگوں میں قوت مدافعت نہ تھی۔ انہوں نے المعز سے رجوع کیا اور المعز نے ایک لشکر روانہ کر دیا جس سے رومیوں کی جنگ ہوئی، وہ ہزیمت یاب ہوئے اور ان کی ایک تعداد گرفتار ہو گئی لیکن مصری فوج کے واپس ہوتے ہی رومیوں نے اس جزیرے پر پھر قبضہ کر لیا۔

اس کی کسر المعز نے یوں پوری کی کہ صقلیہ میں رومیوں کے جو قلعے تھے ان سب پر قبضہ کر لیا اور رومیوں کو وہاں سے نکال دیا۔ صقلیہ میں حسن بن علی کلبی کا خاندان تقریباً سو برس سے آباد تھا اور جزیرے پر انہیں کی حکمرانی تھی جسے خلفائے فاطمین کی سرپرستی حاصل تھی۔ کلبی دور میں صقلیہ کو استنا عروج حاصل ہوا کہ وہ مستقبل کے قاہرہ کا پیش خیمہ بن گیا ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ مسجدیں، مدرسے، دارالعلوم، علوم و فنون کے مراکز کیا کچھ نہیں تھا۔ اس جزیرے میں ہر طرف چہل پہل، دن عید رات شب برات، پرمو کا طبی دارالعلوم بغداد اور قرطبہ کی نظیر پیش کیا کرتا تھا۔ جنوبی اطالیہ میں سلرمو کا مدرسہ شہرہ آفاق تھا۔

اس کے بعد ایک عظیم واقعہ پیش آیا۔ مصر قدیم کے بادشاہ کا فوراً خشییدی کے مرنے پر امراء نے گیارہ سال کے ایک بچے کو تخت نشین کیا اور اس کے نام سے عوام پر ستم رانی کرنے لگے۔ قحط و وبا کے بھگتے ہوئے لوگ ان تازہ مظلوم کو برداشت نہ کر سکے اور بعض اکابر نے المعز سے رجوع کیا۔ المعز نے ان کی خواہش پر ابوالحسن جوہر کو ایک لاکھ سوار اور بارہ سو مال کے صندوق دے کر روانہ کیا جس کو مقام جتیرہ پر نو عمر خشییدی بادشاہ بلوشاہ کی فوج نے روکا اور مقابلہ بھی کیا مگر شعبان ۳۵۸ھ کو انہیں عبرتناک شکست ہوئی۔

خشییدی بادشاہ گرفتار ہوا اور جوہر دارالسلطنت میں داخل ہو گیا پھر مصر

قدیم سے لگا ہوا ایک شہر آباد کیا جو قاہرہ معزینہ کہہ کر پکارا گیا اور جس کو فاطمین کا مرکز حکومت بنایا گیا۔ جوہر نے عباسی خلیفہ کا سکھ و خطبہ بند کر کے المعز بن اللہ کا خطبہ جاری کیا اور ایک سکھ ضرب کرایا، اذان میں "حی علی خیر العمل" داخل کرایا، نماز میں بسم اللہ باواز بلند کہنے کی ہدایت کی، نماز جمعہ میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقین کی تلاوت کا حکم دیا، خطبے میں آئمہ حاہرین کے اسمائے گرامی شامل کرائے اور فضائل اہل بیت بیان کرنے کی تاکید کی۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر اس نے جامع ازہر کی تعمیر شروع کرائی جو آج عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔

۳۵۹ھ میں پوپ یوحنا دہم نے جنوبی اطالیہ سے مسلمانوں کو نکلنے کا منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کے لئے اس نے قسطنطنیہ سے فوج طلب کی جو اطالیہ کے لشکر سے مل کر جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے لگی مگر اس کی یہ کوشش کارگر نہ ہوئی۔ متحدہ فوج کو منہ کی کھانی پڑی اور وہ اپنی راہ واپس ہو گئی۔

۳۶۲ھ میں المعز یوسف تلکین بن زیری کو اپنا قائم مقام بنا کر مصر قدیم کی طرف روانہ ہوئے اور ۵۰ رمضان کو قاہرہ میں داخل ہوئے۔ ۳۶۳ھ میں پہلی مرتبہ عید غدیر بڑی شان و شوکت سے منائی گئی۔

جوہر ۳۵۹ھ میں دمشق فتح کر چکا تھا اور وہاں فاطمی خلیفہ کا خطبہ جاری کرا چکا تھا۔ اب اس نے شام کے دوسرے علاقے مسخر کئے۔

پچھنے دو سال سے احساء کے قرمطی شام کے علاقے میں لوٹ مار کر رہے تھے اور ان کی طرف توجہ نہ دی جا سکی تھی۔ آخر ان کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ مصر پر بھی حملہ آور ہو گئے۔ المعز نے ایک لشکر بھیج کر ان کی گوشمالی کی۔ ایک تعداد قتل ہو گئی، باقی احساء کی طرف فرار ہو گئے۔

شعبان ۳۶۳ھ میں ایک ترکی سردار اسپتگین دمشق پر قابض ہو گیا۔ اس نے پھر عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری کرا دیا، المعز خود اس کی تادیب کے لئے روانہ ہوئے مگر بلہیس پہنچ کر انتقال کر گئے۔

کے اور مدینے میں پہلے ہی فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اس دوران



دوسرے مقامات پر بھی اس کا اجراء ہوا حتیٰ کہ خلیفہ کے وفات پانے کے وقت اسلامی دنیا کے بڑے حصے میں ان کی خلافت تسلیم کی جا چکی تھی۔

المعز بن اللہ کے لئے مورخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس نے ایسی عدالت و سخاوت سے حکومت کی جو کسی عظیم شہنشاہ کے شایان شان ہے۔ ایک بار پندرہ ہزار اونٹوں اور دس ہزار خچروں پر لدے ہوئے صندوق افریقہ سے آئے جن میں زرد جو اہر بھرے ہوئے تھے۔ المعز نے غزائی کو حکم دیا کہ سارے صندوق محفوظ کر لئے جائیں اور چند صندوق روز نکالے جائیں، ضرورت مندوں کو اجازت دی جائے کہ ہر ایک مٹھی بھر بھر کے نکال لے۔ اب یہ اس کی قسمت ہے کہ اس کی مٹھی میں جو کچھ آجائے، وہ اس کا ہے۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ بنی فاطمہ کی حکومت کے دوران وزارت ارباب قلم ہی کو ملتی رہی۔

ابو الفرج یعقوب بن یوسف بن کلس المعز کا وزیر تھا، ابو حنیفہ نعمان بن محمد بن منصور قیروانی قاضی القضاۃ۔ مقریزی رقم طراز ہے کہ المعز کا خطبہ ممالک مغرب، مصر و شام، عراق و حجاز وغیرہ میں پڑھا جاتا تھا۔

### ابو المنصور نزار العزیز بالله

وہ جواد، کریم، شجاع، دانشمند، حلیم و صابر، خوش خلق اور کثیر الخیر فرمانروا تھے۔ معافی کو انتقام پر ترجیح دینے والے، مغلوب پر رحم کرنے والے، دشمن کو نوازنے والے، حسن سیرت اور انصاف میں اپنے والد کے نقش قدم پر، عالم و فاضل، ادیب و شاعر، عید کے دن ان کے ایک بیٹے کا انتقال ہو گیا تو چند شعر کہے

ہم اولاد مصطفیٰ حاملان رنج و غم ہیں، صبر و ضبط کے گھونٹ پیتے رہتے ہیں، ہمارے مصائب و آلام بھی عجیب ہیں۔ اول و آخر آزمائش کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں، دنیا اپنی عیدوں کی خوشیاں مناتی ہے ہماری عیدیں ماتم میں گزرتی ہیں۔

العزیز کو عمارتیں بنانے کا بہت شوق تھا۔ مصر میں کتنی ہی عمارتیں ان کی یادگار ہیں۔ رعایا پرور تھے، ہر ایک کے لئے ملنے کی اجازت عام تھی، خونریزی کو

بالکل پسند نہ کرتے، شکار کے شوقین تھے، گھوڑے، کپڑے اور جواہر کے اعلیٰ درجے کے مبصر۔ ان کی سلطنت کی وسعت پہلے سے زائد تھی۔ حمص، حماہ، شیراز اور حلب بھی اس میں شامل ہو گیا تھا۔ محرم ۳۸۲ھ میں مغل بن مسیب عقیلی والی موصل نے اپنی سلطنت موصل، مدائن، کوفہ اور انبار وغیرہ میں ان کا سکھ و خطبہ جاری کیا۔ یمن میں بھی انہیں کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

یہ عظمت و شان مرتے دم تک باقی رہی۔ سلطنت کی حدیں ان کے زمانے میں دریائے فرات کے کنارے سے بحر ظلمات تک پھیلی ہوئی تھیں۔ عرب کا تمام مغربی حصہ منہائے یمن تک اس میں آتا تھا۔

العزیز بھی اپنے پیش روؤں کی طرح بنو کتامہ پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔ یہ قبیلہ فاطمین کے استقرار حکومت میں اساسی حیثیت رکھتا تھا پھر بھی فاطمی خلیفہ نے محسوس کیا کہ ان کے علاوہ بھی بعض فوجی دستے ہونا چاہیے تاکہ صرف بنی کتامہ کی محتاجی نہ رہے لہذا انہوں نے ترک اور ویلیموں کو بھی بھرتی کیا تاہم بنی کتامہ کی قدر افزائی میں کمی نہیں کی۔

ان کا عہد مقابلتاً پرسکون تھا تاہم عرب قبائل میں زنا نے بغاوت کی جس کو بلکین نے رفع کیا۔ عیس بن ام الانصار نے نبوت کا دعویٰ کیا، اس کو شکست دے کر قتل کیا گیا۔

فاس و سجلماسہ میں کچھ خلفشار تھا، ان دونوں مقامات پر دوبارہ قبضہ کیا گیا، اندلس کے بنی امیہ نے مغرب اقصیٰ کے بعض علاقے دہائے تھے ان کو آزاد کرایا گیا اور ۳۷۷ھ تک اس سرزمین سے ان کے اقتدار کو بالکل ختم کر دیا گیا۔

۳۷۳ھ میں بلکین کا انتقال ہو گیا تو بنی امیہ نے بعض ساحلی علاقوں پر تسلط حاصل کر لیا۔ بلکین کا بیٹا منصور افریقہ کا نیا گورنر ہوا تھا، وہ فی الفور اس طرف توجہ نہ کر سکا۔ ۳۶۸ھ میں حاکم صقلیہ نے کسٹنہ اور قلوریہ میں طارنٹا و عروانیہ فتح کئے۔ ۳۷۱ھ میں برویل شاہ فلانڈرز جہاد کے لئے نکلا تھا۔ اس نے قلعہ مانطہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ گورنر صقلیہ اس کو چھڑانے کے لئے آیا تو میدان جنگ میں مارا گیا اور اہل صقلیہ نے اس کے بیٹے جابر کو گورنر بنا لیا اس نے باپ کی موت کا

بدلہ لینے کے لئے پوری تیاری سے حملہ کیا تو عیسائیوں کو جانیں بچانا مشکل ہو گیا اور بردویل فرار ہو گیا۔

جابر بہادر تھا مگر اس میں انتظامی صلاحیت نہ تھی اس لئے العزیز نے جعفر بن محمد بن حسن کلبی کو اس کے بجائے گورنر مقرر کیا۔ ۳۷۵ھ میں جعفر کی وفات پر اس کا بھائی عبداللہ اور ۳۷۹ھ میں عبداللہ کے مرجانے پر ابو الفتح یوسف بن عبداللہ گورنر ہوا۔

دمشق کے حالات کافی دنوں سے ابتر ہو رہے تھے۔ المعز کے انتقال کے بعد سے اہلنگین نے پھر لوٹ مار شروع کر دی تھی، آخر ۳۷۵ھ میں العزیز نے جوہر کو روانہ کیا۔ اس نے پہنچتے ہی دمشق کا محاصرہ کر لیا لیکن اہلنگین نے اپنی مدد کے لئے قرمطیوں کے سردار حسن بن احمد کو بلایا۔

جوہر مصلحتاً رملہ کی طرف ہٹ گیا۔ اہلنگین نے قرمطہ کو لے کر رملہ پر چڑھائی کر دی۔ آخر جوہر عسقلان آ گیا۔ یہاں بھی اہلنگین نے آکر گھیر لیا۔ جوہر اپنے کو کمزور پارہا تھا لہذا اس نے حکمت عملی سے کام لیا اور تنہائی میں اہلنگین سے ملاقات کر کے کہا کہ وہ اس کو بغافیت نکل جانے دے تو آئندہ دمشق سے کوئی سرور کار نہ رکھے گا۔ اہلنگین راضی ہو گیا اور جوہر اپنی فوج کے ساتھ واپس ہو گیا۔

مصر پہنچ کر جوہر نے از سر نو لشکر مرتب کیا اور العزیز کو لے کر رملہ کا عازم ہو گیا۔ قرمطی اور اہلنگین اب تک دمشق میں مقیم تھے۔ محرم ۳۷۷ھ میں زبردست معرکہ ہوا، دشمن کے بیس ہزار آدمی مارے گئے۔ ایک بڑی تعداد گرفتار ہوئی جن میں اہلنگین بھی تھا۔ خلیفہ اس کے ساتھ لطف و کرم سے پیش آیا اور اس کو اپنے ساتھ مصر لے آیا اور اس کو اپنا حاجب بنالیا۔ پھر لوٹ مار نہ کرنے کے وعدے پر قرمطیوں کا بیس ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیا۔

دمشق میں اہلنگین کے بعد اس کا وزیر قسام قائم مقام تھا۔ اس کو العزیز نے گورنر بنا دیا۔ ۳۷۲ھ میں اس کو مصر بلایا اور خضج کو اس کی جگہ مقرر کیا، قدرے وقفے سے کچھ اور ۳۷۸ھ میں نیر کو متعین کیا، اس نے ۳۸۲ھ میں سرتابی کی تو منجولگین کو بھیجا جس نے نظم حکومت پر قابو پایا۔

وقت کے فصل سے بنی طے اور فلسطینی عربوں کے امیر مفرج بن وغفل نے نواح رملہ میں غارت گری شروع کر دی تو ۳۷۹ھ میں ہلنگین کو مصر سے روانہ کیا گیا جس نے ان سب کو سرکوبی کر کے بھگا دیا۔

العزیز کے آخر عہد میں رومیوں نے شام کے سرحدی علاقوں پر تاخت کی۔ العزیز ان کو سزا دینے کے لئے خود روانہ ہوئے مگر رجب ۳۸۶ھ میں بلبیس پہنچ کر بیمار پڑ گئے اور ۲۸ رمضان کو سفر آخرت کر گئے۔

مرنے سے قبل انہوں نے ساڑھے گیارہ سال کے الحاکم کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ العزیز کا عہد ان کے معاصرین میں مثالی تھا۔ شہنشاہ عبداللہ دوم بھی سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، ان کے بعد فاطمین میں ان جیسا خلیفہ نہ ہو سکا۔

### ابو علی منصور الحاکم بامر اللہ

الحاکم تخت سلطنت کے لئے بہت کم سن تھے لہذا العزیز نے اپنے معتمد و معتبر خواجہ سرا کو اتالیق مقرر کیا تھا وہ واروغہ قصر بھی تھا اور بحالت موجودہ مدبر سلطنت بھی، اس نے الحاکم کی بیعت کرائی اور سب سے پہلے نئے خلیفہ کو مبارکباد دی امراء بظاہر مطیع و وفادار تھے لیکن جلد ہی ان کے مابین پھوٹ پڑ گئی اور برجوان اور ابن عمار کی باہمی رقابت کے باعث امیروں کے دو گروہ بن گئے، برجوان کے مشارقہ اور ابن عمار کے مغارب۔ ان دونوں میں جنگ ہوئی اور مشارقہ غالب رہے۔ برجوان نے ابن عمار کو اس شرط پر معاف کر دیا کہ آئندہ کیلئے مستطلاً خانہ نشین ہو جائے۔ مشارقہ و مغاربہ کی ہفتپنشن نظم حکومت پر اثر انداز ہوئی اور چہار جانب ایک باغیانہ رجحان پیدا ہو گیا۔ صور میں بغاوت ہوئی، مفرج بن وغفل نے شام میں لوٹ مار شروع کر دی۔ بادشاہ روم دوقش نے حالات سے فائدہ اٹھا کر افامیہ کا محاصرہ کر لیا۔

برجوان نے جیش بن صمصامہ کو روانہ کیا۔ اس نے اہل صور اور مفرج کو شکست دی پھر افامیہ میں رومیوں کے مقابلے پر آیا اور ان کو انطاکیہ تک بھگاتا چلا گیا۔ شاہ روم جنگ میں مارا گیا اور رومیوں نے دس سال کے لئے برجوان سے صلح کر لی۔



اب بر بنو سہر سیاہ و سپید کا مالک تھا اور اس کی مطلق العنانی حد سے بڑھ گئی تھی۔ کوئی چارہ نہ دیکھ کر الحاکم نے ۳۸۹ھ میں اسے قتل کرادیا اور اس کی جگہ فہد بن ابراہیم کو وزیر بنادیا اور حسین بن جوہر کو قائد القواعد۔

انہیں دنوں مفرج اور حسان بن مفرج نے رملہ میں علم بغاوت بلند کیا اور عسقلان پر قبضہ کر لیا۔ علی بن جعفر بن فلاح الحاکم کی طرف سے مامور ہوا، اس نے ۳۹۰ھ میں انہیں شکست دی۔ اس کے بعد ہی مفرج مر گیا اور حسان نے اطاعت کر لی۔

۳۸۶ھ میں منصور بن بلیکن کا انتقال ہونے پر اس کا بیٹا ابو مناد افریقہ کا گورنر ہوا مگر اس نے مالکی مذہب اختیار کر لیا اور اس مذہب کی عام اشاعت کرنے لگا انجام کار افریقہ کے شہروں میں ۴۰۷ھ میں بے شمار شیعہ قتل کر دیئے گئے اور بعض کو تو زندہ جلادیا گیا۔

اسی زمانے میں ایک شخص ابور کوہ ولید بن ہشام اموی نے بغاوت کی۔ یہ شخص منصور بن عامر کے عہد میں اندلس سے خارج البند ہو کر قیروان میں آ بسا تھا اور برقہ میں بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔ اس نے ایک جماعت فراہم کر کے برقہ کے فاطمی عامل کو نکال دیا اور جو فوج مقابلے پر آئی وہ شکست یاب ہوئی۔ اس سے ابور کوہ کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے صعید اور مصر پر چڑھائی کر دی۔ شاہی فوج سے اس کی جنگ ہوئی اور طرفین کے ہمت سے آدمی مارے گئے پھر ۳۹۷ھ میں اس البرکہ میں جنگ ہوئی ابور کوہ نے شکست کھائی اور گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔

۴۰۰ھ میں الحاکم نے حمید الدین کرمانی کو مدینہ منورہ روانہ کیا اور اس کو ہدایت کی۔

میرے دادا امام جعفر صادق کے مکان میں فلاں جگہ کھودنا اس میں سے ایک صندوق برآمد ہوگا جس میں کتاب علوم آئمہ اور بعض نوادرات محفوظ ہیں، ان کو نکال لانا۔

حمید الدین گیا اور حسب ہدایت عمل کیا تو تبرکات برآمد ہوئے اور انہیں

لے کر وہ قاہرہ آ گیا۔

۴۰۱ھ میں قرواش بن مقلد نے موصل میں خلیفہ الحاکم کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا تو قادر باند عباسی نے بہاء الدولہ بن عضد الدولہ بوسہی سے رجوع کیا اور بہاء الدولہ کی فہمائش پر قرواش پھر عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھوانے لگا۔

۴۰۲ھ میں قادر باند نے خلفائے فاطمیین کی قدح میں ان کا ایک نسب نامہ شائع کرایا جس میں انہیں مجوسی کی اولاد، زندیق اور ملحد ثابت کرنے کی کوشش کی اس پر شیعہ و سنی علماء کے دستخط بھی کرائے۔ مقصود یہ تھا کہ فاطمی خلفاء کی طرف عوام کا میلان ختم ہو جائے لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ عباسی خلفاء کی بے وقعتی اسی طرح باقی رہی۔

الحاکم کا معمول تھا کہ رات میں ایک مخصوص گدھے پر سوار ہو کر شہر کا گشت کیا کرتے تھے پھر کوہ مقطم پر پہنچے ہوئے مکان میں جا کر اعتکاف میں مصروف ہو جاتے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کبھی کبھی مسلسل آسمان کی طرف دیکھتے رہتے اور ستاروں سے اکتساب نور کیا کرتے۔

ستائیس شوال ۴۱۱ھ کو وہ گدھے پر بیٹھ کر نکلے تو واپس نہ آئے، دو سوار ساتھ تھے، ان کو بھی انہوں نے رستے ہی سے واپس کر دیا تھا۔ معمول کے مطابق جب وہ پلٹ کر نہ آئے تو تلاش میں امراء و عمائدین دوڑ پڑے اور سیدھے کوہ مقطم کی طرف گئے، پہاڑ کی چڑھائی پر گدھا نظر آیا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے ایک مقام پر الحاکم کے کپڑے پڑے ہوئے ملے جو پارہ پارہ تھے اور خون میں لت پت تھے۔

کپڑوں سے یہ اندازہ بھی لگایا گیا کہ جسم چھریوں سے زخمی کیا گیا تھا، جس کی علامات کپڑوں پر پائی جاتی تھیں اس طرح الحاکم کی موت کا یقین کر لیا گیا مگر لاش دستیاب نہیں ہوئی۔

الحاکم کا نابالغ بیٹا ان کا جانشین ہوا جس کی رسوم سخت نشینی ممالک محروسہ میں ادا کی گئیں۔

بادی النظر میں الحاکم کسی سازش کے تحت قتل کر دیئے گئے جس کی



صراحت مورخین نے کی ہے لیکن عقیدت مندوں کا کہنا ہے کہ وہ غیبت میں چلے گئے ہیں اور کسی وقت معینہ پر ظہور کریں گے۔

الحاکم سنی، شجاع، منصف، عالم، عابد اور صاحب کرامات تھے۔ حبیب السیر کا بیان ہے کہ وہ عادل اور خدا ترس خلیفہ تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کمال مبالغہ کرتے، مدرسے بنائے، ان کے لئے جاگیریں وقف کیں اور مدارس کے لئے عالم اور فقیہ مقرر کئے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ "مخالفین بنی فاطمہ یہ جو کہتے ہیں کہ وہ کافر تھے اور انہوں نے نماز ساقط کرنے کا فرمان جاری کیا تھا (بلکہ بعض دشمنوں نے یہاں تک بدنام کیا ہے کہ خدائی کا دعویٰ کیا تھا) یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ ان سے اگر اس قسم کی کوئی بات بھی صادر ہوتی تو اسی وقت قتل کر دیا جاتا، ہاں انکار افضی ہونا تو سب ہی جانتے ہیں۔"

مختصر یہ کہ الحاکم نہایت متشرع فرمانروا تھے، اپنی سلطنت میں انہوں نے شراب اور بے تھلکے کی پھلی کی خرید و فروخت کی ممانعت کی، شکاری کتوں کے علاوہ تمام کتوں کے مرداؤلنے کا حکم دیا، تراویح کو بدعت سمجھ کر اس کے پڑھنے پر پابندی لگا دی، نصار اور یہود کو حکم دیا کہ سیاہ عمامے باندھا کریں، یہودی گلے میں پانچ رطل وزنی پتھرے کی شکل اور نصرانی اتنی ہی وزنی صلیب اپنے گلے میں ڈالا کریں، جانوروں میں اونٹ گھوڑے وغیرہ کے بجائے گدھے پر سوار ہوں۔

۴۰۲ھ میں انہوں نے حکم دیا کہ خلیفہ کے واسطے زمین بوسی نہ کی جائے، نہ سلام کے وقت ہاتھ چومے جائیں کیونکہ مخلوق کے لئے زمین کی طرف جھکنا رومیوں کا فعل ہے، اس کے عوض صرف السلام علی المؤمنین ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کہا جائے۔ ۴۰۳ھ میں لوگوں کو شطرنج کھیلنے کے جرم میں پٹوایا، اپنی سلطنت کے تمام گرجوں کے توڑنے کا حکم نافذ کیا، قصر کے گرد طبل و بوق بجانے کی ممانعت کی ۴۰۴ھ میں حکم دیا کہ عورتیں دن رات کسی وقت باہر نہ نکلا کریں۔ ان کو روشدانوں اور کونٹھوں سے جھانکنے کی بھی ممانعت کی گئی۔ سودے والوں کو حکم دیا کہ لانا کر چھاپنے ساتھ رکھیں تاکہ اس سے دروازہ کے اندر عورتوں کو سودا دے سکیں اور عورتیں اسی میں قیمت ڈال دیا کریں۔

اسی سال نجومیوں اور گانے بجانے والوں کی جلا وطنی کا حکم دیا لیکن جب انہوں نے اپنے اپنے پیشے سے توبہ کر لی تو ان کو معاف کر دیا۔ ۳۹۸ھ میں حکم جاری کیا کہ رات کو گھر کے دروازے بند نہ کیا کریں اور دوکانیں کھلی رکھا کریں گھروں اور گلی کوچوں کے دروازوں پر مشعلیں اور شمعیں روشن رہا کریں تاکہ لوگ دن کی طرح کوچوں اور بازاروں میں چل سکیں، خود الحاکم بھی اپنے غلام مسعود کے ساتھ ایک دراز گوش پر سوار بازاروں کا گشت کرتے، جس کسی کو بد معاشی کرتے یا کم تولتے دیکھتے تو اپنے غلام سے پٹواتے اور اس کی بے عزتی کراتے تھے۔ اس گشت سے خوف خدا نمایاں ہوتا اور ہر ایک کو اہواز تھی کہ جس کا جی چاہے اپنا حال خود بادشاہ سے مل کر عرض کرے۔ سداوے اہل عہد سے اشہد ان علیاً ولی اند اذان میں باواز بلند کہا گیا جواب تک شیعوں میں مروج ہے۔

الحاکم ایک باکمال ہیئت داں تھے۔ ابوالحسن علی بن عبدالرحمن بن احمد بن یونس المستوفی ۳۹۹ھ المعروف بہ ابن یونس بنجمن نے ان کے نام پر ایک اعلیٰ درجہ کی زیج ۴ جلدوں میں تیار کی جو زیج حاکی کے نام سے مشہور ہے۔

قاہرہ کے قریب ہی جبل مقطم کی چوٹی پر الحاکم نے اپنے لئے ایک خانقاہ بنا رکھی تھی۔ رات کو اکثر وہاں چلے جایا کرتے اور عبادت کیا کرتے تھے۔ ۴۰۷ھ کو جب جبل مقطم پر چڑھ رہے تھے تو تنہا پا کر کسی دشمن نے ہلاک کر دیا۔ جسٹس امیر علی لکھتے ہیں کہ الحاکم بڑی فیاضی اور تندہی کے ساتھ علم و سائنس کی ترقی میں کوشش کرتے تھے، شام و مصر میں انہوں نے بہت سی مسجدیں کالج اور رصد گاہیں تعمیر کرائی تھیں۔

### ابو الحسن علی الظاہر لا عزاز دین اللہ

ان کی عمر صرف سولہ سال تھی لہذا رئیس الرؤسا ابوالحسن عمار بن محمد اتالیق اور حاکم کی بہن ست الملک نائب السلطنت قرار پائی۔

کہا جاتا ہے کہ امیر الجیوش ابن دواس نے بعض مذہب دشمن عناصر سے سازش کر کے الحاکم کو قتل کرادیا تھا جس کا علم ست الملک کو تھا لہذا بیعت کے دوسرے دن، جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو ست الملک نے اسے گرفتار کر کے



گردن مار دی اور کہا کہ "یہ الحاکم کے قتل کا بدلہ ہے.....!"  
بعض متعصب مورخین نے ست الملک کو الحاکم کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے امیر لٹیوش سے ناجائز تعلقات تھے جس کا علم الحاکم کو ہو گیا تھا لہذا ست الملک نے ان دو اس کے ذریعے الحاکم کو قتل کرا دیا لیکن مقریزی اس کی تردید کرتا ہے اور اس کو بھی خواہان بنی عباس کا اہتمام قرار دیتا ہے بہر حال ست الملک چار سال تک حسن و خوبی سے نظم سلطنت کی دیکھ بھال کرتی رہی، ۴۱۵ھ میں انتقال کر گئی۔

اس کے بعد حبشی غلام معضاد مدبر سلطنت ہوا، شریف کبیر عجمی، شیخ نجیب الدولہ جرجرائی اور شیخ عمید الحسن بن بدوس امرائے سلطنت نے معضاد سے مل کر طے کیا کہ ان لوگوں کے علاوہ کوئی اور خلیفہ سے ملنے نہ پائے۔ یہ پابندی اس حد تک تھی کہ چتر بردار، صاحب انشاء، داعی الدعاة، قاضی القضاة اور نقیب نقبائے طالبین تک کو بیس روز میں صرف ایک دفعہ باریابی کی اجازت تھی۔

۴۱۸ھ میں ابو القاسم علی بن احمد جرجرائی کو وزیر بنایا گیا جو آخر وقت تک اس عہدے پر فائز رہا کیونکہ وہ بڑا منظم اور دیانت دار تھا۔ ۴۱۳ھ میں منتخب الدولہ وزیری متولی قیساریہ کو فلسطین کی امارت سپرد کی گئی صالح بن مرداس اور حسان بن مفرج سے اس کی متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ آخر صالح نے حلب اور اس کے مضافات پر اور حسان نے رملہ اور اس کے نواح پر قبضہ کر لیا اور شام کا ایک بڑا حصہ فاطمین کے ہاتھ نکل گیا۔

۴۱۵ھ میں عراق و خراساں کے حلبی شام و مصر کی راہ سے مکے سے واپس ہو کر قاہرہ آئے تو الظاہر نے ان کو خلعت دئے۔ عراقیوں کے خلعت قادر باللہ عباسی نے اور خراسانیوں کے خلعت محمود بن سبکتگین نے یہ کہہ کر جلوا ڈالے کہ "رافضیوں کے دیئے ہوئے خلعت ناپاک ہوتے ہیں۔"

۴۱۶ھ میں تمام فقہائے مالکی مصر سے نکال دیئے گئے اور داعیوں کو حکم ہوا کہ لوگوں کو کتاب و عام الاسلام اور مختصر الوزیر حفظ کرائیں اور اسماعیلی مذہب کی تبلیغ کریں۔

اسی سال رومیوں نے صقلیہ کے کئی مقامات مسلمانوں سے چھین لئے اور قلور یہ ان سے خالی کرا لیا۔

۴۱۸ھ قیصر روم سے صلح ہو گئی، اس نے اپنے ملک میں الظاہر کا خطبہ پڑھنے کی اجازت دیدی۔ اس کے بعد ہی قسطنطنیہ میں ایک مسجد بنائی گئی اور اس میں موزن مقرر کیا گیا، جو اب الظاہر نے قمامہ کا گر جا تعمیر کرا دیا۔

۴۲۱ھ میں اہل روم سے ترکوں کی جنگ ہوئی جس میں طرفین کے بکثرت آدمی کام آئے۔ بقول روضۃ الصفا قیصر روم نے چھ لاکھ فوج سے شام پر حملہ کیا تھا پھر حلب کی طرف پیش قدمی کی لیکن اہل حلب نے چھاپے مار مار کر اس کے لشکر کو تباہ کر دیا۔ ۴۲۵ھ میں جب بغداد میں ہنگامہ ہوا تو الظاہر نے اپنے داعی روانہ کئے اور کافی آدمیوں نے ان کی دعوت قبول کی۔

نصف شعبان ۴۲۴ھ میں الظاہر نے وفات پائی اور ابو تقسیم معد ان کے جانشین ہوئے۔

الظاہر اپنے جد امجد العزیز کی طرح منصف مزاج اور نیک سیرت تھے۔ ان کی سیاست اور کمال فراست سے اکثر فتنے دب جاتے۔ چونکہ امراء نے ان کو تقریباً نظر بندی کے عالم میں رکھا تھا اس لئے قدرے عیش پسند ہو گئے تھے، پھر بھی حدود سلطنت میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا تھا تاہم کہا جاسکتا ہے کہ خلافت فاطمین کے زوال کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

### ابو تقسیم معد مستنصر باللہ

جرجرائی وزارت پر اور وزیری شام کی گورنری پر اب تک برقرار تھا۔ وزیری نے اپنی فراست سے شام میں بڑی اصلاحات کی تھیں، ہم عصر فرمانرواؤں میں اس کی عزت تھی اور رومی تو اس سے خائف رہتے۔ مستنصر کے دل میں بھی اس کی قیمت تھی جس سے وزیر جرجرائی جلتا تھا۔ آخر ۴۳۳ھ میں اس نے اس پر بغاوت کا الزام لگا کر چڑھائی کر دی۔



وزیری ایک بہادر جرنیل تھا۔ ۴۲۹ھ میں اس نے شبل الدولہ پر حملہ کیا تھا اور اس کو قتل کر کے حلب پر قابض ہو گیا تھا۔ ۴۳۲ھ میں حماۃ اور اقامیہ کے درمیان رومیوں کو شکست دی تھی اور ان کا زور اتنا توڑا تھا کہ رومی مدتوں مسلمانوں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اس میں قاہرہ کی فوج سے ٹکر لینے کی طاقت تھی مگر اس نے ٹل جانا مناسب سمجھا اور حماۃ کی طرف ہٹ گیا پھر اپنی فوج کو مضبوط کر کے حلب میں داخل ہو گیا مگر اسی سال جمادی الاول میں اس کا انتقال ہو گیا اس کے انتقال پر معز الدولہ ثمال بن صالح بن مرداس نے صفر ۴۳۴ھ میں حلب کے تمام علاقوں پر، حسان بن مفرج نے فلسطین پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

۴۴۹ھ میں مصریوں کے حملے پر ثمال نے حلب کو مصری سردار ابن ملہم کے حوالے کر دیا اور خود مصر چلا گیا مگر شعبان ۴۵۴ھ میں محمود بن شبل الدولہ نے حلب لے لیا جسکو ثمال نے مصر سے آکر ۴۵۳ھ میں واکزار کرایا۔ ذی قعدہ ۴۵۴ھ میں ثمال مر گیا اور عطیہ حلب کا گورنر ہوا۔ محمود بن شبل الدولہ غراساں میں اقامت گزین تھا۔ اس نے ۴۵۵ھ میں پھر حلب فتح کر لیا۔ ۴۶۸ھ میں محمود نے وفات پائی تو اس کا بیٹا نصر جانشین ہوا مگر ۴۶۹ھ میں اس کا بھائی حلب کا بادشاہ ہو گیا۔ ۴۷۲ھ میں شرف الدولہ مسلم بن قریش والی موصل نے حلب چھین لیا اور اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، جس کو ۴۷۹ھ میں سلجوقیوں نے فتح کیا اور قسیم الدولہ اقسقر کو وہاں کا گورنر بنا دیا پھر آہستہ آہستہ پورا شام مسخر کر لیا۔

اس سے قبل ۴۶۳ھ میں سلجوقی سردار تسزرمہ، بیت المقدس اور اس کے جوار کا علاقہ فتح کر چکا تھا۔ ۴۶۸ھ میں اس نے دمشق کو مسخر کر کے وہاں عباسی خلیفہ مقتدی کا خطبہ جاری کر دیا اور جی علی خیر العمل اذان سے نکلوا دیا۔

۴۶۹ھ میں اس نے قاہرہ کو بھی فوجی حصار میں لیا مگر بدر الجہالی نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ وہ بہت برے حال میں دمشق واپس ہو سکا۔ ۴۸۲ھ میں فاطمی لشکر نے شام کے ساحلی مقامات صور، صیدا، عکہ وغیرہ تسخیر کر لئے لیکن مسلسل حملوں کے باوجود دمشق فتح نہ کر سکے۔

افریقہ کے حالات ان سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ وہاں کا گورنر معز بن بادیس تخت شیعہ دشمن تھا۔ اس نے ۴۴۲ھ میں مستنصر کا خطبہ موقوف کر کے عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری کر دیا تھا۔ مستنصر نے دو عرب قبائل رعبہ اور ریاح اس کے پیچھے لگا دئے۔ انہوں نے ہرقہ کی سکونت اختیار کی اور چہار جانب لوٹ مار شروع کر دی پھر اپنی تعداد بڑھا کر ۴۴۶ھ میں طرابلس فتح کر لیا اور قیروان سے تین منزل پر بمقام جندران تین ہزار فوج سے معز کی ساٹھ ہزار فوج کو شکست دی اور باجہ فتح کر لیا پھر ۴۴۹ھ میں قیروان میں داخل ہو گئے۔ معز مہدیہ کی طرف بھاگ نکلا اور وہیں ۴۵۳ھ میں مر گیا۔

اس کا بیٹا تمیم اس کی جگہ تخت نشین ہوا تو اس نے ۴۷۹ھ میں عربوں کو شکست دے کر قیروان اور بعض دوسرے علاقوں سے نکال دیا اور ۴۸۰ھ میں اپنی سرزمین کو تمام مخالف عناصر سے پاک کر کے آزاد حکومت قائم کر لی لیکن ۵۰۱ھ میں وہ مر گیا اور اس کا بیٹا یحییٰ بادشاہ ہوا تو اس نے مصیبت وقت دیکھ کر مصری خلفاء کا خطبہ جاری کر دیا اور اس کے بعد وزیری بادشاہ فاطمین کا خطبہ پڑھتے رہے، یہاں تک کہ ۵۴۲ھ میں صقلیہ کے نصرانی حکمران روجر نے مہدیہ فتح کر لیا۔

۴۴۲ھ میں علی بن صلیحی نے یمن میں مستنصر کے نام کا خطبہ جاری کیا تھا ۴۵۰ھ میں بساسیری نے عباسی خلیفہ قائم کو قید کر کے اس کے کپڑے اور عمامہ مصر بھیجا تھا اور ایک سال تک بغداد میں فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھوایا تھا۔ ۴۵۱ھ میں مستنصر کی خلافت بصرہ، واسطہ اور مضافات میں تسلیم کر لی گئی تھی لیکن جب طغرل بیگ نے بساسیری کو قتل کر دیا اور قائم کو آزاد کرایا تو پھر ۴۶۲ھ سے مکہ و مدینہ میں بھی عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

حقیقتاً خلافت فاطمین کے قیام سے نہ صرف خلافت عباسیہ پر ضرب لگی تھی بلکہ پوری سنی دنیا تھملا گئی تھی کہ خلافت پر تو ان کی اجارہ داری تھی، اس کو شیعوں کے ایک فرقہ نے کیونکر اپنایا اور یہ انداز فکر ایک حد تک غلط نہ تھا کیونکہ شیعوں کی طرف سے خلافت کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا لیکن خلافت کے لئے ایک معیار یہ بنایا گیا تھا کہ جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں بیٹا اسی کا ہے اور اس کی



تصدیق حاکم شام نے بزور شمشیر خلافت حاصل کر کے کی تھی۔

خلافت و امامت کے مسئلے کو طول دینے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ حضور سرور کائنات کی وفات کے بعد پیغمبری اور فرمانروائی کی جو تقسیم از خود ہو گئی تھی، اس سے دو گروہ وجود میں آ گئے تھے: ایک گھروالوں کا، دوسرا باہروالوں کا۔ گھروالے سجادہ رسالت کی نیابت کے لئے امامت کے قائل تھے، باہروالوں نے سقیفہ بنی ساعدہ سے خلافت کا آغاز کر دیا تھا جس میں حضرت علیؑ کے چار سال زبردستی درمیان میں آ گئے تھے۔ زبردستی اس لئے کہ باہروالے گروپ کی بڑی تعداد نے اس کو تسلیم نہیں کیا تھا، اس میں سرفہرست ام المومنین حضرت عائشہ تھیں۔

پھر یہ خلافت کھلی ہوئی بادشاہت کی صورت ابن زبیر، بنی امیہ اور بنی عباس میں آ گئے بڑھتی رہی اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ اپنی ہوئی تلواریں رہیں۔ جن کی تلواریں زیادہ تیز ثابت ہوئیں، انہوں نے تاج و تخت خلافت حاصل کر لیا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی فاطمین نے بھی قسمت آزمائی کی اور جیالوں کا ساتھ دینے والی خلافت ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب خلافت کے اصطلاحی معنی تھے ایک مضبوط حکومت!

علامہ عبدالحق محدث دہلوی آل رسول کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ کتنے سیر چشم ہیں کہ آپ نے مسلمانوں کی فرمانروائی بڑی کشادہ دلی سے دوسروں کے سپرد کر دی۔

ہماری طرف سے اس میں اتنا اضافہ ہو سکتا ہے کہ دوسروں نے قبضہ کر لیا تو ہم نے اس کو واپس لینے کے لئے مسلمانوں میں خون خرابہ پسند نہیں کیا کیونکہ حضور اس کی تاکید فرما گئے تھے۔ حضرت علیؑ کے بعد دوسرے آئمہ کرام نے بھی اپنے کسی پیر کو اقتدار کے لئے مسلمانوں پر تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ اب اگر حضرت مختار ثقفی، زید شہید یا نفس ذکیہ میدان میں آئے تو یہ ان کا ذاتی اجتہاد تھا، اس کا آئمہ گرامی قدر کی مرضی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

پھر جب امام مہدیؑ غیبت میں چلے گئے تو کوئی عجمان اہل بیت کو روکنے والا نہ تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ دنیا انسان کی زبان کے بجائے تلوار کی زبان سنتی بھی

ہے اور سمجھتی بھی ہے تو سنیوں کے ساتھ شیعہ بھی نبرد آزما ہو گئے اور یہ سلسلہ خاندان طاہریہ سے شروع ہوا تو مراقش سے مصر پہنچا اور فاطمین نے اپنی عظیم بادشاہت کا نام خلافت رکھ دیا۔

امامت قرآن و حدیث کی رو سے صرف خدا کی دین پر منحصر تھی جو ازل سے حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کے لئے مقدر تھی۔ کوئی ڈنڈھ سو سال تک تو امامت مختص رہی اہل بیت رسول سے۔ خلافت کی فقہی ضروریات کے لئے کچھ باہر کے آدمی بھی کھڑے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی اپنے کو امام کہنے کی جرات نہ کر سکا۔ بنی عباس کے دوسرے خلیفہ نے یہ امتیاز بھی خانوادہ رسالت سے چھین لیا اور خود امام جعفر صادقؑ کے حلقہ تلامذہ سے ایک ممتاز عالم کو منتخب کر کے امام بنا ڈالا: امام بھی کیسا امام اعظم! اور اس کے بعد یہ سلسلہ دور استقبال کے متوازی آ گئے بڑھتا رہا، حتیٰ کہ ہمارے بارہویں امام دنیا کی نظروں سے دور چلے گئے تب بھی حکومت ساز امامت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

لائق استعجاب تو یہ امر تھا کہ خدا ساز امامت کے مقابلے پر انسان اپنی امامت لے آیا پھر خلافت تو انسان کی ساختہ و پرواختہ تھی، اس میں اگر شیعوں کا کوئی حلقہ حصہ دار بن گیا تو اعتراض کی کیا بات ہے۔ اس نے خدا کا دیا ہوا کوئی منصب تو نہیں چھینا تھا۔ انسانوں کی خلافت تھی، وہ بھی انسان تھے، انہوں نے لے لی اور ایسے رعب اور دبدبے سے اس کو رکھا کہ مکے اور مدینے نے بھی اسکو مان لیا۔

اب اگر راکز خلافت کو دیکھا جائے تو بغداد و دمشق کے ساتھ قاہرہ کا نام ناگزیر ہے بلکہ قاہرہ کی نظیر دونوں میں سے کوئی پیش نہیں کر سکا۔ جامع ازہر آج بھی عالم اسلام کی عدیم المثال یونیورسٹی ہے۔ عجیب بات ہے کہ دارالعلوم تو تسلیم ہے مگر اس کے بانیوں کی خلافت سے انکار ہے کیونکہ اس پر شیعیت کی چھاپ لگی ہوئی ہے شیعیت کی چھاپ تو امامت پر بھی تھی، اس نام کو کیوں استعمال کیا، شاید صرف اس لئے کہ فقہ اور امام لازم و ملزوم ہیں اور نماز کے لئے خلافت نہیں بلکہ امامت ہی درکار ہوتی ہے۔



بہر حال کوئی مانے یا نہ مانے مگر فاطمین مصر دو ڈھائی سو سال تک چار دانگ عالم میں اپنی خلافت کے ڈنکے پٹواتے رہے اور ان کے سامنے بغداد کی خلافت بچوں کا کھیل نظر آتی جو طالع آزمائش شیر زنوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ عباسی خلیفہ جانتے تھے کہ وہ دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ ہیں پھر بھی وہ حسد میں فاطمین پر کچڑا چھلتے رہتے۔

ان کے خلاف ایک بار انہوں نے ایک محضر شائع کرایا تھا جو بے اثر ثابت ہوا تھا، دوسری بار پھر ایک محضر تیار کرایا اور اس کی بے شمار نقلیں شہروں شہروں تقسیم کرائیں کہ خلفائے مصر مجہول النسب ہیں۔ وہ شاید بھول گئے کہ دنیا حسب نسب ہی کو مانتی تو اولاد فاطمہ زہرا سے زائد کون تھا مگر ان پر ستم کے پہاڑ ڈھائے جاتے رہے اور ان سنگروں میں خود وہ اور انکے اسلاف بھی آتے ہیں اور اب وہ نہیں ہیں تو دشمنی ان کے ماننے والوں سے نکالی جاتی ہے۔

لیکن سچی بات سننا کون ہے؟ خلیفہ بغداد اور ان کے لواحقین چاند کی طرف خاک اڑاتے رہے، چاند کا دامن تو میلا نہیں ہوا، خاک پھینکنے والوں کے منہ پر آگری جو طغرل بیگ نے اپنے رومال سے پونچھ ڈالی کہ وہ خلفائے فاطمین سے انتقام لے گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ۴۶۰ھ سے ۴۶۶ھ تک مصر میں سخت قحط پڑا۔ ہزاروں آدمی فاقوں سے مر گئے اور کتنے ہی ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ ارباب حکومت سے جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ سب کیا مگر دوسری جگہوں سے کتنا غلہ منگوایا جاسکتا۔ نتیجے میں حکومت خود ڈانوا ڈول ہونے لگی جس کو بدر الجمالی وزیر نے سنبھالا اور اس موقع پر ہر ممکن ذریعہ استعمال کر کے تھوڑا بہت اناج فراہم کرتا رہا۔

بدر الجمالی پکا اثنا عشری تھا۔ اس نے مصر کو بڑے بحران سے نکالا، طرابلس الشام، صور اور مکہ کو دوبارہ فاطمی سلطنت میں شامل کیا پھر وہ مکہ کی گورنری پر بھیج دیا گیا۔

انہیں دنوں ترکی غلاموں کا زور بڑھ گیا اور اس کو توڑنے کے لئے نئے غلام بھرتی کئے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں رشک و حسد پیدا ہوا اور باہم جنگ کی

نوبت آگئی۔ ناصر الدولہ ابو علی حسین بن حمدان ترکی غلاموں کا سردار تھا۔ اس نے ترکوں کا ساتھ دیا اور کئی لڑائیوں کے بعد ترک فتحیاب ہوئے اور مصر میں ان کا طوطی بولنے لگا۔

یہ لوگ خلیفہ پر دباؤ ڈال کر بڑی بڑی رقوم وصول کرتے اور اس طرح انہوں نے خزانہ خالی کر دیا مگر ناصر الدولہ وصول ہونے والی رقوموں میں سے ترکوں کو بہت کم دیتا لہذا اس سے ترکوں کی ان بن ہو گئی اور انہوں نے اس کو مصر سے نکلوا دیا۔

ناصر الدولہ نے ایک جمعیت فراہم کر کے قاہرہ پر چڑھائی کر دی۔ شاہی فوج نے شکست کھائی پھر ترکوں اور ناصر الدولہ میں اس شرط پر صلح ہو گئی کہ تاج الملوک شادی اس کا نائب ہو گا مگر یہ صلح عارضی ثابت ہوئی، بات بگڑتی ہی رہی۔ ناصر الدولہ نے خلیفہ کا وظیفہ بند کر دیا اور سکندر یہ اور میاط فتح کر کے وہاں عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری کر دیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ ناصر الدولہ نے بیرون ملک کے سنیوں سے ساز باز کر لیا تھا اور خود بھی سنی ہو گیا تھا لہذا وہ خلیفہ کو معزول کرنا چاہتا تھا۔ یہ حقیقت ترکوں کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اس کے محل میں گھس کر اس کو قتل کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے بھائیوں فخر العرب اور تاج المعالی کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

ان حالات سے مجبور ہو کر خلیفہ نے پھر بدر بن عبد اللہ الجمالی کو مکہ سے طلب کیا اس دوران صقلیہ میں بھی بد نظمی ہو گئی اور فرنگیوں نے ۴۶۴ھ میں قسریانہ اور جرجنت کے سوا پورے جزیرے پر قبضہ کر لیا اور ۴۸۱ھ میں یہ دونوں مقامات بھی لے لئے۔

بدر الجمالی مصر کو سنبھالنے میں لگا ہوا تھا کہ ذی قعد ۴۸۷ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اس کا بیٹا محمد ملک ابو القاسم وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اسی دوران ۱۸ ذی الحجہ ۴۸۷ھ کو خلیفہ مستنصر نے عالم فانی سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔

مستنصر بڑے صابر و شاکر فرمانروا تھے۔ قحط کے زمانے میں انہوں نے بھی رعایا کے ساتھ فاتحہ کئے۔ ناصر خسرو ان کے زمانے میں ایک سال تک مصر میں رہا



۴۷۹ھ میں شیخ بلبال حسن بن صباح تاجروں کے لباس میں قاہرہ پہنچے اور سات سال تک مستنصر کے مہمان رہے پھر مستنصر نے انہیں خراساں اور بلاد عجم کا داعی مقرر کیا۔ حسن نے پہلے باطنی طور پر اور علانیہ اسماعیلیت کی دعوت دی پھر قلعوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ چلتے وقت انہوں نے مستنصر سے پوچھا تھا کہ آپ کے بعد ہمارا امام کون ہوگا؟ مستنصر نے اپنے بیٹے نزار کا نام لیا تھا۔

مستنصر کے تین بیٹے تھے: نزار، ابوالقاسم احمد مستعلی اور محمد۔ مستعلی اپنے والد کے بعد خلیفہ ہوئے اور محمد کے بیٹے عبدالحمید میمون حافظ کو بعد میں یہ منصب ملا۔

### ابو القاسم احمد مستعلی بالله

وصیت کے مطابق نزار کو خلیفہ ہونا چاہئے تھا مگر وزیر سلطنت سے ان کی مخالفت تھی اس لئے اس نے احمد کو مستعلی کے لقب سے خلیفہ بنا دیا۔ نزار اسکندریہ چلے گئے جہاں الپتگین گورنر تھا۔ اسکندریہ والوں نے نزار کی بیعت کر لی اور انہوں نے مصطفیٰ لدین اللہ کے لقب سے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔

اس پر وزیر سلطنت افضل نے اسکندریہ میں انہیں گھیر لیا مگر شکست کھائی اس نے پھر حملہ کیا اور نزار کو الپتگین اور قاضی ابن عمار سمیت گرفتار کر لیا۔ مستعلی نے نزار کو دیوار میں چنوا دیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ گرفتاری کے بعد نزار کا کیا حشر ہوا کسی کو معلوم نہیں لیکن نزاری اسماعیلیوں کو یقین ہے کہ نزار کا بیٹا ہادی قید سے نکل گیا تھا اور اسی ہادی کے سلب سے الموت کے اسماعیلی امام پیدا ہوئے۔

اس طرح اسماعیلی دو فرقوں میں بٹ گئے: ایک مستعلویہ جو ہندوستان کے شیعہ بوہرے ہیں اور جن کا کہنا یہ ہے کہ مستنصر نے بعد میں مستعلی کے لئے وصیت کی تھی، دوسرا فرقہ نزاری کہلاتا ہے جو حسن بن صباح کا پیرو ہے اور آغا خانی خوجوں کے نام سے معروف ہے۔

۲۵ صفر ۴۹۵ھ کو مستعلی ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ملک الافضل نے ان کے بیٹے ابو علی کو تخت خلافت پر بٹھا دیا اور اس کے کم سن ہونے

کے سبب پورا نظم سلطنت اپنے ہاتھ میں رکھا۔ مستعلی کے عہد ہی میں ملک شام سلجوقیوں اور رومیوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ رومیوں نے ۴۹۲ھ میں معرة النعمان اور بیت المقدس، ۴۹۳ھ میں حیفاء اور ۴۹۴ھ میں قیساریہ اور ساحل شام کے دیگر مقامات بھی فتح کر لئے تھے۔ حلب و دمشق میں فاطمیوں کا خطبہ ۴۹۰ھ سے بند ہو گیا تھا۔ بحالت موجودہ شام سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔

### ابو علی منصور آمد با حکام اللہ

مستنصر کے زمانے میں بھی وزیر سلطنت تمام مالی اور ملکی امور پر حاوی تھا، منصور کے عہد میں وہ تقریباً مطلق العنان ہو گیا اور خلیفہ عضو معطل بن کر رہ گئے پھر بھی اس دور میں ہر طرف امن، خوشحالی اور تہل تہل کے آثار نمایاں رہے۔ چند فتوحات بھی کی گئیں اور صلیبی مجاہدوں کو پسپا بھی کیا گیا لیکن بعض علاقے بھی ہاتھ سے نکل گئے اور ساحل فنیقیہ کے شہر جو بدر لہمائی نے فتح کئے تھے، ان کو مجاہدین نے لے لیا۔

۴۹۷ھ میں عکہ، ذی الحجہ ۵۰۲ھ میں طرابلس الشام چھن گئے اور مصری فوج اس وقت پہنچی جب ان شہروں کا جنازہ نکل چکا تھا۔ اسی سال عرفہ، ہانیاس اور جبل الامان، ۵۰۳ھ میں بیروت، ۵۰۴ھ میں صیدا، ۵۰۵ھ میں قلعة تبین پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا۔ ۵۱۱ھ میں شاہ بردویل مصر پر حملہ آور ہو گیا مگر بیمار ہو جانے کے سبب واپس ہو گیا اور انعریش پہنچ کر مر گیا۔

افضل سلطنت کا منظم بھی تھا اور آمر کا نگر اس بھی لیکن جوان ہو کر خلیفہ اس کے پند و نصائح برداشت نہ کر سکے، لالہ بالی طبعیت اور عیش پسندی سے وہ مناسب اور نامناسب کی تمیز کھو بیٹھے تھے۔ رمضان ۵۱۵ھ میں انہوں نے چند آدمی بھیج کر افضل کو قتل کرادیا۔ مورخین نے اس کو باسد بیر اور صائب الرائے لکھا۔ افضل کے بعد مامون ابو عبد اللہ کو وزیر بنایا گیا مگر اس کو بھی اپنی حد سے تجاوز کرنے پر ۵۱۹ھ میں گرفتار کر لیا گیا اور ۵۲۱ھ میں مع اس کے بھائیوں کے قتل کر دیا گیا۔



ان واقعات کے ساتھ ساتھ خود فاطمین میں بھی استنا اختلاف ہو گیا تھا کہ نزاریہ فرقہ مستعلویوں اور ان کے اماموں کا سخت دشمن تھا۔ ۵۲۴ھ میں ایک دن آمر سیر سے واپس آرہے تھے کہ دس نزاری فدائیوں نے انہیں قتل کر دیا۔

مرتے وقت آمر نے کہا تھا کہ میری فلاں بیوی حاملہ ہے۔ اس کے بنیا ہوگا جو میرا جانشین ہوگا، میرا عم زاد عبد المجید میمون اس کا کفیل ہوگا۔ اس وصیت کے مطابق عبد المجید کو حافظ لدین اللہ کے لقب سے نائب السلطنت بنا دیا گیا لیکن حامد بیوی سے لڑکی پیدا ہوئی اس لئے بعد میں حافظ ہی خلیفہ کے منصب پر فائز ہو گئے۔

مقریزی لکھتا ہے کہ آمر کریم وجود تھے۔ ان کے متعلقین کثرت عطا ہے بعیش و آرام بسر کرتے، رعایا بھی خوشحال تھی، وہ حافظ قرآن بھی تھے اور واقف فتنہ

بعض مورخین نے آمر کو لاولد لکھا ہے اور بعض نے تحریر کیا ہے کہ انہوں نے ایک لڑکا طیب نامی چھوڑا تھا، حافظ جس کے سرپرست قرار پائے تھے مگر طیب کے بالغ ہونے پر ان کی نیت میں فرق آگیا اور انہوں نے خلافت پر قبضہ کر لیا۔

ایسے مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ آمر نے اس کی بھی پیشین گوئی کی تھی اور اپنے اکابر دعا کو ہدایت کی تھی کہ ایسے میں طیب کو روپوش کر دیں۔ بوہروں کے نزدیک اس امام طیب کی نسل کا امام ہر زمانے میں ہونا واجب ہے اور اسی کو وہ سیدنا کہتے ہیں۔

### عبد المجید میمون حافظ لدین اللہ

ابو علی احمد بن افضل ان کا وزیر تھا جو اثنا عشری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حافظ نے بھی وہی مذہب اختیار کر لیا تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے شیعوں کے بارہویں امام مہدی آخر الزماں کا نام سکے پر کندہ کرایا تھا، خطبے میں بھی اس کو شامل کیا تھا اور اسماعیل بن جعفر صادق اور حافظ کے نام نکلوا دیئے تھے۔

پھر ابو علی کی مطلق العنانی اور سخت گیری کے سبب وہ اس سے اکتا گئے اور عاجز ہو کر ۱۵ محرم ۵۲۶ھ کو ایک فرنگی کے ہاتھوں اس کو قتل کر دیا۔

ابن خلکان نے ابو علی احمد کے تدبیر اور انتظامی صلاحیت کی تعریف کی ہے۔ ابو الفتح ابو علی احمد کی جگہ وزیر بنا تو اس نے بھی شاہ شطرنج بنا دیا۔ اس پر حافظ نے ۲۲ ذی الحجہ ۵۲۶ھ کو اسے بھی زہر دلوادیا پھر دو سال تک کسی کو وزیر نہیں بنایا اور خود سارا انتظام دیکھتے رہے۔ ۵۲۸ھ میں انہوں نے بڑے بیٹے سلیمان کو ولی عہد اور وزیر مقرر کیا اور چند ماہ بعد اس کے انتقال پر بچھے بیٹے حیدرہ کو نامزد کیا۔ اس پر چھوٹے بیٹے حسن نے ہنگامہ کر دیا، لڑائی ہوئی۔ مجبوراً حافظ نے اس کو دونوں منصب عطا کر دیئے اور اس نے تمام امور سلطنت پر قبضہ کر لیا مگر وہ بڑا سفاک اور ظالم ثابت ہوا۔ اس نے بہت سے امیروں کو ہلاک کر دیا چالیس امیر تو ایک ہی شب میں مارے گئے آخر حافظ نے اسکو زہر سے ہلاک کر ڈالا۔ اب حافظ نے ایک نصرانی امیر تاج الدولہ بہرام کو وزیر بنایا جو نصرانیوں کو مسلمانوں پر ترجیح دینے لگا۔ امیر رضوان ایک سنی وزیر تھا۔ اس کو اس نے دور دراز علاقے کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ رضوان نے وہاں پہنچ کر ایک فوج مرتب کی اور قاہرہ پر چڑھائی کر دی۔ بہرام اسوان کی طرف بھاگ نکلا۔ رضوان کے بھائی ابراہیم اوحد نے پہنچا کیا اور پکڑ کر لے آیا۔ حافظ نے اسے نظر بند کر دیا اور بہرام نے رہبانیت اختیار کر لی۔

اس کے بعد رضوان نے حافظ کو تخت سے اتار دینے کی سازش کی حافظ کو خبر ہو گئی، انہوں نے اس کا گھر لٹوا دیا۔ دو بھاگ کر سلجوقیوں کی پناہ میں چلا گیا اور ایک ترکی امیر کشکین سے مدد لے کر مصر پر حملہ آور ہوا۔ ۵۳۴ھ میں اس نے باب النصر کے قریب اہل مصر کو شکست دی۔ اس عرصے میں اس کے کئی ساتھی اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ حافظ نے حکمت عملی سے اس کو پکڑوا لیا اور قید کر دیا لیکن وہ قید سے نکل بھاگا اور ایک بار پھر مصریوں کی ایک جماعت فراہم کر کے قاہرہ پر چڑھ دوڑا اور شہر میں داخل ہو گیا لیکن حافظ نے سوزانیوں کی ایک جماعت بھیج کر اس کو قتل کر دیا۔

۵۳۴ھ میں حافظ کا انتقال ہو گیا، مقریزی نے انہیں کثیر المدارات، عارف اور علم نجوم کا ماہر لکھا ہے۔



طلّاح نے ربیع الاول ۵۴۹ھ میں قاہرہ پہنچ کر عافری لاش آبائی قبرستان میں دفن کرائی اور خود ملک الصالح کے لقب سے وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔  
کم سن خلیفہ فائز نے جب سے اپنے چچاؤں کی لاشیں دیکھی تھیں، اس وقت سے مرض صرع میں مبتلا ہو گیا تھا، وہ نظم حکومت سنبھالنے کے قابل ہی نہ تھا اس لئے طلّاح آزادی کے ساتھ امور ملکی و مالی کو انجام دیتا رہا۔ حتیٰ کہ ۵۵۵ھ کو گیارہ سال کی عمر میں فائز کا انتقال ہو گیا۔ طلّاح نے ابو محمد عبداللہ علی بن یوسف بن حافظ کو عاصد لدین اللہ کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔

طلّاح ایک وفادار وزیر تھا لیکن اس کی خود مختاری محل کی خواتین کو سخت ناگوار تھی۔ اس سلسلے میں بعض بد نما واقعات رونما ہوئے پھر بھی مورخین نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔

وہ قوم کا ارمنی اور عقیدے کا اشنا عشری تھا، شاعر، مثنوی، اہل علم و فضل کا قدر داں، خوش نویس، ادیب اور شاعر تھا، سادات کی بڑی عزت کرتا، انہیں انعام و اکرام سے نوازتا رہتا اور بعض بزرگ سیدوں کے تو اس نے وقائف مقرر کر دیئے تھے۔ اس کی شخصیت رعب دار تھی مگر ہر شخص کو اس نے ملنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ نماز گزار تھا اور فرض و نوافل کا حد درجہ پابند، کتاب الاعماد فی الرد علی اہل العناد، بحث امامت علی ابن ابی طالب میں اسکی تصنیف ہے۔ اس کے اشعار بھی دو جلدوں میں موجود ہیں، لکھوہ فی الرد علی القدر، اس نے ایک قصیدہ قدریہ کی تردید میں لکھا تھا۔

وہ ایک کھلا ہوا شیخہ تھا، مکہ و مدینہ اور مشاہد مقدسہ کے لئے نقد و جنس بھیجتا رہتا اور تمام روضوں کے مجاوروں کی خدمت بھی کرتا تھا۔

وزارت کی باگ ڈور ایسے وقت میں اس کے ہاتھ آئی تھی جب فاطمین میں کسی قسم کا دم خم باقی نہ تھا، پھر بھی جتنا ملک رہ گیا تھا اس کا انتظام اس نے بڑی خوبی سے کیا، آخر عمر تک فرنگیوں سے لڑتا رہا اور اکثر موقعوں پر اس نے انہیں شکست فاش دی۔

### ابو منصور اسماعیل ظافر باہر اللہ

ان کے زمانے وزیر وہ رہا جس کے بازو میں زور ہوتا۔ انہوں نے تخت نشین ہو کر ابو الفتح بن امصال کو وزیر بنایا چالیس روز بعد سکندریہ کے گورنر ابن السلار نے اسکو قتل کر کے وزارت حاصل کر لی اور ملک العادل کا لقب اختیار کر لیا ابن السلار کو اس کے سوتیلے بیٹے عباس نے تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور خود وزیر بن گیا

خلیفہ کو محل کی چہار دیواری کے باہر کوئی اختیار نہ تھا۔ رقابتیں، سازشیں، فرقہ بندیوں اور بد عملی نے قاہرہ کو میدان کارزار بنادیا تھا جس کے نتیجے میں صلیبیوں نے عسقلان پر قبضہ کر لیا۔

امراء ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ انہوں نے خلیفہ ظافر کو عباس کے قتل پر آمادہ کیا۔ عباس کو خبر ہوئی تو اس نے خلیفہ کو محل کے اندر قتل کرا دیا اور ظافر کے بھائیوں جبریل و یوسف اور حسن بن حافظ کے بیٹے پر الزام لگا دیا اور سب کو تہ تیغ کرا دیا۔ پھر ظافر کے کم سن بیٹے کو تخت پر بٹھا کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

### ابو القاسم عیسیٰ فائز بنصر اللہ

وہ برائے نام خلیفہ تھے، اصل بادشاہ خود عباس تھا۔ اس پر امراء، لشکری اور سودانی سب اس کے خلاف ہو گئے۔ ادھر ظافر کی نوعیت قتل کی بو پھوٹ گئی تھی۔ محل سے اس کی خبر طلّاح بن رزیک گورنر اشمونین کو ملی۔ اس نے سپاہیوں اور خانہ بدوش عربوں کو ظافر کے غم میں سیاہ لباس پہنا کر قاہرہ کی طرف پیش قدمی کی۔ قاہرہ کے لشکری بھی اس سے جا ملے۔ عباس ۱۲ ربیع الاول ۵۴۹ھ کو اپنے بیٹے نصر اور دوست اسامہ کو لے کر شام کی طرف بھاگ نکلا۔

ظافر کی بہن نے زر کثیر دے کر فرنگیوں کی خدمات حاصل کیں۔ انہوں نے عباس کو راستے ہی میں جا لیا۔ لڑائی میں عباس مارا گیا۔ اسامہ فرار ہو گیا اور نصر کو ایک منجرے میں بند کر کے قاہرہ لایا گیا۔ قصر کے اندر تینچوں سے اس کی بومیاں کاٹی گئیں اور باب زوید پر پھانسی دیدی گئی۔



### ابو محمد عبد اللہ علی عاصد الدین اللہ

دس برس کی عمر میں وہ خلیفہ ہوئے، طلائع نے اپنی بیٹی انہیں بیاہ دی۔ محل میں ایک عرصے سے اس کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں، آخر فائز کی چھوٹی بھوپھی نے ابن الداعی کو اس کے قتل پر مامور کر دیا اور ۱۹ رمضان ۵۵۶ھ کو جب طلائع دہلیز قصر سے گزر رہا تھا تو ابن الداعی نے اس پر حملہ کر کے چھریوں کے پے در پے واروں سے امتنا زخمی کر دیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا مگر مرنے سے قبل اس نے فائز کی بھوپھی کو بھی ٹھکانے لگوادیا۔

عاصد نے اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے رزیک کو وزیر بنایا مگر اس کی وزارت کو صرف بارہ ماہ گزرے تھے کہ صعید کے گورنر شادور نے چرمحائی کر کے اس کو قتل کر دیا اور صفر ۵۵۸ھ میں خود وزیر بن گیا لیکن اس کے نو ماہ بعد طلائع کے صاحب الباب امیر ضرغام نے قاہرہ سے نکال دیا۔

شادور سنی المسلک تھا، وہ نور الدین محمود کے پاس دمشق جا پہنچا اور اس سے اس شرط پر مدد کا اللب گار ہوا کہ مجموعی محاصل میں سے فوج کی تنخواہیں نکال کر جو کچھ بچے گا، اس کا ایک تہائی دمشق بھیجتا رہے گا اور دمشق کے سب سالار شیرہ کوہ کو ہمیشہ قاہرہ میں رکھے گا۔

نور الدین محمود نے اسد الدین شیرہ کوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین کو شادور کے ساتھ کر دیا۔ شیرہ کوہ لڑتا بھڑتا ۲ جمادی الاخر ۵۵۹ھ کو قاہرہ میں داخل ہو گیا۔ ضرغام گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا اور شادور بھجور وزیر بنادیا گیا۔

شیرہ کوہ شہر کے باہر مقیم تھا۔ شادور نے عہد شکنی کی اور شیرہ کوہ کو حکم بھیجا کہ مصر سے نکل جائے۔ ناچار شیرہ کوہ نے بلبیس پر قبضہ کر کے مصر کے مشرق میں اپنی حکومت بنالی۔

شادور نے اس اثناء میں فرنگیوں سے مدد حاصل کر لی اور ان کو لے کر بلبیس کا محاصرہ کر لیا۔ شیرہ کوہ صورت حال کو نازک دیکھ کر ذی الحجہ ۵۵۹ھ میں شام کی طرف واپس ہو گیا مگر ربیع الاول ۵۶۲ھ میں پوری تیاری کے ساتھ پٹن کر

آیا اور مصر کے مغربی حصے پر قابض ہو گیا۔ شادور نے پھر فرنگیوں کو بلایا مگر شیرہ کوہ نے مشترک لشکر کو بمقام باہین شکست دی پھر سکندر یہ کو مسخر کر لیا۔

شادور میں فرنگیوں کے بل پر استناد مغم تھا کہ اس نے سکندر یہ کو حصار میں لے لیا۔ آخر شیرہ کوہ نے پچاس ہزار دینار تاوان دینے کی شرط پر صلح کر لی اور یہ بھی قید لگائی کہ جب فرنگی چلے جائیں گے تو وہ بھی مصر خالی کر دے گا اور اس معاہدہ کی رو سے شیرہ کوہ شوال ۵۶۲ھ میں شام واپس ہو گیا۔

فرنگیوں نے شادور سے ایک خفیہ معاہدہ کیا تھا کہ فرنگی سفیر قاہرہ میں رہے گا، بعض شہروں پر ان کا فوجی قبضہ ہو گا اور انہیں ایک لاکھ دینار سالانہ مصر سے بطور خراج ملتا رہے گا۔

شادور ایک طرح پران کی گرفت میں آ گیا تھا چنانچہ اس نے قاہرہ کی شہنگی ان کے حوالے کر دی اور شہر کے دروازے بھی ان کی سپردگی میں دے دیئے۔ انجام کار وہ مسلمانوں کو ستانے لگے۔

صفر ۵۶۳ھ میں بیت المقدس کے بادشاہ اموری نے اچانک مصر پر حملہ کر دیا اور بلبیس فتح کر کے اس کو پوری طرح لوٹا اور قاہرہ کو حصار میں لے لیا۔ اہل مصر نے قاہرہ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ان کا دباؤ بڑھتا گیا۔ آخر خلیفہ عاصد نے براہ راست نور الدین زنگی سے مدد کی درخواست کی۔ اس دوران شادور نے دس لاکھ دینار اور ایک روایت کے مطابق بیس لاکھ دینار دے کر عیسائیوں کو صلح پر راضی کر لیا۔

نور الدین زنگی نے مصر کی مدد کے لئے شیرہ کوہ کو صلاح الدین اور دوسرے امراء کے ساتھ آٹھ ہزار فوج دے کر روانہ کر دیا جس نے فرنگیوں کو شکست دے کر انہیں واپسی پر مجبور کر دیا پھر شادور کا سر کاٹ کر عاصد کے پاس بھیج دیا۔ عاصد نور الدین کے ممنون احسان تھے۔ انہوں نے شیرہ کوہ کو ملک المنصور اور امیر المیوش کے خطابات دے کر وزارت کے عہدے پر فائز کر دیا۔ شیرہ کوہ نے گورنروں کے عہدوں پر اپنے معتمدوں کو مقرر کیا، فوجیوں کو جاگیریں عطا کیں لیکن وہ دو ماہ پانچ روز وزارت کر کے ۲۲ جمادی الاخر ۵۶۳ھ میں وفات پا گیا اور اس کے بھتیجے صلاح الدین نے ملک الناصر کا خطاب پا کر قلمدان وزارت سنبھال لیا



صلاح الدین نے ایک طرف داد دہش سے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنایا، دوسری طرف عاصد سے بدظنی پیدا کرنے کے لئے عوام سے جاو بے جا رقوم وصول کرنا شروع کر دیں، پھر خلیفہ کو بھی نہیں بخشا، ان کو اس طرح لوٹا کہ ان کے پاس صرف ایک گھوڑا رہ گیا اور ایک دن وہ بھی مٹ گیا۔

یہ ہوا انجام المعز کے آخری جانشین کا، قاہرہ کا عظیم شہر جس کی یادگار ہے اور جامع ازہر نے جس کو غیر فانی بنادیا ہے۔

صلاح الدین نے امور سلطنت پر حاوی ہو کر خلیفہ کو عضو معطل بنادیا پھر ان یادگاروں کو مٹانا شروع کیا جن سے فاطمین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

جمادی الاخر ۵۶۶ھ میں دارالمعوضہ کو مدرسہ شافعیہ میں اور دارالعدل مدرسہ مالکیہ میں بدل دیا، قضاۃ شیعہ کو معطل کر کے پورے ملک میں شافعی قاضی مقرر کئے، عاصد کے قاضی القضاۃ کامل کو معزول کر کے عبدالملک بن درباس کو مصر کا قاضی القضاۃ بنادیا۔

اس وقت سے مصر میں مذہب شیعہ ناپید ہونے لگا اور اس کی جگہ مالکی اور شافعی مذہب نے لے لی۔ آخر صلاح الدین کے مظالم سے تنگ آکر قصر خلافت کے داروغہ خواجہ سراموتمن الخلافہ نے خفیہ خفیہ مصریوں کی ایک جماعت اکٹھا کر کے فرنگیوں کی مدد طلب کی لیکن یہ راز کھل گیا اور صلاح الدین نے دھوکے سے موتمن الخلافہ کو قتل کرادیا۔ پھر قصر خلافت کے تمام ملازمین کو برطرف کر کے اپنے کارندے مقرر کر دیئے اور اپنے معتمد خواجہ سراہاء الدین قراقوش کو محل کا داروغہ بنادیا۔

قلم جب اپنی انتہاء پر پہنچ گیا تو پچاس ہزار حبشیوں نے جمع ہو کر صلاح الدین کی فوج سے جنگ کی مگر حبشیوں کی نہ کوئی تربیت تھی اور نہ تنظیم، انہیں شکست ہوئی۔ ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی، جو بچے وہ بھاگ نکلے۔

صفر ۵۶۵ھ میں فرنگیوں نے دمياط کا محاصرہ کیا۔ نور الدین نے اطلاع پا کر ملک روانہ کی اور خود شام میں رومی علاقے پر حملہ آور ہو گیا۔ تیجے میں عیسائی دمياط چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ ۵۶۶ھ میں صلاح الدین نے ایلہ فتح کر لیا۔

محرم ۵۶۷ھ کے دوسرے جمعہ کو صلاح الدین نے مصر میں عاصد کا خطبہ موقوف کر کے مستضیٰ عباسی کا خطبہ جاری کر دیا۔ عاصد اس کے بعد ہی عاشور ۵۶۷ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اس کے ساتھ ہی سلطنت فاطمیہ کا ستارہ ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

قرمانی لکھتا ہے کہ عاصد شدید التشیع تھے اور سب صحابہ میں مبالغہ کرتے تھے، خود صلاح الدین کو اعتراف تھا کہ اس نے عاصد سے زائد سخی اور کریم نہیں دیکھا۔ وہ بڑے نرم مزاج تھے اور رعایا سے بہت محبت کرتے تھے۔

عاصد کی وفات پر صلاح الدین نے ان کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا اور اہل و عیال کو محل کے ایک گوشے میں قید کر دیا۔ وہ سب آہستہ آہستہ اسی عالم میں مر گئے۔ جو ۶۱۰ھ کے زندان شام کی پیروی تھی۔ یہ تھا ہلا جہاد صلاح الدین ایوبی کا جو اس نے شیعوں کے خلاف کیا اور عالم اسلام جس کے لئے بڑے فخر سے اس کا نام لیتا ہے۔

مسلمانوں میں ایک تفرقہ حضور کی حیات دنیاوی کے اختتام پر پڑا تھا۔ کسی نے آپ کو صرف پیغمبر مانا اور کسی نے ایک سراپا ہدایت فرمانروا گردانا۔ یہ نظریاتی اختلاف آج تک پایا جاتا ہے۔

دو سرائفکری اختلاف شیعوں میں ایام جعفر صادق کی رحلت کے بعد پیدا ہوا اور ایک گروہ نے امام موسیٰ کاظم کو امام تسلیم نہیں کیا بلکہ امام صادق کے بیٹے اسمعیل کو امام قرار دیا جو آپ کے حین حیات انتقال کر چکے تھے۔ محمد بن اسمعیل کے یہ پیرو اپنی باطنی تحریک کو لے کر اٹھے اور انہوں نے مصر میں اپنی خلافت قائم کر لی اسمعیلیوں کے سلسلہ امامت میں چودہ تاجدار گزرے جن کے محولہ بالا حالات مسلم تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ امامت کا ایک موروثی تسلسل نزار سے بھی چلتا ہے، جس سے اسمعیلیوں میں کئی شاخیں ہو گئی ہیں۔

ایک شاخ حسن بن صباح کی ہے جنہیں شیخ بلبال بھی کہا جاتا ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ نزار کو دار پر چڑھا دیا گیا تھا مگر حسن بن صباح کے فدائی اس کو تسلیم نہیں کرتے، وہ نزار کی بغبت کے قائل ہیں۔



اسی طرح خلافت فاطمین کے بعض فرمانرواؤں کا تشیع انہیں اپنا عہد ثابت کرتا ہے لیکن اس سے موضوع بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسماعیلی بوہریہ اساسی طور پر شیعوں میں شامل تھے اور شامل ہیں اور بیشتر اصول شیعیت ان کی طرف سے مجروح نہیں ہوتے اس لئے ان کی سرگزشت تاریخ شیعان علی کا حصہ سے فاطمین مصر کی دو سو پچھتر سالہ تاریخ خلافت یقیناً ماضی کے عروج و زوال کی وہ داستان ہے جس کے سامنے صرف خلافت بغداد قرطبہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ بغداد و قرطبہ کے فرمانرواؤں نے انسان اور انسانیت کے لئے جو کچھ کیا، اس کو تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے لیکن قاہرہ کی خدمات انسانی اور تجلیات عمرانی زیر قلم صفحات کی ضرورت ہیں۔

مشرقی تہذیب میں رعایا کو بادشاہ کی اولاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فاطمین مصر نے اس کی عملی تصاویر پیش کیں۔ وہ خود کتنے بڑے انسان اور کس قدر ہادیانہ صفات کے حامل تھے؟ اس کی صراحت ابن اثیر، ابن خلکان، ابن خلدون، مقرئزی اور دیگر مورخین نے کی ہے اور علیحدہ علیحدہ خلفائے مصر کی سیرت و کردار کے جو خاکے پیش کئے ہیں، انہیں دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ شریف بھی تھے، زاہد و پاکباز بھی، مفکر و سیاستدان بھی، عالم و فقیہ بھی اور ان کی اکثریت اپنے پہلو میں ایک دل دردمند رکھتی تھی۔

فاتحین عالم میں ان کا شمار نہ کیا جائے، تب بھی اہل سیف اور شجاع تو مانا ہی جائے گا۔ ان کی شوکت و سطوت، رعب و داب انہیں سلاطین اعظم کی صف میں لاکھڑا کرتا ہے لیکن اس بلندی پر ہونے کے باوجود وہ جابر و ظالم کہے نہیں جاسکتے۔ ان کی سلطنت بھی دوسری سلطنتوں کی طرح دور دور تک پھیلی پھر اپنے مرکز کی طرف سمٹ کر ایک نئے فاتح صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں فنا ہو گئی لیکن انہوں نے جو اپنے نقوش قدم چھوڑے ہیں، وہ آج بھی باقی ہیں اور انکی قائم کی ہوئی علمی درسگاہ آج بھی عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔

جسٹس امیر علی نے ہسٹری آف سیراسنز میں ان کی عمرانی اصلاحات کا ایک مختصر سا قلمی خاکہ پیش کیا ہے جو ان کی عظمت کے ایک پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔

### فاطمین کے نقوش قدم

۲۴ جمادی الثانی ۳۵۹ھ مطابق ۱۴ مئی ۹۶۹ء کو جوہر نے قاہرہ کی داغ بیل ڈالی تھی اور المعز کے پہنچنے سے قبل فصیلیں بن چکی تھیں۔ عالیشان عمارتیں آناً فاناً تیار ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت خوبصورت شہر وجود میں آگیا جس کی پختہ سڑکیں باہر مضافات تک چلی جاتی تھیں اور حارات کہلاتی تھیں۔ بازاروں کو احاطہ کہتے تھے جو فصیل تک جا کر ختم ہوتے تھے۔ خلیفہ کا خاص محل جس میں بارہ گنبد دار ایوان تھے، شہر کے مشرقی حصہ میں واقع تھا اور جس کا نام قصر الکبیر الشرقي یا قصر المعزى تھا۔ محل کے دس پھانک تھے، ہر پھانک پر فوج کا ایک دستہ متعین رہتا، ہر دستہ میں پانچ سو سپاہی پیدل اور پانچ سو سوار ہوتے۔ محل کے بارہ ہزار خدمتگار تھے اور اس سے ایک زمین دوز راستہ دوسرے عالی شان محل کی طرف جاتا تھا جو دریائے نیل کے کنارے شہر کے مغربی حصہ میں واقع تھا اور جس کو قصر المغربی یا قصر البحر کہتے تھے۔ شہر کے اندر اور باہر خلیفہ کے اور بھی کئی محل اور مکان تھے جن کی بچی کاری اور گکاری چین کے نقش و نگار کو مات کرتی تھی اور کندن کی جھلک ستاروں سے چشمک زنی کرتی تھی۔ امیروں کے محلات کاری گری کا اعلیٰ نمونہ تھے، مگر رقبہ میں شاہی محلوں سے کم تھے۔ خوبصورت باغات کے مناظر، ان کے گرد مکانات کی قطار، ہوشمند اور طرار سیاحوں کو بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیتی تھی۔

پندرہویں اور سولہویں صدی کے یورپین سیاح اس پر روضہ رضواں یا باغ جنان کا گماں کرتے تھے۔ مسجدیں، کالج، شفاخانے، بڑے بڑے ہوٹل اور سرائیں شہر میں ہینماں تھیں۔ چار جامع مسجدیں تھیں جن کی شان و شوکت دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی تھیں، بنی فاطمہ کا بنایا ہوا ایک امام باڑہ بھی تھا جس کو حسینہ کہا جاتا اور جس کی عمارت ایسی خوبصورت تھی کہ چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اس امام باڑے میں ایام عاشورہ میں مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔



مردوں اور عورتوں کے واسطے عالیشان حمام بنے ہوئے تھے۔ عورتوں کے حمام فوراً شناخت ہو جاتے تھے کیونکہ ان کی ظاہری نمائش مختلف تھی۔ منڈیوں میں بیس ہزار دوکانیں تھیں جو دنیا کی پیداواروں سے بھری رہتیں اور جن کی آراستگی دیکھ کر گمان ہوتا کہ رسیوں کی کوٹھیاں ہیں۔ شہر کے گرد ایک بڑی مضبوط فصیل تھی۔ چند بڑے بڑے دروازوں کے نام حسب ذیل تھے۔ الباب النصر، الباب الفتوح، الباب القنطرہ، الباب الذوطلہ اور الباب الحج۔ مستول لوگوں کی دلچسپی بازوں اور شکروں سے پرندوں کے شکار اور کتوں سے ہرنوں کا تعاقب کرانے پر مرکوز تھی۔ دریہ کے کنارے رہنے والے ملاح دریائی گھوڑے شکار کرتے تھے۔

سلطنت کے انتظامی محکمے اور صیغے عباسیوں کی طرح تھے مگر چند کے نام مختلف تھے اور ان محکموں میں نمایاں فرق بھی تھا۔ مصر میں امیر المیوش کا بڑا اقتدار ہوتا تھا۔ وہ کمانڈر انچیف اور وزیر دونوں کا کام کرتا تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ امیر المیوش ہی بادشاہ ہوتا تھا۔ ابتدائی خلفاء کے عہد میں امیر المیوش صرف اپنا منصبی کام ہی کرتا تھا مگر مستنصر کے عہد سے بنی فاطمہ کا آفتاب ڈھلنا شروع ہوا اور سازش اور گروہ بندی نے حد بر کی جگہ چھین لی تو سب نفسا نفسی میں ہٹتا ہو گئے۔ صرف سیاسی حیثیت ہی عزت و حرمت کا ذریعہ رہ گئی۔ علماء کی جگہ جاسوسوں نے لے لی اور لمبا مدار و باوقار آزاد طبع لوگوں کے بجائے خوشامدیوں اور منافقوں کی قدر ہونے لگی۔ حکام نے لوگوں میں پھوٹ ڈلوانے اور سازشیں کرانے کو ہی ملک داری سمجھ لیا مگر ان سفہانہ کوششوں کا خمیازہ آخر خود انہیں کو بھگتنا پڑا۔

خلفائے فاطمی علم و ہنر کے بڑے مربی تھے۔ انہوں نے دارالعلم، کتب خانے اور دارالحکمت قائم کئے تھے، بڑی بڑی کتابیں، علم ہندسہ اور سائنس کے متعلق آلات فراہم کئے تھے، لکھنے کا سامان مفت دیا جاتا، خلفاء علمی مجلسیں منعقد کرتے جن میں مدارس اعلیٰ کے پروفیسر، منطقی، مہندس، فقیہ، حکیم اپنا اپنا خاص لباس یعنی خلع پہن کر شریک ہوتے تھے۔ انگریزی یونیورسٹیوں میں جو گاؤن

گرجویٹوں کو دیئے جاتے ہیں وہ بالکل اسی طرح کے ہیں جس طرح کے خلع ہوتے تھے دو لاکھ ستاون ہزار دس سالانہ کالوں، پروفیسروں اور تعلیمی افسروں کی تنخواہوں، تعلیمی سامان اور علمی آلات پر خرچ کئے جاتے اور بطریق شائستہ رعایا سے وصول کئے جاتے تھے۔ ہر علمی شاخ کی تعلیم عام تھی۔ علم ہیئت کو شائع کرنے کے لئے رصد گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ ایشیا اور ہسپانیہ سے بڑے بڑے عالم اور سائنسدان ان ایوان ہائے علوم و فنون کو زینت دینے کے لئے بلائے گئے تھے۔

بنی فاطمہ کی تاریخ کو مکمل کرنے کے لئے اس عجیب تحریک کا ذکر ضروری ہے جو انہوں نے اپنی رعایا میں علم پھیلانے کی غرض سے پیدا کی تھی، وہ یہ تھی کہ بنی فاطمہ اپنے فرقے میں غیر مذاہب کے لوگوں کو شامل کرنے سے جو سیاسی فائدہ مرتب ہو سکتا ہے اس کو نظر انداز نہ کرتے۔ بڑے دارالحکمت کے متعلق ایک گرانڈ لاج تھی جس میں اسماعیلی مذہب کے سرپاراز اصول سے واقف ہونے کے خواہش مندوں کو اس مذہب کے عقائد کی تعلیم دی جاتی تھی، ہفتہ میں دو بار یعنی شنبہ اور دو شنبہ کو داعی الدعاة جو وزیر یا قاضی القضاۃ ہوتا، جلسہ کا انعقاد کرتا جس میں مرد اور عورتیں سفید لباس زیب تن کئے شامل ہوتی تھیں ان جلسوں کو مجالس الحکمت کہتے تھے۔ کارروائی شروع کرنے سے قبل داعی الدعاة، گرانڈ ماسٹر کا یعنی خلیفہ کا انتظار کرتا اور جب وہ آجاتا تو داعی الدعاة اس کو وہ لیکچر پڑھ کر سناتا جو نئے ممبروں کو سنانا ہوتا تھا، اس پر خلیفہ اپنے دستخط ثبت کر دیتا تھا۔ لیکچر سن چکنے کے بعد نووارد، داعی الدعاة کے ہاتھ پر بوسہ لیتے اور گرانڈ ماسٹر کے دستخط کو پیشانی سے لگاتے۔ مقتدی نے اس لاج کے مختلف درجوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمسنری کی تاریخ کا نقشہ پیش کیا ہے جو حقیقتاً قاہرہ کی لاج سے نقل کی گئی ہے۔

دارالحکمت کی سیاسی شان تو اس کے بانیوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی مگر اس کی علمی شعاعوں نے مملوکوں کی افراتفری کے زمانے تک مصر کے شہروں کو منور رکھا اور اس کے جو راز تھے وہ زمانہ دراز گزر جانے کے باوجود آج تک ویسے ہی ہیں اور مختلف مذہب و ملت کے اقوام و ممالک میں اسی طرح اپنی شان دکھا رہے ہیں۔



قاہرہ میں بے شمار کالج تھے۔ شاہی کتب خانے میں نہایت خوشخط اور کمال خوبصورتی سے مجلد کی ہوئی ایک لاکھ قلمی کتابیں تھیں جو طلباء کو بلا تامل مستعار دی جاتیں۔ فاس قیروان اور دیگر افریقی شہروں میں علم کے دریا بہہ رہے تھے۔ فاس کے کتب خانہ اعظم میں یونانی مورخ لیوی کی تصنیفات کا مکمل عربی ترجمہ موجود تھا۔

### شیخ الجبال

مذکرہ فاطمین کے ذیل میں وہ فرقہ نظر انداز نہیں ہو سکتا جس نے محمد بن اسماعیل المعروف بہ امام مکتوم سے اپنا رشتہ تو برقرار رکھا لیکن عقائد کی حد تک اپنا راستہ الگ بنالیا، یہ فرقہ حسن بن صباح کا ہے جو نزار کی امامت کا قائل ہے۔

حسن بن صباح، چونکہ نزار کی خدمت میں رہتے تھے اور ان کی عظمت کے قائل تھے لہذا ان کے متبعین اپنے کو نزاری کہتے ہیں۔ ابن خلدون نے ان کے نظریات کو قرامطہ کے مشابہ قرار دیا ہے جبکہ جسٹس امیر علی کا خیال ہے کہ حسن بن صباح مزدک ومانی کے فلسفے سے متاثر تھے۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن حسن بن صباح کے عقائد اصل اسماعیلیوں سے مختلف تھے جو فی زمانہ بواہر کہلاتے ہیں۔

کسی مورخ کے تبصرے سے قطع نظر کر کے "حسن" کی شخصیت اور مبلغ علم کو دیکھا جائے تو وہ رے کے باشندے تھے۔ مختلف درگاہوں میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی، نجوم، ہندسہ اور ریاضیات کے ماہر تھے اور اگلی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو ایک عالی دماغ، مہم جو اور مستقل مزاج انسان تھے، تب ہی فاطمی خلیفہ مستنصر نے دعوت باطنیہ دینے کے لئے منتخب کیا تھا۔

یہ خدمات انہوں نے بڑی خوبی سے انجام دیں پھر اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہو گئے جو نجانے کب سے ان کے ذہن میں پل رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فاطمی داعی احمد بن غفاش کے اثر سے باطنی تحریک کے داعی بنے تھے اور اس کے بعد مستنصر کا تقرب حاصل کیا تھا۔ بہر طور انہوں نے شام، جزیرہ، دیار بکر، خراسان، کاشغرا اور ماوراء النہر کا دورہ کیا اور قلعہ "الموت" کو اپنے مقصد کے لئے تجویز کیا جو ایک علوی کی ملکیت تھا۔ حسن نے اس سے تعلقات استوار کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، پھر ان کے

مریدوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا رہا اور دشمنوں کو رستے سے ہٹا دینا ان کا شغل ہو گیا۔ اسی قلعہ سے حسن نے نظام الملک طوسی پر حملہ کرایا تھا اور سلجوقیوں کا عظیم وزیران کے فدائیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترا تھا، پھر انہوں نے قلعہ خالنجان، اسویا، الرمل، ملاذخان اور کتنے ہی دوسرے قلعوں پر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔

حسن بن صباح کی تعلیمات کتنی خرائگیز تھیں، اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی جنت ارضی اتنی دلکش ضرور تھی کہ آدمی ایک بار اس میں داخل ہوتا تو باہر آنے کا جی نہ چاہتا پھر حشیش کا استعمال اس سے قبل شاید دوسرے لوگوں نے نہ کیا ہو یا پھر عام نہ ہو اور حسن بن صباح اولین اشخاص میں سے ہیں جو اس کو عربی کے طور پر بروئے کار لائے۔ اس سلسلے میں یقیناً حاشیہ آرائی کی گئی ہے مگر اس کو بالکل بے بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔

وجوہ پر یقینی رائے زنی ممکن نہیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شیخ الجبال کا ایک اشارہ ان کے مرید کے لئے کافی ہو گا اس کے بعد کسی کی جان لینا تو درکنار، وہ خود اپنے گلے پر چھری پھیر سکتا تھا۔

یہی سبب تھا جو کوئی چھوٹا بڑا اپنے کو فدائیوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ سمجھتا۔ باطنیت کے پرستاروں کا طریق جنگ مام سپاہیوں کی طرح نہ تھا۔ وہ پہلے جاسوسوں کے انداز سے کسی مقام پر اپنی جگہ بناتے پھر متعلق شخص یا اشخاص پر حملہ کر دیتے۔ وہ بڑے دلیر اور جیالے ہوتے مگر عربوں کا استعمال ہمیشہ کمین گاہوں سے کرتے اور حیلہ سازی کر کے بڑے بڑے کام سرانجام دیتے۔ نظام الملک کو بھی انہوں نے اسی طرح مارا تھا۔

ان کے قلعے ہر طرح مضبوط ہوتے۔ ان میں مہینوں کے دفاع کا سامان موجود رہتا۔ آلات حرب و ضرب کے ساتھ ساتھ ان قلعوں میں زردجوہر کے انبار لگے رہتے جو لوٹ کے ہوتے۔ لاتحین مفتوحہ ممالک سے خراج وصول کرتے ہیں، باطنین اپنی پناہ میں لئے ہوئے افراد سے زر مہمانہ یا زر سالانہ وصول کرتے تھے۔

یقیناً انہوں نے امن عامہ کو تباہ کر دیا تھا لیکن عوام ان کی زد سے محفوظ



تھے، ان کا نشانہ صرف دشمن یا خواص ہوتے، انہیں پروہ خنجر آزمائی کرتے اور وہی ان کا نشانہ ستم بنتے تھے۔

شیخ الجبال کی حیثیت ایک فرقے کے رہنما کی ہے۔ متبعین کا کہنا ہے کہ وہ اپنے مسلک کی اشاعت خفیہ خفیہ تو کر چکے تھے، اب انہیں کھلے بندوں اپنا پیغام پہنچانا تھا، اگر وہ مٹھی بھر سرفروشوں کو لے کر میدان میں نکلتے تو ان کا بھی وہی حال ہوتا جو بوہی، عقلی اور مزیدی حکمرانوں کا ہوا لہذا انہوں نے اپنے لئے ایک نیا راستہ تجویز کیا اور چند قلعة مسخر کر کے انہیں حصن حصین بنالیا تاکہ قوت حاصل ہو جانے کے بعد سلجوقیوں کے مد مقابل آسکیں لیکن یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

قتل و غارت کے لئے استدلال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے عام فاتحین کی طرح زمین کو انسانی خون سے لالہ زار نہیں کیا بلکہ چیدہ چیدہ افراد کو قتل کیا جس سے ایک خوف اور دہشت پھیلی مگر عام آدمی اس سے متاثر نہیں ہوا اسی لئے داعمین جب عوام میں گھس کر اپنے نظریات پیش کرتے تو دو چار آدمی اسکو قبول ضرور کر لیتے تھے۔

باطنی مقلد شیخ کو فاتحین عالم کے مقابلے میں لاکھڑا کرتا ہے تو کہتا ہے کہ لوٹ مار اور مال غنیمت میں دونوں برابر ہیں مگر فاتحین کے دامنوں پر بے گناہ شہریوں کے خون کے دھبے نظر آتے ہیں، شیخ الجبال کو کسی عوامی خونریزی میں ملوث نہیں کیا جاسکتا، وہ اپنے مضبوط قلعوں کے ساتھ دولت اس لئے اکٹھا کر رہے تھے کہ جس طرح طغزل بیگ نے آہستہ آہستہ سلجوقی حکومت کو پھیلا یا تھا اسی طرح باطنی حکومت کی داغ بیل ڈالیں۔

حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن حسن بن صباح کا اپنے قلعوں کو مستحکم کرنا کسی مقصد سے خالی نہ تھا مگر وقت نے مساعدت نہ کی اور سلجوقیوں نے ان خلاف لشکر کشی شروع کر دی۔

لدائیوں کے طریقہ کار میں یرغمال بنا کر استحصال کرنا بھی شامل تھا جس سے انہیں بے پناہ دولت ملتی تھی۔ سلجوقی فوجوں نے کئی مرتبہ ان کے خلاف اقدام کیا مگر خود نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔

ایک مرتبہ انہوں نے اصفہان میں سلطان برکیارق کے بیٹے محمد کو گھیر لیا تھا اور سلطان کو اس کی جان بچانے کے لئے ان کا مطالبہ پورا کرنا پڑا تھا، اس کے بعد برکیارق نے ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فوجی دستے اطراف میں پھیل گئے اور فدائی چن چن کر قتل کئے جانے لگے لیکن مرنا ان کے لئے شیخ کی تعلیمات کے مطابق حاصل حیات تھا، اسی لئے وہ کسی امیر پر آزمائش ستم کرتے اور خود گھر جاتے تو اس مقام پر اپنے کو بھی ہلاک کر ڈالتے..... چنانچہ برکیارق کے حین حیات فدائین کا استیصال نہ ہو سکا۔ سلطان محمد جب سلجوقیوں کا فرمانروا ہوا تو اس نے قلعة شاہ در کا محاصرہ کیا جس کا سربراہ احمد بن غطاش تھا جس کو حسن بن صباح کا استاد یادست راست کہا جاتا۔

مصورین کے سلجوقیوں سے مقابلے ہوتے رہے۔ آخر احمد بن غطاش نے درخواست کی کہ ان کو قریب کے قلعة میں نصف نصف کر کے جانے کی اجازت دی جائے تو وہ قلعة خالی کر دیں گے۔ سلطان محمد نے منظور کر لیا مگر جب آدھے فدائی جا چکے تو سلجوقیوں نے قلعة مہدم کر دیا، اسی (۸۰) فدائی مع احمد بن غطاش کے مارے گئے۔

اسی زمانے میں ابراہیم استرابادی کو بغداد میں قتل کیا گیا۔ اس کے بیٹے بہرام نے شام پہنچ کر قلعة بانیاس پر قبضہ کر لیا اور وہاں سے اپنے مسلک کی تبلیغ کرنے لگا، پھر اس نے اس پر اکتفاء نہیں کی اور ایک فوج مرتب کر کے بعلبک کے حکمران فصحاک پر حملہ کر دیا۔ سخت لڑائی کے بعد بہرام کو شکست ہوئی اور وہ رزم گاہ میں کام آیا۔

علی بن تفتکین باطنی تعلیمات سے متاثر تھا۔ اس عرصے میں اس نے اطراف میں تبلیغی مہمات روانہ کیں۔ ابو علی وزیر نے بھی اس سے تعاون کیا، پھر اس نے عوام کے خوف سے قلعة بانیاس عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔

اس نواح میں پہلے ہی سے باطنیوں کے کئی قلعة تھے جو ایک دوسرے کے متصل تھے، قلعة مصیات ان میں سب سے بڑا تھا ۵۴۲ھ میں جب صلاح الدین نے شام فتح کیا تو اس قلعة کو گھیرے میں لیا پھر اپنے ماموں کے کہنے سے محاصرہ اٹھالیا

حکومتیں بدلتی رہیں، طوائف الملوکی میں جب چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوئیں تو بعض پر شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ محب اہل بیت ہوں جیسے بنی حمود جو نفس ذکیہ کی اولاد میں سے تھے البتہ مغرب اقصیٰ کی صورت حال مختلف تھی وہاں کوئی قبیلہ شیعہ ہو یا نہ ہو لیکن آل رسول کی محبت کا دم ضرور بھرتا تھا۔

مراقش کی اداریسی سلطنت ختم ہو چکی تھی لیکن بنی ادریس کی تبلیغ نے اسنا کام کیا تھا کہ صحرا میں جہاں کہیں کوئی آبادی تھی وہاں اہل بیت کی عظمت کے چراغ روشن تھے۔ ایسی ہی ایک حکومت "اشراف سعدین" کی بھی تھی جسکے سر خانوادہ رسالت کے سامنے ہمیشہ عقیدت سے جھکتے رہے۔

### اشراف سعدین

مشہور تھا کہ اہل سجدہ نے جب سے ایک سید کو لا کر بسایا، ان کی برکت سے فصلوں کو فیض پہنچا ہے لہذا اہل ورع بھی حجاز کے شہر ینبع النخل سے نفس ذکیہ کی اولاد سے ایک بزرگ کو جا کر لے آئے ان کی آمد بھی ورع کی فصلوں کے لئے سعد ثابت ہوئی اس لئے وہ سعدین کہلائے۔

#### ابو محمد عبد اللہ اول

اس نے مسلمانوں کی ایک جماعت لے کر پرتگیزیوں کا مقابلہ کیا تھا اور ۹۱۷ھ میں انہیں سوس سے نکال دیا تھا لہذا سوس کا ہر دلعزیز بادشاہ بن گیا، نیک نفس، متقی، مستجاب الدعوات تھا، ۹۳۳ھ میں اس نے انتقال کیا۔

#### ابو العباس احمد اول

اس نے پرتگیزیوں کے کئی حملوں کو روک دیا تو ۹۳۰ھ میں اہل مراقش نے خود شہر اس کے حوالے کر دیا، فاس کے وطاسی بادشاہ نے چرمائی کی تو اس کو شکست دی، ۹۴۰ھ میں اس کے بھائی محمد الشیخ نے اسے گرفتار کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔

پھر سلجوقی حکمرانوں نے کئی قلعوں پر یلغار کی اور ان میں سے بعض کو فتح بھی کر لیا مگر قلعہ الموت اپنی جگہ پر رہا۔

اس کے بعد جلال الدین بن علاء الدین خوارزم شاہ جب ہندوستان سے واپس ہوا تو اس نے آذر بایجان اور آرمینیا کی تسخیر کے بعد اس قلعہ کا بھی محاصرہ کیا تھا مگر اس کو فتح نہ کر سکا اور باطنیوں کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں۔

تاریخوں کے خروج کے زمانے میں باطنیوں کے حملے بھی بڑھ گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہلاکونے اپنے دور اقتدار میں باطنیوں کی گوشمالی کی تھی اور شیخ الجبال کے ایک ساتھی خورشاہ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا تھا لیکن خود شیخ الجبال کے سلسلے میں مورخین میں اختلاف ہے، کسی نے یقین کے ساتھ کچھ نہیں لکھا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ سلطان بیبرس ملک الظاہر نے باطنی قلعوں کو مہدم کر لیا تھا، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہیں کہ حسن بن صباح کے انجام تک پہنچنے کے بعد بھی باطنی تحریک ختم نہیں ہوئی، ان کے قلعے بھی جا بجا باقی رہے جو امتداد زمانہ میں دھیرے دھیرے ختم ہو گئے اور باطنی بھی اپنا لائحہ عمل بدل کر عام شہروں میں شامل ہو گئے۔

اس مسلک کے لوگ آج بھی ساری دنیا میں موجود ہیں جو اسماعیلی خوجہ کہلاتے ہیں۔ شیخ الجبال حسن بن صباح سے ان کا سلسلہ امامت چلتا ہے جو آغا خان کی نسل میں ایک کے بجائے دوسرے کو منتقل ہو جاتا ہے۔

ان کے عقائد شیعوں سے بہت مختلف ہیں اور امام مکتوم محمد بن اسماعیل کے مسلک سے بھی علیحدہ ہیں پھر بھی وہ حضرت علیؑ کو نہ صرف امام اول مانتے ہیں بلکہ ان کے عقیدے میں نصیریت کی جھلک بھی پائی جاتی ہے اس لئے تاریخ شیعیان علیؑ سے انہیں نکالا نہیں جاسکتا۔

اندلس سے شیعوں کا براہ راست کوئی تعلق کبھی نہیں رہا ایک خیال یہ ہو سکتا ہے کہ موسیٰ بن نصیر، چونکہ دشمن اہل بیت نہ تھا، اس لئے ممکن ہے کہ حارث بن زیاد کی فوج میں کچھ شیعہ شامل ہوں جنہوں نے قیام اندلس میں اپنی نسل چھوڑی ہو اس کے بعد اموی عہد میں تو اس فرقے کے وجود کا امکان ہی نہ تھا پھر



بھی۔ اس نے اپنی سلطنت کو بہت وسعت دی، قصر بدیع اس کی یادگار ہے۔ بیدار  
مغز اور دور اندیش حکمران تھا، ۴۱۲ھ میں مر گیا۔ اس نے ایک خاص خط لہجہ کیا تھا  
جس میں حروف کے بجائے اعداد استعمال کئے جاتے اور ان اعداد کا مطلب صرف  
اس فن کو جلنے والا ہی سمجھ سکتا۔ یورپ کا خط شجرہ اسی کی نقل ہے۔

زیدان

وہ فاس کا بادشاہ ہوا تو مراقش میں اس کا چھوٹا بھائی ابو فارس تخت پر بیٹھا  
زیدان نے دوسرے بھائی محمد الشیخ کو ابو فارس کے مقابلے پر روانہ کیا جس سے  
عوام زیدان کے خلاف ہو گئے اور وہ تلمسان کی طرف بھاگ گیا۔ ۴۱۳ھ میں محمد  
الشیخ فاس پر قابض ہو گیا اور اس کے بیٹے عبداللہ نے مراقش ابو فارس سے چھین لیا  
مگر وہ ظالم تھا لہذا زیدان نے عوام کی مدد سے اس کو نکال دیا۔ ۴۱۵ھ میں عبداللہ  
نے زیدان کو مار بھگایا، اس طرح ان کے درمیان برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔  
زیدان اور اس کی اولاد عرصے تک مراقش میں حکمران رہی اور عبداللہ فاس پر  
قابض رہا۔ زیدان نے ۴۳۷ھ میں وفات پائی، وہ زبردست عالم اور دینیات اسلام کا  
ماہر تھا۔

عبدالملک، ولید، محمد الشیخ اور ابو العباس احمد

یکے بعد دیگرے مختلف مقامات کے بادشاہ ہوئے اور مسلسل ایک  
دوسرے سے لڑتے رہے اور ان کے علاقوں پر دوسرے لوگ قبضہ کرتے رہے۔  
۴۷۹ھ میں مولار شید لٹالی نے ابو العباس کے بیٹوں اور دیگر اہل خاندان کو قتل  
کر کے اس خاندان کی حکومت کو ختم کر دیا جس کی مدت ڈیڑھ سو سال رہی اور  
جس کا مسلک شروع شروع میں شیعہ تھا پھر بدلتا رہا لیکن وہ ہمیشہ اہل بیت کی  
عظمت کے قائل رہے۔

اشراف فلالی (سجلہ سہ)

نفس ذکیہ کی نسل سے ایک بزرگ مولیٰ حسن بن قاسم ۶۶۳ھ میں  
سجلماسہ پہنچے۔ بنی مرین نے ان کی بڑی عزت و توقیر کی۔ وہ نہایت صالح، زاہد و مستقی،  
عالم و فاضل اور باکمال تھے، اپنے پند و نصائح سے انہوں نے اہل سجلماسہ کو بڑا فنیس

ابو عبداللہ محمد، ابو المعروف بہ الشیخ

اس نے ۹۳۸ھ میں اپنے ملک سے پرتگالیوں کو نکال دیا، ۹۵۵ھ میں ایک  
خونریز جنگ کے بعد مکناسہ اور ۹۵۶ھ میں وطاسیوں کا دارالسلطنت فاس فتح کر لیا۔  
۹۵۷ھ میں اس نے ترکوں سے تلمسان چھین لیا اور کل مغرب اقصیٰ کا بادشاہ بن  
گیا۔ وہ سلیمان پاشا والی قسطنطنیہ کو براہ کتا تھا اور ان سے صلح منظور نہ کرتا اس  
لئے ترکوں نے سازش کر کے ۹۶۳ھ میں اسے قتل کر دیا پھر مراقش کے گورنر نے  
ابو العباس اور اس کے بیٹوں کو بھی دھوکے سے مروا دیا۔ محمد بزامبر، عالی دماغ  
اور باہمت بادشاہ تھا۔

ابو محمد عبداللہ الغالب بالله

دور حکومت کے پہلے ہی سال حسن پاشا والی الجزائر نے تلمسان پر حملہ کیا  
مگر شکست کھائی۔ ترکوں سے اس کو سخت نفرت تھی، ان کی ضد پر اس نے حجر  
بادیس اس شرط پر اسپین کے حوالے کر دیا کہ وہ ترکوں پر بحری حملہ کرتا رہے گا۔  
۹۸۰ھ میں مغربی ساحل پر پرتگیزیوں نے حملہ کیا تو ان کے جہازوں کو غالب نے  
لوٹ لیا جن پر ہندو رہ سو تو وہیں تھیں۔ ۹۸۱ھ میں وہ وفات پا گیا۔

ابو عبداللہ متوکل

اس کے چچا عبدالملک اور احمد قسطنطنیہ سے پانچ ہزار کا لشکر لے کر حملہ  
آور ہوئے، عرصے تک لڑائی ہوتی رہی، ۹۸۳ھ میں متوکل فرار ہو گیا۔

عبدالملک معتصم

متوکل اس کے خلاف سبا بچین شاہ پرتگال کو چرمھالایا، زبردست جنگ ہوئی  
جس میں متوکل اور سبا بچین دونوں مارے گئے۔ اسی دوران معتصم کا انتقال  
ہو گیا اور احمد اسکی جگہ بادشاہ ہوا۔ معتصم ترکوں کے رنگ میں رنگ گیا تھا مگر  
متوکل اپنی روش پر قائم تھا۔ وہ زبردست عالم اور مناظر تھا۔

احمد منصور دبالہ

اس سے ترکوں کے تعلقات اچھے تھے اور یورپ کے بعض حکمرانوں سے

ہنچایا اور ان کی برکت سے سبلماسہ میں ایک خوشحالی کا دور آگیا۔

ان کا بیٹا مولیٰ محمد بھی باپ کے نقش قدم پر تھا۔ وہ بھی سبلماسہ کی دینی قیادت کرتا رہا۔ اس طرح یہ سلسلہ محمد بن محمد بن علی تک پہنچا۔

اشراف سعدین کے آخری دور میں کسی عصبیت کی بناء پر سوس کے حکمرانوں نے گورنر سبلماسہ کے ذریعہ محمد بن محمد بن علی کے والد شریف محمد کو گرفتار کرالیا۔ محمد نے زرنہ دے کر انہیں چھڑایا مگر اپنی طاقتی کا احساس پیدا ہو گیا اس وقت سے محمد بن محمد نے جمعیت فراہم کرنا شروع کر دی۔

زہد و تقویٰ کے حامل اور سجادہ عبادت کے وارث کو جنگ و جدل سے کیا کام تھا لیکن دنیا نے قلم و تشدد سے مدافعت کی صلاحیت کو ناگزیر قرار دیا تو محمد بن محمد نے ایک دن سبلماسہ کے گورنر کو شکست دے کر نکال دیا اور عوام نے برضا و رغبت اس کی بیعت کر لی۔ ۱۲۵۰ھ سے ۱۲۶۵ھ تک سبلماسہ پر اس نے حکومت کی

شریف محمد بن محمد

اس نے سبلماسہ پر قبضے کے بعد خود سوس پر حملہ کیا پھر ورعہ فتح کیا۔ ۱۲۶۰ھ میں اس نے برتاسن کا ایک حصہ ترکوں سے لے لیا۔ وہ الجزائر پر حملہ کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ بھائی مولیٰ رشید نے بغاوت کی، جنگ ہوئی اور وہ مولیٰ رشید کی گولی سے مارا گیا۔

مولیٰ رشید بن محمد

اس نے ۱۲۷۶ھ میں تازا اور فاس بھی فتح کر لیا۔ ۱۲۷۹ھ میں مراقش پر بھی قبضہ کر کے اپنا سکہ اور خطبہ بھی جاری کر دیا۔ ۱۲۸۱ھ میں ابو حسون کی اولاد سے سوس کا علاقہ بھی چھین لیا۔ ۱۲۸۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ رعایا اس کے عہد میں خوشحال تھی اور علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔

مولیٰ اسماعیل بن محمد

امراء نے اس کے بھتیجے ابو العباس کو مراقش کا حکمران بنایا تھا مگر وہ فاس میں تخت نشین ہوتے ہی مراقش پر چڑھ دوڑا۔ ابو العباس مراقش سے فاس آگیا۔ واپس ہو کر مولیٰ اسماعیل نے ۱۲۸۳ھ میں اس کو قتل کر دیا اور مکناسہ کو

دار الحکومت بنالیا۔

۱۲۸۹ھ میں وہ ایک بڑا لشکر لے کر الجزائر پر حملہ آور ہوا مگر ترکوں سے طے پا گیا کہ دریائے تافنا اس کے اور ترک علاقے کے درمیان حد فاصل رہے گی۔ ۱۲۹۲ھ میں اس نے اسپین سے مہدیہ پھر ۱۲۹۵ھ میں طنجہ انگریزوں سے چھین لیا۔ ۱۳۰۰ھ میں العرائش اور ۱۳۰۲ھ میں اصیلا اسپین کے قبضے سے نکال لیا۔ ان فتوحات کے بعد مولیٰ اسماعیل نے ملک اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا اور ۱۳۳۹ھ میں سفر آخرت کر گیا۔

اسماعیل ایک اقبال مند اور شجاع حکمران تھا۔ اس کی قلمرو کی حدود جنوب میں سوڈان اور مشرق میں بسکرہ پر ختم ہوتی تھیں۔ اس کی تعمیرات عالم کی عظیم عمارتوں کے سامنے قابل ذکر ہیں۔ اپنی اولاد کو اس نے علوم و فنون میں ماہر کیا تھا۔ اسکے بعد ابو العباس ذہبی، عبداللہ اور محمد بن عبداللہ بادشاہ ہوئے جو آپس میں دست و گریباں رہے اور ان کے علاقے آہستہ آہستہ مغربیوں کے ہاتھوں میں چلے گئے، بعض پر ترکوں نے قبضہ کر لیا۔

محمد بن عبداللہ کے بعد سات فرمانروا اور گزرے: یزید بن محمد، سلیمان بن محمد، عبدالرحمان بن ہشام، محمد بن عبدالرحمن، حسن بن محمد، عبدالعزیز بن حسن اور یوسف بن حسن۔

۱۳۳۱ھ میں اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور فرانس اور اسپین نے اس کو آپس میں تقسیم کر لیا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن عبداللہ یا اس کے پیش رونے اپنا عقیدہ بدل لیا تھا اس کے بعد تمام حکمران غیر شیعہ گزرے۔ شروع کے چھ فرمانروا نہ صرف ناموں سے بلکہ عمل سے بھی اہل بیت کے طرفدار تھے۔ (۴۰)



## مغل سلطنت

شیعیت اصولی طور پر کبھی جارحانہ فوج کشی کی حامی نہیں رہی بلکہ اس نے تسخیر ملک کے لئے خونریزی کی ہمیشہ ممانعت کی اور شیعوں کے آئمہ نے اپنے پیروں کو اس کی اجازت بھی نہیں دی لہذا اعلیٰ کے کسی فدائی نے اگر فوجی طاقت کے بل پر کوئی علاقہ فتح کیا تو اسے اس کا ذاتی فعل قرار دیا جائے گا۔

اس پابندی کے باوجود کوئی تین سو برس تک شیعہ چھوٹے اور بڑے ہیمنے پر اقتدار کے لئے لڑتے رہے اور اس مدت میں ان کی شمشیر آبدار نے وہ جوہر دکھائے جس کی نظیریں آگے چل کر صلاح الدین ایوبی نے پہلے شیعہ کشی میں پھر عیسائیت کا غلبہ روکنے کے لئے پیش کیں۔

عیسائیت سے مسلمانوں کا ٹکراؤ بنی امیہ کے عہد سے شروع ہوا تو اس وقت تک جاری رہا جب تک اہل اسلام میں کچھ دم ختم باقی رہا۔

عباسی عہد میں بھی عیسائیوں سے مسلمانوں کے معرکے ہوئے جس میں شیعوں نے بھی حصہ لیا اور حمدانیوں میں سیف الدولہ کی عمرہ صلیبی سوراؤں سے لڑتے گزر گئی۔ پھر سلجوقی عہد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اسی دور میں لبنان کے بنی عمار نے ایک عرصے تک صلیبی سیلاب کو روک رکھا۔

اس سلسلے میں عماد الدین زنگی اور نور الدین زنگی کے کارنامے مسلمانوں کی تاریخ میں محفوظ ہیں اور ان کے بعد صلاح الدین کسی مرد آہن کی طرح پورے یورپ کے سامنے تنہا ایستادہ نظر آیا۔

صلاح الدین ایوبی نے مصر کی فاطمی سلطنت کا جنازہ اپنی نوک شمشیر پر اٹھا کر قبرستان پہنچایا تھا پھر زنگی سلطنت کے وارث کی حیثیت سے کوس لمن الملک بجایا تھا لیکن اس کے بعد مسلم سلطنت کئی حصوں میں بٹ گئی: شام، مصر، خوارزم اور دوسری چھوٹی چھوٹی حکومتیں۔ ایسے میں تاتاریوں کا سیلاب اٹھ کر خوارزم کی طرف بڑھنے لگا۔

شیعہ حکومتیں یخ و بن سے اکھڑ چکی تھیں۔ افراد اب بھی موجود تھے جو پہلے کی طرح بکھرے ہوئے تھے اور عام مسلمانوں کی طرح علی الاعلان یا تقیہ میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تاتاریوں کی یلغار میں وہ بھی ہر مقام پر اس دیوار میں شامل ہے جو تاتاریوں کو روکنے کے لئے کہیں کہیں بنائی گئی اور دیوار گرنے سے وہ بھی مسلمان کی حیثیت سے پستے رہے۔

تاتاریوں کی یورش کا ذمہ دار یقیناً علماء الدین خوارزم تھا جس کی بزدلی مسلم تاریخ کا المیہ ہے۔ تاہم باپ کی کمی اس کے بیٹے جلال الدین نے پوری کی۔ وہ عالم اسلام کو تباہی سے تونہ بچا سکا مگر جو انہر دی کا ایک سک تاتاریوں پر بھی بٹھا گیا

عراق، ایران و شام خون میں نہا گیا اور مسلمانوں پر من حیث القوم ایسی قیامت ٹوٹی جو شاید پاداش تھی صدیوں کے ظلم و ستم کی اور جس کے اسباب میں ان کی تفریق و انتشار کو بڑی اہمیت دی جاسکتی ہے۔

تاتاریوں کا معمول تھا کہ جس مقام کو فتح کر کے پامال کرتے اس کے باقیات الصالحات کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ ان میں علماء، فقہاء اور فنکار سب شامل ہوتے۔ اس طرح چنگیز خان کے نائب ہلاکو خان کے پاس ایران میں بڑے بڑے ماہرین علوم و فنون جمع ہو گئے تھے جن میں شیعوں کے شہرہ آفاق عالم نصیر الدین طوسی بھی تھے جو ماہر ریاضیات بھی تھے اور استاد فلسفہ بھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہلاکو کو بغداد پر حملے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو شیعوں کے خون ناحق کا انتقام تھا ورنہ محسوس یہی ہوتا ہے کہ مسلمان مورخین نے قرائن و قیاسات سے ان کے دامن کو ہلاکو کی خونریزی میں ملوث کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بغداد کی بدامنی اور خلافت کے حالات کسی بھی حمد آور کے لئے ایک واضح دعوت تسخیر تھے جس کی قلمی تصویر کشی جسٹس امیر علی نے ہسٹری آف سیراسز میں کی ہے جو ان اسباب و عوامل پر روشنی ڈالتی ہے جن میں ہلاکو شمشیر برسنہ ہو کر بغداد پر ٹوٹ پڑا۔



نہ آئے گا تو حیرتی سلطنت اور تیرے غرلے ہمیشہ کے لئے تجھ سے جدا ہو جائیں گے۔“  
کم عقل خلیفہ کے پاس نہ فوج تھی اور نہ غرلہ، صرف چند شکستہ دل مشیر  
اور تباہ و خستہ شہر کے کھنڈر موجود تھے پھر بھی اس نے اس طوفان کے آگے جھک  
جانے کے بجائے مغرورانہ جواب دیا جس سے وحشی ہلا کو غنیمت و غضب میں آگیا اور  
اتنی بڑی فوج کے ساتھ، جو سارے بغداد کو گھیرے میں لے سکتی تھی، خلفاء کے شہر  
کی طرف روانہ ہو گیا۔ خلیفہ کے لشکر نے شہر سے کچھ فاصلہ پر وحشیوں کا مقابلہ کیا  
مگر ایک موقع پر اختلاف رائے ہونے کے سبب سخت تباہی بخش شکست کھائی اور  
دوسرے موقع پر جانوں کا بے سود نقصان عظیم ہوا۔ مغلوں نے اب بغداد کا محاصرہ  
کرنے کا ارادہ کر لیا۔ شہر کے باہر تمام بلندیوں میں ناروں اور محلوں پر توپوں کی قسم  
کی کلیں نصب کی گئیں جن کے ذریعہ بڑے بڑے ہتھر اور دھتکتے ہوئے گولے اندر کی  
طرف پھینکے جانے لگے۔ فصیلیں شق ہو گئیں اور کئی مکانات میں آگ لگ گئی۔

چالیس دن کے محاصرہ کے بعد خلیفہ نے ہلا کو سے صلح کی سلسلہ جنبانی  
شروع کی یہ اظہار اطاعت بے اثر ثابت ہوا۔ ہلا کو نے مستعصم باللہ کے بڑے بڑے  
سرदारوں کو اپنے کیمپ میں بلایا اور خفیف سے عذر پران کو اور ان کے ہمراہیوں  
کو قتل کر دیا۔ مستعصم کی حالت سخت مایوسی کی تھی ایسے موقع پر اس سے کہا گیا کہ  
شہر حوالے کر کے خلیفہ اپنی اور رعایا کی جانیں بچا سکتا ہے وہ فوراً اختیار ہو گیا اور اپنے  
بیٹوں، بھائی اور تین سو دیگر سربراہان اور وہ اشخاص قاضی شیخ امام اور عمائد سلطنت کو  
لے کر مغل لشکر میں پہنچ گیا۔ وحشی مغل نے اپنے فاسد خیالات اور ارادوں کو اپنی  
چرب زبانی اور خندہ پیشانی کے نیچے دبائے رکھا۔ اس نے خلیفہ سے کہا کہ اہل شہر  
سے کہلا بھیجیں، لوگ ہتھیار پھینک کر پھاٹکوں کے آگے جمع ہو جائیں تاکہ مردم  
شماری کر لی جائے۔ ماسمجھ خلیفہ نے اس ہدایت کے ساتھ اپنے محافظ بھیج دیے، جن  
کو مغلوں نے قابو میں کر لیا اور دوسرے دن طلوع آفتاب کے بعد قتل و غارت  
شروع ہو گیا۔

بغداد کی تباہی و بربادی کا خاکہ کھینچنے کے لئے گہن جیسے جید عالم کا قلم درکار  
ہے: عورتیں اور بچے جو پناہ مانگنے کے لئے ہاتھوں میں قرآن لے کر نکلتے موت کی

## بغداد کی تباہی

خلیفہ مستنصر ۱۲۳۱ء میں عین اس وقت، جب اس کے خاندان اور عرب  
تہذیب پر وقت آنے والا تھا، اس دنیا نے فانی سے رحلت کر گیا اور اس کی جگہ اس  
کا بیٹا احمد عبداللہ المستعصم باللہ کے خطاب سے تخت خلافت پر رونق افروز ہوا۔ یہ  
کمزور اور عیش پرست تھا۔ اس کے عہد میں ملک کے اندر باہر شورش اور فتنہ برپا  
ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا خاندان ہمیشہ کے لئے خلافت و حکومت محروم ہو گیا  
بغداد میں حنفیوں اور حنبلیوں کے جھگڑوں، بغداد کے مغربی مضافات میں  
کرخ کے شیعہ اور سنیوں کے تنازعوں اور فسادوں نے اور سب سے زائد امراء پر  
بد معاشوں اور لفظوں کے غلبہ نے ایوان حکومت کے سنگ بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا۔  
مستعصم کا خواب و خور حرام ہو گیا اور اس نے اپنے باپ کی فوج کو موقوف کر کے  
چلتے پرتیل ڈالنے کا کام کیا۔ شیعہ اور سنیوں کی لڑائیوں سے تنگ آکر اس نے اپنے  
بیٹے ابو بکر اور سیکریٹری کو کرخ کے مضافات مہندم کر دینے اور شیعوں کو غلام بنا  
لینے کا حکم دے دیا۔ اس حکم سے مولد الدین محمد بن العلقمی شیعہ وزیر کو سخت رنج  
پہنچا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیعوں کا انتقام لینے کے لئے اس نے مغلوں کو بغداد آنے  
کی دعوت دے دی۔ عرب مؤرخ ابن خلدون، ابو الفدا، مقریزی اور سیوطی وزیر کو  
منک حرام لکھتے ہیں اور میراخوند اور وصال ان کی تائید کرتے ہیں، صرف ایک  
مصنف جامع التواریخ اس کو منک حلال اور شاہی خاندان کو آنے والی مصیبت  
سے بچانے کا خواہاں بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ”بادشاہ خود مالا لائق تھا، وزیر کیا کر سکتا تھا“  
بہر حال اصل معاملہ خواہ کسی طرح بھی ہو واقعہ یہ ہے کہ ہلا کو جو ایران میں اپنے  
بھائی منگو خان کا نائب تھا، حشاشین کو فنا کر کے اور ان کے قلعوں کو تباہ کرنے  
کے بعد تبریز کی طرف بڑھا۔ وہاں سے اس نے مستعصم باللہ کی طرف اپنے قاصد کے  
ہاتھ ایک پیغام بھیجا کہ ”جب ہم روڈ بار پر حملہ کرنے گئے تھے تو ہم نے تجھ کو پیغام  
بھیجا تھا کہ ہماری مدد کر تو نے مدد دینے کا وعدہ کیا تھا مگر کوئی آدمی نہیں بھیجا، اب  
ہم تجھ کو ہدایت کرتے ہیں کہ اپنا رویہ تبدیل کر اور شرارتوں سے باز آ، اگر تو باز



طرف ڈھکیل دیئے گئے، ناز پرور وہ خواہن، جنہوں نے کبھی غیر مردوں کی صورتیں بھی نہ دیکھی تھیں، مکانوں سے کشاں کشاں باہر لائی گئیں اور انکی سخت بے حرمتی اور عصمت دری کی گئی، وہ علم و ہنر کے خزانے جو بادشاہوں نے سخت جانفشانی سے جمع کئے تھے اور جن میں قدیم ایران کی ترقی کے بچے کچے گوہر چن چن کر رکھے گئے تھے چند گھنٹوں میں ضائع و برباد ہو گئے۔ تین دن تک گلیوں میں خون کی ندیاں بہتی رہیں اور دریائے دجلہ کا پانی سیلوں تک ارغوانی ہو گیا۔ لوٹ مار، قتل و غارت اور کشت و خون کا بازار چھ ہفتوں تک گرم رہا۔ وحشیوں نے محلات، مساجد اور مزارات آگ کی نذر کر دیئے یا ان کے سہرے کس اتار کر انہیں کھنڈر بنا دیا۔ ہسپتالوں میں بیمار اور مریض، کالوں میں طلباء اور پروفیسر تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ مزاروں میں شیخوں اور مقدس اماموں کی غیر فانی یادگاریں کتب خانوں میں عالموں اور فاضلوں کے نشیے والے کارنامے خاک کا ڈھیر ہو گئے، جہاں کہیں دریا نزدیک تھا پانی کی آغوش میں غرق کر دیئے گئے۔ پانچ صدیوں کی محنت شاقہ سے جمع کئے ہوئے خزانے جہالت پر قربان ہو گئے قوم کا چمنستان علم و ہنر ہمیشہ کے لئے اجڑ گیا اور ایوان ترقی منہدم ہو گیا۔ چار دن کے کشت و خون کے بعد ۲۰ محرم ۶۵۶ھ یا ۲۷ جنوری ۱۲۵۸ء کو مستعصم مع اپنے بیٹوں اور خاندان کے سربراہ اور وہ افراد کے ذبح کر دیا گیا اور خاندان عباسیہ کے صرف چند نو نہال جان سلامت لے کر نکل سکے۔ بغداد میں قتل و غارت سے قبل بیس لاکھ نفوس کی آبادی تھی۔ ابن خلدون کے قول کے مطابق سولہ لاکھ جانیں تلف ہوئیں اور اس کی تباہی کے ساتھ مغربی ایشیا پر جہالت کا گھناؤپ اندھیرا چھا گیا۔

تیرھویں صدی مسیحی میں وحشی مشرکوں کی بدولت جو بربادی اسلامی دنیا پر وارد ہوئی، عرب اور ایرانی مورخ اس کا بیان بڑے درد انگیز ہجے میں کرتے ہیں۔ کوئی شخص سوائے جاہل اور سیہ باطن کے بنی نوع انسان کے اس قدر جانی اتلاف اور تمدنی نقصان پر چار آنسو بہائے بغیر نہ رہے گا۔ ابن الاثیر لکھتا ہے: "مغلوں کا حملہ سخت مصیبت اور خوفناک تباہ کاری تھی جو دنیا پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً وارد ہوئی اور جس کی مثال شاید مستقبل میں بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے گی

اگر کوئی کہے کہ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک ایسا قہر الٰہی نازل نہیں ہوا تو وہ بالکل سچ کہتا ہے کیونکہ تاریخ میں اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔

عبدالمطیف مغلوں کے حملہ کی نسبت تحریر کرتا ہے: "یہ ایسی مصیبت تھی جس کے سامنے ساری مصیبتیں بیچ ہیں۔ جوینی مصنف جہاں کشا جو چنگیز خان کا ملازم تھا لکھتا ہے کہ "وہ انقلاب جس نے دنیا کو چھٹی کا دودھ یاد دلادیا علم کو تباہ اور عالموں کو ختم کر دیا، خراسان کو جو روشنی کا مرکز اور علماء کا ماں تھا، کالعدم کر دیا، علم و ہنر کے وارث تلوار کی نذر ہو گئے اور زمانہ میں سائنس اور علوم کا قحط پڑ گیا بغداد کو تباہ و برباد کر کے مغلوں نے دریائے فرات کو عبور کیا اور الجزیرہ پہنچ گئے۔ خونریزی اور جہالت ان کے ہمراہ تھی، روحہ، حیران اور نصیبین کے باشندے تلواروں کے گھاٹ اتر گئے، حلب میں پچاس ہزار آدمی قتل ہوئے اور دس ہزار بچے غلام بنا کر فروخت کئے گئے۔ حیران اس وعدے پر کہ شہر محفوظ رکھا جائے گا مطیع ہو گیا، مگر مغلوں نے سارے باشندوں کو موت کی نیند سلا دیا حتیٰ کہ شیرخوار تک کو نہ چھوڑا۔ یہ ۹ صفر ۶۵۸ھ یا ۲۸ جنوری ۱۲۶۰ء کا واقعہ ہے۔ اس طرح تباہی و بربادی کو جلو میں لئے ہوئے یہ درندے مغرب کی طرف بڑھتے رہے اور مسلمانوں کا اتفاق موئے پر سودرے کا کام کرتا رہا۔

### مغل تہذیب کے دھارے پر

اب صورت حال یہ تھی کہ تقریباً پورا عالم اسلام تاتاریوں کے قبضے میں تھا کچلے اور دہشت زدہ مسلمان بے لٹائے شہروں میں جا بجا کچلا ہو رہے تھے کہ فلسطین میں سلطان بیبرس ملک الظاہر نے اپنی طاقت کو سمیٹا، مایوس اور بددل مسلمانوں میں ایک جوش پیدا کیا اور موت یا زندگی کی لڑائی لڑنے کے لئے چل پڑا۔

تاتاریوں نے عین جالوت میں ان کا مقابلہ کیا۔ سروں سے کفن باندھ کر نکلنے والے یہ سچے کر آئے تھے کہ ان کو تو قتل ہی ہونا ہے پھر میدان جنگ میں مار کر کیوں نہ مریں، تاتاری مسلسل فتوحات کے نشے میں سرشار تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا جلال الدین ابن خوارزم شاہ کے بعد دوسرا سرفروش ان کے مد مقابل ہے اور مسلمان سرفروش موت سے لڑنے کے لئے آئے ہیں۔



نتیجہ یہ نکلا کہ تاتاری صفیں ٹوٹنے لگیں اور مسلمانوں کے پیہم حملوں سے یہ درازیں بڑے بڑے شگافوں میں بدل گئیں۔ تاتاریوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور پہلی بار انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر ان کے لئے گھوم کر اس طرف دیکھنا ممکن نہ رہا۔

اس فتح کے بعد ادھر مسلمانوں کی مایوسی میں ہمت و حوصلے کی شعاعیں پھوئیں، ادھر تاتاری تمدنی زندگی سے آشنا ہونے لگے اور ہلاکو کا دربار چونکہ علماء و فضلاء سے بھرا ہوا تھا لہذا اس میں بھی ایک انسانیت پیدا ہونے لگی۔ یہی وہ وقت ہے جب سے منگو لیا کے وحشیوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔

شیعہ کشی پچھلی دو صدیوں کا طرہ امتیاز رہی تھی کسی مدت کے لئے اس کا سوال ہی ختم ہو گیا تھا۔ تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ دور اقتدار میں اکثریت اقلیت کو کچلتی ہے اور جب خود اس پر مصیبت آتی ہے تو اتحاد و اتفاق کا نعرہ بلند کرتی ہے ایسا ہی کچھ اس زمانے میں بھی ہوا مگر تابہ کے؟

چنگیز خان نے ملک کی تقسیم اپنے بیٹوں کے مابین کر دی تھی۔ اس کی رو سے منگو قاآن تین نسلوں کے بعد مرکز میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس کی طرف سے ہلاکو خان ایشیا کا فرمانروا تھا اور چنگیز خان کے پوتے پڑپوتے اور دوسرے رشتہ دار مختلف علاقوں کے امیر تھے۔

حضور کی ذات گرامی کے بارے میں مسلمانوں کی نظریاتی تفریق یقیناً افسوس ناک تھی تاہم اس میں کوئی نہ کوئی آہنگ پایا جاتا تھا لیکن جب سے دمشق میں اسلام کو سیاسی مصالح اور دین کا آمیزہ بنا دیا گیا، اس وقت سے اسلام کی ہیئت بدلتی ہی رہی۔

بنی عباس بھی بنی ہاشم کی طرح بنی امیہ کا تختہ ستم رہے تھے مگر جب انہوں نے حکومت پر قبضہ کیا تو غاصب کی حیثیت سے اصل حقدار کی پامالی ان کا بھی مسلک منصفی بن گیا اور انہوں نے جاوہ اقتدار کی خاطر ماضی کی تقلید میں پیش روؤں سے زیادہ چابکدستی دکھائی اور اصول و فروعات دین میں اولاد فاطمہ کی برتری اور

شرف ختم کرنے کے لئے ایک امامت لاکھڑی کی اور منصور نے حضرت ابو حنیفہ کو امام اعظم کا لقب دیدیا۔

شیعوں کے امام خدا نے بنائے تھے، بنی عباس نے سنی بھی بنادئے، سنیوں کی فقہ بھی اور سنیوں کا امام اعظم بھی۔ اس کے بعد امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام غزالی، امام فخر الدین رازی، امام ابن تیمیہ وغیرہ ظہور میں آتے رہے کس کو کس نے امام بنایا، کون خود امام بن گیا، اس کی تفصیل ان کے ماموین جاستے ہوں گے۔

جہاں تک فقہوں کا تعلق ہے، ایک فقہ فقہ حنفیہ کے نام سے تو عباسی لائے، باقی فقہیں خود داعیان امامت نے پیش کیں جس کے نتیجے میں مسائل پر مسائل پیدا ہوتے چلے گئے رویت باری، خلق قرآن اور دیگر اجتہادی نظریے لہذا شیعہ و سنی تو ایک طرف رہے، ان نظریات کے پیر و آپس میں کھتم گتھا ہونے لگے۔ یہ سلسلہ جو چلتا تو چلتا ہی رہا، لیکن جب کبھی شیعہ اور غیر شیعہ کا سوال پیدا ہوا تو شیعوں کے لئے باقی سب سنی بن گئے اور اہل بیت اور غیر اہل بیت کے طرفداروں کے صرف دو گروہ رہ گئے۔

یہ صورت حال کئی صدیوں سے اپنی جگہ پر تھی، خلافت کے درباروں میں تو شیعوں کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی، عموماً وہ منظر عام سے ہٹ جاتے۔۔۔ تمام حکومتوں کے ادوار میں یہی صورت رہی اور اب تاتاریوں کا دور دورہ تھا تو چونکہ وہ غیر جانبدار تھے اس لئے اختلاف شدت کے ساتھ سامنے آ رہا تھا۔

تاتاری جب قتل عام کر رہے تھے تو سب مسلمان تھے، نہ کوئی شیعہ تھا اور نہ سنی مگر ہلاکو کے دربار میں جب شیعہ، سنی علماء جمع ہوئے تو سب فرد واحد کی کاٹ کرنے لگے اور یہ فرد واحد تھے علامہ نصیر الدین طوسی!

ادب و تہذیب سے نابلد مغل نے درباری علماء سے مختلف اوقات میں بہت کچھ پوچھا تھا اور بعض باتوں پر یقین بھی رکھتا تھا اس لئے اکثر سوالات کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر مختلف مسالک کے عالم علامہ نصیر الدین کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے مگر آل رسول کا پرچم جس کے سر پر ہرا رہا ہو، اس کو لا جواب کون کر



سکتا ہے۔ نتیجے میں ہر موقع پر عالموں کے متحدہ محاذ کو منہ کی کھانا پڑی۔  
ایک بار تو ان سب نے قیامت ہی کر دی اور علامہ نصیر الدین کا قصہ ہی ختم کر ڈالنے کا انتظام کر دیا۔

مغلوں میں مردے کو مٹی کے نیچے دبا نے کا رواج بھی تھا۔ ہلاکو کی ماں کا انتقال ہوا تو اس کی تدفین کا انتظام کیا جانے لگا۔ علامہ نصیر الدین طوسی کی بڑی عزت تھی، وہ سب سے پہلے تعزیت کے لئے گئے اور کافی دیر تک انسان کے انجام اور آخرت پر گفتگو کر کے چلے گئے۔ علماء نے اجتماعی طور پر ایک منصوبہ بنالیا تھا۔ نصیر الدین کے جانے کے بعد وہ سب ایک ساتھ پہنچے اور بڑے دکھ کا اظہار کیا پھر ایک جمید عالم نے بڑے تشویش کے لہجے میں کہا:۔

”قبر میں فرشتے آتے ہیں جو عربی میں سوال کرتے ہیں، آپ کی ماں عربی تو جانتی نہیں، جواب کیسے دیں گی؟“

جاہل تاتاری صرف پیکان و تیغ کی حرکت کے گر جاتا تھا، قلم کی گردش سے اس کی پٹھلی نسلیں تک آشنا نہ رہی تھیں، مسلم علماء سے بعض باتیں اس نے سن رکھی تھیں، وہ بھی ایک فکر میں پڑ گیا کہ اس کی ماں قبر میں کیا کرے گی لہذا اس نے اس عالم سے سوال کر دیا۔

”پھر کیا کیا جائے؟“

”کسی عربی داں کو اس کے ساتھ دفن کر دیجئے تاکہ وہ فرشتوں کی بات سمجھ کر خود جواب دیدے۔“ عالم نے مشورہ دیا اور بات ہلاکو کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے خود ان ہی سے پوچھا۔

”کس عالم کو.....؟“

”اس کا فیصلہ آپ خود کریں، ویسے فی الوقت نصیر الدین سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔“ عالم نے جو کہنا تھا، وہ کہہ دیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر دل ہی دل میں مسکراتا ہوا چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہلاکو نے اس کے جانے کے بعد علامہ نصیر الدین کو طلب کیا اور ان سے کہا۔

”تمہیں میری ماں کے ساتھ دفن ہونا ہے.....“

پھر اس نے دریافت کرنے پر تفصیل بتائی۔ علامہ نصیر الدین کے ہوش اڑ گئے مگر وہ بڑی متانت سے بولے۔

”مجھے اس خدمت میں کوئی عذر نہیں مگر آپ کی فکر ہے۔“

”میری فکر.....؟“ ہلاکو نے استفہامیہ انداز میں کہا اور علامہ نصیر الدین نے صراحت کی۔

”فرشتے اچھی عربی سے متاثر ہوتے ہیں اور بلاشبہ مجھ سے اچھی عربی کوئی نہیں جانتا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سو برس بعد جب آپ کا وقت آئے گا تو میں آپ کے ساتھ جاؤں گا، ویسے آپ کی مرضی!“

”پھر ماں کے لئے کیا کیا جائے؟“ ہلاکو نے علامہ سے حل دریافت کیا اور علامہ نے انہیں عالم کا نام لے لیا جنہوں نے ہلاکو کو یہ راستہ دکھایا تھا اور اسی سلسلہ میں کہا۔

”میرے بعد اگر کسی کو عربی پر عبور حاصل ہے تو وہی بزرگ ہیں۔“

ہلاکو کی سمجھ میں آگیا اور وہ خوش ہو کر بولا۔

”میں آپ کی اسی علمیت کے سبب آپ کی قدر کرتا ہوں۔“

پھر علامہ نصیر الدین اجازت لے کر باہر آگئے اور وہ عالم طلب کر لئے گئے..... وہ بہت چنچے چلائے مگر ہلاکو نے ایک نہ سنی، اس کو اپنی ماں کا خیال تھا کہ قبر میں تکلیف نہ ہونے پائے۔

مغلوں کی رسم کے مطابق گڑھا کھدایا ہوا تیار تھا پہلے ہلاکو کی ماں قبر میں اتاری گئی پھر اس عالم کو اس میں پھینکا گیا اور گڑھا مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

جس نے دوسرے کے لئے گڑھا کھدوایا تھا، وہ خود اس میں دبا دیا گیا۔

اس طرح کے واقعات پیش آتے رہے اور سنی و شیعہ عالموں کی کشمکش ہلاکو کے دربار میں جاری رہی۔ ہلاکو کے دل پر اسلام کا سکہ بیٹھتا جا رہا تھا لہذا طرفین کی کوششیں جاری تھیں کہ اپنے مسلک کو برحق ثابت کرے۔

مغل فرمانروا کو مستفت پا کر اسلام کی توضیحات میں ہر مکتبہ فقہ کا عالم اپنے اپنے زاویہ فکر و اجتہاد کو پیش کرتا رہا۔ شیعوں کے اصول میں کسی اجتہاد کا سوال ہی



طلاق دینے کا اعلان کر دیا پھر وہ نادام ہوا کیونکہ غلطی بیوی کی نہ تھی، خود اسی کی تھی جس کو اس نے محسوس کیا اور درباری علماء کے سامنے اپنی ندامت کا اظہار کیا۔

علماء نے بیک زبان کہہ دیا۔

”طلاق ہو گئی، اب وہ کسی اور سے شادی کرے تو آپ کے عقد میں آ سکتی ہے“

خدا بندہ اس بیوی کو چاہتا بہت تھا وہ پریشان ہو گیا اور علماء سے اس نے پوچھا ”کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ کسی کے پاس گئے بغیر وہ میری ہو جائے؟“

علماء نے انکاری جواب دیا۔ اس پر ایک درباری نے رائے دی کہ علامہ

حلی سے بھی فتویٰ لے لیا جائے، چنانچہ علامہ بلوائے گئے اور آپ کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ طلبی کی غایت کیا ہے؟

آپ جب پہنچے تو خدا بندہ نے احترام کے ساتھ آپ کو تخت کے اوپر آ جانے کو کہل آپ نے دونوں جوتیاں اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لیں اور تخت کے اوپر چڑھ گئے۔ اس پر کسی نے کہا۔

”یہ جوتیاں ہاتھ میں کیوں لے لیں؟“

”ابو حنیفہ چرا لے جائیں گے.....“ آپ نے جواب دیا اور ایک جمید عالم

بڑے استعجاب میں بولے

”ابو حنیفہ.....“

”جی ہاں، ابو حنیفہ.....“ وہ رسول اللہ کی ہزم سے جوتیاں چرا لے جاتے

تھے؟ علامہ حلی نے بڑی متانت سے بتایا اور وہ عالم تقریباً جمع پڑے۔

”ابو حنیفہ تو اس وقت تھے ہی نہیں۔“

”اچھا، وہ رسول کے وقت میں نہیں تھے۔“ علامہ حلی اس طرح بولے جیسے

انہیں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہو، پھر آپ نے کہا ”اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے فتاویٰ سنی سنائی پر مبنی ہیں۔“

اس کا جواب عالم نے دیا: ”لیکن جو کچھ سنا، وہ بہت معبر ذرائع سے۔“

”آپ معبر ذرائع کی بات کرتے ہیں ہم ان میں سے اکثریت کو مشکوک

جانتے ہیں، ہم جو کچھ کہتے ہیں، وہ اس کے حوالے سے جو ہر وقت، سفر و حضر میں پیغمبر

نہ تھا البتہ اس کی افادی تشریحات علامہ نصیر الدین طوسی ضرور بیان کرتے رہے جو تہذیب سے قدرے آشنا ہونے کے بعد چنگیز خان کے وارث کے لئے کچھ قابل فہم ضرور قرار پائیں مگر جب کسی دوسرے کی باری آئی تو اس نے اپنا منطقی راستہ دکھایا۔ اس طرح ہاتراشیدہ مغل کا ذہن لچھ کر رہ گیا۔

اسلام کے نقوش اس کے ذہن میں بننے اور بگڑتے رہے اور وہ منگولیا کے وحشیانہ تمدن اور اسلامی ثقافت کا عجیب مرکب بن کر رہ گیا..... اور کوئی فیصلہ کئے بغیر اس دنیا سے گزر گیا۔

اس کے بعد ہی مغلوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا جن میں سے بعض نے سنی مسلک اختیار کیا اور بعض نے شیعہ لیکن ان میں یہ شناخت دشوار تھی کہ کون شیعہ ہے، کون سنی؟ تاہم مسلمانوں کی تفریق کے باوجود وہ ایک دوسرے کے اتنے دشمن نہ رہے کہ عقیدے کے اختلاف کے سبب خون خچر پڑا۔ صورت حال اب پہلے سے مختلف تھی، جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا وہ بھی مسلمانوں کے دشمن نہ تھے اور ہلا کو کی طرح علماء و فقہاء کی تدریسی دانی کرتے تھے۔

غیر جامدار مغل ماحول میں شیعوں پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن سنی اکثریت تھی ان کے سامنے اکادمی کا شیعہ عالم ہمہ وقت موجود تو نہ رہتے لہذا جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو جو بھی سنی عالم ہوتا وہ سادی تختی پر جو چاہتا لکھ دیتا۔ ان حالات میں شیعوں کی غیر معمولی ذہانت ہی انہیں سربر کر سکتی تھی اور اس آزمائش میں اہلبیت کا مسلک انہیں سر بلند رکھتا۔

اس سلسلے میں متعدد علماء نے اپنی ذہانت اور ہمہ دانی کے پرچم ہرائے جن میں شیخ طوسی کے بعد علامہ حلی کا نام بار بار لیا جاتا ہے۔ آپ ہلا کو کے آٹھویں جانشین محمد خدا بندہ کے دربار میں بہت معروف تھے آپ کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن خدا بندہ نے اپنی ایک بیوی کو غصے میں طلاق دیدی۔ اس نے بھی کچھ زبان درازی کی اور خدا بندہ نے تین چار مرتبہ اس کو

وہ ایران، ایشیائے کوچک اور ہندوستان سے بحیرہ روم تک کے ملک کا بادشاہ تھا، اسی قلمرو میں اس کا خاندان تقریباً ایک صدی تک حکمران رہا، تخت نشینی کے لئے خاندانی لڑائیوں سے قطع نظر بہم وجہ اس کے ملک میں امن و امان رہا۔ علوم و فنون کی ترقی میں گزشتہ شاہان ایران کی طرح ایلخانی فرمانروا بھی قابل تعریف تھے۔ ابو سعید کے زمانے میں اس خاندان کا زوال شروع ہوا اسباب وہی تھے جو عباسیہ اور سلاجقہ وغیرہ کے زوال کا باعث ہوئے تھے یعنی مذہبی جھگڑے، امرا کا آپس میں رشک و حسد۔

ابو سعید کے انتقال کے بعد سلطنت بھان متی کا تماشہ بن گئی۔ امراء ایسے شہزادوں کو تخت پر بٹھاتے جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن سکتے، بالخصوص دو گھرانوں کے باہمی نفاق نے سلطنت کو خاک میں ملا دیا، ان میں سے ایک غازخان کا منظور نظر امیر چوہان تھا، دوسرا امیر حسین جلائر۔ دونوں امیروں کا ایک ایک بیٹا تھا جو ہم نام تھے مگر تمیز کے لئے چوہان کے بیٹے کو حسن کوچک اور امیر حسین کے بیٹے کو حسن بزرگ کہتے تھے۔

ابو سعید کے بعد جب فضا حسن کوچک کے لئے سازگار ہوتی تو وہ کسی کو تخت پر بٹھا دیتا اور جب حسن بزرگ کو موقع ملتا تو کسی دوسرے کو بادشاہ بنا دیتا۔ اس سے ایک وقت میں دو دو بادشاہ ہوتے رہے اور آپس میں جنگ و جدل کی نوبت آتی رہی۔ یہاں تک کہ ایلخانی خاندان کے آخری بادشاہ نوشیرواں کے بعد ایران میں جلائر کا طوطی بولنے لگا اور حکومت ہلا کو کے خاندان سے نکل گئی اور جلائر، مظفریہ، ککرت، سرب داری وغیرہ کی حکومتیں قائم ہو گئیں جو اس وقت تک قائم رہیں جب تک امیر تیمور نے تمام ایران کو فتح نہیں کر لیا اور اس کو اپنی اولاد میں تقسیم نہیں کر دیا۔

### ابا قخان

ہلا کو کے بعد بادشاہ ہو کر اس نے تبریز کو دارالحکومت بنایا، اپنے بھائی بشموت کو در بند و شیردان کی طرف بھیجا، دوسرے بھائی منشین کو علاقہ مازندران

کے ساتھ رہتا تھا اور جو حقیقتاً حضور کا سایہ تھا۔ علامہ کے لہجے میں ایک وقار تھا اور آواز قدرے بلند، جس کو آپ نے بلند کر لیا اور امام جعفر صادق کی بیان کی ہوئی حدیث دہرائی جو امام نے اپنے پدر بزرگوار اور انہوں نے اپنے والد نامدار اور انہوں نے بسلسلہ آبائی حضرت علی سے سنی تھی اور حضرت علی نے خود سرور کائنات سے۔

علامہ نے فرمایا۔

”غصے میں دی ہوئی طلاق نہیں ہوتی، طلاق تو صرف وہ طلاق ہے جو نبات عقل و ہوش میں سوچ سمجھ کر دی جائے اور اس کے بعد بھی آدمی کو اپنے غلط فیصلے کا احساس ہو تو طلاق کا عدم ہو جاتی ہے اور وہ بیوی سے رجوع کر سکتا ہے۔“  
خدا بندہ اور اہل دربار اچھل پڑے اور سب نے علامہ کے فتوے پر اظہار مسرت کیا۔

اس طرح کے معرکے آئے دن ہوتے رہتے تھے جن میں خادمان آل رسول بازی لے جاتے تھے اور انہیں کی بدولت مغلوں کے دل و دماغ میں لہان کی کرن پھوٹتی تھی اور وہ بارگاہ فاطمہ زہرا کے دربان بنتے جاتے تھے۔

### مغلوں کا مذکور حکومت

ہلا کو کے مذہب کے متعلق یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا عام خیال یہی ہے کہ وہ مغل عقیدے اور اسلام کا معجون مرکب تھا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ فتح بغداد کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم یہ سچ ہو یا غلط یہ مسلم ہے کہ مسلمان علماء کی اس کے دربار میں بڑی توقیر تھی۔

حکیم خواجہ نصیر الدین طوسی مولف اخلاق ناصری وغیرہ نے ہلا کو کے حکم سے مراغہ میں ایک رصد گاہ بنائی تھی، ملا علی اور ملا غیاث الدین بھی اس کے عہد میں تھے، نیز اثیر الدین اوماتی، نجم الدین منجم اور شیخ سعدی اس کے درباریوں میں شامل تھے، اس کا وزیر پہلے سیف الدین تھیں پھر خواجہ شمس الدین محمد جوینی ہوا۔



وغراسان دریائے آمو کے کنارے تک دیا، نویان بہادر اور اینکان نویان کو حدود روم کی حفاظت کے لئے متعین کیا، مکرور بیہ کی امارت دریائی نویان کے حوالے کی، گر جستان و سرحد شام بشر آموں کے سپرد کیا وزارت اور دیوان خاص کا منصب خواجہ شمس الدین محمد جو دینی کو دیا فارس کی حکومت اتابک ابو بکر کی اولاد پر بھائی رکھی مگر چغتائی کے پوتے برک خان نے باتفاق قید و خان ماوراء النہر و ترکستان پر قبضہ کر لیا پھر اباقا خان کے ملک پر حملہ کیا مگر شکست کھا کر بخارا بھاگ گیا اور بخارا کے علماء کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر غیاث الدین اپنا نام رکھا۔ غیاث الدین کے مرنے کے بعد اس کا ملک قید و خان اور اباقا خان نے آپس میں بانٹ لیا۔ اسی سال مصر کے حاکم نے اباقا خان کے گورنر کی سازش سے روم کے سرحدی ملک پر قبضہ کر لیا، اباقا خان نے اسے نکال دیا اور خود مصر پر چڑھائی کر دی مگر سلطان بندقدار نے مغلوں کو مار بھگایا اور خود بندقدار نے بابلستان پر حملہ کر کے ایک مغل کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ ۶۶۹ھ میں اباقا خان نے اپنے بھائی منگو تیمور کو تسخیر مصر پر مامور کیا مگر اس نے شکست کھائی، ۶۸۰ھ میں اباقا خان کا انتقال ہو گیا۔ خواجہ شمس الدین جلال الدین، مولانا روم اور شمس تبریز اور قطب الدین شیرازی امامی ہر دی اس زمانے کے مشہور شعراء گزرے ہیں۔

### نکوہ اور بن ہلاکو

وہ اپنے بھائی کی جگہ بادشاہ ہوا اس نے بھی دین اسلام اختیار کیا اور سلطان احمد نام رکھا، مجد الدین یزدی کو قتل کر کے خواجہ شمس الدین کو وزیر بنایا اور اس کے بھائی علاء الدین کو قید سے نکال کر بغداد کا حاکم مقرر کیا، والی مصر سے اس نے صلح کر لی، کیونکہ وہ بھی مسلمان تھا۔ اس پر اس کے بھائی ارغون اور تمشور بگز گئے۔ نکوہ دار نے تمشور کو مار ڈالا اور ارغون کو قید کر دیا۔ ارغون نے بوتقائی اور تاتاری شہزادوں سے سازش کر کے سلطان کو گرفتار کر لیا، بعد میں قتل کر دیا۔ خواجہ شمس الدین بھاگ گیا۔ اس کی حکومت صرف سوا دو سال رہی، دار السلطنت تبریز تھا۔

منگول عقل و دانش میں حقیقتاً کندہ تراش تھے اور مذہب کے سسٹے میں

تو کچھ جانتے ہی نہ تھے مہذب دنیا کو انہوں نے روند تو ڈالا مگر اس کی چمک دمک دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو گئی۔ مختلف مسالک اور مذاہب کے علماء ان کی گرفت میں تھے لہذا جو جس عالم کے ہتھے چڑھ گیا، اس کو اس نے اپنے زاویہ نگاہ سے تراش لیا۔ نتیجے میں کوئی مسلمان بن گیا، کوئی عیسائی یہودی، مسلمانوں میں بھی نظریاتی تفریق کے لحاظ سے جو جس کسی نے سمجھا دیا وہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اسی لئے صحیح معنی میں کوئی کسی مذہب میں بہختہ نہ تھا اور ہر معلم کے رنگ میں رنگ جاتا تھا پھر بھی اب ان میں ایک تفریق ہونے لگی تھی اور وہ تسخیر ملک کے عزم و خیال کے ساتھ ساتھ عقیدے کے بندھنوں میں جکڑتے جا رہے تھے اور ان کے اندر ایک گروہ بندی پیدا ہو رہی تھی۔

### ارغون خان

ارغون خان نے بادشاہ ہو کر امیر بوتقائی کو وزیر بنایا اور خواجہ شمس الدین کو دوسرا وزیر، پھر بوتقائی کے بہکانے سے اس نے فخر الدین مستونی اور حسام الدین کے ہاتھوں خواجہ شمس الدین کو مروا دیا۔ اس دوران سعد اللہ یہودی ہر سیاہ پسید پر چھا گیا اس کے رسوخ سے جل کر بوتقائی نے ارغون کے بھائی جوشکاب کو بادشاہت کی دعوت دی، اس نے خود ارغون کو اطلاع کر دی اور یہ سازش ناکام ہو گئی پھر سعد اللہ کی ترغیب سے اس نے حکم دیا کہ کل مسلمان اپنا مذہب چھوڑ کر یہودی ہو جائیں ورنہ قتل کئے جائیں گے اس کے ساتھ ہی اس نے حرین کو مسمار کرنے کا منصوبہ بھی بنالیا مگر یہ ارادہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ارغون کو مرض موت لاحق ہو گیا۔ امراء نے جوشنی اور سعد اللہ یہودی کو قتل کر دیا۔ عبداللہ بیضاوی قاضی القضاۃ اور نجم الدین زرکوب اس عہد کے باکمال تھے۔

### کیخاتو خان

کیخاتو خان اس کا جانشین ہوا۔ باید و خان حاکم بغداد نے طغچار امیر کی سازش سے اس پر فوج کشی کی اور ۶۹۴ھ میں اس کو قتل کر دیا۔ اپنی چار سال کی حکومت میں اس نے کسی گنہگار یا بیگناہ کو قتل نہیں کرایا، صدر جہاں نظام الدین احمد قزوینی اس کا وزیر تھا۔



باب دو خان نے تخت نشین ہو کر امیر طغاجار کو امیر الامراء بنا دیا۔ غازا خان خراسان کے حاکم نے نوروز بن ارغون حاکم توران سے مدد لے کر اس پر چڑھائی کی راستے میں دزیر صدر جہاں بھی اس سے آٹا، باب دو خان شکست کھا کر مارا گیا۔ اس کی مدت حکومت چھ ماہ تھی۔

#### غازا خان

غازا خان نے مسلمان ہو کر اپنا نام محمود رکھا۔ کئی سال بعد کسی شبہ پر اس نے امیر قتلک کو ایک بڑی فوج کے ساتھ نوروز کی گرفتاری پر مقرر کیا۔ نوروز کے بھائی جو عراقین میں حاکم تھے، جا بجا قتل کئے گئے۔ نوروز خود نیشاپور سے اپنے داماد فخر الدین کرت کے پاس ہرات چلا گیا اس نے نوروز کو امیر قتلک کے حوالہ کر دیا اور وہ ۶۹۶ھ میں قتل کر دیا گیا۔

۶۹۹ھ میں مصر اور شام پر اس کا قبضہ ہو گیا مگر امیر قفقاق ناظم مصر، شاہ مصر سے مل گیا اور دوبارہ روم و شام سلطنت مصر میں شامل ہو گئے۔ ۷۰۲ھ میں دوبارہ مصر پر حملہ کیا گیا مگر شکست ہوئی۔ ۷۰۳ھ میں غازا خان کا انتقال ہو گیا۔ غازان شاہ نے مسلمان ہونے کے بعد دو مرتبہ رسالت پناہ کو خواب میں دیکھا اور ہر مرتبہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کو آپ کے ساتھ پایا۔ خاتم الانبیاء نے ہر مرتبہ اس کو تاکید کی کہ میرے اہل بیت کے ساتھ اخلاص رکھ اور سادات کے ساتھ سلوک کر۔

اسی لئے غازان خان آل رسول کو بہت عزیز رکھتا تھا، شیعوں کو کر بلائے محل اور نجف اشرف سے بلا کر اعلیٰ مناصب پر فائز کرتا۔ مرتے وقت اس نے اپنے بیٹے کو بھی اس کی وصیت کی تھی۔

#### الجاتو خان، محمد خدا بندہ

الجاتو خان، محمد خدا بندہ غازا خان کے لاولد فوت ہونے کے بعد بادشاہ ہوا۔ اس نے اسلام کی اشاعت میں بہت کوشش کی، شیعہ مذہب کا مسلمان تھا، اس نے گیلان کو فتح کیا پھر کئی دوسرے مقامات۔

۷۰۳ھ میں اس نے ایک نیا شہر سلطانیہ آباد کر کے اس کو دارالحکومت قرار دیا، کئی فرمانرواؤں کو باجگزار بنایا پھر مصر پر حملہ کیا مگر صلح کر کے واپس ہو گیا۔ مصر پر حملے کے دوران شہزادہ بیگ، میسور اور داؤد خواجہ ماوراء النہر سے خراسان پر حملہ آور ہوئے۔ اس نے امیر بوجائی اور بہرام شاہ کو ان کے مقابلہ پر بھیجا۔ بوجائی مارا گیا اور بہرام شاہ بھاگ گیا آخر اس نے خود چڑھائی کر کے خراسان سے سب کو نکال دیا اور اپنے بیٹے ابو سعید بہادر خان کو خراسان کا حاکم بنا دیا اور خود سلطانیہ واپس ہو کر انتقال کر گیا۔ خواجہ رشید اور علی شاہ اس کے وزیر تھے۔ شام، کرمان، سیستان، قفقاق، دارس، بلخار، ماوراء النہر، ختا، خوارزم، تاتار و گیلان اس کے زیر حکومت تھے۔ اتنی وسیع سلطنت میں اس نے امن و امان برقرار رکھا۔

#### ابو سعید بہادر خان

الجاتو محمد خدا بندہ کے مرنے کے بعد امیر چوپان نے ابو سعید کو بلا کر بادشاہ بنایا، تمام ملکی اور جنگی انتظام خود اس کے سپرد رہے اور دیگر امور اس کے منتخب لوگوں سے متعلق قرار پائے۔ خواجہ رشید الدین پر سازش کے الزامات تھے لہذا اس کو قتل کر دیا گیا، اس پر ملک میں کئی مقامات پر بغاوت ہوئی، خراسان شہزادہ میسور والی ماوراء النہر لے لیا اور دشت قفقاق پر شہنشاہ اورنگ نے قبضہ کر لیا، والی مصر نے بکرتک کا علاقہ دبایا۔

بات یہ تھی کہ لوگ امیر الامراء کے اختیارات سے جلتے تھے اور اس کے قتل کے درپے تھے اس کے علاوہ شیعہ علماء بالخصوص علامہ حلی نے مغل دربار میں آل محمد کی فضیلت میں جو استدلال کیا تھا اور وقتاً فوقتاً جو تقاریر کی تھیں، اس نے مغل ذہنوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا، خدا بندہ اور تمام متعلقین نے تو علی الاعلان شیعیت کا اظہار کر دیا تھا، پھر بدرجہ مغلوں کا ایک گروہ حلقہ اہل بیت میں داخل ہو گیا۔ بالفاظ دیگر:-

شیخ نصیر الدین طوسی نے ہلاکو کے دربار میں جو بیچ بویا تھا وہ باآواز ہو رہا تھا اور پچھلی نسلوں میں کتنے ہی سربرآوردہ افراد شیعہ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد جہد



مسلسل جاری رہی اور اب اکدم بادشاہ وقت اور اراکین دولت نے یک زبان ہو کر علی کی حمایت کا نعرہ لگایا تو آواز باز گشت مغل ایوان سے ٹکرا کر دور دور پہنچی اور سنی حلقے میں ایک ہلچل پڑ گئی۔ ہر طرف ریشہ دو انیاں شروع ہو گئیں، سنی صدر اپنے اپنے حلقوں میں تحریکیں کرنے لگے، انجام کار بندہ خدا کے بعد ابو سعید کو ہدف بنالیا گیا اور مقامی طور پر امیر الامراء چوپان سے تو دشمنی ہی ہو گئی اور اس کو راستہ سے ہٹا دینے کی تدابیر کی جانے لگیں۔

ابو سعید کو معلوم ہوا تو اس نے ان لوگوں کو قتل کرا دیا۔ میور شاہ مارواہ النہر نے ہرات میں غیاث الدین کرت کا محاصرہ کر رکھا تھا، ابو سعید نے امیر حسین کو مدد کے لئے بھیجا اور ہراتیوں نے محاصرہ سے رہائی پائی پھر میور شاہ ۶۲۱ھ میں اپنے ہی امراء کی ٹمک حرامی سے قتل ہو گیا۔

بادشاہوں کے ذاتی معاملات بھی نظم حکومت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اتفاق سے ایک ایسا واقعہ بھی پیش آگیا۔ ابو سعید امیر چوپان کی لڑکی پر عاشق تھا اور نکاح کا امیدوار تھا مگر وہ امیر شیخ حسن حاکم روم سے منسوب تھی۔ امیر چوپان نے اسے امیر شیخ حسن سے بیاہ دیا، اور خود کسی بہانے خراسان چلا گیا۔ امیر ابو سعید نے ناراض ہو کر چوپان کے بیٹے کو قتل کرا دیا پھر اس کے عزیز و اقارب کو تہہ تیغ کر کے امیر چوپان کی گرفتاری کا حکم دے دیا اس پر امیر چوپان نے خود اس پر حملہ کر دیا مگر شکست کھائی اور غیاث الدین حاکم ہرات سے مدد مانگی۔ غیاث الدین نے مدد کرنے کے بجائے امیر چوپان اور اس کے جوان بیٹے صیداد خان کو قتل کر دیا اور ان کے سرا ابو سعید کے پاس بھیجوا دیئے۔ ان واقعات سے ڈر کر امیر چوپان کی بیٹی بغداد خاتون کو اس کے شوہر امیر حسن نے طلاق دیدی اور وہ ابو سعید کے حرم میں داخل کر لی گئی۔

امیر شیخ علی خراسان کا حاکم بنایا گیا تھا۔ اس نے وہاں لوٹ مار شروع کر دی نظم حکومت تہہ و بالا ہو گیا مگر قبل اس کے کہ ابو سعید ادھر توجہ کرتا اس کا انتقال ہو گیا۔ مغل سلطنت کا ایک زریں باب بند ہو گیا اور خراسان میں سربراہیوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

صفی الدین اردبیلی، علاء الدین سمنانی، شیخ احمد اوحدی، قطب الدین رازی اس دور کے مشاہیر میں تھے۔

### معز الدین ارپاخان

ابو سعید کے بعد تیرہ سال کے عرصے میں آٹھ بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے پہلے خواجہ غیاث الدین وزیر نے ارپاخان کو بادشاہ بنایا۔ ارپاخان نے بغداد خاتون کو قتل کر دیا جو سلطنت کی دعوی دار تھی اور شہزادی ساقی بیگ دختر محمد خدا بندہ سے نکاح کیا۔ ابو سعید کی دوسری زوجہ دلشاد خاتون امیر علی شاہ حاکم بکر کے پاس چلی گئی، اس کی ترغیب سے امیر علی شاہ نے موسی بن علی بن باید خان کو تخت پر بٹھا دیا، اس پر امیر شیخ حسن بزرگ نے ناراض ہو کر روم کی حدود میں سلطان محمد کو بادشاہ بنا دیا۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور امیر علی شاہ مارا گیا موسی خورستان کی طرف فرار ہو گیا۔

### محمد خان

محمد خان کو تخت پر بٹھا کر حسن بزرگ نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور دلشاد خاتون بیوہ ابو سعید سے عقد کر لیا اس عرصے میں شیخ حسن کو چک بن امیر چوپان نے شہزادی ساقی بیگ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

### ساقی بیگ

ساقی بیگ المعروف بہ ساتیک الجاسو کی بیٹی اور ابو سعید کی بہن تھی۔ پہلے اس نے ارپاخان سے نکاح کیا تھا، اب وہ حسن کو چک کے عقد میں تھی۔ حسن کو چک اس کو تخت نشین کر کے حسن بزرگ پر حملہ آور ہوا مگر جلد ہی دونوں میں صلح ہو گئی کیونکہ ایران میں شدید بد نظمی پھیل رہی تھی۔

امیر حلاجی طغانی دیار بکر میں، امیر ارتا بعض بلاد روم میں، ملک بن تیمور تاش برجی میں، امیر اکرنج کے بیٹے کردستان میں، اولاد امیر محمود خان آنخو فارس میں، سید جلال الدین میراں اور عماد الدین سنائی اصفہان میں، امیر مبارز الدین یزد میں قطب الدین خوری کرمان میں، ملک شجاع الدین بم میں، معز الدین حسین کرت



ہونے والے بھی گنتی میں کم نہ تھے۔ شیعوں کے لئے یہ مناسب اگرچہ باعث طہانیت نہیں ہو سکتا مگر شیعہ ان سو برسوں میں مغلوں کے شکر گزار ضرور رہے کیونکہ اس مدت میں کسی نے انہیں اس لئے نہیں ستایا کہ وہ شیعہ ہیں۔

اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اقتدار سنیوں کے کسی سردار کے بجائے مغلوں کے ہاتھ میں تھا اور وہ سنی شیعہ سب کو برابر سمجھتے تھے، دوسرا سبب یہ تھا کہ مغلوں کی تلوار جس طرح سنیوں کے سروں پر تھی، اسی طرح شیعوں کے سروں پر بھی، دونوں دہشت زدہ اور ہراس کے عالم میں تھے۔ ایسے میں کوئی سنی شیعہ کو دیکھ کر کیا کہتا کہ گردن زدنی ہے۔

اب مغل منگولیا سے آئے ہوئے وحشی نہ رہے تھے ان میں اسلام کا شعور بھی پیدا ہو گیا تھا لہذا پرانے سنیوں کے لئے موقع تھا کہ مغل سنیوں سے مل کر شیعوں کے خلاف محاذ بنائیں۔

واقعات شاہد ہیں کہ ایسا ہوا مگر اس میں شدت نہیں آئی، تسخیری مہمات کی مصلحتیں ان پر غالب رہیں، لہذا مغل سلطنت جب حصے بجزوں میں بٹ گئی تو ایک نے دوسرے پر اس لئے حملہ نہیں کیا کہ وہ شیعہ ہے بلکہ اس لئے چڑھ دوڑا کہ اس کا علاقہ چھین کر اپنی حکومت کا رقبہ وسیع کر لے۔

چھوٹے چھوٹے حکمران طوائف الملوکی میں اسی مقصد کی خاطر آپس میں متصادم ہوتے رہے، حالانکہ وہ سب مغل تھے اور ان میں سے بیشتر کا سلسلہ نسب ماضی کے کسی ایک مرکز پر جا کر مل جاتا تھا۔

عقیدے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو خدا بندہ اور اس کے درباریوں کی نسلیں سب کی سب شیعہ تھیں جن میں جلائے اور بعض دوسرے خاندانوں کی اکثریت شامل تھی، باقی سب سنی اور یہ امتیاز قدرے مشکل تھا کہ کون شیعہ ہے، کون سنی کیونکہ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ خاندان عقیدے کے اعتبار سے بٹ بھی جاتے تھے مگر ان میں آپس کے رشتے برقرار رہتے اور باہم شادی بیاہ بھی ہوتے رہتے تھے۔

میں، طغلتیمور مازندران میں، امیر ارغون شاہ طوس میں، سردار سبزدار میں، امیر عبداللہ بن امیر ملانی قہستان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کر چکے تھے۔

حسن کو چک تہنا حسن بزرگ کا مقابلہ نہ کر سکتا، لہذا اس نے طغلتیمور کو ہموار کر کے مازندران سے بلایا، شیخ امیر علی حاکم خراساں کا لشکر بھی سلطانیہ آہنچا اور سب نے مل کر حسن بزرگ پر حملہ کیا مگر شکست یاب ہوئے۔ موسیٰ خان جنگ میں مارا گیا، طغلتیمور بسطام کی طرف بھاگ گیا اسی درمیان کسی نے امیر علی حاکم خراساں کو بھی قتل کر دیا۔

اس فتح کے بعد حسن بزرگ نے اباقا خان کے بڑپوتے جہاں تیمور کو تخت پر بٹھا دیا اور حسن کو چک نے ساقی بیگ کو ہٹا کر سلیمان خان بن بٹموت بن ہلا کو خان کو بادشاہ بنالیا جو ساقی بیگ کو عقد میں لے آیا۔

دونوں بھائیوں میں تفتو کے مقام پر ایک مرتبہ پھر سخت جنگ ہوئی۔ شیخ حسن بزرگ شکست کھا کر مازندران بھاگ گیا اور حسن کو چک کو اس کی بیوی نے مار ڈالا۔ اس عرصے حسن کو چک کے بھائی ملک اشرف نے اصفہان سے آکر سلیمان پر حملہ کیا اور نوشیرواں نام کے ایک شہزادے کو تخت نشین کیا جو چند روز حکومت کر سکا، ۷۵۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اور اسی پر خاندان ہلا کو کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

مغلوں کی سلطنت عراق و ایران میں چھانوے سال چل سکی۔ انحطاط کے اسباب و عوامل میں بیشتر وہی باتیں تھیں جو دوسری حکومتوں کے زوال کی موجب رہی تھیں لیکن مغل دوسری حکومتوں کے مقابلے میں کم وقت لے سکے۔ اس کی وجوہات میں بنیادی بات یہ ہے کہ ان کا کوئی باہمی مرکز اتحاد نہ تھا، مہذب قوموں سے وابستگی ہوتے ہی وہ اختلاف عقائد کے چکر میں پھنس گئے اور سیاست سے نا آشنا ہونے کے باعث وقت کے تقاضوں کو سمجھ نہ سکے۔

عیسائی یہودی ہونے والے مغل اگرچہ کسی گنتی میں نہ تھے پھر بھی ان کی کوئی نہ کوئی تعداد تھی، باقی مسلمان ہو گئے۔ منگولیا کے مسلک پر قائم رہ جانے والے ناقابل ذکر تھے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں اکثریت تو سنی رہی لیکن شیعہ

## طوائف الملوکی

## امیر چوپان

امیر چوپان بن ملک بن توران بہادر، سلدوز غازی خان کے زمانے میں بڑے سرداروں میں شمار ہوتا، سخی اور نیک سلطان ابو سعید کے عہد میں اعلیٰ منصب تک پہنچا اور مغلوں کی پوری سلطنت اس کے زیر فرمان آگئی، شہروں کے بیشتر حکام اس کے بیٹے یا متعلقین میں سے تھے، سلطان صرف نام کا بادشاہ تھا، پھر بھی بادشاہ بادشاہ ہی ہوتا ہے، امیر چوپان خود سلطان ابو سعید ہی کے اشارے سے قتل ہوا۔

اس کے نو بیٹے تھے: پہلا امیر حسین گورنر خراسان جو خوارزم میں زخمی ہو کر مارا گیا، دوسرا امیر تیمور تاش فرمانروائے روم، جو باپ کے مقتول ہونے پر مصر چلا گیا اور وہاں ملک اناصر کے حکم سے قتل کیا گیا، تیسرا امیر دمشق خواجہ جس کو ابو سعید نے قتل کرایا، چوتھا صلا د خان جو باپ کے ساتھ ہرات میں تلوار کے گھاٹ اتر، پانچواں امیر محمود گورنر گرجستان، یہ بھی ابو سعید کے حکم سے تبریز میں مارا گیا چھٹا امیر سیور خان جو امیر ایلکان بن شیخ حسن بزرگ کے حکم سے دیار بکر میں قتل ہوا، ساتواں امیر یاغی باستی، ملک اشرف کے حکم سے تبریز میں مارا گیا، آٹھواں سیوک اور نواں نوروز۔

چوپانیوں میں امیر چوپان کے بعد دو بادشاہ ہوئے: شیخ حسن کوچک اور امیر حسن برادر حسن کوچک۔

## آق بوقائی

آق بوقائی بن ایلکان جو کینخاتو کے زمانے میں سالار بزرگ تھا، باید و خان کی لڑائی میں مارا گیا۔ اس کا بیٹا امیر حسین سلطان ابو سعید کے دور میں خراسان کے امراء میں سے تھا۔ یہ ارغون کا داماد بھی تھا۔ امیر حسین کے بعد اس کا بیٹا شیخ بزرگ علاقہ روم کا گورنر ہوا۔ ابو سعید کے بعد جب مغل سلطنت زوال پذیر ہوئی تو حسن بزرگ نے شاہی اقتدار حاصل کیا اس کے بعد اس خاندان میں مزید تین بادشاہ تھے۔

## امیر شیخ حسن نویان ایلکانی

سلطان ابو سعید کے زمانے میں روم کے ایک علاقے کا حاکم تھا۔ اس نے امیر علی شاہ کو قتل کر کے موسیٰ کو بھگا کر، محمد خان کو برائے نام بادشاہ بنایا اور اقتدار مکمل اپنے ہاتھ میں لے کر حاکم بن گیا جس سے فتنہ و فساد کے آثار پیدا ہوئے مگر شیخ حسن نے قابو پایا۔

اس کے بعد شیخ حسن کوچک نے اس پر خروج کیا۔ امیر حسن بزرگ نے عراق میں پناہ لے کر ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی اور اسی سال حکومت کر کے ۷۵۷ھ میں فوت ہوا۔

## امیر حسن کوچک چوپانی

امیر حسن کوچک چوپانی نے سلیمان کو برائے نام تخت پر بٹھا دیا تھا، دراصل بادشاہ وہ خود تھا۔ اس نے روم، آذربائیجان اور عراق و عجم کے بعض علاقے بھی اپنی حکومت میں شامل کر لئے تھے، ۷۴۴ھ میں اس کی بیوی نے سوتے میں اسے قتل کر دیا۔

## ملک اشرف چوپانی

ملک اشرف چوپانی نے برائے نام بادشاہ سلیمان کو سلطانیہ میں محدود کر دیا اور خود تبریز میں خود مختار اقامت اختیار کر لی۔ یہ بہت قائم حکمران تھا۔ جانی بیگ حاکم قفقاز نے چرستانی کرکے، ۷۵۷ھ میں اس کو قتل کر دیا اور چوپانی حکومت خاتمہ کر دیا۔

## اویس بن حسن بزرگ ایلکانی

اویس بن حسن بزرگ ایلکانی باپ کے مرنے پر ۷۵۷ھ میں بغداد کا بادشاہ ہوا۔ خلیج جو ق بیگ جانی بیگ کی طرف سے تبریز کا حکمران تھا۔ اس نے تبریز اس سے چھین لیا، پھر برق بیگ، علی بیگ، جلال الدین قزوینی وغیرہ کو شکستیں دے کر ان کے علاقوں پر بھی قابض ہو گیا اور ایک بڑا فرمانروا بن گیا۔ بغداد اس کے زمانے میں بڑا بارونق اور پرامن شہر تھا۔ ۷۷۶ھ میں بیس سال حکومت کر کے اس نے وفات پائی۔



### سلطان حسین بن اویس

سلطان حسین بن اویس باپ کا جانشین ہوا۔ سب سے پہلے اس نے خواجہ بیرم ترکمان کی بغاوت فرد کی پھر قلعه در بند فتح کیا، تبریز و سلطانیہ پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا۔ اس کی عدم موجودگی میں شہزادہ علی نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ سلطان حسین نے عاقل آقا کو بھیج کر بغداد واپس لیا اور شہزادے کو شونیز کا علاقہ دے کر ہموار کر لیا اور بغداد میں قیام پذیر ہو کر عاقل آقا کو پورے لشکر کے ساتھ تبریز روانہ کیا۔

اس اثناء میں دشمنوں نے پھر بغداد پر حملہ کر دیا۔ سلطان حسین تبریز کی سمت فرار ہوا جہاں اس کے بھائی احمد نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔

### سلطان احمد جلائر بن اویس ایلکانی

سلطان احمد جلائر بن اویس ایلکانی کے قیام تبریز میں عاقل آقا کے اکسمانے پر اس کے بھائی بلنیز نے سلطانیہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شیخ علی حاکم عراق عاقل آقا کا حامی تھا۔ ان سب نے متحد ہو کر تبریز پر حملہ کیا مگر سلطان احمد سے شکست کھائی پھر طے پایا کہ احمد آذر بایجان اور بغداد میں، بلنیز عراق و عجم میں حکومت کرے۔ اس فیصلے کو چار سال گزرے تھے کہ امیر تیمور گورگان نے آذر بایجان فتح کر کے بغداد پر حملہ کیا، سلطان احمد مصر بھاگ گیا اور امیر تیمور کے انتقال کے بعد واپس آکر عراق پر قابض ہوا پھر قرا یوسف والی تبریز پر حملہ بولا مگر جنگ میں مارا گیا یہ تمام سلاطین شیعہ عقیدہ رکھتے تھے۔

اس کی ذات پر ایلکانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور تبریز میں قرا یوسف ترکمان کی حکومت مستقل ہو گئی۔

ابو اسحاق بن امیر محمود شاہ، عبداللہ انصاری کی نسل سے تھا جو صرف اپنی ذات سے بادشاہ ہوا۔ سلطان ابو سعید کے زمانے میں اس کا رتبہ بلند ہوا تھا۔ آپ کے قتل کے بعد وہ فارس چلا گیا تھا مگر جب شیخ حسن کو چک بادشاہ ہوا تو اس نے

فارس کی حکومت پر حسن چوپانی کو دے دی، اس نے اصفہان شیخ ابو اسحق کے قبضے میں رہنے دیا۔ کچھ دنوں بعد جب اشرف عراق پہنچا اور اس نے شیراز پر چڑھائی کی تو پیر حسن بغیر لڑے بھاگ گیا۔ ابو اسحاق نے ملک اشرف کے آنے سے قبل شیراز پر قبضہ کر لیا۔ ملک اشرف اپنے بھائی کے مارے جانے کا حال سن کر رستے ہی سے آذر بایجان واپس ہو گیا اور ابو اسحق شیراز کا بادشاہ بن گیا۔

پھر امیر یاغی باسقی امیر مسعود برادر ابو اسحق کی مدد سے شیراز کا بادشاہ ہو گیا مگر وہاں کے باشندوں نے اسے نکال دیا اور ابو اسحق اپنی بادشاہت پر واپس آگیا۔ وہ بہت سخی اور عادل بادشاہ تھا۔ قاضی عضد نے اپنی کتب مواقف اسی کے نام پر لکھی تھی۔ خواجہ حافظ نے بھی اس کی تعریف میں اشعار لکھے ہیں۔ ۷۵۶ھ میں وہ امیر مبارز الدین سے شکست کھا کر قتل ہوا اور شیراز میں خاندان مظفر کی حکومت کا آغاز ہو گیا۔

### آل مظفر

عزالدین عمر مرعنی وزیر غیاث الدین غوری کا بھائی تاج الدین عثمان قلعه خنसार اور بعض علاقہ غور کا حاکم تھا۔ عثمان کے بعد عزالدین کا بیٹا رکن الدین اس کی جگہ حاکم ہوا۔ رکن الدین نے چنگیز خان کی اطاعت کی اور اس کے حکم سے تمام غور اس کو مل گیا۔ اس کا نواسہ شمس الدین امرائے چنگیز خان میں معتبر ہوا اور جب رکن الدین ۷۲۳ھ میں مر گیا تو اس کا نواسہ شمس الدین بن ابو بکر کرت، جو سلطان سنجر سلجوقی کی نسل سے تھا، اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔ یہی خاندان کرت کا بانی سمجھا جاتا ہے اس خاندان میں آٹھ بادشاہ گزرے۔

شمس الدین، رکن الدین، فخر الدین، غیاث الدین، شمس الدین، حافظ الدین، معز الدین حسین اور غیاث الدین۔ یہ سب خدا بندہ کے باج گزار تھے مگر ان میں سے کئی بہت متعصب سنی تھے۔

غیاث الدین نے مغل سلطنت کے کمزور ہو جانے کے بعد سرحد و خواجہ علی موید حاکم نیشاپور و بسطام پر صرف اسی لئے حملہ کیا تھا کہ وہ شیعہ تھا۔ تین سال کی مسلسل جنگ کے بعد فتح تو کر لیا مگر حکومت کسی طویل مدت تک باقی نہ رہی۔



امیر تیمور نے ۷۸۳ھ میں ہرات پر قبضہ کر لیا اور ایک سال بعد ۷۸۴ھ میں پیر محمد، ملک محمد، غیاث الدین اور علی بیگ جوئی سب سر قند لے جا کر قتل کروا دیئے گئے۔ جدا اعلیٰ اس خاندان کا غیاث الدین حلجی خراسانی سجاوندی خوانی عراق عجم کے چند قطعات پر حاکم تھا۔ تاتاریوں نے جب خراسان پر یورش کی تو حلجی اپنے تینوں بیٹوں ابو بکر، محمد اور منصور کو لے کر علاء الدین اتابک کے پاس بزد چلا گیا۔ علاء الدین نے ابو بکر بن حلجی کو تین سو سوار دے کر ہلاکو کی خدمت میں بھیج دیا جو فتح بغداد میں شریک ہوا۔ آخر ہلاکو نے اس کو مصر روانہ کیا جہاں وہ مارا گیا۔ منصور بن حلجی کے تین بیٹے تھے: محمد، علی اور مظفر، جن میں مظفر اتابک یوسف شاہ کے دربار میں امیر تھا، پھر ارغون کی خدمت میں رہا اور اس کا شمار بڑے امیروں میں ہونے لگا۔

۷۱۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مظفر کے بعد اس کا بیٹا مبارز الدین الجاسق سلطان کی طرف سے باپ کے عہدے پر سرفراز ہوا۔ جب سلطان ابو سعید خان بادشاہ ہوا تو اس نے ۷۱۹ھ میں اس کو یزد کی حکومت عطا کی اور ۷۴۱ھ میں کرمان بھی دے دیا۔ مظفر کی اولاد میں چار بادشاہ ہوئے۔

### مبارز الدین محمد

امیر شیخ ابو اسحق والی شیراز نے کئی مرتبہ اس پر یورش کی مگر ناکام رہا۔ آخر خود مبارز الدین نے چرمائی کر کے ۷۵۶ھ میں شیراز فتح کر لیا۔ ابو اسحق کے مرنے پر جب مغلوں کی سلطنت ضعیف ہوئی تو وہ اصفہان اور آذربائیجان پر بھی قابض ہو گیا اور اس نے اپنی سلطنت سندھ سے سرحد عراق تک قائم کر لی۔ آخر عمر میں وہ چھوٹے بیٹے ابو یزید کو ولی عہد کرنا چاہتا تھا مگر اس کے بڑے بیٹوں محمود اور شجاع نے اس کے داماد شاہ سلطان کی سازش سے اسے گرفتار کر کے اندھا کر دیا۔

### جلال الدین شاہ شجاع

جلال الدین شاہ شجاع نے کرمان کی حکومت اپنے بھائی ابو یزید کو اور اصفہان کی محمود کو دی اور خود شیراز میں تخت نشین ہوا۔ کچھ دنوں کے وقت سے چھوٹے بھائی محمود نے سلطان اولیس حاکم بغداد و تبریز کی مدد سے شیراز پر قبضہ

کر لیا۔ شجاع نے کرمان میں قدم جما کر مقابلہ کیا اور فتح پائی مگر محمود دوبارہ حملہ آور ہوا اور پھر شیراز پر قبضہ کر لیا۔ محمود کے مرنے کے بعد شیراز پھر اس کے تسلط میں آگیا۔ اس اثناء میں بغداد کا حاکم اولیس انتقال کر گیا اور اس کا بیٹا سلطان حسین اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔ شجاع نے خود تبریز جا کر سلطان کی بہن اپنے بیٹے زین العابدین کے عقد میں لی اور اصفہان کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔ وہ کمالات باطنی اور فضائل نفسانی کے سبب مشہور تھا۔ حافظ شیرازی اس کے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے۔ مرتے وقت اس نے اپنی سلطنت اس طرح تقسیم کی کہ اصفہان یحییٰ کو، کرمان احمد کو اور شوسٹر منصور کو دیا اور زین العابدین کو اپنی جگہ تخت نشین کیا۔

### زین العابدین

زین العابدین سے اس کے چچا ابو یزید، شاہ یحییٰ اور شاہ منصور سے اکثر لڑائیاں ہوتی رہیں، آخر حاکم شوسٹر منصور نے اس کو گرفتار کر کے آنکھوں میں نیل کی سلاخیں پھر وادیں۔ یحییٰ نے شیراز لے لیا اور پھر منصور نے اسے فتح کر لیا اور یحییٰ یزد چلا گیا۔

### منصور

منصور اس وقت تک شیراز کا فرمانروا رہا جب تک امیر تیمور نے اس کو فتح نہیں کر لیا۔ تیمور نے پہلے اس کو قتل کیا پھر احمد والی کرمان، یحییٰ والی تبریز، مہدی ابن شجاع، معز الدین جہانگیر بن یحییٰ اور ابو اسحاق، کل سلاطین آل مظفر کو طلب کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا اور فارس کی سلطنت اپنے بیٹے عمر شیخ مرزا کو تفویض کر دی، حکومت کرمان امیر برلاس برادر امیر جا کو اور یزد کی حکومت ملوکہ چین کو عطا کی۔

### سربداران (خراسان)

سلطان ابو سعید کے زمانے میں خواجہ فضل اللہ پاشیتی کا بیٹا عبدالرزاق پہلوان سربداری کے عہدے پر مامور تھا ۷۳۶ھ میں کرمان کا خراج وصول کرنے کے لئے بھیجا گیا تو راستے میں سلطان کی خبر وفات کان میں پڑی لہذا وہ کرمان جاسنے کے

بجائے اپنے وطن پاشین آگیا جہاں اس نے کچھ آدمی جمع کئے اور حاکم پاشین کے بھانجے کو قتل کر کے پاشین پر قبضہ کر لیا پھر سبزواری فتح کر کے اس کو دارالسلطنت بنایا یہ خاندان اثنا عشری شیعہ تھا۔ بتدریج بسطام وغیرہ کے علاقے بھی اس کے قبضے میں آگئے۔ مدت حکومت صرف تیس بتیس سال ہی رہی مگر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔

### خواجہ عبدالرزاق

قیام حکومت کے بعد وہ اس پر قبضہ ہی جمارہا تھا کہ اس کے بھائی وجیہ الدین نے اس کو قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ عبدالرزاق کی مدت حکومت ایک سال دو ماہ تھی۔

### خواجہ وجیہ الدین

خواجہ وجیہ الدین نے امیر ارغون سے نیشاپور چھین لیا۔ طغ تیمور نے اس پر حملہ کیا تو شکست کھائی پھر اس نے خود ہرات پر دھاوا بولا مگر ہزیمت یاب ہوا اور گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔

### محمود تیمور

محمد تیمور کی مدت حکومت صرف دو سال تھی، ۷۴۴ھ میں علی شمس الدین کے ہاتھ سے مارا گیا اور اس نے اس کے بجائے کلو اسفندیار کو بادشاہ بنا دیا۔

### کلو اسفندیار

ایک سال کے اندر ہی تلوار کے گھاٹ اتر گیا۔

### شمس الدین بن فضل اللہ

خاندانی جھگڑوں کے سبب سات ماہ بعد ہی برطرف کر دیا گیا۔

### شمس الدین علی

شمس الدین علی نے پونے پانچ سال تک بڑے عدل و انصاف سے حکومت کی مگر کوئی اس کا چھپا دشمن تھا، جس نے دھوکے سے قتل کر دیا۔

### خواجہ یحییٰ

خواجہ یحییٰ سخنی اور عادل بادشاہ تھا۔ اس نے حمید رہلوان کو سپہ سالار بنایا

اور طغ تیمور کو ہلاک کر کے مازندران پر قبضہ کر لیا۔ اس کے زمانے میں سلطنت کی حدود وسیع اور مضبوط تھیں۔ اس کے برادر نسبتی نے اس کے بھائی علاء الدولہ سے سازش دھوکے سے قتل کر دیا۔

### خواجہ ظہیر الدین

خواجہ ظہیر الدین، حیدر بہلوان کی مدد سے تخت پر بیٹھا مگر عیاش اور شراب خوار تھا، اصلاح کا موقع دیے جانے کے باوجود نہ سدھراتو اس کو معزول کر دیا گیا اور حیدر بہلوان کو اس کا جانشین بنایا گیا۔

### حیدر بہلوان

حیدر بہلوان بڑا سخنی اور منصف مزاج تھا اور فنون حرب کا ماہر بھی مگر اسفرائین کے محاصرے میں حسن و امغانی کے ہاتھ سے مارا گیا۔

### لطف اللہ

لطف اللہ حسن بہلوان کی مدد سے بادشاہ ہوا لیکن ایک سال چار ماہ بعد خود حسن اسے مار کر تخت نشین ہو گیا۔

### حسن بہلوان

حسن بہلوان نے چار سال سات ماہ رعب و داب سے حکومت کی مگر سازشوں پر قابو نہ پاسکا اور علی موید کے ہاتھ سے قتل ہو گیا۔

### خواجہ علی موید

خواجہ علی موید کوئی کامیاب حکمران ثابت نہیں ہوا۔ غیاث الدین کرت نے نیشاپور اس سے چھین لیا۔ امیر تیمور کے خراسان پہنچنے پر اس نے تیمور کی اطاعت قبول کر لی۔ تیمور نے اس کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا مگر خود اس کو اپنے امراء میں داخل کر لیا پھر ایک فوج کا سردار بنا دیا، تیمور ہی کی طرف سے وہ کردستان بھیجا گیا تو ایک معرکے میں شدید زخمی ہوا اور جانبر نہ ہو سکا۔ سرداران کا وہ آخری بادشاہ تھا۔ اس کی مدت حکومت سولہ سال سات ماہ تھی۔



## خاندان تیموریہ

تو منائی خان مغل چنگیز خان کا جد چہارم تھا۔ تو منائی کے بیٹے کا پوتا قراچار نویاں چغتائی خان بن چنگیز خان کے دربار میں امیر الامراء تھے اس کی اولاد شہر سبزوار کش میں آباد رہی۔ قراچار نویاں کے پوتے کا پوتا تراخان نویاں تیمور کا باپ تھا تیمور ۷۳۶ھ میں شہر کش میں پیدا ہوا۔ ۷۶۱ھ میں تراخان نے ماوراء النہر فتح کر کے شہر سبزوار کش تیمور کو دیدیا۔ وہ اپنے سارے امیر حسین والی افغانستان و ماوراء النہر کو قتل کر کے تخت نشین ہوا اور سمرقند کو دار الحکومت بنالیا۔ پھر اس نے ماوراء النہر اور شرغان فتح کر کے خوارزم پر یورش کی، شیخ یوسف صوفی کو شکست دی، ۷۶۶ھ میں قمر الدین خان کو شکست دے کر کاشغر کا علاقہ چھین لیا اور اس خان حاکم سفلستان کو مغلوب کیا، ۷۸۱ھ میں خوارزم فتح کر لیا، اترار اور دشت خفیاق جو بچے خان کی اولاد سے لے کر توغتمش خان کو دیدیا، ۷۸۳ھ میں فوشیخ فتح کر کے ہرات خاندان کرت سے چھڑایا، جونی قربانی حاکم طوس اور علی موید سرمداری کو مطیع کیا، شیخ داؤد سبزواری کا استیصال کیا، قطب الدین سیستانی کی سرکوبی کی اور اس کا علاقہ لے لیا اور قندھار اور تمام افغانستان فتح کیا، ازبکستان کے مفسدوں کو سزا دی، جرجان، مازندران کو مسخر کیا، امبرولی والی استرآباد کو معزول کر کے وہ علاقہ لقمان شلعر بن تخت تیمور کو دیا، ۷۸۷ھ میں سلطانیہ تک کا کل ملک فتح کر لیا، احمد جلائر کو شکست دی (جو بلنذید سلطان روم کے پاس بھاگ گیا)، آذربائیجان کو مسخر کیا، گرجستان فتح کیا پھر فارس میں پہنچ کر اعزاء الدین اردستانی کو سزا دی جس نے حجاز کا قافلہ لوٹا تھا۔ جونی قربانی حاکم طوس اور سرمداری قتل ہوئے۔ ۷۸۹ھ میں قرا محمد ترکمان پر یورش کر کے قلعہ وان وغیرہ فتح کر کے عمر شیخ مرزا ولد تیمور اس لڑائی میں مارا گیا۔ پھر اصفہان میں آکر قتل عام کرایا، ۷۹۵ھ میں شاہ منصور حاکم شیراز کو قتل کیا اور آل مظفر پر کامیاب ہو کر فارس پر قبضہ کیا۔

پھر بغداد فتح کر کے قتل عام کرایا، احمد جلائر اب مصر کی طرف بھاگ گیا۔ ۷۹۰ھ میں توغتمش والی خفیاق نے سرکشی کی، اسے مغلوب کیا اور روس میں ماسکو تک گھس گیا اور ماسکو فتح کر کے جلا دیا اور دشت خفیاق کی حکومت اپنے ایک ملازم اور لوس جو بچے خان کے سپرد کی۔ ادھر چین تک کا تمام ملک فتح ہوا۔ آذربائیجان میں واپس آکر آذربائیجان اور عراق کی حکومت اپنے بڑے بیٹے میران شاہ کو اور خراسان دوسرے بیٹے شاہ رخ کو سپرد کر کے سمرقند آیا، ۸۰۱ھ میں سندھ کو عبور کر کے ہند پر حملہ کیا۔ سکندر بت شکن والی کشمیر نے وکیل بھیج کر اطاعت قبول کی۔ تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو محمود تغلق نے اپنے وزیر ملو خان کے ہمراہ مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ تیمور نے دہلی فتح کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھا، ۱۵ دن دہلی میں رہ کر بھرپور فتح کیا اور کوہ شوالک کا علاقہ فتح کرتا ہوا سید خضر خان کو ملتان کا صوبہ دار بنا کر سمرقند آیا۔ ۸۰۲ھ میں پھر ایران آیا، شہزادہ سکندر بعد فتح و انتظام مغلستان و خطا و ختن کے خدمت میں آکر مستحق تحسین ہوا۔ ۸۰۳ھ میں ایشیاء کو چپک پر یورش کر کے سیواس اور ملاطیہ فتح کیا، بہت سے نصارے قتل کئے، مسلمانوں کو امان دی، شاہ رخ مرزا ابلسان (سانبریا) بھیجا گیا اس نے وہاں جا کر ترکمانوں کو شکست دی اور خود تیمور تیمور تاش حاکم حلب، حمص حماة اور بعلبک کو فتح کر کے دمشق آیا فرخ شاہ والی مصر منہزم ہوا، تیمور نے دمشق میں قتل عام کر کے شہر کو مسمار کیا پھر گرجستان ہوتا ہوا بغداد آیا اور احمد جلائر کے گماشتہ کو بغداد سے نکال دیا، ۸۰۴ھ میں تبریز آیا اور روم پر یورش کی، انقرہ (انگوریہ) کی لڑائی میں سلطان بلنذید یلدرم شکست کھا کر پھڑا گیا اور قید ہی میں مر گیا، پھر قلعہ از میر (سمرنا) کو فتح کر کے مسمار کیا۔ روم کی فتح کے بعد ملک فرخ برقوق ناصر شاہ والی مصر بھی مطیع ہو گیا اور مصر میں تیمور کے نام کا سکہ و خطبہ جاری ہوا۔ مگر قرا یوسف ترکمان مطیع نہ ہوا، آخر شکست کھا کر مصر چلا گیا۔ ۸۰۵ھ میں ملک کرکین حاکم گرجستان مطیع ہوا۔ یکم محرم ۸۰۷ھ کو امیر تیمور سمرقند واپس آیا اور چین پر آٹھ لاکھ فوج سے چڑھائی کی، راستہ میں ختن فتح کیا مگر شعبان ۸۰۷ھ میں بیمار ہو کر مر گیا۔ حسب وصیت سمرقند میں لا کر دفن کیا گیا۔ عمر ۷۰ برس پائی۔



فتوحات کے لحاظ سے تیمور لاثانی تھا۔ دنیا میں کسی بادشاہ نے اتنی بڑی سلطنت پر حکومت نہیں کی۔ دیوار چین سے وسط روس یعنی ماسکو اور بحیرہ روم اور دریائے نیل سے دریائے گنگ تک تمام ملک اور خلقت اس کے زیر حکم تھی؛ توران، ترکستان، تمام ممالک ایران، گرجستان، چین، ختن، کاشغر، بدخشاں، افغانستان، خراساں، خوارزم، عراق، عرب، کچھ، مکران، شمالی ہندوستان، روم، شام اور حجاز میں سکھ اور خطبہ اسی کے نام کا جاری تھا۔ اسے ایشیاء میں صرف جاپان، ہندوچینی اور چین فتح کرنا باقی رہ گیا تھا۔ تیمور کے زمانے میں علامہ تفتازانی، میرسید شریف یسان الدین محمد نجومی، شمس الدین محمد حافظ شیرازی اور شیرازی صاحب قاموس اور مغربی خواجہ علی شطرنجی مشہور علماء گزرے ہیں۔

تیمور نے اپنے ایام مرض میں اپنے پوتے پیر محمد ولد جہانگیر کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور اپنی سلطنت کو اپنی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا:

ہرات، خراساں، مازندران، جرجان اپنے بیٹے مرزا شاہ رخ کو

آذربائیجان، رے اور بغداد دوسرے بیٹے میراں شاہ اور اس کے دو بیٹوں

مرزا عمر اور مرزا ابو بکر کو

شیراز، اصفہان، کرمان اور یزد اپنے مرحوم بیٹے عمر شخ مرزا کے دو بیٹوں پر

محمد اور مرزا رستم کو

ولایت، حبہ تاحدود خٹا لغ بیگ بن شاہ رخ کو

کاشغر و ختن ابراہیم سلطان بن شاہ رخ کو۔ اسی طرح دیگر علاقے اپنی دیگر

اولاد کو عطا کئے۔ اس کی سلطنت کی مفصل تقسیم اس شجرہ سے صاف اور واضح طور

پر ظاہر ہوگی۔ تیمور کی وفات کے بعد صرف ایران، ترکستان اور افغانستان اس کی

اولاد کے قبضہ میں رہا دیگر مفتوحہ ممالک نے تیمور کے مرتے ہی اپنی آزادی بحال

کر لی، بقیہ مقبوضات بھی آپس کی تقسیم اور جنگ باہمی کی وجہ سے سو برس سے

زیادہ خاندان تیموریہ کے قبضے میں نہ رہے۔ آخر میں تیمور کے پوتے بابر کی

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت ۱۸۵۷ء تک قائم رہی۔

سلطنت تیموریہ کا دورانیہ ایک سو چالیس سال ہے، چودہ فرمانروا اس کی

نسل سے گزرے جو آپس میں اور چنگیز خان کے خاندان کے دوسرے حکمرانوں سے فکر افکار ختم ہوتے رہے۔

سنہ وفات	سنہ جلوس	بادشاہ
۸۰۷	۷۷۱	امیر تیمور
۸۱۱	۸۰۷	مرزا خلیل بن میراں شاہ
۸۵۰	۸۰۷	سلطان سعید شاہ رخ بن تیمور
۸۱۲	۸۰۷	جلال الدین میراں شاہ بن تیمور
۸۱۲	۸۰۷	مرزا پیر محمد بن عمر شخ بن تیمور
۸۵۳	۸۵۰	لغ بیگ بن شاہ رخ بن تیمور
۸۶۵	۸۵۰	علاء الدولہ ابن بایسنقر بن شاہ رخ
۸۵۴	۸۵۰	سلطان محمد بن بایسنقر بن شاہ رخ
۸۶۱	۸۵۴	لوا القاسم بابر بن بایسنقر بن شاہ رخ
۸۵۴	۸۵۲	عبد اللطیف بن لغ بیگ بن شاہ رخ
۸۷۳	۸۵۵	ابو سعید بن سلطان محمد بن میراں شاہ
۹۱۱	۸۷۳	سلطان حسین بن غیاث الدین بن بایسنقر ابن عمر شخ
۹۲۰	۹۱۱	بدیع الزماں بن سلطان حسین

تیمور کو شیعہ حلقہ ارادت میں شامل نہیں کیا جاسکتا مگر وہ سنی بھی نہ تھا، وہ صرف ایک مسلم حکمران تھا، تسخیر ملک جس کا مسلک اور جہانگیری جس کا نصب العین تھا۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد اس نے جو تیموریہ مغل سلطنت قائم کی اس کی بنیاد شیعہ و سنی حکومتوں کے خاکستری پر رکھی ہوئی تھی۔

در حقیقت اس کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ کسی کا کیا عقیدہ ہے اور کون کس کو مانتا ہے، اس کو تو بہادر اور بے جگر سپاہی درکار تھے جن کی شمشیر خارا شکاف پہاڑوں کو توڑ دیتی، ایسے بیالے درکار تھے، خونریزی جن کی فطرت اور بربریت جن کی عادت ہو لہذا ایسے ہی سپاہی لے کر وہ نکلتا تھا..... پھر بھی روایتی طور پر کہا جاتا ہے کہ روضہ امام حسین سے اس کو خاص عقیدت تھی اور عموماً عاشور محرم کو وہ کر بلا جایا کرتا تھا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی فوج میں شیعہ کافی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی خوشنودی کے لئے وہ ایسا کرتا ہو لیکن اس خیال کو تقویت اس



لئے نہیں ہو سکتی کہ کر بلا کے بعض سادات کا وہ احترام بھی کرتا تھا اور انہیں عطیات سے نوازتا بھی تھا۔

ایک بزرگ سید کے بارے میں مشہور ہے کہ ہر بار وہ امیر تیمور کو نادرات پیش کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سید نے صریح مقدس کی ایک نقل پیش کی جو کر بلا کی مٹی سے بنائی گئی تھی۔ ایک بار ایک تسبیح دی جس کے بہتر دانے عاشور کو سرخ ہو جاتے تھے۔ تیمور کو عقیدہ ہونے لگا کہ یہ چیزیں اس نے احتیاط سے رکھیں۔ امیر تیمور کا نام نامی فاتحین عالم میں سکندر اعظم اور چنگیز خان کے بعد دیا جاتا ہے۔ اس کی عمر بھی گھوڑے کی پیٹھ پر گزر گئی۔ ۸۰۱ھ میں جب وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اس کے بعد جو عاشور اس کو دلی میں پڑا اس کی شب میں اپنی سپاہ کی تالیف قلب کے لئے اس نے متذکرہ نقل روضہ ایک عماری میں رکھ کر گشت کرائی اور صریح پر وہ تسبیح بھی لٹکا دی۔ شاید اس کے بعد اس نے ہر شب عاشور اس عمل کو دہرایا ہو۔

پھر بادشاہ کی تقلید میں اس گشت نے رواج کی صورت اختیار کر لی۔ ہندوستان میں اسی کو جلوس تعزیه کا آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت پر کوئی بحث ایک فاضل کام ہو گا کیونکہ مجلس عزاء اور جلوس کا وجود اس سے قبل بھی پایا جاتا تھا۔ تیمور کے اس عمل سے نوعیت جلوس ضرور بدلی اور شیعوں پر اس کا یہ احسان ہے کہ اس نے مظاہرہ غم کا ایک اضافی راستہ دکھا دیا۔

### ایک جائزہ

شیعیت کی بساط اشاعت پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس کا نقطہ آغاز مدینہ تھا جس کا پھیلاؤ یمن اور مضافات یثرب و بطنی میں صحرائی قبائل تک ہوا تھا پھر کوفہ و بصرہ تک اس کا دامن کشادہ ہوا۔ بنی امیہ کی سختیوں نے وقتی طور سے اس کی اشاعت پر پھرے بٹھا دیئے اور بظاہر وہ ناپید ہو گئی لیکن شیعہ علماء نہایت خاموشی سے جہاد لسان و قلم کرتے رہے۔

زمانہ کچھ سازگار ہوا اور شیعوں کو علاقائی طور پر اپنے عقائد کے اظہار کا موقع ملا تو شیعوں کے گروہ میں پرانے پہروں کے ساتھ نئے چہرے اور خاندانی

شیعوں کے دوش بدوش نئے شیعہ نظر آئے اور ان سب نے مل کر حصول اقتدار کیلئے جہاد بالسیف میں حصہ لیا۔

شیعہ حکومتیں بنیں اور ختم ہو گئیں اور ان کی جگہ غزنویوں، سلجوقیوں اور ایوبیوں نے لے لی۔ ایک بار پھر شیعوں کا دور استلاء شروع ہوا لیکن وہ تلواروں کی چھاؤں میں اور سردار زندہ رہنے کے عادی تھے اس لئے مرمر کر جیتے رہے۔ آخر منگولیا کے زرد طوفان نے سب کچھ ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔

عراق و ایران اور شام میں مغل حکومت کے استعمار کے بعد جب تاتاریوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی ابتداء ہوئی تو ہر مکتبہ فکر کے علماء نے اپنی صداقت کا مظاہرہ شروع کیا ان میں حنفی بھی تھے مالکی بھی، شافعی بھی تھے اور حنبلی بھی۔ انہیں میں ایک چہرہ امام ابن تیمہ کا بھی تھا۔ اور سب کے آخر میں ایک مظلوم طبقے کے اہل علم بھی۔

اس خاموش جہاد میں شیخ نصیر الدین طوسی اہل بیت کے نمائندے تھے اور ان کے دوش بدوش بعض دوسرے علماء بھی۔ اس عہد میں شیعہ علماء نے اپنی حقانیت کے جو بیج بوئے، وہ بار آور ہوئے بغیر نہ رہے اور علامہ حلی تک پہنچتے پہنچتے مغل اور ترک ذہنوں میں اسلام کی وہ تصویر مرتسم ہو چکی تھی جس کے خال و خد تعلیمات آل محمد کی روشنی میں درست کئے گئے تھے۔

کتنے سنی ہوئے؟ کتنے شیعہ؟ اس کا فیصلہ اس لئے بھی نہیں ہو سکتا کہ پہلے سے شیعہ بہت کم تھے اور سنی بہت زائد۔ یہی صورت حال تیمور کے حملے کے وقت باقی تھی جس میں تیمور کے بعد کچھ اضافہ ہوا، کیونکہ اب خود مغلوں اور ترکوں میں بھی عالم پیدا ہو چکے تھے۔ تاریخ نے جو کچھ دیکھا، وہ اتنا ہی کہ اکثر حکمران قبائل شیعہ تھے اور انفرادی طور پر جو شیعہ، سنی اکثریت کے گھیرے میں تھے وہ اپنے عقیدے کے بارے میں کسی سے کوئی بات ہی نہ کرتے۔

اس طرح ایران میں شیعہ قبائل کا سلسلہ نسب یا تو ہلاکو خان کی اولاد سے جا کر مل جاتا تھا یا تیمور سے۔ یہی حال سنیوں کا بھی تھا، عراق میں سنی اور شیعہ حلقے بیشتر عراقیوں ہی کے تھے۔ (۲۱)

## سلطنت صفویہ

### خاندانی پس منظر

شیخ صفی الدین السطحق کا نام سب سے پہلے ابو سعید کے دور میں آتا ہے جو ہلاکو خان کی نسل میں محمد خدا بندہ کے بعد تخت نشین ہوا، محمد خدا بندہ کے عہد سے مغل دربار میں شیعہ علماء و فقہاء کو برتری حاصل تھی اور ان میں صفی الدین ایک موقر بزرگ گردانے جاتے تھے۔

انہوں نے شیعیت کی تبلیغ و اشاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور مغلوں کی بڑی تعداد کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔

تاریخ کی یاد میں ان کا سلسلہ نسب حضرت موسیٰ کاظمؑ سے جا کر ملتا ہے اور عراق میں ان کے جن آباء و اجداد کا پتہ چلتا ہے وہ دوسرے سادات کی طرح مقام سے بچنے کی خاطر ٹولیوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل ہوتے رہے اور آخر اردبیل میں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔

خواجہ علی، شیخ صفی الدین کے پوتے تھے جو ایک صاحب کرامت درویش تھے۔ امیر تیمور ان کا بڑا معتقد تھا یہ سلسلہ ان کی کئی پشتوں سے چلا آ رہا تھا اور اس کے بعد بھی جاری رہا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ خواجہ علی کے پوتے شیخ جنید کے ہزاروں مرید تھے اور یہ مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی جس سے خائف ہو کر جہاں شاہ بن قرا یوسف نے انہیں اپنے علاقے سے نکال دیا اور وہ اردبیل سے حلب آ گئے پھر حلب سے دیار بکر چلے گئے۔

اب شیخ جنید ایک مرشد معجز نما تھے لیکن ان کا انداز تصوف دوسرے سجادہ نشینوں کا سا نہ تھا۔ وہ فقیروں کے بھیس میں تماشائے اہل کرم نہ دیکھتے بلکہ

باحیثیت لوگوں کو غریب نوازی کی تلقین بھی کرتے تھے۔ خود وہ مسجد گونہ کے ولی کامل کا طوق غلامی گھے میں ڈالے تھے لہذا اپنے مریدوں کو بھی اہل بیت کے لئے جینے اور اسلام کے لئے مرنے کا درس دیتے تھے۔

اسی لئے کچھ دن بعد انہوں نے دیار بکر سے گرجستان کا رخ کیا اور کفار سے جہاد کا فریضہ انجام دیا جس میں انہیں کامیابی ہوئی اور ایک بڑی تعداد مسلمان ہوئی پھر وہ شیردان کے عازم ہوئے۔

والی شیردان نے ان کے داخلے پر پابندی لگائی لہذا جنگ ہوئی اور شیخ جنید نے شہادت پائی۔ باپ کی جگہ بیٹے نے لی اور سلطان حیدر نے اردو تمندوں کو منظم کر کے پھر مقابلہ کیا مگر انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی اور وہ بھی میدان میں کام آ گئے

سلطان حیدر کے تین بیٹے تھے: ابراہیم علی شاہ، اسماعیل علی شاہ اور سلطان علی شاہ۔ یہ تینوں اعزا اقربا اور بچے کچے مریدوں کو لے کر دیار بکر پہنچے تو رستم بیگ ولد حسن سدر راہ ہوا۔ وہ اپنے علاقے میں ان کا رہنا خطرے سے خالی نہ سمجھتا اس لئے نوبت مقابلہ کی آ گئی۔ جنگ آزمودہ اور نا تجربہ کار لوگوں کا مقابلہ تھا لہذا میدان تجربہ کاروں کے ہاتھ رہا اور سلطان علی شاہ نے اپنا مقصد حیات پورا کر دیا۔

باقی بچے دو بھائی، ابراہیم علی شاہ اور اسماعیل علی شاہ، وہ بقیۃ السیف کو لے کر گیلان چلے گئے جہاں ان کی پذیرائی ہوئی۔ اسی مقام سے ان کی ملک گیری کا آغاز ہوا۔

### استقرار حکومت

امیر تیمور نے ۷۸۳ھ سے ۸۹۵ھ تک بیشتر جنگی حکمرانوں سے ان کی حکومتیں چھین کر ایک مضبوط تیموری حکومت قائم کر دی تھی لیکن نویں صدی ہجری شروع ہوتے ہوئے خود ان کی حالت بھی جنگیں جیسی ہو گئی تھی۔ ہر طرف اقتدار کی کشمکش تھی، دو تین خاندانوں نے مختلف حلقوں کو بانٹ رکھا تھا اور ایک دوسرے کا ملک چھین لینے کے لئے میدان داری کر رہا تھا۔

ان حالات کا گہرا مشاہدہ اسماعیل نے کیا تھا اور ممکن ہے کہ اس کے ذہن



### شاہ اسماعیل صفوی

اسماعیل صفوی بادشاہت کا اعلان کرنے سے قبل تقیہ میں تھا، تخت پر بیٹھتے ہی شیعیت کا اعلان کر دیا۔ اس نے تشیع کی اشاعت میں ہر ممکن کوشش کی سکے میں ایک طرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، علی ولی اللہ، دوسری طرف اپنا نام کندہ کرایا، یہی قزلباشوں کی ٹوہیوں پر بھی کڑھوایا۔

تیموری گورنروں اور چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو اس نے بہت جلد مطیع کر لیا۔ سلطان مراد، جو عراق، شیراز، کرمان و اصفہان کا بھی حکمران تھا، اس کی بڑھتی طاقت دیکھ کر حملہ آور ہوا مگر اس نے اس کو ہمدان کے معرکے میں شکست دی اور مراد نے بغداد پہنچ کر دم لیا۔ اسماعیل نے اصفہان و شیراز وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا، پھر مازندران و جرجان فتح کیا اور چند ہی سال میں اس کی قلمرو کی حدود دریائے جیحون سے خلیج فارس تک اور افغانستان سے دریائے فرات تک پہنچ گئیں اس کے بعد اس نے بغداد بھی لے لیا، ۹۱۷ھ میں محمد خان شیبانی والی ماوراء النہر نے اس کے علاقے پر تانت کی۔ اسماعیل نے مشہد میں اس کو پسا کیا، وہ مرد میں محصور ہو گیا اور آخر کار قتل ہوا۔

۹۲۰ھ میں سلطان سلیم نے آذربائیجان پر حملہ کیا اور چاندوران کی جنگ میں اس کے لشکر کو شکست دی۔ وہ بغداد کی طرف پسا ہو گیا۔ اسماعیل جوابی حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ سلیم تبریز میں مقیم رہ کر قسطنطنیہ واپس ہو گیا، اسماعیل کی اس شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان سلیم بڑی توہین لے کر آیا تھا اور قزلباشوں کے پاس اس وقت تک توہین نہ تھیں۔

اب اسماعیل صفوی ترکستان، خراسان و طبرستان کی وسیع سلطنت کا تاجدار تھا اور طول و عرض کے حکمران اس کے زیر نگیں تھے۔ بدخشاں کے حاکم سلطان اولیس اور کابل کے بادشاہ بابر نے اپنے اپنی اس کی خدمت میں بھیجے جو ہرات میں باریاب ہوئے اور قرار پایا کہ دریائے جیحون کے اس طرف کا علاقہ ایران کا اور اس پار افغانستان کا علاقہ متصور ہوگا

میں قیام حکومت کا کوئی خیال بھی ہو جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ ۹۰۵ھ میں چار سو مریدوں کو لیکر گیلان سے نکلا آذربائیجان کے مختلف علاقوں سے جنید کے کچھ مرید اور آکر مل گئے اور اسماعیل شیروان کی طرف چل پڑا۔ شاید اسے فرخ شاہ والی شیروان سے باپ اور بھائی کے قتل کا بدلہ لینا تھا۔

سلطان حیدر کی شہادت اسماعیل کی دیکھی ہوئی بات تھی۔ اس کے بعد سے وہ رزم گاہوں کا نزدیک مدور سے جائزہ لیتا رہا تھا۔ وہ ایک خاندانی سجادہ نشین کا وارث تھا لیکن میدان جنگ بھی اس کے لئے کوئی اجنبی جگہ نہ رہی تھی۔ اس کو صرف جہاد کا شرف یا شہادت کی عزت حاصل نہیں کرنا تھی بلکہ اس کا نصب العین دشمن کو ہٹا کر اس کے ملک پر قبضہ کر لینا بھی تھا۔

والی شیروان درویشوں کو کھیرے لکڑی کی طرح کاٹ ڈالنے کے لئے شیروان سے نکلا تو اس کو محسوس ہوا کہ دلق پوشوں نے اپنے قالب بدل ڈالے اور بھوکے شیروں کی طرح اس کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ فرخ مرزا لڑتا ہوا مارا گیا اور اسماعیل نے شیروان میں صفوی حکومت کا پہلا پتھر رکھ دیا۔

الوند مرزا دالی تبریز اپنے کو آذربائیجان کا بادشاہ سمجھتا تھا اس کو جب خبر ملی کہ ایک خانقاہی سرفروش شیروان کا حاکم بن گیا تو وہ اس کی گوشمالی کے لئے ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوا۔ ۹۰۷ھ میں بمقام شرور اسماعیل نے اس کو روکا۔ گھمسان کارن پڑا، جنیدی مرید سروں سے بے نیاز ہو کر لڑے اور آخر انہوں نے دشمنوں کے منہ پھرا دیئے۔ الوند مرزا آق قوئیور زرم گاہ سے بھاگ نکلا اور اسماعیل تبریز پر قابض ہو گیا جہاں سے صحیح معنی میں سلطنت کا آغاز ہوا۔

اس خاندان میں یکے بعد دیگرے گیارہ فرمانروا سریر آرائے سلطنت ہوئے ابو المظفر شاہ اسماعیل صفوی، طہماسپ اول بن اسماعیل، اسماعیل ثانی بن طہماسپ، محمد خدا بندہ بن طہماسپ، عباس اول بن خدا بندہ، صفی اول بن سام بن عباس، عباس ثانی بن صفی اول، سلیمان اول بن عباس ثانی، حسین بن سلیمان، طہماسپ ثانی بن حسین، عباس ثالث بن طہماسپ ثانی، مدت حکومت دو سو اکتالیس سال رہی۔



میں آیا۔ بیرم خان ترکمان اس کے ساتھ تھا جو شاہ طہماسپ کا ہم عقیدہ بھی تھا اور بعض حوالوں سے جانا پہچانا بھی اور یوں بھی سلاطین صفویہ بڑے کشادہ دل اور وسیع النظر تھے۔ طہماسپ نے ہمایوں کا خیر مقدم کیا اور کسی بادشاہ کی طرح مہمان بنایا پھر دس ہزار سوار دے کر رخصت کیا۔ یہی وہ مدد تھی جس کی بدولت ہمایوں دوبارہ ہندوستان کی سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

آخر ۶۶ برس کی عمر میں شاہ طہماسپ پچپن سال تک بڑے دبدبے کی حکومت کر کے انتقال کر گیا۔

### شاہ اسماعیل ثانی

شیعوں کے بارے میں جہاں بہت سی غلط باتیں مشہور کی جاتی ہیں وہاں ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ بڑے متعصب ہوتے ہیں، سنیوں کو کبھی اپنے اقتدار میں شامل نہیں کرتے، حالانکہ دیکھا جائے تو اس کا اطلاق خود سنیوں پر ہوتا ہے، وہ کسی شیعہ کی پرچھائیں بھی گوارا نہیں کرتے۔ یہ ایک غلط بات ہے کہ شیعہ تقیہ میں رہ کر اپنی بے مثال صلاحیت کے سبب سنی حلقے میں جگہ بنا لے۔ اس کے برعکس شیعہ جہاں کہیں اقتدار میں رہے، انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے سنیوں کو نوازا جس کی نظیریں بڑھاپہ کے دور میں بھی کثرت سے ملتی ہیں اور صفوی عہد میں بھی۔ شاہ طہماسپ نے تو بعض کلیدی عہدے سنیوں کو دے رکھے تھے حتیٰ کہ اپنے بیٹے اسماعیل کا اتالیق بھی سنی رکھ چھوڑا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شروع ہی سے اسماعیلیں کے ذہن کو بدلتا رہا اور اسماعیل جب تخت پر بیٹھا تو اس نے سنی ہونے کا اعلان کر دیا۔

شیعہ ماحول میں یہ ایک بڑی جسارت تھی لیکن بعض سنی اراکین بھی شاہ اسماعیل کے ساتھ تھے۔ اس طرح طویل المنصبہ سازش بروئے کار آئی تھی لہذا شاہ اسماعیل نے تخت پر بیٹھتے ہی شاہانہ اختیارات کا استعمال شروع کر دیا اور شیعوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھانے لگا۔ یہاں تک کہ بعض برگزیدہ صوفیوں کو بھی قتل کر دیا اس کا ارادہ تو یہ تھا کہ خاندان صفویہ کے ایک فرد کو بھی زندہ نہ چھوڑے گا اور وہ اس پر عمل ضرور کرتا لیکن کوئی چارہ نہ دیکھ کر اس کی حقیقی بہن نے اس کو زہر دیدیا اور دو سال حکومت کر کے وہ وفات پا گیا۔

اس کے بعد اسماعیل صفوی نے بیرام بیگ قرمانی کو اندخو، شرغان، میند اور قاریاب کا گورنر مقرر کیا اور قم پہنچ کر اقامت پذیر ہوا۔

اس درمیان خبر ملی کہ ازبکوں نے عہد شکنی کر کے دریا پار علاقہ ایران پر قبضہ کر لیا ہے اور نجم ثانی حاکم خراسان کو گرفتار کر کے اپنے بادشاہ کے پاس بھیج دیا ہے اور عبداللہ خان اوزبک نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ اسماعیل یہ اطلاع پاتے ہی بذات خود اٹھ کھڑا ہوا اور ازبکوں پر ایسی سخت یلغار کی کہ ان کو پامال کر کے رکھ دیا۔

۹۳۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اور چوبیس سال کی حکمرانی میں وہ ہر اعتبار سے ایک مستحکم سلطنت چھوڑ گیا۔

### شاہ طہماسپ اول

طہماسپ صفوی صرف گیارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ شاہ اسماعیل نے ازبکوں کو سخت سزا دی تھی مگر نئے بادشاہ کی نابالغی سے فائدہ اٹھا کر عبداللہ خان خراسان پر چڑھ دوڑا اور علاقے کو تاراج کیا۔ طہماسپ کم سن ہونے کے باوجود مقابلے کے لئے نکلا۔ عبداللہ خان اس کے آنے کی خبر پاتے ہی پیٹھ دکھا گیا اور طہماسپ بھی مصطحت وقت سمجھ کر اس کے علاقے میں داخل نہ ہوا۔

کچھ دنوں بعد، جب اس نے عنان سلطنت پوری طرح سنبھال لی تو قندھار پر یلغار کی اور اس کو فتح کر کے خاندان قاپچار کے ایک سردار کو وہاں کا گورنر بنا دیا۔ عبداللہ خان اوزبک نے اس کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ غلط نکلا تو مجبور ہو کر اس نے صلح کی درخواست کی جو طہماسپ نے منظور کر لی۔ اس کے بعد طہماسپ نے شہر تفلس اور گرجستان فتح کیا۔ اس پر سلطان سلیمان والی ترکی نے اس پر حملہ کیا۔ تبریز، زنجان اور اردبیل میں طہماسپ و سلیمان کے سخت معرکے ہوئے اور سلیمان کو واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ کچھ وقفہ سے سلیمان نے پھر حملہ کیا، آخر دونوں میں صلح ہو گئی۔

۹۵۰ھ میں ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر طہماسپ صفوی کی پناہ



### محمد مرزا (محمد خدا بندہ)

محمد مرزا نہایت سخی اور عادل حکمراں تھا۔ اس کے ابتدائی دور میں عبداللہ خان کے بیٹے جلال خان نے خراسان کو تاراج کیا مگر حاکم خراسان نے شکست دے کر اس کو گرفتار کر لیا پھر قتل کرادیا۔ اسی زمانے میں ملک محمود نے سیستان سے قزلباش فوج کو نکال دیا۔ شاہ قسطنطنیہ کی طرف سے مصطفیٰ پاشا نے آذربائیجان پر حملہ کیا اور قزلباش لشکر کے ایک حصے کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ عادل گرائی تاتاری نے شیروان لے لیا۔ وزیر ایران نے شیروان کو چھڑایا مگر دوسرے حصے واپس نہ ہو سکے۔ سبب یہ تھا کہ بادشاہ کو ضعف بھر تھا۔ اس کی بیوی نے شاہی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ انجام کار امراء نے ناراض ہو کر اس کو قتل کرادیا اور عام بد نظمی پھیل گئی۔

۹۹۳ھ میں عثمان پاشا نے قسطنطنیہ سے آکر تبریز میں قتل عام کرایا، عبداللہ خان بن سکندر خان اوزبک نے ہرات و خراسان پر یورش کی اور پورے علاقے کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان حالات میں محمد مرزا نے اپنے بھائی عباس کے حق میں تخت سے دست بردار ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ۱۰۱۳ھ میں وفات پا گیا

### شاہ عباس اعظم

شاہ عباس خاندان صفویہ کا سب سے عظیم فرمانروا تھا۔ اس کے عہد میں عبداللہ اوزبک نے ہرات پر حملہ کر کے ایک تعداد کو قتل کیا ہرات کا ناظم علی تلی خان مقابلے میں مارا گیا پھر عبداللہ خان نے مشہد کا محاصرہ کیا اور چالیس روز میں اس کو فتح کر لیا اور حلقہ امامیہ میں سے ایک تنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔

شاہ عباس جو اباً اپنی فوجیں لے کر مقابلے پر آیا تو وہ ملک خالی کر گیا مگر عباس صفوی مشہد کی طرف بڑھتا ہی رہا۔ اس دوران ترکوں نے گنجه، قراباغ، ہمدان اور نہاوند پر قبضہ کر لیا۔ مجبوراً شاہ عباس غم و غصہ میں اس طرف گامزن ہوا صورت حال کو نازک دیکھ کر سلطان سلیم نے صلح کر لی اور ترکوں نے جو علاقے

لے لئے تھے وہ سب واپس کر دیئے۔

ان تجربات سے عباس صفوی نے ۵۹۵ھ میں اصفہان کو دارالسلطنت قرار دیا ۱۰۰۲ھ میں عبداللہ بن عبداللہ اوزبک نے خراسان میں داخل ہو کر اسفرائن اور سبزوار کو لوٹ لیا۔ شاہ صفوی مقابلے پر آیا تو وہ حسب دستور فرار ہو گیا۔ شاہ نے اس سلسلے میں مازندران تک کے علاقے پر تسلط حاصل کر لیا۔

۱۰۰۶ھ میں عبداللہ اوزبک فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا عبداللہ بن مارا گیا تو عباس صفوی نے ماوراء النہر پر حملہ کر کے بلخ کا سارا علاقہ فتح کر لیا پھر ترکوں سے تفلس واپس لے لیا۔ گرجستان میں بھی اس کو کئی بڑی فتوحات ہوئیں،

اسی زمانے میں جہانگیر کے قلعہ دار قندھار نے پرتگیزیوں سے جزیرہ ہرمز چھین لیا اور ایران سے ترکی کے اہلکار نکال دیئے گئے۔

۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس صفوی نے بغداد بھی فتح کر لیا پھر نجف اشرف کا روضہ تعمیر کرایا، کربلائے معلیٰ کے لئے اپنے خرچے کا منہ کھول دیا اور اکثر راستوں پر کارواں سرائے تعمیر کرائے۔

وہ ایک راسخ العقیدہ اثنا عشری شیعہ تھا۔ شیعیت کی تبلیغ میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

بعض مورخین نے اس پر الزام تراشی کی ہے کہ سنیوں کے لئے اس کے ملک میں رہنا دشوار ہو گیا تھا جو اس پر تہمت ہے۔ وہ اپنے عقائد میں پکا ضرور تھا لیکن کسی سنی کو زبردستی شیعہ بنانے کی کوئی نظیر اس کے عہد میں نہیں ملتی، البتہ شاہ طہماسپ نے جو غلطی کی تھی اور جس کی وجہ سے شاہ اسماعیل ثانی سنی ہو گیا تھا اس غلطی کا اعادہ شاہ عباس نے نہیں کیا۔ اس نے سنیوں کو عہدے دیئے لیکن سابقہ تجربے کے تحت کسی کلیدی عہدے پر انہیں فائز نہیں کیا۔ وہ آزمودہ را آزمودن کو جہل سمجھتا تھا اس لئے مورخین نے لکھ دیا کہ وہ سنیوں کو اپنی وسیع سلطنت میں رکھنا ہی نہ چاہتا تھا۔ تینتالیس برس کی شاندار حکومت میں اس نے ایران کا وقار ہمیشہ بلند رکھا۔ ۱۶۲۳ء میں بمقام کاشان اس کا انتقال ہوا اور قم میں سپرد خاک کیا گیا۔

شاہ عباس اعظم ایک سخی اور طبعاً رحمدل بادشاہ تھا مگر اپنے سرداروں کو مطیع اور وفادار دیکھنا چاہتا تھا اس لئے ایک ہوشمند فرمانروا کی طرح ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا۔ خود اپنی ذات سے بہادر تھا اور بہادروں کی قدر کرتا۔ اوزبکوں کے مسلسل حملوں کو وہ بار بار روکتا رہا، انہیں شکستوں پر شکستیں دیتا رہا، ترکی حملوں کو بھی اس نے کئی مرتبہ رد کیا اور انہیں پسپا کیا حتیٰ کہ تبریز، جارجیا، کردستان اور بغداد پر اپنے پرچم ہرا دیئے۔ اصفہان کو پہلے پہل ایران کا دارالسلطنت اس کی دور بینی کا ثبوت ہے۔

دوسرے مذاہب کے احترام کو وہ اپنا فرض سمجھتا تھا، عیسائیوں کو بھی اس نے گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی۔ ارباب علم و فن کا وہ قدر داں تھا۔ ان کی سرپرستی کرتا۔ اس کے عہد میں بہت سی سڑکیں بنائی گئیں اور عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

رعایا کی دیکھ بھال کو وہ اپنا فریضہ منصب قرار دیتا اور ملک کی آبادی بڑھانے میں مسلسل کوشاں رہتا اسی لئے رفاہ عام کے کاموں میں خاص دلچسپی لیتا تھا۔ فنون لطیفہ اور علم و ادب کی بھی اس کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔

وہ ایک بہت دور اندیش فرمانروا تھا، بالخصوص داخلی اور خارجی حکمت عملی اس کا طرہ امتیاز تھا اسی لئے اس کے دور کو ایران کی تاریخ کا زریں باب کہا جاتا ہے۔

### شاہ صفی

شاہ صفی، شاہ عباس صفوی کا پوتا تھا، بڑا ظالم اور خونخوار۔ اس کے زمانے میں جاجا بغاوتیں ہوئیں نظم و نسق تہہ و بالا ہو گیا اس نے ان بغاوتوں کو فرد تو کیا مگر شراب کے نشے میں بہت سے بے گناہ بھی قتل کرا دیئے۔

۱۶۳۸ء میں ترکوں نے سلطان مراد کے حکم سے بغداد کا محاصرہ کیا اور سخت مدافعت کے بعد اس کو فتح کر لیا، ہزاروں ایرانی اور قرباش قتل ہو گئے۔ ایام محاصرہ میں ترک شہر پر ہر روز توپ کے گولے برساتے جس سے محلے کے محلے تباہ ہو گئے۔ اس کے دور میں علی مردان حاکم قندھار نے قندھار شاہجہاں کے حوالے کر دیا۔ ۱۶۴۲ء میں بمقام کاشان وہ مرگیا، قم میں دفن ہوا۔

### عباس ثانی

عباس ثانی نو سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے قندھار شاہجہاں کے عمال سے چھین لیا اور اورنگ زیب اور دار شکوہ کے پے در پے حملوں کے باوجود اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ بڑا پاکباز اور متشرع بادشاہ تھا لہذا شراب پر پابندی لگا دی اور اس کی سزائیں قرار دی، ترکستان کا بادشاہ امام قلی خان اپنے بیٹے نادر محمد کو تخت پر بٹھا کر تخت سے دست بردار ہو گیا تھا، شاہ عباس ثانی نے اس کو بڑی تواضع کے ساتھ اپنے پاس رکھا اور پھر جب ترکستان کے امراء نے نادر محمد کو ہٹا کر اس کے بیٹے عبدالعزیز خان کو بادشاہ بنالیا تو اس نے نادر محمد خان کو مدد دے کر پھر بادشاہ بنوادیہ چونکہ ترک و افغان خراسان پر برابر حملے کرتے رہتے تھے اس لئے اس نے لشکر کشی کر کے قندھار و کابل پر مستقل قبضہ کر لیا اور ترکمانوں کو سخت سزائیں دیں۔ ۱۶۶۶ء میں اس نے بمقام وامغان وفات پائی اور قم میں سپرد خاک کیا گیا۔

### سلیمان مرزا

۱۶۸۰ھ میں ادنیہ خان صابن نے استرآباد لوٹ لیا مگر شاہی فوج سے شکست کھا کر مارا گیا، ترکی و ایران کی سابق جنگوں کے دوران سلیمان خان اردلانی کردستان میں خود مختار ہو گیا تھا، اس نے ایک شہر سلیمانہ بھی آباد کیا پھر کرکوک اور موصل پر یورش کی۔ ایران کی فوج نے اس کا مقابلہ کیا اور شکست دے کر اس کو قتل کر دیا۔ اسی زمانے میں نادر محمد خان کا بیٹا عبدالعزیز خان سلطنت اپنے بھائی کے سپرد کر کے خانہ کعبہ جانے کے لئے ایران آیا۔ شاہ سلیمان مرزا نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور تزک و احتشام کے ساتھ مکے جانے کے لئے رخصت کیا۔ ۱۶۹۳ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

وہ بڑا رحم دل، متواضع اور غریب پرور بادشاہ تھا۔

### حسین مرزا

حسین مرزا عقل سے عاری اور انتظامی صلاحیت سے بے بہرہ تھا اس کے عہد میں ایران کی عظیم سلطنت کو بڑا دھچکا پہنچا۔ ۱۱۱۴ھ میں اولیس خان غلزی نے قلعه دار قندھار شہنواز کو قتل کر کے



قندھار پر قبضہ کر لیا، اس کے مرنے پر اس کے بیٹے محمود خان نے ہرات بھی لے لیا پھر سیستان و کرمان پر بھی متصرف ہو گیا۔ حسین مرزا نے اس کا مقابلہ کیا مگر ۱۷۵۵ء میں خود محمود خان کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ آخر ۱۷۶۲ء میں محمود خان نے اصفہان پر حملہ کر کے اس کو بھی فتح کر لیا اور ایران کا بادشاہ بن گیا۔

حسین مرزا کا بیٹا طہماسپ مازندران میں تھا۔ اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ بڑھ کر محمود خان کا مقابلہ کرتا لہذا وہ مازندران کی حکومت پر قابض رہا۔

### محمود خان غلزی

محمود خان غلزی طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی سوجھ بوجھ بھی رکھتا تھا اس نے ملک محمود شیبانی والی سیستان اور نادر قلی افشار کے تعاون سے خراسان کے بیشتر علاقے بھی مسخر کر لئے پھر نادر قلی کی محمود خان شیبانی سے نا اتفاقی ہو گئی اور نادر قلی طہماسپ بن حسین مرزا کو مازندران سے بلا کر اس کا مددگار بن گیا دونوں نے مل کر محمود شیبانی پر حملہ کیا اور اس کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح طہماسپ کی حکومت خراسان اور سیستان تک وسیع ہو گئی۔ محمود غلزی مغربی ایران میں تھا اس نے ان حالات میں دماغی توازن کھو دیا اور ۱۷۶۵ء میں دیوانہ ہو کر مر گیا۔

### اشرف خان غلزی

اشرف خان غلزی محمود خان کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اسی زمانے میں سلطان ترکی نے سلطان حسین کی رہائی کے لئے اس پر چڑھائی کی مگر اشرف خان نے سلطان حسین کو قتل کر دیا پھر ترکوں سے صلح کر لی اور ادھر سے مطمئن ہو کر خراسان پر حملہ کیا مگر طہماسپ اور نادر قلی نے اس کو شکست دی، آخر ۱۷۳۰ء میں وہ خزانہ لے کر اصفہان سے بھاگ نکلا لیکن طہماسپ نے تعاقب کر کے پکڑ لیا پھر قتل کر دیا۔

### شاہ طہماسپ بن حسین مرزا

اصفہان میں طہماسپ کی تخت نشینی عمل میں آگئی۔ نادر قلی اشرف سے فراغت پا کر عراق کی تسخیر پر متوجہ ہوا اور اس کو غاصبوں سے چھڑا کر تبریز پر حملہ کیا جو ترکوں کے قبضہ میں تھا، اس کو داغدار کر کے نادر قلی نے افغانوں اور ترکمانوں کی سرزنش کی اور تمام مفسدوں کو چن چن کر قتل کیا آخر میں ہرات پر قبضہ کیا جو

ابدالیوں کے قبضے میں تھا۔

جب پورا ایران اس کے زیر نگیں آ گیا تو اس نے ۱۷۳۲ء میں خود طہماسپ کو گرفتار کر لیا، اس کے شیر خوار بیٹے عباس کو برائے نام بادشاہ بنایا اور عملاً خود ایران کا فرمانروا بن گیا۔

### شاہ عباس ثالث

اس کے بعد نادر قلی نے بغداد پر حملہ کیا اور ترکوں کو شکست دے کر اس پر اپنا پرچم لہرایا۔ پھر اس نے صوبہ فارس کے حاکم محمود خان بلوچ کو سزا دی اور پورے ایران میں اس کا طوطی بولنے لگا۔

صفویوں کی عظیم سلطنت محمود غلزی کے اصفہان پر قبضے کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی لیکن شاہ طہماسپ ابھی زندہ تھا جس کو نادر کے بیٹے رضا قلی نے قید سے نکال کر قتل کر دیا۔ عباس ثالث ۱۷۳۶ء میں خود اپنی موت مر گیا اور امراء نے علی الاعلان نادر قلی کی بادشاہت کو تسلیم کر لیا۔

### خاندان افشاریاں

#### نادر قلی خان عرف نادر شاہ

افشار ذات کے ترکمان تھے، پہلے ترکستان میں رہتے تھے، مغلوں کے عہد میں آذربائیجان آگئے اور نادر شاہ کے باپ نے مشہد مقدس کے شمال اسیور میں سکونت اختیار کر لی جہاں ۱۱۵۱ھ میں نادر قلی بیگ المعروف بہ نادر علی شاہ پیدا ہوا۔ ابتداً اس نے رہزنی اور قزاقی سے دولت پیدا کی پھر اس سے ایک فوج بنالی، اسی فوج کے بل پر وہ اقتدار میں داخل ہوا اور آخر کار ایران کا بادشاہ بن گیا۔

فتوحات نادر شاہ کا مقدر رہیں جس میں اس کی غیر معمولی شجاعت کو دخل تھا اس نے جنگیز خان اور تیمور کی طرح ایک بہت بڑی سلطنت قائم کی اور بیرجی



میں بھی ان سے کم نہ تھا۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ان میں سے کوئی فاتح عالم قسادت اور سنگدلی میں دوسرے سے پیچھے نہ تھا۔ تاریخ میں جن کی شجاعت کے ڈنکے بجائے جاتے ہیں اور مورخین نے جن کے قصیدے لکھے ہیں، دیکھا جائے تو ان کے دامن بے گناہوں کے ہوسے آلود اور ان کے ہاتھ متمدن شہریوں کے خون سے رنگین نظر آئیں گے۔ اسی لئے اسلام نے صرف تسخیر ممالک اور حصول اقتدار کے لئے تلوار اٹھانے کی ممانعت کی ہے تاوقتیکہ اسلام پر آنچ نہ آرہی ہو۔

رسول کے نائب برحق علی ابن ابی طالب کی خاموشی کے اسباب میں بنیادی نکتہ یہی تھا کہ لوگوں نے تو صرف اس اقتدار کو جھینا ہے جو علی کو ملنا چاہیے تھا، اسلام کو استنا تو نہیں بگاڑا ہے کہ وہ ہچاننا نہ جاسکے اور پھر جب شام میں اسلام کی شکل ہی بدل دی گئی اور حرام محمد کو فقہی تاویلات سے حلال کر دیا گیا تو ذوالفقار کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔ یہی سبب تھا جو ہمارے کسی امام نے نہ زید شہید کی تائید کی اور نہ نفس ذکیہ کے حق میں کوئی فتویٰ دیا اور بعد کے شیعہ سلاطین خواہ وہ صفار ہوں یا بویہی، سب کی جنگیں ویسی ہی تھیں جن کے مجموعوں کو تاریخ اسلام کا نام دیا گیا ہے حالانکہ ان جنگوں کا تعلق اسلام کے بجائے صرف مسلمانوں سے تھا اور وہ صرف استقرار حکومت یا توسیع مملکت کی خاطر لڑی گئی تھیں اور نادر شاہ جیسے لوگوں کی لڑائیاں تو صرف حکومت کے لئے تھیں۔

لیکن اگر محولہ جنگیں اسلامی تھیں جیسی سلطان محمود غزنوی کی لڑائیاں تو نادر شاہ کی فتوحات بدرجہ اتم اس تعریف میں آتی ہیں اور وہ بھی تاریخ اسلام کا حصہ ہیں۔

بہر حال نادر شاہ نے صفویوں کے تخت پر بیٹھ کر جب حکومت کو کچھ مضبوط کر لیا تو قندھار پر دھاوا بولا اور محمود غزنوی کے بھائی حسین شاہ کو شکست دے کر قید کر لیا پھر کابل فتح کیا اور ہندوستان کا عازم ہوا۔

فتوحات کا ایک سیلاب اس کے آگے آگے چلتا تھا اور حکمران خواہ ہندو ہو یا مسلمان، جو اس کے سامنے آتا، نادر شاہ اس کو روند تا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ کرناس

میں ہندوستان کے بادشاہ محمد شاہ کے لشکر نے اس کو روکا مگر وہ اس کو خاطر میں لانے والا نہ تھا۔

اس سلسلے میں ہندوستان کی تاریخ ایک واقعہ کو پیش کرتی ہے کہ محمد شاہ نے دہلی میں اعلان کیا کہ جو شخص نادر شاہ کو نذرانے دے کر واپس کرے گا اس کو اودھ کا صوبہ دیا جائے گا، اس مقصد کے لئے سعادت خان برہان الملک اور نظام الملک روانہ ہوئے۔ سعادت خان خود ایرانی نسل تھا، اس نے سونے کی مہریں اور جواہرات پیش کئے اور نادر شاہ واپسی پر نیم راضی ہو گیا۔ نظام الملک عقب میں روانہ ہوا تھا اس کو راہ میں اس کی خبر ملی چنانچہ وہ اسی مقام سے واپس ہو گیا اور اس کا رنامے کو اپنی ذات سے منسوب کر کے اس نے اودھ کی صوبہ داری کا پروانہ حاصل کر لیا۔

اس عرصے میں اس کے مشیروں نے نادر شاہ سے کہا کہ وہ اس حقیر دولت پر اکتفاء نہ کرے اور نادر شاہ نے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ نظام الملک کی چوٹ پر خود سعادت خان نے یہ بات نادر شاہ سے کہی تھی۔ حقیقت جو کچھ ہو مگر ہوا یہ کہ نادر شاہ واپس ہونے کے بجائے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا تاہم سعادت خان برہان الملک کے کہنے سے اس نے کوئی قتل و غارت نہیں کیا دہلی کے قیام میں بھی نادر پر امن رہا لیکن دہلی والوں نے اس کے بعض سپاہیوں پر ہتھ بڑھائے اور بعض بیانات کے مطابق چند فوجی قتل کر دیئے، اس پر نادر شاہ جنگی تلوار ہو گیا اور اس نے قتل عام کا حکم دیا۔

یہ خونریزی دہلی کی عظیم خونریزی تھی جو آخر برہان الملک کی کوششوں سے ختم ہوئی اور نادر شاہ دہلی کی حکومت محمد شاہ کو بخش کر واپس ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ بڑا قالم تھا اس نے انسانی خون ارزاں کر دیا تھا، جدھر جاتا، خون کے دریا بہاتا ہوا گزرتا یقیناً نادر شاہ بڑا بے رحم تھا لیکن دوسرے فاتحین کیا خون کے بجائے آب رحمت برساتے ہوئے آگے بڑھتے تھے اور عوام میں لڑو پیڑے تقسیم کرتے تھے، خود مسلمانوں کے تمام تاریخی ہیرو اسی کے مرتکب ہوئے جو نادر نے کیا لیکن نادر شاہ نے جس طرح ہندوستان کی حکومت محمد شاہ کو



واپس کر دی تھی، اس کی نظیر کسی اور نے پیش نہیں کی جبکہ نادر قندھار و کابل فتح کرتا ہوا آیا تھا، یہ مقامات تو اس نے پرانے حکمرانوں کو نہیں دیئے، ہندوستان شاید اس لئے دیدیا ہو کہ یہ حکومت طہماسپ صنوی نے ہمایوں کو دلوائی تھی۔ اس کے پیش رو نے جو چیز دی تھی اس کو نادر شاہ واپس کیا لیتا!

پورا ہندوستان اس کے رحم و کرم پر تھا اس کے ساتھ ایسے ایسے جرنیل موجود تھے جنہیں وہ دہلی میں اپنا قائم مقام بنا سکتا تھا جیسا کہ شہاب الدین غوری نے کیا تھا اور اپنے کسی جرنیل کو نہ چھوڑتا تو خود ایرانی النسل برہان الملک موجود تھا، اس کو اپنا باجگزار بادشاہ بنا کر چھوڑ دیتا لیکن برہان الملک نے پوری طلاق لسانی سے سفارش کی تھی اور نادر شاہ نے مان لیا۔ اس طرح جو لوگ اس کو درندہ کہتے ہیں انہیں ماننا پڑے گا کہ اس کے پہلو میں ایک انسانی دل بھی تھا کہ وہ برہان الملک کو دیئے ہوئے قول سے پھرا نہیں اور جو لوگ برہان الملک پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ نادر شاہ کو واپس لے آیا انہیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اگر ان کا خیال صحیح ہے تو برہان الملک نے گئی ہوئی حکومت واپس بھی دلادی۔

یقیناً نادر شاہ بہت مال و دولت لے کر ہندوستان سے پلٹا تھا مگر اس کا عشر عشر بھی نہیں جو سلطان محمود نے غزنی میں اکٹھا کیا تھا۔ یہ دولت نادر شاہ نے مشہد میں جمع کی، اس کو اپنا دار السلطنت قرار دیا اور بیشتر دولت روضہ امام کی نذر کر دی۔

ایران کے جو علاقے سابقہ عہود میں روسیوں اور ترکوں نے لے لئے تھے، نادر شاہ نے یکے بعد دیگرے ان سب پر قبضہ کیا، ہندوستان سے واپسی کے وقت اس نے خوارزم، بخارا اور داغستان کو مسخر کیا تھا، ان سب پر اس کی گرفت مضبوط تھی لیکن وہ ایک سخت گیر فرمانروا تھا اس لئے اس کے دشمنوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ اس کی حدود سلطنت دریائے سندھ سے کوہ قاف تک پھیلی ہوئی تھیں لہذا ہوشیار رہنے کے باوجود وہ اندرونی سازشوں سے بچ نہ سکا، خود اس کے خون جگر نے اس سے دھوکا کیا۔ علی قلی خان حاکم ہرات اس کا بھتیجا تھا اس نے امراء سے مل کر اس کے قتل کا منصوبہ بنایا اور ایک رات سوتے میں وہ قتل کر دیا گیا۔ کہا

جاتا ہے کہ خود اس کے ایک غلام نے تلواروں کے مسلسل وار کر کے اس کو مارا تھا اور اسے نادر شاہ کے معتمد امراء نے قتل پر آمادہ کیا تھا جس میں احمد شاہ پیش پیش تھا جس پر وہ سب سے زائد اعتبار کرتا تھا۔

نادر شاہ کے بعد خزانے کے لئے افغانی اور ترکمانی امراء میں مبرد آزمائی ہوئی احمد شاہ ابدالی غالب آیا وہ سارا خزانہ لے کر قندھار چلا گیا اور خراسان اور افغانستان کو ملا کر اس نے اپنی علیحدہ سلطنت قائم کر لی۔

پھر ملک کے مختلف حصوں میں جداگانہ حکومتیں قائم ہو گئیں؛ آزاد نامی افغان نے آذربائیجان پر، علی مردان بختیاری نے اصفہان پر اور محمد حسن قاجار نے بحیرہ کیسپین کے مشرقی ساحل، استرا بادر پر قبضہ کر لیا۔ نادر شاہ کے بھتیجے علی شاہ کے پاس ملک کا تھوڑا سا حصہ رہ گیا۔

### علی شاہ

اس نے بادشاہ ہوتے ہی اپنے بھائی ابراہیم کو کلات روانہ کیا جہاں نادر شاہ کی اولاد اور بقیہ خزانہ تھا، ابراہیم نے وہاں پہنچ کر خزانے کو اپنے قبضے میں لے لیا، نادر شاہ کی اولاد میں پندرہ کو قتل کر دیا کچھ بھاگ گئے اور کچھ بند کر دئے گئے۔ پھر علی شاہ نے انتظام حکومت حسن بیگ اور سہراب کے حوالے کر دیا اور اصفہان اور فارس کی حکومت ابراہیم کو دیدی۔ کچھ دنوں بعد حسن بیگ نے سہراب کو قتل کر دیا اور ابراہیم و علی شاہ میں بھی جنگ چھڑ گئی جس میں علی شاہ کو شکست ہوئی، وہ گرفتار کر کے اندھا کر دیا گیا اور ابراہیم اس کی جگہ بادشاہ بن گیا۔

### ابراہیم شاہ

نادر شاہ کے بیٹے شاہ رخ کو ابراہیم نے قید میں ڈال دیا تھا، اسی زمانے میں کسی طرح وہ زندان سے نکل آیا اور باپ کے وفاداروں کو یکجا کر کے میدان میں آیا۔ ابراہیم کی فوج عین جنگ کے دوران اس سے مل گئی اور ابراہیم مارا گیا۔

### شاہ رخ شاہ

تخت نشینی کے تین چار ماہ بعد خراسان کے سرداروں نے اس کو پکڑ کر



اندھا کر دیا اور مشہد مقدس کے متولی سید محمد کو جو سلطان حسین صفوی کا داماد اور شاہ سلیمان صفوی کا نواسہ تھا، بادشاہ بنا دیا مگر شاہ رخ کے طرفداروں نے اس کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروادیں اور شاہ رخ کو قید سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا۔ شاید انہیں اندھا بادشاہ ہی درکار تھا۔ شاہ رخ ۱۲۲ھ تک خراسان پر حکومت کرتا رہا۔

نادر شاہ کے قتل کے بعد دو سال تک ایک سرے سے دوسرے سرے تک انتشار رہا، استرآباد سے آذربائیجان تک تمام شمالی ایران محمد حسن قاجار کے زیر نگیں تھا اور جنوبی ایران پر کریم خان زند حکمران تھا، صرف خراسان افشاریوں کے پاس تھا۔ ۱۱۴۱ھ میں، جب محمد حسن قاجار مارا گیا تو کریم خان زند نے فارس و ایران کی حکومت پر مکمل قبضہ کر لیا اور خاندان زند نے افشاریوں کی جگہ لے لی۔

### خاندان زند

#### کریم خان

نادر شاہ کے بعد ۱۱۴۳ھ میں علی مراد بختیاری نے قزاقوں کے سردار کریم خان سے ایک معاہدہ کیا اور اصفہان کو گھیرے میں لے لیا پھر حاکم اصفہان ابو الفتح افشار بھی اس اتحاد میں شامل ہو گیا اور تینوں سرداروں نے مل کر سلطان حسین صفوی کے نواسے اسماعیل کو برائے نام بادشاہ بنالیا۔

اس کے بعد کریم خان تسخیر عراق کی مہم پر روانہ ہوا اس کے جانے کے بعد علی مراد خان نے ابو الفتح کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ اسماعیل کو لے کر فارس کا عازم ہو گیا۔ کریم خان کو علی مراد کی بد عہدی کا علم ہوا تو اس نے بڑھ کر اصفہان پر قبضہ کر لیا پھر فارس کا رخ کیا۔ علی مراد شاہ اسماعیل کو لے کر مقابلے پر آیا، لیکن عین موقع پر شاہ اسماعیل کریم خان سے آغا اور علی مراد کے لئے فرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب محمد حسن خان قاجار بن نواب فتح علی خان نے کشور کشائی کا آغاز کیا تھا اور استرآباد، مازندران، گیلان اور آذربائیجان وغیرہ پر قابض ہو گیا تھا اور استرآباد کو مرکز بنا کر فوجوں کو تسخیری مہمات پر روانہ کر رہا تھا۔

کریم خان نے اس پر چڑھائی کی تو محمد حسن قاجار خود مقابلے کے لئے نکلا۔ شاہ اسماعیل نے جو کام علی مراد بختیاری کی مقابلے میں کریم خان کے لئے کیا تھا، وہی کریم خان کے مقابلے میں محمد حسن قاجار کے لئے کیا اور موقع پا کر قاجاری لشکر میں آگیا۔ انجام کار کریم خان کو شکست ہوئی۔ محمد حسن خان نے اصفہان پر تسلط حاصل کر لیا اور محمد حسین قاجار کو صوبہ دار بنا کر شیراز کی سمت بڑھ گیا مگر حسین قاجار اس کے جاتے ہی باغی ہو گیا۔ محمد حسن قاجار نے پلٹ کر مقابلہ کیا تو شکست کھائی ۱۱۴۱ھ میں دھوکے سے بدست شیر علی قتل ہو گیا اسی دوران علی مراد خان بھی محمد خان زند کے ہاتھ سے مارا گیا۔

اب کریم خان کے لئے میدان قدرے صاف تھا۔ اس نے خراسان کے سوا ایران کے بڑے حصے کو مسخر کر لیا اور تہران کو اپنا دار سلطنت قرار دیا، کردستان کی فتح کے بعد وہ ایک بڑی سلطنت کا مالک بن گیا پھر اس کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جلا

کریم خان ایک غالی شیعہ تھلاس نے کبھی اپنے کو بادشاہ نہیں سمجھا بلکہ وکیل امام عصر کہتا تھا وہ بہادر ہونے کے ساتھ ایک نیک نفس انسان بھی تھا۔ محمد حسین خان کے بیٹے آقا محمد خان سے اس نے بہت اچھا سلوک کیا۔ اس کا نظم حکومت بہت اعلیٰ تھا، رعایا کا خیال رکھتا تھا اور عوام سے بڑی نرمی کے ساتھ پیش آتا، اس نے بہت سے رفاہی کام کئے، سڑکیں بنوائیں، کارواں سرائیں تعمیر کرائے۔

قاجاریوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا۔ محمد حسن خان کی ایک بیٹی سے خود عقد کیا، دوسری بیٹی اپنے بیٹے رحیم کے نکاح میں لایا اور اپنے چھپے داد و ہش کی بہت سی داستانیں چھوڑ گیا۔

#### ابو الفتح خان و ذکی خان

ابو الفتح کریم خان کا جانشین ہوا تو اس کے چچا صادق خان نے شیراز پر حملہ کیا مگر پسپا ہو کر کرمان کی طرف ہٹا ہوا۔ اسی زمانے میں تہران کے ایک سردار علی مراد نے اصفہان پر دھاوا بولا، ذکی خان بھجرا ابو الفتح کو لے کر مقابلے کے لئے چلا مگر راستے میں ابو الفتح کے آدمیوں نے ذکی خان کو قتل کر دیا اور پھر علی مراد خود ابو الفتح



سے آکر مل گیا اور دونوں شیراز آگئے۔

اس عرصے میں صادق خان نے اطاعت قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور اس حیلے سے شیراز آگیا۔ وہ ایک منصوبہ بنا کر آیا تھا چنانچہ اس نے موقع پاتے ہی ابو الفتح اور کریم خان کے باقی دو بیٹوں کو قید کر لیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔  
علی مراد اس کی اس حرکت پر بہت مشتعل ہوا۔ وہ اپنی سپاہ کو لے کر شیراز سے نکل گیا پھر پلٹ کر حملہ آور ہوا اور صادق خان کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا پھر کریم خان زند کے تینوں بیٹوں کو قید خانے سے بلوا کر ان کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروادیں اور خود اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔

### علی مراد خان

علی مراد خان طبعاً بہت قالم تھا اس نے اپنے برادر مادری جعفر خان کے علاوہ حقداران حکومت میں سے بیشتر کو موت کے گھاٹ اتروا دیا، اس پر امراء ناراض ہو گئے اور انہوں نے آقا محمد خان بن محمد حسن قاجار کو استرآباد سے بلوایا اس کی مدد کر کے علی مراد کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دی، اس پر جعفر خان نے اصفہان پر چڑھائی کر دی۔ اسی دوران علی مراد مر گیا اور جعفر خان اصفہان میں تخت نشین ہو گیا۔

### جعفر خان

جعفر خان کے بادشاہ ہوتے ہی آقا محمد قاجار نے اس پر چڑھائی کی، جعفر خان شیراز کی طرف فرار ہو گیا جہاں کچھ لوگوں نے اس کو قتل کر دیا۔

### لطف علی خان

لطف علی خان بوشہر سے آکر شیراز میں باپ کا جانشین ہوا۔ آقا محمد خان نے اس پر حملہ کیا اور شیراز فتح کر لیا، لطف علی خان نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔ اس طرح چالیس سال کے بعد زندیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ایران کے مطلع حکومت پر قاجار خاندان کا آفتاب طلوع ہوا۔

### خاندان قاجار

اس خاندان کا جد اعلیٰ قراچار محمد نویان امیر تیمور کا جد چہارم تھا۔ اس کی نسل میں سب سے پہلے نواب فتح علی خان قلعہ مبارک آباد کا حاکم ہوا۔ وہ صفوی بادشاہ طہماسپ ثانی کے ساتھ کئی مہمات میں شریک ہوا۔ ۱۱۳۹ھ میں نادر شاہ نے طہماسپ کو اس کے خلاف بھرا اور وہ قتل کر دیا گیا، پھر فتح علی خان کا بیٹا محمد حسن خان مبارک آباد کا قلعہ دار ہوا جو ۱۱۶۱ھ میں اپنے نمک حرام ملازم کے ہاتھوں مارا گیا

زندیوں کی حکومت میں محمد حسن خان کا بیٹا حسین قلی خان پھر ایک معزز عہدے پر فائز ہوا۔ اس کے بیٹے آقا محمد خان کو کریم خان زند نے نظر بند کر دیا۔ حسین قلی خان ستائیس سال کی عمر میں ایک ترکمان قوم یموت کے ہاتھوں قتل ہوا

کریم خان کی وفات کے بعد آقا محمد خان نظر بندی سے آزاد ہو گیا اور اس نے ۱۱۹۳ھ سے اپنی فتوحات کا آغاز کر دیا اور ۱۲۱۲ھ تک وہ پورے ایران کا حکمران بن گیا اور اس کی ذات سے سلطنت قاجار کی بنیادی پڑی۔

### آقا محمد خان

کریم خان کا انتقال ہوتے ہی وہ تہران کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اس نے کریم خان کا خزانہ لوٹ لیا پھر اپنی قوم کے لوگوں کو جمع کر کے مازندران پر قبضہ کر لیا۔ یہیں سے اس کی فتوحات شروع ہوئیں، آہستہ آہستہ اس نے اصفہان، ہمدان، کردستان اور گیلان مسخر کر لیا اور ۱۲۰۹ھ میں خاندان زند کے آخری بادشاہ لطف علی کو گرفتار کر کے ایران کا بادشاہ بن گیا۔

جارجیا کو روس کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے اس نے ایک ہولناک جنگ کی اور اسی جنگ کے دوران کسی نے سازش کر کے خود اس کے غلام کے ہاتھوں سوتے میں اس کو قتل کر دیا۔



## فتح علی شاہ

خاندان قاجار کا دوسرا بادشاہ حد درجہ شجاع اور ہوش مند تھا اس نے تخت پر بیٹھتے ہی پہلے مفسدوں کا صفایا کیا پھر دوسرے مسائل سلطنت کی طرف توجہ کی مرزا نادر بن شاہ رخ نے خراسان میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ فتح علی نے اس کو گرفتار کر کے قتل کرایا۔ محمد خان ولد ذکی خان زند نے شیراز میں سر اٹھایا تھا، اس کی سرکوبی کی۔ حلی ابراہیم خان زندیوں کا وزیر اعظم تھا اس نے تسخیر شیراز میں قاجاریوں کا ساتھ دیا تھا، وہ حکومت قاجار میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا مگر وہ اب حد سے زائد مطلق العنانی پر آمادہ تھا، فتح علی شاہ نے اس کو تنبیہ کی تو وہ گستاخی پر اتر آیا۔ شاہ قاجار نے اس کو بھی تلوار کے گھاٹ اتروا دیا۔

۱۲۱۸ھ میں روس نے تفلس کو فتح کر کے گنجہ کا محاصرہ کر لیا، فتح علی شاہ خبر پا کر خود مقابلے پر آیا اور اتنے روسی قتل کئے کہ ان کے سروں کا سینار بن گیا، ۱۲۲۰ھ تک روسیوں سے اس کے سات معرکے ہوئے اور ہر ایک میں روسیوں کا بھی انجام ہوا مگر آٹھویں لڑائی میں روسیوں نے شیروان لے لیا۔

۱۲۲۱ھ میں حلی فیروز والی ہرات نے مشہد پر حملہ کیا مگر ایرانی اس کو بھگاتے ہوئے بڑھے اور خود جا کر ہرات کا محاصرہ کر لیا آخر حلی فیروز نے دو سال کا خراج دے کر جان چھڑائی۔

اسی سن میں نپولین بونا پارٹ کا سفیر باریاب ہوا فتح علی شاہ نے اس شرط پر دوستی کو قبول کیا کہ پہلے فرانس و ایران مل کر روسیوں سے پنٹیں گے پھر ایران ہندوستان کی مہم میں فرانس کا ساتھ دے گا۔ ان حالات میں روس نے ۱۲۲۳ھ میں ایران سے صلح کر لی مگر کچھ ہی دنوں بعد بد عہدی کر کے ایران لے لیا مگر جلد ہی فتح علی شاہ کے ہاتھوں شکست کھائی۔

اسی سال انگریزوں نے اپنی سفارت بھیجی اور الماس کا ایک بڑا انگینہ مندر کیا اور دونوں ملکوں میں دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔

۱۲۲۶ھ میں شہزادہ ولی مرزا نے حلی فیروز والی ہرات پر چڑھائی کر کے پھر دو سال کا خراج وصول کیا۔ روس اور ایران کی کشمکش جاری تھی، گنجہ کے قریب ایک سخت لڑائی ہوئی، روس نے شکست فاش کھائی اور ان گنت روسیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ آخر ۱۲۲۹ھ میں روس نے پھر صلح کا ایک معاہدہ کر لیا۔ اسی سال انگریزوں سے بھی تحریری صلح ہوئی۔

۱۲۳۸ھ میں ترکی سے بھی معاہدہ صلح ہوا۔ اسی سال شیعہ علماء کی تحریک پر روس سے جہاد کیا گیا، پے در پے جنگیں ہوئیں۔ آخر ۱۲۴۳ھ میں پھر صلح ہو گئی۔ ۱۲۵۰ھ میں اس عظیم فرمانروا کا انتقال ہو گیا۔

فتح علی شاہ ایک اقبال مند بادشاہ تھا، جدھر جاتا فتوحات اس کے قدم چومتیں مگر ٹرانس کا کیشیا کا علاقہ اسی کے عہد میں روس کے زیر نگیں آیا۔ ۱۸۰۲ء میں سعود بن عبدالعزیز نے کر بلا کو تباہ کیا، روضہ امام حسین کو شدید نقصان پہنچایا، پانچ ہزار شیعوں کو قتل کر ڈالا اور روغنے پر چڑھے ہوئے نوادرات لوٹ لے گئے، فتح علی شاہ نے سلیمان پاشا والی بغداد کو لکھا مگر انہیں ایام میں اس کا انتقال ہو گیا، آخر فتح علی شاہ کو خود ان کی سرکوبی کے لئے نکلنا پڑا۔

۱۸۱۱ء میں وہ ایک لشکر جرار لے کر نکلا، مسقط میں وہابیوں نے اس کا مقابلہ کیا اور شکست کھا کر بے شمار لاشیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے پھر نجد میں کئی مقابلے ہوئے جن میں کافی وہابی مارے گئے اور وہ کر بلا کے قتل عام کا بدلہ لے کر واپس ہو گیا۔

فتح علی شاہ کثیر الاولاد تھا۔ ۵۷ بیٹے، ۴۶ بیٹیاں اس نے یادگار چھوڑیں اور ایک مضبوط حکومت بھی جس میں بعد کے لائق حکمرانوں نے چار چاند لگا دیئے پھر زوال شروع ہو گیا۔

## محمد علی شاہ اول

۱۲۵۳ھ میں اس نے غوریاں فتح کر کے حکومت کا افتتاح کیا پھر ہرات کو محاصرہ میں لیا مگر انگریزوں کے کہنے سے محاصرہ اٹھالیا۔ اس کے عہد میں افغانوں نے شیعوں پر جہاد کی نیت سے حملہ کیا۔ نجیب پاشا



حاکم بغداد سخت شیعہ دشمن تھا۔ اس نے ۱۲۶۰ھ میں کربلا پر چڑھائی کی، تین گھنٹے کے قتل عام میں نو ہزار شیعہ قتل کرائے اور شہر کو بے طرح غارت کیا، محمد علی شاہ نے انتقام لینے کے لئے ترکی پر حملہ کر دیا لیکن کوئی بڑی جنگ ہونے سے قبل روس اور انگلستان کے سفیر درمیان میں آگئے اور عذر معذرت پر بات زیادہ بگڑنے نہیں پائی۔ مرد مسلمان، اہل دانش، بہادر بادشاہ محمد علی شاہ چودہ سال کی باجبروت حکومت کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

### ناصر الدین شاہ

۱۲۶۳ھ میں خراسان و مشہد میں ترکمانوں نے بغاوت کی جس کو بآسانی فرد کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں بابی فرقہ وجود میں آیا: علی محمد نامی ایک شخص نے اپنا نام باب رکھا اور مہدی آخر الزماں ہونے کا دعویٰ کیا، ملا حسین بشرویہ اس کا خلیفہ اور قرۃ العین اس کی نائب تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عقیدتمندوں کا ایک حلقہ ہو گیا اور جا بجا بغاوت کی صورت پیدا ہو گئی۔ آخر حکومت کو اس پر توجہ کرنا پڑی۔ ۱۲۶۶ھ میں باب مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے بابی قتل ہوئے اور ان کی جمعیت منتشر ہوئی۔

۱۲۶۷ھ میں محمد امین خاں والی خوارزم نے علاقہ سیرابی پر قبضہ کر لیا جس کو ناصر الدین شاہ نے ایک لشکر بھیج کر واپس لیا۔۔۔۔۔ اسی سلسلے میں حاکم سیستان کو مطیع کیا گیا اور ہرات کو قبضے میں لیا گیا۔

اسی سال شیخ سلیمان بابی اور شیخ علی نے بارہ آدمیوں کے ساتھ شاہ قاجار پر سرراہ حملہ کیا، ناصر الدین کو معمولی سازخم آیا اور وہ سب قتل کر دیئے گئے۔ کچھ دنوں کے فصل سے والی قندھار نے خود حاضر ہو کر اطاعت قبول کی اور والی مستط باجگزار ہوا۔

۱۲۷۱ھ میں محمد امین خان والی خوارزم نے پھر ہاتھ پاؤں نکالے اور سرخس پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ اس کے مقابلے کے لئے ایک بڑا لشکر بھیجا گیا اور وہ قتل ہوا۔ اسی زمانے میں دوست محمد والی کابل نے قندھار پر قبضہ کر لیا اور ہرات پر بھی اپنا پرچم لہرا دیا۔ قاجاریوں نے ہرات تو فوراً واپس لے لیا قندھار کے لئے فوج

روانہ ہونے ہی والی تھی کہ دوست محمد نے انگریزوں کی مدد بوشہر بھی فتح کر لیا اور وہاں کے حاکم دریا بیگ کو گرفتار کر کے بمبئی بھیج دیا۔ اس پر ایک بڑی فوج مقابلے کے لئے بھیجی گئی۔ انگریزوں نے افغان فوج کو جدید آلات حرب سے لیس کر دیا تھا پھر بھی کئی معرکوں میں انہیں شکست ہوئی۔ آخر ۱۲۷۳ھ میں انگریزوں کی مداخلت سے صلح ہو گئی اور شاہ قاجار نے ہرات وغیرہ مقبوضات پر کابل کا قبضہ تسلیم کر لیا۔ پھر روس، انگریز اور ترکی سفیر ارن روم میں یکجا ہوئے اور باہم مختلف ممالک کی حدود متعین ہو گئیں۔ اس کے بعد ممالک فرنگ، ترکی، روس اور امریکہ وغیرہ میں دوستانے کے طور پر سفیروں کا تبادلہ ہوا تاکہ کوئی غلط فہمی ہونے پر ایک دوسرے کے موقف کو سمجھا جاسکے۔

۱۲۸۲ھ میں ناصر الدین قاجار نے نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارت کی پھر یکے بعد دیگرے تین مرتبہ انگلستان کا سفر کیا اور ہر مرتبہ ایک سفرنامہ تحریر کیا۔۔۔۔۔ ناصر الدین قاجار ایشیا کا پہلا فرمانروا تھا جس نے ساحل انگلستان پر قدم رکھا اور انگریزوں کے ملک میں جس کا شاندار استقبال کیا گیا۔

۱۳۱۳ھ میں اس عظیم حکمران پر محمد رضا بابی نے گولی چلائی اور وہ اس کے ہسپتال سے شہید ہو گیا۔ بہت نیک، خدا ترس، شجاع اور دور اندیش بادشاہ تھا جس کا شہرہ اقبال ایشیا اور یورپ میں اور جس کا نام امریکہ تک پہنچ گیا تھا۔

اس کے عہد میں ایران نے ہر اعتبار سے ترقی کی۔ ریل ۱۸۶۵ء میں اور تار برقی ۱۸۶۷ء میں شروع ہوئی تھی، ایران میں سب سے پہلے ریل کی پٹری ۱۸۸۸ء میں تہران سے شہزادہ عبدالعظیم تک پکھائی گئی۔ ۱۸۸۹ء میں پہلا امپیریل بینک قائم ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں انگریزوں نے تمباکو کا ٹھیکہ لیا مگر ۱۸۹۳ء کے شروع میں مجتہدین کی رائے کے مطابق ٹھیکہ توڑ دیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں ایک کمیشن کے ذریعے روس اور ایران کی سرحدوں کا تعین ہوا تاکہ آئندہ کوئی تنازعہ کی صورت پیدا نہ ہو۔

### مظفر الدین قاجار

۱۲۶۸ھ میں وہ بمقام تہران پیدا ہوا، ۱۳۱۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ اپنے باپ کی طرح لائق اور منظم تھا، ۱۳۱۷ھ میں وہ بھی انگلستان کی سیر کو گیا اور لگ بھگ

ایک سال بعد واپس ہوا۔ ۱۳۲۶ھ میں انتقال کر گیا۔ محمد علی مرزا ولی عہد سلطنت اور آذربائیجان کا گورنر تھا۔ رحلت کی اطلاع پا کر وہ تہران آگیا تاکہ باپ کی جگہ عنان حکومت سنبھال سکے۔

### محمد علی شاہ دوم

محمد علی شاہ دوم جنوری ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں تخت نشین ہوا۔ مظفر الدین نے انگلستان کے طرزیہ یک پارلیمنٹ بنادی تھی جو امراء و علماء پر مشتمل تھی۔ اس کو محمد علی نے منظور نہیں کیا۔ آخر راعی اور رعایا میں لڑائی کی نوبت آگئی۔ سخت کشت و خون ہوا۔ مئی ۱۹۰۹ء میں محمد علی نے ملک کو خطرے میں دیکھ کر پارلیمنٹ کی بالادستی منظور کر لی لیکن اس کے بعد اس نے عہد شکنی کی۔ آخر اس کو تخت سے اتار دیا گیا اور اس کے بیٹے احمد شاہ کو ایران کا فرمانروا بنادیا گیا۔

### احمد شاہ

احمد شاہ ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء کو تخت پر بیٹھا، مگر اس کو شروع ہی سے ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا جس میں عالمی سیاست کو بھی دخل تھا اور اندرونی خلفشار کو بھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے بھائی کو ایران کا ولی عہد بنا کر خود پیرس آگیا اور نظم سلطنت احمد رضاخان کے ہاتھ میں آگیا جو ایک سپاہی کی حیثیت سے فوج میں شامل ہوا تھا اور اب ایران کی پوری طاقت اور ایک طرح سے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ رضاخان کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو انسان کے مقدر ساز ہونے کا یقین کرنا پڑتا ہے۔

وہ ماژندران کے سلسلہ کوہ میں ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوا تھا۔ ناخواندگی کی حالت میں وہ ۱۴ برس کی عمر میں قزاق برگیز میں ، جو ناصر الدین شاہ قاجار کی خواہش پر روسیوں نے قائم کیا تھا، بھرتی ہو گیا۔ شوق مطالعہ نے پڑھنا لکھنا سکھایا ایران کے سرحدی علاقوں میں اس نے اشتراکی شورش کو دبانے میں نام پیدا کیا، رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا وہ قزاق برگیز کی سرداری پر فائز ہو گیا اس دوران غیر ملکیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لئے حکومت کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو ایک انقلاب پسند رہنما سید ضیاء الدین طباطبائی نے بے اثر پارلیمنٹ کو

ختم کرنے اور انقلاب برپا کرنے پر قزاق برگیز کو مائل کیا۔ رضاخان نے ڈھائی ہزار قزاق فوج کے ساتھ تہران پر چڑھائی کر دی، دفاع کرنے والی پولیس بھی فوج سے مل گئی اور ۱۹۲۱ء میں ایک انقلاب آگیا لیکن رضاخان کو شہنشاہ احمد شاہ قاجار کے ساتھ غداری کچھ پسند نہ آئی۔ آخر شہنشاہ نے ضیاء الدین طباطبائی کو ملک کا وزیراعظم اور رضاخان کو افواج کا سپہ سالار بنادیا۔

لیکن ۱۹۲۱ء میں ضیاء الدین طباطبائی کو اپنی سخت گیری کے سبب مستعفی ہونا پڑا تو رضاخان کو وزارت دفاع کا منصب بھی سونپ دیا گیا اس نے فوج کی تنظیم کے ساتھ طاقت میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور ملکی اور خارجہ پالیسیوں پر اپنا اثر مرتب کیا، حتیٰ کہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں وزیراعظم قوام السلطنت نے احمد شاہ قاجار اور امراء و مجتہدین کی مدد سے رضاخان کو ہٹا دینے کا منصوبہ بنایا لیکن سازش کھل گئی رضاخان نے اقوام السلطنت کو گرفتار کر لیا اور بادشاہ احمد شاہ خرابی صحت کے بہانے اپنے بھائی کو ولی عہد بنا کر پیرس چلا گیا۔

رضاخان نے وزارت عظمیٰ کی ذمہ داری بھی سنبھال لی اس عرصے میں ملک میں جمہوریت کی تحریک شروع ہو گئی، علماء و مجتہدین نے اس کی مخالفت کی اور حالات اتنے بگڑ گئے کہ رضاخان کو مارشل لا لگانا پڑا۔ بے چینی پر ایک حد تک قابو پانے کے بعد رضاخان قم آگیا اس نے مذہبی پیشواؤں سے گفت و شنید کی آخر طے یہ پایا کہ جمہوریت کی تحریک ختم کر دی جائے۔

رفتہ رفتہ رضاخان کا اثر حکومت اور پارلیمنٹ پر استنا بڑھ گیا کہ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں بادشاہ کو معزول کر کے رضاخان کو رضا شاہ پہلوی بنادیا گیا۔ اس طرح قاجاری عہد کا خاتمہ ہو گیا اور اس پہلوی دور کا آغاز ہوا جو انقلاب اسلامی پر ختم ہوا

### پہلوی سلطنت

### احمد رضا شاہ پہلوی

سپاہ گری احمد رضا شاہ پہلوی کا پیشہ آبائی تھلا اس کے دادا مراد علی خان، ناصر الدین قاجار کے افسر فوج تھے جو ہرات کے محاصرے کے دوران فوت ہوئے، والد عباس علی خان ایک متوسط درجے کے زمیندار اور ماژندران کی قاجاری فوج



میں افسر تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو احمد رضا خان صرف چالیس دن کا مولود تھا جس کو لے کر ماں اپنے عزیزوں کے پاس تہران آگئی اور محمد رضا خان ایک یتیم اور بے سہارا کی طرح پرورش پانے لگا۔

جوان ہونے پر احمد رضا خان نے ایک ان پڑھ سپاہی بن کر زندگی کا آغاز کیا اور جب وہ ایران کا وزیر اعظم ہوا تو اس کا شمار مدیرین عالم میں ہوتا تھا۔

اس نے وقت کے دھارے کا رخ دیکھ لیا تھا لہذا پہلے علماء پر اثرات قائم کئے پھر نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارتوں سے مشرف ہوا اور واپس آکر سندھ کی ساتھ ایران کی تعمیر میں لگ گیا۔

اس نے اپنے دور حکومت میں فوجی تنظیم نو اور اسلحہ سازی کی صنعت کی طرف خصوصی توجہ دی، نظام تعلیم کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا، ذرائع نقل و حمل کو وسعت دی، معدنیات خاص طور سے پٹرول کی دولت کو حکومت کی نگرانی میں غیر ملکی کمپنیوں کی مدد سے تلاش کیا، صحت کے میدان میں بھی کئی اہم اقدامات کئے، حکومت کے نظم و نسق کے شعبہ کی اصلاح کی، نئی تہذیب کو عام کرنے کے لئے معاشرہ کو قدیم تہذیب کی پابندیوں سے نجات دلانے کی کوشش کی علماء و مجتہدین کی مخالفت کے باوجود بے پردگی کو عام کیا، یورپی ممالک سے تجارتی معاہدے کئے اور ملک کو معاشی اور مادی ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔

دوسری جنگ عظیم میں اگرچہ ایران نے اپنی لاتعلقی کا اعلان کر رکھا تھا لیکن روس اور اتحادی فوجوں نے دو طرف سے ایران پر حملہ کر دیا، خاصے جان و مال کا اتلاف ہوا اور حکومت کو سخت سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات میں رضا شاہ کبیر نے اس بات کو مناسب سمجھا کہ وہ اپنے ولی عہد شہزادہ محمد رضا شاہ کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جائے چنانچہ اس نے ملک چھوڑ دیا اور خود اختیاری جلاوطنی میں زندگی کے باقی دن گزار دیئے۔

احمد رضا شاہ پہلوی کی زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے تو وہ یقیناً ایران کا معمار تھا۔ اس پر زائد سے زائد یہ الزام عائد کیا جاسکتا ہے کہ اس نے ملک کو نوٹ۔آریہ مہر اور پہلوی کی نسبت ایران کے قدیم شاہی خاندان سے ہے۔

یورپ کے نقش قدم پر ڈال دیا اور علماء کے اثرات کو کم کر کے مذہبیت کو نقصان پہنچایا لیکن اگر اس وقت کے سیاسی افق کو دیکھا جائے تو اس پر پہلا نام مصطفیٰ کمال اتاترک کا نظر آئے گا جس نے خلافت کو ختم کر کے یورپ کے مرد بیمار ترکی میں ایک تازہ روح پھونکی، احمد رضا پہلوی نے بھی اسی کو وقت کا تقاضا قرار دیا۔

ترکی جرمنی کا حلیف رہا تھا اگر مصطفیٰ کمال ایک نیا پرچم لے کر کھڑا نہ ہوتا تو ترکی کا نام دنیا کے نقشے سے اڑ جاتا، رضا شاہ کبیر کا رجحان جرمنی کی طرف تھا لیکن اس نے بڑی مدبرانہ چابکدستی سے اپنی غیر جانبداری برقرار رکھی لیکن اتحادیوں کے نزدیک یہ بھی جرم تھا کہ ایران نے ان کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔

اسیے میں صرف رضا شاہ کبیر کی سیاسی سوجھ بوجھ تھی کہ وہ اس تخت سے دست بردار ہو گیا جس پر اتحادیوں کی نگاہ پڑ سکتی اور اس نے ایک نئے تاجدار کو سامنے کر دیا جس پر اتحادیوں کی عدالت کوئی جرم عاید نہ کر سکتی اور اس طرح وہ ایران کو کسی بڑے خرد برد سے بچالے گیا جو اس کا کارنامہ ہے۔

### محمد رضا شاہ پہلوی

۲۲ سالہ محمد رضا شاہ پہلوی نے ستمبر ۱۹۳۱ء میں پارلیمنٹ کے ایک خصوصی اجلاس میں دستور کے مطابق شہنشاہیت کا حلف اٹھایا۔ وہ ایک روشن خیال بادشاہ تھا۔ اس نے اتحادیوں کے بارے میں ایران کی واضح پالیسی مرتب کی اور چند ماہ کی گفت و شنید کے بعد برطانیہ و روس سے بعض معاہدے کر لئے لیکن جلد ہی اپنی سیاسی تدبیر سے ایران کی سرزمین کو روسی اور برطانوی فوجوں سے خالی کرالیا وہ فطرتاً ایک شرمیلانوجوان تھا پھر بھی اپنے دور حکومت میں اس نے ایران کو مادی ترقی کی طرف گامزن کیا مگر ایران کی سیاست کو وہ بیرونی مداخلت سے دور نہ رکھ سکا۔ کبھی وہ برطانیہ کے تسلط میں تو کبھی فرانس کے اور آخر کار امریکہ کے چنگل میں اس حد تک پھنسا کہ ایران امریکہ کا ایک صوبہ اور شاہ ایران علاقہ کا امریکن پولیس مین بن گیا۔ آئیہ اندر و جردی کے انتقال کے ساتھ ہی رضا شاہ نے یہ سمجھ لیا کہ ایران میں علماء کا اثر ختم ہو گیا اور ۱۹۶۳ء میں اس نے سفید انقلاب کا اعلان کر دیا۔



اب ایران میں غیر اسلامی شعار کا پرچار عام اور اسے قانونی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، بے پردگی، عربیائی، بے حیائی مغربی تہذیب کے پہلو بہ پہلو عروج پر تھے۔ پھر اسرائیل سے تعلقات استوار کئے گئے اور بہائیت کو فروغ حاصل ہوا ایسے میں مشہور عالم دین الحاج آقا روح اللہ خمینی خاموش تماشائی نہ رہ سکے۔ انہوں نے خطبات جمعہ میں عوام کو اس ابتری کی طرف متوجہ کیا اور ایران کے ذریعے عالم اسلام کو آئندہ خطرات سے آگاہ کرنا شروع کیا جس کے نتیجے میں ۵ جون ۱۹۷۳ء کو انہیں گرفتار کر لیا گیا اور قم، تہران، شیراز اور تبریز جیسے شہروں میں شاہ کی مخالفت کی ہر دوڑ گئی، مظاہرے ہوئے اور مجبور آیتہ اللہ خمینی کو قید سے رہا کر کے تہران میں نظر بند کر دیا گیا پھر اپریل ۱۹۷۴ء میں انہیں قم بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے انقلاب اسلامی کی تجدید کی اور ظلم کے خلاف عوامی علم بلند کر دیا۔

آیتہ اللہ آقائے خمینی نومبر ۱۹۷۴ء میں ترکی کے لئے ملک بدر کر دیئے گئے مگر وہ عراق منتقل ہو گئے جہاں ان کے مراجع تقلید تھے۔ عراق کے قیام میں وہ مسلسل اسلامی انقلاب کا آواز بلند کرتے رہے آخر عراق کی حکومت نے بھی انہیں ملک بدر کر دیا اور وہ کویت ہوتے ہوئے پیرس چلے گئے۔

فرانس کے اس عظیم شہر میں بھی ان کی تحریک جاری رہی، عجیب ستم ظریفی ہے کہ تہران کو مشرق کا پیرس کہا جاتا تھا وہ اسی پیرس کو مشرق بہ اسلام کرنا چاہتے تھے اور یورپ کے پیرس میں بیٹھ کر اس کا نعرہ لگا رہے تھے۔

بہر حال ۱۹۷۸ء میں ایک انقلاب عظیم کے آثار پیدا ہو گئے اور شاہ پہلوی اندرونی اور بیرونی اقتدار کے باوجود اس کو روک نہ سکا اب اس کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ ملک سے فرار ہو کر اپنے کو بچالے جائے۔ اس کوشش میں وہ کامیاب ہوا اور جنوری ۱۹۷۹ء میں اس پہلوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جس نے مادی زاویہ نگاہ سے ایران کو ایشیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا تھا لیکن اخلاقی اعتبار سے اسنا کھوکھلا کر دیا تھا کہ وہ کسی طرح مسلمانوں کا ملک کہے جانے کے قابل نہ تھا۔

## شیعان کشمیر

کشمیر میں مسلمانوں کے ورود کا کوئی وقت معین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سلطان محمود نے جب کشمیر پر حملہ کیا تو کہیں نہ کہیں کوئی مسلمان پایا جاتا تھا جو وسط ایشیا سے تجارت یا سیاحت کے لئے آیا ہو گا اور پھر یہیں کا ہو گیا۔

ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح کشمیر پر محمود کا حملہ بھی حصول زر و مال یا تسخیر ملک کے لئے تھا جس کو انجام دے کر وہ ایک ماہ بعد چلا گیا اور کچھ مسلمان اپنی خوشی سے یا حکمائے گئے جن سے کشمیریوں کو معنوم ہوا کہ اسلام بھی کوئی مذہب ہے۔ بعض نے اسلام کی حلقہ بگوشی بھی اختیار کی مگر وہ کسی گنتی میں نہیں آتی۔

اس ملک کی اکثریت ہندو اور بدھ مت کی پیرو تھی اور ان کا بادشاہ رنجن ساہ بدھ مت ہونے کے باوجود اپنے عقیدے سے متفق نہ تھا۔ ایک دن اتفاق سے اس نے دریا کے کنارے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا۔ عبادت کا یہ طریقہ اس کو عجیب سا لگا مگر دلکش بھی۔ اس نے عبادت سے فارغ ہونے کے بعد اس شخص سے استفسار کیا اور اس نے اسلام کے بارے میں موٹی موٹی باتیں رنجن ساہ کو بتائیں پھر بادشاہ اس کو اپنی جگہ پر لے گیا اور تفصیلات دریافت کرتا رہا۔ مسلمان اپنے مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے بدھ بادشاہ کو متاثر کر لیا۔ اس مسلمان کا نام سید شرف الدین المعروف بہ بلبل شاہ تھا۔

بادشاہ کا قبول اسلام وادی کشمیر میں طلوع اسلام کا پہلا دن کہا جاسکتا ہے پھر آہستہ آہستہ علماء، صوفیاء اور سادات پہنچنا شروع ہوئے اور ساکنان کشمیر عمومی سطح پر اسلام سے آشنا ہونے لگے۔

”فرشتہ“ کا بیان اس سے مختلف ہے اور وہی صحیح معلوم ہوتا ہے اس نے لکھا ہے کہ:



شاہ مرزا نام کا ایک قلندر راجہ سہدیو کے زمانے میں کشمیر پہنچا اور اپنی چرب زبانی اور دانشمندی سے راجہ کے مزاج میں دخیل ہو گیا اور وزارت کے عہدے تک پہنچ گیا۔ سہدیو کے بعد اس کا بیٹا رجن راج گدی پر بیٹھا تب بھی شاہ مرزا وزیر رہا۔ رجن جلد ہی مرگیا تو اس کا ایک قرابت دار اودن قندھار سے آ کر تخت نشین ہوا اس نے بھی مرزا کو بحال رکھا۔

شاہ مرزا اراکین حکومت پر اپنا اثر قائم کر چکا تھا ان کو ملا کر اس نے ایک فوج تیار کر لی اور راجہ کے مقابلے پر آ گیا۔ اتفاق سے راجہ اودن دیوانہ نہیں دنوں مرگیا۔ رانی ان سے لڑی مگر شاہ مرزا کی چالوں سے مات کھا گئی اور شکست کھا کر گرفتار ہو گئی۔

شاہ مرزا اس کو مسلمان کر کے عقد میں لایا اور ایک شبانہ روز اپنے پاس رکھ کر قید کر دیا اور شمس الدین کا لقب اختیار کر کے کشمیر کا حکمران بن گیا پھر مذہب حنفی رائج کرنے پر توجہ دی مگر اس نے داد و ہش اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اس لئے کامیابی سے حکومت بھی کرتا رہا اور حنفیت کو بھی فروغ ملا۔

تین برس حکومت کر کے وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا جمشید تخت پر بیٹھا، پھر علاؤ الدین، شہاب الدین اور قطب الدین تخت نشین ہوئے۔ ان کے بعد سکندر بت شکن کا زمانہ آیا جس نے اشاعت اسلام پر توجہ دی۔ سلطان علی شاہ اس کا جانشین ہوا۔ اس کے بھائی شاہی خاں نے ۸۲۶ھ میں اس کو شکست دے کر حکومت پر قبضہ کر لیا اور سلطان زین العابدین کہہ کر پکارا گیا۔

وہ ایک غیر متعصب حکمران تھا اس کے عہد میں ہندو مسلمان سب خوش رہے اور حدود سلطنت وسیع سے وسیع تر ہو گئیں۔ بہت سے رفاہی کام بھی ہوئے طور طریقے میں وہ اکبر اعظم کی نظیر تھا۔ پھر شاہ حیدر اور شاہ حسن یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور ۸۶۳ھ میں فتح شاہ کشمیر کا فرمانروا ہوا۔

### کشمیر میں شیعیت

اس سلسلے میں متفقہ طور پر ایک نام لیا جاتا ہے سید علی ہمدانی کا جو سات

سو سادات کے ساتھ وارد کشمیر ہوئے۔ سن ۷۴۴ھ بتایا جاتا ہے۔ اس طرح آپ جب سرینگر پہنچے تو مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئے پچیس تیس سال گزر چکے تھے اور سلطان قطب الدین کا زمانہ تھا اس نے بصد تکریم استقبال کیا مگر آپ چالیس روز قیام کر کے واپس ہو گئے۔

سادات یقیناً ٹھہر گئے ہوں گے جنہوں نے وہ خانقاہ مکمل کی جو سید ہمدانی سے منسوب ہے۔

چالیس روزہ قیام میں آپ نے رشد و ہدایت کا فریضہ مرکز حکومت سری نگر میں ادا کیا پھر مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے واپس ہو گئے۔ کشمیر میں قیام کا دورانیہ معلوم نہیں مگر بنیادی اثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کافی طویل رہا ہو گا اور آپ کے بعد سادات میں سے جو لوگ رہ گئے تھے وہ آپ کے مشن کو پورا کرتے رہے ہوں پھر ۷۹۵ھ میں جب آپ کے صاحبزادے سید محمد ہمدانی کشمیر آئے تو ان کے ہمراہ بھی تین سو آدمی تھے مل جل کر ایک ہزار آدمی لہذا خود سید محمد ہمدانی کو کشمیر میں شیعیت کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔

سید ہمدانی کا مسلک بعض مورخین نے شافعی لکھا ہے اور بعض نے شیعہ مگر شافعی زیادہ قرین عقل ہے کیونکہ اس وقت سے بہت پہلے ان کی تبلیغی سرگرمیاں تیز ہو چکی تھیں اور ان کے مبلغ مسلسل ملایا، جاوا، سماترا پہنچ رہے تھے، ہو سکتا ہے کہ سید علی ہمدانی کی مسافرت بھی اسی مقصد کے لئے عمل میں آئی ہو۔

بہر حال سید نے فضائل محمد و آل محمد سے اپنی مہم کا آغاز کیا جس کی تلقین امام شافعی بھی کرتے رہے اور اسی پر شیعیت کی اساس بھی رکھی ہوئی ہے۔ سید علی ہمدانی کے بارے میں شیعہ ہونے کا گمان اس لئے بھی ہوتا ہے کہ ان کے ساتھیوں کی اکثریت شیعہ تھی۔

کشمیر کے سابق مسلمانوں میں کچھ شیعہ بھی تھے جو ہندو رسم و رواج سے متاثر ہو گئے تھے۔ سید علی ہمدانی کے ساتھیوں میں شیعہ عالم سعید الدین نے نفہیم اسلام کے ساتھ ان کی اصلاح کے فرائض بھی انجام دیے۔ سید محمد مدنی اور سید



حسین قمی بھی ۹۹۶ھ میں کشمیر آ پہنچے۔ ان بزرگوں کے کشف و کرامات کے ان گنت واقعات وادی کشمیر میں زبان زد ہیں۔

اس کے بعد وقتاً فوقتاً سادات میں سے بعض افراد پہنچتے رہے۔ ان کے تسلسل میں ایک نام میر شمس الدین عراقی کا ملتا ہے جن کو مرزا حسین والی غراسان نے بھیجا تھا اور ان کے ہاتھ کشمیر کے بادشاہ وقت حسن شاہ کو بعض تحائف روانہ کئے تھے۔ یہ حسن شاہ مرزا کی اولاد میں تھا، میر شمس الدین بعض اہم تبلیغی مہمات انجام دے کر واپس ہو گئے۔

میر شمس الدین دوسری بار کشمیر گئے تو ایک صاحب اقتدار ملک موسیٰ رینہ کو حلقہ اہل بیت میں داخل کیا اور اس کے اثر سے پورا چڈیل شیعہ ہو گیا جہاں ۹۱۴ھ میں انہوں نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔

اب میر کی حیثیت ایک مرشد کی تھی اور اشاعت اسلام میں آپ کی مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ علاقہ لداخ میں آپ نے بے شمار ہندوؤں کو مسلمان کیا۔ کرگلی اور اسکردو میں پرچم آل محمد ہرادیئے اور نو مسلموں کو از سر نو مسلمان کیا۔

۹۳۲ھ میں میر شمس الدین کا انتقال ہو گیا جو حقیقتاً شیعہ اثنا عشری نہ تھے بلکہ نور بخشی مسلک کے تھے جو شیعہ عقائد سے ملتے جلتے ہیں..... ۹۵۵ھ میں مرزا حیدر کاشغری نے کشمیر پر حملہ کیا تو نور بخشی اور شیعہ اثنا عشری سب کا قتل عام کیا اور میر شمس الدین کا مزار کھدوا ڈالا۔ اس مرتبہ اسکی حکومت کشمیر میں دس سال رہی

نور بخشی عقائد کے بارے میں محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ بنیادی عقائد میں وہ شیعوں کے مشابہ ہیں لیکن ان کے مذہبی معمولات و زندگیوں جیسے ہیں میر شمس الدین کے متعلق فرشتہ کا کہنا ہے کہ وہ نور بخشی نہ تھے بلکہ اثنا عشری شیعہ تھے۔ کتاب "احوط" ایک ملحد کی تصنیف ہے جو ان کے نام سے لکھ دی گئی ہے کشمیر کی آبادی کی بابت فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ سنی تھی البتہ فوج میں شیعہ موجود تھے۔

یہ بیان تحقیق مزید میں پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے اور بعد کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ (۳۲)

### کشمیر کا جیالا سپاہی

میر شمس الدین کے بعد ملک موسیٰ رینہ نے ان کے مشن کو پورا کیا۔ ۹۱۶ھ میں فتح شاہ کے مقابلے میں وہ مارا گیا تو فتح شاہ اس کے علاقہ کا حکمران ہوا۔ فتح شاہ سلطان زین العابدین کا بیٹا تھا اس کے دو بھائی اور تھے جن کے مابین لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر ۹۲۴ھ میں محمد شاہ کامیاب ہوا۔ اس نے مشہور و معروف قبائلی سردار لنکر چک کے وارث کلچی چک کو وزارت کے عہدے پر فائز کیا جو امراء کی سازشوں سے اکتا کر نوشہرہ چلا گیا۔

قبائل کی ان لڑائیوں سے شیعیت کو نقصان پہنچا مگر اس سے قبل اتنی اشاعت ہو چکی تھی کہ عقائد متزلزل نہیں ہوئے..... ان ہی میں ایک خاندان کپوارہ تھا جو سنی مسلک پر قائم رہا۔

کلچی چک نوشہرہ میں مقیم تھا کہ کشمیر پر حملے کے لئے بابر کا بھیجا ہوا لشکر نزدیک پہنچ کر ٹھہر گیا۔ کلچی چک نے حب الوطنی میں اس لشکر پر شب خون مارا۔ اس کا بیٹا حسین خان، شیخ علی بیگ سردار لشکر کے خیمے میں گھس گیا اور پے در پے تلوار کے تین وار کئے۔ شیخ نے پناہ مانگی تو اس کو چھوڑ دیا مگر رات کے اندھیرے میں باقی لشکر کا صفایا کر دیا۔ اس واقعے کی اطلاع جب سلطان محمد شاہ کو ہوئی تو اس نے درخواست کر کے کلچی چک کو عہدہ وزارت پر واپس بلا لیا۔

سلطان محمد اس بار بھی کچھ ہی دنوں بعد کلچی چک کے خلاف ہو گیا تو ۹۳۴ھ میں کلچی نے اس کو تخت سے اتار کر اس کے بیٹے ابراہیم کو بادشاہ بنا دیا اور نظم حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پچھلی وزارت میں علی رینہ سے کلچی کا معرکہ ہوا تھا اور وہ گرفتاری کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ اس نے ریگی چک اور ماگرے قبائل سے سازش کی اور ابراہیم ماگرے ۹۳۵ھ میں بابر سے بیس ہزار فوج لے کر کشمیر پر چڑھ دوڑا۔ اس لشکر کا سپہ سالار بھی شیخ علی بیگ تھا۔ کلچی چک بڑی بہادری سے لڑا مگر شکست کھا کر میدان سے نکل بھاگا۔



فاتحین نے سری نگر میں داخل ہو کر سلطان محمد شاہ کو پھر تخت پر بٹھا دیا اور ملک کو تقسیم کر لیا۔ ملک ابدال، لوہر ماگرے، ریگی چک اور علی رینہ ایک ایک حصے پر قابض ہو گئے۔

۹۳۷ھ میں مرزا کامران نے تیس ہزار فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ شیخ علی بیگ اور محرم سرداران لشکر تھے اس کی اطلاع پا کر چاروں حکمران قلعہ چیراؤڑ میں جمع ہوئے اور کلہی چک سے مشترکہ درخواست کی۔ کشمیر کا محب وطن پٹھلی باتیں بھول کر مدد کے لئے آگیا پہلی ہی لڑائی میں دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے اور وہ صلح کر کے واپس ہو گئے۔

۹۳۹ھ میں سلطان سعید خان والی کاشغر نے کشمیر پر حملہ کیا اس کے لشکر نے کئی شہر پامال کر ڈالے اور علاقوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ جاڑا گزر جانے پر کشمیری پھر متحد ہو کر آئے۔ پہلے دن کے معرکے میں علی رینہ، حسین رینہ اور علی بٹ نے بڑی شجاعت کے جوہر دکھائے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ دوسرے دن کلہی چک نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اس کے پیہم حملوں سے ترکوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور کلہی چک انہیں بھگاتا چلا گیا۔

اسی سال کشمیر میں سخت قحط پڑا۔ مرزا حیدر دو غلات کاشغری فوج کا ایک سردار تھا جو ہمایوں کا قریبی عزیز بھی تھا۔ اس نے اس موقع پر اہل کشمیر پر بڑے مظالم ڈھائے پھر وہ ہمایوں کے پاس چلا گیا۔ ۹۴۲ھ میں سلطان محمد شاہ کا انتقال ہو گیا لہذا اسکے بیٹے شمس الدین ثانی کو تخت پر بٹھایا گیا اور کلہی چک وزیر بنایا گیا۔ اس کے عہد وزارت میں پہلے شمس الدین کا انتقال ہوا، پھر اس کا بھائی اسماعیل شاہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ ۹۴۶ھ میں اسماعیل کا بیٹا ابراہیم شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس مدت میں ریگی چک اور ابدال ماگرے نے بغاوت کی اور کلہی چک نے دونوں کو ہندوستان کی طرف مار بھگایا۔ یہ دونوں پھر مرزا حیدر کو چڑھا لائے۔

مرزا حیدر سنی تھا اور یہ دونوں بھی سنی تھے اس لئے انہوں نے شیعیت کے غلبہ کو کم کرنے کے لئے سنی مسلک کے لوگوں کا تعاون حاصل کیا اور کلہی چک مقابلے کی طاقت نہ دیکھ کر نوشہرہ چلا گیا۔

اس عرصے میں شیر شاہ سوری ہندوستان کا بادشاہ ہو چکا تھا۔ کلہی چک نے اس سے مدد حاصل کر کے کشمیر پر حملہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۹۵۱ھ میں کلہی چک نے دوسرا حملہ کیا مگر اس میں بھی شکست کھائی کیونکہ اس کے پاس فوج کی تعداد بہت کم تھی اور مرزا حیدر کے پاس ایک بڑا لشکر تھا، پھر بھی کلہی چک مایوس نہ تھا لیکن ۲۲ جمادی الاخر ۹۵۲ھ میں اس کا وقت آخر آ پہنچا اور پونجھ کے علاقے میں موضع تھنہ میں وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

وہ ایک عظیم سردار قبیلہ اور باجبروت بادشاہ تھا۔ بہادر، رحمدل اور منصف مزاج، رزم گاہ کا شیر اور بزم کی رونق تھا۔ عقل و دانش، ذہانت اور فطانت میں جواب نہ رکھتا۔ اس کی داد و عطا کے قصے کشمیر میں مشہور تھے اس نے چڈبیل کے متصل خانقاہ نور بخشہ نام کا ایک امام باڑہ بنوایا تھا جو کشمیر کا پہلا امام باڑہ تھا جس میں مجلس عزا منعقد ہوتی تھی۔

### شیعوں کی بے جا رنجی

نازک شاہ ولد فتح شاہ، ابراہیم شاہ کے بجائے کشمیر کا بادشاہ بن چکا تھا مگر حقیقتاً بادشاہت مرزا حیدر دو غلت کی تھی جو ۹۴۷ھ سے اہل کشمیر پر کوہ ستم توڑ رہا تھا۔ وہ ایک بہت متعصب سنی تھا۔ شیعوں کے قصور ڈھونڈ کر اور پیدا کر کے مشق ستم کرتا۔ کلہی چک نے حنفیوں، شافعیوں اور شیعوں کو شیرد شکر بنار کھا تھا مرزا حیدر نے ان میں عداوت کا بیج بو دیا۔ صورت حال کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ۹۵۲ھ میں کلہی کی وفات سے اس کے قبیلے اور جماعت میں تفرقہ اور پریشانی ہوئی، شیعہ امامیہ اور نور بخش مسلمان بے بس ہوئے کیونکہ اب ان کی رہبری اور رہنمائی کے لئے قائد موجود نہ تھا۔

اس سے مرزا حیدر اور شیر ہو گیا۔ ۹۵۵ھ میں عوام اور سپاہیوں کو شیعہ اور نور بخش مسلمانوں کا قتل و غارت کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم پاتے ہی انہوں نے ان دو جماعتوں کا قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ شروع کی۔ ان کے معابد، مساجد اور مکانات جلائے گئے۔ چڈبیل میں میر شمس الدین کی خانقاہ کو جلا کر رکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا پھر اسکو مزبلے میں تبدیل کر دیا گیا۔ شکل ریشی شیخ دانیال ولد میر شمس الدین



کے خلیفہ تھے۔ انہیں مرزا حیدر نے ۸ ذی الحجہ ۹۹۵ھ کو شہید کر دیا۔ ان کے جسم کو جلوا دیا۔ بابا علی بخار کے مرید صوفی داؤد کو تڑپا تڑپا کر مارا۔ خود بابا علی بخار کو قتل تو نہیں کیا مگر ڈاڑھی منڈوا دی۔ قاضی میر علی پر شیعوں کی حمایت کا الزام لگا کر شہر بدر کر دیا۔ پھر دانیال پر علماء سے کفر کے فتوے لگوا کر قتل کیا حتیٰ کہ شیعہ مشاہیر میں سے کسی کو جستانہ چھوڑا۔

اکتقاء صرف اتنے ہی پر نہیں کی گئی بلکہ حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جو میر شمس الدین کی پیروی کرے گا نور بخشی یا شیعہ مسلک اختیار کرے گا، وہ مستوجب قتل ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عراق و شام کی طرح شیعہ تقیہ کر کے منظر عام سے ہٹ گئے۔ مرزا حیدر خود اپنی "تاریخ رشیدی" میں لکھتا ہے۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس وقت کشمیر میں کوئی شخص علانیہ نور بخشی مسلک کا اظہار نہیں کرتا۔ تمام لوگ اپنے آپ کو سنی مسلک کا مسلمان ظاہر کرتے ہیں کیونکہ وہ میری سنگدلی سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے کوئی دوسرا مسلک اختیار کیا تو انہیں قتل کر دیا جائے گا"۔ (۴۳)

سفاک ترک نے شیعوں کے ساتھ سنیوں اور ہندوؤں کو بھی نہیں بخشا۔ آخر عیدی رینہ نے اس کے خلاف کھڑے ہونے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے سید ابراہیم، غازی چک اور دولت چک سے مل کر ایک جمعیت اکٹھا کی اور مرزا کی قوت کم کرنے کے لئے مختلف مقامات پر نام کی بغاوتیں کرا دیں۔ مرزا حیدر نے اپنے فوجی دستے ان جگہوں پر بھیج دیئے اور خود اس کے ساتھ تھوڑے سے سپاہی رہ گئے۔ یہ لوگ اس موقع کے منتظر تھے۔ انہوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ادھر اس کے سپاہی ٹکڑیوں میں بٹ کر مار ڈالے گئے اور خود مرزا کو ایک قصاب نے ذبح کر ڈالا

### قبیلہ چک کا دوسرا جرنیل

۹۵۸ھ میں نازک شاہ کو پھر بادشاہ بنایا گیا، عیدی رینہ وزیر اعظم ہوا اور کاجی چک کے بیٹے اور پوتے مختلف عہدوں پر فائز کئے گئے۔ ۹۶۱ھ تک کا زمانہ کشمیریوں کے لئے بہت اچھا گزرا۔ اس کے بعد ہیبت خان نیازی سلیم شاہ سوری

کے حکم سے کشمیر پر حملہ آور ہوا۔ دولت چک کشمیر کا سپہ سالار تھا۔ بعض اراکین حکومت اس سے جلتے تھے وہ اس کے پیچھے اپنی اپنی فوجیں لے کر چلے تو مگر اس کی شکست کے خواہاں ہو کر۔

دولت چک نے اپنے لشکر کو دو مختلف راستوں سے بھیج کر دشمن کو گھیرے میں لے لیا اور ایسے تابڑ توڑ حملے کئے کہ صرف دو آدمی بمشکل بچ کر جاسکے۔ اس فتح سے سارا ملک خوش ہوا مگر عیدی رینہ جل بھن کر کباب ہو گیا۔ اس نے کئی سرداروں کو ملا کر علم بغاوت بلند کر دیا مگر دولت چک نے اس کے حلیفوں کو توڑ لیا۔ عیدی رینہ ہزیمت یاب ہوا اور بھلگتے میں گھوڑے سے گر کر مر گیا

دولت چک بڑا طاقتور تھا، اپنے وقت کا رستم کہا جاتا، منصف مزاج تھا۔ اس نے ہر ایک کو مذہبی آزادی دی تھی۔ جو بزرگ مرزا حیدر کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے، ان کے مزارات بنوائے اور پس ماندگان کو جائیدادیں دیں، میر شمس الدین کی خانقاہ دوبارہ تعمیر کرائی اور اس کے لئے کئی گاؤں وقف کئے۔

دولت چک کے بعد طاقت و سطوت غازی چک کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے اسماعیل شاہ کو معزول کر کے حبیب چک کو فرمانروا بنا دیا اور کشمیر میں چک خاندان کی حکومت کا آغاز کر دیا۔

حبیب چک کی نالائقی کے سبب کچھ دنوں بعد غازی چک کو تخت پر بٹھا دیا گیا اور ۹۶۱ھ میں اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

### چک بادشاہ، غازی شاہ

چک خاندان اپنی شجاعت، لیاقت، تدبیر اور دانائی میں ممتاز تھا اور غازی شاہ میں بھی یہ تمام باتیں بانی جاتی تھیں۔ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں لداخ، اسکردو، گگٹ، پگھل اور گگر فوج کر کے اپنی سلطنت کی حدود وسیع کر لیں۔ وہ کسی پر زیادتی نہ کرتا پھر بھی اس کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں ہوئیں مگر اس نے ان سب پر قابو پا لیا۔ باغیوں نے دہلی پہنچ کر مغلوں سے مدد لی اور ابوالمعالی ایک لشکر کے ساتھ کشمیر پہنچا۔ اور تمام سنی مسلمان اس سے جا کر مل گئے۔



### علی شاہ

اس بادشاہ نے ۹۷۸ھ میں عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ سید مبارک ہستی اس کا وزیر ہوا جس نے کئی اندرونی بغاوتوں کو فرد کیا پھر سابق شاہی خاندان سے ملازک شاہ کے بیٹے حیدر خان اور سلیم خان اٹھے اور کئی قبیلوں کو ملا کر مقابلے پر آگئے مگر پسپا ہوئے۔ علی شاہ نے دونوں کو معاف کر دیا۔

راجہ کشنوار نے دو مرتبہ بغاوت کی مگر شکست کھائی۔ پہلی مرتبہ اپنی بیٹی علی شاہ کو پھر دوسری بیٹی یعقوب شاہ کو بیاہ دی۔

اسی زمانہ میں قحط پڑا۔ بادشاہ نے اپنا خزانہ اور زر و مانا رعایا میں تقسیم کر دیا۔ امراء و عمائدین نے بھی اس کی تقلید کی جس سے بادشاہ کی رعایا پروری کی دھوم ہو گئی۔ ایک دن چوگان بازی میں اس کی آنت پھٹ گئی اور وہ نو سال حکومت کر کے انتقال کر گیا۔ بہت رحم دل اور علم پرور بادشاہ تھا۔

### یوسف شاہ

۹۸۷ھ میں اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا لیکن خاندانی بغاوتوں میں ہزیمت یاب ہوا اور سری نگر چھوڑ کر تھنہ چلا گیا۔

### سید مبارک ہستی

۹۸۸ھ میں بادشاہ ہوا جو پہلے علی شاہ کا وزیر رہا تھا وہ ایک سادہ مزاج انسان تھا، نظم و نسق میں ماہر امراء کی خود سری کو اس نے اول دن سے لگام دی اس لئے سب اس کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے دو بارہ یوسف شاہ کو لانے کا منصوبہ بنایا مگر دونوں میں سے کوئی لڑنے کو تیار نہ تھا۔

ابدال بٹ مبارک ہستی کا دشمن تھا اس نے ساز باز کر کے لڑوا دیا اور یوسف شاہ شکست کھا کر پھر تھنہ چلا گیا۔ ابدال اب بھی باز نہ آیا، اس نے سرداروں سے مل کر ہستی کے خلاف زہر اگلا اور سب نے مل کر اس کو تخت سے اتار دیا اور لوہر خان کو بادشاہ بنالیا۔

غازی شاہ کو بالکل وقت پر خبر ہو سکی۔ اس کے ساتھ صرف اس کے رشتہ دار اور کچھ قبیلے کے لوگ تھے پھر بھی وہ مقابلے پر آگیا۔

تھوڑے سے سرفروش ایک آزمودہ کار لشکر سے لکرائے لیکن مردانگی نے حرص و آز کا منہ پھیر دیا۔ ابو المعالی بچ کر نکل گیا اور ڈنڈہ ہزار قیدی غازی شاہ کے لئے چھوڑ گیا۔ باغی پھر ہندوستان پہنچ گئے اور اب کی وہ حیدر کاشغری کے بھائی قرا بہادر کو لے آئے..... اب کی غازی شاہ نے اعلان کیا کہ جو ایک مغل کا سر لانے گا اس کو ایک اشرفی انعام میں ملے گی۔

ڈوم قبیلے کے لوگ یہ سنتے ہی نکل پڑے۔ جو مغل جہاں کہیں انکو ملا اس کو انہوں نے پکھاڑ دیا اور ایک اشرفی کے ساتھ کچھ اور انعام بھی حاصل کیا۔ اس طرح نے وبا کی صورت اختیار کی تو ایک بڑی تعداد بغیر لڑے بھڑے بے سر ہو گئی اور مغل ہمت ہار کر واپس چلے گئے۔

اس دوران غازی شاہ کی بصارت جاتی رہی اور وہ اپنے بھائی حسین شاہ کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا۔

غازی شاہ بڑے رعب و دبدبے کا حکمران تھا، اس کے عہد میں بڑا امن و امان رہا، بہادر اور انصاف پسند تھا، علم و دست اور شاعر تھا، بہادروں اور اہل علم کی عزت کرتا تھا، کسی مظلوم کی حفاظت اپنا فرض، قالم اس کا عزیز بھی ہو تو سزا دیئے بغیر نہ چھوڑتا۔ ان اوصاف کی بدولت اسے ہر دلعزیزی حاصل تھی۔

### حسین شاہ

خاندان چک کا تیسرا بادشاہ تھا جو ۹۷۱ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کو تخت پر بیٹھتے ہی کئی اندرونی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا، جن کو اس نے بڑی بہادری سے فرد کیا۔

وہ ایک منصف مزاج حکمران تھا، سنی و شیعہ میں تمیز نہ کرتا لہذا سنی غلبہ بڑھنے لگا اور اکثر سرعام تلخ کلامی کی نوبت آجاتی، کئی قتل بھی ہوئے۔ بادشاہ کی صحت بھی خراب تھی۔ آخر وہ اپنے بھائی علی کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا مدت حکومت ۹۷۱ھ سے ۹۷۸ھ تک رہی۔



## لوہر خان

وہ ایک درد مند بادشاہ تھلاہنے دور میں اس نے اشیائے صرف بہت ارزاں کرائیں۔ روٹی اتنی بڑی بنتی تھی کہ "لوہر منڈ" کہی جاتی۔

یوسف شاہ دوسری شکست کے بعد آگرہ چلا گیا تھا چونکہ فن موسیقی کا ماہر تھا لہذا اکبر کے دربار میں اس کی پذیرائی ہوئی وہ ایک فوج لیکر کشمیر آیا۔ لوہر خان نے ابدال بٹ کو اس کے مقابلے کے لئے روانہ کیا لیکن اس کے بیٹے نے غداری کی اور یوسف سے مل گیا۔ پھر بھی لوہر خان ہمت نہیں ہارا۔ قبائل کی اکثریت یوسف شاہ کے ساتھ ہو گئی تھی لیکن ابدال بٹ نے مقابلہ کیا اور لڑائی میں مارا گیا اور لوہر خان ہندوستان چلا گیا۔

سری نگر میں یوسف شاہ کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور ۹۸۹ھ میں وہ دوبارہ تخت نشین ہوا۔

بے وفائی اور سازشیں کشمیریوں کا خاصہ مزاج تھیں۔ ان کا سابقہ دوسری باریوسف شاہ کو ہوا۔ کچھ دنوں بعد بغداد میں شروع ہو گئیں۔ حبیب چک کو گرفتار کر کے سزا دی گئی۔ حیدر چک نکل گیا اس نے کشنوار سے مدد لے کر جنگ کی مگر شکست کھائی۔

کچھ دنوں بعد شہنشاہ اکبر کی سفارت کشمیر پہنچی۔ جواباً یوسف شاہ نے اپنے بیٹے یعقوب کو روانہ کیا۔ وہ دربار اکبری کے حالات لکھ کر یوسف شاہ کو بھیجتا تھا مگر مرزا قاسم انہیں چھپا ڈالتا تھا۔ ادھر اکبر نے حکم دیا کہ حکیم علی خود کشمیر جا کر یوسف شاہ کو لائے۔

یعقوب کو درباری حالات کا علم ہوا تو نظریں بچا کر بھاگ کھڑا ہوا مگر مرزا قاسم نے چالاکی سے باپ کو بیٹے سے بدظن کر دیا اور حکیم علی یوسف شاہ کو لینے کے لئے پہنچا تو اس کو گور جواب دلوا دیا۔

ہندوستان کا شاہی مزاج اس خود سری کی تاب نہ لاسکا، نتیجے میں اکبر نے راجہ بھگواند اس کو فتح کشمیر پر مامور کر دیا۔ مغل افواج کشمیر کے قریب پہنچیں تو تمام کشمیری اکائی بن کر مقابلے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مرزا قاسم نے اس موقع پر

سب سے زائد غداری کی۔ مغل کیمپ میں جا کر راجہ بھگواند اس سے اپنے لئے وعدے لئے اور یوسف شاہ کو بہکا کر صلح کے لئے راجہ بھگواند اس کے پاس پہنچا دیا۔ غیرت دار بیٹا یعقوب اتنی آسانی سے کشمیر کو مغلوں کے رحم و کرم پر ڈالنے والا نہ تھا اس کے حکم پر ابو طالب نے درہ کھادرہ سے گھیرا ڈالا اور درہ بولیاہ سے فائدہ اٹھا کر مغل افواج کا راستہ روک دیا۔ کشمیریوں کی خوش قسمتی سے بارش اس قیامت کی ہوئی اور برف باری کے سبب سردی اس غضب کی پڑی کہ مغل سپاہی مرنے لگے۔ دریا کی طغیانی اس پر مستزاد تھی۔ انجام کار راجہ بھگواند اس نے دور اندیشی سے کام لے کر یعقوب سے صلح کر لی اور ہندوستان واپس ہو گیا۔ یوسف شاہ کو اپنی بزدلی کی سزا ملی، اکبر نے اسکو قید کر دیا پھر مان سنگھ کے ساتھ قلعہ رہتاس بھیج دیا۔

۱۲ ذی الحج ۱۰۰۰ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ بزار عایا پرور اور مخیر تھا۔ حراست کے عالم میں اس نے تمام زرد جو اہر خیرات کر دیا تھا۔ فارسی، کشمیری اور ہندوستانی کا شاعر تھا اور فن موسیقی کا تو استاد تھا۔ اچھا منظم بھی تھا اور مدبر بھی مگر مرزا قاسم سے فریب کھا گیا۔ حد سے زائد اعتماد نے اس کو تباہ کر دیا۔

## یعقوب شاہ

جواں سال بادشاہ ۹۹۳ھ میں تخت کشمیر پر بیٹھا۔ "وہ ذہانت و فطانت اور عقل و تدبیر سے آراستہ اور شہامت و شجاعت میں مشہور تھا۔ اس کو ملک کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے عہد حکومت میں وطن دشمن عنصر نے مذہب کے نام پر تعصب کی آگ لگا دی جس کے نتیجے میں اس بد نصیب ملک کی آزادی سلب ہو گئی۔ اس فتنے کا بانی قاضی موسیٰ تھا جو بڑا متعصب تھا اور شاہی خاندان کے مٹانے پر تکا ہوا تھا کیونکہ یہ خاندان شیعہ مسلک کا حامی تھا قاضی موسیٰ شاہی خاندان کے دشمنوں اور غداروں کی کھلم کھلا حمایت کرتا تھا۔"

"حسین شاہ کے عہد حکومت میں جن مفتیوں نے مظلوم یوسف (شیعہ) کے قتل کا حکم جاری کیا تھا۔ ان میں قاضی موسیٰ بھی شامل تھا۔" (۴۴)

اس سے قبل تین چار بادشاہوں کے عہد میں بھی وہ سازشوں میں ماخوذ ہوا



مجلسیں کیوں ہوتی ہیں، جلوس کیوں نکالے جاتے ہیں اذان میں علی کی خلافت الہیہ کا اعلان کیوں کیا جاتا ہے حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ شیعہ علی ہی کو خلیفہ برحق مانتے ہیں اور مجلسیں اور جلوس ان مظالم کے خلاف احتجاج ہے جو ایک نام نہاد مسلم حکومت نے رسول کی اولاد پر روا رکھا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول کے کلمہ گو اور آل رسول پر ستم کے پہاڑ توڑنے والوں کے حمایتی.....! یہ جلوس خود ان کے خلاف تو نکلتے نہیں تو برا کیوں لگتا ہے؟ بات یہ ہے کہ شیعوں کی کوئی بات گوارا نہیں ہے اور خود ان کا وجود تو برداشت ہو ہی نہیں سکتا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال کشمیر میں تھی، ایک شیعہ حکومت قائم ہو گئی تھی تو سنی اکثریت ریشہ دوانیوں میں لگی ہوئی تھی، کبھی اندرونی بغاوتیں کراتی اور کبھی باہر کی طاقتوں کو اکسا کر کشمیر پر چڑھا لاتی جس میں اب تک کامیابی نہ ہوئی تھی لہذا اس بار ایک مکمل منصوبے کے ساتھ تحریک چلائی گئی اور یعقوب شاہ کو ملکی خلفشار میں مبتلا کر کے ایک وفد اکبر اعظم کے پاس بھیج گیا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اکبر کو کشمیر فتح کرنے کی بڑی تمنا تھی اور اس کی کئی کوششیں ناکام رہی تھیں اس لئے اب کی اس نے کشمیر کی یک جہتی کو ختم کرنے کے لئے پہلے سے اپنے آدمی بھیج کر سنی شیعہ سوال کو ہوا دی بلکہ کشمیر میں آگ لگادی تھی۔

ان آدمیوں میں بعض نے سنی علماء، صوفیاء اور مشائخ کو خرید لیا تھا جس میں شیخ یعقوب صوفی اور خواجہ حبیب اللہ نوشہری سرفہرست تھے۔ یہ لوگ دکھانے کے لئے ایک وفد لے کر اکبر کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور اس کو کشمیر پر حملے کی دعوت دی۔ تبادلہ خیالات کے بعد باہم طے ہوا کہ:-

”ملک فتح کرنے کے بعد کشمیریوں کو کسی بھی اعلیٰ اور ذمہ

دار عہدے پر تعینات نہ کیا جائے، شیعہ چک خاندان میں سے کسی ایک فرد کو بھی کشمیر میں رہنے نہ دیا جائے“

یہ دو شرطیں منجملہ ان شرائط کے تھیں جو اراکین وفد نے اکبر سے منوائیں

تھا اور عمائدین کی سفارش پر معاف کر دیا گیا تھا۔ اس بار مغلوں کے ہاتھوں کشمیر کی پامالی کا راز منکشف ہو جانے پر خود اس کے لوگ درگزر پر تیار نہیں ہوئے لہذا اس کو غداری کی سزا دی گئی۔

اس کے بعد شمس چک نے بغاوت کی، کئی لڑائیاں ہوئیں آخر بزرگوں نے بیچ میں ہڑ کر صلح کرادی۔

لیکن عصبیت کشمیریوں کے خمیر میں داخل ہو چکی تھی۔ سری نگر میں کئی قاضی موسیٰ پیدا ہو گئے، شیعہ سنی فساد عروج پر پہنچ گیا۔ میر شمس الدین عراقی کی خانقاہ جلا دی گئی اور منصوبے کے مطابق شیعوں کا قتل عام کیا گیا۔

بعض قبیلے کھلی بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور یعقوب شاہ اندورنی اور علاقائی خلفشار میں پھنس کر رہ گیا۔

کشمیر میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ کشمیریوں کے لئے نیا ہویا پرانا لیکن شیعوں کے لئے یہ ان کی تاریخ کا ایک باب تھا جو اب کشمیر میں کھل رہا تھا اور نہ اس سے قبل ایشیا کے کسی حصے میں ان کا وجود برداشت نہیں کیا گیا، کوئی شیعہ حکومت کے کسی عہدے پر فائز ہوا تو اس کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں اور وہ انجانے الزامات سے ختم کیا گیا اور اگر کہیں کوئی حکومت بن گئی تو بغاوتیں اس کا مقدر رہیں۔

سنی اقتدار میں تو وہ اپنا نام بھی کھل کر بتانے کے قابل نہ تھے اور خود ان کا اقتدار تو وہم و گمان میں بھی گزر نہ سکتا، گویا وہ ہمیشہ مظالم کا شکار ہونے ہی کے لئے پیدا ہوتے رہے تھے۔

بغداد کا بویہی دور شاید ہے کہ لاکھ انصاف درواری سے حکومت کی گئی مگر نت نئے فتنے اٹھتے ہی رہے اور جہاں موقع ملا، بیدریغ شیعہ کشی کی گئی۔ شیعوں کو کبھی سکون میسر آیا تو کسی غیر جانبدار حکومت میں..... اور سنی حکومتوں میں پہلے تو دو صدیوں تک انہوں نے تقیہ میں بسر کی، وطن چھوڑ چھوڑ کر دور دراز علاقوں میں چلے گئے پھر اتنے گمنامی میں پڑے کہ بزرگ اپنے پس ماندگان کو اپنی حقیقت بھی بتانے سکے اور نسلوں کی نسلیں سنی ہو گئیں۔

فی زمانہ جن مقامات پر سنی حکومت ہے وہاں روزیہ سوال اٹھتا ہے کہ



خود اکبر کی طرف سے صرف ایک شرط رکھی گئی جو ان لوگوں نے بڑی خوشی سے تسلیم کر لی۔ بالفاظ دیگر اہل کشمیر کی نسلوں کا سودا کر لیا۔ اکبر نے ان سے منظور کیا۔ "کشمیریوں میں سے کوئی بھی ہتھیار استعمال نہ کرے۔"

اور نہ سپاہ گری کا پیشہ اختیار کرے۔" (۳۵)

شیعہ دشمنی میں مادر وطن کو بیچ کر سنی وفد بہت خوش ہوا کہ اب چک قبیلے یخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے جائیں گے اور شیعوں کی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔

ان کا یہ مقصد تو کسی حد تک پورا ہوا لیکن ناعاقبت اندیشوں نے ہمیشہ کے لئے طوق غلامی بھی پہن لیا۔

### کشمیر کی قسمت کا فیصلہ

شہنشاہ اکبر نے قاسم میر بحر کی سرکردگی میں ایک لشکر جہاز روانہ کر دیا جس کی رہنمائی یہ قوم فروش کرتے رہے اور انہوں نے اس کو کشمیر کی سرحد تک پہنچا دیا۔ اندر کے انتظامات پہلے ہی ہو چکے تھے، متعصب سنی قبائل بھی اس لشکر سے آئے۔

یعقوب شاہ اطلاع پا کر مقابلے کے لئے نکلا تو راستے ہی سے اسکے سنی سردار اور سپاہی ٹوٹنے لگے پھر بھی وہ دل شکستہ نہیں ہوا۔ شاید وہ اس کے لئے پہلے سے تیار اس نے یوسف چک، ایہہ چک اور سید ابراہیم کو روکنے کے لئے متعین کیا مگر ان کے سپاہی دشمنوں سے جا ملے۔ مجبوراً وہ واپس آئے۔ بہرام نیایک اور شنگی نیایک جو دوسرا راستہ روکنے کے لئے تعینات ہوئے تھے، انہوں نے بھی غداری کی النبتہ قاسم نیایک اور حسین چک نے پیر پنچال کے راستے مغل ہراول پر سخت حملے کئے۔ قاسم نیایک جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بیٹے ظفر نیایک نے تابڑ توڑ حملوں سے دشمن کے پروں میں تھلکہ ڈال دیا اور وہ لڑتے لڑتے گر گئے اور کشمیر کا حق ادا کرتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔

یعقوب سے جب مغل افواج کا مقابلہ ہوا تو اس کی سپاہ داد شجاعت دے

رہی تھی مگر ساتھیوں کی بے وفائی سے اس کا دل ٹوٹ گیا، یعقوب خود قلب لشکر میں تھلہ کسی ضرورت سے گھوڑے سے اترا کہ ایک تیر گھوڑے کو آکر لگا اور وہ بدک کر سپاہیوں کی طرف بھاگا۔ سپاہی گھوڑے کو خالی دیکھ کر سمجھے کہ یعقوب قتل ہو گیا اس کے بعد ان میں لڑنے کی سکت نہ رہی اور وہ میدان سے فرار ہو گئے لگے یعقوب میدان سے بھاگ کر اپنے خسر راجہ کشنوار کے پاس پہنچا اس کی بے رخی سے مایوس ہو کر پرگنہ برنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مغل فوج سری نگر پر قابض ہو چکی تھی مگر یعقوب شاہ بھی ہار مان کر بیٹھنے والا نہ تھا اس نے کشمیری حمیت کو لکارا اور دیکھتے ہی دیکھتے جیالوں کا ایک گروہ اپنے گرد جمع کر لیا پھر ان میں بعض قبائل بھی شامل ہو گئے۔

پھر اس نے سری نگر میں داخل ہو کر مغل فوج پر حملہ کیا اور مغربی علاقے کے چند مکانات میں آگ لگا دی۔ مغل سپاہی گھبرا کر باہر نکلے تو انہیں قتل کر دیا۔ کشتوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اس درمیان اس نے اپنے سپاہیوں کو خزانہ لوٹنے کی اجازت دے دی اور نورنگ خان کو قید کرنے والوں کو قتل کر دینے کا حکم دیدیا۔ اس سے اس کے قریب کی جمعیت میں کمی واقع ہو گئی ایسے میں قاسم میر بحر کو موقع مل گیا اس نے سنبھل کر حملہ کر دیا اور یعقوب کی فتح شکست میں بدل گئی۔

اس دوران سردی کا موسم شروع ہو گیا اور لڑائی بند ہو گئی۔ قاسم میر بحر نے نامہ و پیام سے یعقوب شاہ کے کئی سردار توڑ لئے۔ گرمیاں شروع ہوتے ہی یعقوب نے اپنی طاقت کو مجتمع کیا۔ اس کی خبر ملتے ہی میر بحر نے سات آٹھ ہزار فوج چند سرداروں کے ساتھ مقابلے کے لئے روانہ کی۔ ڈکون میں سخت لڑائی ہوئی۔ اتفاق سے بارش ہو گئی، یعقوب شاہ نے مغلوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔

اس کے بعد مغل سری نگر سے باہر نہیں نکلے۔ آخر ایک دن قاسم میر بحر پوری فوج مقابلہ پر لے آیا۔ صبح سے شام تک لڑائی ہوتی رہی۔ مغلوں کے پاؤں اکھڑنے ہی والے تھے کہ یعقوب کے سپہ سالار نورنگ کی آنکھ پر ایک تیر آکر لگا اور وہ گھوڑے سے گر گیا اس سے یعقوب کے سپاہی ہمت ہار کر پیچھے ہٹنے لگے پھر بھی یعقوب نے اپنا پڑاؤ اس مقام سے نہیں ہٹایا۔



شمس چک یعقوب شاہ کا حلیف تھا لیکن اس جنگ میں وہ دور کا تماشائی بنا رہا۔ یعقوب شاہ نے اس سے شکایت کی تو اس نے کہلا بھیجا کہ یعقوب اپنا لشکر لے کر ہانچک چلا آئے تو دونوں مل کر لڑیں گے۔ یعقوب اس کے کہنے کے مطابق اس سے جا ملا اور دونوں نے مل کر مغلوں پر حملہ کر دیا۔

گھمسان کارن پڑا۔ اس لڑائی میں حسن ملک ندی نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ مغلوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں شکست کے آثار دیکھ کر میر بخر نے ہاتھیوں کو آگے بڑھا دیا۔ حسن ملک نے تیروں کی بوچھاڑ کر کے انکو الٹا بھگا دیا اور ہاتھیوں نے اپنی فوج کو روند ڈالا۔ مغلوں کو عبرتناک شکست ہوئی اور انہوں نے سری نگر پہنچ کر دم لیا۔

مغلوں پر بڑا سخت وقت تھا۔ وہ سری نگر میں بھی محفوظ نہ تھے۔ قاسم میر بخر نے اکبر کو حالات کی خبر دی۔ اس نے ایک فوج قہار مرزا یوسف خان کی سرکردگی میں کشمیر روانہ کی اور محمد بٹ اور بابا خلیل کو بھی ساتھ کیا۔

محمد بٹ شاہان چک کا وزیر رہ چکا تھا اور بابا خلیل شیعہ رہتا تھا۔ اکبر نے ان کو ساتھ اس لئے کیا تھا کہ موقع پڑنے پر صلح و صفائی کی سعی کر سکیں۔

شمس چک نے اپنے بھائی لوہر چک کو مرزا یوسف کے مقابلے پر بھیجا مگر وہ لڑنے کے بجائے یوسف مرزا سے جا کر مل گیا اس سے سپاہیوں میں بڑی بددلی پیدا ہوئی اور ان میں لڑنے کا حوصلہ ختم ہو گیا۔

شاید اس میں شمس چک کا لہاء بھی شامل تھا جس کو محسوس کر کے یعقوب شاہ کشنوار چلا گیا۔

دوسری بار واپس ہو کر اس نے پھر لشکر جمع کیا۔ محمد بٹ نے مغلوں کی طرف سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی، دوسرے مقابلے میں یعقوب پسپا ہوا کیونکہ اس کے اکثر سپاہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

مرزا یوسف کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جب تک یعقوب شاہ زندہ ہے، اس کی مداخلت جاری رہے گی اس لئے اس نے نرم رویے کے وعدے پر یعقوب شاہ کو

ہتھیار ڈال دینے کی پیش کش کی۔ یعقوب کی قوت ختم ہو چکی تھی اس لئے شہنشاہ اکبر کے سری نگر پہنچنے پر وہ دربار میں حاضر ہو گیا۔

اکبر نے اس کو دہلی بھیج دیا جہاں سے وہ راجہ مان سنگھ کے حوالے کر دیا گیا اور باپ کی طرح قلعہ رہتاس میں نظر بند کر دیا گیا۔ بظاہر وہ بے دست و پا تھا پھر بھی شیر کے پنجرے سے باہر نکل آنے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے اس کو زہر دلوادیا گیا اس طرح کشمیری شجاعت کا آخری پرچم بھی سرنگوں ہو گیا۔

کشمیر میں اب کوئی مغلوں کے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکتا پھر بھی بعض سوراؤں نے جدوجہد آزادی برقرار رکھی جو ۱۶۲۱ء تک جاری رہی البتہ اس کے بعد کوئی شیعوں کی فریاد سننے والا نہ رہا۔

کلمتی چک اور دولت چک کے بعد یعقوب شاہ کشمیر کی بہادری کا علامہ تھا اکبر نے دوبار خود اس کا امتحان کیا۔ ایک مرتبہ بغیر ہتھیار ایک مست ہاتھی سے لڑوا دیا۔ یعقوب شاہ نے سرعت کے ساتھ پیچھے جا کر اس کی دم پکڑ لی اور اس وقت تک اس کو کھینچتا رہا جب تک وہ جڑ سے اکھڑ نہیں گئی۔

دوسری بار ایک سرکش راجہ کو تنہا اسکو بھیج کر زندہ گرفتار کرایا۔ وہ حقیقتاً یعقوب سے خائف تھا کہ کہیں وہ کشمیر پہنچ گیا تو کشمیر کی بغاوت دبانے مغلوں کے بس کی بات نہ ہوگی لہذا وہ اسکو مروا دینا چاہتا تھا لیکن یعقوب شیر تھا اس کے لئے ایسے خطرے سے کھیلنا معمولی بات تھی۔ اکبر کی یہ تدبیریں کارگر نہ ہوئیں تو قاسم میر بخر نے یعقوب کو زہر دلوادیا۔

### انتقام کا دھارا

کہا جاتا ہے کہ بہادر بہادر کی قدر کرتا ہے لیکن کشمیر میں مغلوں کی حکومت کا آغاز ظلم و ستم سے کیا گیا۔

مغلوں کی کامیابی ہر اعتبار سے سنی علماء و عمائدین کی رہیں منت تھی جن کی سازشوں سے چک بادشاہ کے حلیف اس سے غداری کر کے مغلوں کے شریک ہوئے تھے۔ مغلوں نے ان سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق پہلے چک بادشاہوں کے محلات کو مسمار کیا جو بلند و بالا پہاڑیوں کے دامن میں بنے ہوئے تھے اور کشمیر



ٹکانا تھا لہذا پہلے اس نے بالادستوں پر ہاتھ صاف کیا پھر زیر دستوں کی توانائی خون چوس کر ٹکالی تاہم اسنا تو ضرور ہوا کہ مقامی لوگوں میں سے جس کسی کو ضرورتاً استعمال میں لایا، وہ سنی تھا۔

شیعہ منظر عام سے ہٹ گئے، اکثریت تقیہ کی سی صورت میں گنہگار ہو گئی اور ایک تعداد کشمیر چھوڑ کر چلی گئی۔

### چک بادشاہوں پر ایک نظر

ان کی شجاعت کی داستانیں آج بھی کشمیر کی وادیوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ ان کی تلواروں کی کاٹ کا لوہا اکبر کے دربار میں بھی مانا گیا۔ کشمیر برتسلط کا سوال نہ ہوتا تو شاید مغل شہنشاہ ان پر اتنے مظالم کو روا نہ رکھتا اور وطن کشمیر سے محبت ان کی کمزوری نہ ہوتی تو یوسف شاہ اور یعقوب شاہ پر اکبر اعتماد کر لیتا اور اس کے جرنیلوں میں کئی ناموں کے اضافے ہو جاتے۔

کشمیر میں شیعہ علماء کا سلسلہ سید علی ہمدانی سے شروع ہوا تھا جو آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ اسکے بعد سید محمد ہمدانی، سید محمد مدنی، سید حسین قمی، میر شمس الدین عراقی وغیرہ نے خود کشمیر میں اتنے علماء پیدا کر دیئے کہ ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے اور چک دور حکومت میں تو اتنی سرپرستی کی گئی کہ کشمیر کے علماء گنتی میں عراق و شام سے زیادہ کم نہیں رہے۔ بابا خلیل اللہ، بابا مہدی، شیخ حسن، حافظ بصیر، ملا حسن اسود اور ملا عینی وغیرہ نامور اور متبحر عالم کزرے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ عالم ایسے بھی تھے جو مختلف زبانوں کے شاعر تھے جیسے امیر علی، ملا نامی اول، ملا نامی دوم، بابا طالب اصفہانی، ملا احمد مہری، ملا محمد امین مستغنی، مرزا علی خان، حسین شاہ چک، علی ملک چک، محمد ملک چوڈری، بادشاہ یوسف شاہ، ملکہ جہ خاتون وغیرہ۔

چک حکمرانوں میں اکثریت کا نظم و نسق بہت اچھا تھا۔ عوام کی سہولت کے خاص انتظامات تھے، تعلیم کے لئے ہر گاؤں، ہر محلے میں درسگاہیں تھیں جن کے اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی، کالمین فن کی سرپرستی کی جاتی تھی، خطاطی عروج پر تھی۔

کی سطوت ماضی کے آئینہ دار تھے، پھر دوسری عالیشان عمارتوں کو کھدوایا۔ آخر میں شاہی مقبرے کو نیست و نابود کیا اور ان کے تراشیدہ پتھر وہاں سے اٹھا کر مسجدیں تعمیر کیں۔ انسانوں کے مزارات میں استعمال کی ہوئی چیزوں سے خدا کے گھر کی تعمیر کی جو شاید داخل ثواب ہوگا۔

اس کے بعد چک سردار مختلف بہانوں سے بلائے گئے اور تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بہرام خان اور اس کے بیٹوں کو زہر دلوادیا۔ یوسف خان، علی خان اور ابراہیم خان وغیرہ کی آنکھیں نکلوا دیں۔ مختلف حیلوں سے کئی مرتبہ شیعوں کا قتل عام کرایا پھر ان چک سرداروں پر توجہ کی جنہوں نے اپنی قوم سے غداری کی تھی اور مغلوں کے دوست بن گئے تھے۔ ان میں سے اکثر کو آگرہ بھیج دیا جن میں شیر علی ماگرے، یوسف خان، ابراہیم خان، شمس چک، شمس دونی، سید حسین خان، ہستی، علی ڈار، اسماعیل دولی وغیرہ شامل تھے۔

قصر حکومت کی بنیادوں میں شیعہ رہنماؤں کا خون دینے پر اکتفاء نہیں کی گئی بلکہ اس کی دیواروں پر شیعہ عوام کے خون سے نقش و نگار بھی بنائے گئے اور اس خدمت کو بعد کے صوبہ داروں نے انجام دیا۔ چک آبادیاں ویران کر دی گئیں اور بچے کچے سردار ترک وطن کر گئے۔ اس طرح سنی اکابرین کا یہ مطالبہ پورا ہو گیا کہ چک قبائل کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔

پھر شیعوں کو معیشت کی موت مارا گیا، تلوار ان سے چھین لی گئی تھی، ملازمت کے دروازے بھی بند کر دیئے گئے۔ مجبوراً رزم آزمائے قبائل کی اولاد اکل حلال کے لئے دست کار بن گئی تاہم بادشاہوں کی اولاد کوئی نیچا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔

یہ ہوا انجام اس شجاع قوم کی نسلوں کا جن کی تلواروں کی جھنکار کشمیر کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر آج بھی سنائی دیتی ہے اور جن کے خون کی آبیاری سے آج بھی پہاڑوں کی وادیوں میں گل لالہ جیسے پھول لگتے ہیں۔

سنی ابتدا بہت خوش ہوئے کہ انہوں نے اپنا انتقام لے لیا لیکن پھر ان کی باری بھی آگئی کیونکہ اکبر سنی سے زائد ایک حکمران تھا اس کو تو کشمیریوں کا دم خم



دسویں صدی ہجری کے اختتام اور سولہویں صدی عیسوی کی آٹھویں دہائی میں چک حکومت کا خاتمہ ہوا اور کشمیر میں مغل سلطنت کا سورج طلوع ہوا۔ کشمیر کے مدعیان حکومت باقی تھے۔ وہ مختلف مقامات پر مغل فوجوں سے ٹکر لیتے رہے مگر اس کا کچھ حاصل نہ ہوا۔ مغل سلطنت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی اور دلی و اگرہ سے مغل صوبیدار بدل بدل کر آتے جاتے رہے۔

قیام حکومت کے لئے مغلوں کی سازش ہو یا خود کشمیری سنی دلوں کا غبار ٹکانے کے لئے ایسا کرتے ہوں مگر عملی طور پر یہی ہوا کہ جب کوئی سنی صوبیدار دلی سے متعین ہو کر سری نگر آیا تو فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ پھر بھی اب پہلے جیسی فضاء نہیں تھی شیعوں کا فرقہ اب کبھی کبھی اطمینان کی سانس لے لیتا تھا لیکن اس کے پینپنے کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔

اس طرح ٹیڑھ سو سال گزر گئے۔ مغل حکومت کمزور پڑ گئی اور ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ درانی نے کشمیر فتح کر لیا اور ۱۷۵۶ء میں وہ بلند خان سروزی کو عامل کشمیر بنا کر خود واپس ہو گیا۔ کشمیر پر افغان حکومت کا دورانیہ ساٹھ برس سے زائد کا نہیں ہے۔ اس عرصے میں افغانوں کی طرف سے دو شیعہ صوبیدار بھی آئے مگر کشمیر کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی رہی۔

محمود شاہ اور شجاع الملک اپنی حکومتیں قائم کرنے کے لئے باہم لڑتے رہے مگر دونوں میں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔۔۔ اور فتح خان بارکزی نے ۱۸۱۳ء میں رنجیت سنگھ والی پنجاب کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔

کشمیر کے سنی شیعہ ان زمانوں میں لڑے مگر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ سنی غلبہ بڑھ چکا تھا کیونکہ اس عہد کے سکے پر کسی بادشاہ کے بجائے ایک مقبول دلی نور الدین کا نام کندہ ہے..... محمود شاہ انتشار سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ بن گیا تھا تاہم اصل حکومت بارکزی سرداروں کی تھی۔

یہ صورت حال چلنے والی نہ تھی۔۔۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ۱۸۱۹ء میں

رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کر دیا اور اس کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ رنجیت سنگھ کسی حد تک منصف مزاج حکمران تھا لیکن ہری سنگھ کشمیر کا صوبیدار بنا تو اس نے اہل کشمیر پر بڑا تشدد کیا۔

صدیاں گزر گئی تھیں سنیوں اور شیعوں کو لڑتے ہوئے اس سے سنیوں کو یہ فائدہ تو ہوا تھا کہ کل کے حکمران طبقے کو خستہ حال بنا دیا تھا مگر سکھوں کی چکی میں پسے کا وقت آیا تو دونوں چکنا چور ہو گئے۔ ظالم و مظلوم، جارج اور مجروح کے صرف حروف اصلی رہ گئے اور ان کا استعمال خود انہیں پر ہونے لگا..... مگر ابھی تو صرف آغاز ہوا تھا، مسلمانوں کو اس سے کہیں زائد صبر آزمایا حالات سے گزرنا تھا۔

### ڈوگرہ

جموں کی پہاڑی ریاست کے دعویدار اس زمانے میں تین بھائی تھے جو راجپوت تھے اور ڈوگرہ کہلاتے تھے: دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور بھیت سنگھ۔ رنجیت سنگھ نے دھیان سنگھ کو اپنی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا اور گلاب سنگھ جموں پر قابض ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۰ء میں اس کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا لیکن اس سے قبل گلاب سنگھ کشتوار، لداخ اور بعض دوسرے پہاڑی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا۔

۱۸۲۹ء میں رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا تو گلاب سنگھ نے اپنی ریاست میں اضافہ کر لیا۔

رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں میں جو انتشار پیدا ہوا، اس میں ایک طرف انگریزوں نے فائدہ اٹھایا، دوسری طرف گلاب سنگھ اپنی طاقت مضبوط کرتا رہا اور انگریزوں سے جب سکھوں کی جنگ ہوئی تو اس نے ثالثی کا کردار ادا کیا۔ پھر معاہدے کی رو سے دو آہ کی حکومت اور پندرہ لاکھ اشرفی تاوان جنگ سکھوں پر عائد ہوا۔ سکھ صرف پانچ لاکھ دینے کے حالات میں تھے، دس لاکھ گلاب سنگھ نے ادا کر دیئے اور اس کے عوض کشمیر کی حکومت سکھوں سے حاصل کر لی۔

حاکم کشمیر امام الدین نے قبضہ دینے سے انکار کیا اور گلاب سنگھ کی فوجوں کو شکست فاش دی تو اس نے انگریزوں کی مدد حاصل کی اور قبیلہ چک کی سرزمین پر



اپنا پرچم لہرا دیا۔

پچھلے سو برس کشمیر کے مسلمانوں پر بڑے سخت گزرے تھے مگر اب جو دور آیا اس میں انہیں سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔

گلاب سنگھ ۱۸۵۷ء میں مر گیا اور اس کا بیٹا رن بیر سنگھ تخت پر بیٹھا تو وہ باپ سے زیادہ ظالم ثابت ہوا۔ اس نے ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا۔ ۱۸۷۷ء میں قحط پڑا تو تین سال مسلمان کسانوں کے لئے سب سے زیادہ سخت تھے۔ پھر زلزلہ آیا ۱۸۸۵ء میں رن بیر سنگھ کا بیٹا مہاراجہ پرتاب سنگھ کشمیر کا حکمران ہوا تو اس نے مسلمانوں پر قیامت ہی ڈھادی۔ اس پر انگریزوں نے مداخلت کی اور ۱۸۹۲ء میں برطانوی ہند کے اصول پر مالیائے کا تعین ہوا مگر ذرائع نقل و حمل نہ ہونے کے سبب اس سے مسلمانوں کو زیادہ فائدہ نہ پہنچ سکا..... یہ اس علاقے کی بات ہے جس کی ۹۴ فیصد آبادی مسلمان تھی اور ۹۴ فیصد ۶ فیصد کے غلام بنے ہوئے تھے۔ یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہی جب تک چودھری غلام عباس اور شیخ عبداللہ نے ۱۹۳۱ء میں اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی اور اہل کشمیر میں آزادی کا شعور پیدا نہیں کیا۔

کشمیر کی تاریخی داستان بھی عراق و ایران اور شام سے مختلف نہیں۔ اس سرزمین پر بھی آپس کی جنگ آزمائی نے اہل اسلام کو اس درجے تک پہنچا دیا۔ کون ظالم تھا کون مظلوم، اس کا فیصلہ تو حال کے تنازعات میں نہیں ہو سکتا پھر بھی یہ ضرور ہے کہ کشمیر کی عظمت میں شیعوں کا بڑا حصہ ہے اور انہیں دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کا کشمیر کیا تھا؟

### شیعوں کی خانقاہیں اور مساجد

چک خاناندان کی عمارتیں اگرچہ زمانے سے ناپید ہو چکی ہیں مگر جن کے آثار باقی ہیں، ان سے شان و شکوہ کا ایک اندازہ ہو سکتا ہے۔ جن خانقاہوں نے شیعیت کی تبلیغ و اشاعت کی مہمات انجام دیں، ان کے نام لئے جاسکتے ہیں، خانقاہ سید محمد مدنی، خانقاہ میر شمس الدین عراقی، خانقاہ بابا حسن، حسن آباد، خانقاہ بابا خلیل وغیرہ۔

مساجد میں ہتھر مسجد، مسجد حسن آباد، مسجد حلی عیدی اور مسجد بڈگام قابل ذکر ہیں۔

امام باڑوں میں چڈبیل، امام باڑہ حسن آباد، امام باڑہ بڈگام اور امام باڑہ احمد پورہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

باغات میں صرف شاہ حسین اور یوسف شاہ کے لگائے ہوئے باغات قدیم دور کی یادگار ہیں جن میں ملکہ نور جہاں آصف خان، صادق خان، علی مردان خان، کفایت خان، امیر خان جواں شیر نے اپنے اپنے باغات کا اضافہ کیا۔

اس طرح کشمیر کی دلکشی بڑھانے میں شیعوں کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ شیعیت کی توسیع میں سید علی ہمدانی کے بعد سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں عالم اس سرزمین پر وارد ہوئے، انہوں نے عمریں مسلک آل محمد کی ترویج میں صرف کر دیں، خود کشمیری علماء ان سے زائد ہیں۔

ہمدانی خاندان کے چند نام ہیں: ملا عبدالرشید، ملا محمد صادق، ملا طالب، ملا غالب، ملا عبدالغنی۔

انصاری خاندان کا ذکر ملا عالم انصاری سے شروع کیا جائے تو ملا محمد، ملا افضل علی، ملا محمد جواد، ملا عبداللہ، مولوی حیدر علی، کتنے ہی اسمائے گرامی ہیں جن کی دینی خدمات لوح زمانہ پر ثبت ہیں۔

تیسرا خاندان موسوی ہے جن میں آغاسید مہدی، آغاسید محمد، آغاسید علی، آغا شیخ علی اصغر، حاجی سید حسن رضوی، آغاسید محمد وغیرہ لتنے گرانقدر نام ہیں جن کے مماثل مشکل سے ڈھونڈھے جاسکتے ہیں۔

شعراء میں صرف جلی نام لئے جائیں تو ان میں سے بعض کو مشاہیر ایران کی صف میں کھرا کیا جاسکتا ہے۔ ان میں غزل گو بھی ہیں اور مرثیہ گو بھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں ہر صنف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ کشمیر میں اطمینان کی زندگی میر آسکتی تو لقمان کی عقل ان کے پاس موجود تھی۔ فارسی کی بساط ادب پر وہ لتنے گہرے نقوش چھوڑ جاتے کہ حافظ شیراز کی طرح شاعر کشمیر کہلاتے لیکن بد نصیبی سے ان کا حال بھی سرزمین کشمیر جیسا ہوا اور انہیں اس کا موقع نہ مل سکا کہ جریدہ عالم پر مہر دوام لگا سکتے! (۴۶)



لبیک کہنے کا انداز معجزانہ ہے..... مورخین نے حجاج کا کردار پیش نظر رکھے بغیر جو کچھ کان میں ڈالا گیا اسکو قلم بند کر دیا اور وہی تاریخ بن گیا، جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ حکومت واقعہ کی نوعیت اپنی مصلحتوں کے مطابق بیان کر دیتی ہے اور پھر اسی کو شہرت ہو جاتی ہے اور ایک دور گزرنے کے بعد دوسرے دور میں اسی کو اصل واقعہ تصور کر لیا جاتا ہے۔

جہانیک حجاج کا تعلق ہے، بنی امیہ کے پورے عہد سے چند سفاک ترین حکمران منتخب کیے جائیں تو ان میں حجاج سر فہرست ہوگا۔ اسکی سیرت ظلم و جور کی داستانوں کا مجموعہ ہے۔ ایسے شخص سے کوئی انصاف اور فریاد رسی کی توقع کیا کر سکتا پھر عورت نے حجاج ہی کو کیوں پکارا اور اس انداز سے جیسے کوئی کسی ولی اللہ سے مدد چاہتا ہو۔

فریاد اے حجاج!

اور جواب بھی ویسا ہی ملا

”ہاں میں آیا!“

شاید ستر ہزار سادات کا خون پی کر حجاج میں کراماتی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی اور ایک دل درد مند و دیعت ہو گیا تھا کہ وہ ایک عورت کی فریاد سے تڑپ اٹھا اور تسخیر سندھ کا عزم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔..... جیتے جاگتے بے گناہ انسانوں کی زبانیں کٹولینے والا اور اپنے سامنے زندہ انسانوں کی آنکھیں نکلوا کر ترہتا چھوڑ دینے والا اسقدر رحم دل ہو گیا تھا کہ ایک عورت کی بے چارگی برداشت نہ کر سکا۔

عجیب ستم ظریفی ہے کہ منتخب بھی کیا گیا فریاد رسی کیلئے تو ایسے ظالم کو، عراق و عرب کی عورتیں جس کا نام لے کر بچوں کو ڈراتی تھیں اور بچے واقعی ڈر کر ماں کی گودوں میں چھپ جاتے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ حجاج بچوں کو ماں کی گودوں سے چھین کر بھی ذبح کر دیتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ حملے کا جواز پیدا کرنے کیلئے ایسی کسی توجیہ کی ضرورت ہی کیا تھی اور کچھ کہنا ہی تھا تو حجاج کے بجائے ولید بن عبدالملک کا نام چسپاں کر دیا جاتا جو یقیناً فتاح عالم بننے کیلئے ساری دنیا کو

## سندھ

محمد بن قاسم کا حملہ سندھ میں مسلم اقتدار کا نقطہ آغاز ہے، راجہ داہر سے جنگ اور تسخیر سندھ مسلم جرنیلوں کی مدبرانہ شجاعت کا کارنامہ ہے۔

حملے کا سبب بیشتر مورخین نے ایک ہی لکھا ہے:- ”ایک مسلمان تاجر لنکا میں وفات پا گیا تھا۔ اسکی بیوہ عورت یتیم لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ لنکا کے راجہ نے انکو بڑے آرام سے مع تحفہ و ہدایا کے ایک جہاز پر سوار کر کے خلیفہ کے پاس روانہ کر دیا اور اسی وساطت سے اس نے چاہا کہ خلیفہ سے رسم اتحاد بڑھائے۔ اس جہاز میں کچھ حلئی بھی تھے۔ یہ جہاز جب سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل کے قریب پہنچا تو سندھی قزاقوں نے اسکو لوٹ لیا۔ یہ سندھ کی مشہور قوم نیز کے لوگ تھے۔ ان قزاقوں نے دیبل کو جائے پناہ بنا رکھا تھا اور اس طرح اکثر جہازوں کو لوٹ کر دیبل چلے آتے تھے۔

ان قیدیوں میں سے ایک عورت قبیلہ ربوع کی بے اختیار پکار اٹھی۔

”فریاد اے حجاج!“

جب اسکی خبر حجاج کو ہوئی تو وہ غصے کے مارے بے تاب ہو گیا اور اہتہائی جوش میں کہہ اٹھا۔

”ہاں میں آیا!“

اس واقعہ سے حجاج کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے سندھ فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ (۳۷)

تاریخوں میں ایک تو اتر سے اس عورت کی فریاد نقل کی گئی ہے اور بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب یہ آوازیوں ان شاہی سے نکل رانی تو حجاج کہہ اٹھا۔

”ہاں میں آیا!“



زیر نگین کر لینا چاہتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ حجاج کی نظریں ایک عرصے سے سندھ پر لگی ہوئی تھیں جو اس زمانے میں سادات کی پناہ گاہ بن گیا تھا۔

رسول کی اولاد میں جو لوگ تقیہ میں چلے جاتے اور اپنے ہی وطن میں اجنبی بن جاتے ان میں سے بیشتر بچ جاتے، باقی موقع محل سے ترک وطن کرتے رہتے۔ ان میں مصر و مرقش اور غیر معروف علاقوں کے علاوہ کرمان و سندھ بھی تھا جو وقت کے بیرحم لوگوں کی دسترس سے باہر تھا۔

ان علاقوں سے اہل بیت کا ایک رابطہ عرصے سے قائم تھا۔ حضرت عمرو حضرت عثمان کی تسخیری مہات میں جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مختصر عہد میں سیستان و کرمان کی سنگلاخ زمینیں اور سندھ کے ریگزار سقیفہ بنی ساعدہ سے زائد خانہ سیدہ زہرا کی تجلیوں سے آشنا ہو چکے تھے اور سادات کے ترک وطن سے اس میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن شکاری کی نظریں بھی شکار کی نقل و حرکت پر لگی ہوئی تھیں۔ حجاج عورت کی فریاد پر تڑپا ہوا یا نہ تڑپا ہو مگر جب سینے میں آتا کہ بیس پچیس آدمیوں کا ایک قافلہ فلاں جانب نکل گیا تو وہ ضرور تڑپ اٹھتا اور اسکو ایک فکر سی لاحق ہو جاتی کہ اتنے سادات یا محبان علی بچ گئے۔

سادات کی پناہ گاہوں میں سندھ اسکی دست رس سے دور تھا لہذا اسکے بارے میں اکثر سوچتا رہتا اور کوئی نہ کوئی منصوبہ بناتا رہتا۔

### سندھ اور اہل بیت

تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اہل بیت کرام سے سندھ کا تعارف حارث بن مرہ عبیدی کے حملے سے ہوا اس سے قبل دو فوجی مہمیں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھیجی گئی تھیں لیکن وہ سرحدوں سے واپس آگئی تھیں۔ عبداللہ ابن عباس کے فرستادہ جرنیل نے حسب ہدایت ان خارجیوں کا سراغ لگایا جنہوں نے کرمان میں باقاعدہ حکومت قائم کر لی تھی اور تیاری کر کے خلافت اسلامیہ پر نیا حملہ کرنا چاہتے تھے۔

حارث عبیدی نے انکو مار بھگا یا اور سندھ کے ملحق علاقوں پر حکومت قائم کر لی

"حارث نے مال غنیمت کے ساتھ ہندو اسیروں اور ایک ہزار کنیزیوں کو کوفہ بھیجا تھا۔ مرد قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور کنیزیں تقسیم کر دی گئیں۔ ان قیدیوں نے وطن واپس ہو کر آل رسول کی انسانیت کا ایسا بیان کیا کہ برہمنیت کے ستائے ہوئے انسان خود بخود اسلام کے گرویدہ ہو گئے اور ان میں بعض حارث بن مرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ ایمان ہو گئے۔ (۳۸)

یہ علاقہ موجودہ قلات کا تھا۔ حارث عبیدی نے اسی تسلسل میں سیستان و کرمان کے وہ علاقے بھی مسح کیے جس میں ایران کے مشہور بادشاہ فصحا کی اولاد حکومت کرتی تھی۔ حکمران کا نام مورخین نے شنسب لکھا ہے۔

شنسب کے کانوں میں اسلام کی انسان دوستی کا آوازہ پڑ چکا تھا۔ وہ خود بلوچستان سے چل کر کوفہ پہنچ گیا اور امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے اسلام قبول کر لیا۔

سندھ و ہند کی سرزمین پر شنسب پہلا شخص تھا جس نے جانشین پیغمبر کے ہاتھ سے سند حکومت پائی اور ایک علم حاصل کیا۔ یہ علم شنسب نے عراق سے واپس ہو کر اپنے تخت پر نصب کر دیا پھر ایک مسجد تعمیر کرائی اس میں حضرت علی ابن ابی طالب کا عطا کردہ فرماں آویزاں کیا۔ بالفاظ دیگر سندھ پر عظمت اہل بیت کا پرچم ہرا دیا۔ (۳۹)

شنسب نے اپنی حکومت اسلامی خطوط پر استوار کی تھی جو کئی نسلوں تک باقی رہی کہنے کو یہ ایک چھوٹی سی حکومت تھی لیکن اسکے نتائج دور رس نکلے اور شنسب کے عمل سے سندھیوں کے قلوب پر آل رسول کی صداقت کا سکہ بیٹھنے لگا۔ اس پر کوفہ سے واپس ہونیوالے قیدیوں کے بیانات! سندھ کے کچلے ہوئے انسانوں کے تصور میں خانوادہ رسالت کا تقدس ملکوتی بن گیا پھر جو بنی امیہ کا ستیا ہوا سید سندھ پہنچا تو ہر طرف اسکے لئے دیدہ و دل فرش راہ ہونے لگے۔

"شعیاز اسلام ان انڈیا" کی رو سے بحوالہ فتوح البلدان و تحقیق مولانا سید سبط الحسن ہنسوی، کوفہ میں بعض برہمنوں اور جاٹوں کا سراغ ملتا ہے جو حضرت علیؓ کے دور میں ہندوستان سے پہنچے۔ ان میں سے کتنے مشرف بہ اسلام ہوئے اور کتنے



اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے، اسکی کوئی تحقیق نہ ہو سکی۔ یہ واقعہ شنب کے وارد کو فہ ہونے کے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔

جاٹوں کے قیام کی مدت کئی برس معلوم ہوتی ہے کیونکہ جنگ کر بلا کے بعد دجلہ کے کنارے کچھ جاٹوں کے نمودار ہونے کی نشاندہی جسٹس امیر علی نے کی ہے ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض جنگ کر بلا میں شریک ہوئے ہوں اور پھر کسی نے سلیمان بن سرد خراسانی اور مختار ثقفی کی جنگوں میں بھی حصہ لیا ہو۔ اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے مگر ان کی وطن واپسی ایک عرصے کے بعد ہوئی اور جب وہ پلٹ کر گئے تو ان کے دلوں میں اہل بیت کی صداقت کا سکہ یقیناً بیٹھا ہوگا۔

غزنوی حملوں سے قبل پنجاب اور اسکے ملحق علاقوں میں ایسے لوگوں کی موجودگی ثابت ہے کیونکہ سادات بارہہ کے قبیلے کا جب پنجاب میں ورود ہوا تو کسی نے کسی مقام پر کوئی نہ کوئی ہم عقیدہ موجود ضرور تھا جسکی رہنمائی اور مشورے سے قبیلے کی ایک تعداد ٹولیوں میں بٹ کر مختلف علاقوں کی سمت آگے بڑھی۔

ایک قیاس یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں عجمان آل رسول کی موجودگی کے سبب سادات کے کسی گروہ نے سندھ کی طرح اس طرف بھی ہجرت کی ہو اور کسی ہندو راجہ نے انکی سپرت و حق منائی سے متاثر ہو کر انہیں اپنی پناہ میں رکھ لیا ہو۔ تاریخ کی روشنی میں اسکے بدیہات تاریکی میں ہیں لیکن حالات کے تحت اسکے امکانات پائے جاتے ہیں پھر بھی سندھ کی طرف ستم رسیدگان کی ہجرت مسلمات میں سے ہے جو تحقیقی دیدہ ریزی سے روشن سے روشن تر ہو رہی ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی کے ادائل میں ایک معروف شیعہ سید کے ملتان پہنچنے کا سراغ بھی ملتا ہے جو جعفر الملک کے نام سے ملتان کے حکمران ہوئے پھر انکی اولاد نے انسانیت و اخلاق کے وہ نمونے پیش کیے کہ ایک بڑی تعداد کو آل رسول کا حلقہ بگوش بنالیا۔

فرج سندھی، خالد سندھی اور آبان سندھی کے نام امام جعفر صادق کے تلامذہ میں لیے جاتے ہیں جن کا دینی تبحر درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا، جنہوں نے نویں اور دسویں صدی عیسوی میں سندھ سے پنجاب تک تعلیمات اہل بیت کی تبلیغ کی، اپنے

بعد شاگردوں کی ایک تعداد چھوڑ گئے۔ اشاعت اسلام کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور ترک وطن کر کے آنے والے اطراف و جوانب میں پہنچتے رہے، ان میں سے ایک بزرگ ملا محمد علی بھی شامل ہیں جن کا مزار گجرات میں بمقام کہے واقع ہے اور پیر پرواز کے نام سے موسوم ہیں۔ آپ اسمعیلیت کے داعیان اولین میں تھے اور مقامی زبان میں ہندوؤں کو درس دیا کرتے تھے۔ ایک بڑی تعداد کو انہوں نے دائرہ آل رسول میں داخل کیا۔

ملتان و سندھ میں اسمعیلیت کی تبلیغ اسکے بعد وقوع میں آئی لیکن سندھ عموماً اولاد فاطمہ زہرا کی پناہ گاہ بنا رہا جسکے شواہد تاریخ کی روشنی میں جا بجا پائے جاتے ہیں اور جسکے نام اتنے جلی ہیں کہ مورخین کی عصیت بھی انکو نظر انداز نہیں کر سکتی

اسکی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ سندھ میں ان کا خیر مقدم اس طرح کیا جاتا تھا کہ جد اعلیٰ کی سرزمین میں اپنی بے وقعتی کے احساس پر ان کے آنسو نکل آتے تھے بعض سندھیوں نے آباء و اجداد سے سنی ہوئی یہ روایت بھی بیان کی کہ سادات جس رستے پر گزر جاتے سندھی انکے نقش قدم کی خاک اٹھا کر محفوظ کر لیتے کہ اس سے گھر میں برکتوں کا نزول ہوگا۔

سندھ سے خانوادہ رسالت کے تعلق مزید میں یہ روایت بھی فراموش نہیں ہو سکتی کہ حضرت محمد حنفیہ کی والدہ گرامی حنفیہ کا تعلق بھی سندھ سے تھا۔ ان خاتون کا نام مورخین نے خولہ لکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ محمد حنفیہ کی ماں نہیں ہو سکتیں کیونکہ خولہ مال غنیمت کے ساتھ آئی تھیں اور حضرت علی نے ان سے عقد فرمایا تھا۔

بہر حال سندھ سے اہل بیت کے کئی نسلی روابط تھے۔ ایک ربط یہ بھی تھا کہ امام زین العابدین کی ایک زوجہ بھی سندھی تھیں جن کا اسم گرامی حمیدہاں تھا۔ حضرت زید شہید انھیں کے بطن سے پیدا ہوئے اور ان معظمہ کی بدولت اہل سندھ سے سادات کا رشتہ بہت مضبوط رہا۔ (۵۰)

خود امام زین العابدین کی نظر میں ایک رشتہ بہت زیادہ اہم تھا اور وہ رشتہ



انہیں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دریائے سندھ کے کنارے کھلے میدانوں میں پہنچے۔ ایک قافلہ راجہ داہر کے آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا جو اسکے دربار میں حاضر کیا گیا اور اس نے حقیقت حال راجہ کے سامنے بیان کر دی۔ پیشانیوں پر سجدے کی علامات اور بشرے پر جھلکتا ہوا نور ایمان ان کا گواہ تھا جو راجہ پر انکی صداقت کا اثر ڈالے بغیر نہ رہا۔ راجہ نے انہیں عمت و احترام سے رکھنے کی ہدایت کر دی۔

پھر وہ کئی بار اسکے سامنے حاضر ہوئے اور راجہ ان کے علم، زہد، پاکبازی سے متاثر ہوتا رہا۔ آخر اس نے انہیں اپنے درباریوں میں شامل کر لیا اور وہ سب اسکے معتمد بن گئے۔

اسکی خبر شدہ شدہ حجاج کو پہنچی تو اس نے ولید کی اجازت سے انکی واپسی کا مطالبہ کیا اور راجہ داہر کو لکھا کہ وہ اسکی حکومت کے باغی ہیں انہیں حوالے کیا جائے۔ بسینہ روایات سے سہ چلتا ہے کہ راجہ داہر نے اس مطالبے کا جواب بڑی نرمی سے دیا تھا کہ سندھ کی تہذیبی روایت اسکی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے مہمانوں کو دشمنوں کے حوالے کر دے پھر جب یہ معلوم ہے کہ یہ لوگ رسول عرب کی اولاد بھی ہیں اور بلند کردار بھی اور اتنا انہیں سندھی قومیت میں داخل بھی کر لیا گیا ہے لہذا انہیں عربوں کے حوالے کر دیا گیا تو سندھ کی زمین مجھ سے محاسبہ کرے گی اس لئے بڑی معذرت کے ساتھ مجبوری کا اظہار کیا جاتا ہے۔

سندھ کے بزرگ عالم اور سن کی عظیم خاتقاہ کے سجادہ نشین نے اپنی کتاب سندھودیش مطبوعہ جی ایم سید اکیڈمی (۵۶، ۵۷) میں اس واقعہ کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی معلومات کا ماخذ غالباً وہ کتابیں ہیں جو ان کے کتاب خانے میں موجود ہیں۔ "سندھودیش" کے اکثر حصوں سے اختلاف کے باوجود بعض حقائق قابل تسلیم ہیں، ان میں یہ واقعہ بھی ہے۔

بزرگ عالم نے محولہ سادات کے قافلہ سالار کا نام محمد بن علفی تحریر کیا ہے اور اسی کے ساتھ راجہ داہر سے بنی امیہ کے اختلاف کے بعض دوسرے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔

تھا آپ کی پرورش کرنیوالی خاتون کا جو سندھی تھیں اور جن کا نام تھا سلافہ۔

ایک روایت کے مطابق جناب شہر بانو کا انتقال ۳۴ھ میں امام زین العابدین کی ولادت کے وقت ہو گیا تھا اور اسکے بعد سے آپ کی دیکھ بھال سلافہ نے کی تھی۔

امام آپ کی بڑی عمت کرتے اور ماں ہی کی طرح سمجھتے تھے۔ یہ خاتون کر بلا میں بھی موجود تھیں۔ بعض مورخین نے شہدائے کر بلا میں ایک پنڈت کا ذکر بھی کیا ہے جو یقیناً ان ہی میں سے کسی خاتون کا قرا بتدار ہوگا۔ اس سے اس روایت کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ کئی سندھیوں نے امام کی طرف سے جنگ کی۔ ایک کو درجہ شہادت نصیب ہوا اور باقی سخت زخمی ہوئے۔ ان میں سے ایک دو بچ بچا کر سندھ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے مگر بسینہ روایات سے اسکی شہادت ملتی ہے کہ واقعہ کر بلا کی اطلاع سب سے پہلے سندھ پہنچی اور خاندان فاطمہ زہرا سے وابستگی کے سبب وہاں ایک کہرام مچ گیا اور کسی زخمی کے بچ نکلنے کا واقعہ صحیح مان لیا جائے تو چشم دید بیانات سے سندھ میں سید الشہداء کی پہلی صف ماتم پچھ جانا مسلم ہو جاتا ہے۔

بہر طور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سندھ میں ترک وطن کر کے سادات کا پہنچنا مسلم تھا اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا جو نہ ولید سے چھپا تھا اور نہ خون آشام حجاج سے جو ان دونوں کی ناگواری کا موجب تھا۔

سندھی بزرگوں میں ایک روایت بسینہ چلی آتی ہے کہ سادات چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہو کر اموی حدود سلطنت میں سفر کرتے اور سرحد پار کر کے ایک قافلے کی صورت اختیار کر لیتے پھر سیستان، بلوچستان اور مکران جہاں بن پڑتا وہاں اقامت اختیار کر لیتے۔ انکا تقدس و تقویٰ غیر مسلمین کو بھی ان سے نفرت نہ کرنے دیتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اپنا تعارف کراتے اور اسلام کا درس دیتے تو لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔

اور جو لوگ اسلام کی صداقت کو قبول نہ کرتے وہ بھی ان بزرگوں کی عظمت کو ضرور مانتے جن کی قبور اب بھی ان علاقوں میں جا بجا مرجع خلایق ہیں۔



سندھ میں نسلًا بعد نسل چلی آنے والی روایت اور جی ایم سید کا بیان اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جبکہ ماضی کی تاریخ میں بھی اور آج بھی یہی ہوتا ہے کہ کسی ملک کا آدمی دوسرے ملک میں پہنچ جائے تو اولاً ذکر ملک دوسرے ملک سے اسکی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے جیسا کہ خود سندھ کی تاریخ میں ابو جعفر منصور عباسی کے دور کا ایک واقعہ ملتا ہے کہ ہندو راجہ نے عبداللہ اشتر کو پناہ دی تھی تو منصور دوانیقی نے سزا دینے کیلئے اسرفوج کشی کرادی تھی۔

اسکے بعد محمد بن علفی کے واقعہ کو صحیح نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی۔ رہ گئی بات اس کہانی کی جسکو تاریخ بنا کر حجاج نے پیش کرایا ہے تو وہ حجاج کیلئے حملے کا جواز پیدا کرنے کی خاطر ایک گڑھی ہوئی بات بھی ہو سکتی ہے اور واقعہ بھی لیکن شبہات سے خالی نہیں کیونکہ مسبینہ تاریخ اسلام اکثر جھوٹی روایات پر مبنی ہے اور انہیں روایتوں کی بدولت آج اسلام کی بہتر صورتیں موجود ہیں اور ہر صورت اصلی ہونے کی دعوا یدار ہے۔

ان حالات میں سادات کا راجہ داہر کی پناہ میں آنا مسلم ہو جاتا ہے اور اسکو جھٹلایا نہیں جاسکتا تاوقتیکہ سادات کے ان مقابر کو کھدوانہ ڈالا جائے جن کا وجود ابتدائے دور بنی امیہ سے مکران و سندھ میں پایا جاتا ہے۔

اب سندھ میں بیان کی جانے والی اس روایت کو بھی مانتا پڑے گا کہ محمد بن قاسم سے جب راجہ داہر کا مقابلہ ہوا تو یہ سادات راجہ داہر کی طرف سے لڑے تھے اور ان میں کا ایک ایک آدمی میدان جنگ میں اپنے میزبان کو بچانے کیلئے شہید ہو گیا تھا۔ میزبان ہندو تھا یا مسلمان، انہیں اس سے غرض نہ تھی، وہ تو صرف اتنا جانتے تھے کہ ان کے میزبان پر یہ جنگ انہیں پناہ دینے کے جرم میں مسلط کی گئی تھی

فقہاء کا فیصلہ اس سلسلے میں کیا ہے؟ یہ وہ جانبیں تاریخ تو یہی ہے جو بیان کی گئی اور محمد بن قاسم اسی بنا پر راجہ داہر کی گوشمالی کیلئے بھیجا گیا تھا بلکہ تسخیر سندھ پر مامور کیا گیا تھا۔

”فرشتہ“ کے بیان کے مطابق ولید بن عبدالملک عرصے سے تسخیر سندھ کے

خواب دیکھ رہا تھا اور اس سے قبل دو کوششیں کر چکا تھا لیکن ان میں اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اسکے دعوہ میں اسکی ہوس حکمرانی بھی ہو سکتی ہے اور سادات کی ایک پناہ گاہ کو ختم کر دینے کا جذبہ بھی جو ولید کی افتاد طبع کو دیکھتے ہوئے قابل یقین ہے۔ ایسے میں ”فرشتہ“ کے مطابق ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹی ہوئی عورت دربار میں جا کر فریادی ہوئی اور اس نے حجاج بن یوسف کو سندھ پر حملے کا حکم دیدیا۔ حجاج کا تو یہ دلی منشاء ہی تھا۔ اس نے محمد بن قاسم کو متعین کر دیا۔

### سندھ میں اموی حکومت

محمد بن قاسم کی فتوحات حجاج بن یوسف کا کارنامہ شمار کی جاتی ہیں طارق بن زیاد کی تسخیر اندلس موسیٰ بن نصیر کے تدبیر کا نتیجہ اور قتیبہ بن مسلم کی مہمات خود ولید سے منسوب کی جاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تینوں جرنیلوں کی کامیابی خود انکی شجاعت کا حاصل تھیں۔ بالخصوص محمد بن قاسم کو جو فوری اقدامات کرنا پڑتے ان کا فیصلہ جواں سال ہونے کے باوجود وہ خود کرتا۔ اسی لئے وہ ہفتوں اور مہینوں میں سندھ کے ساحل سے لے کر اندرون ملک چھاتا چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اتنی بڑی مملکت زیر نگیں کر لی جو کسی آزاد سلطنت کے ہم پلہ تھی۔

محمد بن قاسم اموی تھا اور تسخیر سندھ کی وجوہات میں سادات بھی شامل تھے لہذا محمد بن قاسم نے انکی جستجو میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا مگر گنتی کے لوگ ہاتھ لگے، باقی تقیہ میں چلے گئے یا روپوش ہو گئے۔ قرینہ یہ کہتا ہے کہ ایک بڑی تعداد راجہ داہر کے ساتھ رہی ہوگی جو میدان جنگ میں کام آگئی۔

محمد بن قاسم حجاج کا بھتیجا بھی تھا اور داماد بھی لیکن اس سے خونریزی کی وہ داستانیں وابستہ نہیں جو حجاج کا حصہ تھیں۔ مورخین نے اسکے عدل و انصاف کی تعریف کی ہے اور ممکن ہے اپنے اسی انداز طبع کے باعث اس نے سادات کی تلاش میں زیادہ کد و کاوش نہ کی ہو اور چشم پوشی سے کام لیا ہو۔

محمد بن قاسم کا حشر طارق بن زیاد سے زیادہ مختلف نہیں ہوا جو جابر و قالم حکومتوں کا شعار رہا ہے۔ پھر وہ دن بھی آگیا، جب بنی عباس نے بنی امیہ کا تختہ الٹ دیا امویوں کی قبریں تک کھدوا ڈالی گئیں اور بنی عباس کی خلافت کا آغاز ہو گیا۔



ایک مودبانہ تبصرہ اگر لائق اعتناء قرار پائے تو حق پسندی ہوگی کہ کیا خلافت صرف بزور شمشیر حاصل کرنے کی چیز تھی؟ کہ حضرت معاویہ نے جنگ صفین میں فریب سے حاصل کی تو خلافت کا تقدس بھی مل گیا اور پھر ہر اموی خلیفہ مقدس رہا اسکے بعد عباسیوں نے ان کا قتل عام کر کے تخت خلافت پر قبضہ کر لیا تو مستعصم باللہ تک ہر خلیفہ سرتاپا مقدس۔ یہ منطق فہم سے بالاتر ہے کہ بنی امیہ میں حضرت معاویہ سے مروان الحمار تک خلیفہ رسول اور بنی عباس نے انکی قبور تک کھدوا ڈالیں تو وہ بھی نائب رسول بقاتل بھی محترم مقتول بھی محترم، عالم بھی برحق مظلوم بھی برحق خدا کیلئے کوئی اصول تو بنائیں ورنہ حق و باطل کا امتیاز بالکل ختم ہو جائے گا۔ پھر یہی خلافت طاقت کے بل پر فاطمین مصر نے لے لی اور آخر میں ترکان عثمانی نے، یہ سارے خلیفہ کیا کیا کرتے رہے؟ کسی سے چھپا نہیں ہے۔ اسکے باوجود جب کمال اتاترک نے ترکی کو بچانے کیلئے خلافت کو ختم کیا تو ہندوستان کے مجاہد ملت مولانا محمد علی جوہر جچ پڑے کہ مصطفیٰ کمال نے غضب ڈھا دیا۔ خلافت کو ختم کر دیا شاید وہ چاہتے تھے کہ ترکی ختم ہو جائے تو خلافت کہیں اور چلی جائے۔ حالات اجازت دیتے تو اس خلافت کو بچانے کیلئے لاکھوں سے مسلح کوئی نہ کوئی فوج ضرور جاتی۔

کچھ میں نہیں آتا کہ کتنا ہی بڑا عالم ہو اگر خلیفہ بن جائے تو مستوجب احترام اس کا ہر حکم لائق تعمیل ایک نکتہ اور بھی قابل غور ہے کہ وہ لوگ جو اموی خلیفہ کو قتل الہی سے زائد سمجھتے تھے جب سفاح عباسی بے پناہ مظالم توڑ کر خلیفہ بنا تو وہی لوگ اسکے لئے بھی اسی طرح مودب ہو گئے اور اسکے بعد ہر عباسی خلیفہ محترم اور تقدس مآب!

سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر ہلا کو خاں مسلمان ہو کر خلیفہ بن جاتا یا تیمور صاحبقران بایزید یلدرم کو بخرے میں بند کرنے کے بجائے خود خلافت کو قید کر لاتا خلافت کیلئے اپنے ماتھے پر چپکا لیتا تو کیا اسکی باجھوں سے بہتے ہوئے انسانی خون کے باوجود وہ احترام خلافت کا سزاوار ہو سکتا تھا؟ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی مانتا اور کوئی نہ مانتا۔ میرا اعتراض برائے اعتراض نہیں ہے بلکہ برادران ملت کی فکر کو

جھنجھوڑنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے قبل بھی ایسی ہی باتیں زیر غور آچکی ہیں۔ تبھی تو خلفائے راشدین کی اصطلاح وضع ہوئی اور صف خلافت کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک خلیفہ راشد اور دوسرے کی اصطلاح میرے علم میں نہیں، غالباً غیر راشد! اور اگر غیر راشد خدا نخواستہ صحیح ہے تو خلیفہ کا عظیم منصب اس پر صادق ہی نہیں آتا۔

ہمارا اس لفظ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں کیونکہ رسول کی نیابت کیلئے ہم امام منصوص من اللہ کے قائل ہیں اور اس کا تسلسل حضرت علی ابن ابی طالب سے شروع ہو جاتا ہے۔ فرماں روا کوئی سنی ہو یا شیعہ اگر وہ امام کی متابعت کرتا ہے تو ہم اسے مانتے ہیں ورنہ نہیں یوں نظام دنیوی کیلئے کوئی بادشاہ بن جائے یا سلطان ہمارے شرعی زاویہ نگاہ سے اسکو کوئی اہمیت نہیں۔

یہی قیمت ہماری نظر میں خلافت کی تھی۔ اسی لئے ہر ایک کے نزدیک ہمارا خون مباح رہا۔ اور اب امویوں کے بعد عباسی برسر اقتدار آئے تھے۔ تب بھی ہم اپنی جگہ پر تھے کل بھی ہم تقیہ کر رہے تھے اور وطن چھوڑ چھوڑ کر مراقش و مصر اور سندھ و ہند میں پناہ لے رہے تھے، آج ہمارے ساتھ اموی بھی شامل ہو گئے تھے وہ سوچتے ضرور ہوں گے کہ ہم نے آل فاطمہ زہرا کو خور بدر کیا تھا تو آج خود پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں اور کہیں پناہ نہیں ملتی۔

ہمارا خیال ہے کہ عباسی بنی امیہ سے زیادہ ظالم تھے۔ بنی امیہ تو صرف زندوں کا خون بہاتے تھے، مردوں پر تبرا بھجواتے تھے، بنی عباس نے تو زندوں میں سے کسی کو چھوڑا نہیں اور مردوں کے نام و نشان تک مٹا ڈالے۔

اموی نسل میں کتنے بقسید حیات رہ سکے اس کا کوئی اندازہ نہیں۔ استیابی کہا جاسکتا ہے کہ بہت تھوڑے جو مراقش و اندلس چلے گئے ریگستانوں میں جا چھپے یا کسی طرح بلوچستان کے غیر آباد علاقوں تک پہنچ سکے۔

بہر حال اقتدار مستقل ہونے کے بعد سندھ پر بھی عباسیوں کا قبضہ ہو گیا۔



### سندھ میں عباسی دور حکومت

بنی امیہ کے استیصال کے بعد عباسیوں نے تمام ممالک محروسہ پر قبضہ کر لیا جنہیں سندھ بھی شامل تھا۔ منصور دوانیقی نے عمر بن حفص کو سندھ کا حاکم بنا کر بھیجا جسکے کچھ ہی دنوں بعد محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم نے حقوق اہل بیت کا علم بلند کیا۔ عباسیوں سے زبردست معرکے ہوئے اور دونوں بھائیوں نے یکے بعد دیگرے شہادت پائی۔ نفس ذکیہ کے جہاد کے بعد عبداللہ الاشر بن نفس ذکیہ کچھ ساتھیوں کو لے کر عازم سندھ ہوئے۔ عمر بن حفص عباسی حکمران تھا لیکن وہ حقیقتاً مائل بہ تشیع تھا۔ اس نے ان کا خیر مقدم کیا اور بڑی عزت کے ساتھ رکھا پھر عباسی خلیفہ کے خوف سے ان سب کو ایک بہادر ہندو راجہ کے پاس بھیج دیا۔

مولانا ابو ظفر ندوی مولف تاریخ سندھ نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ اس راجہ کا ملک دریائے سندھ کے کسی معاون دریا کے کنارے ریگستان میں واقع تھا۔ عمر بن حفص نے اپنی دانست میں عبداللہ الاشر کو ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا لیکن منصور دوانیقی کو کسی نہ کسی ذریعہ سے خبر لگ گئی اور اس نے عمر بن حفص سے مطالبہ کر دیا کہ عبداللہ کا سر یا خود عبداللہ کو بغداد بھیج دے۔ عمر نے عبداللہ کے بجائے ان کے ایک ہم شکل کو بھیج دیا جو قتل ہو گیا مگر اسکے دوسرے شواہد نہیں ملتے پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ شجاع ابن شجاع کی ہاشمی حمیت اسکو کیونکر گوارا کر سکتی کہ ان کے عوض کوئی دوسرا بے گناہ تلوار کے گھاٹ اتر جائے البتہ عبداللہ کے علم میں لائے بغیر عمر بن حفص نے ایسا کیا ہو تو اور بات ہے۔

حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن اسکے بعد ہی عمر بن حفص کا تبادلہ افریقہ ہو گیا اور ہشام کو سندھ کا حکمران بنادیا گیا۔

تاریخ نے سندھ کی سادات نوازی کو نظر اتنان سے دیکھا ہے راجہ داہر نے بھی پیغمبر اسلام کی اولاد کو پناہ دی تھی اور دوسرے ہندو راجہ نے الاشر اور انکے ساتھیوں کو بڑی عزت کے ساتھ رکھا اور ہر سہولت بہم پہنچائی حتیٰ کہ عبداللہ کی

تبلیغ اسلام میں بھی وہ مانع نہیں ہوا۔

امام حسن کے پرپوتے نے اشاعت دین کا پورا حق ادا کیا اور سندھ کے بیشمار لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا ادھر منصور دوانیقی ہشام کو عبداللہ کیلئے تاکید کر رہا تھا۔ ہشام کو خاندان نبوت کا احترام ملحوظ تھا کہ ایک دن ہشام کا بھائی اپنی فوج کے ساتھ کسی مہم پر جا رہا تھا کہ ایک طرف سے کچھ سوار آتے دکھائی دئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللہ الاشر دریا کے کنارے تفریح کیلئے نکلے ہیں۔ سطح نے اپنے لشکر کو آگے بڑھا دیا۔ حسن شنی کا پوتا ان رو بہاؤں کو پیٹھ کیا دکھاتا حالانکہ وہ تعداد میں بہت زائد تھے ایک اور دس سے زیادہ کا ستا سب تھا۔

جنگ شروع ہوئی تو منصور و ابراہیم کی لڑائی کی یاد تازہ ہو گئی۔ عبداللہ نے لاشوں کے انبار لگا دئے اور ان کے ساتھی حق سرفروشی ادا کرتے رہے مگر تابہ کے آخر ایک ایک کر کے ان کے تمام ساتھی لہو لہان ہو کر گر گئے اور وہ بھی لاشوں کے درمیان گھوڑے سے زمین پر آ رہے۔

میدان جنگ کی شہادت عبداللہ کی میراث تھی۔ فرات کے کنارے ان کے دادا امام حسین کے ساتھیوں نے بھی اسی طرح سر کٹائے تھے۔ زخمی سادات نے کروٹیں بدل بدل کر عبداللہ کی لاش کو اپنے کٹے بھٹے جسموں سے چھپایا تاکہ ان کا سر بغداد بھیجا نہ جاسکے۔ وہی ہوا کہ عبداللہ کی لاش شناخت نہ کی جاسکی اور بعد میں نو مسلم سندھیوں نے موقع پا کر لاش کو دریا میں بہا دیا۔

کلفٹن کر لیتی پر عبداللہ شاہ غازی کا مزار اس واقعہ کی شہادت دیتا ہے۔ (۵۱) عباسی خلیفہ عبداللہ الاشر کی شہادت سے بھی مطمئن نہیں ہو لاس نے ہشام کو اس راجہ کی سرکوبی کا حکم بھیج دیا جس نے آل رسول کو پناہ دی تھی اور اب بھی چار پانچ سو سادات و نو مسلم جسکی حفاظت میں تھے ہشام نے راجہ سے سادات کو حوالے کر دینے کا مطالبہ کیا۔ راجہ نے بھی ویسا ہی جواب دیا، جیسا راجہ داہر نے حجاج کو دیا تھا اور نتیجہ بھی وہی نکلا کہ ہشام ایک بڑا لشکر لے کر چلا راجہ اور اسکی فوج نے بڑی جوانمردی دکھائی۔ راجہ کی ساری فوج کٹ گئی تب بھی وہ لڑتا رہا اور لڑتا ہوا مارا گیا۔ سادات میں سے ایک ایک نے وہ داد شجاعت دی کہ



عباسیوں کے دانت کھٹے کر دئے۔ آخر وہ بھی سب کے سب مارے گئے مگر اہل سندھ کے دلوں پر بہادری کے وہ نقوش ثبت کر گئے کہ خانوادہ رسالت کی شمشیر زنی وادی مہران میں ضرب المثل ہو گئی۔ اور پھر ایسا کچھ ہوا کہ حکومت عباسیوں کی تھی مگر سندھ ہی دل و دماغ پر قبضہ اہل بیت کا تھا۔

فتح بظاہر ظالم کی ہوتی ہے مگر مظلومیت بڑے دیر پا اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ کر بلا کا آوازہ برسوں سے سندھ میں گونج رہا تھا اولاد فاطمہ زہرا کا خون جب اس طرح آئے دن بہایا گیا تو عوامی ذہن مت نئی ہلچل سے دوچار ہوتے رہے اور اہل بیت کی صداقت دلوں میں گھر کرتی رہی۔

### ہباری حکومت

ان حقائق کے باوجود ستم رسیدہ سادات سندھ کے مختلف حصوں میں پہنچتے ہی رہے۔ عباسی خلافت کے انحطاط پذیر ہونے پر ۲۴۰ھ میں عمر بن عبدالعزیز ہباری، جو عباسیوں کی طرف سے سندھ کا والی تھا، ایک طرح پر آزاد حکمران بن گیا مگر خطبہ عباسیوں ہی کا جاری رہا۔

۲۵۴ھ میں جب یعقوب بن لیث صفاری کا عروج ہوا تو سندھ اس کے ماتحت آگیا اور ہباری حکومت اسکی باجگزار بن گئی لیکن اسی دوران ملتان میں اسمٰعیلی حکومت قائم ہو چکی تھی اور عمر بن شیبانی کو حاکم ملتان بنایا گیا تھا جسکے بعد شیخ حمید عامل ملتان ہوا۔

فاطمین مصر نے قیام خلافت کے بعد بھی تبلیغ کا وہی سلسلہ جاری رکھا تھا کہ ان کے داعی مسلمانوں میں گھس کر منطقی طور پر اپنے موقف کو ذہن نشین کراتے اور کم تعلیمیافتہ لوگوں کو اپنی جانب ملتفت کر لیتے۔ یہی انہوں نے ملتان و منصورہ میں کیا تھا اور ایک تعداد کو ہم نوا بنا کر بنو سامہ کا تختہ الٹا تھا۔

بنو سامہ کے بارے میں مورخین کا خیال ہے کہ وہ سندھ کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جنکو اسمٰعیلیوں نے ختم کیا اور اسمٰعیلیوں کو محمود غزنوی نے ملتان کی اسمٰعیلی حکومت کا دورانیہ زیادہ طویل نہیں ہے لیکن باطنی طریقہ کار میں تلوار سے زائد زبان کا استعمال ہوتا اس لئے

قیاس غالب یہی ہے کہ اسمٰعیلیوں نے ملتان کی طرح پہلے منصورہ والوں کا ذہن بدلا پھر تلوار اٹھائی اور اس طرح منصورہ میں بھی ایک جداگانہ اسمٰعیلی حکومت قائم کر لی ان حکمرانوں نے سادات کے مفاد کیلئے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن ان کے زمانے میں شیعیان علی کی جانوں کو کوئی خطرہ نہ تھا اور عرائے سید الشہدا کو پوری آزادی تھی بلکہ مجلس و ماتم میں اسمٰعیلی برابر کے شریک رہتے تھے۔

عراق و ایران میں شیعہ حکومتیں وجود میں آچکی تھیں۔ عباسی خلافت اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ تھی لہذا سادات کی سندھ میں آمد کم ہو گئی تھی مگر اب اسکی ضرورت بھی نہ تھی۔ سندھ کے گوشے گوشے میں شیعیت کے چراغ روشن ہو چکے تھے جسکی روشنی صوفیائے کرام کی ضیاء سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

ان حالات میں دو صدیاں گزر گئیں۔ سامانی حکومت پیدا ہو گئی اور اسکی خاک پر سبکتگین نے غزنی کا ایوان سلطنت تعمیر کر لیا۔ پھر سلجوقیوں نے بوہیں، آل حمدان اور بنی مزید کی لاشوں پر سے گزر کر ایک فاتحانہ نعرہ بلند کیا۔ سلجوقیوں کی جگہ عماد الدین زنگی نے لی اور زنگیوں کے سہارے صلاح الدین ایوبی نے فاطمین مصر کو پامال کیا۔

شیعوں کیلئے یہ کئی سو برس کے دور ابتلاء کی داستان ہے جس کا افتتاح سلطان محمود نے عراق میں کیا اور اب اسکی نظریں ہندو سندھ پر پڑ رہی تھیں جہاں ہندوؤں کی دولت اور شیعوں کی حکومتیں تھیں اور یہ دونوں اسکے لئے کشش رکھتیں لہذا محمود پنجاب کو روند کر سندھ پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔

### سلطان محمود کے حملوں کی نوعیت

سندھ پر مسلمانوں کے قبضے اور سیستان، مکران اور ملتان کے الحاق کے بعد اندرون ہندوستان کے علاقے اسلام کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے لیکن ایسی تمام معلومات منفی تھیں جن میں سلطان محمود کے حملوں سے اضافہ ہو گیا۔

مقصود سلطان کی منقصد نہیں ہے بلکہ سلطان کے حملوں سے عام ذہنوں پر جو اثرات مترتب ہوئے ان کی نشاندہی ہے۔ اپلتگین اور پھر سبکتگین کے وقت سے



پنجاب اور سندھ پر غزنی کے حملے شروع ہو چکے تھے اور پنجاب کا کچھ حصہ سلطنت غزنی کا جزو بن چکا تھا۔ سلطان محمود نے اس میں توسیع کی۔ ادھر ایران و خراسان، ادھر پنجاب سے آگے تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ پھر ہندوستان کے اندرونی حصوں کی طرف قدم بڑھایا۔

اگر نظریہ توسیع مملکت ہوتا اور جس جگہ کو تسخیر کرنا ہوتا اس پر حملہ کیا جاتا تو ایک مخصوص زاویہ سے اسلام کی اشاعت ہو سکتی تھی اور مفتوحہ مقامات کے ہندو یقیناً دائرہ اسلام میں داخل ہوتے رہتے جیسا کہ محمد بن قاسم کے حملوں سے ہوا اور مسلمان سندھ میں رہ پڑے تو ہندو اور بدھ مت والوں کو پیغمبر عرب کا دین سمجھنے کا موقع ملا اور وہ بتدریج مسلمان ہوتے رہے لیکن سلطان محمود نے تو یہ کیا کہ طوفان بن کر داخل ہوا اور لوٹ کھسوٹ کر غزنی واپس ہو گیا۔

اس سے سمجھایا گیا کہ غارتگری کا نام اسلام ہے اور زرو جو اہر لوٹنے والا ہی مسلمان ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمود بت فروش نہیں تھا بلکہ بت شکن تھا۔ یہ کون سی بت شکنی تھی کہ بتوں کے ہیرے جو اہرات نوچ کر انکو توڑ دیا اور دوسرے بت نصب کرانے کیلئے سوم ناتھ کو چھوڑ دیا۔

سوال یہ کیا جائے کہ گئے کس لئے تھے تو جواب اسکے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ درکار تھا، وہ لے لیا اور خطرات سے بچنے کیلئے واپس ہو گئے۔ محمود کے سترہ حملوں میں بیشتر حملوں کا حاصل استباہی ہوا کہ غزنی میں ہندوستان کی دولت کے انبار لگ گئے اور آفت ناگہانی کے گزر جانے کے بعد ہندو اسلام کے پہلے تجربے سے برسوں تک سسکتے رہے اور عربوں کے دین سے انکی نفرت دوبالا ہو گئی۔

### سلطان محمود اور ملتان

سندھ و ملتان سے محمود کا رابطہ سبکتگین کے وقت سے رہا تھا مگر سبکتگین نے ملتان پر اس لئے حملہ نہیں کیا تھا کہ ملتان کا حکمران خود ایک مسلمان شیخ حمید تھا جو اس سے لڑائی کے بدلے صلح چاہتا تھا۔ اب محمود کی باری آئی تو پندرہ سولہ سال گزر چکے تھے اور ملتان میں شیخ حمید کے پوتے داؤد بن نصر کی حکومت تھی۔

ملتان کی سرحد پر قلعہ بھامیہ واقع تھا۔۔۔۔۔ اس نے اپنی طاقت کے

نشے میں سلطان کی کوئی پرواہ نہیں کی اور سلطان کا لشکر جرار اسکی حدود کے قریب پہنچا تو اپنے علاقے سے اسکی رسد کو روک دیا۔ اس پر سلطان نے ملتان کے بجائے اپنا رخ بھامیہ کی طرف مرڑ دیا۔ ۳۹۰ھ میں بھامیہ کے لشکر سے غزنویوں کی خونریز جنگ ہوئی جس میں بچے راؤ والی بھامیہ کو شکست ہوئی۔ غیرت وار راجہ نے فرط شرم میں خود کشی کر لی اور محمود کشمیر مال و دولت لے کر غزنی واپس ہو گیا۔

دوسری بار اچانک ملتان پر ٹوٹ پڑنے خیال سے وہ درہ بولان کے بجائے درہ خیبر کے رستے سے روانہ ہوا۔ رستے میں انند پال کا علاقہ پڑتا تھا۔ اس نے گزرنے نہ دیا کیونکہ وہ داؤد کا ہم سرحد تھا اور حق ہمسائیگی کا تقاضہ تھا کہ اسکی طرف سے دشمن کی کوئی مدد نہ کی جائے۔

ایسا ہی کچھ راجہ بھامیہ کے ساتھ پیش آیا تھا اور اسکو جان سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

محمود کی افواج آگے بڑھیں تو انند پال سے پشاور کے قریب مقابلہ ہوا اور انند پال ہزیمت یاب ہوا، بھاگ کر اس نے کشمیر کے دروں میں پناہ لی اور محمود اس کا تعاقب کرتا ہوا بھٹنڈہ کی راہ سے ملتان جا پہنچا۔

محمود کو شاید داؤد اور ملتان سے پر خاش ہو گئی تھی یا پھر اسکے خاصہ مزاج کی بات ہو گئی کہ شیعہ کا نام آجائے تو وہ مشتعل ہو جاتا تھا، سبب جو کچھ بھی ہو اس کا فیصلہ یہی ہوا کہ وہ ملتان کو مسخر کیے بغیر نہیں رہے گا۔

ادھر داؤد بن نصر نے دیکھا تھا کہ انند پال استباحات توڑ تھا تو اسکو میدان سے بھاگنا پڑا لہذا مقابلے کے بجائے قلعہ بند ہو گیا پھر اس نے دولاکھ اشرفی سالانہ خراج پر اور ملک کا ایک حصہ دیکر صلح کر لی۔

اس سلسلے میں محمود کو انند پال سے بھی فصد ہو گئی کہ اگر وہ اس کا راستہ نہ روکتا تو ملتان کی فتح نامکمل نہ رہ جاتی۔ لہذا انند پال جب ہندوستانی راجاؤں سے مدد لے کر مقابلے پر آیا تو محمود نے ملتان سے تعاون کی امید کی لیکن بچے راؤ بھامیہ داؤد کی دوستی میں مارا گیا تھا اور انند پال سے محمود کی دشمنی بھی داؤد ہی کی وجہ سے ہوئی تھی چاہئے تو یہ تھا کہ داؤد محمود کے بجائے انند پال کی مدد کرتا لیکن سوال پیدا ہو گیا تھا



کفر و اسلام کا اس لئے داؤد غیر جانبدار بن گیا۔ نتیجے میں محمود نے اس کے لئے ایک فیصلہ کر لیا۔

ہند پال سے نپٹ کر اس نے غزنی میں ایک بڑا لشکر تیار کیا اور ۴۰۱ھ میں اس تیزی سے ملتان آگیا کہ ملتانیوں کو تیاری کا موقع ہی نہ مل سکا۔ غالباً یہ لوگ قلعہ بند ہو گئے مگر محمود نے ایک زبردست اور پر زور حملہ کر کے ملتان فتح کر لیا۔ پھر ایک باغی شہر کا جو حال ہو سکتا تھا وہ اس کا ہوا۔ اس نے باغیوں کو سخت سے سخت سزا دی۔ کسی کے ہاتھ اور پیر کاٹے کسی کو قتل کیا اور بڑی تعداد کو قید کر دیا۔ انہی میں شیخ داؤد بن نصر بن حمید بھی تھا جسکو گرفتار کر کے محمود غزنی لے گیا۔ یہ قلعہ غورک میں نظر بند رہا حتیٰ کہ اس جہان سے چل بسا۔ (۵۲)

محمود نے ملتان میں ایک حاکم مقرر کر دیا اور دیگر انتظامات کے ساتھ اسمٰعیلی شیعوں کی بنوائی ہوئی مسجد کو برباد کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسمٰعیلیوں نے محمد بن قاسم کی مسجد کو بنی امیہ کی مسجد قرار دے کر بند کر دیا تھا۔ اس کا جواب محمود کی طرف سے دیا گیا۔

### سلطان محمود اور منصورہ

ملتان کے بعد منصورہ کی حکومت باقی تھی۔ بعض مورخین نے اس کا یہ جواز پیش کیا ہے کہ گجرات کی طرف جانے کیلئے اپنا مقبوضہ راستہ بنانا تھا اس لئے اس پر حملہ کیا، جیسا کہ اہل ملتان پر مظالم ڈھانے کی خاطر لکھدیا گیا کہ وہ باغی تھے حالانکہ ذرا بھی انصاف سے کام لیا جاتا تو محمود نے بلاوجہ داؤد بن نصر پر حملہ کیا تھا اور راجہ بھائیہ کو داؤد کا دوست ہونے کے ناتے خود کشی پر مجبور کر دیا پھر ہند پال سے پرانی دشمنی اس لئے تازہ ہو گئی تھی کہ اس نے ملتان جانے کا راستہ نہیں دیا تھا۔

متعصبانہ اور جارحانہ اقدامات کی ان تادیلوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان تارکین وطن سادات نے محمود کا کیا بگاڑا تھا جو محتصم کے عہد سے جانیں بچا بچا کر سندھ پہنچے تھے اور دریائے مہران کے کنارے کنارے چھوٹی چھوٹی بستیاں بنا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ نہ مسلح تھے نہ پر خطر ان کے مردوں کو محمود نے تہہ تیغ کر دیا اور عورتیں بچوں کو لے کر جدھر سینگ سمائے ادھر چلی گئیں۔ ملتانیوں کیلئے سلطان

محمود اباہ و اجداد کے قاتل کی حیثیت رکھتا تھا، وہ اس کے وفادار کیونکر ہو سکتے تھے لہذا ان پر الزام تراشی کر کے ظالم ٹھہرایا۔ منصورہ کیلئے کہنے کو بھی کچھ نہیں تھا پھر بھی مورخین نے بہانے تلاش کرنے کی کوشش کی حالانکہ حقیقت یہ ہے جو ابن اشیر نے لکھی ہے۔

سلطان نے منصورہ کا قصد کیا۔ یہاں کا والی اسلام سے پھر گیا تھا (یعنی اسمٰعیلیہ ہو گیا تھا) جب اسکو سلطان کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ شہر سے نکل گیا اور اپنے آدمیوں کو لے کر جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ سلطان محمود نے اس کا تعاقب کیا دو طرف سے اس پر حملہ آور ہوا۔ اس میں بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے دریا میں ڈوب گئے۔ تھوڑے سے لوگ بچ سکے۔ سلطان بھائیہ ہوتا ہوا غزنی چلا گیا جہاں صفر ۴۱۶ھ میں پہنچا (۵۳)

اس کے بعد محمود نے چھوٹے چھوٹے اسمٰعیلی مقبوضات کو بھی لے لیا اور اسمٰعیلیوں کے قتل میں اتنی ارزانی کی کہ ان کا خون جیسے مباح ہو

سلطان محمود کے سلسلے میں مورخین نے جرائم کی پردہ پوشی کی جتنی بددیانتی کی ہے وہ مورخانہ وقار کو مجروح کرتی ہے۔ بلاشبہ محمود ایک بہادر مسلمان تھا لیکن حد درجہ متعصب، حریص اور بے رحم، چونکہ اس نے ہندوؤں پر بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، شیعوں کو ظالمانہ طریقہ پر کچلا لہذا اسے غازی اور مجاہد قرار دیا گیا۔ حصول زر کیلئے اسکی غارت گری کو نظر انداز کر دیا گیا۔

اسلام اگر تلوار کے زور سے پھیلا یا گیا ہو اور غیر مسلم مورخوں کے اس غلط اعتراف کو صحیح مان لیا جائے تو بھی محمود نے تلوار کے زور سے اسلام بھی نہیں پھیلا یا۔ کاش یہی کیا ہوتا۔ اس نے تو تلوار کے زور سے دولت اکٹھا کی اور اکٹھا کرتے کرتے اس دولت کا حساب دینے کیلئے خدا کی طرف بلایا گیا۔

### سومرہ حکومت

ملتان پر غزنی کے حاکم مدت تک باقی رہے پھر منصورہ کا حال بعینہ ویسا ہی ہوا کہ غزنوی لشکر لوٹ مار اور قتل و غارت کر کے چلا گیا اور وہاں سومرہ حکومت قائم ہو گئی جو اسمٰعیلی تھی۔



ابو ظفر ندوی کی تحقیق کے مطابق سومرہ نسلی طور پر مسلمان تھے اور برسوں سے سندھ میں رہنے کے سبب سندھی کچھ میں رنگ گئے تھے اور ان کے نام بھی مقامی تہذیب سے متاثر تھے۔ منصورہ میں غزنوی طاقت کمزور پڑنے پر جب اسماعیلیوں نے غلبہ حاصل کیا تو ان کے شیخ کا نام سومرہ تھا لہذا حکومت اسی سے منسوب ہو گئی۔ بہر حال وہ قدیم مسلم ہوں یا نو مسلم مگر اب اسماعیلی شیعہ تھے جن کا تعلق سندھی قومیت سے تھا۔ سومرہ اول کا زمانہ حکومت کافی طویل تھا۔ ۵۴۶ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس خاندان کی حکومت دریائے سندھ کے کنارے پھیلی ہوئی تھی جس میں منصورہ کی شمولیت سے سلطنت کی وسعت کافی بڑھ گئی۔ سندھ سے ملتان تک ایک اچھٹی نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ فاطمین مصر کی سلطنت کا سندھ پر کافی اثر پڑا تھا اور اسماعیلی کسی مدت سے سندھ کے مختلف حصوں پر قابض تھے۔ بڑی حکومتیں یقیناً دوہی تھیں ملتان اور منصورہ۔

سلطان محمود نے ان دونوں کو فتح تو کیا تھا لیکن منصورہ جلد ہی سومرہ اقتدار میں چلا گیا۔ ملتان کو جانے میں کچھ دیر لگی تاہم سلطان مسعود کا دور آتے آتے ملتان کیلئے طاقت آزمائی شروع ہو گئی۔

### سومرہ فرمانروا

مسلم دور میں یہ سندھیوں کی پہلی حکومت تھی جسکو وطن پرست ہندوؤں نے بھی قبول کیا جبکی مدت سلطنت چار صدیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ۵۵۰ھ میں شہاب الدین غوری نے ملتان اور اچھہ پر حملہ کیا مگر دیہلی سے ٹھٹھہ تک بھٹو کی حکومت قائم رہی بلاشبہ یہ دور ملتان سے ٹھٹھہ تک اسماعیلیوں کی حکومت کا تھا مگر جہاں حکومت کا سوال آتا ہے وہاں بھائی سے بھائی ٹکرانے لگتا ہے۔ ایسا ہی کچھ سومرہ میں بھی ہوا اور وہ وقت بھی آگیا جب ملتان، اچھہ، دیہلی، ٹھٹھہ علیحدہ علیحدہ حکومتوں کے مراکز بن گئے مگر بعض لحاظ سے اقتدار اعلیٰ منصورہ کی سابقہ حکومت کو حاصل رہا جو اب مٹھری میں منتقل ہو چکا تھا۔ بادشاہان سومرہ کا ایک نقشہ تاریخ سندھ از مولانا ابو ظفر سے ماخوذ ہے جو تحفۃ الکرام اور تاریخ معصومی سے قدرے مختلف ہے پھر بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

نام	مدت حکومت	سن وفات	کیفیت
سومرہ اول (یاراج سوم رائے)	۵۴۰ء سے	۵۴۲ء	نسل سومرہ کا یہ پہلا حکمران خاندان ہے
یاراج پال	۲۲ سال	۵۴۳ء	
سومرہ دوم	۲	۵۴۶ء	یہ دوسرا خاندان ہے،
بھونگر	۱۵	۵۴۶ء	اس کی حکومت زیر نگرانی وزیر اہم ہوئی کیونکہ کل عمر ۱۷ برس کی تھی،
دودا یا داؤد بن بھونگر اول	۲۳	۵۴۸ء	مدت عمر ۲۶ سال زیر نگرانی وزیر اہم اس کی حکومت رہی
بائی (ثانی یا تارائی)	۱۵	۵۵۰ء	یہ دودا کی لڑکی تھی،
سنگھ رائے (سنگھ یا سنگھارا بن دودا)	۱۵	۵۵۱ء	یہ لاولد تھا، بعض لوگوں نے اس کا نام (سجرا) بھی لکھا ہے۔
خفیف	۳۳	۵۵۳ء	نسل سومرہ میں سے یہ تیسرا خاندان ہے
انار (عمر)	۲۳	۵۵۶ء	عمر ۷ سال، شہاب الدین غوری سے جنگ کے اثناء میں مر گیا
دودا (یا داؤد) دوم	۸	۵۵۸ء	یہ سومرہ کسی گندہ کا حاکم تھا مگر آخر میں بادشاہ ہو گیا،
بھٹو، دودا بن بھونگر کی اولاد سے ہے	۳۳	۵۶۱ء	یہ سومرہ دوم کے خاندان سے ہے، اس کا نام پانچویں بھٹو بھی لکھا ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام "خیرا" لکھا ہے
کھن رائے (کنہرا)	۶	۵۶۱ء	
جے سنگھ (جلسی یا جسیہ)	۳	۵۶۲ء	
محمد تور	۱۵	۵۶۳ء	یہ سومرہ نسل سے ہے اور اپنے خاندان کا بانی ہے،
کھن رائے (کنہرا) دوم	۴	۵۶۹ء	
دودا (یا داؤد) (سوم)	۱۲	۵۷۱ء	غالباً یہ لاولد تھا،
بائی	۱۵	۵۷۶ء	
گنیش رائے (جنیسرا)	۱۸	۵۸۳ء	غالباً یہ کسی گندہ کا حاکم یا وزیر تھا جو بائی کے بعد سلطنت پر قابض ہو گیا،
بھونگر (دوم)	۱۵	۵۹۹ء	یہ سومرہ دوم یا محمد تور کے خاندان سے تھا،
خفیف (دوم)	۸	۶۰۰ء	
دودا (یا داؤد) (چہارم)	۵	۶۱۲ء	
دودا	۲۵	۶۳۷ء	یہ کسی ضلع کا حاکم یا باغی تھا
انار (عمر) دوم	۱۰	۶۴۷ء	غالباً یہ بھونگر دوم کے خاندان سے تھے
بھونگر (سوم)	۵	۶۵۲ء	سومرہ خاندان کا آخری تاجدار ہے



۶۲۰ھ میں جب جلال الدین خوارزم شاہ تاتاریوں سے شکست کھا کر سندھ پر حملہ آور ہوا تو سومرہ خاندان کی ایک دوسری شاخ ٹھٹھہ پر حکمران تھی۔ وہ جلال الدین کے خوف سے ایک جریرہ میں منتقل ہو گئی مگر جلال الدین جب چنگیزی لشکر کے ڈر سے مکران ہو کر عراق چلا گیا تو جیسی سومرہ واپس آگیا مگر ناصر الدین قباچہ نے اسکو اسکے علاقے سے بیدخل کر دیا لیکن سومرہ اس طرح خاموش بیٹھنے والے نہ تھے، انہوں نے جنوب مشرق میں اپنی طاقت سمیٹ کر ایک گاؤں آباد کیا۔ اس کا نام اپنے سردار کے نام پر محمد تور رکھا پھر اس مقام سے آہستہ آہستہ پورے سندھ پر متصرف ہو گئے۔

کچھ عرصے بعد ایک سندھی کی شکایت پر علاء الدین خلجی نے ایک فوج سندھ بھیجی جس نے بہت سے مقامات فتح کر لیے اور محمد تور تک چلے گئے جہاں بڑی سخت لڑائی ہوئی اور سومرہ حکمران پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ خلجیوں کے جانے کے بعد انہوں نے دوبارہ حکومت قائم کی۔

۶۱۶ھ میں علاء الدین خلجی کے بعد قطب الدین تخت نشین ہوا تو سومرہ نے اپنی حدود سلطنت بڑھانا شروع کر دیں اسی دوران خلجی ملتان پر قابض ہو گئے۔ سومرہ نے اس خلفشار سے فائدہ اٹھا کر ٹھٹھہ اور محمد تور کی ازسرنو تعمیر کر لی۔

۶۲۵ھ میں سلطان محمد تغلق دہلی میں تخت نشین ہوا تو سومرہ پھر سندھ میں نمودار ہو گئے تھے مگر جنوب کی طرف سمٹ گئے تھے اور انکی حکومت بھکر اور اسکے مضافات تک محدود تھی۔

اس دوران ”سمہ“ قبیلہ کافی طاقتور ہو گیا تھا اور اس نے مکران پر قبضہ کر کے مغربی سندھ میں ہاتھ پاؤں نکالنا شروع کر دیے تھے۔ سومرہ کو کمزور پا کر انہوں نے جنوب کا رخ کیا۔ سومرہ میں لڑنے کی طاقت نہ تھی۔ کاہہ بن تملجی نے انار اور علی شاہ کو گرفتار کر لیا اور بہرام پور لے جا کر دونوں کو قتل کرادیا۔

۶۳۷ھ میں بھونگر سوم اسکا جانشین ہوا جس نے پھر ایک بڑی حکومت قائم کر لی اور سلطنت دہلی کا باج گزار بن گیا۔

۶۵۱ھ میں محمد تغلق کا ایک باغی گجرات سے بھاگ کر سندھ پہنچا۔ سومرہ

نے اسکو ٹھٹھہ میں پناہ دی لہذا محمد تغلق نے باغی کے تعاقب میں ٹھٹھہ کا محاصرہ کر لیا پھر اپنی بیماری کے سبب محاصرہ اٹھا کر واپس ہوا تو سومروں نے اسپر حملہ کیا اور لوٹ مار کر کے واپس چلے آئے۔

انہیں دنوں سومرہ اور سمہ کی آپس کی جھڑپیں بڑھ گئیں۔ سمہ موقع پا کر سومرہ کے آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے اور سومرہ سمہ کے آدمیوں کو آخر سمہ نے جمع ہو کر سومرہ پر حملہ کر دیا، انکو شکست دے کر ٹھٹھہ پر قبضہ کیا پھر محمد تور پر تسلط حاصل کیا اور ایک نئے شہر ساموتی کو آباد کر کے اپنی حکومت کی بنیاد رکھ دی اس طرح ۷۵۲ھ میں سندھیوں کی پہلی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

### سندھ کا دوسرا حکمران خاندان سمہ

اس خاندان کے نسلی سلسلے میں متعلق مورخین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض اسے ابو جہل سے منسوب کرتے ہیں بعض سام بن عمر بن ہشام بن ابولہب کو جد اعلیٰ قرار دیتے ہیں بعض ہندو کہتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ جمشید شہنشاہ ایران کی نسل ہیں۔

ہر مورخ اپنے قیاس کے مطابق دلائل رکھتا ہے لیکن سندھ و ایران کا تعلق بہت قدیم ہے اور سندھ زمانہ دراز تک ایران سے ملحق رہا تھا لہذا کہا جاسکتا ہے کہ ایران کا کوئی قبیلہ سندھ آکر بس گیا اور اس نے بڑھ مت یا ہندو مذہب اختیار کر لیا پھر سومرہ کی طرح حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

قبول اسلام کے وقت کا تعین مشکل ہے مگر جب سمہ برسر اقتدار آئے تو وہ مسلمان تھے اور ان کے حکمرانوں نے ”جام“ کا لقب اختیار کیا جو ”جم“ سے مشتق ہے اور کثرت استعمال میں ”جم“ سے جام بن گیا ہے۔

اپنے اٹھان میں اس قبیلے نے بھی بڑی شجاعت اور تلوار کے جوہر دکھائے اور ایک قابل ذکر حکومت قائم کر لی۔

### فیروز الدین جام آنر بن بانہنیہ

۵۱ھ تا ۵۳ھ۔ جام آنر نے اپنی حکومت کا آغاز سیوستان سے کیا تھا۔



ساڑھے تین سال کی مدت حکومت میں اس نے اسکو مضبوط بنادیا اور ایک فوج تیار کر دی جو دشمن کی مدافعت کر سکتی۔

### علاء الدین جام جونہ بن جام آنر

۷۵۳ھ تا ۷۶۸ھ۔ جام جونہ بڑے بھائی جام آنر کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اسکے دل میں اول دن سے کشور کشائی کا جذبہ تھا۔ اس نے بکھر پر بزور شمشیر قبضہ کیا اور سندھ حکومت کو پہلے سے زائد طاقتور بنالیا مگر کچھ دنوں بعد سلطان علاء الدین کے بھائی الغ نے ملتان فتح کر کے ایک فوج سندھ بھیج دی لیکن اس سے قبل جام جونہ کا انتقال ہو چکا تھا لہذا اس فوج نے بکھر پر باسانی قبضہ کر لیا۔

### جام تماچی بن جام آنر

۷۶۸ھ تا ۷۷۷ھ۔ اس کو سلطان علاء الدین کے لشکر سے مقابلہ کرنا پڑا اور وہ دل میں اول دن سے کشور کشائی کا جذبہ تھا۔ اس نے بکھر پر بزور شمشیر قبضہ کیا اور سر عرصے بعد جام تملی کا بیٹا خیر الدین دہلی سے سندھ آیا اور اپنے علاقہ پر قابض ہو گیا۔ انھیں دنوں محمد تغلق کا سندھ میں انتقال ہو گیا اور فیروز تغلق زمام حکومت میں لینے کیلئے دہلی روانہ ہوا تو خیر الدین نے اسکے لشکر پر چھاپے مارے۔ پھر چند سال منصفانہ حکومت کر کے وفات پا گیا۔

### جام علاء الدین جونہ

۷۷۷ھ تا ۷۹۱ھ۔ جام خیر الدین کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اسکے پندرہ سال بعد فیروز تغلق سندھ پر حملہ آور ہوا اور جام علاء الدین کو دہلی لے گیا جہاں جام نے فیروز تغلق کی خوشنودی حاصل کی اور سلطانی طرف سے دوبارہ سندھ کا حکمران بنادیا گیا۔

### جام تماچی ثانی

۷۹۱ھ تا ۷۹۵ھ۔ جام تملی جام جونہ کا بھائی تھا، عیش و عشرت کا دلدادہ اس نے ایک لڑکی نوری سے عشق کیا تھا اور اسکے لئے جھیل کھنجر کے کنارے ایک محل تعمیر کرایا تھا۔

### جام صلاح الدین

۷۹۵ھ تا ۸۰۶ھ۔ یہ جام تملی کا بیٹا تھا۔ اس نے باغیوں کی سرکوبی کر کے بدامنی دور کی پھر کچھ پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوا اس نے اپنے زمانے میں فوج اور رعایا پر خاص توجہ کی۔

### جام نظام الدین

۸۰۷ھ تا ۸۰۹ھ۔ جام نظام الدین بن جام صلاح الدین نے نظام حکومت اپنے چار بچاؤں کے حوالے کر دیا جو موقع پا کر اس پر چڑھ دوڑے۔ جام نظام الدین گجرات کی طرف فرار ہوا اور امرائے سلطنت نے جام علی شیر کو تخت پر بٹھا دیا۔ جام نظام الدین گجرات پہنچنے سے قبل ہی مر گیا۔

### جام علی شیر

۸۰۹ھ تا ۸۱۵ھ۔ یہ جام تملی کا بیٹا تھا جو نہایت مدبر اور عدل پرور تھا۔ رعایا کو اسکے دور میں بڑا اطمینان میسر تھا ایک رات وہ دریا کی سیر کو نکلا تھا کہ جام نظام الدین کے بچاؤں نے اس پر حملہ کر کے قتل کر دیا اور ان میں سے ایک بچا تخت نشین ہو گیا۔

### جام کرن بن جام خیر الدین

۸۱۶ھ۔ اسکو تخت نشینی کے تھوڑے ہی دنوں بعد بھائیوں نے قتل کر دیا اور جام سکند بن خیر الدین تخت نشین ہو گیا۔

### جام سکندہ شاہ

۸۱۶ھ۔ اسکی سلطنت ایک سال سے کم رہی لیکن مختصر سے وقت میں اس نے رفاہ عامہ کے کئی کام کیے۔

### جام فتح خان

۸۱۶ھ تا ۸۳۶ھ۔ یہ سکندر کا بیٹا تھا۔ اس کے دور میں ہندوستان پر تیمور کا حملہ ہوا اور اسکے ایک جرنیل مرزا پیر محمد نے ملتان فتح کر لیا۔ اہل سندھ کو معلوم تھا کہ تیمور سادات کا بہت احترام کرتا ہے لہذا سادات سکھر میں سے ایک متقی اور

عبادت گزار بزرگ ابو الغیث مرزا پیر محمد کی خدمت میں ملتان بھیجے گئے اس نے بڑی عمت کے ساتھ ابو الغیث کا خیر مقدم کیا، گرانقدر تحائف دے کر واپس کیا اور ان کے کہنے کے مطابق سندھ میں غارت گری نہیں کی۔ اس طرح فتح خاں بڑے اطمینان اور سکون سے پندرہ سال حکمران رہا۔

### جام تغلق شاہ

۸۳۶ھ تا ۸۵۷ھ۔ جام تغلق فتح شاہ کا بیٹا تھا۔ بڑا منتظم اور ہوش مند فرمانروا تھا۔ اس نے گجرات سے اپنے رشتوں کو استوار کیا اور دہلی سے روابط قائم کیے۔ اٹھائیس سال کی کامیاب حکمرانی کے بعد فوت ہوا۔

### جام مبارک

۸۵۷ھ، جام سکندر مبارک ۸۵۷ھ تا ۸۵۸ھ۔ تاریخ معصومی میں جام مبارک کے بجائے جام سکندر لکھا ہے جو جام تغلق کا نابالغ بیٹا تھا اور مبارک اس کا اتالیق۔ تخت پر بیٹھتے ہی جام سکندر کو اندرونی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹھٹھہ میں مزید ڈیڑھ سال حکومت کے بعد وہ فوت ہو گیا۔

### جام رائڈنہ

۸۵۸ھ تا ۸۶۶ھ۔ جام رائڈنہ جام سکندر کے وقت میں ایک سرحدی حاکم تھا۔ وہ امراء کو ملا کر تخت نشین ہوا باتمیز اور مدبر تھا۔ آٹھ سال تک کامیاب حکومت کرنے کے بعد اس کے ایک مصاحب جام سبج نے زہر دے کر مار ڈالا اور خود فرمانروا بن گیا۔

### جام سبج

جام سبج بہت خوبصورت آدمی تھا۔ ٹھٹھہ کے تخت پر اس سے قبل اتنا حسین و جمیل بادشاہ نہ بیٹھا تھا۔ یہ جام بڑا منصف مزاج اور رعایا پرور تھا۔ اس کے انصاف کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ مورخین میں ان دونوں حکمرانوں کے سلسلے میں اختلافات ہیں۔ تاریخ معصومی میں رائے ڈنہ کے بعد سبج کا ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رائے ڈنہ سرحد اور شہروں کا حاکم تھا اور سبج ٹھٹھہ کا اور سبج نے رائے ڈنہ کو کسی مصاحب کے ذریعہ زہر دلوا دیا تھا اور ٹھٹھہ کے ساتھ رائے ڈنہ کے مقبوضات کا بادشاہ بھی بن گیا تھا۔

### جام نظام الدین ثانی

المعروف بہ جام تندہ ۸۶۶ھ تا ۹۱۳ھ۔ جام تندہ کو سہ حکومت کی آبرو کہا جاسکتا ہے: مدبر، خلیق، متواضع، انصاف پرور، خدا ترس، ذہین، نکتہ رس اور بہادر اسکے بارے میں کئی داستانیں سندھ میں زباں زد ہیں۔

سندھ کی تاریخ میں اس کا عہد سب سے زیادہ پرامن تھا۔ رعایا کو اس پر پورا اعتماد تھا اور وہ بھی ایک بادشاہ کی طرح عوام کے مسائل اور تکالیف پر نظر رکھتا تھا اس کا دربار علماء، فضلاء اور اکابر سے بھرا رہتا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے ٹھٹھہ کو بغداد و قاہرہ اور قرطبہ بنا دیا تھا۔ قدیم ٹھٹھہ کے متصل ایک شہر آباد کیا تھا جو ٹھٹھہ ہی کہلایا۔

۸۹۰ھ میں شاہ بیگ ارغون نے قلعہ سیوی پر حملہ کیا اور قندھار واپس چلا گیا اور علاقے پر اپنے بھائی سلطان محمد کو حاکم بنا گیا۔ جام تندہ نے اس کے مقابلے کیلئے ایک لشکر بھیجا جو بری طرح ہزیمت یاب ہوا۔ اس کے بعد ارغون لشکر نے بکھر سمیت کئی قلعے فتح کر لیے۔ جام تندہ نے بہت کوشش کی کہ ایک بڑا لشکر اپنے مقبوضات کو واپس لانے کیلئے روانہ کرے مگر سندھی پٹھلی جنگ سے لتے ڈر گئے تھے کہ دوبارہ مقابلے پر جانے کی ہمت نہ کر سکے۔

اور بقول تاریخ فرشتہ، جام تندہ ناکامی کی غیرت میں بیمار پڑ کر مر گیا

### دریا خان

دریا خان جام تندہ کے دیوان کا غلام تھا جو اپنی ذہانت کے سبب جام تندہ کا مقرب بن گیا تھا وہ اپنی صلاحیت کے لحاظ سے تخت نشین ہوا۔ اس نے شاہ بیگ ارغون کا مقابلہ کیا اور سخت زخمی ہو کر ٹھٹھہ میں انتقال کیا۔

### ناصر الدین ابو الفتح

سلطان فیروز شاہ ۹۱۳ھ تا ۹۲۶ھ۔ جام فیروز جام تندہ کا کم سن بیٹا تھا۔ جام صلاح الدین اس کا مخالف تھا وہ سلطان مظفر گجراتی سے مدد لیا اور جام فیروز کو شکست دے کر تخت پر قابض ہو گیا۔



دریاخان نام کا ایک سردار جام فیروز کا پشت پناہ تھا۔ اس نے جام نندہ کے نام پر منتشر قوت کو یکجا کیا اور جام صلاح الدین نے ٹھٹھہ سے جو فوج بھیجی تھی، اس کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ جام صلاح الدین کے سپہ سالار نے فتح کے بعد جو خط ٹھٹھہ روانہ کیا تھا وہ اتفاق سے دریاخان کے ہاتھ پڑ گیا اس نے خط بدل کر ایک خط جام صلاح الدین کو بھجوا دیا کہ وہ فوراً ٹھٹھہ خالی کر دے۔ جام صلاح الدین نے ایسا ہی کیا اور دریاخان نے جام فیروز کو ٹھٹھہ لے جا کر تخت نشین کر دیا۔

جام فیروز اس کے بعد کئی سال تک حکومت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ۹۲۶ھ میں شاہ بیگ ارغون نے پھر سندھ پر حملہ کیا اور سیوہن ہوتا ہوا ٹھٹھہ جا پہنچا۔ دریاخان نے ٹھٹھہ سے نکل کر مقابلہ کیا اور لڑتا ہوا مارا گیا اور سہ سلطنت ارغونوں کے قبضے میں چلی گئی۔

سہ حکومت کا دورانیہ پونے دو سو سال ہے۔ اس میں سہ بادشاہوں نے سندھ کیلئے بہت کچھ کیا۔ شہری ترقی کے ساتھ علوم و فنون پر بڑی توجہ دی۔ باہر سے آئیوالے سادات اور اہل تصوف کے سوا خود سندھیوں میں بھی بڑے بڑے عالم و فاضل پیدا ہوئے اور بجا طور پر سندھ کے اس دور کو عہد آفرین کہا جاسکتا ہے۔

سندھیوں کا عمومی مذہب حنفیت رہا لیکن شیعوں کی ایک بڑی تعداد ملک کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ان میں اسماعیلی بھی تھے اور بکثرت اشاعشری جو ان سادات کے طفیل جتنکے مزارات آج بھی سندھ کا امتیاز ہیں اور جنگی نسلیں عقائد راسخہ کے ساتھ اب بھی سندھی کہے جانے پر فخر کرتی ہیں۔

خود سہ قبائل میں بھی بہت سے شیعہ موجود تھے اور موجود ہیں اور علماء فضلاء اور شعراء میں تو اکثریت شیعوں کی تھی جن میں آل رسول کو فضیلت حاصل رہی۔ (۵۴)

## ارغون خاندان

۹۲۷ھ تا ۹۶۲ھ

ارغون، چنگیز خاں کی نسل سے ہیں۔ انکا سلسلہ، نسب ہے: ارغون خاں بن اباقاخان بن ہلاکو خاں بن تولی خاں بن چنگیز خاں۔ اپنے باپ اباقاخان کے زمانہ میں وہ خراسان کا بادشاہ تھا۔ باپ کی موت کے بعد اس کا بیٹا غازی (غازان) خاں، تخت خانی (سلطانی) پر متمکن ہوا۔

خدا نے اس کے دل میں اسلام کا نور روشن کیا اور وہ خراسان کو غازان خاں کے سپرد کر کے خود حضرت سید الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لئے مدینہ طیبہ روانہ ہوا۔ وہاں وہ آنحضرتؐ کے حکم سے خواب میں امیر المومنین حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ سے بغل گیر ہوا۔ اسی وجہ سے وہ سادات کے احترام میں مبالغہ سے کام لیتا تھا۔

امام حسینؑ کی جائے شہادت تک اس نے ایک ایسی کشادہ اور عمیق نہر کھدوائی تھی کہ دجلہ و فرات سے کشتیاں کر بلا تک آتی جاتی تھیں۔ غازان خاں کے بارے میں بھی اسی قسم کی ایک روایت ملتی ہے۔

## شاہ بیگ

ارغون خاندان کی اولاد میں سے جب شاہ بیگ ابن امیر ذوالنون ابن میر حسن بصری نے ٹھٹھہ پر قبضہ کیا اور وہاں کی لوٹ مار اور قتل و قید سے فارغ ہوا تو جام فیروز، جس کے اہل و عیال اسیر ہو گئے تھے، اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھ کر حاضر خدمت ہوا۔ شاہ بیگ اس سے بڑی نوازشوں کے ساتھ پیش آیا، اسے اپنا بیٹا بنا کر سیوستان ملک کا ملک عنایت کیا اور کوہ لکی کو سرحد قرار دیا۔ اس کے بعد میر علیکہ ارغون، سلطان مقیم بیگلار، کیبک ارغون اور احمد ترخان کو فیروز کے پاس چھوڑ کر سیوستان کے نواح سے دریاخان کے بیٹوں کا صفایا کیا پھر شال اور سیوی کی طرف بڑھ گیا۔

سہ قوم کے لوگ، جو اس افراتفری کے دور میں ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے، وہ



جام صلاح الدین کو گجرات سے لے آئے۔ کچھ کے والی رائے کھنگار کی مدد سے وہ دس ہزار جائیداد ساتھ لے کر ٹھٹھے پر حملہ آور ہو گیا۔ مرزا شاہ حسن ابن شاہ بیگ یہ خبر پا کر ۱۴ محرم کو شال سے نکلا اور بیس دنوں کے اندر ٹھٹھے پہنچا۔ فریقین نے جب ایک دوسرے کے سامنے صفیں آراستہ کیں تو صلاح الدین کا بیٹا ہیبت خان جو سلطان مظفر گجراتی کا نواسہ تھا اور لشکر کا افسر مقدمہ تھا، آگے بڑھا۔ مرزا عیسیٰ ترخان، میرعلیکہ اور سلطان قلی بیگلار نے ایک زبردست یلغار کر کے ہیبت خان کو قتل کر دیا۔

صلاح الدین، بیٹے کے مارے جانے سے انتہائی جوش و غضب کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑا۔ اس طرف سے مرزا شاہ حسن نے بھی سخت حملہ کر کے شجاعت کا حق ادا کیا اور آن واحد میں دشمن کا سارا لشکر درہم برہم کر دیا اکثر کو قتل اور باقی ماندہ کو بھگا دیا۔ رائے کھنگار کا بھائی آمر آمرانی میدان جنگ میں کام آیا۔ مرزا شاہ حسن حملہ آوروں کو گجرات کی طرف بھگا کر تین دن کے بعد واپس ہوا۔ ماہ ربیع الثانی میں شاہ بیگ خود بھی باغبان کے نواح میں پہنچا اور مرزا شاہ حسن کو طلب کیا۔ اسی درمیان اس نے ماچھیوں کو جو خود مختار ہو گئے تھے ختم کر کے ان کے قلعہ کی بنیادیں بھی اکھاڑ پھینکیں۔

مرزا شاہ حسن نے باپ کے حکم کے مطابق سیوستان جا کر وہاں قابل اعتماد افراد مامور کئے اور انہیں نئے سرے سے عمارتیں تعمیر کرنے کے لئے زمینیں تقسیم کیں پھر باپ کی خدمت میں واپس آگیا۔

انہیں دنوں میں شاہ بیگ نے جام فیروز کو لکھا تھا "میں نے گجرات فتح کر نیا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ جیسے ہی یہ تمنا پوری ہوئی، مملکت سندھ حسب سابق تیرے حوالہ کر دی جائے گی۔" اس کے بعد وہ بکھر کو روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قلعہ کے اندر رہنے والے سادات کو روپڑی میں رہائش گاہیں عطا کیں اور اروڑ شہر کے کھنڈروں کی اینٹوں سے ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا۔

سال بھر میں جب قلعہ کی عمارت تیار ہوئی تو اس نے میر فاضل کو کلتاش، ملک محمد کو کہ، میر محمد ساربان اور سلطان محمد مہر دار جیسے امرا کو وہاں مقرر کیا پھر

بلوچ فساد یوں کی سرزنش کے لئے فوجیں مامور کیں جنہوں نے منصوبہ کے مطابق سارے مقامات پر ایک ہی وقت میں اس گروہ کو برباد کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر شاہ بیگ شال اور سیوی کی طرف واپس گیا۔ اس کے بعد سنہ ۹۲۸ھ میں وہ پھر بکھر آیا اور پائندہ محمد ترخان کو وہاں کی حکومت تفویض کر کے گجرات کے ارادہ سے موضع انگھم کے قریب جا کر جام فیروز کا انتظار کرنے لگا۔ اتفاقاً ۲۲ ماہ شعبان سنہ ۹۲۸ھ کو وہ سکرات میں مبتلا ہوا اور پیش امام حافظ شریف کو سورۃ یاسین پڑھنے کا حکم دیا وہ جب تلاوت کرتے کرتے آیت "وَمَالِیْ لَا اَعْبُدُ الذِّیْ" پر پہنچا تو اس نے کہا کہ "مکر پڑھ" چنانچہ دوسری مرتبہ جب حافظ، آیت "یٰلَیْلِیْتُ قَوْمِ یٰعْلَمُوْنَ بِمَا عَفَرْتُ" پر پہنچا تو اس نے اپنی جان جان آفرین کے حوالہ کر دی۔ "شہر شعبان" اس کی تاریخ وفات ہے۔

پھر اس کی لاش کو مکہ معظمہ لے جا کر دفن کیا گیا۔ عہد شباب میں وہ خواجہ عبداللہ کی خدمت میں حاضر رہ کر اور علمی کمالات حاصل کر کے بلند درجہ پر فائز ہوا تھا جب وہ باپ کے ساتھ ہرات میں رہا کرتا تھا تب بھی ہمیشہ علما کی صحبت میں رہتا اور ہفتہ میں دو بار انہیں اپنے مکان میں مدعو کر کے ان کی خدمت کیا کرتا اور ان سے فیض حاصل کرتا تھا۔ اس کی تصنیفات میں "شرح کافیہ" اور بعض رسالوں کے حواشی مشہور ہیں۔

### مرزا شاہ حسن

مرزا شاہ حسن، ۹۲۸ھ تا ۹۶۲ھ، باپ کے انتقال پر نصرپور میں تخت نشین ہوا اور اس نے شہنشاہ بابر کے نام کا خطبہ پڑھا۔ بعض خیر خواہ اس پر کافی ناراض ہوئے لیکن اس نے کہا کہ "قدیمی ولی نعمت کے ہوتے ہوئے اس کا نام خطبے شامل نہ کرنا ہمارے لئے مناسب نہیں۔" جام فیروز نے شاہ بیگ کی وفات کی خبر سن کر خوش منائی اور فاتحہ خوانی کو نظر انداز کر کے اطاعت سے منحرف ہو گیا۔ مرزا شاہ حسن نے یہ خبر پا کر اس کی بیعت کنی کا ارادہ کیا۔ جام فیروز نے اسکی اطلاع پاتے ہی حافظ رشید خوش نویس اور مفتی قاضی قاضن کے ہاتھوں تحائف بھیج کر معذرت چاہی لیکن ساتھ ہی ساتھ خفیہ طور پر جنگ کی تیاری میں بھی مشغول رہا۔ مرزا کو یہ حال



معلوم ہوا تو اس نے ٹھٹھے پر چڑھائی کر دی۔ جام فیروز نے اپنے میں مقابلہ کی سکت نہ پا کر وزیر مانک اور شیخ ابراہیم داماد کو جنگ پر مامور کیا اور دریا پار کر کے فرار ہو گیا ان دونوں نے بڑی کوششیں کیں، تو پچیوں اور تیر اندازوں سے بھری ہوئی کشتیاں حاصل کر کے راہ روکنی چاہی، لیکن مرزا کا لشکر ان سب کو ہٹاتا ہوا ٹھٹھے میں داخل ہو گیا۔

بد نصیب جام فیروز کچھ بھاگ گیا وہاں سے پچاس ہزار پیادوں اور سواروں کے ساتھ چاچک اور راحمہ کے قریب آکر ٹھہر گیا۔ مرزا شاہ حسن نے کچھ آدمی ٹھٹھے کی حفاظت کے لئے چھوڑے اور اس کے مقابلہ پر آگیا۔ دونوں فریق جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو سندھی اور کچی بہادر سروس سے پگڑیاں اتار کر رسم کے مطابق چادروں کے کونے ایک دوسرے سے باندھ کر، گھوڑے سے اتر کر پیادہ ہو گئے اور جنگ کے لئے مستعد ہو گئے۔ سندھ اور ہند کے لوگوں کا یہ دستور ہے کہ جب وہ مرتے دم تک جنگ کرنے کا ہتھیہ کرتے ہیں تو اسی طرح لڑائی شروع کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ مرزا شاہ حسن نے یہ حالت دیکھ کر امرا کو مبارکباد دی اور کہا کہ ”انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو باندھ کر ہمارے سامنے کر دیا، انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہو گا۔“ یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے اتر اور وضو کر کے مناجات کی نیت سے دو رکعت نفل ادا کی، بارگاہ ایزدی میں کامیابی کے لئے دست بدعا ہو گیا اور اس کی دعا قبول ہوئی۔ لشکر اسکے حکم کے مطابق تیر برسا رہا تھا، جب وہ مناجات سے فارغ ہوا تو اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر ہلہ بول دینے کا اشارہ کیا۔ صبح سے شام تک جنگ ہوتی رہی جس میں تقریباً بیس ہزار آدمی قتل ہو گئے۔ جام فیروز پہلے ہی گجرات بھاگ گیا تھا اسکے بعد مرتے دم تک وہیں رہا۔ مرزا نے تین دن تک اس مقام پر قیام کیا، غنیمت میں، گھوڑے اور جو دوسرا سامان ہاتھ آیا تھا اسے اس نے اپنے آدمیوں میں تقسیم کیا۔ پھر شہر ٹھٹھے میں منزل انداز ہوا اور وہاں سے تغلق آباد آگیا۔

چھ ماہ بعد وہ ہالا کنڈی کی راہ سے پہلے سیوستان گیا۔ وہاں درہیلہ کا پرگنہ میر فرخ کو عطا کر کے شکار کھیلتا ہوا ”برلو“ پہنچا جو بکھرے تین کوس کے فاصلہ پر واقع ہے راہ میں اس نے ہر مقام پر بستیوں اور باشندوں کو مطیع کیا۔ حدود اباوڑی میں

اس کے لشکر نے ڈھیر اور ماچھی قبائل کو شکست دی اور ”اباوڑی“ پر قبضہ کیا۔ آخر سنہ ۹۳۰ھ میں تسخیر ملتان کا ارادہ کر کے پہلے ایک ہفتہ کے لئے وہ سیوی گیا، وہاں قلعہ کی نئے سرے سے تعمیر کرائی۔ واپسی میں رند، گسی اور بلوچ قبائل کو مطیع کرتا ہوا بکھر آگیا۔ سنہ ۹۳۱ھ میں وہ ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ”سیورائی“ کے قلعہ کو تاراج کر کے ”قلعہ منو“ کا رخ کیا لیکن قطب العارفین شیخ روح اللہ قدس سرہ کی سفارش پر اس سے درگزر کیا۔ ملتان کے بہادروں میں سے ”رحمو“ اور ”بندہ ڈھر“ خود اسکی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ لائکاٹھ شہزادے اور بلوچ جو اس کے مقابلہ کے لئے نکلے، انہیں شکست دے کر اور قلعہ اچ فتح کر کے اس نے اسے مسمار کر دیا۔ اس کے بعد ہی سلطان ”محمود لائکاٹھ“ بلوچ، رند، دودا، کورائی اور چانڈیہ قبائل کے اسی ہزار بہادروں کو لیکر اس کے مقابل آیا لیکن مرزا نے لائکاٹھوں سے صلح کر لی اور گھارو واہ کو سرحد مقرر کر کے معتمد افراد کو اچ میں مامور کر دیا۔ اس کے بعد اس نے دلاور کے قلعہ پر چڑھائی کی جو شوریدہ زمین پر واقع تھا اور مضبوطی کے اعتبار سے دور دراز کے ملکوں تک مشہور تھا اس نے کچھ ہی عرصہ میں اسکو فتح کر لیا اور اہل قلعہ میں سے اکثر کو قتل و زخمی کر کے باقی ماندہ کو گرفتار کیا اور بے اندازہ زرو مال کے ساتھ پندرہ دن کے اندر بکھر واپس آگیا۔

سنہ ۹۳۲ھ میں وہ دوبارہ ملتانوں کی نافرمانی کی وجہ سے ان پر حملہ آور ہوا اور ایک سال کے محاصرے میں کافی قتل و غارت کیا بالاخر شہر فتح ہوا۔ سلطان محمود لائکاٹھ کی بیٹی اور بیٹے کو اس نے مسکین ترخان کے حوالہ کیا، جو ان دونوں کو اپنا جگر گوشہ اور فرزند تصور کرنے لگا۔ دو ماہ وہاں قیام کر کے اس نے خواجہ شمس الدین کو ملتان پر مامور کیا اور خود بکھر واپس آگیا۔ کچھ عرصہ بعد نذرانہ کے طور پر ملتان بابر بادشاہ کے حوالہ کر دیا اور خواجہ شمس الدین کو بکھر واپس بلالیا۔ بابر نے ملتان اپنے فرزند کامران کو عطا کر دیا۔

اس عرصے میں والی کچھ راؤ کھنگار نے، جو جام صلاح الدین کی حمایت میں آیا تھا اور شکست کھا کر فرار ہو گیا تھا، ٹھٹھے کی تسخیر کا ارادہ کیا اور شاہ حسن کو خط بھیجا کہ ”میرا بھائی آمر امرانی تمہارے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا، اس کے اقارب ٹھٹھے پر حملہ کرنا



چاہتے ہیں لیکن تمہاری غیر حاضری میں خالی ملک پر فوج کشی کرنا جائز نہ تھا لہذا تمہیں اطلاع دی جاتی ہے، اگر تم ولایت ٹھنڈے کا کچھ حصہ مقتول کے ورثا کو دے دو تو بہتر ہے ورنہ ہم آرہے ہیں۔“

مرزا نے جواب لکھ بھیجا کہ ”آمر کے خون کا جوش ابھی سرد نہ ہوا ہوگا اس لئے ہم خود تمہاری طرف آرہے ہیں۔ یہاں آنے کی تکلیف نہ اٹھاؤ۔“

مورخین کا کہنا ہے کہ مرزا نے خود پہل کر کے اس کو خط لکھا تھا کہ ”میں تیرے بھائیوں کا سارا ملک اپنے قبضہ میں کر چکا ہوں تعجب ہے کہ تجھ جیسے غافل نے اس قدر قریب ہونے کے باوجود نہ کوئی تحفظ بھیجا، نہ اطاعت اختیار کی اور نہ اتحاد ہی کی ضرورت محسوس کی ہے۔ بہر حال اب ہم گجرات فتح کرنے کا عزم کر رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ خواہ مخواہ خود کو پامال نہ کر، اطاعت قبول کر لے اور کسی تعداد میں کبھی گھوڑے نذرانہ کے طور پر روانہ کر۔ دوسری صورت میں جنگ کے لئے تیار رہ۔“

رائے کھنگار کو اپنے لشکر اور بہادروں پر ناز تھا اور وہ اپنے تکبر پر بدستور قائم تھا اس لئے مرزا تیزی کے ساتھ اس کی طرف روانہ ہو گیا مگر کچھ کے قریب پہنچتے ہی لشکر میں رسد کی سخت قلت ہو گئی جس سے سپاہی تنگ دل ہو گئے لہذا صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مرزا نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا اور حکم دیا کہ ہر حصہ مختلف سمتوں سے کھنگار پر حملہ کرے لیکن ایک دوسرے سے غافل نہ ہو اور خود کو اس طرح اس کے سامنے ظاہر کرے کہ حریف دوسری فوج کے وجود سے بے خبر ہو کر مقابلہ پر آجائے۔

چنانچہ پہلا دستہ ”سلطان محمود خان“ کی معیت میں بڑھا، دوسرا میر فرخ اور خود مرزا شاہ حسن کی سرکردگی میں تیسرا دستہ شاہ حسن تلداری کی کمان میں اور چوتھا دستہ مرزا عیسیٰ اور میر علیک کی سرکردگی میں۔

کھنگار کو جب خبر ملی کہ مرزا شاہ حسن ایک مختصر فوج کے ساتھ جنگ کرنے آ رہا ہے تو وہ جنگ کے لئے مستعد ہو کر دس ہزار سوار اور بے شمار پیادے ساتھ لے کر مقابلہ پر آ گیا۔ سلطان محمود کے دستے کو کھنگار کے آنے کی خبر ملی تو فی الفور اس کی راہ روک کر اس نے مرزا کو اس کی خبر دی اور ایک تیز رفتار قاصد میر فرخ کی طرف

روانہ کیا۔ کھنگار کا لشکر گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہو گیا اور چادریں ایک دوسرے سے باندھ کر اور باہم ڈھالیں ملا کر نیزہ بازی شروع کر دی۔ اس طرف سے مغلوں نے اپنی رسم کے مطابق تیر برسانے شروع کر دیے۔ دو تین ساعت جنگ ہوئی ہوگی کہ خدا کی مدد سے غنیم نے صرف سلطان محمود کی فوج سے مکمل شکست کھائی اور فرار ہوتے وقت میر فرخ کی فوج کے ہتے چڑھ کر خونخوار تلواروں کی خوراک بن گیا۔ جب مرزا کے لشکر کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو گئی تو اس نے وہیں ڈیرے ڈال دیے اور صبح کے وقت شہروں اور قریوں کو لوٹنے کے لئے لشکر روانہ کیا جو بے شمار اسباب، گھوڑے، قیدی اور مویشی ساتھ لے کر واپس ہوا۔

### مرزا کا پٹن پر حملہ

مرزا شاہ حسن کچھ سے مظفر و منصور نہایت شان و شوکت سے واپس ہوا اور ایک عرصے تک سندھ میں آرام و آسائش سے وقت گزارتا رہا۔ سنہ ۹۴۲ھ میں جب ہمایوں نے دہلی سے آکر چتور پر حملہ کیا اس موقع پر چتور کے بادشاہ کی سفارش میں سلطان محمود بہادر گجراتی نے اسے ایک سخت خط لکھا، جو ہمایوں کے دل پر گراں گزرا۔ وہ یلغار کر کے خود سلطان محمود کے ملک پر حملہ آور ہو گیا اور اسے شکست دی۔ اسی زمانے میں اس نے مرزا شاہ حسن کو بھی پٹن پہنچنے کیلئے لکھا تا کہ شکست خوردوں کی راہ فرار مسدود ہو جائے۔

یہ تحریر موصول ہونے پر مرزا شاہ حسن بسرعت لشکر لیکر نصر پور سے رائدن پور، رادھن پور کے راستے پٹن جا پہنچا۔ پٹن کے حاکم خضر خاں کو محصور کر کے اس نے قرب و جوار میں لوٹ شروع کر دی۔ بکھر کا حاکم سلطان محمود خاں ہراول پر تھا۔ اس نے جنید اور ”جونہ دھابجہ“ کو خضر خاں کے پاس پٹن بھیج کر پیغام دیا کہ مرزا کی خدمت میں حاضر ہو۔ خضر خاں نے جواب دیا کہ ”سلطان محمود بہادر کرناں میں صحیح سلامت موجود ہے، میں اس کے حکم کے بغیر قلعہ کس طرح حوالہ کر سکتا ہوں۔“ یہ جواب پا کر قاصد اس کی والدہ کے پاس گئے۔ آخر پٹن سے لشکر کی چھاؤنی اٹھانے کے لئے ایک لاکھ فیروز شاہی مرزا شاہ حسن کو، اور تیس ہزار فیروز شاہی سلطان محمود خاں کو نذرانہ دینے کا فیصلہ ہوا۔ نذرانہ وصول کر کے مرزا شاہ حسن نے اپنے آنے



کی اطلاع عبدالقدوس کے ذریعہ ہمایوں کی خدمت میں روانہ کی اور خود پندرہ دن تک پٹن کے نواح میں مقیم رہا۔

اس دوران سلطان محمود خاں، محمود آباد تک جا کر تاخت کر چکا تھا اور کثیر مال و متاع لے کر واپس آگیا تھا۔ میر فرخ نے مرزا شاہ حسن کو مشورہ دیا کہ "اگر ہمایوں نے مرزا کو اپنی چھاؤنی میں طلب کیا تو ضرور جانا پڑے گا۔ اندیشہ ہے کہ ارغون، ترخان اور سندھی سپاہی سلطانی ساز و سامان اور عطا و بخشش دیکھ کر ہمارا ساتھ نہ چھوڑ دیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ کوئی بہانہ بنا کر یہیں سے سندھ واپس لوٹ جائیں۔"

اس تجویز سے متفق ہو کر مرزا حسن نے مرزا قاسم بیگ کے ہاتھ ایک عریفہ بھیجا کہ "شاہی حکم کی تعمیل میں وہ اپنا سارا لشکر لیکر آگیا تھا لیکن ابھی ابھی ٹھٹھہ اور بکھر کے امراء کی جانب سے خطوط موصول ہوئے ہیں کہ کلمتی، جتوئی اور دیگر زمینداروں نے سندھ کو خالی دیکھ کر لشکر جمع کر لیا ہے اور ہر طرف لوٹ مار کر رہے ہیں اس لئے مجبوراً میں ادھر واپس جا رہا ہوں۔"

سنہ ۹۳۵ھ کی ابتداء میں وہ رادھن پور کی راہ سے ٹھٹھہ کی طرف لوٹتا ہوا ٹھٹھہ پہنچ گیا۔ سنہ ۹۳۶ھ میں اس نے میر علیکہ ارغون کو گجرات اور بنگالہ کی فتوحات کی مبارکباد دینے کے لئے ہمایوں بادشاہ کے حضور میں بھیجا، اور میر خوش محمد ارغون کو قندھار کی تسخیر کی تہنیت میں مرزا کامران کی خدمت میں روانہ کیا۔ میر علیکہ نے شاہی چھاؤنی سے بغیر اجازت واپس آکر مرزا شاہ حسن سے کہا کہ "بادشاہ کی لاپرواہی سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ عنقریب کوئی غنیم اس پر حملہ آور ہو جائے گا اسی لئے میں فوراً واپس چلا آیا" اور ہوا ایسا ہی، کچھ ہی دنوں بعد شیرخاں نے ہمایوں پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں کے شکست کھا جانے کی خبر سندھ پہنچی تو مرزا شاہ حسن نے میر علیکہ کی دوراندیشی پر آفرین کی اور مجلس مشاورت طلب کی۔ اس میں اچ سے لیکر بکھر تک دریا کے دونوں کناروں کو ویران اور برباد کر دینے کا فیصلہ ہوا (۵۵)

### ہمایوں کی سندھ میں آمد

شعبان سن ۹۳۷ھ کے آخر میں ہمایوں کا لشکر اچ پہونچا۔ وہاں بخشو لاکھ بذات خود حاضر نہ ہوا البتہ لشکر کے خرچ کے لئے غلہ کی کچھ کشتیاں بھیج دیں۔

۲۸ رمضان کو شاہی لشکر، نے روہڑی میں پڑاؤ ڈالا اور بربلوکا "چار باغ"، جو فرحت و نظارہ کے اعتبار سے آپ اپنا جواب تھا، بادشاہ ہمایوں کی اقامت گاہ بنا۔ سلطان محمود خاں نے قلعہ کو مستحکم کر کے ساری کشتیاں منگوا کر اپنی طرف لنگر انداز کرائیں۔ بادشاہ نے حاضر ہونے کے لئے حکم بھیجا تو اس کے جواب میں اس نے عرض کیا کہ "میں میرزا شاہ حسن کا بٹک خور ہوں جب وہ حکم دے گا، قلعہ حوالہ کروں گا" لیکن شاہی لشکر گاہ میں غلہ کی قلت کا حال سن کر اس نے تقریباً پانچ سو غرار غلہ بھیج کر حق خدمت ادا کیا۔ یہ خدمت پسند کی گئی۔

بادشاہ نے امیر طاہر صدر اور سمندر بیگ کی معرفت مرزا شاہ حسن کو پیغام بھیجا۔ مرزا نے قاصدوں کا شایان شان استقبال کیا اور اقرار کیا کہ حضرت کے تشریف فرما ہونے پر ہالہ کنڈی سے لے کر ہٹھورہ تک دریا کے اس پار والے مواضعات حرم سرا کے اغراجات کے لئے حوالہ کر دے گا اور عہد و اقرار پختہ کرنے کے بعد حاضری کا شرف حاصل کرے گا، پھر اپنی کل فوج سمیت ہمرکاب رہتے ہوئے گجرات فتح ہونے کے بعد ہی واپس آئے گا۔

ترخانوں نے مرزا شاہ حسن کے اس انداز کو ٹال مٹول پر محمول کیا اور بکھر کا محاصرہ کر لیا پھر یادگار مرزا کو بکھر میں چھوڑ کر سیوستان کا عازم ہو گیا لیکن ہمایوں کے پہنچنے سے قبل شاہ محمود ارغون وغیرہ نے آس پاس کی عمارتیں مہندم کر کے چاروں طرف خندقیں کھدوا رکھی تھیں اور کشتیاں بھی جمع کر لی تھیں۔

ایسا ہی کچھ انتظام ٹھٹھہ میں بھی کیا گیا۔ ہمایوں نے بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس اثناء میں راجہ جودھپور نے اپنی طرف آنے کی دعوت دی اور وہ سندھ سے جودھپور کا عازم ہو گیا لیکن یہ سراسر فریب تھا لہذا ہمایوں راستہ بدل کر جیسلمیر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسی سفر میں عمر کوٹ کے مقام پر اکبر کی ولادت ہوئی۔



مرزا شاہ حسن نے ہمایوں کے جانے کے بعد تمام مقامات پر پھر قبضہ کر لیا اور جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی اسکو درست کر لیا۔

سنہ ۹۵۵ھ میں مرزا کامران ہزارہ سے سندھ پہنچا۔ مرزا شاہ حسن نے اپنی بیٹی اسکو بیاہ دی۔ اسکے کچھ ہی دنوں بعد ہمایوں نے کامران کو اندھا کر دیا۔ کہتے ہیں کہ مرزا شاہ حسن نے برے وقت میں ہمایوں سے بد سلوکی کی تھی اور ارغونوں اور ترخونوں پر مظالم ڈھائے تھے لہذا وہ فاج میں مبتلا ہو گیا۔

۹۶۲ھ میں مرزا عیسیٰ ترخان نے امراء کو ملا کر مرزا شاہ حسن کو ہٹانے کی سازش کی۔ مرزا حسن بے دست و پا ہو چکا تھا۔ انجام کار مرزا عیسیٰ اور محمود خان نے سندھ کو آپس میں نصف نصف بانٹ لیا اور ٹھٹھہ و بکھر کی دو حکومتیں وجود میں آگئیں اور مرزا حسن ان دونوں کے رحم و کرم پر زندہ رہا۔ اس نے ۶۶ سال کی عمر پائی اور ۳۴ سال حکومت کی۔

مرزا شاہ حسن ایک سخت گیر حکمران تھا مگر نہایت شجاع اور باہمت مورخین اس پر ہمایوں سے بیوفائی کا الزام لگاتے ہیں مگر امور مملکت میں وفا کے معنی کبھی متعین نہیں ہو سکے۔ مرزا شاہ بیگ نے اپنے زور بازو پر اقتدار حاصل کیا اور مرزا شاہ حسن اس کا جانشین تھا۔ ربط قدیم کو ملحوظ رکھ کر مرزا حسن نے اپنی خوشی سے بابر کا خطبہ جاری رکھا تھا جو امرائے سلطنت کی مرضی کے خلاف تھا۔ اب وہ ایسا تو نہ کر سکتا کہ اپنی سلطنت ہمایوں کے حوالے کر دیتا اور خود اس کا دست نگر بن کر رہ جاتا۔ یہی سلطنت ہی تو تھی جسکے لئے ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھر وادی تھیں۔

چند لفظوں میں مرزا شاہ حسن پر تبصرہ کیا جائے تو وہ سندھ کا عظیم حکمران تھا۔ خود بھی عالم و فاضل تھا اور علماء و فضلا اور سادات کی عزت کرتا تھا۔ اس کا شمار ہمیشہ سندھ کے بڑے فرمانرواؤں میں کیا جائے گا۔

### ترخان دور

مرزا عیسیٰ خان اول ۹۶۲ھ میں تخت پر بیٹھا، ۹۷۳ھ میں وفات پا گیا۔ اسکے

تین بیٹے بقید حیات رہے جن میں سے مرزا محمد صالح نے بغاوت کر کے مرزا محمد باقی اور چھوٹے بھائی مرزا جان بابا کو جلاوطن کر دیا اور مرزا عیسیٰ کو نظر بند کر دیا آخر مرید بلوچ نامی شخص نے ذاتی دشمنی کی بنا پر مرزا صالح کو قتل کر دیا تو مرزا باقی واپس آگیا اس کا دور حکومت بارہ سال رہا۔ اس درمیان ایک مرتبہ وہ بکھر گیا ہوا تھا تو گوا کے بندر گاہ سے نکل کر فرنگی ٹھٹھہ پر حملہ آور ہو گئے۔ انہوں نے پورے شہر اور حویلی کو تباہ کر دیا۔ واپسی پر مرزا عیسیٰ نے ٹھٹھہ کو سمندر سے ملانے والی نہر میں پتھر ڈلو کر کشتی چلانے کے قابل نہیں رکھا اور شہر کو محفوظ کر دیا۔

### مرزا باقی

مرزا عیسیٰ کے بعد ٹھٹھہ کا حکمران ہوا۔ وہ حد درجہ بخیل اور جرس تھا اور ظالم بھی۔ کئی عالموں اور مشائخ کو اس نے قتل کر دیا اور غارتہ بھرنے کیلئے رعایا کو بہت سٹیلہ لوگ اسکی مملکت سے ترک وطن کر گئے۔ ۹۹۳ھ میں اپنے بیٹے شاہرخ کی موت پر اسکو اتنی پشیمانی ہوئی کہ خود اپنے کو ہلاک کر لیا۔ اس کا بیس سالہ دور سندھ کیلئے سیاہ ترین دور تھا۔ مرزا جان بابا اس کا چھوٹا بھائی تھا، اسکو اس نے قتل کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا پائندہ بیگ اسکی زندگی ہی میں جانی بیگ کو اپنی یادگار چھوڑ کر مر گیا تھا جو دادا کے بعد تخت نشین ہوا۔

### مرزا جانی بیگ

۹۹۳ھ سے وہ دادا کے مظالم کا کفارہ ادا کرتا رہا۔ اس نے علم دوستی اور فیاضی کی وہ روایات قائم کیں کہ جلد ہی لوگ مرزا باقی کے عہد کو بھول گئے۔ اسکے عہد میں ٹھٹھہ کے نئے دور کا آغاز ہوا کہ اکبر اعظم کے حکم پر عبدالرحیم خاننہان نے ٹھٹھہ کا محاصرہ کر لیا۔ جانی بیگ سے مغل فوجوں کے کئی معرکے ہوئے جن میں اہل سندھ نے شکست کھائی۔ سنہ ۱۰۰۱ھ میں جانی بیگ نے مغلوں کی اطاعت کر لی۔ اکبر اعظم نے اسے منصب جلیل سے سرفراز کیا۔ سندھ مغل حکومت کا حصہ بن گیا اور جانی بیگ کا کسٹن بیٹا ٹھٹھہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ (غازی بیگ) سلطان محمود بھکری

مرزا شاہ حسن کے بعد وہ بھکر پر قابض ہو گیا تھا مگر بہت سفاک حکمران تھا۔



مرزا عیسیٰ سے اسکی کئی لڑائیاں ہوئیں پھر صلح ہو گئی۔ اکبر اعظم کو بھکر کے حالات کا علم ہوا تو اس نے محب علی خاں کو متعین کیا جس نے اس کا نصف سے زائد علاقہ فتح کر لیا۔ اس پر محمود خاں نے اکبر کو لکھا کہ محب علی خاں کے علاوہ کسی اور کو بھیجا جائے تو بھکر حوالے کر دے گا۔ اکبر نے گیسو خاں کو روانہ کیا لیکن اس سے قبل محمود خاں بیس سال حکومت کر کے مر گیا اور ۹۸۲ھ میں بھکر سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا۔

### سندھ کے مغل گورنر

#### مرزاغازی بیگ

خسرو خاں، مرزا احمد بیگ اور بندو خاں اکبری طرف سے اسکے اتالیق تھے۔ آٹھ سال تک اس نے بڑی کامیاب حکومت کی۔ رعایا بھی اسکے عہد میں مطمئن اور خوشحال رہی۔ ۱۰۱۳ھ میں اسکو پنج ہزاری منصب ملا۔ پھر دور جہانگیری میں مزید اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۰۲۱ھ میں کسی نے اسکو زبردستی یا۔ منتظم، شجاع، علم پرور تھا اور خود بھی بہت اچھا شاعر تھا۔

#### مرزا عیسیٰ خان ترخان دوم

عیسیٰ خان اول کے بیٹے جان بابا کا بیٹا تھا، ۱۰۱۳ھ میں دربار اکبری میں پہنچا مختلف صوبوں کا گورنر رہا، ۱۰۳۸ھ میں ٹھٹھہ آیا، نو ماہ کے بعد پہلے گجرات پھر دکن بھیج دیا گیا۔ یہ زمانہ جہانگیری کا تھا پھر عہد شاہجہانی میں مختلف عہدوں پر فائز رہا، ۱۰۶۲ھ میں طویل عمر پا کر وفات پائی۔

سندھ مرزاغازی بیگ کے عہد میں مغلوں کے قبضے میں آیا۔ اس وقت سے گورنری ترخانی خاندان کی رہی۔ انکی نیابت میں مغل امراء کام کرتے رہے۔ دور اکبری میں شاہرخ مرزا اور خسرو چرکس، عہد جہانگیری میں ۱۰۰۹ھ سے ۱۰۲۱ھ تک غازی خان ترخان کی نیابت میں مرزا عیسیٰ خان، بندو خان اور خسرو خاں چرکس کام کرتے رہے۔ پھر مرزا عیسیٰ خاں کا زمانہ آیا اس لئے مغل گورنر باختیار ہو گئے۔

مرزا عبدالعلی ترخاں، مرزا رستم قندھاری، تاج خاں، ارسلان بیگ، میر عبدالرزاق گورنر رہے۔ مرزا شاہ بیگ ارغون، سید بایزید بخاری، سید ابراہیم، شریف الملک اور مرزا ابو سعید ان کے بعد متعین ہوئے۔ پھر عہد شاہجہانی میں عیسیٰ

ترخاں کے بعد سید بادشاہ، مرتضیٰ خاں، میر ابو البقا امیر خاں، یوسف محمد خاں، دولت خاں خواص، غیرت خاں، مغل خاں، میر ابو البقا بار دوم، عالمگیر، سعید خاں جعفر خاں مغل خاں سردار خاں اور ظفر خاں احسن گورنری کے عہدے پر فائز ہوئے۔

عہد اور نگر نیب میں قباد بیگ اوزبک، لشکر خاں، غصنفر خاں، عرت خاں، ابو النصر خاں، سعادت خاں، کفایت خاں، سید عبدالرزاق، خانہ زاد خاں، سردار خاں، مرید خاں، ابو النصر خاں، نواب حفظ اللہ خاں، سعید خاں، یوسف خاں احمد یار خاں سندھ بھیجے گئے۔

اور نگر نیب کی وفات کے بعد سعید خاں، مہین خاں، شاکر خاں اور مہین خاں متعین ہوئے پھر یکے بعد دیگرے بارہ صوبہ دار دہلی سے آئے اور سندھ کا نظم و نسق دیکھتے رہے مگر مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ سندھ میں بھی حکومت کی باگ ڈھیلی پڑتی رہی۔

۱۱۴۳ھ میں نواب دلیر خاں سندھ کا صوبہ دار ہوا۔ وہ دو سال رہا۔ اسکے بعد صوبہ ٹھٹھہ عمدۃ الملک امیر خاں کو اجارہ داری پر بطور انعام دیا گیا۔ ۱۱۴۵ھ میں دلیر خاں کے بیٹے نے امیر خاں سے پٹے پر لے لیا اور چار سال تک اس کا انتظام سنبھالتا رہا اس مدت کے بعد ۱۱۴۵ھ میں نواب صادق علی خان نے اجارے پر امیر خاں سے لے لیا۔ دو سال بعد نور محمد کھوڑا کے وکیل شیخ غلام محمد نے لے لیا اور اسکے بعد مغل حکومت ختم ہو گئی اور کھوڑا دور کا آغاز ہوا۔ جسکے پہلے فرمانروا نور محمد کے والد یار محمد تھے جنکو معمار اول کی حیثیت حاصل ہے۔

ارغونوں کی حکومت سے آخری مغل صوبہ دار تک سندھ کا جائزہ لیا جائے تو ترخانوں تک سب شیعہ مسلک کے لوگ تھے اور مغل صوبہ داروں میں بھی بعض یہی عقیدہ رکھتے تھے، باقی سنی الملک۔ کھوڑے سارے کے سارے حنفی العقیدہ تھے، بعض روادار اور بعض بہت کثران میں اشاعریوں کی بھی ایک تعداد تھی جن میں بعض نوشیعہ تھے اور بعض کا آبائی مسلک یہی تھا لیکن اہل سندھ میں وطنیت ہمیشہ سے غالب رہی لہذا عقیدے کو بہت کم اہمیت دی گئی۔ مجموعی طور پر کھوڑا عہد پچھلے ادوار کے مقابلے پر صبر آزار رہا۔



## کھوڑا دور حکومت

یہ خاندان نسلی طور پر عباسی تھا جسکے اسلاف ۲۵۹ھ میں سندھ آئے۔ پھر دوسرے لوگ مختلف سنیں میں پہنچتے رہے۔ چونکہ یہ لوگ کھوڑا نام کے پہاڑ پر مقیم ہوئے تھے لہذا پہلے کھوڑا کہلائے پھر کھوڑا بن گئے۔ دوسرے قبیلوں کی طرح یہ خاندان بھی طالع آزمائی کرتا رہا مگر سندھ میں اسکی حیثیت اس وقت سے مقرر ہوئی جب اس نے صوبہ ٹھٹھہ کی حکومت ٹھیکے پر لی اور یہی سندھ میں اسکی حکومت کا نقطہ آغاز ہے۔

۱۱۳۳ھ میں میاں نور محمد کو استقرار حکومت میں پہلے اپنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا پھر دوسرے مد مقابل ہوئے لیکن اس نے زور بازو سے ہر مشکل کو آسان بنالیا اور اسی دوران سلطنت دہلی سے رابطہ قائم کر کے سندھ حکومت حاصل کر لی پھر داؤد پوتوں سے جنگ ہوئی جو عباسیوں ہی کی ایک شاخ تھے اسکے بعد بروہیوں سے لڑنا پڑا جو قلات کے حکمران تھے۔

ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے سے سندھ بھی محفوظ نہ رہا۔ میاں نور محمد اس سے ایک ٹکر بھی نہ لے سکتا تھا لہذا مجبوراً اسکو اطاعت کرنا پڑی۔ محرم ۱۱۵۳ھ میں نادر شاہ لاڑکانہ میں تھا۔ یوم عاشور گزار کر ۱۱ محرم کو وہ قندھار روانہ ہو گیا۔

چلتے وقت اس نے سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سبی اور کچھ محبت خاں والی قلات کو، شکار پور داؤد پوترہ کو دیا اور بقیہ سندھ نور محمد کھوڑہ کیلئے چھوڑ دیا اور نور محمد کے دو بیٹوں کو ساتھ لے گیا جو اسکے قتل کے بعد سندھ واپس ہو سکے۔

میاں نور محمد نے اسکے جانے کے بعد ملک پر قابو حاصل کر لیا کہ احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا۔ نور محمد نے اسکو بھی جھیلنا اور ۱۲ صفر ۱۱۶۷ھ میں وفات پائی۔ بڑا منتظم، اولوالعزم، علم دوست اور رعایا پرور حکمران تھا۔ عقیدے میں حنفی تھا لیکن اپنے بیٹوں کیلئے جو وصیت نامہ چھوڑا ہے، اس میں لکھا ہے "اہل بیت کی محبت ہمیشہ یکساں اور ہر وقت ہونا چاہئے اور ذوی القربی کی محبت فرض عین اور عین فرض ہے"۔ اس نے بلا تفریق مذہب و مسلک بڑے بڑے علماء و شعراء اپنے دربار میں جمع کیے تھے۔

## محمد مراد یاب خان

۱۱۶۷ھ میں باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ وہ ایک صوفی منش آدمی تھا۔ بہت جامد اس۔ نے ایک بڑا حلقہ ارادت پیدا کر لیا جس میں فقراء، بلوچ اور جاٹ سب شامل تھے۔ اس پر امرائے سلطنت سے اختلاف پیدا ہوا اور مراد یاب نے کسی خطرے کے پیش نظر اپنا غزانہ مسقط منقول کرنا شروع کر دیا جس پر عمائدین نے باہمی صلاح و مشورہ سے اسکو معزول کر دیا اور ۱۱۷۰ھ میں اسکے بھائی میاں غلام شاہ کو تخت نشین کر دیا۔

## میاں غلام شاہ

اس نے خدا باد نام کا ایک شہر بسا کر اسکو دارالحکومت قرار دیا مگر اسکے بھائی احمد یار خان نے اسکی بادشاہت کو تسلیم نہیں کیا اور دوسرا بھائی محمد عطر خان احمد شاہ ابدالی سے حکومت سندھ کی سند لے آیا۔ غلام شاہ پہلے جیسلمیر پھر بیکانیر گیا اور وہاں سے بہاولپور کے رئیس محمد مبارک خاں کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اسکی مدد لیکر سندھ آگیا۔

روہڑی میں اس سے دونوں بھائیوں کے لشکر کا مقابلہ ہوا جس میں غلام شاہ کامیاب ہوا اور ایکبار پھر بھائیوں میں سندھ کی تقسیم ہو گئی لیکن غلام شاہ نے ہر شورش کو دبا دیا اور ہر جنگ میں فتح حاصل کی اس پر اسکو افغانستان کے دربار سے خطابات عطا ہوئے۔ اسکو نظم و نسق کا شعور اور تعمیرات کا بڑا ذوق تھا اور دیانے سندھ کے کنارے نیروں کوٹ کے مقام پر ذی قعد ۱۱۸۲ھ میں اس نے ایک شہر آباد کیا جس کا نام حیدر آباد رکھا۔ جمادی الاول ۱۱۸۶ھ میں سولہ سال کامیاب حکومت کر کے اس کا انتقال ہو گیا۔

رعب و دبدبہ کے لحاظ سے وہ سندھ کا بڑا حکمران تھا مگر مخدوم محمد ہاشم کی تحریک پر اس نے جلوس ماتم اور تابوت نکالنے پر یا بندی عاید کی تھی۔

## میاں محمد سر فراز خان

غلام شاہ کا یہ بیٹا ۱۱۸۶ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس نے نظم حکومت سنبھالنے کے بعد ۱۱۸۸ھ میں کچھ کو مسخر کیا۔ نالپروں سے اسکے خاندان کا بڑا پرانا رشتہ رہا تھا۔



میاں یار محمد کے وقت میں میر شہداد اس کا دست راست تھا۔ اسکے تین بیٹے تھے۔ میر جام نندو، میر چاکر اور میر بہرام۔ یہ سب نور محمد کھوڑا، مراد یاب خاں اور غلام شاہ کے ادوار میں بڑی دیانت سے خدمات کی بجا آوری کرتے رہے تھے لیکن سرفراز خان کو درباریوں نے بہرام خاں کے خلاف کر دیا جس میں تاجہ اللہ بخش لیکھی پیش پیش تھا۔ بہرام خان کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے اطاعت کو بغاوت پر ترجیح دی اور اپنے بیٹے میر بجار کو حج کے بہانے سے ہٹا دیا۔ میر صوبدار باپ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوا۔

آخر ایک دن وہی ہوا۔ میر بہرام کو بہانے سے بلایا گیا اور اس کا سرتار لیا گیا بیٹے نے باپ کا یہ عالم دیکھا تو جھنجھکا کر تاجہ لیکھی کے پیٹ میں گھونپ دیا وہ تونچ گیا لیکن صوبدار خاں خود قتل ہو گیا۔

میروں کو اپنے اخلاق اور حسن سلوک سے "برکیوں" کی سی حیثیت حاصل تھی۔ وفاداروں کے قتل ناحق پر سرفراز خاں کے خلاف عام نفرت پھیل گئی اور میروں کے خاندان والے تو جوش انتقام میں دیوانے ہو گئے۔ بہرام کے چچیرے بھائی میر فتح خان نے ٹالپروں اور بلوچوں کو جمع کیا اور خدا باد پر ہلہ بول دیا۔ قالم بہت بزدل ہوتا ہے۔ سرفراز بدحواس ہو کر صرف چند ساتھیوں کے ساتھ پایادو بھاگ نکلا اور حیدر آباد پہنچ کر دم لیا۔

خدا باد پر قبضہ کر کے میر فتح خاں نے پرانے روابط کو ملحوظ رکھا اور سرفراز کے چھوٹے بھائی محمود خاں کو ۱۱۸۹ھ میں تخت پر بٹھا دیا۔

### میاں محمود خاں

میر فتح خاں میر بجار کو سربراہ خاندان سمجھتا تھا لہذا جب راجہ لیکھی نے غزانے کنجیاں اسکو پیش کیں تو اس نے انتظار کرنے کو کہا جس سے تاجہ لیکھی نے فائدہ اٹھایا۔ میاں محمود خاں کو ایک مقام پر لے جا کر قید کر دیا اور اسکی جگہ نور محمد کے بیٹے غلام نبی کو حکمران بنا دیا۔

### میاں غلام نبی

غلام نبی کو تخت نشین ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ میر بجار حج سے

واپس ہوا۔ کرلہی کی بندرگاہ پر اتر کر وہ قلات آیا جہاں محمد نصیر خاں والی قلات نے اس کا استقبال کیا اور اسکی مدد کیلئے ایک فوج تیار کی۔ اسپر میر بجار نے کہا۔

"میرے لئے باعث شرم ہے کہ میں اپنے ہی ملک پر فوج لیکر چرمحائی کروں !

"میں نے خدا سے مدد چاہی ہے۔ پنجن پاک میرے مددگار و ناصر ہیں۔ تم تو

صرف میرے لئے دعا کرو اور مجھے خدا کے حوالے کرو" (۵۶)

اس سے رخصت ہو کر میر بجار سندھ پہنچا تو اس کا بیٹا میر عبد اللہ میر فتح خاں میر فتح علی خاں، میر غلام علی، میر سہراب، امیر محمود خاں، میر اللہ یار اور میر ٹھارہ خاں وغیرہ نے اسکے لئے آنکھیں پٹھادیں۔ وہ سب کے سب فوراً کھوڑوں پر حملہ کر دینے کے حق میں تھے مگر میر بجار نے توقف سے کام لینے کی ہدایت کی۔ اسکے بعد میاں غلام نبی کا فرمان پہنچ گیا کہ اگر وہ جنگ کرنا چاہتا ہے تو آگے بڑھے ورنہ اپنا راستہ لے۔

کہا جاتا ہے کہ تاجہ لیکھی، اسکے بیٹے اور اعزاء و اقربا میاں غلام نبی پر چھائے ہوئے تھے، انہیں نے یہ فرمان میر بجار کے نام بھجوا دیا تھا۔ بالفاظ دیگر اسکو لٹکا رہا تھا۔ میر بجار نے پھر بھی کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ عمر کوٹ کی طرف روانہ ہوا اور قلعہ پر قابض ہو گیا۔

تاجہ لیکھی غلام نبی کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ لیکر بڑھا اور ایک شخص اللہ بخش جھنجھ کو بھیج کر میر بجار سے کہلوایا کہ میاں غلام نبی اس سے لڑنا نہیں چاہتا وہ قلعہ سے باہر نکلے تو دونوں میں صلح ہو جانے لگی۔ میر بجار خود صلح پسند آدمی تھا وہ اسکے فریب میں آگیا اور اپنے ساتھیوں کو لیکر قلعہ سے باہر آکر مستحکم ہو گیا مگر دو ماہ گزر جانے کے باوجود کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

بات یہ تھی کہ قلعہ کا فتح ہونا آسان نہ تھا لہذا تاجہ لیکھی نے اس ترکیب سے میروں کو باہر بلایا تھا جسکو بہت دیر میں میر بجار سمجھ سکا۔ تاجہ لیکھی تیس ہزار کا لشکر لیکر آیا تھا جسکے مقابلے میں چھ ہزار کی کچھ حقیقت نہ تھی لیکن میروں کے سپاہی ایک مقصد کیلئے لڑنے آئے تھے انہوں نے تیس ہزار کو کاٹ کر رکھ دیا۔

میاں غلام نبی نے جب شکست کو یقینی دیکھا تو میر بجار کے پاس قرآن بدست آدمی بھیجا کہ وہ تاجہ لیکھی کے ہاتھوں مجبور ہو کر آیا تھا اسکی خیمہ تاجہ لیکھی کو



ہو گئی اور وہ میاں غلام نبی کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔

میر بجار نے بڑے شان و شکوہ سے میاں غلام نبی کا جنازہ حیدر آباد بھجوا دیا اور مفتوحین کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔

میاں غلام نبی ایک عالم و فاضل، فیاض، غریب نواز، شاعر اور ادب پرور حکمران تھا مگر قسمت کا بیٹا تھا، عمر بھر دشمنوں کے جنگل میں گرفتار رہا اور آخر میاں سرفراز کی ناعاقبت اندیشی کی بھینت چرھ گیا۔

### میاں عبدالنبی

میاں غلام نبی کا تابوت حیدر آباد پہنچنے پر میاں نور محمد کا چھوٹا بیٹا عبدالنبی ۱۱۹۰ھ میں تخت نشین ہو گیا۔ میاں بجار نے اسکو ہالہ کنڈی بلو کر اسکی حکومت کو تسلیم کر لیا اور نظام سلطنت خود سنبھال لیا۔

سندھ کے حالات کی خبر پا کر احمد یار خاں کا بیٹا عرت یار افغانستان سے ایک بڑا لشکر لے کر سندھ پر حملہ آور ہوا اور لکھی اور شکار پور کے درمیان میر بجار سے شکست یاب ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کو اسکی خبر ملی تو وہ ایک لشکر دتار کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔

میر بجار کو اس سے ایک پریشانی لاحق ہوئی پھر بھی اس نے ہوش و حواس برقرار رکھے۔ میاں عبدالنبی کو لے کر وہ روہڑی آیا اور دریا پر کشتیوں کا ایک پل بنوایا پھر اس نے ایک عریضہ تیمور شاہ کو روانہ کیا کہ آپ کے بھیجے ہوئے افغانوں نے سندھ کے حکمران کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کیا۔ انکی عرت آپ ہی کی دی ہوئی ہے۔ اس لئے ان سے لڑنا پڑا۔ آپ آنا چاہتے ہیں تو روہڑی میں دریا پر کشتیوں کا پل بنوایا گیا ہے تاکہ لشکر کو عبور کرنے میں دشواری نہ ہو۔

اس خط کے پہنچنے سے تیمور شاہ کچھ نرم پڑا پھر میر بجار خود تیمور شاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ایسی چکنی چڑی باتیں کیں کہ تیمور شاہ نے عبدالنبی کو سندھ کی حکومت عطا کی اور افغانستان واپس ہو گیا۔

یہ میر بجار کا کارنامہ تھا اور صرف اسی پر موقوف نہیں، سندھ کیلئے اسکی خدمات ناقابل فراموش تھیں۔ میاں عبدالنبی کو اس نے کسی قیدی بادشاہ کی طرح

نہ رکھا تھا بلکہ وہ ہر لحاظ سے آزاد تھا۔ میر بجار کوئی کام اسکے مشورے کے بغیر نہ کرتا اور خود اس کا سلوک عوام کے ساتھ بیٹوں جیسا تھا۔ ہر چھوٹا، بڑا اس کا گرویدہ تھا اور اہل خاندان تو اسکے فدائی تھے۔

میروں کے خاندان کا حفظ مراتب اور انسان دوستی ہمیشہ سے ضرب المثل رہی تھی اور انہیں اوصاف کی بنا پر ہم عصر علماء اور درباری ان سے خار کھاتے رہے تھے۔ ایسے ہی کچھ حالات تھے جن میں میر بہرام خاں قتل ہوا، اب بیٹے نے باپ کی جگہ لی تھی تو وہ بھی ویسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔ آخر عبدالنبی نے مسلسل کان بھرے جانے کے بعد اسکو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور اتنی احتیاط کی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

میر بہرام خاں بھرے دربار میں مارا گیا تھا، میر بجار کو حیلہ کر کے الگ بلایا گیا اور اچانک کئی آدمیوں نے اسپر تلوار کے بھرپور وار کر دیے اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

قتل کی خبر پھیلنے ہی سارے شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ ہر شخص اسکو اپنے کسی بزرگ کی موت کے مترادف سمجھتا۔ عورتیں تو ڈھاریں مار مار کر رو رہی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ سندھ کی سرزمین نے ایسے بہادر، مدبر اور فرشتہ خصلت انسان کم ہی پیدا کئے تھے۔

میر فتح خان نے تجہیز و تکفین کے انتظامات کیے میر عبداللہ بن میر بجار باہر گیا ہوا تھا اسکے آنے پر سب نے اسکو سربراہ خاندان بنالیا۔ اس نے لوگوں کے کہنے کے باوجود عبدالنبی کو قاتل قرار نہیں دیا مگر خود عبدالنبی کے دل میں چور تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو جو دھ پور بھیج دیا اور خود جھنجھن اور جتوئی قبیلے کے آدمیوں کو لیکر قلات کی طرف بھاگ گیا جسکے بعد وجہ قتل اور دست قاتل دونوں روشنی میں آ گئے۔ میر عبداللہ نے پھر بھی عبدالنبی کے بجائے بعض اہل دربار کو قتل کا ذمہ دار ٹھہرا کر عبدالنبی کو بلوانے کی کوشش کی مگر وہ مجرم تھا لہذا مارے ڈر کے نہیں آیا اور میر عبداللہ نے اسی خاندان کے ایک شخص صادق علی عباسی کو تخت پر بٹھادیا۔



میر عبداللہ سرزمین سندھ کی غارت گری اور سندھیوں کی خونریزی پر تڑپ اٹھا۔ اس میں افغانستان کے اتنے بڑے لشکر سے متصادم ہونے کی طاقت نہ تھی مگر وہ سندھ کی تاریخی بھی برداشت نہ کر سکتا اس لئے اس نے میر اور بلوچ سرداروں کو جمع کیا، انہیں حمیت اور غیرت دلائی تو وہ جذبہ وطنیت سے بے چین ہو گئے اور سب لڑنے کیلئے تیار ہو گئے۔

اسکی خرم دغاں کو پہنچی تو اس نے میر عبداللہ کو خط لکھا کہ وہ لڑنا نہیں چاہتا۔ بادشاہ کو لکھے گا، جیسا جواب آئے گا اس پر عمل کیا جائے گا۔ میر عبداللہ نے اس کا بڑا نرم جواب دیا پھر مدد خان قسم پوری کرنے کیلئے دریائے سندھ خدا باد پہنچ گیا جہاں اس نے عبدالنبی سے خزانہ مدفون کا پتہ دریافت کیا اور وہ جب کچھ بتا سکا تو اس نے پہلے سے کہیں زائد لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔

اسکی اطلاعات میر عبداللہ کو ہوئیں تو اس نے مزید جنگی تیاری شروع کر دی اور مدو خاں کو لکھا کہ اس نے وعدے کے خلاف اہل سندھ کو استبداد مصائب سے دوچار کر دیا ہے جو اسکے شایان شان نہیں ہے۔ اس کا جواب مدو خاں نے یہ دیا کہ آئندہ وہ ایسی باتوں کی روک تھام کرے گا لیکن اگر وہ شاہ افغانستان کا مطیع ہے تو فوج کو واپس کر دے اور خود ہمارا بننا قبول کرے تاکہ ہم اپنے بادشاہ کو لکھ سکیں کہ اہل سندھ باغی نہیں ہیں۔

میر عبداللہ نے اسکو چال قرار دیا مگر فتح خاں اور میر سہراب مدو خاں کے پاس جانے کو تیار ہو گئے۔ آخر میر عبداللہ فوج کو لیکر دین گڑھ کی طرف چلے پڑا اور فتح خاں مدو خاں کی طرف روانہ ہو گیا۔

مدو خاں نے فتح خاں کے پہنچتے ہی اسکو حراست میں لے لیا اور اسکے گلے پر چھری رکھ کر ایک خط عبداللہ کو لکھوایا کہ وہ تمام بڑے سرداروں کے ساتھ آجائے۔ فتح خاں نے یہ خط تو لکھ دیا مگر رات کے اندھیرے میں بھیس بدل کر نکل بھاگا اب مدو خاں نے میر عبداللہ کو پھانسنے کی ایک تدبیر اور کی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو وہ عبدالنبی کو چھوڑ کر افغانستان چلا گیا۔

اب عبدالنبی نے بہاول خاں نواب بہاول پور کو بیچ میں لیا اور بعض

## صادق علی خان

یہ فقیر صفت آدمی تخت نشین ہوا ہی تھا کہ عبدالنبی کی تحریک پر ایک طرف مہاراجہ جودھ پور کا لشکر، دوسری طرف سے قلات کی فوجیں سندھ پر چڑھ دوڑیں۔ میر عبداللہ نے پہلے جودھ پوری لشکر کی طرف پیش قدمی کی اور فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور چوتھا حصہ سب کے آگے رکھا جس میں میر فتح خاں، میر فقیر اور اس کا بیٹا باغہ فقیر تھے اور فوج زیادہ تر نظامانیوں، لغاریوں اور جمالیوں پر مشتمل تھی۔

جودھ پوری بڑے طمطراق سے آئے تھے مگر میر فتح علی خاں نے میرے پر اتنے زور کا حملہ کیا کہ راٹھوروں کے پاؤں اکھڑ گئے اسکے بعد دوسرے حصوں کی یلغار میں جودھ پوری جنس، خیمے، توپیں، اونٹ اور ہاتھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس عرصے میں بردہی لشکر لاڑکانہ سے آگے بڑھ کر قریب پہنچ چکا تھا۔ اس لشکر میں خود عبدالنبی اور محمد نصیر کا داماد زرق خاں موجود تھا۔ میر عبداللہ جانتا تھا کہ یہ لشکر زیادہ جاندار ہے لہذا اسکے مقابلے کیلئے لشکر کی ترتیب میں اس نے بڑی احتیاط سے کام لیا اور افسران فوج کو بعض ہدایات بھی دیں۔

پل چالک کے قریب اہل سندھ کا اس سے ٹکراؤ ہوا۔ ایک ہولناک معرکہ پیش آیا اور لاشوں پر لاش گرنے لگیں۔ آخر خود میر عبداللہ نے قلب پر استاز بردست حملہ کیا کہ زرق خاں کو سنبھلنا مشکل ہو گیا مگر اس نے میدان نہ چھوڑا آخر وہ لڑتا ہوا مارا گیا۔

یہ فتح میر عبداللہ کی عظیم فتح تھی جسکے بعد سندھ پر اسکی دھاک بیٹھ گئی۔

عبدالنبی میدان جنگ سے قلات پہنچا پھر افغانستان جا کر تیمور شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس زمانے میں افغانستان کا ایک سردار مدو خاں اسحق زئی محمد بہاول کے ملک میں آیا ہوا تھا۔ عبدالنبی محمد نصیر کے واسطے سے اسکے پاس پہنچا اور تیمور شاہ کا فرمان اسکو پہنچایا جس میں عبدالنبی کی مدد کا حکم دیا گیا تھا۔ مدو خاں نے اغراجات لشکر کا سوال اٹھایا تو عبدالنبی نے سندھ میں لوٹ مار کا راستہ دکھا دیا۔

دوسرے لوگوں کے ذریعہ صلح کی درخواست کی اور سب کے آخر میں ایک کلام پاک پر ایٹھے عہد کا اقرار لکھ کر میر عبداللہ کے پاس بھیج دیا۔ اس نے قرآن مجید کو بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھ کر کچھ سوچتا رہا۔ شاید اسے جنگ صفین یاد آگئی ہو، جب لیتہ الحریر میں شکست ہونے سے قبل لشکر شام سے نیزوں پر قرآن بلند کر دئے گئے تھے۔

میر عبداللہ نے کہا۔

"میں اپنے باپ اور چچا کے طریقے پر چلوں گا اور انہیں کے طریقے پر اس دنیا سے رخصت ہوں گا۔"

پھر وہ میر فتح علی خاں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میرے بعد میرے بچے بہرام خاں اور غلام حسن خاں یتیم ہو جائیں گے۔ انہیں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔"

پھر وہ اٹھا اور عبدالنبی کے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے میر عبداللہ کو بڑی عزت اور احترام سے ٹھہرایا اور اس کا اعتماد بڑی حد تک حاصل کیا۔ میر فتح خاں بھی اسکے ساتھ تھا۔ ان دونوں کو اس نے اتنا مطمئن کر دیا کہ وہ محافظ لیے بغیر اس سے ملنے لگے اور آخر ایک دن اس نے انہیں گرفتار کر لیا اور پھر ان کے سر قلم کر دائے

سندھ کی فضا ایکبار بہرام خاں کی موت پر سو گوار ہوئی تھی، دوبارہ میر بہار کے غم میں باب میر عبداللہ انہیں کے رستے پر گیا تو گھر گھر صف ماتم بچھ گئی۔ نالہروں نے خبر پاتے ہی بیوی بچوں کو دین گڑھ بھیجا اور چھ ہزار بلوچوں کو لیکر عبدالنبی پر حملہ کر دیا۔ اسکے پاس کافی فوج تھی لیکن اس نے شکست کھائی اور وہ میدان چھوڑ گیا لیکن مسلسل تنگ و دو کرتا رہا اور تیس ہزار کا لشکر لیکر پھر میروں پر چڑھ دوڑا۔

میروں کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی لیکن انتقام کے جنون میں وہ مقابلے پر آگئے پیکان اندازی کے بعد میر فتح علی خاں نے تلوار سوخت لی اور گھوڑے سے اتر کر بھوکے شیر کی طرح قلب لشکر پر ٹوٹ پڑا، دوسری طرف سے میر سہراب اور میر حسن نے مردانہ وار یلغار کی اور حرینوں کو کھیرے گکڑی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ ایسے

بہادروں کا مقابلہ کون کرتا۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا اور عبدالنبی اس طرح بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور سیدہ قلات پہنچ گیا۔

میر نصیر خاں اب اسکی مدد کیلئے تیار نہ تھا لیکن جب وہ قدموں پر گر گیا تو اس نے ایک فوج ساتھ کر دی جس نے اسکو دریا پار اتار دیا۔ فتح علی خاں نے نصیر خاں سے خفیہ معاہدے کے تحت بروہی فوج پر حملہ نہیں کیا اور وہ غلات واپس ہو گئی۔ آخر عبدالنبی بھاگ کر پھر افغانستان چلا ہوا۔

اس اثناء میں میر فتح علی خاں میر آباد فتح کر کے سندھ کا فرمانروا بن چکا تھا۔ تیمور شاہ نے عبدالنبی کی فریاد پر میر فتح علی خاں سے واقعات دریافت کیے اور اس نے بے کم و کاست سب کچھ لکھ بھیجا۔ تیمور شاہ نے نصف ملک عبدالنبی کو دینے کا حکم صادر کر دیا اور دو افغان سرداروں کو فوج دے کر اسکے ساتھ کر دیا۔

میر فتح علی خاں شاہ افغانستان کی مسلسل مداخلت سے عاجز آچکا تھا اس نے تقسیم سندھ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور چالیس ہزار فوج لے کر روہڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسکے ساتھ ہی اس نے تیمور شاہ کی خدمت میں اپنے سفیر بھیج دئے اور پورے سندھ کی سند حکومت حاصل کر لی۔ ۱۱۹۹ھ میں اس نے ایک شہر کی بنیاد ڈالی جس کا نام فتح آباد رکھا۔

نالہروں کی یگانگت اور یک جہتی نے انکو اس عروج پر پہنچا دیا تھا لیکن جب زمین اور زور درمیان میں آیا تو ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ میر فتح علی خاں نے سارے ملک کو سات حصوں میں بانٹ کر چار حصے اپنے اور اپنے تین بھائیوں کیلئے رکھے تھے دو حصے میر سہراب کے اور ایک ٹھارہ خاں کا لیکن سہراب اور ٹھارہ خاں اس پر راضی نہیں ہوئے سہراب نے روہڑی پر مستقل اقتدار حاصل کر لیا جو ریاست خیرپور کی بنیاد بنا۔ ٹھارہ خاں نے شاہ بندر میں حکومت قائم کر لی۔

عبدالنبی بے سہارا اور مایوس ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنی جدوجہد ترک نہیں کی اور دربار افغانستان میں لگا رہا۔ وہاں اس نے یہ خبر بھی پہنچائی کہ سندھ تین حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اس پر تیمور شاہ نے پھر اسکو سند حکمرانی عطا کر دی اور



مالپرا فرمانروائے سندھ

### حسب و نسب

یہ قبیلہ حضرت حمزہ کی اولاد میں تھا جو کرمان و مکران سے پانچویں صدی ہجری میں موجودہ بلوچستان کے علاقے میں وارد ہوا۔ کچھ لوگ وہیں رہ گئے اور کچھ سندھ میں منتقل ہو گئے۔ نالہ ان کے ایک بزرگ کا نام تھا اور پور بھٹنی اولاد۔ اس طرح نالہ پور کہا گیا پھر نالپر ہو گیا۔

انہیں میں سے ایک بزرگ گلہ یا گلو خاں عرف سلیمان خاں تھے جنکے آٹھ بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام ہونک خاں اور تیسرے کا نام مانک خاں تھا ایک بیٹے کا نام شہداد خاں، جس نے شہداد پور آباد کیا۔ اسکے بیٹوں میں میر چاکر خاں اور میر بہرام خاں تاریخ میں بہت نامور ہوئے۔ چاکر خاں نے شاہ پور چاکر آباد کیا میر سہراب خاں اسی کا بیٹا تھا جو میران خیر پور کا جد تھا۔

بہرام خاں کا بیٹا میر صوبدار خاں میاں سرفراز کے ہاتھوں ۱۱۸۹ھ میں باپ کے ساتھ قتل ہوا تھا۔ اسکے چار بیٹے تھے، میر فتح علی خاں فاتح سندھ، میر کرم علی خاں، میر مراد علی خاں اور میر غلام علی خاں۔ حیدر آباد کے میر بہرام خاں کی اولاد میں ہیں۔ مانک خاں کے بڑے بیٹے کا نام میر اللہ یار خاں تھا۔ اللہ یار خاں کا ایک بیٹا سمو خاں تھا۔ سمو خاں کا ایک بیٹا میر فتح خاں اور فتح خاں کا بیٹا میر ٹھارہ خاں تھا جسکی اولاد میں میران میر پور ہیں۔

ان سب نے کھوڑا دور میں نمایاں کردار ادا کیے اور میر فتح علی خاں کے زور بازو بن کر اسکو کامیاب کرایا۔

### میر فتح علی خاں فاتح سندھ

۱۱۹۹ھ میں استقرار حکومت کے بعد میر فتح علی خاں نے حیدر آباد کو مرکز حکومت قرار دیا۔ میر سہراب خاں نے خیر پور میں حکومت قائم کی تھی اور ٹھارہ خاں نے میر پور میں ان حکومتوں کو اس نے تسلیم کیا۔ کچھ دنوں تک انہوں نے کابل کو غراج دیا پھر بند کر دیا۔

احمد خاں نور زئی اور بوستان خاں کو اسکے ہمراہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ والی قلات کو بھی مدد کیلئے لکھ دیا۔

خیر پور کے قریب پہنچ کر عبدالنبی نے میر سہراب خاں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے قریب کھانے کے بجائے میر فتح علی خاں کو باخبر کر دیا میر فتح علی خاں نے اہل و عیال کو کچھ اور جیسلمیر بھیج دیا اور خود سینیہ تان کر مقابلے پر آگیا۔ میر سہراب نے ساتھ نہ دیا اور قلعہ شاہ گڑھ میں غیر جانبدار بن کر بیٹھ گیا۔ اب فتح علی خاں تہنا تھا اور افغانستان کا ٹڈی دل! لیکن موت یا زندگی کی اس جنگ میں ٹھارہ خاں نے اس کا ساتھ دیا۔ دس ہزار کا چالیس ہزار سے مقابلہ تھا اور دونوں فوجوں کے بیچ میں ایک نالہ حامل تھا۔

افغان فوج نے یہ التزام کیا کہ میروں کا لشکر نالہ عبور نہ کرنے پائے لہذا جیسے ہی مالپری سپاہی آگے بڑھے بندوقوں سے گولیاں برسے لگیں اس پر فتح علی خاں نے حکم دیا کہ نالے میں کود پڑو اور سپاہیوں کے ساتھ وہ خود بھی نالے میں اتر گیا پھر اچانک وہ تلوار بے نیام کر کے دشمن پر حملہ آور ہو گیا۔

بلاشبہ میر فتح علی خاں کے فوجی فرزند ان شمشیر کہے جاسکتے تھے۔ انہوں نے تلواریں جو چلائیں تو ایک ساتھ دو دو سرگیندوں کی طرح اچھل اچھل کر گرنے لگے اور افغان فوج اس طرح بھاگی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی۔ عبدالنبی اور افغان سردار بھی جانیں بچالے گئے۔ باقی سپاہیوں نے قرآن مجید کا واسطہ دے کر جان بخشی کرائی۔

تیمور شاہ اس شکست پر جوش انتقام میں خود بہاولپور تک پہنچ گیا تو میر فتح علی خاں نے اسکو لکھا کہ وہ بادشاہ سے جنگ کرنے کا اہل نہیں ہے اگر شاہ سندھ کسی اور دنیا چاہتا ہے تو وہ سندھ چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اسکے ساتھ ہی اس نے گراں قدر تحائف روانہ کئے۔ تیمور شاہ نرم پڑ گیا اس نے جو لشکر سندھ کی طرف بھیجا تھا اسکو واپس بلالیا۔

۱۲۱۴ھ میں تیمور شاہ کا انتقال ہو گیا اور ۱۲۲۰ھ میں عبدالنبی بھی دردر کی ٹھوکریں کھا کر مر گیا۔



حیدرآباد کی حکومت میر فتح علی خاں اور اسکے بھائیوں میر غلام علی، میر کریم علی اور میر مراد علی پر مشتمل تھی اور انکی مرکزیت کو خیرپور اور میرپور تسلیم کرتے تھے۔

یہ پورا قبیلہ منظر تاریخ پر آنے سے قبل شیعہ تھا۔ ایرانی بلوچستان سے ترک وطن کے اسباب کیا تھے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہو سکتا ہے کہ شیعیت کے سبب سنخوتی دباؤ پڑا ہو یا اسی طرح کی کوئی اور وجہ ہو لیکن وطن چھوڑنے کیلئے کسی مجبوری کا ہونا مسلم ہے۔ اس طرح پورے کا پورا قبیلہ موجودہ بلوچستان آگیا پھر کچھ بلوچستان میں رہ گئے اور کچھ سندھ میں داخل ہو گئے۔

بلوچستان میں رہ جانے والے بھی یقیناً شیعہ تھے۔ جیسے میر محمد نصیر خاں والی بلوچستان اور اسکے ساتھ اسکے اہل خاندان۔ دوسرے لوگوں کو تاریخ کے جنگل سے ڈھونڈھ نکالنا مشکل ہے لیکن سندھ کے میر سب ایک ہی عقیدے کے ماننے والے تھے اور بڑے راجہ کہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی ڈانوا ڈول نہیں ہوئے۔ میر فتح علی خاں صرف ایک اچھا جرنیل ہی نہیں تھا بلکہ مدبر بھی تھا۔ اس نے کھوڑا عہد کے وہ تمام علاقے ایک ایک کر کے واپس لے لیے جن پر انتشاری حالات میں دوسروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے سبزل کوٹ، نواب بہاولپور سے، کرلئی خان قلات سے، شکارپور افغانستان سے لکھ پت اور بست راجہ بھوج سے، عمر کوٹ راجہ جو دھپور سے واپس لیا اور ۱۸ سال تک بڑی سطوت و شوکت سے حکومت کر کے ۹ محرم ۱۲۱۷ھ میں انتقال کر گیا۔ افغانستان میں اس سے دو سال قبل شاہ زمان بن تیمور شاہ معزول ہو چکا تھا۔

میر فتح علی خاں کو اپنی ذات سے فاتح سندھ کہا جاتا ہے لیکن حقیقتاً وہ سندھ کا وقار تھا۔ اسکی حکومت ایک مثالی حکومت تھی۔ یوں تو میروں کے پورے قبیلے کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ عوام میں ہر دل عزیز اور مقبول ہوتے تھے لیکن میر فتح علی خاں کا نام میر بہرام خاں، میر بجاہ خاں میر عبداللہ خاں کے ذیل میں لیا جاتا تھا۔ بادشاہوں کی اولاد میں عموماً تاج و تخت کیلئے نبرد آزمائی ہوتی ہے۔ ایک

دوسرے کے خون کا پیسا بن جاتا ہے لیکن میر فتح علی خاں نے خاندانی شیرازے کو بکھرنے نہیں دیا اور بادشاہ ہونے کے بعد چھوٹے بھائیوں کو چھوٹا بھائی اور بڑوں کو بڑا سمجھا۔ بلوچوں کو بلا امتیاز عقیدہ اور بقدر صلاحیت عہدے دے دیے اور ان کے ذہن نشین کرایا کہ حکومت خود انکی ہے اور وہ اپنا ہی کام کر رہے ہیں۔ وفات سے کچھ گھنٹے پہلے اس کا ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جو باپ کے بجائے سندھ کی چوہیاری (چار بھائیوں کی) حکومت کا رکن بنا۔

دوسری خصوصیات کے ساتھ وہ ایک درد مند انسان اور ایک علم پرور حکمران تھا اس کا دربار باکمالوں سے بھرا رہتا جن میں ثابت علی شاہ، مائل ٹھٹھوی اور ملک الشراہ عظیم ٹھٹھوی نمایاں تھے۔

### میر غلام علی خاں

فتح علی خاں کا بھائی ۱۶ محرم ۱۲۰۷ھ کو سربراہ مملکت بنا خاندان کے تمام اکابر کی موجودگی میں اسکی دستار بندی ہوئی کیونکہ اب وہ فتح علی خاں کے بجائے ملک و قبیلہ دونوں کا سردار تھا۔ وہ ایک شریف النفس، ہوشمند اور ذی شعور انسان تھا اور امور جہان بینی سے بھی واقف تھا۔ اسکے زمانے میں رعایا خوش حال تھی اور ہر طرف امن و چین تھا۔ حکومت کے نظم و نسق، اخلاقی اقدار اور اصول دین پر عملدرآمد کی طرف اسکی خاص توجہ تھی لیکن مذہب میں جبر کو اس نے کبھی روا نہیں رکھا۔ اس نے اپنا سکہ تیمور شاہ کے سکے کے برابر خود ڈھلویا تھا جس کا نام روپیہ کورہ تھا۔

میر غلام علی کسی طرح میر فتح علی خاں سے کم نہ تھا لیکن اسکے دور میں خاندانی اختلاف شروع ہو گیا۔ میر ٹھارہ خاں خم ٹھونک کر میدان میں آگیا۔ میر غلام علی نے میر محمود کو مقابلے پر بھیجا جس نے ٹھارہ خاں کو شکست دی اور زخمی حالت میں کشتی پر بٹھا کر لایا۔ میر غلام علی بڑی شفقت کے ساتھ پیش آیا اسکے زخموں کا علاج کرایا اور صحت یاب ہونے پر عرت و احترام کے ساتھ خلعت دے کر رخصت کر دیا۔

انگریزوں سے میاں غلام شاہ کھوڑا کے وقت سے سندھ کے روابط تھے۔ ان کی کوٹھیاں ٹھٹھہ اور شاہ بندر میں بنی ہوئی تھیں لیکن شاہ زمان بادشاہ افغانستان



نے دباؤ ڈال کر انکو بند کرادیا تھا۔ میر غلام علی خاں نے کسی تحریک پر انگریز نمائندے کو بمبئی سے بلوایا اور ان سے ایک تجارتی معاہدہ کیا جو بظاہر دوستانہ تھا لیکن اس میں انگریزوں نے بعض شاطرائہ شرائط رکھ دی تھیں۔ پھر ایک دوسرا معاہدہ ۱۲۲۳ھ میں ہوا اور اس طرح میر غلام علی خاں کے ہاتھوں سندھ کے گئے میں وہ طوق پڑ گیا جو آخر کار پھانسی کا پھندا ثابت ہوا۔

مجموعی طور پر میر غلام علی کا دور سندھ کیلئے ایک پرامن اور کامیاب دور تھا۔ ۶ جمادی الثانی ۱۲۲۴ھ میں اس نے انتقال کیا۔

### میر کرم علی خاں

میر فتح علی خاں کے بنائے دستور کے مطابق میر کرم علی خاں سندھ کا فرمانروا ہوا تو اس نے چھوٹے بھائی میر مراد علی کے مشورے سے جہانپانی کا آغاز کیا اور اسکو سرکار عظمت مدار کہہ کر ملقب کیا گیا۔

کابل کے تخت پر جب شاہ شجاع الملک مستحکم ہوا تو ۱۲۲۱ھ میں وہ خراج وصول کرنے کیلئے سندھ آیا تھا۔ میروں میں اس سے جنگ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اس لئے سترہ لاکھ ادا کر دئے۔ ۱۲۲۵ھ میں وہ پھر آیا اور اسکو بیس لاکھ روپیے اور بعض بیش قیمت تحائف دینا پڑے۔ وہ پشاور پہنچا ہی تھا کہ اسکے وزیر شیر محمد خان نے کشمیر سے واپس آکر اسپر حملہ کر دیا۔ سبب یہ تھا کہ سید احمد کابل کے تخت متعصب سنی عالم تھے۔ انہوں نے شیعوں کے قتل عام کا فتویٰ دیدیا اور ۱۲۱۹ھ میں سخت شیعہ سنی فساد ہو گیا کافی شیعہ شہید ہوئے۔ انہوں نے ۱۲۲۵ھ میں سید احمد کو قتل کر دیا۔ شیر محمد کو گمان ہوا کہ یہ قتل شاہ شجاع الملک کے کے ایماء پر ہوا ہے لہذا اس نے اسپر حملہ کر دیا۔ شیر محمد لڑائی میں مارا گیا۔ پھر فتح خان نے محمود شاہ کو تخت پر بٹھا کر شاہ شجاع پر حملہ کیا اور وہ ہزیمت یاب ہو کر پنجاب میں رنجیت سنگھ کے پاس پناہ گزیں ہوا پھر اسکو انگریزوں نے اپنا آلہ کار بنالیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رنجیت سنگھ ملتان پر قابض ہو چکا تھا اور اس نے سندھ فتح کرنے کے بہانے تلاش کرنا شروع کر دئے تھے لیکن میروں نے انگریزوں سے رجوع کیا اور ان کے دباؤ میں آکر رنجیت سنگھ نے سندھ کا خیال چھوڑ دیا۔

کچھ دنوں بعد شاہ شجاع سردار محمد عظیم سے شکست کھا کر شکار پور آیا۔ اس نے اخلاقی اثر ڈال کر میران حیدر آباد سے وقت پر مدد کرنے کا معاہدہ کیا لیکن جب وہ خیر پور پہنچا تو سہراب نے کسی مزید معاہدے سے انکار کر دیا۔

شاہ شجاع دو سال شکار پور میں رہا اور جنگی مشقتیں کرتا رہا۔ اس درمیان اسکی لوٹ مار اور مظالم حد سے بڑھ گئے۔ میروں نے مجبور ہو کر نہایت خاموشی سے محمد عظیم والی افغانستان کو سندھ آنے کی دعوت دیدی۔ سردار محمد عظیم ۱۲۳۶ھ میں سندھ پہنچا تو میران سندھ دو طرفہ بازی سے پریشان ہو گئے۔ آخر بدقت تمام شاہ شجاع سے پیچھا چھوٹا اور وہ لدھیانہ کی طرف چلا گیا۔ پھر محمد عظیم خاں شکار پور کی حکومت پر قبضہ کر کے خراسان کا عازم ہو گیا۔

کچھ وقفے سے یہ خبر مشہور ہوئی کہ رنجیت سنگھ شکار پور پر قبضہ کرنے کیلئے آرہا ہے اس لئے میران حیدر آباد و خیر پور و میروں نے متحد ہو کر حکمت عملی سے شکار پور کو آپس میں تقسیم کر لیا۔

۱۲۳۲ھ میں "سید احمد شہید" سندھ آئے اور اہل سندھ کو انہوں نے دعوت جہاد دی مگر انہیں فی الفور کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی پھر بھی سید صبغتہ اللہ نے حردوں کی تنظیم کر لی۔

۱۲۳۳ھ میں میر کرم علی خاں نے وفات پائی۔ بڑا سخن سنج اور اہل علم و فضل بادشاہ تھا۔ اسکی علم و ادب پروری کے باعث ایران و خراسان کے کئی باکمال حیدر آباد آکر آباد ہوئے۔

### میر مراد علی خاں

میر فتح علی خاں کا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے اپنے تدبیر سے ملک میں کسی شورش کو ابھرنے نہ دیا۔ اس میں بہت سے محاسن تھے مگر بخل اسکی کمزوری تھی ۱۸ ذی قعد ۱۲۴۰ھ کو اس نے انگریزوں سے تیسرا معاہدہ کیا جس سے انگریزوں نے سندھ میں مزید حقوق حاصل کر لیے اس طرح وہ اس پھندے کو تنگ کرتے جارہے تھے جو انہوں نے سندھ کے گلے میں ڈالا تھا۔

اسکے بعد شاہ شجاع پھر سندھ آیا۔ میر مراد علی خاں نے اسکو اخراجات کیلئے



چالیس ہزار روپے دئے مگر وہ جانے میں ٹال مٹول کرتا رہا کہ ۶ جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ کو میر مراد علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ دانشور اور ادیبوں کا قدر داں تھا، خود بھی ادیب اور شاعر تھا۔

### میر نور محمد خاں و میر محمد نصیر خاں

میر نور محمد میر مراد علی خاں کا بیٹا تھا۔ وہ سرپر آرائے حکومت ہوا تو اس نے اپنے بھائیوں اور عزیز و اقارب سب کو شریک حکومت بنایا۔ شاہ شجاع الملک ابھی شکارپور میں مقیم تھا۔ اس نے وقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور میروں کو اسکی طرف سے غلط فہمی پیدا ہو گئی پھر میروں کے کارندوں نے شکارپور چھوڑ دیا اور شاہ شجاع نے اپنے آدمی مقرر کر دئے۔ یہ گویا طرفین سے اعلان جنگ تھا۔

اس وقت میں خیرپور کی کچھ فوج روہڑی میں جمع ہوئی۔ منصوبہ یہ تھا کہ مزید فوج یکجا ہونے پر حملہ کیا جائے گا مگر فقیر عالم خاں مری حکومت شکارپور کے لالچ میں خود رائی کر کے اس فوج کو چڑھالے گیا جس سے شاہ شجاع کے ایک دستے کا مقابلہ ہو گیا۔ حلی ہدایت اللہ اس کا افسر تھا۔ مری اس سے لڑ گیا اور مارا گیا۔ اس کے بیٹے خاں جہاں نے حلی ہدایت اللہ کو قتل کر دیا۔

اسکی اطلاع شاہ شجاع کو ہوئی تو اس نے سمندر خاں کو تین ہزار پیادے دے کر سات توپ بردار کشتیوں کے ساتھ خیرپور کی سمت روانہ کر دیا۔ ۱۲۴۹ھ میں کھوڑی کے مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ میروں کے لشکر نے طریق جنگ میں فریب کھایا۔ اس کے باوقار افسر مارے گئے جس سے فوجیوں میں بددلی پیدا ہو گئی وہ غلطیوں پر غلطیاں کرتے رہے اور انہیں سخت شکست ہوئی۔

صفر ۱۲۴۹ھ میں میران حیدر آباد اپنا لشکر جمع کر کے روہڑی پہنچے جہاں خیرپور کی فوجیں بھی آگئیں۔ ادھر شاہ شجاع نے بھی تیاری کی مگر چند دانش مندوں نے دوسری لڑائی کی نوبت نہیں آنے دی۔ شاہ شجاع پانچ لاکھ روپیہ اور پانچ سو اونٹ باربرباری کے لیکر خراسان روانہ ہو گیا مگر جلد ہی دوست محمد خاں سے شکست کھا کر سندھ آگیا۔ میروں نے اسکی تواضع اور ضیافت کی اور زادراہ دے کر رخصت کروایا۔

### سندھ اور انگریز

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی یعنی بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں انگریزوں نے ساری دنیا میں بالخصوص ایشیا میں ہر طرف سازشوں کا جال بکھا رکھا تھا۔ وہ زمین کے چپے چپے پر خود اپنی یا اپنے قابو کے آدمیوں کی حکومت چاہتے تھے افغانستان میں ان کے پاس شاہ شجاع الملک کا مہرہ تھا جسکو وہ دوست محمد کی جگہ پر رکھنا چاہتے تھے جس میں انہیں کامیابی نہ ہو سکی تو انہوں نے سندھ کیلئے ایک ذہنی منصوبہ بنایا اور لشکر کے خراسان جانے کیلئے میروں سے راستہ دینے کی استدعا کی اور میران کے فریب میں آگئے۔

اس سازش میں شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ دونوں شامل تھے۔ ۲۹ دسمبر ۱۸۳۸ء کو انگریزی فوج شاہ شجاع کے ساتھ بہاول پور پہنچی، ۲۴ جنوری ۱۸۳۹ء کو وہاں سے روہڑی پہنچی اور دریائے سندھ کے کنارے خیمہ انداز ہوئی پھر میر رستم خاں سے اجازت لے کر قلعہ بکھر سے گزرنے اور دریا پر پل بنانے کی اجازت لی اور ۳ فروری ۱۸۳۹ء کو اس پل کے ذریعے دریا عبور کیا۔ پھر رستم خاں والی خیرپور کو دھوکے میں رکھ کر قلعہ بکھر پر قبضہ کر لیا۔

ادھر بمبئی کی فوج ۱۸۴۰ء مطابق ۱۲۵۵ھ میں کرلہی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئی پھر اس نے ٹھٹھہ کی طرف پیش قدمی کی۔ میران حیدر آباد، میرپور کو اسکی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مقابلے کیلئے لشکر جمع کیا جس نے ۲۰ فروری ۱۸۴۳ء کو کرلہی کی انگریز چھاؤنی لوٹ لی۔ اسیر انگریزوں نے شکارپور کے عامل کے ذریعے میروں کو دھمکی دی۔ میر نور محمد خاں انگریزوں سے لڑنے کے حق میں نہ تھا اس لئے تاوان جنگ ادا کر کے انگریزوں کو ہموار کر لیا۔ وہ شکارپور اور لاڑکانہ ہوتے ہوئے خراسان کی طرف روانہ ہو گئے پھر بھی انہوں نے راستے میں جبکہ آباد کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

انگریزوں نے بنگال کی طرح جب سے ٹھٹھہ اور شاہ بندر میں اپنی تجارتی کوٹھیاں بنائی تھیں اس وقت سے بڑی گہری نظر سے سندھ کا جائزہ لے رہے تھے لیکن میروں میں جزوی اختلافات کے باوجود خاندانی حمیت اور وطنیت کا جذبہ تھا اور



میر کرم علی خاں و میر مراد علی خاں فرمانروایاں حیدر آباد اور ان کے وفادار اور دور بین مشیر زندہ تھے انہوں نے انگریزوں کو حد سے تجاوز نہ کرنے دیا لیکن اب انکی جگہ میر نور محمد خاں اور میر محمد نصیر خاں نے لی تھی۔ خیرپور میں میر سہراب کے بعد میر رستم خاں، میر مبارک خاں اور میر علی مراد خاں مسند نشین حکومت تھے۔ ان میں آپس کا اتحاد بھی کم ہو گیا تھا اور بزرگوں کی سی سوجھ بوجھ بھی نہ تھی لہذا انگریزوں نے انہیں شیشے میں اتار لیا اور ان کے تحفظ کے نام پر کوئلہ میں ایک چھاؤنی بنانے کی اجازت لے لی جسکے اخراجات خود میروں کے ذمے ڈال دئے۔ فوج انگریزوں کی اور مصارف میروں کے!

شکارپور میں ایک چھاؤنی انگریز پہلے ہی قائم کر چکے تھے۔ اسکو بھی سندھ کی بد نصیبی کہنا چاہئے کہ ۱۲۵۵ھ میں میر نور محمد خاں والی حیدر آباد کا بھی انتقال ہو گیا اور تدبر و دانش کا ایک بڑا ستون گر گیا۔

انہیں دنوں انگریز خراسان میں پسپا ہو کر سکھو شکار پہنچے اور انہوں نے میروں سے کرلہی، قلعہ بکھر اور کیتی کا مطالبہ کر دیا۔ میروں کے باقیات الصالحات شاطران فرنگ کی چالوں کو سمجھ چکے تھے کہ کلائی پکڑ کر وہ پورے ہاتھ کی گرنٹ کر لیں گے لہذا انہوں نے بھی لشکر کی تنظیم و تربیت شروع کر دی مگر میروں کے پاس کوئی دور اندیش جرنیل نہیں تھا اس لئے بعض بلوچ دستوں نے انگریزوں پر شب خون مارنا شروع کر دئے۔

انگریزوں نے جواباً تلوار کے بجائے زہر کا استعمال کیا اور لوگوں کو درمیان میں ڈال کر میروں سے ایک نیا معاہدہ کرنے کی پیش کش کی جس سے سندھ میں انگریز مداخلت بڑھ جاتی اور ان کا سکہ بھی رائج ہونے کے امکانات پیدا ہوتے تھے۔ میروں نے اسکو منظور نہیں کیا تو انگریز حیدر آباد اور خیرپور میں پھوٹ ڈالنے کی تدبیر کرنے لگے۔

صوبدار خاں میر فتح علی خاں کا بیٹا تھا۔ اسکو باپ کے بجائے سربراہ بنوانے کا وعدہ کیا۔ خیرپور جا کر میر علی مراد خاں کو دستار بندی کا لالچ دیا مگر ایک دو کے علاوہ کوئی ان کے فریب میں نہیں آیا۔

اس دوران انگریزی ریشہ دوانیوں کی خبریں سندھ میں گشت کرنے لگیں۔ سندھیوں کا جذبہ حب الوطنی اچانک بیدار ہو گیا۔ بختیار خاں لغاری ایک نشہ باز سردار تھا مگر ان حالات نے اسکو جواں مرد بنا دیا۔ اس نے اپنے قبیلے کو سوتے سے جگایا اور بلوچوں سے ان کے پرانے اختلاف کو دور کیا۔

اس موقع پر سندھ کی سرزمین نے میر فتح علی خاں کو آواز دی مگر میروں میں سے کوئی بھی ویسا مدبر نہ نکل سکا جو لغاری اور بلوچ مردان جنگ آزما کو عربی اصول پر منظم کر سکتا اور انگلستان کی مکار قوم سے خود ان کے طریقوں پر نبرد آرائی کر سکتا۔ پھر بھی پورے ملک میں سندھ کو بچانے کے نعرے بلند ہو گئے۔

میر صوبدار خاں اور میر نصیر خاں دونوں جنگ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ انہیں انگریزوں سے عہدہ براہونے کی امید نہ تھی لیکن جب ساری قوم ایک پرچم تلے جمع ہو گئی تھی تو کوئی اپنے کو ان سے علیحدہ کیونکر رکھتا۔ وہ بھی سوار ہو کر باغ میر فتح علی خاں میں آگئے۔ اس اشیا میں حیات خاں مری اور نسیم خاں مری کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا اور بلوچوں نے حملہ کر کے انکی چھاؤنی میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔

انگریز میران حیدر آباد کی شکار گاہ میں جمع تھے۔ میر محمد نصیر خاں، میر شہداد خاں، میر رستم خاں اور میر صوبدار خاں کا بیٹا بارہ ہزار لشکر اور چند توپوں کے ساتھ حیدر آباد سے چھ میل پر میانی میں خیمہ زن ہو گئے۔ ۱۴ فروری ۱۸۴۳ء کو سورج بلند ہونے پر انگریزی فوج دور سے نمودار ہوئی تو میر جان محمد نے بلوچوں کو لٹکارا۔

”تم نے کلام اللہ کی قسم کھائی تھی مردانگی کا وقت ہے سندھ پر قربان ہو جاؤ“ اس آواز پر بھی بلوچوں نے حرکت نہ کی البتہ حلی خدا بخش پچاس سواروں کے ساتھ، مراد علی خاں چانک، نصیر خاں چانک، غلام محمد خاں ٹالپر، مبارک خاں ٹالپر، میر غلام شاہ ولد میر محراب خاں ٹالپر اور میر جان محمد خاں مردانہ وار بڑھے اور لوہے کی سفید دیوار سے ٹکر لگے۔ پھر باقی بلوچوں نے بھی یلغار کی۔



انگریزوں کی جنگ کا انحصار توپوں اور بندوقوں پر تھا اس طرف صرف جتد توپیں تھیں اور بلوچ عموماً تلوار کے دھنی تھے پھر بھی وہ جوش شجاعت میں بڑھتے چلے گئے اور جو توپوں اور بندوقوں کی مار سے بچ سکے، وہ انگریز صغوں کو توڑ کر گھس گئے اور چشم زون میں انہوں نے میدان لاشوں سے پاٹ دیا۔

بلوچوں کی بہادری انگریزوں کو کبھی فراموش نہ ہو سکی۔ عبداللہ خاں نظامانی اور میرزا خاں نظامانی نے اپنے دستوں کے ساتھ ان گنت جسم سروں سے علیحدہ کر دئے لیکن جب وہ گر گئے اور محمد علی خاں لغاری، دریا خاں لغاری اور غلام حیدر لغاری بھی وطن پر قربان ہو گئے تو سرفروشنوں کی ہمتیں پست ہو گئیں اور جو اپنے کو بچاسکے وہ میدان سے نکل گئے۔

میر بھی سب کے سب زخمی ہوئے تھے۔ حیدر آباد کے قلعہ میں دم لے کر انہوں نے انگریزوں سے رابطہ قائم کرنے کے سوا چارہ نہ دیکھا لہذا انہیں خط لکھا۔ میر صوبدار خاں نے اس جنگ میں حصہ نہ لیا تھا۔ اس کا بیٹا میدان میں گیا تھا اس لئے میر اسکی طرف سے بھی مطمئن نہ تھے۔

انگریزوں نے میروں کے جواب خط میں انہیں بلا بھیجا اور ان کے پہنچنے ہی چارلس نیپئر نے انکو گرفتار کر لیا۔ پھر قلعہ حیدر آباد پر قبضہ کیا اور میر صوبدار خاں کو بھی گرفتار کر لیا۔ قوم کا ساتھ چھوڑنے والے کا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔

اب سندھ انگریزوں کا تھا۔ انہوں نے اہل سندھ پر وہ مظالم کیے کہ بنگال کے ستم زدگان کی داستانیں اسکے سامنے ماند پڑ گئیں۔ میروں کو گرفتار کر کے انہوں نے بسببی بھیج دیا جہاں سے وہ مختلف قلعوں میں نظر بند کر دئے گئے۔ ۶ ربیع الاول ۱۲۶۱ھ (۱۲ اپریل ۱۸۴۵ء) کو حالت نماز میں میر محمد نصیر خاں کا انتقال ہو گیا۔

علی و حسین و حسن دستگیر، خدایار و یادور محمد نصیر۔

اس جواں مرد سے شکست کا صدمہ برداشت نہ ہو سکا۔

بلوچوں نے اسکے بعد مختلف مقامات پر بغاوتیں کیں مگر بجز تباہی و بربادی

کچھ حاصل نہ ہوا۔

اس طرح بنگال سے لیکر سندھ تک انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

## میران سندھ ایک نظر میں

### حیدر آباد

میر محمد نصیر خاں، نور محمد خاں ٹالپر کا بھائی تھا جو اسکے بعد حیدر آباد میں تخت نشین ہوا اور زوال سندھ کے بعد شدت غم میں دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ نہایت تعلیم یافتہ، بہادر، مستقل مزاج، ادیب و شاعر تھا اور علماء و فضلاء کا قدر داں بھی۔ دیوان فارسی، دیوان اردو اور کئی دوسری کتب اس کا سرمایہ ادب ہیں۔

میر حسن علی خاں میر محمد نصیر خاں کا بیٹا تھا، کلکتہ میں انگریزوں کا قیدی رہا، ۱۸۶۳ء میں رہا ہو کر حیدر آباد آیا، ۱۹۰۶ء میں اس نے وفات پائی، ۱۹۱۲ء میں کر بلائے محلی میں دفن کیا گیا، بہادر، عالم و فاضل اور کئی علمی کتابوں کا مصنف اور شاعر تھا۔ میر عباس علی خاں مومن بن محمد نصیر خاں نے ۱۹۵۷ء میں بمقام کلکتہ ۲۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ دیوان فارسی اور ایک شنوی اسکی یادگار ہے۔

میر حسن علی خاں بن نور محمد خاں نے ۱۸۷۸ء میں وفات پائی، متعدد اردو و فارسی کتابوں کا مصنف اور شاعر تھا۔

میر صوبدار خاں بن میر فتح علی خاں گہوارے ہی سے سنی آغوش کا پروردہ رہا اس لئے مذہب کے لحاظ سے اہل السنّت والجماعت تھا اس نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا مگر انہوں نے اسکو معاف نہیں کیا۔ کلکتہ کی قید میں ۱۸۴۶ء میں فوت ہوا اور میت حیدر آباد لاکر میروں کے قبرستان میں دفن کی گئی، صاحب تصنیف اور شاعر تھا۔ میر محمد علی خاں بن صوبدار خاں نے ۱۸۶۱ء میں بمقام کلکتہ وفات پائی۔ کئی منظوم کتابوں کا مصنف تھا۔

میر شہداد خاں حیدری بن نور محمد خاں سورت میں قید رہا۔ اسپر کپتان انس کے قتل اور آتش زنی کا الزام تھا جس سے بری ہو گیا مگر کلکتہ بھیج دیا گیا اور ۱۸۵۷ء میں وہیں وفات پائی، لاش حیدر آباد لاکر دفن کی گئی۔ خاک پائے مرتضیٰ شہداد خاں!



میریار محمد خاں بن مراد علی خاں نے ٹالپر کے حالات تحقیق سے لکھے ہیں۔  
فارسی نثر میں استاد کا درجہ رکھتا تھا، ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا۔

### خیر پور

میر سہراب خاں - فاتح سندھ - کا چھوٹا بھائی تھا۔ ۱۷۸۳ء مطابق ۱۱۹۹ھ میں اس نے اپنی علیحدہ حکومت قائم کی اور دور اندیشی کے تحت خیر پور سے تھوڑے فاصلے سے پہاڑی پر ایک نہایت مضبوط اور مستحکم قلعہ تعمیر کرایا جو کوٹ ڈبئی کہلاتا ہے، میروں کے تمام معرکوں میں شریک رہا، کئی علاقے فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کئے اور رعایا کی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کیے۔ ۱۸۲۹ء میں ملک اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے گوشہ نشین ہو گیا۔ ۲۷ صفر ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء میں وفات پائی۔

بلند اقبال، غریب پرور، قدر شناس اور متواضع حکمران تھا۔

میر رستم خاں میر سہراب خاں کا بیٹا تھا۔ اس نے بھی میر فتح علی خاں کی طرح بیٹوں میں جاگیر کی تقسیم کر دی تھی لیکن اختلاف رونما ہو کر رہا اور دوسرے بھائیوں کے درمیان خونریزی ہو کر رہی تاہم رستم خاں نے بڑے ہونے کا کردار ادا کیا۔

۲۰ جنوری ۱۸۳۹ء میں اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے دوستانہ معاہدہ کیا اور میران حیدر آباد کی سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ ۲ نومبر ۱۸۴۲ء کو انگریزوں سے دوسرا معاہدہ کیا۔ میر رستم خاں خاندانی تنازعوں کو حل کرنا چاہتا تھا لیکن آگے چل کر نو نہار کے مقام پر ان کے مابین جنگ ہو کر رہی۔ یہی وہ حالات تھے جن سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا۔ بزرگان قبیلہ میں تہذیبی روایات برقرار رکھنے کا جذبہ تھا لیکن جب وہ ایک ایک کر کے اٹھ گئے تو میروں میں امیرزادوں کی سی خود غرضی پیدا ہو گئی جو زوال سندھ کا باعث ہوئی۔

انگریز مختلف طریقوں سے اس باہمی اختلاف کو مسلسل ہوا دیتے رہتے۔ کبھی ایک کو چرمھاتے کبھی دوسرے کی پشت پر ہاتھ رکھتے۔ نتیجے میں میر رستم خاں میر مراد علی خاں کے حق میں تاج و تخت سے دست بردار ہو گیا۔ انگریز اسکی گرفتاری کی فکر میں تھے لہذا وہ ریگستان سے گزرتا ہوا شہداد پور پہنچا پھر بچتا بچتا جنگ میانی میں

اہل خاندان کا شریک ہوا اور زندان فرنگ میں بمقام پونا ۱۸۴۶ء میں قید ہستی سے آزاد ہو گیا۔

بلند کردار امیر تھا۔ انگریز اقتدار کو حقیقتاً اس نے ایک نکلے کیلئے پسند نہیں کیا اسی لئے تمام عمر پریشانیوں میں گزر گئی۔

### میر علی مراد خاں

میر رستم خاں کے بیٹوں میں میر علی مراد خاں شروع ہی سے انگریزوں کا یار وفادار تھا جسکے صلے میں میروں کا انتزاع حکومت ہونے پر وہ خیر پور کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ میروں میں یقیناً اختلاف تھا لیکن سب میر صوبدار خاں اور میر علی مراد خاں کے سے لوگ نہیں تھے۔ میر صوبدار خاں نے تو اتنا ہی کیا تھا کہ جنگ میانی میں شرکت نہیں کی لیکن میر علی مراد خاں نے تو قیامت یہ کی کہ جب میر شیر محمد خاں والی میر پور انگریزوں کے مد مقابل آیا تو اس نے بلوچوں کے پروں میں داخل ہو کر بلوچ سرداروں کو میر شیر محمد خاں کا ساتھ چھوڑ دینے پر اکسایا اور مختلف قسم کے لالچ دے کر ان کو توڑ لیا جس سے شیر سندھ میر شیر محمد خاں کی طاقت کمزور پڑ گئی۔

میر علی مراد خاں کا کردار حب الوطنی کے زاویہ نگاہ سے کسی طرح مستحسن نہیں ہو سکتا لیکن اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ ایک بڑی سلطنت کا کچھ حصہ بچ گیا جو مستقبل میں بعض مظلوموں اور کمزوروں کی پناہ گاہ بن گیا۔

نظام حیدر آباد اور والی خیر پور سفید فام شکاریوں کے یار وفادار ہونے کے سبب پوری طرح تباہی کا شکار نہیں ہوئے لیکن انہوں نے حریت پسندوں کا ساتھ نہ دے کر اور وطن کی جڑیں کھوکھلی کر کے اپنے کو ہمیشہ کیلئے مطمئن کر لیا، پھر ان کو وہ عزت بھی نصیب نہیں ہوئی جو آزاد دکن یا آزاد سندھ میں حاصل تھی۔ انگریزوں کا جہا تک تعلق ہے، وہ ہندوستان میں ہمیشہ سے اپنا آلہ کار ڈھونڈتے رہے تھے اور انہیں کے ہاتھوں انہوں نے سلطان ٹیپو اور سراج الدولہ کی قبریں کھدوائیں اور شیر سندھ کا مقبرہ بھی تیار کرایا لیکن وہ خود کسی کے یار وفادار ہونا تو درکنار یار بھی نہ تھا ایسا ہی انہوں نے میر علی مراد خاں کے ساتھ بھی کیا اور نو نہار کی جنگ میں

میر شیر محمد خاں کا جنگ میانی میں شریک ہونا ثابت نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ تعلقات کی کشیدگی کے سبب میران حیدر آباد و خیرپور نے اسکو دعوت نہ دی ہو، لیکن جب جنگ میانی کے بعد میروں کے انجام کی خبر شیر محمد خاں کو معلوم ہوئی تو وہ تڑپ اٹھا۔ سب اس کے بھائی بند تھے۔ انگریزوں سے اسکو اتنی نفرت ہو گئی کہ انتقام لینے کیلئے راتوں کی نیند اسپر حرام ہو گئی۔ اس نے شب و روز محنت کر کے لشکر کو آراستہ کیا اور حیدر آباد کی طرف چل پڑا۔

سقوط حیدر آباد اور میروں کے انجام کا اہل سندھ پر اتنا اثر پڑا تھا کہ لوگوں نے مختلف مقامات پر ٹولیوں اور دستوں کی صورت میں انگریزوں پر حملے کئے تھے اور جا بجا قتل و غارت گری بھی کی تھی مگر جو ابا انگریزوں کی طرف سے اتنا ظلم ڈھایا گیا تھا کہ ایک عام دہشت طاری تھی لیکن جب شیر محمد شیر سندھ کا نعرہ انتقام بلند ہوا تو لوگ کونوں کھدروں سے نکل آئے اور میرپور پہنچنے لگے۔

ان میں بلوچ بھی تھے اور میر بھی، نظامانی بھی تھے اور لٹاری بھی۔ یہ سب سندھ کی آزادی کیلئے جمع ہوئے تھے اور ان کے جذبے کو دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ سندھ کی سرزمین سفید فام نسل کیلئے تنگ ہو جائے گی لیکن انگریزوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بعض ضمیر فروشوں کو خرید لیا جو وفادار سندھیوں کے نقاب چہروں ڈال کر فداکاروں میں شامل ہو گئے۔ ان کے دو کام تھے ایک یہ کہ اہل سندھ کو دہشت زدہ کریں اور انگریزوں کی طاقت سے ڈرا کر خوف و ہراس پیدا کریں، دوسرا یہ کہ موقع ملے تو پیٹھ میں چھرے گھونپ دیں۔

کہا جاتا ہے کہ سندھیوں کے جوش و ولولہ کا یہ عالم تھا کہ وہ سوتے میں بھی نعرے لگانے لگتے تھے۔

میر شیر محمد خاں کا لشکر حیدر آباد سے آٹھ میل پر ٹنڈو موسیٰ خاں کھتران میں پھیلی کے مشرق میں خیمہ زن ہوا۔ انگریزوں نے بھی حیدر آباد میں اپنی قوت کو یکجا کر لیا تھا۔ وہ بھی بڑے توہن خانے لے کر میدان میں آئے۔ ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو سندھ کی آخری جنگ آزادی وقوع پذیر ہوئی جو جنگ دہ کے نام سے مشہور ہے۔

ہوش محمد میر صوبدار خاں کا غلام تھا۔ غیر معمولی ہمت و شجاعت دیکھ کر شیر

اسکے کردار کو مشتبہ قرار دے کر خیرپور کی ضبطی کا حکم دیدیا پھر علی مراد خاں خود لندن گئے تو انکی ریاست واکزار ہوئی۔

اس میں انگریزوں کے رحم یا مروت کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے انکی آنکھیں کھول دی تھیں کہ ہندوستان کی مردہ لاش میں کسی وقت بھی جان پڑ سکتی ہے اور وہ کوئی کروٹ بدل سکتا ہے پھر سندھ میں میر علی مراد خاں کی ہدایت پر اسکے بیٹے میر شاہنواز خاں نے اس دور میں انگریزوں کی مدد کی تھی اور ایک تجربے کے بعد حکومت برطانیہ کو اہل ہند کی اشک شونی بھی کرنا تھی اس لئے خیرپور کو واکزار کر دیا گیا ورنہ میر علی مراد خاں کا بھی وہی حشر ہوتا جو میر صوبدار خاں کا ہوا تھا۔

۲۵ رمضان ۱۳۱۱ھ مطابق اپریل ۱۸۹۴ء کو میر علی مراد خاں کا انتقال ہو گیا اور لاش کر بلانے محلے لے جا کر دفن کی گئی۔ انگریز نواز پالیسی سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو میر علی مراد خاں ایک عالم و فاضل، دور اندیش اور ادب پرور حکمران تھا خیرپور کے اگلے حکمرانوں کے عہد کی سیاست ماضی سے بالکل مختلف تھی انہیں سارے ہندوستان کی طرح انگریز کے زیر سایہ زندہ رہنا تھا۔ شیعہ زاویہ نگاہ سے ان سب نے گر انقدر خدمات انجام دیں، عزاداری کو فروغ دیا کتنے ہی مذہبی ادارے انکی یادگار ہیں۔

### میرپور

میران سندھ کی تیسری حکومت میرپور کی تھی جس کا بانی ٹھارہ خاں بن میر فتح خاں تھا۔ ٹھارہ خاں نے بعض ریگستانی علاقے اپنی مملکت میں شامل کر کے اسکو وسیع کیا اور ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں ایک پائیدار حکومت چھوڑ کر چل بسا: بہادر اور مدبر حکمران تھا۔

میر علی مراد خاں اس کا بیٹا تھا جو ایک خدا ترس اور رعایا پرور حکمران تھا۔ ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اسکے بعد اس کا بیٹا میر شیر محمد خاں تخت میرپور پر بیٹھا۔ انگریزوں نے دوسرے میروں کی طرح اسپر بھی ڈورے ڈالے اور اس سے بھی ایک معاہدہ کیا۔



انگلیاں تلوار کے قبضے میں بیوست رہیں جو کئی اوزاروں کی مدد سے ڈھیلی کی گئیں۔  
انگریز کمانڈر چارلس اسکی بہادری سے استامتاثر تھا کہ اس نے اسکی جھیز و  
تکفین فوجی احترام کے ساتھ کرائی اور اعزاز کیلئے اسکی قبر پر ایک توپ نصب کرادی

میر شیر محمد خاں کے بڑے بڑے جیلے سپاہی اور سردار مارے جاچکے تھے۔  
وہ خود زخموں سے چور چور تھا مگر میدان چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ اب وہ فتح کے بجائے  
میدان جنگ کی موت کیلئے لڑ رہا تھا لیکن بعض ہواخواہ سمجھا، سمجھا کر اسکو نکال لے گئے  
اور وہ نصر پور ہوتا ہوا میر پور چلا گیا۔ وہاں سے ساز و سامان لیکر ریگستان آگیا جہاں  
اسکے اہل و عیال پہلے ہی جاچکے تھے۔

سندھ کی شجاعت کے بچے کچے عناصر اب بھی اسکے ساتھ تھے۔ چانڈیہ بلوچ  
اور ٹالپر امراء دریا عبور کر کے سکرند میں اس سے ملنے والے تھے۔ شیر محمد شاہ پور  
چاکر سے سکرند کی طرف روانہ ہوا کہ انگریزوں کی گھوڑ سوار فوج نے اسکو آگھیرا۔ شیر  
محمد خاں نے پیٹھ دکھانا تنگ قرار دیا۔ کوئٹہ کے مقام پر پیدل فوج نے سواروں  
کا مقابلہ کیا اور دو سو لغاری جوان مارے گئے۔

رات کے اندھیرے میں وہ میر پور ماتھیلہ روانہ ہوا۔ اہل سندھ نے ابھی  
ہمت نہیں ہاری تھی لوگ اس کا پتہ لگا لگا کر اسکے گرد جمع ہو رہے تھے اور ایک بڑا  
لشکر اسکے پاس جمع ہو گیا تھا کہ میر علی مراد خاں نے اپنے وسائل سے اسکے امراء میں  
پھوٹ ڈلوادی۔ وہ اس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے اور سندھ کا شیر قندھار کا عازم  
ہو گیا۔ وہاں کے سرداروں نے اسکی مدد کی لیکن انگریزوں کے مقابلے میں انکی  
حیثیت ہی کیا تھی۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد میر شیر محمد نے اپنے آپ کو گورنر پنجاب  
کے حوالے کر دیا۔ عام حالات میں اسکو تختہ دار پر لٹا دیا جاتا لیکن اب ہندوستان میں  
انگریزوں کی پالیسی بدل رہی تھی اس لئے گورنر نے اسکی ہمت اور بہادری کے صلے  
میں کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔

عمر کے آخری حصے میں وہ اپنے بھائی کے ساتھ میر پور آیا تھا۔ کبھی کا نسلی  
حکمران اب ایک عام شہری تھا مگر وہاں کا ذرہ ذرہ اب بھی اسکے قدموں کے نیچے بچھ

محمد خاں نے اسے سپہ سالار لشکر بنایا تھا۔ اس نے بڑی تنظیم کے ساتھ اپنے لشکر کو  
آگے بڑھایا۔ انگریز توپوں نے اپنے دہانے کھول دئے جسکے لئے وہ تیار تھے لہذا اپنی  
چھوٹی چھوٹی توپوں کی آڑ لیکر وہ آگے بڑھے اور ایک بڑی تعداد کی بھیٹ دے کر  
انگریز فوجوں سے جانکرائے۔

میر غلام علی خاں ولد میر عبداللہ ٹالپر، رحیم خاں ٹالپر، علی خاں ٹالپر اور دیگر  
بچے کچے میر اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان میں شامل تھے۔ کمال خاں مری، نبی  
بخش مری اور نوحانی بلوچ انگریزوں پر بلانے بے درماں کی ٹوٹ پڑے۔ ان سب  
نے وہ شمشیر زنی کی کہ سندھ کو ہمیشہ ان پر فخر ہے گا۔

ہوش محمد کا نعرہ تھا ہم مرجائیں گے مگر سندھ کو جانے نہ دیں گے۔ وہ انگریزوں  
کے سروں پر بجلی کی طرح کڑک رہا تھا۔ انگریزوں کے قدم ڈنگا رہے تھے۔ وہ وقت  
دور نہ تھا کہ سندھ کی آزادی کا سورج ایک بار پھر طلوع ہو جاتا مگر اسکو مشیت ایزدی  
ہی کہنا چاہئے کہ اچانک تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں جن سے استاگرد و غبار بلند ہوا کہ  
آدمی کو آدمی دکھائی نہ دیتا۔

ایسے میں انگریزوں کا زر خرید محمد خاں تھوڑے جو سندھی لشکر میں شامل تھا وہ  
ہلکے ہلکے قدم اٹھا کر میر شیر محمد کے ذخیرہ بارود کے قریب پہنچا اور اس میں اس نے  
آگ لگادی۔ غداری کی یہ نظیر صفحات تاریخ میں ڈھونڈھنے سے نہ ملے گی کہ آگ کی  
ایک چنگاری سے محمد خاں تھوڑے نے سندھ کی پشت کے بجائے ماتھے پر غلامی کا داغ  
لگا دیا۔

بارود ایک دھماکے کے ساتھ اڑی تو ہر طرف ہلچل پڑ گئی اور انگریزوں نے  
مقدور کو سازگار دیکھ کر ڈنگاتے ہوئے قدموں کو جمادیا۔ شکست یقینی ہو چکی تھی۔  
سپاہیوں کے دل ٹوٹ چکے تھے پھر بھی سندھ کے سالاران لشکر آخری سانس تک  
لڑتے رہے اور انگریزوں کی لاشیں دور دور تک پھیلاتے رہے۔

ہوش محمد کا تو یہ عالم تھا کہ وہ جدھر جاتا دور دورہ انگریز زخمیوں کی قطاریں  
بنا کر بڑھتا رہتا۔ قبضہ شمشیر اسکی انگلیوں میں بیوست تھا وہ بڑھتا جا رہا تھا اور شمشیر  
گویا خود بخود گردش کر رہی تھی مگر تباہ کے۔ آخر وہ بھی گر گیا لیکن مرنے کے بعد اسکی

## ہندوستان

۴۱۷

اسلام کا پہلا آوازہ کوہ صفا کی چوٹی سے بلند ہوا جو کے کے درو دیوار میں گونج کر ریگزار عرب کے ذرے ذرے کو سنائی دیا۔ پھر سفارت الہی کے آخری نمائندے کی معجز منائی سے ایوان کسریٰ کے مہندم کنگروں سے جا کر ٹکرایا تو اسکی آواز بازگشت چین کے قصر شہنشاہی میں گونجی اور فضائے بسیط میں جذب ہو کر اطراف و اکناف عالم میں پھیلی اور غیر شعوری طور پر بندرا بن کے گویوں اور اجودھیا کے برہمنوں کے کانوں میں پڑی اور جب عکاظ کا میلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا اور ایام حج میں شمال و جنوب، مشرق و مغرب کے تاجر کے میں جمع ہوئے تو پیغمبر عرب کا ابتدائی پیغام لے کر اپنے اپنے اوطان کو واپس ہوئے۔ یہ پیغام خلاصہ تھا پچھلے چالیس سال کی بے نام تعلیمات کا جو وحدانیت اور انسانیت پر مشتمل تھیں۔ کرشن کنھیا اور رام چندر جی کے حلقہ بگوش اسکو سن کر کچھ چوکنا ضرور ہوئے مگر انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے کسی ترمیمی شکل میں خود ان کے عقائد پیش کیے جا رہے ہوں۔

عرب تاجروں نے سواحل ہند کو اسلام کے ابتدائی خال و خد سے آشنا کیا مگر کوئی واضح تصویر سامنے نہ آسکی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے کچھ لوگ وقتاً فوقتاً عرب پہنچے اور حضور کی حیات میں اور حضور کے بعد اسلام کو سمجھنے کی کوششیں کرتے رہے۔ بعض روایات کے مطابق امام جعفر صادق کی درس گاہ سے بھی کسی پنڈت نے فیض حاصل کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر وہ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوا ہو لیکن مجموعی طور پر ہندوستان اسلام سے ناآشایا اور اس سرزمین پر اسلام ایک علامت استغہامیہ بنا رہا؟

ہندوستان سے مسلمانوں کا ربط عملی طور پر غزنی کے عروج سے شروع ہوا اور سبکتگین کے پہلے حملے کے بعد سے درہ خیبر کے دامن میں اسلام کو کچھ سمجھنے کے حالات پیدا ہوئے لیکن گنگا و جمن کا متمدن دوا آبہ اور گھاگرا اور سر جو کے کنارے پہلے

۴۱۸

جاتا تھا آخر ۱۸۷۷ء میں وہ دہلی کی خاک کا پہوند ہو گیا۔

میران سندھ اب ماضی کی ایک کہانی بن چکے ہیں مگر ان کا حب وطن، رعایا پروری، غریب نوازی اور علم دوستی آج بھی سندھ میں ضرب المثل ہے۔ کاش ان میں بہادری کے ساتھ باہمی اتحاد بھی ہوتا تو سندھ سات سمندر پار کے تاجروں کے ہاتھوں لٹنے سے بچ جاتا۔ (۵۷)



کی طرح اسلام سے انجان بنے رہے۔ دین عرب کا کوئی صحیح مفہوم ان کی سمجھ میں آ ہی نہ سکتا کیونکہ اب تک کسی نے ان کو کچھ بتایا ہی نہ تھا لہذا ان کے ذہنوں میں اسلام پہلے ہی کی طرح استفسار طلب تھا۔

یہ تو انہیں سلطان محمود کے حملوں کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام کیا ہے؟

### غزنی

سلطان محمود کا مقصد دوسرے سلاطین کی طرح شاید ملک گیری نہ تھا بلکہ صرف لوٹ مار، غارت گری اور حصول دولت تھا۔ تب ہی تو جب وہ حملے کے بعد غزنی واپس ہوتا تو میدان کے میدان لاشوں سے بچے ہوئے چھوڑ جاتا، معبدوں کو ویران اور انسانوں کو کنگال بنا جاتا۔ مہاتما گوتم کی سرزمین براسی کو اسلام سمجھا گیا۔

اسلامی اقتدار کا یہ کردار شرعی نقطہ نظر سے متنازعہ مسئلہ رہا ہے۔ ہمیں اس پر کوئی بحث مقصود نہیں ہم تو غزنی کے اس عظیم فرمانروا کو شیعہ زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہمیں دمشق و بغداد کے بعد غزنی کے ایوان سادات کے خون سے رنگین دکھائی دیتے ہیں۔ بلاشبہ محمود نے شیعوں کے خون کی اتنی ارزانی نہیں کی، جسکی مثالوں سے بنی امیہ کا پورا عہد بھرا ہوا ہے اور جس کی نظریں منصور دوانیقی اور متوکل نے پیش کی ہیں لیکن اس کو تو اکثر مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ سلطان محمود کو شیعوں سے سخت دشمنی تھی۔ وہ ان کی پرچھائیں تک برداشت نہ کر سکتا۔ چند اکابر کو جو اس نے نظر انداز کر دیا تھا اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اس کے دور میں ان کا مثل مل نہ سکتا۔ کہاں سے لاتا محمود حکیم فردوسی جیسا باکمال اور ابوہریرہ بخاری البیرونی کا سا ہمہ جہت عالم اور ریاضی داں۔

محمود کی شیعہ دشمنی کے یوں تو بہت سے واقعات ہیں ان میں ایک سامنے کی بات سندھ پر اسکا حملہ ہے بعض مورخین نے اس کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر ابن اثیر جیسے بے باک مورخ نے لکھ ہی دیا کہ منصورہ پر محمود کا حملہ صرف اس لئے ہوا تھا کہ اہل منصورہ مذہب سے پھر گئے تھے یعنی اسمٰعیلی شیعہ ہو گئے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ محمود نے بعض بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس کے حملوں کے نتیجے میں کچھ مسلمان ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہ گئے مگر ہمارے نزدیک اس سے شیعیت اور اسلام دونوں کو شدید دھچکا لگا البتہ اس زاویہ

نگاہ سے اسکے بھانجے مسعود غازی نے دین کی گرانمایہ خدمات انجام دیں جن کا مزار بہرائچ میں آج بھی عقیدت گاہ عوام و خواص ہے اور ہندوستان میں جتنے ورود سے مختلف مقامات پر مسلم خاندان بس گئے جنہوں نے آگے چل کر شہاب الدین غوری کا خیر مقدم کیا۔ شیعیت کو محمود سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ وہ تو اول دن سے ظلم و تشدد سہنے کی عادی رہی تھی لیکن اسلام کی ایک غلط تصویر اجنبی ملک میں پیش ہو جانا بہر طور قابل غور ہے جس کو معین الدین اجمیری جیسے اولوالعزم بزرگ نوک پلک سے درست نہ کرتے تو پوری ہندو قوم نہ جانے کب تک غلط فہمی میں پڑی رہتی اور یہی سمجھتی رہتی کہ اسلام نام ہے قتل و غارت کا اس میں انسان اور انسانیت کیلئے کوئی جگہ نہیں لیکن خدا رحمت کرے ان صوفیائے کرام کا جن کا مقصد حیات ہی پیغمبر عرب کے دین کو اطراف و اکناف عالم میں پہنچانا تھا۔ وہ ایک جذب و کشف کی کیفیت میں ہر کفرستان کی طرح ہندوستان میں بھی وارد ہوئے۔ اپنے مختص انداز میں پہلے عوام سے خلا ملا پیدا کیا پھر انہیں کی زبان میں عبد و معبود کی حقیقتوں کو بیان کرنا شروع کیا اور اسکی تان اسلام پر جا کر توڑی۔

یہ صوفی نہ شیعہ تھے نہ سنی، ان میں کی اکثریت صرف محمدؐ اور آل محمدؐ کو جانتی تھیں اور انہیں کا تعارف اس نے اجنبی لوگوں سے کرایا۔ حتیٰ کہ غزنویوں کا پورا زمانہ گزر گیا اور حکومت غزنی کے افق پر غور کا سورج طلوع ہونے لگا

### غور

امیر المومنین حضرت علیؑ کی خلافت قاہری میں شنسب بن حریق سیستان کی ایک بڑی حکومت کا فرمانروا تھا جسکی حدود ایک طرف ایران سے مکران تک، دوسری طرف غور اور فیروزہ کوہ کے اس پار تک پھیلی ہوئی تھیں۔ شنسب خود کوفہ جا کر امیر المومنین کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا اور اس وقت سے اسکی مملکت میں نعرہ ہائے اہل بیت بلند ہوتے رہے تھے۔

یہ حکومت مختلف اوقات میں اپنی سرحدیں بدلتی رہی مگر فرمانروائی آل شنسب کے ہاتھ میں رہی۔ آل شنسب اب ایک قبیلہ نہ رہا تھا بلکہ اسکی بہت سی شاخیں ہو گئی تھیں مگر وہ سب اولاد فاطمہ زہراؑ کی حلقہ بگوش تھیں اور اسکے اثرات اندرون سندھ تک وسعت پذیر تھے۔



بنی عباس نے جب کالا لباس پہن کر انتقام خون حسین کا آواز بلند کیا تو آل شنب کا ایک قبیلہ ابو مسلم کے ساتھ تھا پھر بنی صفار کے عروج میں بھی ایک شنبی سردار مصروف جہاد پایا گیا اس دوران کس کس نے خلافت کو تسلیم کیا اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دامن اہل بیت کسی فرد واحد کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوٹا اور ان کی حکومت نوعیت بدل بدل کر باقی رہی۔

غزنی میں سبکتگین کی حکومت کے قیام کے بعد نسل ضحاک کی یہ حکومت مصائب کا شکار ہونا شروع ہوئی اور سلطان محمود کے دور میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بقول "فرشتہ" ذریت ضحاک میں دو بھائی سور اور سام غزنوی غلبہ کا بری طرح شکار ہوئے، کتنے قتل ہوئے، کتنے جلاوطن ہو گئے اس کا اندازہ کسی تاریخ سے نہیں ہو سکتا البتہ یہ کہا جاسکتا ہے آل شنب سلطان محمود کے ہاتھوں اس طرح تباہ ہوئی کہ فیروزہ کوہ کے پھیلے ہوئے دیہات میں کچھ لوگ نہایت بد حالی میں باقی رہ گئے باقی مخلوط آبادی میں ضم ہو گئے یا ناپید ہو گئے۔

سام ہندوستان کے طرف بھاگ گیا اور ایک طویل مدت کے بعد وہ وطن واپس ہو رہا تھا کہ کشتی دریا میں غرق ہو گئی اور اس کا جواں سال بیٹا اعزالدین حسین بچ کر ساحل بننار ہو گیا اور کسی طرح فیروزہ کوہ تک جا پہنچا جہاں وہ ڈاکوؤں کا سردار بن گیا پھر گرفتار ہو کر قید کر دیا گیا سات سال بعد اس نے زندان سے رہائی پائی تو اپنے قبیلے کو منظم کرنے کی فکر کی۔

دوسرے بھائی سور کی اولاد نے غزنی کی پناہ لے لی تھی جو بالاخر فیروزہ کوہ میں آکر آل شنب کے باقیات الصالحات سے آ ملی۔

پھر علاء الدین حسین جہاں سوز بن اعزالدین حسین نے غزنی پر چڑھائی کی اس کو جلا کر خاک کر دیا ہلاطین غزنویہ کی قبروں تک کو کھدوا ڈالا اور خود واپس آ گیا بہاء الدین سام اعزالدین کے بیٹے غیاث الدین اور معزالدین اسکے بھتیجے تھے جو استقرار حکومت میں اسکے دوش بدوش رہے۔ یہ دونوں شجاعت و سخاوت میں چچا سے بہت بڑھے چڑھے تھے۔ علاء الدین حسین نے کسی غلط فہمی میں ان کو قید کر دیا جو اسکے بیٹے سیف الدین محمد کے عہد میں رہا ہوئے اور برسر اقتدار آئے۔ (۵۸)

غیاث الدین جب غور کا بادشاہ ہوا تو اسکے بھائی معزالدین عرف شہاب الدین نے تو سب مملکت کیلئے پہلے سلطنت غزنویہ کی حدود کو منتخب کیا پھر فتح ہندوستان کا منصوبہ بنایا۔

خاندانی ناموں کے لحاظ سے ان کے نام غیاث الدین حسین اور معزالدین حسین تھے مگر زباں زد صرف غیاث الدین اور معزالدین ہوئے۔

اس طرح سلطنت غزنی کے کھنڈروں پر غور کا ایوان حکومت تعمیر ہوا سلطان غیاث الدین بڑا بھائی ہونے کے باعث بادشاہ تھا اور شہاب الدین اس کا نائب لیکن عملی طور پر سارا نظم مملکت شہاب الدین کے ہاتھ میں تھا۔

امیر سبکتگین اور سلطان محمود نے آل شنب کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور کوئی قلم ایسا نہ تھا جو اٹھا رکھا ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا نام و نشان تک مٹا دیا تھا۔ اس کو تو مشیت الہی کہنا چاہئے کہ باقیات الصالحات فیروزہ کوہ میں موجود تھے اور خاندان کے مختلف گروہ جو ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے، ان کی نسلیں، جہاں جہاں تھیں، اطلاع پا کر یکجا ہو گئیں اور تاریکی اور بربادی کی وہ داستانیں بیان کی جانے لگیں جو سنیہ بسنیہ چلی آرہی تھیں۔

غزنوی طوفان نے ذریت ضحاک کو مٹا کر خاک کر دیا تھا مگر ہوا کا رخ بدلنے پر اس خاک سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں پھر یہ چنگاریاں شعلہ بن گئیں۔ سلاطین غزنی نے تم کے جو پہاڑ ڈھائے تھے، وہ مرنے کے بعد خود ان پر ٹوٹے۔ دانستہ یا نادانستہ محمود کی قبر تو رہ گئی باقی تمام مزارات مہدم کر دئے گئے اور سبکتگین کی قبر کھود کر اس کی ہڈیاں تک نکال کر پھینک دی گئیں۔ سبکتگین نے اپنے جو رو ستم کا آغاز بھی اسی طرح کیا تھا اور بعض امراء شنب کی لاشیں تک جلوا دی تھیں کیونکہ وہ آل رسول کے طرفدار تھے۔

شنسبین حریق کی نسلوں کو چار سو سال سے زائد گزر چکے تھے۔ دو ڈھائی صدی تک تو وہ اپنے مسلک پر سختی سے قائم رہیں اور بوہی سلطنت کے وجود تک ان کے عقائد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی مگر سلطنت غزنی نے جب اطراف و جوانب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو جانیں تک محفوظ نہ رہیں اور عقیدے میں جبریہ تبدیلی



شروع ہو گئی پھر کھلے قتل عام کے بعد بقتیہ السیف نے تقیہ اختیار کر لیا اور اس طرح شنب جیسے راج العقیدہ شیعہ کی نسلیں آہستہ آہستہ غزنوی عقیدے کی حامی بن گئیں لیکن ایک بڑی تعداد اب بھی شیعہ تھی۔ غیاث الدین اور شہاب الدین کے بارے میں یقین سے کہا نہیں جاسکتا کہ وہ شیعہ تھے یا سنی مگر یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ:-

”بنی امیہ کے عہد میں جمیع ممالک اسلام میں برسر منابر اہل بیت کو ناسزا کہتے تھے مگر غزور والے مرتکب اس امر شنیع کے نہیں ہوئے۔“ (۵۹)

خود سلطان غیاث الدین کو بھی اس پر فخر تھا کہ غزور میں علی اور اولاد علی پر کبھی تبرائے نہیں کیا گیا، نہ سلطنت غزنی کے قیام سے پہلے اور نہ سلطنت غزنی کے نیست و نابود ہونے کے بعد۔ اس سے مطلب واضح طور پر یہی نکلتا ہے کہ شہاب الدین غوری کے پیش رو اور بعد میں آنے والے جنہوں نے اپنا قدیم عقیدہ بدل دیا تھا، وہ بھی کسی طرح دشمن اہل بیت نہ تھے بلکہ حضرت علی کی فضیلت کے قائل تھے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ شیعہ تھے۔ ان سے بھی کہیں کہیں شیعوں کو نقصان پہنچا ہے مگر سبکتگین کی طرح شیعہ کشی انکی گھٹی میں نہیں پڑی تھی کیونکہ شیعہ اسلاف کی سنی اولاد تھے۔

### غزنی و غزور

غزور و غزنی کا توازن و تقابلی کیا جائے تو مسلمان ہونے کے باوجود دونوں میں کئی تضادات نظر آئیں گے اور محسوس ہوگا کہ غزنی کی تعمیر و مشق کی مٹی سے کی گئی تھی۔ بنی امیہ نے جو کچھ سادات کے ساتھ کیا تھا غزنی میں اسکی پوری تقلید کی گئی اور دور دور تک جہاں کہیں علی کے دوستوں کا پتہ چلا، کوشش کر کے انکا قلع قمع کر دیا گیا۔

تبرائے غزنی دمشق کی پوری تقلید نہ کر سکا کیونکہ دمشق میں ستر ہزار منبروں سے علی اور اولاد علی کو برا کہا جاتا تھا غزنی میں صرف ایک محفل منعقد کی جاتی اور اس میں نام بنام لعنت بھیجی جاتی تھی۔ شنبی حکومت ختم ہو چکی تھی ورنہ اس کے جواب میں وہاں مدح علی کے قصیدے پڑھے جاتے۔ اب اسکی جگہ غزور کی سلطنت

تائم ہوئی تو سلطان غیاث الدین نے اعلان کر دیا کہ غزور آل رسول کا دوست ہے دشمن نہیں۔

سلطان محمود اور شہاب الدین غوری کا موازنہ کیا جائے تو دونوں میں یہی نمایاں فرق دکھائی دے گا۔ ایک کے دل میں علی کی دشمنی کا ابال، دوسرے کے دل میں علی کی محبت کے سوتے پھوٹتے نظر آئیں گے۔ شہاب الدین کی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ اسکی رگوں میں دوڑنے والا شنب کا خون اس سے حب آل رسول کا تقاضا کرتا رہا ہوگا۔

مورخین سلطان محمود کے اسلامی کارناموں کو اچھلتے ہیں۔ شاید محبان علی کی عداوت بھی ان کارناموں میں شامل ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ فقیہان اسلام نے بھی ناروا خونریزی اور کھلی ہوئی غارتگری پر کوئی فتویٰ نہیں لگایا اور غیر مسلم عبادت گاہوں پر ڈاکہ ڈالنے کو جہاد کہہ دیا، حالانکہ ان کے زاویہ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو جہاد سلطان شہاب الدین غوری کا تھا جو ہندوستان پر اس لئے حملہ آور ہوا تھا کہ وہاں مسلم حکومت قائم کرے۔

پرتھوی راج کے مقابلے میں سلطان غوری کی پہلی شکست سے اسکی شجاعت پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ وہ حد سے زائد زخمی ہونے کے باوجود میدان سے ہٹنا نہ چاہتا تھا مگر اس کا غلام رزم گاہ سے اسکو نکال لے گیا۔

بلاشبہ شہاب الدین بہادروں کی نسل سے تھے۔ اس شکست کو وہ بھول نہ سکا۔ دو سال تک اس نے خون آلود کپڑے نہیں اتارے، اوپر سے شاہی لباس پہنتا رہا۔ دو سال تک زمین پر لیٹا رہا اور جب پوری فوجی تیاری کر لی تب دوبارہ فتح یا موت کا نعرہ لگا کر غزور سے روانہ ہوا۔

پرتھوی راج ہندوستان کی راجپوت شجاعت کا ورثہ دار تھا۔ اسکو شکست دینا آسان نہ تھا مگر نوشتہ ازل میں ہندوستان میں مسلمان حکومت کا قیام خوش نصیب شہاب الدین کے نام لکھ دیا گیا تھا۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑا اور دہلی پر اس نے اپنا پرچم لہرا دیا۔

ہمارا زاویہ نگاہ تسخیر ممالک کے اس انداز کا مکمل نہیں ہوتا، ہم تو اسلام کو



دلوں میں آباد کر دینے کے قائل ہیں۔ شہنشاہ کا نام جسکی نظیر بن سکتا ہے تاہم تسخیری نظریے سے شہاب الدین کے طریقے کو برداشت کیا جاسکتا ہے جس کا نتیجہ کم سے کم استناد ضرور نکلا کہ قطب الدین ایبک کی پہلی مسلم سلطنت کی بدولت مسلمان تیزی کے ساتھ ہندوستان پہنچنے لگے اور اہل ہند کو پیغمبر عرب کا مذہب کسی حد تک سمجھنے کا موقع ملا۔

سلطان محمود نے غزنی کا خزانہ زرو جو اہر اور سونے کی مورتیوں سے بھر دیا تھا لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ خود وہ مرنے سے قبل اس انبار کو دیکھ دیکھ کر روتا تھا، اپنے ساتھ کیا لے گیا؟ اسکے برعکس شہاب الدین غوری کا جب نام آتا ہے تو وہ ہندوستان کی مسلم فرمانروائی کا نقطہ آغاز قرار پاتا ہے۔

مسلمانوں کی جنگوں کا فیصلہ فقہی نقطہ ہائے نگاہ سے ذرا مشکل ہے۔ فقہاء سے کسی جنگ کے بارے میں استفتاء لیا جائے تو فتاوے مختلف ہوں گے۔ فقہ امامیہ تو صرف ان جنگوں کو اسلامی کہے گی جو اسلام اور صرف اسلام کیلئے لڑی گئی ہوں اور انکی نوعیت بھی دفاعی ہو جارہا نہ ہو۔ فقہ امامیہ کسی مستبد قوم پر بلا سبب حملے کو جائز قرار نہیں دیتی تا وقتیکہ اس قوم کی طرف سے خود مسلمانوں پر حملے کا خطرہ نہ ہو اور مسلمانوں پر مسلمانوں کی یلغار تو صرف ازالہ ظلم کیلئے جائز ہو سکتی ہے۔ فقہ حنفی میں بھی اسی طرح کی پابندیاں ہیں مگر ان میں قدرے لچک پائی جاتی ہے لیکن بعد کے مجتہدین اور ائمہ نے ان میں بڑی کشادگی پیدا کر دی ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام غزالی اور امام ابن تیمیہ کے موقف اگرچہ یکساں نہیں پھر بھی وہ اس مسئلے میں زیادہ پابندیاں عائد نہیں کرتے انجام کار بعض مقامات پر ان میں ایک الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

بات صرف سلطان غزنی یا شہاب الدین غوری کے حملوں کی نہیں ہے، ان سلاطین کی بھی ہے جو تسخیر ملک کیلئے ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے۔ سلطان محمود نے کسی کمزور شیعہ مملکت کو ہڑپ کر لیا تو فقیہ کہہ دے گا کہ محمود کٹر سنی تھا، اسکو حق پہنچتا تھا، اہل بدعت کو قتل کر دے مگر جب سنی حکمران سنی سے ٹکراتا ہے تو کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

تاریخ میں ایسے ان گنت محاربات ہیں اور حیرت ہوتی ہے جب ان کو بھی جہاد قرار دیا جاتا ہے۔ امیر تیمور جب ترکان عثمانی پر حملہ آور ہوتا ہے تو دونوں طرف سے نعرہ ہائے اللہ اکبر بلند ہوتے ہیں۔ بابر جب ابراہیم لودی سے ٹکر لیتا ہے اور شیر شاہ سوری جب ہمایوں پر یلغار بولتا ہے تو نعرے وہی بلند ہوتے ہیں جو اسلامی جنگوں میں لگائے جاتے رہے۔ ان مواقع پر فقیہوں سے دریافت کیا جائے تو دونوں طرف سے حق بجانب ہونے کے فتوے مل جائیں گے لیکن فقہ امامیہ کسی کو حق بجانب قرار نہ دے سکے گی۔ ملک گیری کیلئے کوئی جنگ ہمارے نزدیک اسلامی نہیں ہو سکتی خواہ وہ محمود نے لڑی ہو یا شہاب الدین نے۔

لیکن شہاب الدین کا ہندوستان پر حملہ کفرستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کیلئے تھا اس لئے وہ ماضی کی بعض جنگوں کی تعریف میں آسکتا ہے جن میں ہونیوالی خونریزی کسی طرح مستحسن نہ تھی تاہم نتائج کے اعتبار سے بعض افادی پہلو ضرور برآمد ہوئے۔

ہمارے مولیٰ علی ابن ابی طالب نے ایسی کسی جنگ کو کبھی نہیں سراہا لیکن مسلمان جب جنگ میں پھاند ہی پڑے تو اہل اسلام کی بقاء کی خاطر حضرت عمرؓ کو گرانقدر اور بروقت مشورے دے اور تعاون بھی کیا۔

اسی طرح شہاب الدین غوری کے پرتھوی راج پر حملے کا کوئی جواز نہیں ہے مگر چونکہ اسکی نیت میں غارت گری اور لوٹ مار کے بجائے مسلمانوں کی حکومت کا قیام تھا لہذا شرع کی حدود و قیود سے قطع نظر اس کے حملہ میں ایک پسندیدہ پہلو بھی ہے اور ممکن ہے کہ اس کا کوئی فقہی جواز بھی مل جائے۔

احسان ہے شہاب الدین غوری کا کہ اس نے ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے استقرار حکومت سے اسلام کا وہ پرچم نصب کر دیا جس نے کوہ ہمالہ سے راس کمارنی تک اور غور سے بنگال تک چپے چپے کو اپنے سائے میں لے لیا اور اس عہد کا آغاز کر دیا جو مستقبل کے ہزار سال تک چلتا رہا اور جسکی بدولت مشرکوں کی سرزمین پر توحید کا بول بالا ہوتا رہا۔



## ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ

### قطب الدین ایبک

قطب الدین ایبک کا عقیدہ کیا تھا؟ اسکو سمجھنے کیلئے اس پورے دور کا جائزہ لینا پڑے گا، جب آل شنسب غزنوی غلبے میں پس رہی تھی۔ زندگیاں بچانے کا اسکے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ عقیدہ بدل دیا جائے یا ترک وطن کر کے غزنویوں کی دست رس سے دور نکل جائے۔ یہی ہوا کہ ایک تعداد ہندوستان میں جا بسی، کچھ لوگوں نے عقیدہ کا سودا کر لیا، تھوڑے سے لوگ روپوش ہو گئے۔ نسلوں پر نسلیں گزرتی چلی گئیں اور کئی سو برس کے بعد فیروزہ کوہ سے آل شنسب کے باقیات الصالحات انگریزیاں لیکر نکلے تو تھوڑے سے لوگ اشاعرشی عقائد کے حامل تھے باقی خلافت کے قائل مگر حضرت علی کی افضلیت کو ملتے تھے اور خلافت علی کے بعد صرف سلسلہ اہل بیت ان کا مرجع عقیدت تھا۔

معز الدین حسین المعروف بہ شہاب الدین کا مسلک بھی یہی تھا لہذا قطب الدین ایبک کے بارے میں بھی ایسا ہی کچھ سمجھا جاسکتا ہے جبکہ اسکے ساتھ ہندوستان میں رہ جانے والے بارہ امامی بھی تھے اور چار یاری بھی لیکن ایسے چار یاری جو حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی کے بعد صرف آل رسول کے قائل تھے۔ یہی عقیدہ ہندوستان میں حنفی اکثریت کا رہا۔

تاج الدین یلدوز اور دوسرے امراء کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ ان میں سے بعض شیعہ بھی تھے۔

### سلطان شمس الدین التمش

ایک عالم و فاضل اور درویش صفت فرمانروا تھا، حنفی العقیدہ مگر محب اہل بیت اسکی بیٹی رضیہ سلطانہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ ہو گئی تھی لیکن اس زمانے میں عقیدے کی تفریق اتنی نمایاں نہ تھی کہ کوئی امتیاز کیا جاتا۔ عاشور محرم کو شہادت نامہ پڑھا جاتا تو اس میں سب ہی شریک ہوتے شیعوں کے گھروں میں جو مجلسیں ہوتیں ان میں بھی اہل سنت شرکت کرتے۔

## معز الدین بہرام شاہ

اس کے دور کی بھی یہی کیفیت رہی۔

### سلطان علاء الدین مسعود شاہ

یہ بھی اسی مسلک پر قائم رہا۔

### سلطان ناصر الدین محمود

عالم و فاضل اور مرد فقیہ تھا۔ یہ بھی اہل بیت کرام کی عظمت کا قائل تھا۔

### سلطان غیاث الدین بلبن

اس کی بھی اہل بیت دشمنی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بات یہ تھی کہ ان سب کے سامنے امور مملکت کے سوا دوسرے مسائل زیادہ اہمیت نہ رکھتے۔ جو امراء خلافت کے قائل نہیں تھے، وہ اس موضوع کو زیر بحث نہ لاتے۔ رہ گیا ذکر کر بلا تو اس سے کسی سنی کو بھی کوئی اختلاف نہ تھا۔ جہاں کہیں مجلس منعقد ہوتی جس کا جی چاہتا اس میں شریک ہو جاتا۔ اس وقت تک ہندوستان میں بدعت کی ہوا پھیلی نہ تھی۔

### سلطان معز الدین کیقباد

اس کی تین سالہ حکومت فیروز شاہ خلجی کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ اسکے بعد علاء الدین خلجی، شہاب الدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ، تخت سلطنت پر بیٹھے جن کاشیعوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر غیاث الدین تغلق نے تخت پر قبضہ کر لیا۔

### غیاث الدین تغلق

اس کے بعد ۷۲۵ھ میں سلطان محمد تغلق سربراہی سلطنت سوا۔ اسکی طویل حکومت کے بعد ۷۵۲ھ میں فیروز شاہ تخت نشین ہوا پھر غیاث الدین تغلق باربک، ابوبکر شاہ، سلطان ناصر الدین محمد، سکندر شاہ، ناصر الدین محمود عثمان سلطنت سنبھالتے رہے اور اسی زمانے میں امیر تیمور صا. جعفران ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔

یہ تمام حکمران سنی تھے لیکن ان سب کے عہد میں شیعہ مسلک کے امراء کسی نہ کسی حد تک حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ان میں سے

### سلطان محمد شاہ

غدار امراء میں گھرا ہوا تھا۔ ۸۴۹ھ میں اس نے وفات پائی۔

### علاء الدین بن محمد شاہ

اس کی تخت نشینی میں بہلول لودھی حاکم پنجاب نے شرکت نہیں کی۔ اس نے دہلی کے بجائے بدایوں کو پایہ تخت بنالیا۔ بہلول لودھی نے امراء کو ملا کر ولی پر قبضہ کر لیا اور ۸۸۴ھ میں علاء الدین کے مرنے پر بادشاہ بن گیا۔

### سلطان بہلول لودھی

نسلاً افغان تھا اسکے زمانے میں جون پور میں سلطان شرقی کی حکومت قائم ہو چکی تھی جس سے بہلول کے کئی معرکے ہوئے مگر وہ مملکت شرقیہ پر قبضہ نہ کر سکا ۸۹۴ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

### سلطان سکندر لودھی

ایک کامیاب فرمانروا تھا، خدا ترس اور منصف مزاج بھی۔ اس کی سلطنت اور مدت سلطنت دونوں وسیع تھیں۔ ۹۲۳ھ میں انتقال کیا۔

### ابراہیم لودھی

سکندر لودھی کا بڑا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے پر بادشاہ ہوا۔ ایک باصلاحیت حکمران تھا مگر بعض امراء اس سے خوش نہ رہ سکے۔ ظہیر الدین محمد بابر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو پانی پت کے میدان میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ (۶۰)

بعض اپنے عقائد میں متعصب بھی تھے پھر بھی کسی نے شیعوں پر ایسا قلم نہیں کیا کہ غزنی کی یاد تازہ ہو جاتی بلکہ بکثرت ایسے شواہد ملتے ہیں کہ بعض سلاطین نے شیعہ دوستی کا ثبوت دیا۔

ہندوستان میں امیر تیمور کی فتوحات کا تعلق شیعوں سے صرف اس قدر ہے کہ اس کی فوج میں شیعہ مسلک کے بہت سے امراء اور شیعہ سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی ورنہ ایسی کوئی تسخیری مہم کو ہمارے عقیدے سے کوئی واسطہ نہیں۔

تیمور خونخوار تھا یا ظالم اسکو ہندوستان کی سرزمین جانتی ہوگی جس نے اس سے قبل سکندر اعظم سے سلطان محمود غزنوی تک کتنے ہی فاتحین کی یلغاروں کو جھیلا تھا اور زمانے کی گرد سے خون آلود مٹی کی سرخی کو صاف کیا تھا ہم تو استا ہی جانتے ہیں کہ تیمور بھی دوسرے جنگ آزماؤں کی طرح تلوار سے اپنا مقدر بنانے کیلئے نکلا تھا۔ بڑا مال غنیمت حاصل کیا اس نے اور اسے دل کھول کر سپاہیوں میں تقسیم کیا۔

پھر جب وہ پلٹا تو ملتان و دیپالپور کی حکومت خضر خاں کو تفویض کی۔ دو آجے پر ملو اقبال خان نے قبضہ کر لیا۔ گجرات خان اعظم خاں مالوہ دلاور خاں، قنوج داودہ دکرہ اور جونپور سلطان الشرق خواجہ جہاں کے حصے میں آیا جن میں باہم نبرد آزمائی ہوتی رہی۔ شہاب الدین غوری کے لواحقین کا آخری حکمران ناصر الدین محمود بھی ان میں ایک فریق تھا وہ ۸۱۶ھ میں انتقال کر گیا اور سید خضر خاں حاکم پنجاب دہلی کے تخت پر بیٹھ گیا۔

### سید خضر خاں ولد ملک سلیمان

امیر تیمور کا معتمد تھا۔ شروع میں اس نے سکھ و خطبہ بھی میرزا شاہ رخ کا جاری کیا تھا عقیدہ اشاعہ عشری نہیں تھا لیکن آل رسول کی عظمت کا قائل تھا اور سادات کی عزت کرتا تھا۔

### مبارک شاہ

۸۲۳ھ میں باپ کے انتقال پر تخت نشین ہوا۔ تیرہ سال بڑی خوبی سے حکومت کی، سازش سے قتل ہوا۔ تاریخ مبارک شاہی اسکے نام پر ہے۔



## شاہان شرقیہ

امیر تیمور کے پنجاب کی جانب مراجعت کرنے کے بعد خواجہ جہاں نے بھی دوسرے علاقائی حکمرانوں کی طرح جوہپور میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ خواجہ تغلق عہد میں مختلف عہدوں پر فائز رہا تھا اور اس علاقے کا گورنر بھی جس پر اب اس نے اپنی آزاد سلطنت کا پرچم لہرایا تھا۔

جوہپور کی بنیاد ۷۶۰ھ میں فیروز شاہ تغلق نے ڈالی تھی اور اسکو آباد کرنے میں بڑا التزام کیا تھا۔ اس وقت خواجہ جہاں دلی میں بادشاہ کی نیابت کر رہا تھا۔ اب ۸۰۱ھ میں اس نے اسی شہر کو اپنا دار السلطنت قرار دیا تھا۔ سلطان الشرق اور اتابک اعظم کے خطابوں کے ساتھ اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا تھا، کول، قنوج، بہار اور ترمٹ کے علاقے اسکے زیر نگیں تھے۔

خواجہ جہاں بہت جہاندیدہ، تجربہ کار اور شجاع حکمران تھا لیکن وہ اپنی مملکت کو قدرے وسیع کرنے کے سوا کوئی کار نمایاں انجام نہ دے سکا اور ۸۰۲ھ میں خالق حقیقی سے جا ملا۔

### شمس الدین مبارک شاہ

خواجہ جہاں کا بیٹا تھا جو باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ بعض مورخین نے اسکو گود لیا ہوا بیٹا تحریر کیا ہے۔ ملو اقبال خاں حاکم بیانہ سے مدد لے کر اس پر چڑھ دوڑا مگر شکست کھا جانے کے ڈر سے واپس ہو گیا۔ ۸۰۴ھ میں ناصر الدین محمود ایک لشکر جرار کے ساتھ عازم جوہپور ہوا لیکن قنوج پر قبضہ کر کے واپس ہو گیا۔ مبارک شاہ اسکو جواب دینے کیلئے جوہپور سے چلا مگر راستے میں اس کا انتقال ہو گیا۔

### ابراہیم شاہ

اس کا جانشین ہوا۔ اس نے اپنی حکومت کا آغاز فوج کی نئی تنظیم سے کیا پھر ایک لشکر لیکر محمود شاہ سے انتقام لینے کیلئے روانہ ہوا۔ دونوں فوجیں جب آمنے سامنے خیمہ زن ہوئیں تو محمود شاہ کے کئی سردار ابراہیم شاہ کا پلہا بھاری دیکھ کر اس سے آٹے اور مقابلے میں سلطان محمود شاہ کو شکست فاش ہوئی۔ ابراہیم شاہ شرقی سنبھل کی طرف روانہ ہوا اور اسکو مسخر کر کے تاتار خاں کو وہاں گورنر بنا دیا۔

محمود شاہ دلی واپس ہو چکا تھا۔ ۸۱۶ھ میں ابراہیم نے پھر جوہپور سے دلی کا رخ کیا، راستے میں ناصر الدین محمود شاہ کے خود اپنی طرف پیش قدمی کرنے کی خبر ملی تو ابراہیم شاہ فوراً پلٹ پڑا محمود شاہ نے سنبھل فتح کر لیا اور دلی واپس ہو گیا۔ اسکے بعد ہی اسکا انتقال ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد سلطان ابراہیم شاہ تسخیر کالپی کے ارادے سے چلا اور بہوگاؤں فتح کر کے بدایوں کی طرف بڑھا کہ حاکم بیانہ کا قصد مدد کیلئے اس سے آکر ملا۔ بیانہ مبارک شاہ کی طرف سے ملک مبارز نے فتح کر لیا تھا اور کالپی کا عازم تھا۔ سلطان شرقی حاکم بیانہ کی درخواست پر اسکی جانب متوجہ ہوا تو خود مبارک شاہ دلی سے چل کر مقابلے پر آگیا۔ جمنائے کنارے موضع اتر دلی کے قریب دونوں لشکر قریب پہنچے۔ سلطان شرقی دریا عبور کر کے بہان آباد میں خیمہ زن ہوا اور مبارک شاہ قصبہ مالی کوٹہ میں۔

سلطان شرقی نے صورت حال کو سمجھ کر بیانہ کا رخ کیا اور دریائے کنہری کے نزدیک جا کر ٹھہر گیا اور مبارک شاہ اس سے دس میل کے فاصلے پر آکر مقیم ہوا اور دونوں نے اپنے اپنے لشکروں کے گرد خندقیں کھود لیں۔

اس اثناء میں مبارک شاہ نے شرقی لشکر پر شب خوں مارنا شروع کر دیا آخر ایک دن دونوں فوجوں کے سرداروں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور اندھیرا ہونے پر لشکر اپنے اپنے پڑاؤ پر واپس آ گئے۔



سلطان شرقی شروع ہی سے محسوس کر رہا تھا کہ مبارک شاہ بہت بڑے لشکر کو لیکر آیا ہے جسکو شکست دینا آسان نہیں ہے اسی لئے وہ مقابلے کو ٹال رہا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ موقع سے ٹل جائے اور دوسرے ہی دن اس نے میدان سے کوچ کر دیا۔

مبارک شاہ بھی اپنی جگہ خائف تھا۔ اس نے تعاقب نہیں کیا اور بڑھ کر بیانہ پر حملہ آور ہو گیا۔ محمود خاں حاکم بیانہ قلعہ بند ہو گیا مگر اب اسکو سلطان شرقی سے مدد کی امید نہ رہی تھی لہذا اس نے مبارک شاہ کی اطاعت کر لی۔

۸۳۷ھ میں سلطان مبارک شاہ نے دریائے جمنا کے کنارے ایک شہر مبارک آباد کے نام سے بسایا۔ اس درمیان اسکو خبر ملی کہ ابراہیم شاہ شرقی اور ہوشنگ شاہ مالوی کے درمیان کالی کیلئے جنگ ہو رہی ہے۔ مبارک شاہ کو بڑا ارمان تھا کہ وہ ایک بار سلطان شرقی کو ہر ادے لہذا موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ دلی سے مبارک آباد آیا جہاں سرور الملک وزیر کے آدمیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔

سرور الملک عرصے سے گھات میں لگا ہوا تھا۔ مبارک شاہ کے قتل کے بعد اس نے محمد شاہ کو برائے نام بادشاہ بنا دیا اور سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ سلطان الشرق ابراہیم کیلئے دلی پر حملہ کرنے کا بہترین وقت تھا۔ ۸۴۴ھ میں وہ جوہنپور سے نکلا اور نواح دلی کے اکثر مقامات مفتوح کر لیے۔ محمد شاہ میں مقابلے کی طاقت نہ تھی۔ اس نے صلح کی درخواست کی اور اپنی بیٹی کی شادی شاہزادہ حسین بن ابراہیم شاہ کے ساتھ کر دی۔

اس عرصے میں قادر خاں حاکم کالی نے میدان خالی پا کر جوہنپور پر حملہ کر کے بڑی غارت گری کی اور کافی آدمی قتل کر ڈالے۔ ابراہیم شاہ یہ خبر پا کر تیزی کے ساتھ واپس ہوا اور کالی اور اسکے مضافات کو تہس نہس کر دیا پھر مظفر و منصور جوہنپور واپس آ گیا۔ اسی سال اس عظیم فرمانروا نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

وہ صحیح معنی میں سلطان الشرق تھا۔ سخی و شجاع، رعایا پرور اور غلام دوست۔ سارا ملک اسکے عہد میں خوشحال رہا اور جوہنپور نے تو اتنی ترقی کی کہ شیراز ہند مشہور

ہو گیا۔ دور دور سے صوفیائے کرام، علمائے عظام، شاعران باکمال اور ادبائے ذی منزلت جوہنپور آکر آباد ہوئے۔

یوں تو سارے سلاطین شرقیہ اشیا عشری عقیدہ رکھتے تھے لیکن سلطان ابراہیم شاہ ان میں ممتاز تھا، بڑا عبادت گزار متقی اور پرہیزگار کتنی ہی عمارتیں اسکی یادگار ہیں اور بعض مسجدیں اور امام باڑے شہادت دیتے تھے کہ وہ ابراہیم شاہ کے بنوائے ہوئے ہیں۔

اسکے قبولا عام کا یہ عالم تھا کہ موت کی خبر سننے ہی سارا شہر ماتم کدہ بن گیا اور بڑے بڑے درویش تک سیاہ پوش ہو گئے۔

### سلطان محمود شاہ

سلطان ابراہیم کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا محمود تخت شرقیہ پر بیٹھا اور بزرگوں کی طرح رعایا اور فوج کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سلطان محمود خلجی حاکم مالوہ سے سلطان ابراہیم کے تعلقات اچھے رہے تھے اور کالی اس کا تابع تھا لیکن نصیر خاں بن قادر خاں حاکم کالی نے خلاف اسلام روشن اختیار کر لی تھی لہذا سلطان محمود شرقی نے اسکی شکایت حاکم مالوہ کو لکھ بھیجی لیکن نصیر خاں نے کچھ ایسی چالیں چلیں کہ جوہنپور اور مالوہ کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور سلطان محمود خلجی ایک لشکر لے کر مملکت شرقیہ پر چڑھ دوڑا۔

محمود شرقی بھی اطلاع پا کر مقابلے پر آیا۔ دونوں میں کئی جنگیں ہوئیں۔ آخر شیخ الاسلام جائیلدہا نے بیچ میں پڑ کر صلح و صفائی کرا دی۔ طے پایا کہ چار ماہ بعد نصیر خاں کالی اور ایرچہ سلطان الشرق کے حوالے کر دے۔

کچھ دنوں بعد سلطان محمود نے جسادن کے خلفشار کو دور کیا اور بعض پر گنوں اور قصبوں میں تھانے قائم کیے پھر اوڈیہ پر حملہ کیا جہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کو پریشان کر رکھا تھا اور اسکو مسخر کر کے واپس ہوا۔

۸۸۵ھ میں بہلول لودھی دلی کے تخت پر قابض ہو چکا تھا اور ہر طرف ایک انتشاری کیفیت تھی لہذا ۸۵۶ھ میں سلطان شرقی بھی طالع آزمائی کیلئے نکلا اور اس



نے پہنچتے ہی دلی کو حصار میں لے لیا۔ سلطان بہلول لودھی اسکے دفاع کیلئے دیپال پور سے چلا لیکن اسکے ساتھ ہی اس نے سلطان الشرق کے لشکر میں سازش کا جال بکھا دیا اور عین لڑائی میں شرقیوں کا ایک افسر فوج لودھیوں سے جا ملا۔

سلطان محمود شرقی نے شکست سے بچنے کیلئے میدان جنگ سے کوچ کر دیا لیکن لودھی لشکر عقب سے حملہ آور ہو گیا۔ مقابلے میں ایک بڑا شرقی افسر فتح خاں ہری کام آیا اور سات جنگی ہاتھی لودھی پکڑ لے گئے۔

آخر ایک دن طرفین میں سخت معرکہ ہوا مگر فتح و شکست کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ شام کو فوجیں واپس ہوئیں تو طرفین کے بعض سرداروں سے نامہ و پیام شروع کر دیا اور فیصلہ اسیر ہوا کہ جتنا ملک مبارک شاہ کے پاس تھا، بہلول لودھی اسیر قلعہ رہے اور جو حدود سلطان ابراہیم کی سلطنت کی تھیں محمود شاہ ان سے تہاوز نہ کرے

لیکن بہلول لودھی نے معاہدے کی خلاف ورزی کی شمس آباد پر لشکر کشی کر کے اسے رائے کرن کے حوالے کر دیا اور سلطان محمود شاہ کو شمس آباد کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ دریا خاں اور قطب خاں نے اسکو روکا اور رات میں خاموشی سے اسپر حملہ کر دیا مگر شرقی سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

اسی درمیان ۸۶۲ھ میں محمود شاہ کا انتقال ہو گیا اور امرائے سلطنت نے جوہپور میں اسکے بڑے بیٹے محمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

سلطان محمود شاہ سے بہلول لودھی کی صلح ہو گئی تھی جب وہ واپس دلی پہنچا تو اسکی بہن نے اپنے شوہر قطب خاں کا مطالبہ کیا جو جوہپور میں قید تھا۔ سلطان بہلول پھر پلٹ پڑا۔ سرستی پور کے قریب بہلولان محمد شاہ اسکے مقابل آکر خیمہ زن ہوا۔

کوئی خاندان جب اوبار کی زد پر آتا ہے تو پہلے اس میں پھوٹ پڑتی ہے۔ ایسا ہی کچھ جوہپور کے اس شاہی خاندان میں بھی پیش آیا اور سلطان محمد شاہ کی ناعاقبت اندیشی اور فرعونیت نے شاہی افراد کے مابین رخنہ ڈال دئے۔

غلط فہمیاں دلوں میں گھر جاتی ہیں تو مشکل سے نکلتی ہیں اور محمد شاہ کا انداز تھا بھی ایسا ہی کہ ماں اور بھائی سب اس سے مشتبه تھے لہذا اس کا چھوٹا بھائی

شاہزادہ حسین بہلول لودھی کے ہراول کو روکنے کے بہانے ایک فوج لے کر اس سے علیحدہ ہو گیا پھر شاہزادہ جلال اسکے پیچھے ہو لیا۔

بہلول لودھی کی فوج کو اس نے شاہزادہ حسین کا لشکر سمجھا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ بہلول کی فوج نے اسکو گرفتار کر لیا اور بہلول نے اسکو دلی بھیج دیا۔ اسکے بعد محمد شاہ تاب مقابلہ نہ لاسکا اور قنوج کا عازم ہو گیا۔

ماں کو ان واقعات کی خبر ہوئی تو اس نے امراء کے مشورے سے محمد شاہ کو معزول کر دیا اور اسکے بجائے شاہزادہ حسین کو تخت نشین کر دیا۔

یہ تھی اس عظیم سلطنت کے زوال کی ابتداء جس نے تقریباً ایک صدی سے تدبر اور بہادری کی بے مثال نظیریں پیش کی تھیں اور معاشرے کی وہ خدمات انجام دی تھیں جنکے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔

محمد شاہ دریائے گنگا کے کنارے گھاٹ اجگر کے قریب فروکش تھا۔ شرقی لشکر اسکو گرفتار کرنے کیلئے پہنچا تو اس نے مقابلہ کیا اور لڑتا ہوا مارا گیا۔

### سلطان حسین شاہ ، سلطان الشرق

سلطان حسین ایک جیالا فرمانروا تھا۔ وہ بہلول لودھی سے صلح کر کے اوڈیہ پر لشکر کش ہوا۔ راجہ نے اطاعت کر لی اور سلطان کا مگار و کامراں جوہپور واپس ہو گیا۔

۸۷۱ھ میں اس نے قلعہ بنارس کی مرمت کرائی اور وہاں سے راجہ گوالیار کو مطیع کیا۔

۸۷۸ھ میں سلطان حسین نے تسخیر دلی کا عزم کیا۔ بہلول لودھی نے سلطان محمود خلجی سے مدد طلب کی مگر اس کا جواب آنے سے قبل سلطان حسین جاہنچا اور تمام اطراف دلی پر متصرف ہو گیا۔ بہلول لودھی نے دلی کے ارد گرد اٹھارہ کوس تک کا علاقہ چھوڑ دینے کی درخواست کی مگر اسکو شاہ حسین نے منظور نہ کیا۔ مجبوراً بہلول لودھی اٹھارہ ہزار سوار لیکر دلی سے نکلا اور دریا کے کنارے سلطان حسین کے مقابل آکر ٹھہر گیا۔

شاہ حسین کے سردار مضافات پر غارت گری کرنے کیلئے گئے ہوئے تھے۔



بہلول نے ایک مقام پر دریا کو عبور کیا اور اچانک اسکے سر پر جا پہنچا۔ سپاہ بادشاہ کی غفلت کے باعث قتل ہونے لگی اور اس نے راہ فرار اختیار کی۔ مجبوراً شاہ حسین کو بھی بھاگنا پڑا۔ ملکہ جہاں اور خواتین بھی گرفتار ہو گئیں مگر بہلول نے انہیں بعزت شاہ حسین کے پاس بھجوا دیا۔

ملکہ جہاں نے پہلی بار بھی شاہ حسین کو دلی کی فتح پر اکسایا تھا۔ انکی پھر اس نے آمادہ کرنا شروع کیا۔ شاید وہ اپنے اسلاف کی حکومت شوہر کو دلوانا چاہتی تھی۔ سلطان حسین جب اپنے لشکر کے ساتھ دلی کے قریب پہنچا تو بہلول لودھی نے پھر معذرت کی مگر شاہ حسین کو اپنی طاقت پر ضرورت سے زائد اعتماد تھا یا مشیت الہی میں یہی لکھا تھا کہ وہ تدبر سے کام نہ لے۔ انجام کار مقابلہ ہوا اور جوہنپور کی فوجیں ہزیمت یاب ہوئیں۔

سلطان حسین ذرا بھی عقل سے کام لیتا تو تباہی اس کا مقدر نہ بنتی لیکن پہلی شکست کے بعد دوبارہ وہ زیادہ تیاری سے گیا اور منہزم ہوا۔ انکی پھر اسکے لئے سنبھل جانے کا موقع تھا مگر بد نصیبی دامن کش تھی وہ پھر بھی ہوش میں نہ آیا اور تیسری بار پھر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ تو اسکو ایسی شکست ہوئی کہ وہ گھوڑے سے کود کر فرار ہوا اور دور کے مقبوضات میں پناہ گزیں ہوا۔

بہلول لودھی نے جوہنپور پر قبضہ کر لیا جسکے بعد وہ صحیح معنی میں بادشاہ ہندوستان تھا۔

جوہنپور کی حکومت بہلول نے اپنے بیٹے باربک شاہ کو دیدی تھی۔ بہلول کی وفات کے بعد شاہ حسین نے باربک شاہ کو بھڑکا کر دلی پر حملہ کرا دیا مگر سکندر لودھی کے مقابلے میں باربک شاہ نے شکست کھائی اور بھاگ کر جوہنپور میں پناہ لی۔ سلطان حسین نے اسکے بعد دو مرتبہ سکندر لودھی کا مقابلہ کیا مگر قسمت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی ہر مرتبہ اسکو ناکامی ہوئی۔ وہ اپنے خسر سلطان علاء الدین کے پاس چلا گیا جہاں اسکو باقی زندگی عیش و آرام سے گزارنے کا موقع تو مل گیا مگر اسکی ہمت اتنی پست ہو چکی تھی کہ پھر اس نے ملک گیری کا تصور تک نہیں کیا اور باقی زندگی

دوسروں کے رحم و کرم پر گزار لے گیا۔

سلطان حسین میں بہادری کی کمی نہ تھی۔ وہ دوسرے سلاطین ماسبق کی طرح تلوار کا دھن تھا لیکن شاید فہم و فراست سے بالکل خالی تھا جسکے نتیجے میں ۸۸۱ھ میں اسکے ہاتھوں سلطنت شرقیہ کا چراغ گل ہو گیا۔

### شرقی سلطنت کے بعد

سلطنت شرقیہ کا دورانیہ صرف اسی سال کا تھا لیکن اس مدت میں عوام پر اسکے اثرات اتنے گہرے تھے کہ سلطان حسین کے بعد لودھی حکمران شرقی حدود میں بہت دنوں چین سے بیٹھ نہ سکے۔ بات یہ تھی کہ سلاطین شرقیہ صحیح معنی میں رعایا کو اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت وہ سب کے آرام کا خیال رکھتے اور انفرادی و اجتماعی سطح پر ان کے مسائل پر توجہ دیتے۔ اسی لئے وقتاً فوقتاً ہندو و مسلمان رعایا بغاوت کرتی رہی۔

ایک بار تو ٹھاکروں نے باربک شاہ پر حملہ کر کے اسکو جوہنپور سے نکال دیا اور قلعہ میں آگ لگادی۔ تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ انہوں نے جوگا سنگھ کی قیادت میں ایک فوج مرتب کی۔ اس میں وہ سپاہی بھی شامل تھے جو سلطنت الشرق کے لشکر میں شامل رہے تھے۔ انہوں نے جوہنپور فتح کر کے مبارک خاں لوہانی کو دریا پار کرتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ سکندر لودھی خبر پا کر اپنی پوری طاقت یکجا کر کے جوہنپور پہنچا۔ رائے بھید نے خائف ہو کر مبارک خاں لوہانی کو رہا کر دیا۔ چونکہ راجپوت سکندر کے طوفانی لشکر کا مقابلہ نہ کر سکتے اس لئے جوگا سنگھ فرار ہو کر سلطان حسین شاہ کے پاس چلا گیا۔

سلطان الشرق قلعہ بند ہو گیا لیکن بزرگوں کے گرم اور شریف خون نے بزدلی کی موت مرنے کے عار قرار دیا اور ایک دن وہ پھانک کھول کر مقابلے پر آگیا۔ ایک غیر متوازن مگر گھمن کا معرکہ ہوا۔ راجپوت اور مسلمان بہادر زخم کھا کھا کرتے رہے مگر انہوں نے میدان نہ چھوڑا مگر تابہ کے آخر سلطان حسین کے ساتھ صرف چمہ جانب زور ہو گئے جو سلطان حسین کو نکال لے گئے۔ یہ اسکی آخری جنگ تھی جس کے بعد وہ بنگال کی طرف چلا گیا اور پھر اس میں کبھی مقابلے کی طاقت پیدا نہ ہو سکی



خلیق احمد نظامی کسپر ہنسپو، سسٹری آف انڈیا نے اسکو خراج تحسین پیش کیا تھا۔  
سلطان الشرق مبارک شاہ کے بعد سلطان الشرق حسین شاہ سلاطین شرقی  
میں دوسرا نامور بادشاہ ہوا جو صاحب علم و صاحب سیف تھا۔ سکندر لودھی سے  
بار بار شکست کھانے کے بعد اس نے مرتے دم تک شکست قبول نہیں کی اور بار بار  
مقابلے پر آمادہ رہا۔ رعایا اس سے محبت کرتی تھی اور وفادار تھی۔

یہاں تک کہ چھتروں نے جو پور پر حملہ کر کے سکندر لودھی کے بھائی کو  
زبردست شکست دے کر جو پور پر قبضہ کر لیا۔ سلطان حسین شاہ نے جتنے دن  
بادشاہت کی کبھی سکون نصیب نہیں ہوا، ہمیشہ میدان جنگ میں نظر آیا لیکن رعایا  
سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ وہ ایک متقی، پرہیزگار، عبادت گزار اور نیک سیرت  
بادشاہ تھا۔ (۶۱)

یہ سلطنت اب ماضی کی ایک کہانی بن چکی ہے لیکن اس نے جو پور کو جو  
زندگی دی تھی اسی کی بدولت وہ اب تک زندہ ہے۔ کہاں فیروز شاہ تغلق کا وہ شہر جو  
اس نے ۷۶۰ھ میں آباد کیا تھا اور کہاں سلاطین الشرق کا جو پور جو اہل علم اور  
صاحبان کمال کے سبب شیراز مشرق تھا اور ہندوستان کے عظیم شہروں میں اسکو  
برتری حاصل تھی۔

سلاطین الشرق کی تعمیرات بھی منفرد تھیں اور مسجدیں اور امام باڑے  
خستہ حالی کے باوجود اپنے بانیوں کی بے پناہ عقیدت اور شغف ایمانی کے شاہد ہیں۔

## مغل سلطنت

ہندوستان میں

ظہیر الدین محمد بابر ہندوستان میں مغل حکومت کا نقطہ آغاز تھا اور تیمور کی  
سلطنت کا پانچواں وارث۔ اسی لئے اس نے ابراہیم لودھی کو لکھا تھا کہ اگر وہ پنجاب  
اور وہ تمام علاقے جو تیمور نے اپنی سلطنت میں شامل کیے تھے اسکو واپس کر دے تو  
بابر باقی ہندوستان کیلئے کوئی تعرض نہ کرے گا۔

فی الوقت بابر کے پاس نہ کوئی بڑی حکومت تھی اور نہ بڑی فوج لیکن اسکو  
اپنے جنگ آزمودہ سرداروں پر اعتماد تھا اور فرمانبردار سپاہیوں کی شجاعت پر پورا  
بھروسہ لہذا بارہ چودہ ہزار کے لشکر کو وہ لاکھوں پر بھاری سمجھتا۔

محمد بابر مرزا ہوش سنبھلنے کے بعد سے خود اپنے خویش واقارب اور جنگیز  
خاں کی اولاد سے برسرِ پیکار رہا تھا، قدم قدم پر نئی مشکلات سے دوچار رہا تھا اور  
زور بازو کے بل پر ہر بھنور میں اپنا راستہ خود بناتا آیا تھا، البتہ وہ شکر گزار تھا شاہ  
اسمعیل صفوی کا جس نے شیبانی خاں کو قتل کرنے کے بعد اوزبکوں کے مقابلے میں  
دس ہزار فوج سے اسکی مدد کی تھی۔ بابر بخارا کی فتح کو صفوی بادشاہ کی دین سمجھتا تھا  
مگر شیبانی خاں کے جانشین تیمور سلطان نے جلد ہی اسکو واپس لے لیا۔

دوسری بار پھر قزلباش سپہ سالار نجم الثانی نے اسکی تحریک پر اوزبکوں سے  
جنگ کی اور اپنے غرور کے سبب مارا گیا۔ بابر مرزا کو بے سرو سامانی میں یہ علاقے  
خالی کرنا پڑے مگر ہمت مردان کے سہارے اس نے افغانوں کا بڑا علاقہ مسخر کر لیا  
پھر ۹۲۵ھ میں قندھار فتح کیا ۹۳۰ھ میں داخل ہندوستان ہوا۔

بابر کو بارہا ساتھیوں کی بیوفائی کے سبب میدان چھوڑنا پڑا تھا پھر بھی بہت سے ساتھی اور سپاہی ایسے تھے جن پر اسے پورا اعتماد تھا جن میں بڑے ناموں، خواجہ مہدی وغیرہ، کے ساتھ ایک چھوٹے سے افسر جو اس سال بیرم خاں ترکمان کا نام بھی تھا جسکو بابر نے چھوٹی سی عمر میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی کیا تھا اور کچھ ہی دنوں میں ایک دستہ فوج کا افسر بنا دیا تھا۔

پنجاب اور پنجاب سے آگے بڑھتے ہی اسکے افسروں کا بار بار لودھی فوجوں سے سامنا ہوا لیکن فتح بابر کا مقدر بن چکی تھی۔ پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی سے بابر کا فیصلہ کن معرکہ ہوا اور یہ معرکہ ہندوستان میں مغل سلطنت کا سنگ بنیاد بن گیا۔

دوسری شہرہ آفاق جنگ رانا سانگا مہارانا پتھور سے ہوئی اور اسکی فتح نے بابر کو شہنشاہ ہندوستان بنا دیا۔ اسکے بعد دہلی میں اقامت گزریں ہو کر بابر نے تحائف اور بعض نادرات مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ روانہ کیے اور جو علماء و فضلا اسکے ساتھ تھے انکو بھی نذرانے پیش کیے

بابر عقیدے کے لحاظ سے حنفی المسلک تھا مگر ہر قسم کی عصبیت سے پاک اور محب اہل بیت اور غیر شیعہ اولاد تیمور میں بیشتر کا یہی مسلک تھا۔ اسی لئے اسکی فوج میں افسروں اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد شیعہ تھی اور وہ اسکے وفادار بھی تھے صفویوں سے اسکے گہرے روابط تھے اور بنظر غائر دیکھا جائے اور بابر کی پچھلی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو بابر کے ارتقاء میں اسکی خدا واد صلاحیت کے بعد صفویوں کے تعاون کو دخل تھا۔

۹۳۷ھ میں اس کا انتقال ہوا اور ہمایوں اسکے بجائے ہندوستان کے تخت پر بیٹھا

### نصیر الدین محمد ہمایوں

بابر اعظم کا ہونہار بیٹا تھا مگر قسمت کا ہٹیا بابر نے ایک وفادار فوج اسکے سے چھوڑی تھی مگر نزدیک و دور کے بعض حکمرانوں نے غداری کی۔ ہمایوں نے مختلف

جنگوں میں مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن نامساعد حالات میں شکست کھانا پڑی۔ مقدر ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اپنے خون جگر دشمن ہو گئے اور ہمایوں ہر طرف سے دشمنوں میں گھر گیا۔ آخر شیر شاہ سوری کے ہاتھوں ہزیمت یاب ہو کر سندھ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں سے کابل کا عازم ہو گیا۔

بھائیوں سے ہمایوں کے معرکے اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ہوس ملک گیری میں خون کے رشتے بھی قابل لحاظ نہیں ہوتے بلکہ حق وراثت کے سبب مستوجب قتل قرار پاتے ہیں۔

اب سر قندرو بخارا کے فرمانروا اور ہندوستان کے شہنشاہ بابر کا وارث پوری طرف سپاہ ہو چکا تھا۔ تھوڑے سے وفادار ساتھی رہ گئے تھے جن میں ایک بیرم خاں ترکمان بھی تھا جسکو بابر کی مردم شناس نظر کا انتخاب کہنا چاہئے کہ آغاز شباب میں جب وہ اسکی فوج میں شامل ہونے کیلئے گیا تو پہلی ہی نگاہ میں بابر نے ہاتھ پکڑ کر اسکو صف سے الگ کر لیا۔

وقت استبدال چکا تھا کہ ہمایوں جدھر جاتا دوستوں کی طرف سے دشمنی کا سلوک کیا جاتا ایسے میں بیرم خاں نے سابقہ روایات کے مطابق شاہ صفوی سے رجوع کرنے پر توجہ دلائی تو ہمایوں کو بھی اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اب بیرم خاں ہمایوں کا واحد سہارا رہ گیا تھا۔ وہ بابر کے عہد سے ترکمانوں میں جاننا پہچانا جاتا تھا اور بہت سے معزز ایرانی اسکے دوست رہے تھے جو شاہ طہماسپ صفوی کے دور فرمانروائی میں معزز عہدوں پر فائز تھے۔ بیرم خاں نے پہلے سے خطوط بھیج کر ان سے رابطہ قائم کر لیا تھا جنہوں نے ہمایوں کے حالات شاہ طہماسپ کے گوش گزار کر دئے تھے۔

بیرم خاں نہیں چاہتا تھا کہ ہمایوں کو کسی سائل کی طرح شاہ صفوی کے پاس لے جائے اس لئے اس نے پہلے سے زمین ہموار کر لی تھی۔

”ہمایوں بیرم خاں اور اکیس آدمیوں کے ساتھ پہلے خراسان پہنچا پھر وارد سیستان ہوا۔ سرحد پر شاہ طہماسپ کی ہدایت کے مطابق احمد شاہ شاملو نے استقبال



کیا اور سیستان لے جا کر بعزت و تکریم فرائض میزبانی بجالایا۔ عورتوں نے اسی طرح مریم مکانی کو ٹھہرایا۔ وہاں سے ہمایوں ہرات آیا جہاں بڑے شاہزادے سلطان محمد کی طرف سے اسکے اتالیق محمد خاں نلکو نے خیر مقدم کیا اور احترام و تعظیم میں کوئی دقیقہ فرگزاشت نہ کیا۔

ہمایوں بے سروسامانی کے عالم میں تھا۔ شاہ طہماسپ نے قبل سے تمام حکام کو فراہم بھیج دئے تھے کہ شاہ ہمایوں کیلئے تمام لوازمات شاہی فراہم کیے جائیں اس پر عمل کیا گیا اور ہمایوں نے حدود ایران میں اسی جاہ و حشم سے سفر کیا گویا وہ شہنشاہ ہندوستان اور فرمانروائے سرقند ہو۔

پھر ہمایوں نے ہرات سے مشہد مقدس کا سفر کیا اور زیارت سے مشرف ہو کر قزوین کی طرف قدم بڑھایا۔ راستے میں اکابر و امراء عراق ضیافت کا اعزاز حاصل کرتے رہے۔ قزوین میں ہمایوں اقامت گزریں ہو گیا اور دوست صادق بیرم خاں کو شاہ طہماسپ کی خدمت میں روانہ کیا۔ (۶۲)

بیرم خاں شاہ طہماسپ کی خدمت میں باریاب ہوا اور پوری طلاقت لسانی کے ساتھ عرض مدعا کیا۔ وہ صرف رزم گاہ کا شیر ہی نہ تھا کئی علوم کا ماہر اور بلبل ہزار داستان بھی تھا اس نے شاہ طہماسپ کو متاثر کر لیا اور جمادی الاول ۹۵۱ھ میں قزوین سے تھوڑے فاصلے پر "بیلان قیدار نبی" میں ہمایوں سے اسکی ملاقات کرادی۔

ایران میں ہمایوں کے ساتھ جس عرت و احترام کا برتاؤ کیا گیا اور اسکے آرام و اسائش اور تفریح کے جو لوازمات مہیا کیے گئے انکو وہ کبھی فراموش نہ کر سکا۔

شاہ طہماسپ تقریباً مدد دینے کیلئے ہموار ہو چکا تھا مگر امراء اور اراکین دولت میں ایک بڑی تعداد اسکے حق میں نہ تھی کہ ایرانی لشکر کا کوئی حصہ صرف اخلاقی تقاضے پورے کرنے کیلئے داؤں پر لگایا جائے۔ شاہی خاندان کے بعض لوگ بھی اسکے حامی تھے۔

ایک دن شاہ طہماسپ کی بہن سلطان بیگم، ناظر دیوان قاضی جہاں قزوینی اور حکیم نور الدین جو محرموں میں تھے، ان سب نے باہم ایک مشورہ کیا اور ہمایوں

کے اعزاز میں ایک مخصوص دعوت کا التزام کیا اور سلطان بیگم براہ راست ہمایوں سے مخاطب ہو گئی۔ پہلے اس نے ایک رباعی پڑھی جس کا مطلب یہ تھا۔  
"ہم دل و جان سے اولاد علی کے غلام ہیں، ہمیشہ علی کا ذکر کے خوش ہوتے ہیں اور چونکہ علی کی ذات گرامی سے اسرار ولایت قاہر ہوتے ہیں اس لئے ناد علی کو ورد زبان رکھتے ہیں۔"

ہمایوں اس رباعی سے محظوظ ہوا تو سلطان بیگم نے کہا۔  
"اگر آپ وعدہ کریں کہ اپنے ممالک محروسہ کے منبروں کو منقبت خواناں آئمہ معصومین سے مزین کریں گے تو آپ کو ممالک موردنی حاصل کرنے کیلئے کمک دی جاسکتی ہے۔"

یہ جواب تھا ان معترضین کا جو یہ کہتے تھے کہ ہمایوں کی مدد کرنے میں ایران کا کیا فائدہ ہے؟ ہمایوں نے شاہزادی کے گوش گزار کیا۔

"میرے دل میں تو بچپن ہی سے خاندان رسالت کی محبت جاگزیں ہے۔ کامراں مرزا اور بعض چغتائی امراء سے اختلاف کا یہی سبب ہے۔"

فرشتہ کے اس بیان کی بعض تذکرہ نگاروں نے صراحت کی ہے کہ ہمایوں شروع ہی سے مائل بہ تشیع تھا اور بیرم خاں کی صحبت نے اس پر جلا کر دی تھی۔ شاہزادی سلطان بیگم کی دعوت میں اس نے کھلم کھلا شیعیت کا اعلان کر دیا تھا اور ہندوستان میں ترویج شیعیت کا عہد بھی کیا تھا لہذا شاہزادی نے مطمئن ہو کر شاہ طہماسپ سے سفارش کی اور شاہ صفوی نے داغ خاں قاپچار کو دس ہزار سوار دے کر ہمایوں کے ہمراہ کر دیا۔

ہمایوں شاہ طہماسپ سے رخصت ہو کر پہلے تبریز آیا پھر اردبیل میں مزار شیخ صفی الدین پر فاتحہ خوانی کی اسکے بعد مشہد سنجہ اور امام رضا کی قبر مبارک کی زیارت کر کے قندھار کی طرف روانہ ہوا۔

ہمایوں نے ۹۴۷ھ میں شیر شاہ سوری سے شکست کھائی تھی۔ ۹۵۲ھ میں شاہ طہماسپ سے مدد لیکر افغانستان پہنچا۔ اس عرصے میں شیر شاہ سوری کا شاندار دور حکومت گزر چکا تھا اور اسکا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ ۹۶۰ھ میں سلیم شاہ



کے انتقال پر اس کا کم سن بچہ فیروز شاہ بادشاہ ہوا جسکو اسکے ماموں محمد شاہ نے قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا جسکے عہد میں ہیمو بقال سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا اور مجموعی طور پر شیر شاہ کی سلطنت پانچ حصوں میں بٹ گئی۔ ہمایوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور ۹۶۲ھ میں اس نے دلی اور آگرہ فتح کر لیا۔

مفتی شوکت علی فہمی نے ہمایوں پر تبصرہ کیا ہے

”مذہبی معاملات میں وہ بابر کی طرح فرقہ پرستی سے بہت بلند تھا۔ اسکے دور حکومت میں کسی ایک غیر مسلم کو بھی محض اختلاف مذہب کی بنا پر تکلیف نہیں پہنچی۔ ہمایوں کی اس مذہبی رواداری سے اسکے بھائی کامران نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس نے کابل میں ہمایوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا کہ وہ شیعیت اور بے دینی کی طرف جھکا ہوا ہے اور اس کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ افغانستان کے علماء نے اسے ہندو نواز کہہ کر اسکے خلاف کفر کے فتوے جاری کر دیے تھے۔ ہمایوں نے جب دوبارہ کابل پر قبضہ جمایا تو ان تمام علماء کو قتل کر دیا جنہوں نے اسکے خلاف کفر کے پروپیگنڈے میں حصہ لیا تھا۔ ہمایوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ پکا سنی تھا مگر اہل بیت سے اسکو عشق تھا اس لئے لوگ اسکو شیعہ سمجھنے لگے تھے۔“ (۶۳)

ہمایوں حقیقت میں سنی ہو یا شیعہ مگر ایران میں وہ شیعہ تھا اور ہمایوں کے کردار کو دیکھتے ہوئے ناقابل یقین ہے کہ اس نے منافقت کا رویہ اختیار کیا ہو۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ دلی میں وہ سنی تھا بابر کی طرح سنی مگر غلو کی حد تک محب اہل بیت! ہمارا معیار کسی مسلمان کو پرکھنے کا ہے بھی یہی کہ وہ آل رسول کا کس حد تک دوست ہے اور جو آل رسول کا دوست ہے وہ اسکے دشمنوں کا دشمن ضرور ہوگا اور ہمایوں اگر ایسا تھا تو اس نے شاہزادی سلطان بیگم کے سامنے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

پھر بھی ہمایوں نے منبروں پر شائے اہل بیت کرانے کا وعدہ پورا نہیں کیا شاید اسکی آنکھوں یا سیاسی مصلحتوں نے اسکی اجازت یا موقع نہ دیا ہو کیونکہ تاریخ الاول ۹۶۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ سال ڈیڑھ سال کی مدت جن حالات میں

گزری وہ صفحات تاریخ میں روشن ہے اس لئے ہمایوں پر بد عہدی کا کوئی الزام لگایا نہیں جاسکتا کیونکہ زمر کا تعزیر اس سے منسوب ہے جو اسکے عزادار ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ خدا اسکی مغفرت کرے!

### شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر

اکبر ہمایوں کا شہرہ آفاق جانشین تھا جس نے مغل سلطنت کو سیہ پلائی ہوئی دیوار بنادیا، جو اندرونی اور بیرونی طوفانوں کو روکتی ہوئی تقریباً ساڑھے تین سو سال تک ایستادہ رہی۔ مورخین کا فیصلہ ہے کہ یہ دیوار بیرم خاں ترکمان کے کاندھوں پر کھڑی ہوئی تھی۔

بیرم خاں کے مسلک کے بارے میں یہ بدیہی حقیقت ہے کہ وہ شیعہ تھا اور اس کا خاندان کئی پشتوں سے شیعہ تھا پھر بھی بعض مورخین نے لکھ دیا کہ وہ حنفی تھا مگر حضرت علی کو بھی افضل مانتا تھا اور بارہ امام کا بھی قائل تھا عجیب ستم ظریفی ہے کہ اشاعری امامت قائل اور سنی!

بہر حال اس کا عقیدہ اگر یہی تھا تب بھی وہ شیعوں میں شامل تھا کیونکہ خلافت کا ماننے والا کبھی سلسلہ امامت کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

تاریخ شیخان علی کا مقصود محبان علی کے کارنامے ہیں اس لئے اس میں بابر کی بھی گنجائش ہے اور ہمایوں کی بھی

بابر حنفی المسلک مگر حد درجہ محب اہل بیت اور شاید اسکے غلو ہی سے بعض متعصب علماء نے اس پر شیعہ ہونے کا فتویٰ لگادیا تھا اور ہمایوں کو کامران مرزا کی تحریک پر کافر ہی بنادیا تھا۔ تب ہی ہمایوں نے ایران سے واپسی پر ایسے تمام علماء کو چن چن کر تہ تیغ کر دیا تھا۔ یہ انتقام اس نے شیعہ ہونے کی حیثیت سے نہیں لیا تھا اگر اسکو شیعہ کہا جاتا تو وہ بابر کی طرح خاموش ہو جاتا مگر اسکے لئے تو یہ فتویٰ تھا کہ شیعیت کے دائرے میں داخل ہو کر اس نے کفر اختیار کیا ہے۔ ہمایوں کفر کے بہتان کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے ضمیر فروش علماء کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شیعیت اور کفر صرف آج کے مذہبی بازار کا کھراسکہ نہیں ہے ابن الوقت



علماء نے ہر دور میں اپنی دوکان چلانے کیلئے اسکو پرکھا ہے اور اپنے حلقے میں چلایا بھی ہے لہذا ہمایوں کو اسپر برا فروختہ نہ ہونا چاہئے تھا۔ سلاطین، علماء اور سیاستدان ہمیشہ کفر و ایمان کے حوالے سے اپنا الو سیدھا کرتے رہے ہیں جیسا کہ اورنگزیب نے داراشکوہ کیلئے کیا تھا اور فی الوقت کامران مرزا مسلم عوام کو ہمایوں کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔

جہاں تک ہندوستان کی مغل حکومت کا تعلق ہے، تاریخی حقائق شاہد ہیں کہ وہ سلطنت صفویہ کی ساخت تھی۔ بابر نے دوبار شاہ اسماعیل سے مدد لی اور ہمایوں جب ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا زمین اسپر تنگ اور آسمان دور تھا تب بیرم خاں آخری سہارے کیلئے اسکو شاہ طہماسپ کی خدمت میں لے گیا تھا اور وہ قزلباشوں کا لشکر ہی تھا جس نے کابل و قندھار فتح کیا تھا اور ہمایوں ان قزلباشوں کا سربراہ تھا قزلباشوں کی وردی پہننے ہوئے اور انکی مخصوص ٹوپی سر پر لگائے ہوئے، فتوحات شاہ طہماسپ صفوی کے پرچم تلے ہوئیں اور ملک ہمایوں کا کہلایا۔

بابر یا ہمایوں کا کوئی قرض سلطنت صفویہ پر نہ تھا جسکو انہوں نے واپس لیا ہو بلکہ برے وقت میں ایک احسان عظیم تھا ان کا جسکو بتقاضائے شرافت کبھی بھولنا نہ چاہئے تھا۔ ہمایوں ڈوب چکا تھا۔ اس نے ڈوبتے ڈوبتے شاہ طہماسپ کو آواز دی شاہ دوڑ کر آیا اور اس نے ہاتھ پکڑ کر ہمایوں کو باہر نکال لیا۔

اب ہمایوں ملک عدم کا راہی ہو چکا تھا اور اکبر اعظم ہندوستان کا مقدر بن کر دلی کے تخت پر جلوہ افروز تھا تو پھر "شیعہ کافر ہیں" کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ اکبر کے عہد حکومت میں جس کسی پر شیعہ ہونے کا شک بھی ہو جاتا علماء اسکو ماخوذ کرتے اسکی سزا قتل یا قید دوام سے کم نہ ہوتی۔ اکبر نامہ اور دربار اکبری میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں جنکو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اکبر اعظم کا عہد اور یہ ظلم و ستم اس کے بعد ابو الفضل ہوں یا فیضی یا خود بیرم خاں، ان کا تقیہ اختیار کر کے اپنے کو حنفی کہہ دینا تعجب خیز نہیں۔

کوئی حد ہے احسان فراموشی کی۔ ہمایوں ابھی کل ایک شیعہ کے دربار میں دامن امید پھیلا کر گیا تھا اس نے یہ دامن بھر دیا تو آج اس کے بیٹے کے عہد معدلت

گستر میں شیعہ گردن زدنی۔ ہمیں اس روش پر کوئی استعجاب نہیں بلکہ امکان اس کا بھی ہے کہ جواباً یہ فرما دیا جائے کہ شاہ طہماسپ خود سنی تھا جیسا کہ پاکستان میں بانی پاکستان محمد علی جناح کو سنی ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

اتحاد و رواداری بڑی چیز ہے۔ امیر تیمور صاحب قرآن جس کا علم بردار تھا۔ بابر و ہمایوں اسکے وارث تھے سلاطین صفویہ نے اسلام کی مضبوط رسی کے سہارے ان سے ایسا تعاون کیا جسکی نظیر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گی لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد دلی کے متعصب علماء نے یہ رسی توڑ دی۔ حالات کو سمجھنے کیلئے صرف ایک واقعہ کافی ہوگا۔

"علماء مذکور نے ایک موقع پر چند اہل بدعت تشیع بد مذہبی کے جرم میں پکڑے۔ بعض کو قید کیا بعض کو جان سے مار ڈالا۔

ابو الفضل کہتے ہیں، بعض بد گوہر میرے والد کو شیعہ سمجھ کر برا کہنے لگے اور نہ سمجھے کہ کسی مذہب کے اصول و فروع کو جانتا اور شئے اور مانتا اور شئے ہے۔

خاص مقدمہ یہ ہوا کہ ایک سید عراقی (ایران) کا رہنے والا یگانہ زمانہ تھا۔ وہ ایک مسجد میں امام تھا اور علم کے ساتھ عمل کا پابند تھا۔ علمائے وقت اس سے بھی کھٹکتے تھے مگر اکبر کی توجہ ہر بات پر تھی اس لئے کچھ صدمہ نہ پہنچا سکے۔

آخر ایک دن دربار میں یہ مسئلہ پیش کیا کہ میر کی پیش نمازی درست نہیں یہ عراقی ہیں اور حنفی مذہب کی ایک روایت ہے کہ اہل عراق کی گواہی محبر نہیں تو اسکی امامت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے؟

امامت جانے سے سید کا گزارا مشکل ہو گیا۔ وہ شیخ سے اتحاد برادرانہ رکھتا تھا ان سے درد دل بیان کیا انہوں نے بہت سی ہوش افزا تقریریں سنا کر اسکی خاطر جمع کی

اور رد جواب پر دلیری سے سمجھایا کہ یہ لوگ روایت کے معنی نہیں سمجھتے جو

سند لائے ہیں۔ اس میں عراق سے عراقی عجم مراد نہیں بلکہ عراق عرب مراد ہے (۶۳)۔

اس طرح غریب ایرانی سید پھر اپنی ملازمت پر بحال ہو گیا۔ نماز وہ پہلے بھی



حنفی طریقت پر پڑھاتا تھا پھر اسی طرح پڑھانے لگا۔ اپنی نماز پہلے بھی گھر بند کر کے پڑھ لیتا تھا پھر اسی طرح پڑھنے لگا۔ ہمایوں کے بارے میں سچ نہیں کہ دلی میں نماز ہاتھ کھول کر پڑھتا تھا یا ہاتھ باندھ کر مگر جب تک وہ قزلباشوں کے لشکر کا افسر تھا اس وقت تک تو اس نے شیعہ اصول پر نماز ادا کی۔

تحریر خیز ہے ایسے ماحول میں ان شیعہ امراء کا وجود جو عہدہ ہائے جلیلیہ پر فائز تھے لیکن ابوالفضل کا محولہ بالا جواب ہر تعجب کو دور کر دیتا ہے جو اس نے اپنے والد کے سلسلے میں دیا تھا کہ وہ شیعہ اصول و فروع سے واقف ہیں مگر انہیں ملتے نہیں۔ یہی صورت حال تمام شیعوں کیلئے رہی ہوگی اور خود بیرم خاں کیلئے بھی جو سلطنت مغلیہ کا بانی نہیں تو معمار اعظم ضرور تھا۔

بیرم خاں امرائے ترکمان کی براہ راست اولاد میں تھا مگر نیرنگ زمانہ سے حکومت چھن گئی تھی کم سنی میں بابر کی ملازمت کرنے پر مجبور ہوا اور ہمایوں کا منظور نظر بن گیا۔ سولہ سال کی عمر سے جو داد شجاعت دینا شروع کی تو آخر عمر تک گھوڑے کی پیٹھ اور رزم گاہ سے سابقہ رہا۔ ہمایوں کی جو خدمات اس نے انجام دیں وہ اظہر من الشمس ہیں لیکن پونے چودہ سال کی عمر میں اکبر کی تخت نشینی کے بعد جب ہر طرف بغاوت کے آثار تھے تو اکبر کے بجائے کہن سال بیرم خاں مغل سلطنت کا علم بردار تھا پھر ہر چھوٹے بڑے معرکے میں بیرم خاں کی شمشیر آبدار تاج اکبری پر سایہ ٹھن رہی اور بیرم خان نے وہی کیا صغیر سن اکبر کے خان بابا سے جسکی زائد سے زائد توقع ہو سکتی اسی لئے بڑے سے بڑے دشمن نے بھی اسکو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے۔

"یکایک اسکی جانفشانیاں خدمتیں اور بے خطا تدبیریں سفارش کو آئیں، ساتھ شیرانہ حملے اور رستمیانہ کارنامے مدد کو آئیں۔ وہ شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ اسے لائے دربار اکبری میں درجہ اول پر جگہ دی اور نعرہ شیرانہ کی آواز میں کہا یہ وہی سپہ سالار ہے جو ایک ہاتھ پر نشان شاہی لیے تھا کہ خوش نصیبی اسکی جسکے پہلو میں چاہے سایہ کر کے قائم ہو جائے دوسرے ہاتھ میں تدابیر وزارت کا

ذخیرہ تھا کہ جسکی طرف چاہے نظام سلطنت کا رخ پھیر دے۔ نیک نیتی کے ساتھ نیکو کاری اسکی مصاحب تھی اور اقبال خداداد دگار تھا کہ وہ فیروز مند، جس کام پر ہاتھ ڈالتا پورا پڑتا تھا۔"

شیخ اسلام ملا عبداللہ سہانپوری دربار اکبری کے سب سے متعصب سنی عالم تھے، وہ بھی تحریر فرماتے ہیں۔

"وہ مرزا جہاں شاہ کی اولاد میں تھا۔ رموز دانش، سخاوت، راستی، حسن خلق نیاز و خاکساری میں سب پر بازی لے گیا۔ ابتدائے حال میں بابر بادشاہ کی خدمت میں بیچ میں ہمایوں بادشاہ کے حضور میں رہ کر بڑھا چڑھا اور خانخانان کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ پھر اکبر نے وقت بوقت القاب میں ترقیاں دیں۔ نہایت فقیر دوست صاحب حال اور نیک اندیش تھا۔ ہندوستان جو دوبارہ فتح ہوا اور آباد بھی ہوا یہ اسی کی کوشش اور بہادری اور حسن تدبیر کی برکت سے ہوا۔ اخیر عمر میں بسبب اہل نفاق کی عداوت کے بادشاہ کا دل اس سے پھر گیا اور وہاں تک نفرت پہنچی جس کا ذکر حالات سالانہ میں لکھا گیا۔" (۶۵)

مورخین نے تاریخ ساز بیرم خاں سے اکبر کے اختلاف کی وجہ اسکی مطلق العنانی لکھی ہے بلکہ رشک و حسد اور مذہبی تعصب، بہت سے اسباب نے مل کر بدگمانی کی ایک خلیج پیدا کر دی اور شہنشاہ ہندوستان نے اس بوڑھے وفادار سے نگاہیں پھیر لیں جسکی مثال تاریخ ہند تو کیا تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔

آج مغلیہ سلطنت سے بیرم خاں کو نکال دیا گیا تو اس پر کوئی اثر نہیں پڑا لیکن اس وقت وہ ہمایوں کی زندگی سے نکل جاتا، جب صرف بیس یا اکیس وفادار اسکے ساتھ رہ گئے تھے تو کیا ہوتا؟ ہمایوں کی وفات کے بعد جب سلطنت ڈانوا ڈول ہو رہی تھی اور خود اکبر جوان بھی نہ ہوا تھا اگر اس وقت بیرم خاں کی تلوار اور تدبیر آڑے نہ آتا تو ہندوستان کے تخت و تاج پر کس کا نام لکھا ہوتا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ خدا کوئی اور راستہ پیدا کر دیتا۔

انسان کو مجبور محض ملنے کا عقیدہ اسکے سوا اور کہہ ہی کیا سکتا ہے کہ بیرم خاں کو اسی نے پیدا کیا تھا اور آج اکبر سے بیرم خاں کو نکلوایا بھی اسی نے تھا سب



کچھ وہی کرتا ہے لہذا کوئی سوال بھی اسی سے کیا جائے؟ تو پھر ہمارے دلوں میں جو محبت اہل بیت ہے وہ بھی اسی نے پیدا کی ہے آپ ہم کو اس کا مجرم قرار دے کر قتل کیوں کرتے ہیں؟ ہم تو خدا کے حکم سے آل محمد کے دیوانے ہیں۔

بہر حال اکبر کے ابتدائی دور میں ایک عرصے تک جو کچھ ہوتا رہا یقیناً اس میں اکبر کی مرضی کو زیادہ دخل نہیں تھا علمائے مجاز اسلام کے نام پر بے گناہ شیعوں کو قتل کراتے تھے۔ خود اکبر جادہ تصوف میں اسلام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں لگا ہوا تھا لیکن بادشاہ وقت ہونے کی حیثیت سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا کہ شیعہ تو واجب القتل تھے اور ہندوؤں سے کوئی پریشانی نہ ہو سکتی۔

یہی سوال پاکستان کے ان علماء سے بھی ہے جو شیعوں کے کفر کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن جو کھلے ہوئے کافر یا مشرک ہیں ان کی طرف دیکھنے کی جرات بھی نہیں کر سکتے۔ کم از کم ان میں اسلام کی تبلیغ ہی کریں جا کر یا اخلاقی طریقے پر شیعوں ہی کو اپنی راہ حق دکھائیں۔ تلوار تو اب تک صرف سرکٹ سکی ہے دلوں کو خم نہیں کر سکی یہ کام تو علماء کی صداقت ہی کر سکتی ہے مگر وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کرتے شاید تعقل کے راستے پر چلنے کی ان میں سکت نہیں ہے اور کمزور پر طاقت آزمائی انکا شعار رہا ہے۔

مغل سلطنت کی نشاہ ثانیہ میں شیعوں کا یہ خون رانگاں نہیں گیا اور جلد ہی اکبر اعظم ہند و مسلم اتحاد کا علامہ بن گیا پھر نہ کوئی شیعہ رہا اور نہ سنی بلکہ ہر ایک دین الہی کا پابند بن گیا اور ان میں سے اکثر لوگوں کو اکبر کے مذہب کا تحریری عہد کرنا پڑا جو کل شیعوں پر کفر کے فتوے لگایا کرتے تھے۔

اکبر کا یہ ذہنی انقلاب کن اسباب و عوامل کا رہین منت تھا۔ اسکے لئے کوئی حکم لگایا نہیں جاسکتا، بس استہی کہا جاسکتا ہے کہ خدا ہر انسان کو ایک نظر سے دیکھتا ہے اور بادشاہ خدا کا سایہ ہوتا ہے لہذا اسکو بھی رعایا میں کوئی تفریق نہ کرنا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب تمام رعایا ایک ہی مسلک کی راہ رو ہو لہذا اکبر اعظم نے ایک مسلک اپنی رعایا کو دیدیا تھا اور وہ تھا دین الہی۔ اکبر میں یہ تبدیلی

جس ماحول میں پیدا ہوئی تھی اس میں سیکڑوں نام ہیں جو دربار اکبری کی زینت تھے چند نام ملاحظہ ہوں۔

امیش داس راجہ بیربل، راجہ ٹوڈرمل اور راجہ مان سنگھ، منعم خاں، مرزا عزیز کوکلتاش، شیخ عبدالقادر بدایونی، شیخ عبدالنبی صدر اور شیخ اسلام ملا عبداللہ سہارنپوری جسکے ماتحت درجنوں علماء جو اپنے کو یگانہ روزگار سمجھتے تھے۔ مذہبی صف میں بعض عمائدین اور امراء بھی شامل تھے۔

شیعوں کی تعداد بھی قابل ذکر تھی جو اپنے کو شیعہ ظاہر نہ کرتے: بیرم خاں علی قلی خان، میر مرتضیٰ شریفی، حسین خاں ٹکریہ، شیخ مبارک اللہ، ابوالفضل، فیضی، حکیم ابوالفتح گیلانی، بعض متعصب علماء انکی حقیقت سے واقف تھے مگر وہ شیعیت کا اذعان کرتے، اکبر کے دربار میں انکی قیمت تھی اور خود اکبر عقیدے کی بنا پر کسی کو قتل کر دینے کے حق میں نہ تھا لہذا علماء کو جرئت نہ ہوتی کہ اپنے دارالقضاہ میں انکو گردن زدنی قرار دیں اس لئے وہ بچے ہوئے تھے۔

اور جب دین الہی نافذ ہو گیا تو قدیم مسلک کسی کا کوئی بھی رہا ہو، اس کو دین الہی کے عہد نامے پر دستخط کرنا ہی تھے۔ اسکے بعد نہ کوئی ہندو تھا اور نہ مسلمان نہ کوئی شیعہ تھا اور نہ سنی۔ اکبر کی اس بے دینی کے ذمہ دار شیخ الاسلام کے نزدیک بیربل، ابوالفضل اور فیضی تھے۔

مذہبی نقطہ نگاہ سے دین الہی جتنا بھی برا ہو لیکن اسکو اکبر کی وسیع النظری پر محمول کیا گیا۔ اس میں خود اسکی عظمت اور اسکی عظیم سلطنت کا راز پنہاں تھا۔ بارہویوں بلاشبہ ہندوستان کی مغل سلطنت کا نقطہ آغاز تھے لیکن اکبر وہ عظیم شہنشاہ تھا جس نے مغل دور کو تاریخ عالم میں جگہ دلوائی اور ہر دور کے مورخ نے جلی حروف میں جس کا ذکر کیا۔

اکبر اولو العزم، شجاع، مدبر، کشادہ دل، سخی اور عالی ظرف شہنشاہ تھا۔ اس کا دامن بعض حق تنفیوں سے آلودہ ضرور ہے مگر حصول اقتدار اور استقرار حکومت کیلئے تمام دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہا ہے اور اسکی اولاد نے تو آگے چل کر اس سے کہیں زائد کیا۔ مجموعی طور پر اس کا شمار عالمی سطح پر عظیم فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔

۳ جمادی الثانی ۱۰۱۳ھ میں وہ عالم بقا کا راہی ہوا۔

عہد اکبری کا آغاز شیعوں کیلئے ستم آفریں تھا۔ اکبر پر مذہبیت کا غلبہ تھا۔ علماء دربار پر چھائے ہوئے تھے۔ اسی میں بیرم خاں پر عتاب آیا۔ وہ حج کیلئے چلا تو راستے میں قتل کر دیا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ قتل کرنے والے خود اکبر کے آدمی تھے۔ اسکے بعد مختلف حیلوں اور بہانوں سے بے شمار شیعوں کی گردنیں اتاری گئیں مگر اس طوفانی دور کے گزر جانے کے بعد مغل سلطنت ہر عقیدے کے آدمی کیلئے ایک پناہ گاہ رہی۔

مجموعی طور پر شیعوں کی تعداد بہت زائد تھی اور وہ بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز تھے۔ اس میں عنایات شاہی کے بجائے خود انکی صلاحیت کو دخل تھا۔

### شہنشاہ نور الدین جہانگیر

اکبر کے انتقال پر شاہزادہ سلیم جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ دین الہی اکبر کے ساتھ دفن ہو گیا تھا۔ اب پھر کھل کر اسلام کا دور دورہ ہوا جہانگیر اگرچہ مذہبی آدمی نہ تھا تاہم اس نے تمام مذاہب کے لوگوں کو چھوٹ دیدی جس میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی، شیعہ بھی تھے اور سنی بھی مگر سنی علماء کو غلبہ حاصل تھا۔ شیعہ تعداد میں سنیوں کے مقابلے میں بہت کم تھے مگر ممتاز اور قابل ذکر۔

اکبر کے عہد میں بھی شیعوں کی تلوار متعدد محاذوں پر چمکی تھی اور کتنی ہی فتوحات ان کی تلواروں کی زمین منت رہی تھیں اور سادات بارہہ کی شجاعت نے تو بعض جنگوں میں بہادری کے وہ جوہر دکھائے تھے کہ مرزا عزیز کو کلتاش کو کہنا پڑا تھا کہ سادات بارہہ سلطنت مغلہ کے فداکار ہیں۔

عمائدین اور امراء میں ان گنت نام شیعوں کے شامل تھے۔ مہابت خاں، آصف خاں، علی قلی بیگ وغیرہ وغیرہ اور محل سرا میں تو مستورات بھری پڑی تھیں۔ خود شاہی خواتین میں بھی شیعہ عقیدے کی کارفرمائی تھی اور ایرانی خواتین تو جہاں جانب چھائی ہوئی تھیں۔ انہیں میں سے مہر النساء نام کا گوہر نایاب جہانگیر نے منتخب کیا تھا جو ملکہ نور جہاں بیگم کے نام سے مغل تاج و تخت کی زینت بنی۔

مہمات جنگی و ملکی میں بھی شیعوں کا کردار نمایاں تھا مگر جو کچھ بھی تھا، وہ ہر شخص

کی ذاتی صلاحیت و استعداد کی بدولت، اجتماعی مساعی کا نہ امکان تھا اور نہ مصیبت ہر ایک کی جداگانہ حیثیت تھی۔ بعض لوگ اکبر کے وقت سے ممتاز اور با اقتدار چلے آ رہے تھے۔ ان میں ابو الفضل بھی تھا۔ جہانگیر کو اس پر خاش تھی۔ ابو الفضل سے جہانگیر کی دشمنی کے دو سبب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ جہانگیر کو یقین ہو گیا تھا کہ ابو الفضل شہنشاہ اکبر کو جہانگیر کی طرف سے بھڑکاتا رہتا ہے دوسری وجہ یہ تھی کہ جہانگیر کو ابو الفضل کے ملحدانہ عقائد اور خیالات سے سخت نفرت تھی اور اس کا خیال تھا کہ ابو الفضل نے اسکے باپ کو قطعی بے دین اور ملحد بنا دیا ہے اسی لئے جہانگیر نے اسے موقع ملتے ہی قتل کر دیا۔ (۶۶)

جہانگیر کے نامہ اعمال میں دوسرا قتل شیراگن علی قلی بیگ کا ملتا ہے جو اس نے مہر النساء کو حاصل کرنے کیلئے کرایا۔ شیراگن کی شجاعت اسکے لقب سے ظاہر ہے۔ وہ حقیقتاً اپنے وقت کا رستم تھا اور مہر النساء کو جہانگیر سے بچانے کیلئے اپنی امارت بردوان لے گیا تھا لیکن شاہی اختیارات مغل شہنشاہ کی دیوانگی کے ساتھ تھے شیراگن حیلہ سازی سے بردوان میں گھیر لیا گیا اور مردانہ وار لڑتا ہوا قتل ہو گیا۔

مہر النساء ملکہ نور جہاں بن گئی مگر وہ جہانگیر کے محل میں چراغ خانہ بن کر نہیں رہی بلکہ اس نے رزم اور بزم دونوں میں حصہ لیا۔ نور جہاں اپنے شوہر کی ایک محبوب بیوی بھی تھی اور سلطنت کے کاموں میں بادشاہ کی بہترین مشیر بھی تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سلطنت کے کاموں میں جو اختیارات نور جہاں کو حاصل تھے وہ کسی شاہ بیگم کو اس سے قبل حاصل نہ ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اسکے نام کا سکہ تک چلا اور شاہی کاغذات پر اسکے نام کی مہریں بھی لگنے لگیں۔

امور ملکی میں وہ بادشاہ کے دوش بدوش کارفرما رہی۔ ایک لمحے کیلئے بھی بادشاہ سے جدا نہ ہوتی تھی۔ جہانگیر جس وقت دربار میں بیٹھتا تو نور جہاں پردے کے پیچھے اسکی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتی تھی اور امور ملکی میں قدم قدم پر بادشاہ کو صلاح دیتی تھی، سچ پوچھا جائے تو حکومت ہی وہی کرتی تھی۔

جب بادشاہ ہاتھی پر سوار ہوتا تو پس پردہ وہ بھی بادشاہ کے پاس ہی بیٹھتی تھی بادشاہ جنگ کیلئے جاتا تو وہ بھی نبرد آزما کیلئے بادشاہ کے ہمراہ ہوتی۔ بادشاہ کے



ساتھ شکار میں بھی وہ ساتھ رہتی بڑی بہادری کے ساتھ مردانہ وار شیر کا شکار کھیلتی تھی۔ گھوڑے کی سواری میں اسے کمال حاصل تھا۔ غرض کہ بزم میں رزم میں ہر موقع پر وہ بادشاہ کے ساتھ رہتی۔ سلطنت کے کاموں میں اسکی سوجھ بوجھ اور تدبیر کے سب قائل تھے۔ (۶۷)

اسکے علاوہ ایک شیریں بیان شاعرہ تھی، حاضر جوابی میں بھی وہ بے مثال تھی اور لطیفہ گوئی میں تو اسے ملکہ حاصل تھا۔ جہانگیر سے نکاح کرنے کے بعد اس نے جہانگیر کی زندگی کو بالکل بدل ڈالا تھا۔ اسکی شراب نوشی کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔ جہانگیر کہا کرتا تھا کہ ”میں نے اپنی ساری سلطنت نور جہاں کے ہاتھ دو شراب کے پیالوں اور سح کباب کے عوض بیچ دی ہے۔“

نور جہاں ایک شیعہ خاندان کی فرد تھی، بالکل اسی طرح جس طرح جہانگیر ایک سنی باپ کا بیٹا لیکن دونوں میں سے کسی نے عقیدے کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ جہانگیر نے عدل کی جو زنجیر اپنی محل سرا میں لٹکا رکھی تھی ہمیشہ اس کا احترام کیا لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ سنی علماء کا ایک گروہ عصیت کا زہر پھیلانے سے غافل نہیں رہا۔

جہانگیر کی منصف مزلی اور شیعہ امراء کے اقتدار کے سبب شیعہ علماء کی تعداد بھی اس زمانے میں کچھ بڑھ گئی تھی جن میں ایک یگانہ روزگار عالم حضرت نوراند شستری بھی تھے۔ سنیوں کے بعض علماء نے بڑے تکبر کے ساتھ اکثر ان سے مناظرہ کیا مگر ہر بار منہ کی کھائی لہذا نوراند شستری سے ان کو ضد ہو گئی اور انہیں نیچا دکھانے کی تدابیر میں لگ گئے۔

اتفاق سے نوراند شستری نے تصوف پر ایک رسالہ لکھا تھا ان علماء کو خبر لگ گئی۔ انہوں نے ایک آدمی کے ذریعہ وہ رسالہ اڑایا اور اس میں سلیم چشتی کے بارے میں بعض نازیبا فقرے بڑھا دئے پھر رسالے کو اسی مقام پر رکھوا دیا جہاں سے وہ چرایا گیا تھا۔

یہ کام اتنی احتیاط سے کیا گیا کہ حضرت نوراند شستری کو اسکی بھینک بھی نہ مل سکی اور بھینک کیسے ملتی، ایک تہجد گزار با عمل عالم عبادت سے جو وقت پاتا۔

اسکو مطالعے اور تحریر میں گزارتا۔ رسالہ مکمل کر کے وہ رکھ چکے تھے لہذا اسکو دیکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

ادھر ان علماء نے جہانگیر کو خبر کی کہ سلیم چشتی کے خلاف انہوں نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ سلیم چشتی جہانگیر کے مرشد تھے بلکہ بعض روایات کی بنا پر انہیں کی دعا سے جہانگیر کی ولادت ہوئی اور انہیں کے نام پر سلیم نام رکھا گیا تھا۔ علماء کی تحریک پر نوراند شستری کے مکان پر اچانک آدمی بھیجے گئے اور وہ رسالہ برآمد کر لیا گیا۔ جہانگیر اسکو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے علماء کا ایک بچ بٹھا دیا اور اسکو شرعی سزا دینے کا مجاز کر دیا۔

علماء نے منصب قضاۃ پر بیٹھ کر حضرت نوراند شستری کا بیان لیا۔ انہوں نے اضافہ شدہ عبارت سے انکار کیا لیکن تحریر ملا کر لکھی گئی تھی اور روشنائی اور قلم کا التزام بھی کیا گیا تھا۔ ان کے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا گیا اور حکم قتل صادر ہو گیا

چنانچہ پہلے اس تہجد گزار عالم کے کوڑے لگائے گئے اور جب وہ بیہوش ہو گئے تو ہاتھ پاؤں کاٹے گئے پھر رقی جان باقی دیکھ کر تلواروں کے وار کیے گئے اور لاش جنگل میں پھینکوا کر اعلان کرایا گیا جو لاش کو دفن کرنے کی کوشش کرے گا وہ مستوجب قتل ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ لاش سے اتنی مہک نکل رہی تھی کہ پورا جنگل بس گیا تھا۔ اگرہ میں خبر قتل سے ایک کہرام مچ گیا تھا پھر لوگ شاہی حکم سے خائف ہو گئے۔ بعض سادات ہمت کر کے پہنچے اور سید راہو نے لاش اٹھا کر زانو پر رکھ لی۔

اسی رات گوالیار میں ایک ایرانی سردار نے خواب میں سیدہ کو نین کو دیکھا آپ نے فرمایا کہ میرا بیٹا وہاں قتل ہو گیا اور تو آرام کی نیند سو رہا ہے۔ سردار اپنے ساتھیوں کو لے کر اسی وقت اگرہ کی طرف چل پڑا۔

پھر جہانگیر نے حضور سرور کائنات کو خواب میں دیکھا آپ نے غیظ کے عالم میں جہانگیر کو فہمائش کی کہ تو نے میرے فرزند کو قتل کر دیا اور اب لاش بھی دفن نہیں ہونے دیتا۔



جہانگیر نے صبح ہوتے ہی بعض امراء کو بھیجا۔ اس طرف سے ایرانی سردار آکر پہنچا تو سید راجو لاش کے قریب بیٹھے گریہ وزاری کر رہے تھے۔ حضرت نور اللہ شستری کی لاش تو دفن کر دی گئی مگر اگر وہ پر غم کے بادل چھائے رہے اور انکے بعد عالم شہید کو شہید ثالث کہہ کر یاد کیا گیا۔

جہانگیر کے دامن پر خون ناحق کا یہ تیسرا داغ تھا جو شاید نادانستگی میں لگا۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ نور جہاں کو جب اس المناک سانحے کی اطلاع ہوئی تو اسے بھی بہت صدمہ ہوا مگر موقع شناس خاتون خاموش رہی۔ کچھ دنوں بعد جب تلامذہ سکون میں بدلاتو اس نے ان تمام علماء کی دعوت کی جنہوں نے سازش کی تھی اور وہ بھی جنہوں نے شرعی عدالت میں انصاف کا حق ادا کیا تھا۔

ان سب کو اچھے اچھے کھانے کھلانے گئے پھر مشروبات سے تواضع کی گئی۔ جب وہ زود خوری سے سست پڑ گئے تو پردے کے پیچھے چھپے ہوئے حبشی غلام نکلے اور بچے تلے ہاتھوں سے ان سب کا کام تمام کر دیا۔ لاشیں جمن کی لہریں بہا لے گئیں۔ کچھ دنوں تک انکی تلاش جاری رہی پھر لوگوں کو سہ چل گیا مگر زبان کون ہلاتا ملکہ ہندوستان کے خلاف اتنا بڑا اتہام مستوجب قتل قرار پاتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ملکہ کے عمل میں خود جہانگیر کا ایماء شامل تھا۔ وہ آنحضرت کے غصے سے ڈر گیا تھا۔

اس طرح جہانگیر کا عدل پروردور آگے بڑھتا رہا اور ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ میں ساٹھ برس کی عمر میں وہ انتقال کر گیا۔ جہانگیر بہادر، منصف مزاج اور رعایا پرور حکمران تھا

### محمد شہاب الدین شاہجہاں

شاہزادہ غرم ملکہ ممتاز محل کا شوہر اور آصف خاں کا داماد تھا جو جہانگیر کی زندگی میں اپنے بھائیوں سے برسر پیکار رہا تھا۔ ان میں سے خسرو اور پرویز کا انتقال ہو چکا تھا۔ شہریار جو نور جہاں کا داماد تھا اسے بھی غرم نے قید خانے میں اندھا کر دیا اس طرح آصف خاں اور نور جہاں میں نا اتفاقی پیدا ہو گئی تھی پھر بھی شاہجہاں کے دور حکومت میں وہ زندہ رہی اور لاہور میں حیات مستعار کے دن پورے کر کے شہدرہ لاہور میں ۲۹ شوال ۱۰۵۵ھ کو ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

ممتاز محل خوبصورت نور جہاں کی حسین ترین بھتیجی تھی اسکی شادی ۱۶۱۷ھ میں شاہجہاں کے ساتھ ہوئی تھی جبکہ وہ ۱۹ سال کی اور شاہجہاں ۲۱ سال کا تھا۔ اسکے علاوہ شاہجہاں کے دو بیویاں اور تھیں مگر ممتاز محل کو وہ پرستش کی حد تک چاہتا تھا اس کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ ۱۷ ذی قعدہ ۱۰۳۱ھ کو جب بیٹی کی ولادت کے سلسلے میں ممتاز محل کا انتقال ہوا تو اسکی لاش اس نے بہانپور کے ایک باغ میں بطور امانت رکھوا دی تاکہ مدت معینہ کے بعد اسے آگرہ لے جاسکے۔ اسکے بعد شاہجہاں کا یہ عالم ہو گیا کہ اس نے حرم سرا میں داخل ہونا ہی چھوڑ دیا۔ شب و روز روتا رہتا۔ ایک سال کے اندر اسکی سیاہ ڈاڑھی سفید ہو گئی۔

ممتاز محل نور جہاں کی طرح امور مملکت میں دخل نہ تھی مگر نزاکت مزاج اور نفاست طبع کے ساتھ ساتھ اتنی دانشمند تھی کہ شاہجہاں کے منہ کھولنے سے قبل اسکی بات سمجھ لیتی تھی اور آداب محفل میں تو کوئی اس کا ثانی تھا ہی نہیں۔ حوروں کے جمال کے ساتھ تہذیب کا شاہکار، اسپر شکستگی اور خوش مزاجی، ان تمام خوبیوں نے یکجا ہو کر شہنشاہ ہندوستان کو اس کا دیوانہ بنا دیا تھا اور محبت کی یہی دیوانگی تھی جس نے شاہجہاں سے تاج محل جیسی عمارت بنوائی جو آج بھی اپنی دیدہ زیبی میں خود ممتاز محل کی طرح یگانہ روزگار ہے۔

بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مغل دور نے دو عورتیں پیش کی ہیں: ایک زیب وزین، کشور آرائی کا پیکر، دوسرا حسن و محبت کا وہ مجسمہ جس کا مزار صدیوں تک نظر فریب عالم رہے گا اور ممتاز محل کے ساتھ شاہجہاں کو بھی زندہ رکھے گا۔

شاہجہاں کو امور مملکت اپنی طرف متوجہ نہ کر لیتے تو وہ ممتاز محل کی قبر کو چھوڑ کر آگرے سے قدم باہر نہ نکالتا پھر بھی اسکے بعد شاہجہاں میں پہلی سی حسرت باقی نہیں رہی۔ وہ دکن بھی گیا، پرتگیزیوں کے مظالم کا تدارک بھی کیا، کشمیر بھی گیا اور اس نے کوشش کر کے اپنے کو مختلف مشاغل میں لگھایا پھر بھی ممتاز محل کو بھول نہ سکا شاہجہاں کو کچھ تسکین ہوتی تو ممتاز محل کی جہنمی یادگار جہاں آرا بیگم کے پاس جواب ماں کی تمام ذمہ داریاں سنبھال چکی تھی اور باپ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔



ان حقائق کے باوجود شاہجہاں ہندوستان کا عظیم شہنشاہ تھا۔ اسکو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس تھا لہذا اس نے اس طرف سے غفلت نہیں کی۔ فتوحات بھی کرتا رہا اور نظم و نسق بھی دیکھتا رہا۔ آخر ۱۶۵۸ھ میں اس نے آگرہ کے بجائے دلی کو پایہ تخت قرار دیا اور وہاں ایک نیا شہر آباد کرایا جس کا نام شاہجہاں آباد رکھا۔ لال قلعہ اسی میں واقع ہے۔

۷ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ کو وہ اچانک بیمار پڑا اور اسکے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو داراشکوہ نے ولی عہد کی حیثیت سے نظم حکومت ہاتھ میں لے لیا۔

شاہجہاں اپنے بچوں میں جہاں آرا اور داراشکوہ کو بہت چاہتا تھا۔ جہاں آرا کو اس لئے کہ وہ صورت و سیرت میں ممتاز محل سے مشابہت رکھتی اور بیٹی کی حیثیت سے شاہجہاں کو پروانہ وار چاہتی تھی۔ مغلوں میں جہاں آرا کی سی عالمہ اور باسلیقہ خاتون نظیر میں نہیں ملتی۔ وہ ممتاز محل کی تربیت یافتہ تھی اور عقیدے میں بھی اسی کی طرح شیعہ تھی۔

دارا شیعہ تو نہ تھا لیکن مختلف السنہ اور ادیان عالم کا عالم تھا وہ لوگوں کو مذہب کے بجائے انسانیت کی سطح پر پرکھتا تھا۔ ایک بادشاہ کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے فنون حرب سے واقف تھا لیکن اسکو رزم سے زیادہ بزم سے دلچسپی تھی پھر بھی شاہجہاں کی حالت خراب ہونے پر اس نے عنان سلطنت ہاتھ میں لے لی۔

داراشکوہ نے شاہجہاں کے پاس آنے جانے کی پابندی لگادی تھی جس سے عام غلط فہمی پیدا ہوئی کہ شاید بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر پر اورنگزیب نے اندر ہی اندر فوجی تیاریاں شروع کر دیں پھر مراد کو بھی ملا لیا۔

شاہ شجاع کو تو دارا نے شکست دیدی مگر اورنگزیب کے مقابلے میں پسپا ہوا بات یہ تھی کہ اورنگزیب نے داراشکوہ کے غیر اسلامی عقائد کے خلاف سخت پروپیگنڈا کیا تھا لہذا مسلم فوج نے اس سے غداری کی، صرف راجپوت بہادری سے لڑے مگر انکی تعداد اورنگزیب اور مراد کے متحدہ لشکر کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ داراشکوہ شکست یاب ہو کر آگرہ میں پناہ گزیں ہوا۔ شاہجہاں روبہ صحت تھا مگر وہ شرم میں باپ کے سامنے نہ جاسکا اور دس بارہ سواروں کے ساتھ بیوی بچوں کو لیکر آگرہ سے دلی آگیا۔

اورنگزیب نے آگرہ پہنچ کر شاہجہاں کو قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ یہ کامیابی اس نے مراد کے تعاون سے حاصل کی تھی لیکن وہ بھی بادشاہت کا امیدوار تھا اور اورنگزیب نے چالاکی سے اسکو ملاقات کیلئے بلایا اور گرفتار کر لیا۔ پھر اپنی شاطرانہ چالوں سے دارا کے سب سے بڑے دوست راجہ جسونت سنگھ کو بھی توڑ لیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

شاہجہاں کے ایام اسیری عبرت کی ایک داستان ہیں۔ تاج محل اور لال قلعہ کا خالق قلعہ آگرہ کے ایک گوشے میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ تین چیزیں اسکی رفیق تنہائی تھیں، ممتاز محل کے ساتھ بتائے ہوئے دنوں کی یاد، حدیث و فقہ کی کتابیں اور پیکر اخلاص و وفا جہاں آرا بیگم جس نے خود اپنے کو باپ کے ساتھ قید کر لیا تھا، سات سال تک شب و روز باپ کی خدمت کی اور باقی زندگی ریاضت و عبادت میں گزار دی۔ سن سے اتر جانے کے باوجود کئی آدمیوں نے اسکے لئے دامان آرزو پھیلایا مگر جہاں آرا کو دنیا سے اتنی نفرت ہو چکی تھی کہ وہ خوشی کے نام سے دور بھاگتی تھی۔

شاہجہاں فخر زمانہ بیٹی کو دیکھ دیکھ کر جیتا رہا اور سات برس گزار لے گیا۔ اس دوران اس نے کئی مرتبہ اورنگزیب کو بلا بھیجا مگر وہ کون سا منہ لے کر باپ کے سامنے جاتا۔ تعجب انگیز تو یہ بات ہے کہ اورنگزیب کے ساتھ شاہجہاں کی دوسری بیٹی روشن آرا نے بھی باپ کو منہ نہیں دکھایا۔ دنیا اسی کا نام ہے۔

ہمارے بزرگ بلا استناد تاریخ ایک روایت بیان کرتے تھے کہ اورنگزیب نے شاہجہاں سے کہلوایا تھا کہ غلہ کی اقسام میں سے اسکو کوئی ایک اناج مل سکتا ہے شاہجہاں کے بادشاہی نے چنے کو انتخاب کیا تھا۔ اسی سے وہ اتنے قسم کے کھانے تیار کر دیتا تھا کہ شاہجہاں کا دسترخوان بھر جاتا تھا۔

آخر یہ عبرتناک زندگی گزارتے گزارتے ۲۶ رجب ۱۶۷۱ھ کو خالق حقیقی سے جا ملا اور جہاں آرا سے جینے کا یہ سہارا بھی چھن گیا۔ شاہجہاں کو ممتاز محل کے پہلو میں دفن کیا گیا تھا۔ جہاں آرا اکثر انکی قبروں پر جاتی تو اسکو غیر شعوری طور پر محسوس ہوتا کہ جیسے وہ انکی محبت کی واحد یادگار ہو۔



### محمی الدین محمد اور نگزیب عالمگیر

شاہجہاں کے بیٹوں میں مراد اور نگزیب کی قید میں تھا، شجاع بنگال میں اور دارا دہلی سے لاہور پہنچ گیا تھا اور نگزیب نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ اس اثناء میں شجاع بنگال سے الہ آباد پہنچ گیا۔ وہاں اور نگزیب کی فوجوں سے اس کا مقابلہ ہوا اور شجاع نے شکست کھائی۔ پھر اور نگزیب کی فوجوں سے اسکے کئی مقابلے ہوئے مگر بد قسمتی شجاع کے ساتھ رہی۔ وہ پہلے بنگال گیا پھر آسام اسکے بعد اس کا کوئی سپہ نہ چل سکا۔

جسونت سنگھ نے دارا شکوہ سے دغا کی تھی مگر دارا نے خط و کتابت کر کے اسکو ہموار کیا اور جو دھپور کا عازم ہوا لیکن جسونت سنگھ نے پھر وعدہ خلافی کی۔ شاہی لشکر تعاقب میں تھا۔ اس نے دارا کو گھیرا تو جسونت بھی اس سے جا ملا اور دارا شکست کھا کر احمد آباد کی طرف بھاگ نکلا۔

راستے میں راجپوتوں نے اس طرح لوٹا کہ عورتوں کا زیور تک نہ چھوڑا۔ بد نصیب دارا ٹھوکریں کھاتا ہوا سندھ پہنچا جہاں سندھ کے ایک زمیندار ملک جیون نے دعوت کے بہانے گرفتار کر لیا اور دہلی بھیج دیا۔

شاہجہاں کے دارا سلطنت میں دارا اور اسکے بیٹے سپہر شکوہ کو ہاتھی پر بٹھا کر تشہیر کی گئی۔ اس پر عوام میں غم و غصہ کی ہر دوڑ گئی۔ انہوں نے جلوس اور ملک جیون پر ہتھراؤ کیا۔ کئی آدمی اس سلسلے میں قتل کئے گئے اور دارا کو مع اسکے بیٹے کے قید کر دیا گیا۔

شہزادہ دارا شکوہ پر الزام تھا کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ اس نے تصوف کو بدنام کیا ہے۔ وہ کافر و ملحد ہے۔ سہتا پنجہ علماء کے فتوے کے رو سے اسے کافر قرار دینے کے بعد قتل کیا گیا۔ اسکی لاش کو ہاتھی پر ڈال کر سارے شہر میں تشہیر کرائی گئی۔ دارا شکوہ کی اس بے بسی کی وجہ سے عوام کو اس سے غیر معمولی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ جس طرف بھی دارا شکوہ کی لاش گزرتی لوگ ڈھاریں مارا۔

کر روتے تھے۔ لاش کو شہر میں گھما کر ہمایوں کے مقبرے میں ۲۶۹ھ میں دفن کر دیا گیا۔ (۶۸)

دوسری تاریخوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اور نگزیب نے پہلے اسکی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروائی تھیں پھر بھی اطمینان نہ ہوا تو قتل کر کے لاش گشت کرائی تاکہ دارا کے طرفدار عبرت حاصل کریں۔

یہ خبریں آگرہ کے قلعہ میں جہاں آرا اور شاہجہاں کو پہنچی ہو گئی اور ان کے دلوں کا جو عالم ہوا ہوگا، اسکو کوئی بہن یا باپ محسوس کر سکتا ہے۔ اسکے بعد اور نگزیب انہیں منہ کیونکر دکھاتا۔

اب صرف شہزادہ مراد بخش باقی تھا، اسے بھی گوالیار کے قید خانے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جسکے بعد سلطنت کے دعویداروں میں کوئی باقی نہ رہا۔ اور نگزیب نے اسلام کا نعرہ لگا کر کامیابی حاصل کی تھی اور فراست و تدبیر میں کوئی بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دارا شکوہ اپنے ذہن و فکر کے اعتبار سے دوسرا اکبر اعظم تھا بلکہ اکبر سے بہتر تھا کیونکہ اکبر پڑھا لکھا نہ تھا اور دارا مختلف زبانوں اور بیشتر مذاہب کا ماہر تھا۔ اگر دارا کے ساتھ کوئی بیرم خاں ہوتا تو اسکو ناکامی کا منہ دیکھنا نہ پڑتا اور اس کا یہ عمر ستاک انجام نہ ہوتا۔

اور نگزیب نے دارا کیلئے علماء کے فتوے حاصل کر لیے تھے اور قتل کا شرعی جواز پیدا کر لیا تھا لیکن شاہجہاں کی قید کیلئے فتویٰ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور باپ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اسکے لئے حقوق والدین کے شرعی احکامات میں کوئی تبدیلی نہیں کرائی۔ شاہجہاں میں ذرا بھی دم ختم باقی ہوتا تو دارالافتاویٰ کے دروازے بند نہ تھے۔ اور نگزیب کو اس کا بھی شرعی جواز مل جاتا کہ باپ کی خدمت بیٹے کا فرض نہیں اسکی ذمہ دار صرف لڑکی ہوتی ہے۔

جہانگیری اور جہاننامی کے مصالحہ کو سامنے رکھا جائے تو اور نگزیب کا عمل بر محل نظر آئے گا۔ اسکے دور میں مغل سلطنت کی حدود شمال و جنوب اور مشرق و مغرب میں پورے ہندوستان کا احاطہ کرتی تھیں لیکن یہ سب کچھ اس وقت حاصل



ہوا تھا جب اس نے پوری زندگی جنگ و جدل میں گزار دی تھی لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا تھا کہ بغاوت و بد امنی ایک معمول سا بن گیا تھا۔ وہ ایک علاقے پر قبضہ کرتا تو دوسرے میں خلفشار پیدا ہو جاتا اور انجام کار کسی طرف سے اطمینان نہ ہوتا۔ مہابلی اکبر کے ہندوستان میں اس نے ہندوؤں پر جزیہ لگایا تھا اور شیعہ ہونا شرعی جرم قرار دیا تھا نتیجے میں شیعہ پہلے تو گردنیں کٹواتے رہے پھر تقیہ میں چلے گئے لیکن ہندوؤں نے اپنا مذہب کم سے کم بدلا۔ وہ دباؤ پڑنے پر جزیہ ادا کر دیتے مگر تھوڑی سی آزادی پاتے ہی ایسا اسلامی ٹیکس دینے سے انکار کر دیتے۔

دوسری سب سے بڑی سیاسی غلطی اور نگزیب نے یہ کی تھی کہ دکن کی تمام حکومتوں کو ختم کر دیا جو مرہٹوں کو دبائے رکھتی تھیں ان کے علاقے سلطنت مغلیہ میں شامل ہوتے ہی مرہٹے ایک ہندو طاقت بن کر ابھر آئے اور سلطنت کیلئے وبال بن گئے

شیعہ اکبر کے وقت سے مسلمان ہونے کی حیثیت سے سلطنت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے تھے اور نگزیب نے ان پر پابندی لگا دی اس طرح جو لوگ اپنا عقیدہ چھپالے گئے وہ باقی رہے جیسے نعمت خاں عالی، باقی برطرف کر دئے گئے یا خود جانیں بچانے کیلئے کسی طرف چلے گئے۔ ایام عزا کی مجلسیں جو ہندوستان میں مسلم حکومت کے آغاز سے ہوتی آئی تھیں وہ بھی بند کر دی گئیں اور جلوس عزا پر تو قطعی پابندی لگا دی گئی۔

اور نگزیب کے اصلاحی احکامات کی ایک دفعہ نقل کی جاتی ہے

”چونکہ برہان پور میں ایام محرم میں تابوت نکالنے پر مسلمانوں میں خانہ جنگی برپا ہو گئی تھی اس لئے اس نے حکم دیا کہ آئندہ سے تابوت یا اس قسم کی کوئی چیز ایام محرم میں نہ نکالی جائے۔“ (۶۹)

یہ حقائق ناقابل انکار ہیں اور ان پر پردہ ڈالا نہیں جاسکتا۔ وہ ایک کمزور متعصب سنی مسلمان تھا۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں اس نے اسلام کا نعرہ دارا شکوہ پر فتح پانے کیلئے لگایا ہو لیکن بعد میں یہی اسکا مزاج بن گیا۔ جہانگیر مسلمان ہونے کا تعلق ہے، شاہجہاں بھی پکا مسلمان تھا مگر اسلام میں جو رواداری پائی جاتی ہے اس پر

شاہجہاں پورا عمل کرتا تھا۔ اس کا اسلام ایک محتدل رستے پر تھا۔ اس میں کسی موڑ پر انسانیت کا ناتہ نہیں ٹوٹا اور انسانی خون اسلام کے نام پر ارزاں نہیں ہوا۔ اسکے برخلاف اور نگزیب نے ایک طرف شیعوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا، دوسری طرف ہندوؤں سے وہ سلوک کرنا شروع کر دیا جسکے وہ مغل حکومت کے آغاز سے عادی نہیں رہے تھے۔

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس نے سلطان محمود غزنوی کی اتاری ہوئی عینک اپنی آنکھوں پر لگالی تھی۔

یوں تو وہ ایک مہم جو فرمانروا تھا لیکن جس طرح سلطان محمود کو سندھ کی اسماعیلی حکومت سے ضد ہو گئی تھی اسی طرح وہ دکن کی شیعہ حکومتوں کے پیچھے پڑ گیا اور انکو ختم کر کے دم لیا جو سلطنت مغلیہ کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

### تبرہ

شیعوں پر اور نگزیب کی خصوصی توجہ تھی۔ اس نے ہندوستان میں محافل تبرہ منعقد کرنے کا سنگ بنیاد رکھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علیؑ کے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی شام کے درودیوار نے مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ پر سب و شتم کے نعرے سننے تھے پھر شام کی حدود مملکت میں ستر ہزار منبروں سے بریت کا اظہار کیا گیا اور آل رسولؐ سے اجنبی شام نے یہی سمجھا کہ ایسا ہی برا ہو گا یہ شخص جس پر پورا ملک تبرہ کرتا ہے۔

امام حسنؑ نے شرائط صلح میں لکھوایا تھا کہ آئندہ اہل بیت میں سے کسی پر لعن طعن نہیں کی جائے گی مگر اس پر عمل درآمد نہیں کیا گیا اور بنی امیہ کا تقریباً پورا دور یہ نعرے لگاتے گزر گیا۔ پھر بنی عباس میں سے بعض خلفاء نے خلفائے بنی امیہ کی اس سنت کو دہرایا۔

اسکے جواب میں سلطان معزالدولہ بویہی نے شیعوں کی طرف سے سنی اکابر کیلئے ایسے ہی نعرے گوائے۔

سلطان محمود غزنوی کا دور آیا تو اس نے بویہی سلطان کا جواب دیا ہو یا بنی امیہ کے عمل کا اعادہ کیا ہو مگر مجالس تبرہ منعقد کرائیں اور ان میں محبان علیؑ پر



لعنت بھجوائی جواب روافض کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔

سلجوقیوں میں ایسی مجالس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملا لیکن شیعوں پر تبر کیا ضرور جاتا تھا کیونکہ ایک استفتاء کے جواب میں امام غزالی نے لکھا ہے۔

”معین لوگوں کی لعنت میں خرابی ہے اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اگر کوئی بالفرض شیطان ہی پر لعنت نہ کرے اور سکوت اختیار کرے تو کچھ اندیشہ نہیں رہا۔ یزید کی لعنت کا حال تو قتل و اجازت دونوں پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ لعنت کا کیا ذکر ہے جب تک قتل و اجازت کا ثبوت نہ ہو، تب تک اسکو قاتل و اجازت دہندہ بھی نہ کہنا چاہئے اس لئے کہ قتل گناہ کبیرہ ہے اسکی نسبت مسلمان کی طرف بلا ثبوت کامل نہیں ہو سکتی۔

جو صفات مقتضی لعنت کے ہیں وہ تین ہیں، کفر، بدعت اور فسق اور ان میں لعنت کے تین طور ہیں پہلا تو یہ کہ وصف تمام کے ساتھ لعنت مثلاً یوں کہ کافروں، بدعتیوں اور فاسقوں پر خدا کی لعنت ہو۔ دوسرا یہ کہ وصف کو اس سے خاص کر کے کہے، جیسے خدا کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ مجوسی، قدریہ، خوارج، روافض زانی اور سودخور پر اور یہ دونوں شقیں جائز ہیں مگر اہل بدعت پر لعنت کہنے میں تاہل ہے کیونکہ بدعت کا پہچاننا امر مشکل ہے۔“ (۷۰)

یہ فتاویٰ دلالت کرتے ہیں اس حقیقت پر کہ سلجوقی عہد میں شیعوں پر لعنت کی جاتی تھی اور بعض لوگ اسکو مناسب نہیں سمجھتے تھے جنہوں نے امام غزالی سے رجوع کیا اور جب فتویٰ مل گیا تب انہوں نے اسکو جائز قرار دیا۔

ایوبی دور کے بارے میں کہنا کیا اترکان عثمانی کے عہد سے متعلق تحقیق نہ ہو سکی مگر دشمنی عروج پر تھی اس لئے لعنت یقیناً کی جاتی ہوگی۔ اب اورنگزیب نے اسکو تازہ کیا تھا اور طریقہ وہی تھا جس کا فتویٰ امام غزالی نے دیا تھا۔ ایک آدمی منبر پر جاتا اور قابل لعنت وصف کے حوالے سے نام لیتا: فلاں ابن فلاں رافضی بودا حاضرین یک زبان ہو کر کہتے: بر پدرش لعنت!

لیکن تبرے کی یہ مجالس مرکزدں تک محدود ہیں ان میں ان لوگوں کو شرکت پر مجبور کیا جاتا جن پر شیعہ ہونے کا شبہ ہوتا۔

مخلوں کے اگلے ادوار میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔  
میں نے ایک بے تکلف سنی دوست سے پوچھا۔  
”سچ بتاؤ کہ سنی شیعوں سے اتنا جلتے کیوں ہیں؟“  
اس نے بتایا۔

”تم لوگ صحابہ کو برا جو کہتے ہو۔“

”یعنی الٹا چور کو تو ال کو ڈلئے!“ میں نے مسکرا کر جواب دیا اور کہا۔ ”بھائی ہزار سال تک تو علی اور محبان علی پر لعنت تم بھیجتے رہے ہم نے کبھی کبھی موقع محل سے طبع آزمائی کر لی تو ہم سے ناراض ہوتے ہو!“

دوستی کی بات تھی وہ بھی مسکرا دیا۔ بات ختم ہو گئی مگر ایک لمحہ فکر یہ طویل ہوتا چلا گیا۔

”آخر اتنی عداوت ہم سے کیوں؟ صدیاں بیت گئیں مگر نفرت کی خلیج پاٹے نہ پٹ سکی!“

بات اگر سقیفہ بنی ساعدہ کے انتخاب کو نہ ملنے کی ہے تو وہ ہمارے اصول سے جائز نہیں تھا پھر یکطرفہ طور پر کر لیا گیا تھا ہم نے نہ پہلے مانا تھا اور نہ کبھی مانیں گے۔ بات کرنا تھی تو اس پر کی جاتی۔ صداقت اپنے دلائل رکھتی ہے۔ ہم سمجھنا چاہتے تھے اور سمجھنا چاہتے ہیں مگر ہمیشہ تلوار سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی رہی کسی نے زبان سے نہیں سمجھایا بلکہ اپنے متبعین سے کہہ دیا کہ شیعوں کے پاس نہ بیٹھا کرو وہ جادو کر دیتے ہیں!

اور پھر اکثافتنے ہی پر نہیں کی گئی بھولے بھالے مسلمانوں کے کانوں میں ڈالا گیا۔

”شیعہ علی کو خدا مانتے ہیں۔“

”شیعہ روز عاشور سنی بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں اور انکو تعزیے کے سلسلے ذبح کرتے ہیں۔“

لاکھ صفائی دو اور بتاؤ کہ یہ غلط ہے مگر جواب ایک ہی ملتا ہے تم لوگ چھپاتے ہو اور ایک دوست نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مردے کو نہلاتے ہو تو



”گرمی کسم“ کرتے ہو۔ میں حیران ہوا کہ ”گرمی کسم“ کیا ہے؟ اس پر اس نے صراحت کی کہ مردے کے نیچے سے لکڑی ڈالکر اندر کی آلائش نکالتے ہو اور گرمی کسم کہتے جاتے ہو۔

میں نے اسکو بھی اتہام سمجھا مگر سوچتا رہا کہ یہ معصہ کیا ہے؟ آخر بزرگوں سے پوچھا تو انہوں نے بیان کیا۔

ایک بار علماء ایک وفد کی صورت میں اور ننگزیب سے جا کر ملے اور اس سے کہا کہ گورکن عموماً میلے پچیلے اور گندے ہوتے ہیں۔ ان کا پسینہ قبروں میں گرتا ہے اور انہیں میں مسلمان مردے دفن کردئے جاتے ہیں جس سے انکی بے حرمتی ہوتی ہے اور ننگزیب نے پوچھا

”پھر کیا کیا جائے؟“

”قبریں کھودنے کیلئے صاف ستھرے لوگوں کا انتظام کیا جائے۔“ اسے ایک متفقہ جواب دیا گیا اور ننگزیب نے استفسار کیا۔

”آپ لوگوں نے کچھ تجویز کیا ہے؟“

”میرے خیال میں تو یہ کام سادات کے سپرد کر دیا جائے، وہ متقی اور پرہیزگار بھی ہوتے ہیں اور پاک و طاہر بھی۔“ ایک عالم نے منصوبے کے مطابق اپنی تجویز پیش کی اور اور ننگزیب نے ان سے اتفاق کر لیا پھر اسی وقت حکم جاری کر دیا گیا اور سادات گورکنی پر متعین ہو گئے۔

اور ننگزیب کے عہد میں نعمت خاں عالی شیعوں کا واحد سہارا تھا جو تقیہ اختیار کئے تھا ایک بزرگ سید بہت احتیاط کے ساتھ اس سے جا کر ملا اور نعمت خاں عالی نے خفیہ طور پر اسے بعض ہدایات دیدیں۔

نعمت خاں ایک موقر امیر تھا جو مختلف عہدوں پر فائز رہا تھا اور اب داروغہ مطبخ اور میرمنشی کے عہدے پر تھا۔ لوگوں نے عالمگیر سے اسکی شکایت کی کہ وہ رافضی ہے، اور ننگزیب خود جانتا تھا مگر وہ غیر معمولی صلاحیت کا مالک تھا اور حد درجہ وفادار اس لئے اور ننگزیب نظر انداز کرتا تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا کہ تمہیں شک ہے تو اس سے مجلس میں لے جا کر تبرا کر اوسے چنانچہ نعمت خاں کو مجبور کیا گیا۔

وہ مجلس میں منبر پر گیا اور اس نے آواز لگائی۔

”محمد بن ابی بکر رافضی بودا“

اکثر لوگ برپدرش کہہ کر رک گئے اور جن لوگوں نے روانی میں جملہ پورا کر دیا وہ منہ پیٹنے لگے۔ نعمت خاں منبر سے اتر کر چلا گیا۔ اسکی شکایت پھر اور ننگزیب سے کی گئی تو اس نے کہا۔

”تم لوگ علی بن ابی بکر کے دعویدار ہو۔ جب اس نے ایک رافضی کا نام لیا اور مع ولدیت کے پکارا تب بھی تمہیں ہوش نہ آیا اور تمہاری اجتماعی ذہانت اس ایک آدمی سے مات کھا گئی۔ میں بھی جانتا ہوں کہ وہ شیعہ ہے اس جیسا کوئی لے آؤ تو میں اسے نکال دوں“

اسی نعمت خاں عالی نے بزرگ سید کو ایک راستہ دکھا دیا اور جاتے ہی پورے خاندان کو لے جا کر اس نے چھوٹی بڑی قبریں کھدوانا شروع کر دیں۔ جب مسلمان ایک مردے کو لے کر پہنچے تو ہر عیمائش کی قبریں تیار تھیں۔ انہوں نے مردے کو ناپا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ مردہ نہلا دھلا کر اور کفن کر لایا گیا تھا اسکی تدفین کر دی گئی مگر اسکی شکایت کی گئی کہ قبریں پہلے سے کھود کر رکھنا بڑی بد شگون ہے۔ سیدوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔

”ہم تھوڑے سے آدمی ہیں۔ شہر میں مرنے والی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ہم عین وقت پر اتنی قبریں کیونکر تیار کر سکتے ہیں۔ پھر بعض مردوں کا غسل و کفن بھی ہمیں کرنا پڑے گا۔“

جواب معقول تھا لہذا اس اعتراض کو نظر انداز کر دیا گیا۔

شیعوں کے کفن کے طریقہ میں کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ نہلانے میں بھی ایک غسل اس طرح دیا جاتا ہے کہ پانی میں بیر کی پتی ملی جاتی ہے۔ بیر کی پتلی شاخوں کی دو بیساکھیاں بغلوں میں دی جاتی ہیں جو سیدوں نے پہلے سے تیار کر لیں۔ ایک مردہ نہلانے کیلئے لایا گیا تو انہوں نے بیر کی پتی اور بیر کی بیساکھیاں اٹھائیں۔ لوگوں نے پوچھا۔

”ان بیساکھیوں کا کیا ہوگا؟“



”ہملانے سے قبل ان کے ذریعہ اندر کی آلائش نکالی جائے گی۔“ ایک سید نے بتایا، مردے کے قریب جا کر بیساکھی ہاتھ میں لی اور کہا ”گرمی کم۔“

اسکے ساتھ ہی اس نے بیساکھی نیچے کی طرف لگائی۔ مردے کے وارث جمع پڑے۔

”یہ کیا کرتے ہو، اس سے مردے کی بے حرمتی ہوگی۔“

سید رک گیا اور بڑی مہمانت سے بولا ”ہم تو اپنے ہی طریقہ پر غسل دیں گے۔ ہمیں اسکے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں معلوم۔“

سید الگ بیٹھ گیا اور لوگ مردے کو اٹھالے گئے۔

اس وقت سے یہ مشہور ہو گیا کہ شیعوں میں مردے کے ساتھ ”گرمی کم“

ہوتا ہے۔

سادات نے گور کئی غسل و کفن اور تدفین کسی بات سے انکار نہیں کیا لیکن انکے طور طریقہ کو کون مانتا لہذا پھر پرانا طریقہ رائج ہو گیا لیکن اسکے بعد سادات دلی چھوڑ کر چلے گئے۔ اس طرح دلی شیعوں سے خالی ہوتی رہی اور پھر کوئی عوامی آبادی نہ ہو سکی۔

اور ننگزیب کی شخصیت کا ایک پہلو تو یہ تھا، دوسری طرف خود اسکی ایک بیوی راجپوت تھی اور شاہزادہ معظم کی شادی بھی اس نے راجپوت لڑکی سے کی تھی اور یہ دونوں اپنے سابقہ عقیدے پر قائم تھیں۔ ان دونوں پر تبدیلی مذہب کیلئے کوئی زور ڈالا نہیں گیا، نظریں اسکی بھی ہیں کہ اور ننگزیب نے بعض مندروں کو عطایا دئے اور سادات کو بھی جاگیریں دیں۔

شیعوں کے مسائل بالکل علیحدہ تھے۔ وہ مختلف ادوار میں مختلف حالات سے دوچار رہے تھے اور انکو شہداء میں زندہ رہنے کی عادت تھی۔ وہ اپنی صلاحیت کے بل پر زندہ رہنے کے چلن جانتے تھے لہذا اب بھی بہت سے کلیدی عہدوں پر موجود تھے اور مجلسرا میں شیعہ خواتین مغل بیگمات میں گھلی ملی رہتیں۔ علماء بھی اکبر کے ابتدائی دور کی طرح موجود تھے اور بعض شاہی بچوں کی تعلیم پر بھی مامور تھے۔

### شاہزادی زیب النساء

عجیب ستم ظریفی ہے کہ اور ننگزیب کی یگانہ عصر بیٹی زیب النساء شیعہ تھی اور ولی عہد سلطنت شہزادہ معظم بھی اشاعتی۔ کن اسباب و عوامل نے ان کو اس راہ پر لا ڈالا تھا؟ اسکے بارے میں استہابی کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ماحول میں ایسے عناصر موجود تھے جنہوں نے بحث مباحث سے ان کے ذہن میں انقلاب پیدا کر دیا۔

اس سلسلے میں پہلا نام ممتاز محل کا آتا ہے جو جہاں آرا کی ماں تھی اور زیب النساء کی حد تک ایک نام نواب بانی راجہ کشتورا کی بیٹی کا بھی لیا جاسکتا ہے جسکی گود میں اس نے پرورش پائی اور جو ایک طرح پر شاہزادی کی ماں ہی تھی۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ محب اہل بیت تھی۔

ابتدائی تعلیم دینے والوں کا کچھ سراغ نہیں ملتا لیکن دینیات ملا محمد سعید اشرف خلف محمد صالح مازندرانی نے پڑھائی پھر شاہزادی کا علمی دربار منعقد ہونے لگا جس میں باکمال علماء و فضلاء ادباء و شعراء کی شرکت مسلم ہے۔ بعض کو خود اور ننگزیب منتخب کر کے بھیجتا تھا۔

زبیب النساء کا پورا ماحول شاعرانہ تھا۔ اسکی کنیزیں تک شاعر تھیں۔ ایک دن وہ چہل قدمی کے دوران اپنا ایک شعر پڑھ رہی تھی۔

چہار چیز کہ دل می برد کد ام چہار  
شراب و ساقی و گزار و قامت دلدار

کہ اور ننگزیب عقب سے ٹہلتا ہوا پائیں باغ میں آگیا اور اس نے دوسرا مصرعہ بدل کر پڑھ دیا۔

نماز و روزہ و تسبیح و دیگر استغفار

امیر عاقل خاں کے معاشقہ کو اکثر اکابر نے غلط قرار دیا ہے جن میں نیاز فتحپوری بھی ہیں حالانکہ سن و سال کو دیکھتے ہوئے وہ ناممکن نہیں ہے۔ شاہزادی حسین و جمیل تھی اور شاعرہ بھی اور عموماً محسوسات تغزل خود دل پر چوٹ کھائے بغیر پیدا نہیں ہوتے۔ پھر اس سے اسکی عظمت پر حرف بھی نہیں آتا۔ اگر عاقل خاں



پائیں باغ میں جہل قدمی کے ہنگام اسکو چھپ کر دیکھتا رہا ہو اور جب اسکو پکڑنے کیلئے اور نگزیب کے سپاہی دوڑے ہوں تو وہ باور چٹانے کی خالی دیگ میں جا گھس ہو۔ یہ دیگ چو لھے پر چڑھادی گئی اور عاقل خاں عظیم المرتبت شہزادی کو بدنامی سے بچانے کے لئے کوئی آواز نکالے بغیر جل کر کباب ہو گیا۔ محبت اور تحیر خیز شجاعت کی ایک داستان جو نہ غیر فطری ہے اور نہ شہزادی کیلئے باعث توہین پھر اس پر مردہ ذلت کی کیا ضرورت ہے۔

اسی طرح کا واقعہ ناصر علی سرہندی کا ہے کہ جب اسکو زیب النساء کا مصرعہ ”ازہم نمی شود ز حلالت جدا لبم“

اس پر مصرعہ لگانا واقعی مشکل تھا مگر ناصر علی کے منہ سے برجستہ نکل گیا۔ گویا سید برب زیب النساء لبم

اس کو سن کر شاہزادی آگ بگولا ہو گئی مگر گستاخی کے ساتھ ناصر علی کی حاضر جوابی اور مہارت فن نظر انداز نہ ہو سکی۔ شہزادی نے ایک شعر لکھ کر اسکو معاف کر دیا

ناصر علی بنام علی برد نی پناہ  
ورنہ بذوالفقار علی سربرید نی

اس کمال فن کے ساتھ شہزادی مذاہب عالم کی عالمہ تھی، اپنے چچا دارا کی طرح اس نے ایک تفسیر قرآن بھی لکھنا شروع کی تھی جس سے اس کے عقائد کا پتہ چلتا مگر وہ ناپید ہے۔ اس کا دیوان دیوان مخفی کے نام سے پایا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی قدیم کتب خانے میں اسکی کوئی کاپی بھونپ ہو۔

شہزادی نے اپنی جو مہر بنوائی تھی اس پر کندہ تھا۔ کنیز فاطمہ زیب النساء پھر اپنی تحریروں اور گفتگو میں وہ جو کچھ بیان کرتی وہ تولا کے ساتھ تبر کی آئینہ دار بھی ہوتی اسی لئے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ خود اور نگزیب نے اسکو زہر دلوادیا۔ مرتے وقت اور نگزیب کے استفسار حال پر اس نے ایک شعر بڑھا تھا

ترا نہ تکمہ لعش درقبائے حریر  
شداست قطره خون منت گریباں گیر  
اور اس وقت اور نگزیب کے گلوئے قبا میں لعل کی گھنڈی تھی۔

### اور نگزیب نہ ظالم نہ ستم گر

ہم نہیں کہتے کہ بیٹی کا خون اسکی گردن پر ہے ممکن ہے کہ یہ کام اس عہد کے علماء کا ہو کیونکہ بے گناہ شاہزادی نے اسکی شکایت نہیں کی کہ اسکو حب علی کی پاداش میں زہر دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی متعصب نے اختلاف مذہب کی بنا پر زہر دلوادیا ہو مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ۱۱۰۷ھ میں مغلوں کی فخر روزگار خاتون اس دنیا سے سدھار گئی۔

باپ کی حیثیت سے اور نگزیب کو اس کا دکھ ضرور ہوا ہو گا وہ بہر صورت اپنے پہلو میں انسان ہی کا دل رکھتا تھا مگر تو سب سلطنت کے جنون نے اسے بہلا لیا اور وہ دکن کی شیعہ حکومتوں کا استیصال کرنے میں لگ گیا۔

عصبیت سے قطع نظر کر کے اور نگزیب کو دیکھا جائے تو وہ ایک جیالا سپاہی اور بہادر جرنیل تھا۔ اسکی کامیابیوں میں حالات سے زائد خود اسکے تدبیر کو دخل تھا اور اس نے سلطنت مغلیہ کے اس جگہ پہنچا دیا تھا جسکے بعد زوال ناگزیر تھا جو ہو کر رہا

گردنیں قلم کر کے تسخیر ممالک کی پالیسی جو شروع ہی سے مسلمانوں کا شیوہ رہی تھی اسی کو اور نگزیب نے اپنایا اور دلوں کو مسخر کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی جس کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ تلواروں کا سایہ سرے سے ہٹتے ہی بغاوتیں شروع ہو گئیں۔

لیکن محسوس ہوتا ہے کہ آخر عمر میں وہ کچھ بدل رہا تھا۔ علماء کے مشورے پر جب اس نے تعزیر داری بند کرنے کا حکم دیا تو کسی نے بند کمرے میں تعزیر رکھ کر بڑھا دیا، کسی نے رکھا ہی نہیں مگر ایک ضعیف جس چوک پر تعزیر رکھتی آئی تھی اس نے اپنے طریقہ پر اسی چوک میں تعزیر رکھا اور مرنے کیلئے حیار ہو کر بیٹھ گئی۔ لوگوں نے حکم شاہی سے سرتابی پر بہت ڈرایا دھمکایا مگر ضعیف کی عقیدت نے امام کی مودت میں جان عزیز کو کم قیمت قرار دیا۔



اور نگزیب کو خبر ہوئی تو وہ خود اسکو دیکھنے کیلئے روانہ ہوا۔ ضعیفہ تعزیے کے آگے ایک ٹسٹا ہوا دیا جلانے بیٹھی تھی جو ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا تھا مگر روشنی دیر ہاتھا اور ضعیفہ بڑے اطمینان اور سکون سے تعزیے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بادشاہ کے پہنچتے ہی مجمع بڑی تیزی سے چھٹ گیا مگر ضعیفہ اسی طرح بیٹھی رہی

اور نگزیب سواری سے غلطی کے عالم میں اترتا مگر تعزیے کے قریب پہنچ کر نرم پڑ گیا۔ دیر تک تعزیے کو دیکھتا رہا۔ ساتھ والے منتظر تھے کہ وہ حکم دے تو ضعیفہ کا سر اتار لیا جائے اور ضعیفہ بھی اپنے انجام کو سمجھ رہی تھی مگر اس نے تعزیے پر سے اپنی نظریں ہٹائیں نہیں۔ شاید خیال ہی خیال میں رسول کی بیٹی سے کچھ کہہ رہی ہو اور نگزیب نے ایک عجیب سی نگاہ ضعیفہ پر ڈالی اور لئے قدم واپس ہو گیا۔

کس میں ہمت تھی جو اس سے کچھ پوچھتا مگر حیرت ہر ایک کو تھی کہ عورت کو عدول حکمی اور بدعت کی سزا کیوں نہیں دی گئی۔

جسکے نتیجے میں دوسرے لوگ بھی قدرے احتیاط سے عبادت کرتے رہے۔

جشن نوروز بھی ہوا اور ۹ ربیع الاول کو عید زہرا بھی منائی گئی۔ (۷۱)

ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے ہی بعض واقعات پیش آئے اور انسداد عرا کا فرمان پوری طرح نافذ العمل نہ ہو سکا۔ اور نگزیب نے بھی سختی نہیں کی شاید وہ دیوانی قوم کی اندھی عقیدت کو سمجھ چکا تھا یا ہو سکتا ہے کہ صداقت کچھ کچھ اپنا اعجاز دکھانے لگی تھی۔ اس کا اندازہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ ۱۱۱۷ھ میں جب اس کا وقت قریب آیا تو اس نے بارہ دفعات پر مشتمل ایک وصیت نامہ تحریر کیا۔

ان وصایا میں کئی وصیتیں اسکے آخری عقیدے پر دلالت کرتی ہیں۔ سادات کے ساتھ حسن سلوک روار کھا جائے، خاک تربت امام مظلوم قبر میں رکھی جائے اور قبر بنانے کی جو ہدایات ہیں وہ بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ بعض اکابر کی رائے ہے کہ اور نگزیب مرتے وقت شیعہ ہو گیا تھا۔ ان میں ایک رائے مولوی احمد دیوبندی کی بھی ہے۔ مقالہ مشمولہ سرفراز لکھنؤ محرم نمبر ۱۳۷۷ھ میں مولانا نے لکھا ہے "اور مذہب امامیہ متعصب بود"۔ شیعیت کو عالمگیر کے تبدیل ذہن سے کوئی

فائدہ نہیں پہنچتا لیکن یہ بات ضرور روشن ہوتی ہے کہ عاقبت کیلئے اسے ان اصول کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی جسکی وہ عمر بھر تک مذہب کرتا رہا اور جو اسکے نزدیک لائق عقوبت تھے۔

### محمد معظم، بہادر شاہ اول

اور نگزیب کی وفات پر محمد معظم نے یکم صفر ۱۱۱۷ھ کو لاہور میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ محمد اعظم دہلی میں تخت نشین ہو چکا تھا۔ دونوں بھائیوں میں اگرہ کے قریب لڑائی ہوئی۔ شہزادہ اعظم شکست یاب ہو کر مارا گیا۔ سب سے چھوٹا بھائی کام بخش دکن میں تھا اس نے وہاں اپنی حکومت کا اعلان کیا، محمد معظم بہادر شاہ کا لشکر مقابلے پر پہنچا تو گھمسان کی جنگ ہوئی کام بخش میدان جنگ میں استاز خمی ہوا کہ جان بر نہ ہو سکا۔

بہادر شاہ میں شجاعت کی کمی نہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ تاج و تخت کا سزاوار تھا لیکن اس میں تدبیر کی کمی تھی۔ بادشاہ بننے سے بہت پہلے وہ مذہب اثنا عشری اختیار کر چکا جس کا اس نے اعلان کر دیا۔ اور نگزیب کی کمر حکومت کے بعد مغل تخت پر ایک شیعہ کافر و کش ہونا اکثر لوگوں کو نہ بھایا مگر بہادر شاہ استاکم زور نہ تھا کہ امراء کے خوف سے اپنے عقیدے کو چھپائے رکھتا۔ اسکے رعب و دبدبہ کو دیکھ کر کسی نے سرائٹھانے کی جرات نہیں کی پھر بھی بہت سے لوگوں میں ایک بدولی پیدا ہو گئی

راجپوتوں کی بغاوت تو بہادر شاہ نے آسانی سے فرد کردی لیکن سکھ، جو جہانگیر کے وقت سے طاقت پکڑ رہے تھے، ان کے فتنے کو دبانے میں اسے بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ سکھوں نے پنجاب میں لوٹ مار شروع کر دی۔ بہادر شاہ نے وقتی طور پر انہیں دبا لیا مگر انکی جڑیں اندر ہی اندر پھیلی رہیں۔ اسی دوران جنوبی ہند میں مرہٹوں نے سرائٹھایا۔ انہیں بھی دبا لیا گیا۔ بہادر شاہ زندہ رہتا تو ممکن تھا کہ حالات پر قابو پالیتا مگر ۱۹ محرم ۱۱۲۲ھ کو ۳۷ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اسکی مدت حکومت ۵ سال و ۵ ماہ رہی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی نے اسکو زہر دیدیا



## جہاندار شاہ

بہادر شاہ کے چار بیٹے تھے جہاندار شاہ، عظیم الشان، رفیع الشان اور جہاں شاہ۔ باپ کے مرتے ہی وہ آپس میں لڑنے لگے۔ آخر میں جہاندار شاہ کامیاب ہوا مگر وہ میراثیوں اور ڈونینوں کی سرپرستی کرنے لگا اور اسکے بھتیجے فرخ سیر بن عظیم الشان سے اسکے خلاف بغاوت کر دی۔ سید حسین علی خاں اور سید عبداللہ سادات بارہہ اسکے ساتھ تھے۔ جہاندار شاہ کو شکست ہو گئی اور فرخ سیر تخت مخلیہ پرفروکش ہو گیا۔

## فرخ سیر

یہ بادشاہ سید حسین علی خاں حاکم بہار اور سید عبداللہ خاں حاکم الہ آباد کی بدولت تخت نشین ہوا تھا لہذا ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہا۔ سید عبداللہ خاں کو اس نے ظفر جنگ یار وفادار اور قطب الملک کے خطابات دئے اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ تفویض کیا۔ امیر الامراء بہادر فیروز جنگ کو سپہ سالار بنایا اسی طرح دوسرے متعلقین کو بھی مختلف مناسب عطا کیے پھر دہلی پہنچ کر تمام مخالفین کو قتل کرا دیا۔ شیعہ ہر دور کے مدوجرز سے گزرتے آئے تھے کبھی تقیہ کا نقاب منہ پر ڈال کر کبھی کھلے فرار نے روشن جبینوں کا عکس ڈالتے ہوئے اور نگریب کے وقت میں بھی وہ زندہ تھے اور بہادر شاہ اول سے لے کر اس وقت تک کھلی فضا میں سانس لے رہے تھے اور یہ زمانہ ایک طرح پر خود انکی بادشاہت کا تھا جس میں شیعوں کو بھی اپنے طور پر جینے کا حق تھا۔

## سادات بادشاہ گڑ

سیدوں کا ایک قبیلہ عراق و ایران میں بوہبی سلطنت کے زوال کے بعد ترک وطن کر کے پنجاب آیا۔ یہ وہ دور تھا جب غزنی کی سلطنت خراسان سے سرحد اور پنجاب کے ایک حصے تک پھیل چکی تھی اور ہندوستان پر محمود کے حملے شروع ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر صفدر حسین کی تحقیق کے مطابق یہ قبیلہ محمود کی فوج میں شامل ہو کر آیا تھا اور پنجاب میں رہ گیا تھا پھر وقت کے تدبیرچی ارتقا کے ساتھ گنگا و جمنہ کے دو آبے میں آکر آباد ہو گیا۔ بعض شاخیں دوسرے اطراف میں بھی منتقل ہوئیں۔

مولانا محمد حسین آزاد کا کہنا ہے۔

ضلع مظفر نگر میں کہ دو آبہ گنگا و جمن میں واقع ہے صد ہا سال سے ۱۲ گاؤں مشہور چلے آتے ہیں ان میں سادات کی آبادی ہے۔ سہاں کے سید صحیح النسب اور بڑے بہادر تھے۔ سلاطین سلف کے عہد میں انہوں نے بڑے بڑے کارنامے کئے۔

اکبری فوج میں بھی دلاوری کے چہرے کو سرخ و کرتے رہے۔ اول ان میں سید محمود بارہہ تھے کہ پہلے سکندر سور کے قلعہ مانکوٹ میں قید تھے۔ جب اکبری فوج نے محاصرہ کا دائرہ بہت تنگ کیا تو سردار ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ یہ مع اپنے ہمراہیوں کے اکبری لشکر میں آئے اور ملازمت بادشاہی اختیار کی۔ ان کی خدمات جانفشان نے منصب کا درجہ چار ہزاری تک بلند کیا۔ ان کے بیٹے سید ہاشم بارہہ برابر ہی منصب تک پہنچے تھے کہ شہادت کا منصب نصیب ہوا۔ سید عبدالمطلب، سید عبداللہ خاں بارہہ وغیرہ نامی سردار اسی خاندان کے تھے اور ہر میدان میں لٹنے بے جگر ہو کر لڑتے تھے کہ انکی شجاعت آج تک ضرب المثل چلی آتی ہے۔ مرزا عزیز کو کلتاش کہا کرتے تھے کہ سادات بارہہ دولت اکبری کے فدا ہیں (۷۲)۔

اس خاندان کا سلسلہ نسب حضرت زید شہید سے شروع ہوتا ہے اور واسط میں آباد ہونے والے زیدی سادات میں مرکوز ہو جاتا ہے جو انقلابات زمانہ میں مختلف مقامات پر پھیل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین کے مرتبہ خاندانی شجرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید ابو الفضائل کی اولاد نے ترک وطن کیا جو زید شہید کی چودہ پشتوں کے بعد گزرے ہیں۔ کچھ لوگ پنجاب و گجرات میں رہ گئے باقی نے دو آبہ کا رخ کیا اور آہستہ آہستہ بہت سی شاخوں میں بٹ گئے۔ مظفر نگر، میرٹھ، تہ، میران پور، جولی، بلاسپور، چٹوڑہ، بہادر پور، سنہیل، ہیڑہ، مورنہ، جنواڑہ، سری، مین ضلع بجنور، جانشہ، ہاشم پور، کوال، کوئلہ، کہلاوڑہ، کھروہ جلال پور، کیہتوڑہ، منڈھیرہ، بڈھانا، ندی والا وغیرہ

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بڑی تعداد نے ترک وطن کیا تھا جو سب کے سب صاحبان سیف و قلم تھے۔ تب ہی تو مسلم حکومت کے دور میں کوئی نہ کوئی صاحبِ طہل و علم رہا اور قبیلہ کے افراد مختلف مقامات کو اقامت گاہ بناتے



رہے جن میں دلی آکرہ، تغلق آباد اور دکن بھی شامل ہیں اور بدایوں کا نام بھی آتا ہے جہاں نواب سید جعفر کا مزار ہے۔ یہ بات لودھی عہد کی معلوم ہوتی ہے۔

سادات بارہہ میں اس سے قبل جو مشاہیر گزرے وہ تاریخ میں خلط ملط ہیں البتہ دور اکبری سے انکا سراغ ملتا ہے اور نواب سید محمود کا نام آتا ہے۔ بارہ گاؤں کا حوالہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے بارہ پر گئے ہوں۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ تمام علاقے کس بادشاہ سے ملے یا کس دور میں انہوں نے بزور شمشیر ان پر قبضہ کیا پھر بادشاہ وقت سے سند جاگیر حاصل کر لی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم حکومت کے آغاز پر یہ سادات پنجاب سے آگے بڑھے اور ان علاقوں پر قابض ہو کر حکومت سے وابستہ ہو گئے پھر ان کے جوہر شمشیر نے خود اپنے وجود کو تسلیم کرایا نواب سید محمود کے بعد سید ابوالحسن، سید بہادر علی، سید مبارک علی، سید جمعیت علی خاں تلوار کے دھنی کہلائے اور اسی تسلسل میں بہت سے روشن ناموں کے ساتھ ایک بہت جلی نام سید محمد ہاشم کا ملتا ہے جو شجاعان روزگار کو پیچھے چھوڑتا ہوا سید عبدال مطلب تک پھر سید عبداللہ خاں تک پہنچتا ہے اور سادات بارہہ (بارہہ) کی اگلی تاریخ کا پیش خیمہ بنتا ہے۔

### سادات کا غلبہ

فرخ سید کی بادشاہی بالکلیہ سیدوں کی رہین منت تھی اور اس نے انہیں تمام اختیارات دیدئے تھے مگر ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اور یہاں تو تین بادشاہ تھے۔ دو سید اور ایک فرخ سیر لہذا اختلافات شروع ہو گئے اور بدگمانیوں نے دلوں میں جگہ بنالی۔ راجپوتوں کی سرکشی پر فرخ سیر نے سید حسین علی خاں کو متعین کیا تو اس نے انکی تاویب کرنے کے بجائے صلح کر لی اور سید عبداللہ کی طلبی پر دلی واپس آگیا۔

دکن میں مرہٹے سر اٹھا رہے تھے جنکو نظام الملک نے دبا لیا لیکن فرخ سیر نے سیدوں کی طاقت کم کرنے کیلئے نظام الملک کو دلی بلایا اور حسین علی خاں کو دکن بھیج دیا۔ جہاں پہنچتے ہی حسین علی خاں کو اپنے ہی ایک امیر داؤد خاں کا سامنا کرنا پڑا۔ نظام الملک دکن سے یہ منصوبہ بنا کر آیا تھا جسکی ہدایات اسے فرخ سیر نے دی تھیں۔

داؤد خاں لاکھ طاقتور ہی مگر حسین علی خاں کا مقابلہ نہ کر سکا اور حسین علی خاں کے بجائے لڑائی میں وہ مارا گیا۔ اب سیاسی صورت حال حسین علی خاں پر بالکل واضح ہو چکی تھی۔ فرخ سیر اندر ہی اندر انکے دشمنوں کی تعداد بڑھانا چاہتا تھا جو یقیناً مسلم حکومت کے مخالف تھے لیکن خود مسلم حکومت بھی سادات کی گھات میں لگی ہوئی تھی لہذا مرہٹوں کیلئے حسین علی خاں نے ایک صلح کن پالیسی اختیار کی اور تلوار کے بجائے اخلاق سے انکی غارت گری پر قابو پانے کی کوشش میں لگ گیا۔

اس دوران سکھوں نے بغاوت کی اور گورداس پور کو مرکز بنا کر سرہند اور پنجاب میں غارت گری شروع کر دی۔ ان کو کچلنے کیلئے دلی سے ایک بڑا لشکر بھیجا گیا جس نے بندہ بیراگی اور بہت سے سکھوں کو گرفتار کیا۔ وہ سب دلی لاکر قتل کر دئے گئے۔

سیدوں اور فرخ سیر کی کشیدگی اب دشمنی میں بدل گئی تھی جسکی اطلاع سید عبداللہ نے حسین علی کو دی اور فرخ سیر نے سید عبداللہ کو معزول کر کے اعتقاد خاں کو وزیر اعظم بنالیا اور سید عبداللہ کی جان کے لالے پڑ گئے مگر وہ کوئی ترنوالہ نہیں تھا جسکو آسانی سے ہڑپ کر لیا جاتا۔ وہ ہمہ وقت چوکنار رہنے لگا۔

اس اثناء میں سید حسین علی ایک لشکر لیکر دکن سے دلی آگیا جس میں مرہٹے فوج بھی شامل تھی۔ فرخ سیر اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ اس نے سیدوں سے صلح و صفائی کی گفتگو شروع کر دی لیکن یہ ایک چال تھی جسکو عمائدین سلطنت بھی سمجھ رہے تھے ان میں سے کسی نے یہ خبر اڑادی کہ سید عبداللہ قتل کر دیا گیا۔

اس خبر کے کان میں پڑتے ہی حسین علی خاں انتقام میں دیوانہ ہو گیا اس کے لشکر نے شاہی قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مرہٹے اسی موقع کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ فرخ سیر کا خسر راجہ اجیت سنگھ بھی مر گیا۔

۱۱۳۱ھ میں فرخ سیر کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا گیا اور زنداں میں ڈال دیا گیا۔

اس طرح سید حسین علی نے فرخ سیر سے انتقام تو لے لیا مگر اس سے مرہٹوں میں ایک جان پڑ گئی اور لوٹ کے مال سے وہ تنظیم نو کے قابل ہو گئے اور دلی میں سیدوں کے خلاف ایک منافرت عام ہو گئی پھر انہوں نے ابوالبرکات ولد رفیع



الشان کو قید سے نکال کر تخت نشین کیا مگر جب فرخ سیر قید خانے میں مر گیا اور اسکی لاش ہمایوں کے مقبرے لے جانی گئی تو عام بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس پر ابو البرکات کی خواہش کے مطابق اسکے بھائی رفیع الدولہ ابن رفیع الشان کو بادشاہ بنا دیا گیا۔

### رفیع الدولہ شاہجہاں ثانی

رفیع الدولہ دلی میں تخت پر بیٹھا تھا اگرہ میں راجہ اجیت سنگھ والی جو دھور نے بہادر شاہ کے دوسرے پوتے نیکو سیر کو بادشاہ بنا دیا تھا۔ سیدوں کا لشکر اسکے مقابلے کو گیا تو راجہ اجیت سنگھ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ نیکو سیر کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ ادھر رفیع الدولہ تین ماہ حکومت کر کے مر گیا تو سیدوں نے بہادر شاہ کے تیسرے پوتے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔

### روشن اختر محمد شاہ

محمد شاہ جہاں شاہ کا بیٹا تھا، نہایت خوبصورت اور تندرست نوجوان پندرہ سال کی عمر میں اس نے عنان حکومت سنبھالی مگر سارے اختیارات سیدوں کے ہاتھ میں رہے۔

نظام الملک سے سیدوں کی دشمنی فرخ سیر کے عہد سے تھی اور بیشتر امراء نے سلطنت اسکی مٹھی میں تھی۔ وہ ہمیشہ سے سیدوں کے اقتدار سے جلتا تھا۔ فرخ سیر کے دور میں بھی اس نے کوشش کی تھی کہ بادشاہ کو انکی گرفت سے آزاد کرادے۔ اب پھر اس نے ویسا ہی منصوبہ محمد شاہ کیلئے بنایا۔ سیدوں نے اس کا توڑ یہ کیا کہ اسے مالوہ کا صوبہ دار بنا کر بھجوا دیا۔ اس نے مالوہ پہنچتے ہی اپنی فوجی طاقت بڑھانا شروع کر دی۔

اسکی اطلاع سیدوں کو ہوئی تو انہوں نے ایک طرف سے دکن کی فوج اپنے متنبی بھتیجے عالم علی کی سرکردگی میں مالوہ بھجوائی دوسری طرف سے راجپوتانہ کا لشکر دلاور خاں کی ماتحتی میں روانہ کیا۔ نظام الملک نے پہلے تو دلاور خاں کو پسپا کیا پھر دکن کی سمت بڑھ کر عالم علی کو شکست دی۔

نظام الملک ایک لائق سپہ سالار تھا لیکن بہادر ہونے سے زائد سازشی ذہن رکھتا تھا۔ فتانت اور چالاکی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ اول دن سے سادات کے اقتدار کو پسند نہ کرتا اور مختلف مواقع پر انکو رستے سے ہٹانے کی کوشش کر چکا تھا اور صرف اسی پر موقوف نہیں، بہت سے امراء تعصب میں سیدوں کے دشمن تھے۔ نظام الملک مالوہ سے ان امراء کو ہدایات دیتا رہتا چنانچہ ایک جال دلی سے آگرہ تک سیدوں کے خلاف بچھ گیا۔

دلاور خاں اور عالم علی کے ہزیمت یاب ہونے کی خبریں جب آگرہ میں سید حسین علی کو ملیں تو اس نے سید عبداللہ کو دلی روانہ کیا اور خود دکن کا عازم ہوا۔ نظام الملک کے آدمی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ حسین علی کی پاکی دورویہ کھڑے ہوئے آدمیوں کے بیچ سے گزری تو ایک شخص عرضی دینے کے بہانے پاکی کے قریب پہنچا اور خنجر نکال کر ایسا وار کیا کہ خنجر کی نوک سید حسین علی کے دل میں اتر گئی۔ سید عبداللہ کو رستے میں اسکی خبر ملی تو چھوٹے بھائی کی موت سے دنیا اسکی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی پھر بھی ہوش و حواس کو مجتمع کر کے وہ دلی پہنچا اور لشکر کو منظم کرنے میں لگ گیا۔

اس سازش میں محمد شاہ کا پورا ہاتھ تھا۔ عوام کو پہلے ہی وہ شیعہ اقتدار کے خلاف ابھارا جا چکا تھا۔ سیدوں کے سپاہی بھی ٹوٹ کر محمد شاہ کی طرف چلے گئے اور ان سب نے سیدوں کے مکانات لوٹ لیے اور ان کے کارندے گرفتار کر لیے گئے جو لوگ قتل ہوئے تھے ان کی میتیں اجمیر کی طرف جانے لگیں تو کفن تک لوٹ لئے گئے اور میتوں کو اجمیر لے جا کر سڑکوں پر ڈال دیا گیا جو کسی نہ کسی طرح دفن کی گئیں۔

محمد شاہ نے ان خدمات کے عوض ان سب کو انعامات اور مناصب جلیلہ سے نوازا۔

نظام الملک نے سادات کے خلاف جو منصوبہ بنایا تھا وہ ہر طرح مکمل تھا۔ آگرہ میں انکی بیخ کنی کرنے کے بعد محمد شاہ نے دلی کی طرف پیش قدمی کی۔ سید عبداللہ نے اپنی فوجوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ سید کی فوج کے بعض امراء کو



پہلے ہی سے توڑ لیا گیا تھا۔ وہ عین موقع پر دھوکا دے گئے اور سید کے لشکر میں ایک بددلی پھیل گئی جس کا بدہی نتیجہ شکست تھی۔ سید عبداللہ سخت زخمی ہو کر گرفتار کر لیا گیا اور قید میں اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ اس طرح ۱۱۳۴ھ میں اس بادشاہ گرجا خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ نظام الملک کا کارنامہ تھا لہذا اسکو آصف جاہ کا لقب دے کر وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

محمد شاہ ایک نااہل فرمانروا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس میں نظام الملک کی فراست اور سازش کی کارفرمائی تھی۔ اب اسکے پاس دکن، احمد آباد اور مالوہ کی صوبہ داری تھی اور وزارت کا منصب اعلیٰ بھی لہذا وہ ایک طرح خود مختار سا ہو گیا۔

اس عرصے میں مرہٹوں میں کافی طاقت پیدا ہو گئی جس کا الزام متعصب مورخین سیدوں پر لگاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرہٹے سیدوں کی دوستی کی وجہ سے خاموش تھے۔ جب وہ رستے سے ہٹ گئے اور نظام الملک نے دکن کو بچانے کیلئے ان کا رخ شمالی ہند کی طرف کر دیا تو انہوں نے دلی کے مضافات تک تاخت شروع کر دی۔ محمد شاہ نے نظام الملک کو مدد کیلئے بلایا۔

”وہ بادشاہ کے بلانے پر مع اپنے لشکر کے دہلی پہنچ گیا اور وہاں سے مرہٹوں کے مقابلے کیلئے مالوہ گیا لیکن یا تو اسے مرہٹوں سے لڑنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی یا اس نے کسی سیاسی مصلحت اور سازش کی بنا پر لڑنا نہیں چاہا۔ غرض کہ وہ لڑے بغیر دہلی واپس آگیا اور اپنے ہاتھ سے یہ عہد نامہ لکھ کر مرہٹوں کو دے آیا کہ سارا مالوہ مرہٹوں کو دیدیا جائے۔ نظام الملک خود اس عہد نامے کو لے کر بادشاہ کے دستخطوں کیلئے دہلی آیا۔ غرض کہ مرہٹے محمد شاہ کی حکومت میں ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت بن گئے۔“ (۷۳)

سیدوں پر مرہٹوں کی طاقت بڑھانے الزام لگانے والے گریبان میں منہ ڈالیں۔ سید حسین علی نے بلطائف الحیل مرہٹوں کے فتنے کو فرد کر دیا تو ملزم، نظام الملک مرہٹوں سے بھڑا کر سیدوں کو کمزور کرنا چاہتا تھا، وہ اپنے کو بچانے لے گئے تو متعصب مورخ نے ان پر الزام لگادیا، پھر آج اسی نظام الملک نے انکو سند حکومت دیدی تھی۔

سیدوں کا رعب و دبدبہ مرہٹوں کو دبائے ہوئے تھا۔ وہ زندہ ہونے تو مرہٹے فرمانروائی کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے مگر وہ شیعہ تھے اس لئے ان کے زوال پر خوشیاں منائی گئیں۔ آج نظام الملک نے مغل سلطنت کے ایک حصے کا سودا مرہٹوں سے کر لیا تھا تو اس پر آنسو بہانا چاہئے تھا اور اسکی مطلق العنانی کو برا کہنا چاہئے تھا تو کوئی بولا نہیں۔

مغل سلطنت شیعوں کی ساختہ و پرداختہ تھی۔ عصبیت نے ہزار جتن کر ڈالے اور جب موقع ملا تو سراسر اترو لیے مگر شیعوں کے پاس تلوار بھی تھی اور قلم بھی ان سے کہاں بیچھا چھوٹنے والا تھا۔ وہ ہر دور میں مغل حکومت کے پشت پناہ رہے۔ آج نظام الملک سیدوں کا صفایا کر کے بہت خوش ہو رہا تھا لیکن سعادت خاں ایک گوشے سے نکلا اور برہان الملک کے لقب کے ساتھ بڑے امراء میں شامل ہو گیا۔ اسکو بھی نظام الملک نے اول دن سے حریف قرار دیا مگر وہ برہان تھا، جاہ و منصب اور نظم و نسق جسکی اعانت کے محتاج ہوتے ہیں۔

### نادر شاہ کا حملہ

کابل اس زمانے میں ہندوستان کے زیر نگین تھا۔ ایران کے بعض باغی افغان وہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ نادر شاہ نے محمد شاہ کو لکھا کہ انکو وہاں سے نکال دیا جائے مگر کوئی توجہ نہیں کی گئی بلکہ قاصد کو قتل کر دیا گیا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ نظام الملک اور برہان الملک دونوں نے اسکو مرہٹوں کی سرکوبی کیلئے بلایا تھا مگر یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ بہر حال نادر شاہ کسی غوثانگی طرح چلا اور کابل و قندھار کو فتح کرتا ہوا پنجاب میں داخل ہو گیا۔

تفصیلات ایران کے حصے میں درج ہو چکی ہیں۔ نظام الملک نے اس موقع پر بھی وہی چالیں چلیں جو اس نے سادات بارہہ (باہرہ) کے خلاف آزمائی تھیں لیکن سید بہادری کے زعم میں چوٹ کھا گئے۔ برہان الملک ایسے دغا بازوں کو سزا دینا بھی جانتا تھا۔

محمد شاہ نے نادر شاہ کے مقابلے کیلئے نظام الملک اور راجہ اجیت سنگھ سے مدد طلب کی مگر دونوں نے حیلہ کر کے ٹال دیا۔ برہان الملک امیر الامراء کے ساتھ



روانہ ہوا۔ کرنال کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ نادر شاہی لشکر نے ہار  
گھٹنے میں مغل لشکر کو کاٹ ڈالا۔ بڑے بڑے سردار مارے گئے امیر الامراء لڑا کرتے ہوئے  
آیا۔ برہان الملک زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا مگر وہ ایرانی النسل تھا۔ جب نادر شاہ نے اسے  
ہاتھ سے پیش ہوا تو اس نے اسکو معاف کر دیا۔

پھر وہ واقعہ پیش آیا کہ نادر شاہ کو برہان الملک نے نذر پیش کر کے دیا ہے۔  
آباد کر لیا مگر اسکے واپس ہونے سے قبل نظام الملک نے اس کا نامے کا سہارا لیتے  
سریا لہ لیا۔ اس چال کی پر برہان الملک کا اشتعال برپا ہو گیا تھا۔ وہ نادر شاہ کی خدمت سے  
میں دوبارہ حاضر ہو گیا اور نادر شاہ دلی آگیا۔ دلی کے سپاہی موقع محل سے نادر کی  
فوجوں پر حملے نہ کرتے اور کسی امیر نے یہ خبر نہ لائی ہوتی کہ محمد شاہ نے نادر شاہ  
کو بلا کر قتل کر دیا تو دلی قتل عام سے بچ جاتی۔ پھر نادر شاہ کے منظر عام پر آنے کے  
بعد دلی والے اس پر ہتھ پڑاؤ نہ کرتے تو اپنے وقت کا ناسخ تلوار کو بے نیام نہ کرتا۔

وہ روشن الدولہ کی مسجد میں جا بیٹھا اور دلی میں قتل عام شروع ہو گیا۔ سات  
آٹھ سو ایرانی مارے گئے اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ مغل سپاہی اور اہل دلی قتل ہوئے آخر یہ  
قتل عام برہان الملک نے بند کرایا۔

اس موقع پر متعصب مورخ تاریخی خیانت سے باز نہیں آتا۔ وہ لکھتا ہے کہ  
محمد شاہ خود نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا حالانکہ اس سے قبل وہ تحریر کر چکا ہے کہ  
نادر شاہ نے قلعہ لوٹنے کیلئے شاہی خواتین اور خود محمد شاہ کو ایک خیمے میں نظر بند  
کر دیا تھا۔

امن ہونے پر جامع مسجد میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا پھر برہان  
الملک کی وساطت سے نادر شاہ کے بیٹے نصر اللہ مرزا سے محمد شاہ کی بیٹی کی شادی  
ہوئی۔ یہ رشتہ برہان الملک نے اس لئے کرایا تھا کہ نادر شاہ کی نیست ہندوستان  
کیلئے غراب نہ ہونے پائے۔ اسکے بعد ہی برہان الملک کا انتقال ہو گیا۔

نادر شاہ شاہجہاں کا تخت طاؤس اور بہت سے نوادرات لے کر ایران واپس  
ہو گیا اور ہندوستان کی حکومت محمد شاہ کیلئے چھوڑ گیا مگر اب اس میں کوئی رہنمائی  
رہا تھا۔ نظام الملک سادات بارہہ سے چھٹکارا پا کر پھولانہ سمایا تھا مگر آج انکی قوت

موجود ہوتی تو نادر شاہ مغل لشکر کھیرے گلزی کی طرح کاٹ نہ سکتا اور وہ نظام  
الملک کی طرح دور کے تماشائی بنے نہ رہتے۔

نادر شاہ کے بعد پورے ملک میں ایک انتشار کا دور دورہ تھا۔ گجرات و مالوہ  
کو مرہٹوں نے تباہ کر دیا تھا۔ بنگال و بہار میں بھی انہوں نے غارت گری شروع کی  
تھی مگر علی وردی خاں حاکم بنگال نے انہیں مار بھجوا دیا تھا۔ دوسرے علاقے میں  
سرکشی کر رہے تھے ایسے میں احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا۔

یہ افغان سردار نادر شاہ کا فوجی افسر تھا۔ دوسرے امراء کی طرح وہ بھی نادر  
شاہ کے خلاف سازش میں شریک تھا۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد وہ اس کا فرار نہ کر  
کابل آگیا اور غزنی و قندھار میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ پنجاب فتح کر کے وہ دہلی کی  
طرف بڑھ رہا تھا کہ دلی عہد سلطنت احمد شاہ نے اپنی فوج کے ساتھ مقابلہ کیا اور  
۱۱۶۱ھ میں ایک سخت معرکے کے بعد ابدالی کو شکست دی۔

محمد شاہ ۱۱۶۱ھ میں تیس سال حکومت کر کے فوت ہو گیا اور احمد شاہ تخت  
نشین ہوا۔

### احمد شاہ ابدالی

علی وردی خاں بہار و بنگال کا نیم خود مختار حکمران بن چکا تھا۔ اودھ کا صوبہ  
برہان الملک کو ملا تھا۔ اسکے انتقال کے بعد صفدر جنگ فیض آباد کا فرمانروا تھا لیکن  
اس کا قیام دلی ہی میں رہتا تھا۔ دکن میں نظام الملک آصف جاہ کے مرنے پر اسکے  
بیٹوں میں تخت کیلئے خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ مرہٹوں کی شورش اپنی جگہ پر تھی جس  
میں روہیلہ سرداروں کی لوٹ مار کا اضافہ ہو گیا تھا۔

ان حالات میں احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا۔ دلی کی فوج ابدالی کا مقابلہ نہ  
کر سکتی لہذا صفدر جنگ نے مرہٹوں کی خدمات معاوضے پر حاصل کیں جسکی ادائیگی  
نظام الملک کے بیٹے امیر الامراء غازی الدین فیروز جنگ نے کی اور اسکے عوالم دکن  
کے چھ صوبوں کی حکومت حاصل کی مگر احمد شاہ ابدالی سے جنگ کی نوبت نہیں آئی  
وہ ملتان اور لاہور کے صوبوں کی حکومت مل جانے پر ملت گیا۔



فیصلہ کن معرکہ ہوا جس میں لاکھوں مرہٹے قتل ہوئے۔ ۱۱۷۳ھ میں انکی طاقت کو پامال کر کے ابدالی واپس چلا گیا اور پھر کبھی ہندوستان نہیں آیا۔

اس دوران غازی الدین نے عالمگیر ثانی کو قتل کرادیا تھا دلی کا تخت خالی تھا کوئی اسپر بیٹھنے والا نہ تھا۔

شاہزادہ علی گوہر دلی عہد سلطنت تھا جو غازی الدین کے ڈر سے بنگال بھاگ گیا تھا۔ وہ جب واپس آیا تو شاہ عالم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

### شاہ عالم

یورپ کی قومیں یوں تو اکبر اعظم کے عہد سے ہندوستان آنا شروع ہو گئی تھیں لیکن جہانگیر کے زمانے سے انکی آمد و رفت کچھ بڑھی پھر ہندو متج اضافہ ہوتا رہا۔ پہلے پرتگیزی پھر ہالینڈ والے یعنی ڈچ، اسکے بعد انگریز اور فرانسیسی یہ لوگ آپس میں بھی لڑتے رہے اور ہندوستان والوں سے بھی سرد آرمائی کرتے رہے۔ آخر میں فرانسیسی اور انگریز قابل ذکر رہ گئے جو دکن میں برسرِ پیکار رہے۔ انگریز غالب آئے جو ایک طرف بنگال میں ڈٹ گئے دوسری طرف شمالی ہند میں دخل ہوئے۔

شاہ عالم کو انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے حکومت میں بعض اختیارات حاصل کر لیے۔

مغل بادشاہ اب ہر طاقتور کے ہاتھ کا کھٹونا بن گیا تھا۔ انگریزوں کے بعد مرہٹوں کے قبضے میں آیا پھر دہلیے اسکو لے گئے اور غلام قادر روہیلہ نے اسکی آنکھیں نکلوائیں۔

اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے جو انگریزوں کے رحم و کرم پر رہے اور پھر ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزی عملداری میں شامل ہو گیا۔

نظام الملک اور سعادت خاں برہان الملک میں جو عداوت تھی اس زمانے میں وہ موروثی بن گئی اور غازی الدین اور صفدر جنگ میں باقاعدہ لڑائی کی نوبت آگئی۔ صفدر جنگ نے جاٹوں کو اپنی مدد کیلئے بلایا۔ غازی الدین نے مرہٹوں کی مدد حاصل کی مگر جنگ کی نوبت نہیں آئی اور صفدر جنگ دلی سے چلا گیا۔

غازی الدین نے اسکے بعد جاٹوں کو سزا دینے کیلئے ان پر حملہ کیا مگر ناکام ہوا تو اس نے شاہی توپ خانہ طلب کیا اور افسر توپ خانہ خانخاناں وزیر نے انکار کیا تو وہ مرہٹہ سردار ملہار راؤ ہلکر کو بادشاہ پر چڑھا لایا اور مرہٹوں نے تمام شاہی ساز و سامان لوٹ لیا۔ اسکے بعد غازی الدین نے علماء سے احمد شاہ کے خلاف فتویٰ لے کر اسے معزول کر دیا اور قید خانے میں نیل کی سلائیاں پھروا کر اسکو اندھا کر دیا

### عالمگیر ثانی

یہ بادشاہ ۱۱۶۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ غازی الدین نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھال لیا۔

احمد شاہ ابدالی نے پنجاب میں معین الملک کو اپنا قائم مقام بنایا تھا۔ اسکے فوت ہونے پر اس کا داماد خواجہ موسیٰ صوبیدار تھا۔ غازی الدین اسپر چڑھ دوڑا معین الملک کی ناکتداہی سے بھر نکاح کیا اور پنجاب کی صوبیداری تیس لاکھ روپے لے کر ادنیہ بیگ کو دیدی۔

احمد شاہ ابدالی یہ خبر سن کر تیسری مرتبہ ہندوستان آیا۔ غازی الدین نے تو اس سے معافی مانگ لی لیکن ابدالی نے ۱۱۷۰ھ میں دلی پر قبضہ کر لیا۔ ہر طرف لوٹ کا بازار گرم ہو گیا اور دلی کی حالت نادر شاہ کے حملے سے بھی بدتر ہو گئی۔

احمد شاہ نے غازی الدین کے بجائے محیب اللہ کو وزیر اعظم بنادیا اور خود واپس ہو گیا۔

اسکے بعد مرہٹوں نے دلی پر حملہ کیا۔ غازی الدین ان کے ساتھ تھا جو ان کو دلی کے بعد پنجاب پر چڑھا لے گیا۔ اس خبر پر ابدالی جو تھی بار ہندوستان آیا۔ انکی عالمگیر ثانی نے خط بھیج کر اسکو بلوایا تھا۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں سے اس کا



## دکنی ہندوستان

### بہمنی سلطنت

اس سلطنت کا بانی حسن بہمنی تھا جو ایک غیر معروف آدمی تھا۔ اس کا اصل نام حسن تھا اور دلی میں کانگوی بہمن کا ملازم تھا جسکو وہ اپنا محسن سمجھتا تھا لہذا بادشاہ ہونے پر اس نے اپنے نام کے ساتھ بہمن کا نام منسلک کر لیا اور حسن بہمنی مشہور ہوا۔

حسن ایک حوصلہ مند آدمی تھا، سلطان محمد تغلق کی فوج میں شامل ہوا اور امیران سدہ کے ساتھ دکن پہنچا۔ محمد تغلق جب دلی واپس ہو گیا تو چھوٹی مہمات میں طالع آزمائی کرنے لگا۔ کسی درویش نے اسکو حکومت دکن کو بشارت دی تھی جو آہستہ آہستہ پوری ہو گئی اور ایک دن وہ گلبگرہ کا فرمانروا ہو گیا جس کا نام اس نے حسن آباد گلبگرہ رکھا۔

حسن حنفی المسلمک تھا مگر اسکی اہلیت دشمنی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ گیارہ سال دو ماہ تک حکومت کرنے کے بعد وہ ۷۵۹ھ میں وفات پا گیا اور اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ تخت نشین ہوا۔

### سلطان محمد شاہ

یہ بادشاہ باپ کے مقابلے میں زیادہ مذہبی اور سادات پرور تھا۔ اس نے اپنے ملک کو وسعت دی اور تروج اسلام میں بڑی کدو کاوش کی۔ اسکی ماں ملکہ جہاں دنیا سے زائد دین کی طرف راغب تھی۔ وہ شوہر کی وفات کے ایک سال بعد مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئی۔ اسکی شان و شوکت اور داد و دہش کی مورخین نے بڑی مدح کی ہے۔

”مدنیہ منورہ کے قیام میں اس نے چار ہزار سادات لڑکیوں اور لڑکوں کی شادیاں اپنے مصارف سے کرائیں۔ چاریار اور اولاد رسول کے نام پر بڑی خیرات کی بقیع پہنچ کر قبر جناب فاطمہ زہرا کی زیارت اکثر کیا کرتی۔ ایک دن اس نے کسی سے دریافت کیا کہ حضرت سید الشہداء امام حسین کی قبر کہاں ہے؟ اسکو بتایا گیا کہ کربلائے معلیٰ میں۔ اس نے کہا کہ بی بی کی قبر یہاں اور اسکے بیٹے کی قبر کربلا میں؟ اس غریب کو کچھ معلوم نہ تھا۔ جب اسکو یزیدی ظلم و ستم کی داستان سنائی گئی تو وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی اور فوراً کربلا کی طرف چل پڑی۔

ایک رات اس کو خواب میں سیدہ کوئین نظر آئیں۔ انہوں نے اسکو اپنے خوشنود ہونے کی بشارت دی۔ ملکہ جہاں خواب سے بیدار ہوئی تو محسوس ہوتا تھا کہ حسن آباد گلبگرہ کے بجائے سارے عالم کی حکومت مل گئی۔ اسی خواب میں سیدہ عالمیان نے یہ بھی کہا کہ تیرا بیٹا بے چینی سے تیرا منتظر ہے۔ ملکہ جہاں بی بی کے حکم پر جدہ کی سمت روانہ ہوئی اور ایک باعتبار آدمی کو دولت کثیر کے ساتھ روانہ کیا کہ روضہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب اور دوسرے تمام مزارات پر نذر چڑھائے اور باقی رقوم سادات میں تقسیم کر دے۔“ (۴۳)

سعادتمند بیٹے نے بڑی دھوم دھام سے ماں کا استقبال کیا۔ ماں نے تبرکات بیٹے کو دئے اور اہل بیت کی عقیدت میں دن گزارتی رہی۔ ۷۶۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ملکہ جہاں بڑی محب اہل بیت تھی مگر پتہ نہیں چلتا کہ وہ شیعہ ہوئی یا نہیں۔ اسکے اثر سے کتنے لوگوں نے حلقہ بگوش آل رسول ہونے کا شرف حاصل کیا لیکن استا ضرور ہوا کہ بہمنی سلطنت میں شیعوں کے ساتھ کوئی عصبیت برقی نہیں گئی۔

سلاطین بہمنی بلا کے تیغ زن دانشمند اور باہمت فرمانروا تھے اور یہ صفت سلطان محمد شاہ میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ اسکی عمر کا بڑا حصہ جنگ و جدل میں گزرا، ہندو حکمرانوں سے بڑے معرکے ہوئے۔ ان سب میں محمد شاہ سرخ رو رہا۔ ۷۷۶ھ میں فوت ہوا اور اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت پر بیٹھا۔



### سلطان مجاہد شاہ

لے اپنے نام کی مناسبت سے شجاع تھا اور تیر اندازی میں اسکو کمال حاصل تھا۔ شیر اس کا ایک تیر کھا کر گر جاتا تھا۔ بجا پور کے محاذ پر اس نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ تنہا فوجوں کے پرے الٹ دئے۔ وہ استا بہادر تھا کہ غنیم کے دل توڑ کر خود ان میں دراتا تھا مگر زبان کا تیز تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا اس لئے خود اسکے امراء میں بعض اسکے دشمن تھے۔ انہیں میں سے داؤد خان نے سوتے میں اس کا کام تمام کر دیا جو سلطان مجاہد شاہ کا چچا ہوتا تھا۔

### داؤد شاہ

ابن حسن بہمنی ۷۹۹ھ میں تخت نشین ہوا سلطان مجاہد شاہ کی بہن روح پرور آغا اسکو قاتل گردانتی تھی، اس نے ایک وفادار کے ذریعہ مسجد میں اسکو قتل کر دیا

### سلطان محمود شاہ

۷۸۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ وہ بہت علم دوست اور ادیب نواز تھا۔ اسکے عہد میں عراق و ہندوستان کے کتنے ہی علماء اور شاعر دکن پہنچے۔ اس نے ہمیشہ بزم کو رزم پر ترجیح دی اور امور خیر میں لگا رہا۔ ۲۲ رجب ۷۹۹ھ کو اس نے وفات پائی اسکی سلطنت وسیع اور مدت سلطنت تقریباً ۱۸ سال تھی۔ سلطنت بہمنی نے اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل کی۔

### سلطان غیاث الدین بہمنی

سلطان محمود شاہ کا بیٹا تھا اور بہت بدکردار آدمی تھا۔ وہ اپنے ایک امیر تغلیچ کی بیٹی پر عاشق تھا۔ پوین نے دعوت کے بہانے اسکو اپنے گھر بلا کر قتل کر دیا

### سلطان شمس الدین

ابن سلطان محمود شاہ پندرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور امور سلطنت اپنے ترکی غلام تغلیچ کے حوالے کر دئے جو بہت بدچلن اور قالم تھا۔ تنگ آکر امراء نے بھرے دربار میں اسر حملہ کیا۔ شمس الدین نے تہہ خانے میں جا کر پناہ لی پھر وہ یکہ معظمہ چلا گیا۔ تغلیچ گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔

### سلطان فیروز شاہ

پسر داؤد خان اسکے بعد تخت پر بیٹھا۔ اس نے سلطنت بہمنیہ کے وقار کو بلند کر دیا۔ ایک دن اس نے علماء و فضلا کو بلا کر استفسار کیا کہ مرد چار عورتوں سے زائد عقد کرنا چاہے تو کیا کرے؟ بعض علماء نے رائے دی کہ اگر چار عورتیں ہیں تو ایک کو طلاق طلاق کہہ کر کسی اور کو بصد شوق عقد میں لے آئے، بعض نے دوسری تدابیر بتائیں مگر کسی کی بات سلطان کی سمجھ میں نہ آئی۔ آخر اس نے میر فضل اللہ سے پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد سے خلافت اول تک متعہ رائج تھا۔ خلیفہ دوم نے اسکو بند کر دیا۔ مذہب امامیہ کے لوگوں میں اب تک مباح ہے۔ اگر سلطان اسکو سامنے رکھ کر متعہ کرے تو کر سکتا ہے لیکن عمائے اہل سنت کے نزدیک جائز نہیں حالانکہ مسلم، بخاری اور مشکوٰۃ سے ثابت ہے کہ دور رسالت میں متعہ ہوتا تھا۔ فیروز شاہ نے طریقہ امامیہ پر عمل کیا اور آٹھ سو عورتوں کو اپنے متعہ میں لایا۔

حلی محمد قندھاری کی روایت کے مطابق یہ بادشاہ بہت متشرع تھا۔ ربیع پارہ کلام پاک روز لکھتا تھا، عبادت سے جو وقت بچتا اسکو رعایا کا حال سننے میں گزارتا تھا۔ (۷۵)

یہ ہے صحیح تصویر کشی سلاطین بہمنی کے عقیدے کی، ظاہر بظاہر وہ سنی تھے لیکن حد درجہ محب اہل بیت، جہاں چاہتے وہاں شیعہ بناتے ان کے متعلقین اور اہل دربار میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی۔ ان کے مابین کوئی تفریق نہ تھی۔

سلطان فیروز شاہ بڑا جبری اور باہمت تھا۔ پوری زندگی چونتیس بار اس نے کافروں سے جنگ کی اور فتیاب ہوا۔ اس کا دربار علماء و فضلا سے بھرا رہتا اور کسی طرح دیار غزنی سے کم نہ تھا۔ ہندو زرگر کی بیٹی پر تھال اسی کے عہد میں گزری ہے جو اپنی خوشی سے مسلمان ہوئی اور سلطان فیروز شاہ کی بیوی بنائی گئی۔ دکن میں پہلے پہل ایک ہندو راجہ کی بیٹی فیروز شاہ کے عقد میں آئی۔ اس میں بھی سراپا جمال پر تھال کی مساعی کو دخل تھا۔

سلطان نے اپنے بیٹے حسن کو ولی عہد بنایا تھا لیکن اس کا بھائی خانناں احمد



خاں بھی اسکے بعد بادشاہت کا امیدوار تھا۔ اس نے منت مانی کہ اگر تخت اسکو مل گیا تو خانپور کا نام رسول آباد رکھے گا اور اسے سادات مکہ معظمہ و مدینہ منورہ اور نجف اشرف و کربلا معلی کیلئے وقف کر دے گا پھر احمد خان کا شاہی لشکر سے مقابلہ ہوا اور اسکو فتح و ظفر حاصل ہوئی۔ ۸۲۵ھ میں سلطان فیروز شاہ داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

### سلطان احمد شاہ

سید محمد گیسو دراز کے حلقہ ارادت میں شامل تھا۔ وہ ایک دیندار اور نجسہ اطوار فرمانروا تھا۔ علماء و مشائخ کی بڑی عزت کرتا تھا۔ شاہ نعمت اللہ ولی اسی کے دور میں گزرے ہیں۔ انہوں نے بھی کرمان سے احمد شاہ کو دعائیں کہلوائی تھیں اور غرقہ مرحمت کیا تھا اور احمد شاہ کی درخواست پر اپنے بیٹے نور اللہ کو دکن بھیجا تھا۔ احمد شاہ نے اسکے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ ۸۳۴ھ میں جب شاہ نعمت اللہ ولی جان بحق ہوئے تو ان کے بیٹے خلیل اللہ بھی دکن آئے تھے۔ سلطان احمد شاہ بڑا شجاع اور اقبال مند حکمران تھا۔ اس نے بڑی بڑی فتوحات کیں اور دائرہ سلطنت بہت وسیع کر لیا۔ ۸۳۸ھ میں اسکی وفات ہوئی۔

### سلطان علاء الدین

احمد شاہ کا بیٹا تھا، شجاعت و تدبیر میں اسلاف سے کم نہ تھا۔ اسکے خسر نصیر خان فاروقی نے احمد شاہ گجراتی کی مدد سے صوبہ برار پر قبضہ کی کوشش کی۔ ۸۴۷ھ میں دیو رائے یجاپور نے سلطنت بہمنیہ پر حملہ کیا اور کئی لڑائیوں کے بعد شکست کھائی۔ اسکے بعد سلطان نے قلاع سواحل دریا کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ خلف حسن بصری اس کا نامور سردار تھا۔ اس نے سرکہ نامی ایک کافر کے علاقے کو فتح کیا۔ وہ مکر کر کے مطیع ہو گیا پھر وہ اسکو قلعہ گندھانہ کی طرف لے گیا جس کا راجہ رائے سنگیر تھا۔ وہاں جانے کا ایک تنگ راستہ تھا۔ بعض دکنی امراء اور حبشی خلف حسن بصری سے جلتے تھے۔ وہ بہانہ کر کے الگ ہو گئے اور خلف حسن بصری بہادر رائے آگے بڑھتا چلا گیا۔

”سرکہ“ اسکو پہاڑی دروں میں لے جا کر غائب ہو گیا۔ خلف حسن بصری بیمار بھی تھا۔ ایک جگہ اقامت پذیر ہوا۔ ہوا بہت تیز تھی ایک طرف کی آواز دوسری

طرف نہ جاتی تھی۔ ایسے میں رائے سنگیر ایک جمعیت گنہگار کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا سرکہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ ان سب نے پانچ سو بنی حسن کو جن میں مدنی نجفی اور کر بلانی سید بھی شامل تھے، مع خلف حسن بصری کے قتل کر ڈالا۔

باقی بچ بچا کر دکنیوں کے پاس پہنچے جسکی سازش سے یہ قتل عام ہوا تھا دکنیوں نے چاہا کہ وہ منتشر ہو جائیں مگر وہ جاکنہ آگئے جو خلف حسن بصری کا مستقر تھا۔ اسپران دکنیوں نے بادشاہ کو لکھا کہ یہ لوگ سرکہ اور رائے سنگیر سے مل کر بغاوت پر آمادہ ہیں۔

مشیر الملک اور عماد الملک غوری دکنیوں کی سازش میں شریک تھے۔ انہوں نے خط پیش کر کے سلطان علاء الدین کو خوب بھرا اور اس نے انکی تادیب کا حکم دیدیا۔ ابوالقاسم فرشتہ کے الفاظ میں یہ لوگ عبید اللہ بن زیاد اور شمر ذی الجوشن کی طرح آل رسول سے عداوت رکھتے تھے۔ انہوں نے ان غریبوں کو اس طرح گھیرا کہ ان کا کوئی عریضہ بھی سلطان تک نہ پہنچنے دیا پھر اماں دینے کی قسمیں کھا کر قلعہ میں داخل ہو گئے اور سب کو کھانے پر بلا کر دغا کی۔ ایک ہزار سید، ایک ہزار مغل اور پانچ چھ ہزار معصوم بچے شہید ہوئے۔ مقتولین میں ایک سال کے بچے سے سو برس کے بوڑھے تک شامل تھے پھر ان سب کے گھر بار تک لوٹ لیے گئے اور عورتوں اور لڑکیوں کی بے حرمتی کی گئی۔

یہ تھا دکن میں سیرت بنی امیہ کا اختتام جس سے بہمنیوں کے روایتی اتحاد بین المسلمین پر ضرب کاری لگی۔

قاسم بیگ صف شکن قراخان گرد اور احمد بیگ یکہ تاز اپنے ساتھیوں سمیت سادات سے دور تھے، وہ بچ گئے اور انہیں جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے عورتوں کو مردانہ پوشاک پہنائی اور ایک فوج کی صورت میں احمد آباد بیدر کی طرف بڑھے اور مشیر الملک نے دو ہزار ان کے مقابلے پر بھیجے۔ داؤد خاں ان کا سردار تھا جو میدان جنگ میں تیر سے مارا گیا اور لشکر تتر بتر ہو گیا۔

پھر قاسم بیگ صف شکن نے تمام ماجرا سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیان کیا۔ سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ سادات کے جانوں کی تلانی تو وہ نہ کر سکتا



لیکن مالی نقصانات پورے کئے، مشر الملک اور عماد الملک کو گرفتار کر کے عبرتناک سزائیں دیں اور ان کے عیال کو نان شبینہ کا محتاج کر دیا۔ قاسم بیگ وغیرہ کو عہدہ ہائے جلیہ دئے گئے۔ اسی زمانے میں سلطان نے شرا بنوشی سے توبہ کی۔

۸۶۲ھ میں یہ منصف و عادل بادشاہ تینس سال دس ماہ حکومت کر کے فوت ہو گیا۔

### ہمایوں شاہ بہمنی

باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ سکندر خاں نے اس سے جنگ کی اور مارا گیا۔ پھر سلطنت بہمنیہ میں خانہ جنگی کی سی کیفیت شروع ہو گئی اور ہمایوں شاہ کے ہاتھوں اتنے مظالم ہوئے کہ وہ قالم مشہور ہو گیا۔ آخر ایک حبشی کنیز نے سوتے میں اسے قتل کر دیا۔

### نظام شاہ

ابن ہمایوں شاہ ۸۶۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ اسکی عمر ۸ سال تھی، ماں کی اتالیقی میں بادشاہ بنا۔ رائے اڑلیہ نے اسکو کسن دیکھ کر حملہ کیا مگر شکست کھائی پھر سلطان محمود خلجی سے معرکہ ہوا اس میں محمود غالب آیا بہمنی پر زوال آیا مگر بعض بہمنی سرداروں نے لشکر جمع کیا اور محمود کو شکست دی ادھر سے مطمئن ہو کر نظام شاہ نے رائے سنگیر اور دوسرے راجاؤں کو سزائیں دیں۔ ۸۶۷ھ میں ایک رات اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔

### سلطان محمد شاہ

نظام شاہ کا چھوٹا بھائی نو برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ بہمنی امراء ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ وہ آپس میں لڑ پڑے۔ محمود خلجی نے بھی دکن پر حملہ کیا۔ محمد شاہ نے اسکو پسپا کیا پھر کئی ہندو راجاؤں سے معرکے ہوئے ان میں بھی وہ کامیاب رہا۔ ان معرکوں میں نظام الملک حسن بحری نے بھی کارہائے نمایاں انجام دئے۔ فتح اللہ عماد الملک لشکر برار کا افسر مقرر ہوا اور یوسف عادل خاں دولت کا حاکم بنایا گیا۔ ۸۷۷ھ میں رائے ننگوان سے جنگ ہوئی اور اس کا ملک سلطنت بہمنیہ میں شامل کر لیا گیا۔ ۸۸۲ھ میں اس نے اڑلیہ فتح کیا۔ اسکے حدود سلطنت میں کافی اضافہ ہوا۔ ۸۸۷ھ میں بڑی شان و شوکت سے بیس سال حکومت کر کے اس کا انتقال ہو گیا۔

### سلطان محمود شاہ

بارہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا اسکے عہد میں امراء کی باہم دشمنی بڑھ گئی۔ مختلف صوبوں کے حاکموں میں خود مختاری کا رجحان پیدا ہو گیا۔ یوسف عادل خان اور ملک احمد نظام الملک نے اپنے اپنے لشکروں میں اضافہ کر لیا پھر بھی سلطان محمود شاہ کے مقابلے پر آنے کی کسی نے ہمت نہیں کی اور تعلقات برقرار رکھے۔

سلطان محمود ایک باصلاحیت حکمران تھا۔ اس نے مختلف جنگوں میں فتوحات حاصل کیں لیکن صوبائی طاقتوں پر وہ قابو نہ پاسکا۔ ۹۲۳ھ میں سیستیں سال حکومت کر کے اس کا انتقال ہو گیا۔

### احمد شاہ

باپ کی جگہ قلعہ احمد آباد بیدر میں بادشاہ ہوا لیکن امیر برید نے اسکو قلعہ میں محدود رکھا اور قطب الملک ہمدانی نے باغیانہ انداز اختیار کر لیا۔ احمد شاہ نے تحصیل عادل خاں سے شکایت کی مگر قبل اسکے کہ وہ کوئی مدد کرے احمد شاہ ۹۲۷ھ میں وفات پا گیا۔

### علاء الدین شاہ

تخت نشین ہوتے ہی امیر برید سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر کرنے لگا اور اسکے قتل کا منصوبہ بنایا مگر امیر برید کو عین وقت پر خبر ہو گئی اور اس نے علاء الدین کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا پھر اسکو ہلاک کرادیا۔

### ولی اللہ شاہ

اسکو امیر برید نے برائے نام بادشاہ بنایا۔ تین برس تک وہ حرم سرا میں قید رہا پھر قتل کرادیا گیا۔

### کلیم اللہ شاہ

اپنے بھائی کے بعد تخت پر بٹھایا گیا وہ بھاگ کر پہلے یجا پور گیا وہاں اسماعیل عادل شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہو جانے کا خطرہ ہوا تو احمد نگر آ گیا۔ برہان نظام شاہ بحری نے عرت کے ساتھ ٹھہرایا۔ وہاں اس کا انتقال ہو گیا اور اسکے ساتھ ہی سلطنت بہمنیہ کا چراغ گل ہو گیا اور اسکی جگہ دکن میں پانچ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ عادل شاہیہ، نظام شاہیہ، عماد شاہیہ برید شاہیہ اور قطب شاہیہ۔



### سلطنت عادل شاہیہ

یوسف شاہ آل عثمان کا شاہزادہ اور سلطان محمد کا چھوٹا بھائی تھا جب سلطان محمد اسکے قتل کا درپے ہوا تو ماں نے اسکے ہم شکل ایک غلام کو شاہزادہ بنا کر قتل کرادیا اور یوسف ایک تاجر عماد الدین محمود گرجستانی کے ساتھ ایران آگیا۔ تاجر شیعہ عقیدے کا تھا۔ اردبیل میں شاہ صفی کے مزار پر خمس کی رقوم دے کر وہ ہندوستان آیا پھر احمد آباد بیدر پہنچا۔

یوسف صورت میں واقعی یوسف جمال تھا۔ وہ نظام بہمنی کے ہاتھوں فروخت ہوا اور سلطان محمد شاہ کے عہد میں اس کا شمار امراء میں ہونے لگا۔ چونکہ وہ خود ترک تھا لہذا نظام الملک ترک سے اسکے تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ اسی کی سفارش سے یوسف کو عادل خاں خطاب ملا اور وہ اسکے ساتھ برار چلا گیا۔

نظام الملک نے جب قلعہ کھر کہ کا محاصرہ کیا اور سال بھر بعد اسکو فتح کر کے اندر داخل ہوا تو ایک راجپوت نے عقب سے وار کر کے اسکو قتل کر دیا۔ یوسف عادل خاں نے اس موقع پر بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ تھوڑے سے ہاتھیوں کو لے کر اتنے شدید حملے کیے کہ راجپوت بدحواس ہو کر بھاگنے لگے۔ یوسف عادل نے ایک بڑی تعداد کو گرفتار کر لیا اور تسلط حاصل کر کے مال غنیمت اور ہاتھی بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیے جسپر اسکے درجات بلند ہوئے اور حاکم بجاپور کی حیثیت سے وہ امرائے عظیم میں گنا جانے لگا۔

سلطان محمود شاہ کے انتقال کے بعد ۸۹۶ھ میں اس نے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا اور جن قلعوں پر بہمنی امراء قابض تھے انکو بزور شمشیر واپس لیا۔ احمد آباد بیدر کے بہت سے امراء اسکی پناہ میں آ گئے اور اس کا دائرہ سلطنت وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔

امیر قاسم برید اس سے بہت جلتا تھا۔ اسکی شان و شکوت پر حسد میں جل بھن کر کباب ہو گیا۔ اس نے رائے ہم راج اور بہادر شاہ گیلانی کو اسکے خلاف ابھارا اور ہم راج نے رانچور اور مدگل پر قبضہ کر لیا اور بہادر گیلانی قلعہ جام کھنڈی پر

متصرف ہو گیا۔ یوسف عادل نے مصیبت وقت سمجھ کر ہم راج سے صلح کر لی اور بہادر گیلانی کو نظر انداز کر کے قاسم برید پر حملہ آور ہو گیا۔

قاسم برید ملک احمد نظام الملک بحری اور خواجہ جہاں سے مدد لے کر قلعہ بیدر سے نکلا۔ سلطان محمود شاہ بھی ساتھ تھا۔ نظام الملک بحری سے مقابلہ ہوا پھر صلح ہو گئی۔ یوسف عادل شاہ نے واپس ہو کر بہادر گیلانی سے بھی تعلقات استوار کر لیے اور دونوں طرف سے مطمئن ہو کر رانچور کا عازم ہوا اس عرصے میں اطلاع ملی کہ ہیراج خود دریا عبور کر کے اس طرف کو بڑھ رہا ہے۔ یوسف عادل شاہ ائمہ معصومین کے نام لے کر آگے بڑھا۔

آٹھ ہزار سوار دو اسپہ اور سہ اسپہ دو سو ہاتھی اسکے ساتھ تھے۔ بارہ روز تک فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں۔ رجب ۸۹۸ھ میں صفیں آراستہ ہوئیں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو پانسو بہادر یوسف عادل شاہ کے شہید ہو گئے آخر یوسف عادل شاہ اپنے بھائی غصنفر آغا کو لے کر حملہ آور ہوا۔ ہیراج کا لشکر اپنی فتح کو یقینی سمجھ کر لوٹ مار میں لگ گیا تھا۔ یوسف عادل شاہ کے سواروں نے اتنی زبردست یلغار کی کہ اس کے پرے الٹ گئے اور قلب فوج تہہ و بالا ہو گیا۔ غضب کارن پڑا۔ ہیراج کے لشکر میں بھگدڑ پڑ گئی، خود ہیراج نے بھی میدان چھوڑ کر بیجا نگر کا رخ کیا۔ اچانک ایک تیرا کر لگا اور وہ رستے ہی میں فی النار ہو گیا۔

یوسف عادل شاہ نے رانچور اور مدگل کو مسخر کر کے بعض معتمدوں کے سپرد کیا اور خود بیجا نگر کی طرف قدم زن ہوا اور اسپر اپنا پرچم ہرا کر بعض تحائف سلطان محمود شاہ کی خدمت میں بھی روانہ کیے پھر وہ اپنے مرکز بجاپور کی طرف واپس ہو گیا اور تیراج بیجا نگر کا حکمراں بن گیا۔

اس اثناء میں بہادر گیلانی نے حجاج کے بعض جہاز لوٹ لیے اور سلطان نمور

شاہ اس سے ناراض ہو گیا۔ اس نے یوسف عادل شاہ سے مدد طلب کی۔ شاہ یوسف بہادر گیلانی کا دشمن تھا ہی، اس نے فوراً پانچ ہزار سواروں کی کمک بھیج دی۔ بہادر گیلانی ننگواں کی طرف فرار ہو گیا۔ سلطان محمود شاہ نے قلعہ کھنڈی یوسف عادل شاہ کے سپہ سالار کے حوالے کر دیا۔ بہادر گیلانی ایک مقام



سے دوسرے مقام کی طرف بھاگتا رہا۔ آخر شاہ نے اسکو جالیا اور وہ ایک معمولی جنگ کے بعد مارا گیا۔

اسکے بعد سلطان محمود شاہ یوسف عادل شاہ کی درخواست پر بیجاپور گیا جہاں اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال ہوا اور پیش قیمت نذرانے پیش ہوئے پھر سلطان محمود شاہ بیدردانہ ہو گیا۔

۹۸۱ھ میں "دستور دینار" کو حسن اباد گلبرگہ کی خود مختار حکومت کی ہوس ہوئی۔ نظام الملک بحری نے اس سے پشت پناہی کا وعدہ کر لیا اور اس نے سکھ و خطبہ اپنے نام کا جاری کر دیا۔ اس پر سلطان محمود شاہ نے پھر یوسف عادل شاہ سے مدد مانگی یوسف عادل شاہ نے غصنفر آغا کو روانہ کر دیا۔

اسی دوران خبر ملی کہ ملک احمد نظام الملک بحری نے خواجہ جہاں دکنی کو مقدمہ لشکر کے طور پر بھیجا ہے اور عقب میں خود بھی آ رہا ہے۔ یہ سنتے ہی یوسف عادل شاہ خود بھی روانہ ہوا اور غصنفر آغا سے جا کر مل گیا۔

قاسم برید ترک کا مقابلہ "دستور دینار" سے ہوا اور "دستور دینار" شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ قاسم برید اسکو قتل کر دینا چاہتا تھا مگر یوسف عادل شاہ کی سفارش سے وہ چھوڑ دیا گیا اور گلبرگہ بھی اسکے لئے بحال کر دیا گیا۔

یوسف عادل شاہ اور نظام الملک بحری بھی اپنے اپنے لشکروں کو لے کر واپس ہو گئے۔

۹۰۲ھ میں شاہ محمود بہمنی نے اپنے بیٹے احمد کا رشتہ بی بی سستی دختر یوسف سے مانگا اور گلبرگہ کے پرگنے اسکو عطا کر دئے۔ اس پر "دستور دینار" قاسم برید کی پناہ میں چلا گیا۔ یوسف عادل شاہ نے قطب الملک ہمدانی کو ساتھ لیکر پیش قدمی کی مگر بحری "دستور دینار" کی مدد کو پہنچ گیا تھا اس لئے مصلحتاً ارادہ ملتوی کر دیا اور ملک احمد نظام الملک بحری سے صلح کر کے توسیع مملکت میں لگ گیا۔

دستور دینار نے ان حالات میں امیر برید کو لکھا کہ "سنت سنہ پدر" پر عمل کر کے میری معاونت فرمائے۔ "امیر برید" نے تین ہزار سوار اسکی مدد کیلئے بھیج دیے۔

خواجہ جہاں دکنی بھی استقرار مملکت کا خواہان تھا۔ وہ بھی اپنی فوجیں لے کر دستور دینار سے جا ملا۔

یوسف عادل شاہ نے بھی اپنے بھائی غصنفر آغا کو مقدمہ لشکر بنا کر روانہ کیا غصنفر آغا سے دستور دینار کے ہراول کا مقابلہ ہوا اور اس نے شکست کھائی پھر خود دستور دینار سے غصنفر آغا کا تصادم ہوا۔ بڑی ہولناک جنگ ہوئی۔ دستور دینار مارا گیا مگر غصنفر آغا کی پیشانی پر بھی ایک تیر لگا تھا۔ وہ فتح و ظفر کے پرچم اڑاتا ہوا یوسف عادل شاہ تک تو پہنچ گیا مگر سامنے پہنچتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

اس عظیم فتح کے بعد یوسف عادل شاہ نے خطبہ دوازده امام جاری کیا جو سرزمین ہند پر ائمہ برحق کا پہلا خطبہ تھا۔ اسکے ساتھ ہی یوسف عادل شاہ نے تشیع کو رواج دینے پر توجہ کی مگر سنیوں کو علی الاعلان اپنے مسلک پر برقرار رہنے کا مجاز کیا

اس پر ملک احمد نظام الملک بحری اور امیر برید وغیرہ بہت برہم ہوئے اور ان سب کا متحدہ لشکر سلطان محمود بہمنی کی سرکردگی میں یوسف عادل شاہ کے ملک میں داخل ہو گیا۔ یوسف عادل شاہ نے اہل و عیال کو بیجاپور میں محفوظ کیا۔ دریا خاں اور فخر الملک ترک کو گلبرگہ کی طرف روانہ کیا اور خود بحری مملکت کو تاراج کرنا شروع کر دیا۔ نظام الملک نے اس کا تعاقب کیا مگر یوسف عادل شاہ غارت گری کرتا ہوا بڑھتا رہا پھر ولایت برار میں داخل ہو گیا۔

اس موقع پر فتح اللہ عماد الملک نے مشورہ دیا کہ خطبہ ائمہ اثنا عشر موقوف کرویں تاکہ مذہب کے نام کی متحدہ جنگ بند ہو جائے۔ یوسف عادل شاہ نے ایسا ہی کیا پھر عماد الملک نے نظام الملک بحری کو لکھا کہ امیر برید مذہب کے نام پر بیجاپور پر قبضہ کرنا چاہتا ہے جبکہ یوسف عادل شاہ نے رخصت سے توبہ کر لی ہے۔ نظام الملک اور قطب الملک اس مشورے پر رات ہی رات وہاں سے کوچ کر گئے۔ امیر برید نے ان کے چلے جانے پر فتح اللہ عماد الملک سے مدد مانگی۔ اس نے امیر برید کو لیت و لعل میں رکھ کر یوسف عادل شاہ کو حالات سے مطلع کر دیا۔ یوسف عادل شاہ فوراً اپنا لشکر لے کر عماد الملک سے آملا اور دونوں احمد آباد بیدر کی طرف بڑھنے لگے۔

شاہی لشکر مقابلے کی تاب کیا لاتا۔ یوسف عادل شاہ نے اسکو پراگندہ کر دیا



اور یجپور واپس ہو گیا۔ جہاں پہلے کی طرح پھر آئمہ برحق کا خطبہ جاری ہو گیا۔  
 ۹۱۵ھ میں نصرا لے بندر کو وہ قلعہ "ما اتفق" پر حملہ آور ہوئے اور بے شمار مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔ یوسف عادل شاہ خبر پا کر خود روانہ ہوا اور قلعہ کو وہ پر حملہ کر کے ان گنت عیسائی قتل کر دئے۔ بمشکل ٹھوڑے سے لوگ کشتیوں پر بھاگ سکے۔

۹۱۶ھ میں بائیس سال دو ماہ حکومت کر کے اس عظیم بادشاہ کا انتقال ہو گیا حسب وصیت اسکو مزار شیخ چندا کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ شیخ چندا کی اولاد دکن میں بکثرت ہے جن میں شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ چندا خود عقیدۂ شیعہ تھے لیکن ان کے حلقۂ ارادت میں شیعہ و سنی دونوں شامل تھے۔ وہی سلسلہ اب تک چلا آ رہا ہے۔

یوسف عادل شاہ سلطنت عادل شاہیہ کا بانی اور معمار تھا مرد سخی و شجاع بلند اقبال، عادل و حکیم ماہر خط نستعلیق و علم موسیقی و عروض قدردان علم و فن بلند پایہ شاعر باکمال طنزورہ نواز، یجپور کو اس نے ماہرین علم و فن سے آباد کر دیا تھا۔

### اسمعیل عادل شاہ

یہ بادشاہ ابھی پوری طرح بالغ نہ ہوا تھا کہ اسکو عنان سلطنت سنبھالنا پڑی دریا خاں، فخر الملک مرزا جہانگیر، حیدر بیگ اور کمال خاں امرائے کبار میں تھے جن میں بزرگ تر ہونے کے باعث کمال خاں کی بڑی منزلت تھی۔ اس نے کچھ دنوں بعد خطبہ آئمہ بند کر کے خلفائے راشدین کا خطبہ رائج کر دیا اور شیعوں کے طور طریقے پر پابندی لگادی۔

امور سلطنت میں بھی مطلق العنانی کو دخل دیا۔ ایک سال بعد فخر الملک اور دریا خان نے وفات پائی تو انکی جاگیریں اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیں، مرزا حیدر بیگ اور جہانگیر مرزا کی جائیدادوں سے بھی بعض پر گئے نکال کر اپنے اعزاء و اقرباء کو دے دیئے۔ اس طرح اپنی قوت میں اضافہ کر کے شاہی کا خواب دیکھنے لگا اور اسکے لئے امیر قاسم برید سے استعانت کا طلب گار ہوا دونوں کے مابین ایک منصوبہ بنا اور قاسم برید نے سلطان محمود شاہ کو محبوس کیا اور قلعہ گلبرگہ کی طرف چل پڑا۔ کمال

خاں نے اسمعیل شاہ کو مع اسکی والدہ کے قلعہ ارک یجپور میں قید کر کے شولا پور کی طرف روانہ ہوا اور بہت سے قصبات پر قبضہ کر کے حکام عادل شاہی کو نکال دیا اور یجپور واپس آکر اسمعیل عادل کو شاہ قید خانے سے بلا کر رعایا کو دکھایا اور اسکے ساتھ مغل امراء کو معزول کر دیا۔

صفر ۹۲۹ھ میں وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر نیوالا تھا کہ بعض نجومیوں نے حکم لگایا کہ پندرہ دن اسپر سخت ہیں لہذا وہ قلعہ ارک کو محفوظ جان کر اس میں مقیم ہو گیا۔ اس دوران اسمعیل کی ماں پونجی خاتون نے یوسف ترک کو کا کو کمال دکنی کے قتل پر مامور کیا اور اسکو ایک ضعیف خاتون کے ساتھ کمال خاں کی عیادت کو بھیج دیا جو درد سر کا بہانہ کر کے قلعہ ارک میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ضعیفہ نے کمال خاں کی عیادت کی اور حج پر جانے کی اجازت لی پھر یوسف ترک کو ساتھ لے جانے کی درخواست بھی کی۔ اس نے یوسف ترک کو قریب بلا کر بیڑا پان کا اپنے ہاتھوں سے اسکو دیا۔ یوسف نے موقع پاتے ہی خنجر اسکے سینے میں گھونپ دیا جو پیٹھ کے اس پار اتر گیا۔ نتیجے میں ضعیفہ اور یوسف ترک کو اسی وقت مار دیا گیا۔

کمال خاں مرچکا تھا لیکن اسکے لوگوں نے لے جا کر اسکو تخت پر سہارا لگا کر بٹھا دیا اور اسمعیل عادل شاہ کو قتل کرنے کیلئے آدمی روانہ کر دئے پونجی خاتون نے اسکی بھینک پاتے ہی پہریداروں کو لٹکارا کہ تمہارے ہوتے ہوئے اسمعیل قتل کر دیا جائے! کیا ہو گیا ہے تمہاری حمیت کو! چنانچہ دوسو پچاس سپاہی اور سترہ حبشی سینیہ سر ہو گئے۔ پونجی خاتون اور دلشاد آغانے بھی مردانہ لباس پہنا اور تیر و کمان ہاتھ میں لے کر شاہزادے کے ساتھ محل کی پشت بام پر پہنچیں۔ اس وقفے میں صفدر خاں اپنی جمعیت لے کر پہنچا تو اسپر تیروں کی بارش ہوئی۔ شور و غل کی آواز پر مصطفیٰ آغا برج کے پچاس محافظوں کو لے کر آگیا۔ اسکے پاس بندوقیں بھی تھیں اس نے فائر شروع کر دئے۔

صفدر خان نے بڑی توپیں طلب کر لیں۔ مغل اس موقع پر مکر کر کے چھپ گئے۔ صفدر خان میدان خالی پا کر آگے بڑھ آیا اور بندوقیوں نے اسکو بھون ڈالا اور تیروں سے سیکڑوں آدمیوں کو پھلنی کر دیا۔ چونچ سکے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔



اب یہ گروہ فاتحانہ کمال خاں اور صفدر خاں کے سر لیے ہوئے آگے بڑھا۔ اسکے بعد غداروں کے حمایتی بھاگنے لگے۔ دوسرے دن سلطان اسماعیل عادل شاہ نے دربار عام کیا۔ خوش کلیدی آقا، سکندر آقائے رومی، مصطفیٰ آقا، مقرب خاں، مظفر خاں رودباری، خواجہ غیاث الدین کاشی اور محمد حسین طہرانی اور باونا مخلوں اور جتشیوں کو عہدے اور انعامات دے کر نوازا گیا۔

سلطان محمود شاہ بہمنی اور امیر برید اس خبر پر لشکر کش ہوئے۔ سلطان اسماعیل عادل شاہ نے گھنٹوں کی جنگ میں پچیس ہزار سواروں کو شکست دیدی پھر اپنے تمام علاقے واپس لیے

۹۳۰ھ میں امیر قاسم برید ترک نے برہان نظام شاہ بھری، سلطان قلی شاہ اور علاء الدین عماد شاہ کی مدد سے ایک بڑا لشکر ترتیب دیا۔ اسماعیل عادل شاہ نے راستے میں کوئی مدافعت نہ کی۔ جب وہ بیجاپور کے قریب پہنچ گئے تو بارہ ہزار منتخب سواروں کو لیکر نکلا اور ان پر بلائے بے درباں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سلطان محمود شاہ اور اس کا بیٹا دونوں گرفتار ہوئے۔ اسماعیل عادل شاہ نے انکو عرت و احترام سے رکھا پھر انکی خواہش پر اپنی بہن بی بی سستی کی رخصتی بھی کر دی۔

سلطان محمود شاہ بہمنی جب پانچ ہزار عادل شاہی سواروں کے ساتھ احمد آباد بیدر پہنچا تو امیر برید اپنی جاگیر کی طرف چلا گیا پھر موقع پا کر واپس آگیا اور سلطان محمود شاہ پہلے کی طرح پھر اس کا قیدی بن گیا۔

اس عرصے میں شاہ اسماعیل صفوی کے سفیر دکن کے ملکوں میں وارد ہوئے ایک ایلچی بہمنی سلطنت کے پاس بھی پہنچا جسکو امیر برید نے دو سال تک واپس نہ ہونے دیا پھر اسماعیل عادل شاہ کی مداخلت پر رخصت کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دکن کے سلاطین فوجی طاقتوں میں اضافہ کر رہے تھے مگر ان میں سے کوئی یوسف عادل شاہ کے بیٹے کے ہمسرنہ تھا۔ اسماعیل عادل شاہ کی فوج پچاس ہزار سوار اور تین لاکھ پیادوں پر مشتمل تھی لیکن اسکے دشمنوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔ تیسراج نے گردنواح کے تمام راجاؤں کو اپنے پرچم تلے جمع کر لیا تھا

لہذا اسماعیل عادل شاہ سات ہزار سواران تاجپوش کے ہمراہ اسکی طرف روانہ ہوا۔ دریائے پنج میں حائل تھا۔ اسماعیل شاہ نے ہاتھی آگے بڑھا کر دریا میں ڈال دیا اور اس پار پہنچ گیا۔ اس دوران لشکر غنیم نمودار ہوا۔ سلطان اسماعیل کی جمعیت صرف دس ہزار تھی اور فوج کفار میں تیس ہزار سوار اور کم و بیش دولاکھ پیادے تھے مخلوں نے شاہ اسماعیل کے اشارے پر بھرپور ہلہ بولا اور پہلے ہی حملے میں سپہ سالار کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن مقابلہ توپ اور بندوق سے پڑا تو کوئی ڈیڑھ ہزار مسلمان درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ باقیوں کی ہمت ہار گئی اور وہ مع گھوڑوں کے دریا میں کود پڑے۔ اسماعیل عادل شاہ سات جوانان تاج پوش کے ساتھ دوسرے کنارے پر پہنچ سکا اور اسد خاں لاری کے مشورے پر بیجاپور آگیا۔

پھر اس نے برہان نظام شاہ بھری سے تعلقات استوار کیے اور اپنی بہن کا عقد اسکے ساتھ کر دیا لیکن اس کا الٹا اثر ہوا۔ برہان نظام شاہ نے مملکت میں اپنی بہن کا حق طلب کیا اور دونوں میں نا اتفاقی ہو گئی۔ علاء الدین عماد شاہ والی برار اسکے ساتھ تھا اور امیر برید کی کمک آنے ہی والی تھی۔ اس نے قلعہ شوالا پور کا محاصرہ کر لیا۔ اسماعیل عادل شاہ نے دس ہزار کاداروں کے ساتھ چالیس ہزار سواروں کا مقابلہ کیا

امیر برید کی کمک برہان نظام شاہ کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے اکتالیسویں دن فوجیں میدان میں پہنچا دیں۔ پہلے اسد خاں لاری نے علاء الدین عماد شاہ کی صفوں کو درہم برہم کیا پھر ترسون بہادر نے امیر برید پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ برہان نظام شاہ بھری کو خوش کلیدی آقا اور مصطفیٰ آقا نے گھیرے میں لے لیا۔ وہ بھی تاب جنگ نہ لایا۔ چالیس ہاتھی اور توپخانہ اسماعیل عادل شاہ کے ہاتھ آیا۔

۹۳۳ھ میں برہان نظام شاہ بھری اور عماد شاہ میں جنگ ہوئی جس میں بھری کامیاب رہا پھر پچھلی شکست کا بدلہ لینے کیلئے اس نے بیجاپور کا رخ کیا۔ اسماعیل عادل نے پھر اسکو شکست دی اور خواجہ جہاں وغیرہ کو گرفتار کر لیا۔

۹۳۴ھ میں اسماعیل عادل شاہ نے اپنی چھوٹی بہن عماد شاہ والی برار کو بیاب دی۔ اس اثنا میں بہادر شاہ گجراتی سے برہان نظام شاہ کی جنگ ہوئی۔ اسماعیل عادل شاہ نے پچھلی مناقشت کو بھول کر اسکی مدد کی اور اسکو کامیاب کرایا۔ امیر قاسم



برید نے اسکی فوج کے افسروں کو اسماعیل عادل شاہ کی مخالفت پر ابھارنے کی کوشش کی تو وہ بہت مشتعل ہوا اور دس ہزار سوار لے کر احمد آباد بیدر کی طرف چل پڑا۔ امیر قاسم برید قلعہ سے نکل گیا اور اپنے بیٹے علی برید کو نظم و نسق سونپ گیا۔

علی برید کے دو ماموں اپنے کو رسم زماں گردانتے تھے۔ انہوں نے میدان میں مبارز طلبی کی اور اسماعیل عادل شاہ کو مقابلے پر آنے کی دعوت دی وہ انکی لٹکار کو برداشت نہ کر سکا، گھوڑا اڑا کر سامنے آگیا اور چشم زدن میں دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس درمیان ایک طرف سے قلی قطب شاہ کی فوج ظاہر ہوئی۔ اسد خاں لاری بڑھ کر اس سے مقابل ہوا اور اسکے پروں میں رخنے ڈال دئے پھر اسکے ایک بھرپور حملے میں دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ امیر قاسم برید نے عماد شاہ کو درمیان میں ڈال کر صلح کی درخواست کی۔ اس بہانے غافل کر کے وہ اسپر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر الٹا اسد خاں لاری کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اس نے قلعہ احمد آباد بیدر اسماعیل عادل شاہ کے حوالے کر دیا۔

اسی زمانے میں تیمراج کا انتقال ہو گیا اور اسکے بیٹوں میں تخت و تاج کیلئے جھگڑا شروع ہو گیا۔ اسماعیل عادل شاہ نے وقت سے فائدہ اٹھا کر پہلے راجپور اور مدگل کے قلعے مسخر کیے پھر سترہ سال کے بعد مجلس شراب منعقد کی۔ تیمراج کے ہاتھوں ہزیمت یاب ہونے کے بعد سے اس نے شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اس بزم میں عماد الملک کے ساتھ امیر برید کو بھی شریک کیا گیا۔

پھر یجپور واپس پہنچ کر احمد آباد بیدر امیر برید کو واپس کر دیا مگر اس شرط پر کہ کلیان و قندھارا کے قلعے وہ یجپور کو دیدے گا مگر اس نے ان قلعوں کی چابیاں بھیجنے کے بجائے برہان نظام شاہ بھری سے مدد کی درخواست کر دی۔ اسماعیل عادل شاہ نے بہت کوشش کی کہ برہان بھری بچ نہ آئے مگر وہ نہیں مانا اور اسماعیل عادل سو سوار مغل اور چالیس پیادے لے کر دریا عبور کر گیا۔ باقی لشکر بعد میں آیا جس میں بارہ ہزار سوار شامل تھے۔

برہان نظام الملک بھری ایک بڑا توپخانہ اور پچیس ہزار سوار لے کر آیا تھا۔

لشکر جب ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئے تو تلواروں کے ٹکراؤ کے ساتھ سروں پر سرکٹ کٹ کر گرنے لگے۔ گھمسان کارن پڑا خورشید خان نظام شاہی قتل ہوا اور برہان نظام شاہ باحال پریشاں احمد نگر پہنچ سکا۔ اسکے بعد ان دونوں میں کبھی جنگ نہیں ہوئی بلکہ قلی قطب شاہ برہان نظام بھری اور اسماعیل عادل شاہ کے درمیان سرحدوں کا سمجھوتہ ہو گیا۔

۹۴۰ھ میں اسماعیل عادل شاہ، امیر قاسم برید کے اتحاد سے قلعہ نل کنڈہ کی طرف روانہ ہوا۔ قلعہ فتح ہو نیوالا تھا کہ اسماعیل عادل شاہ بیمار ہو گیا اور قلعہ گلبرگہ کا عازم ہوا اور ۱۶ صفر ۹۴۱ھ میں خالق حقیقی سے جا ملا۔ اسماعیل عادل شاہ باہمت، شجاع، سخی اور سنجیدہ مزاج فرمانروا تھا۔

### ملو عادل شاہ

بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے باپ کا جانشین بنایا گیا مگر وہ شراب و شباب میں غرق ہو گیا اور نظم سلطنت میں ابتری پیدا ہونے لگی لہذا امراء نے باہم صلح و مشورہ کر کے چھ ماہ بعد اسکو معزول کر دیا اور اسکے چھوٹے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا۔

### ابراہیم عادل شاہ

بشرے سے وہ یوسف عادل شاہ کا جانشین معلوم ہوتا تھا مگر اس کا اتالیق حنفی المسک تھا جو شروع ہی سے اسکے ذہن میں امام ابو حنیفہ کی عظمت کے نقش بٹھاتا رہا تھا لہذا تخت پر بیٹھتے ہی اس نے سنی ہونے کا اعلان کر دیا اور شیعوں میں سے جو لوگ اسکی نظر میں کھینکتے تھے انکو موقوف کر دیا۔

اس موقع سے رام راج والی یجنا نگر نے فائدہ اٹھایا اور جن امیروں اور سپاہیوں کو اس نے برطرف کیا تھا، ان سب کو اپنے زمرہ ملازمت میں شامل کر لیا۔ اسد خاں لاری نے ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے اسپر پور ش کی اور کامیاب ہوا پھر مصلحت اندیشی کے تحت اس سے صلح کر لی۔ کچھ دنوں بعد ابراہیم عادل شاہ مذہبی اختلاف کی بنا پر اسد خاں لاری سے بدظن ہو گیا اور اسکی گرفتاری کیلئے یوسف شخہ کو متعین کیا۔ وہ ایک بڑی فوج لیکر گیا لیکن اسد خاں کا مقابلہ کیا کرتا بری طرح شکست یاب ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اسکی ذمہ داری خود یوسف شخہ پر ڈال



دی۔ اسد خاں ابراہیم شاہ کی نیت سے واقف ہو گیا تھا۔ اس نے اس معاملہ سے درگزر کیا لیکن ابراہیم شاہ کی طرف سے چوکنارہ بنے لگا۔

برہان نظام شاہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور امیر قاسم برید کی مدد سے ۹۴۷ھ میں ایک بڑی فوج کے ساتھ احمد نگر سے روانہ ہوا اسد خاں لاری بھی اس سے آملا عماد شاہ والی برار نے اسد خاں سے ابراہیم شاہ کی صفائی کرا دی اور ابراہیم نے قوی پشت ہو کر برہان شاہ کو شکست دیدی اور برہان نظام شاہ کو تادان کے طور پر پانچ پرگنے دینا پڑے جسکو وہ بھول نہ سکا۔

اس نے کوشش کر کے والی بیجا نگر رام راج اور جمشید قلی قطب شاہ کو ہموار کر کے مدد حاصل کی۔ اس درمیان امیر قاسم برید فوت ہو چکا تھا اور علی برید اس کا جانشین ہوا تھا۔ برہان نظام شاہ نے اسکو بھی اپنے اتحاد میں شامل کیا اور ان سب نے چار طرف سے مملکت یجا پور پر یلغار کر دی۔ ابراہیم عادل شاہ نے دباؤ پڑنے پر برہان نظام شاہ کے پرگنے اسکو واپس کر دئے اور دوسروں سے صلح کی بات چیت کرنے لگا۔

اسد خاں لاری خود جمشید قلی خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ عین جنگ میں ایک تیر جمشید قلی کے چہرے پر لگا اور اسد خاں مظفر و منصور واپس ہو گیا۔

۹۵۱ھ میں برہان نظام شاہ نے پھر گلبرگہ پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ پھر دوبار ابراہیم عادل شاہ کی برہان نظام شاہ سے لڑائیاں ہوئیں اور ہر بار اس نے بری طرح شکست کھائی جس کا غصہ وہ مقربین پر اتارنے لگا اور ان کو بلا خطا قتل کرانے لگا۔ پھر وہ اسد خاں لاری سے بدگمان ہوا۔ دونوں میں گفت و شنید ہو رہی تھی کہ اسد خاں بیمار ہو کر مر گیا۔

پھر برہان نظام شاہ نے علی برید کے قلعہ کلیان پر لشکر کشی کی۔ ابراہیم عادل شاہ مدد کیلئے آیا تو اسکو بری طرح شکست ہوئی۔ اس نے میدان سے فرار ہو کر نظام شاہی ملک پر غارت گری کی۔ ادھر برہان نظام شاہ نے قلعہ پرندہ فتح کر لیا۔

۹۵۹ھ میں برہان نظام شاہ کی تحریک پر رام راج نے رانچو اور مدگل کے قلعے فتح کیے اور شوالاپور پر برہان نظام نے قبضہ کیا۔ اسکے بعد برہان نظام شاہ کا انتقال ہو گیا اور

حسین نظام تخت نشین ہوا۔ اس سے ابراہیم عادل شاہ کی صلح ہو گئی لیکن جلد ہی یہ دوستی دشمنی میں بدل گئی۔ دونوں میں سخت جنگ ہوئی ایسی جنگ کہ دکن میں کم ہی ہوئی ہوگی۔ اس میں ابراہیم عادل شاہ کو شکست ہوئی۔ وہ اپنے وفادار سپہ سالار سیف عین الملک سے بدظن ہو گیا۔ اسکو پکڑنے کیلئے اس نے دلاور خاں کو بھیجا جب وہ منہزم ہوا تو خود روانہ ہوا اور سیف عین الملک کے معرکے میں اس طرح شکست کھائی کہ یجا پور پہنچ کر دم لیا۔

سیف عین الملک یجا پور کے قریب پہنچا تو ابراہیم عادل شاہ نے رام راج سے مدد طلب کی۔ سیف عین الملک نے یجا پور کے لشکر پر شیخوں مارا تو دھوکا کھایا۔ وہ سب اسے انتظار میں تھے۔ سیف عین الملک کے بکثرت آدمی قتل ہو گئے۔ وہ بچ بچا کر نکل گیا اور گھومتا پھرتا نظام شاہی سرحد میں داخل ہو گیا۔

ابراہیم عادل شاہ مختلف امراض میں گرفتار تھا جب کسی طبیب کے علاج سے فائدہ نہ ہوتا تو اسکو قتل کر دیتا۔ دو برس تک ایسے ہی قالمائے افعال کا مرتکب ہوتا رہا۔ ۹۶۵ھ میں اس نے وفات پائی۔

### ابوالمظفر علی عادل شاہ

ابراہیم عادل شاہ چونکہ خود اتالیق کے اثر سے سنی ہوا تھا لہذا اسکو اندیشہ تھا کہ کہیں اسکے بیٹے کا اتالیق شیعہ نہ ہو لہذا ایک دن اس نے علی سے پوچھا کہ اس کا مذہب کیا ہے؟ علی نے جواب دیا کہ فی الوقت مذہب سلطانی میرا مذہب ہے، آگے کا حال میں نہیں جانتا اس جواب پر اسے شبہ ہوا اور اس نے علی کے اتالیق خواجہ عنایت اللہ شیرازی کو قتل کرادیا اور دوسرا اتالیق مقرر کیا۔ ملا فتح اللہ شیرازی بھی تقیہ میں تھا اور ابراہیم عادل شاہ کے خوف سے سنی بنا ہوا تھا۔

عجیب تماشا ہے کہ کوئی شیعہ مصلحتاً سنی بن جائے تو کہا جاتا ہے کہ تقیہ کیا اور کوئی سنی اپنے کو اسماعیل عادل شاہ کا ہم مذہب بتائے اور ابراہیم کا اتالیق بنا دیا جائے تو اسکو تقیہ نہیں کہتے بلکہ مصلحت وقت کا نام دیا جاتا ہے۔ خدا را تقیہ اور مصلحت کا فرق سمجھا دیجئے۔

ابراہیم عادل شاہ اسکے بعد بھی مطمئن نہ ہوا اور علی کو آغاز شباب میں قلعہ



مرج میں بھیج دیا اور سکندر خاں قلعہ دار کو ہدایت کی کہ وہ شیعوں کی صحبت میں بیٹھنے نہ پائے مگر اتفاق سے وہ اور اس کا داماد کامل خاں دکنی دونوں شیعہ تھے۔ پھر جب ابراہیم عادل شاہ بیمار ہوا اور اسکو پتہ چل گیا کہ علی پکا محب اہل بیت ہے تو اس نے چاہا کہ شہزادہ طہماسپ کو ولی عہد بنادے مگر اسکو بتایا گیا کہ شیعیت میں وہ بڑے بھائی سے آگے ہے تو ابراہیم عادل شاہ مجبور ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ یوسف عادل شاہ کا پورا خانوادہ آل رسول کا دیوانہ تھا۔ خود ابراہیم سنی ہو گیا تھا تو اس کے خوف سے کوئی زبان نہ کھولتا مگر محل سرا کے اندر اور باہر تمام متعلقین چھپ چھپا کر ایک ہی عقیدے کو ملتے تھے اور اسی ماحول میں شہزادوں کی پرورش ہوئی تھی اس لئے وہ قدیم ڈگر سے ہٹ نہ سکتے اور یہی حال شاہزادیوں کا بھی تھا۔

انجام کار علی عادل شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی ازاں میں علیاً ولی اللہ کا آوازہ بلند ہوا اور خطبہ آئمہ اشاعہ جاری کیا گیا۔

محمد قاسم فرشتہ نے اسکو صاحب مشرب، صوفی منش، خوش طبع صاف نظر، عاشقی کے ذوق سے باخبر لکھا ہے پھر تحریر کیا ہے کہ وہ اہل حیثیت سے صحبت رکھتا، ہمیشہ ماہر و یان زہر جبین، سادہ عذران سرآئین سے مجلس کو مزین کرتا تھا، خوش تدبیر و صلح پسند تھا چنانچہ رام راج کے پاس ایک سفارت یجیانگر بھیجی، دوسری سفارت احمد نگر روانہ کی مگر نظام شاہ بحری سفیروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش نہ آیا اور نہ جواب اپنے اپنی روانہ کیے اس لئے اسکی طرف سے علی عادل شاہ کے دل میں ایک رنجش پڑ گئی۔

رام راج سے اس کے تعلقات یگانگت اور اپنائیت کے تھے حتیٰ کہ رام راج کا بیٹا فوت ہوا تو اسکی تعزیت میں وہ خود یجیانگر گیا رام راج نے تواضع اور ضیافت میں کمی نہ کی مگر خود اسکو رخصت کرنے نہ آیا۔ اس سے علی عادل شاہ کے دل میں ایک تلکد پیدا ہو گیا۔

۹۶۶ھ میں اس نے حسین نظام سے شوالاپور اور کلیانی کے قلعوں کا مطالبہ کیا جن پر ابراہیم عادل شاہ کی کمزوری سے حسین نظام نے قبضہ کر لیا تھا۔

اس کے انکاری جواب پر علی عادل شاہ نے بڑی تہذیب سے استدعا کی کہ طاقت آزمائی سے جان و مال کا اتلاف ہوگا اسپر حسین نظام نے الفاظ ناشائستہ استعمال کیے اور طرفین لشکر کشی پر آمادہ ہو گئے۔

۹۶۷ھ میں یجیانگر کی مدد سے یجپور کی فوجیں آگے بڑھیں۔ پرندہ سے جنیر تک اور احمد نگر سے دولت آباد تک تمام آبادیاں تہہ وبالا ہو گئیں۔ کفار یجیانگر نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مسجد اور صف مقدس کی بخر مٹی کی۔ حسین نظام پٹن کی طرف ہٹ گیا پھر قلعہ کلیانی یجپور کے حوالے کر کے صلح کر لی۔

اسکے بعد حسین نظام نے اپنی بیٹی بی بی جمال قطب الملک کو بیہ دی اور رام راج سے تعلقات ہموار کیے تاکہ اس سے یجپور کے خلاف فوجی مدد حاصل کرے علی عادل شاہ نے پھر رام راج سے استعانت چاہی اور وہاں کی فوجیں یجپور روانہ ہو گئیں۔

پچاس ہزار سوار اور دو لاکھ پیادے یجیانگر کے اور عادل شاہی لشکر احمد نگر کی طرف بڑھ گئے۔ حسین نظام بھی مقابلے پر آیا مگر عین موقع پر ابراہیم قطب شاہ، علی عادل شاہ سے جا ملا۔ حسین نظام کو تاب مقابلہ نہ تھی لہذا اس نے میدان چھوڑ دیا۔ اس بار یجیانگر کی فوجوں نے پہلے سے زیادہ غارتگری کی۔ اسکو محسوس کر کے علی عادل شاہ نے قلعہ شوالاپور کی تسخیر ملتوی کر دی۔

رستے میں رام راج نے "نل پسربادشاہ مندو" کا ٹونا پھوننا قلعہ ازسرنو تعمیر کرایا اور یجیانگر کی طرف واپس ہو گیا۔

علی عادل شاہ نے دو جنگوں میں رام راج کی مدد سے حسین نظام پر فتح حاصل کر لی تھی لیکن رام راج اور اسکے لشکر کے طور طریقے نے اسکے دل میں ناسور ڈال دئے تھے۔ پہلی مرتبہ بھی اس نے رام راج سے اس شرط پر مدد حاصل کی تھی کہ اسکی فوجیں مفتوحہ علاقوں میں قتل و غارت نہیں کریں گے اور دوسری مرتبہ تو رام راج نے بذات خود پورا اطمینان دلایا تھا کہ اب پہلے کی طرح کسی مسجد یا عبادت گاہ کو نہ مسمار کیا جائے گا اور نہ بے حرمتی ہوگی لیکن ہوا اسکے برعکس کہ مسجدوں کو



اصطبل بنادیا گیا۔

پھر چلتے وقت رام راج نے علی عادل شاہ اور قطب الملک کے طعنے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا اور یہ دونوں سرتابی نہ کر سکے کیونکہ حسین نظام ان کا دشمن تھا اور دونوں مل کر بھی رام راج کا مقابلہ نہ کر سکتے۔

اور اسکے بعد تو رام راج کا یہ طریقہ تھا کہ مسلم ممالک کے سفیروں کو اپنی سواری کے ساتھ دوڑاتا تھا۔ ان حالات میں علی عادل شاہ کو پکھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے حسین نظام کے خلاف یجائنگر سے مدد کیوں حاصل کی؟

لیکن صورتحال علی عادل شاہ سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ بھی بہادر تھا اور اسکے امراء بھی بڑے جان نثار مگر رام راج کے ٹڈی سے وہ نبرد آزما نہ ہو سکتے اور حالات کو سمجھتے بوجھتے ہوئے اس سے ٹکرا جانا خود کشی کے مترادف تھا لہذا وہ سوچتا رہا اور دانش مند عمائدین سلطنت سے مشورے لیتا رہا آخر اس نے ابراہیم قطب شاہ سے رجوع کیا۔

وہ بھی علی عادل شاہ کی طرح رام راج کے خلاف بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے مصطفیٰ خان دوستانی کو فرائض سفارت انجام دینے پر متعین کیا۔ اسکی کوششیں بار آور ہوئیں اور علی عادل شاہ اور حسین نظام میں اتحاد کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ چاند بی بی بنت حسین نظام کا عقد علی عادل شاہ سے کیا گیا اور قلعہ شوالاپور جہیز میں دیا گیا۔ علی عادل شاہ کی بہن ہدیہ سلطانہ مرتضیٰ نظام سے بیاہ دی گئی۔ اس طرح تینوں بادشاہ باہم مضبوط رشتوں میں منسلک ہو گئے۔

اب علی عادل شاہ نے رام راج سے مطالبہ کیا کہ قلعہ رانچور اور مدگل پر اس نے جنگ کے بعد قبضہ کر لیا تھا لہذا انکو واکزار کر دے جو اب حسب توقع سخت اور اہانت آمیز ملا اور علی عادل شاہ نے فوجی تیاری شروع کر دی۔

حسین نظام نے اس اتحاد میں علی برید کو بھی شامل کر لیا اور ۹۷۲ھ میں منصوبے کے مطابق چاروں لشکر نواح یجاپور میں یکجا ہو گئے۔

جب یہ فوجیں یجائنگر کی طرف بڑھیں تو رام راج نے اسے بچوں کا کھیل قرار دیا اور اپنے چھوٹے بھائی تمراج کو بیس ہزار سوار پانچ سو ہاتھی اور ایک لاکھ پیادوں

کے ساتھ تعینات کر دیا۔ پھر اپنے منگلے بھائی سنگنادڑی کو بڑے جاہ و خشم سے روانہ کیا اور آخر میں مضافات کے سارے راجاؤں کے تھر مٹ میں دور سے جنگ کا نظارہ کرنے کیلئے آہستہ آہستہ بڑھا۔ وہ خوش تھا کہ تمام مسلمان ایک ساتھ خود اسکے جنگل میں لگے۔

تمراج نے دریا کے کنارے پہنچتے ہی عبور کرنے کی ہر راہ سدود کر دی اور جس مقام پر پانی پایاب تھا، وہاں دیواریں کھڑی کر دیں اور ان میں توپیں نصب کر دیں۔ مسلمانوں نے باہم مشورہ کر کے بعض مقامات پر دریا عبور کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن ان مقامات کے بجائے بعض دوسری جگہوں کی طرف ایک دستہ فوج روانہ کر دیا۔ یجائنگر کے لشکری اس دستہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور انکو روکنے کیلئے بڑھ گئے تو مسلمان فوجوں نے متعینہ گھاٹوں سے دریا پار کر لیا۔

اس طرح مسلم لشکروں کو ایک لمبی مسافت طے کرنا پڑی مگر انہوں نے تین روز کا فاصلہ ایک دن میں طے کیا اور رام راج سے دس میل کے فاصلے پر پہنچ کر ٹھہر گئے جہاں تمام فوجیں یکے بعد دیگرے یکجا ہو گئیں۔ دوسرے دن بارہ اماموں کے پرچموں تلے اللہ اکبر اور یا علی کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے اور صفوں کو اس طرح مرتب کیا گیا کہ میمنہ علی عادل شاہ کو میرہ علی برید اور ابراہیم قطب شاہ کو دیا گیا، قلب میں حسین نظام، نظام شاہ بحری نے قیام کیا۔

آتشبازی کے ارابے زنجیروں سے استوار کیے گئے اور جنگی ہاتھی جا بجا ایستادہ کئے گئے پھر ان علموں کو حرکت دی گئی جن پر اسمائے ختم المرسلین و آئمہ طاہرین لکھے ہوئے تھے۔

یجائنگر کا میمنہ تمراج کے سپرد تھا جو علی برید اور ابراہیم قطب شاہ کے مقابل تھا، میرے پر سنگنادڑی علی عادل شاہ کے سامنے اور قلب میں خود رام راج دو ہزار ہاتھی اور ایک ہزار ارابہ توپخانہ کے ساتھ۔

آفتاب جب نصف النہار پر پہنچا تو رام راج نے اپنے جو اہر نگار سنگھاسن کو آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ یہی خواہوں نے گھوڑے پر سوار ہونے کی درخواست کی تو اس نے بڑے غرور سے کہا کہ بچوں کے کھیل میں گھوڑے کی ضرورت نہیں۔



یہی حال اسکے لشکریوں کا تھا۔ قلیل فوج کو تلوار کے گھاٹ اتار دینا اسکے نزدیک گھنٹوں کا کام تھا۔ جنگ کا آغاز یجائنگر کے پچاس ہزار تیر اندازوں نے کیا۔ اسکے ساتھ ہی بندوقیں دغیں، توپیں چھوٹیں۔ لشکر اسلام کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا مگر اسی تناسب سے جو دونوں لشکروں کا تھا پھر فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور تلواریں چلنے لگیں۔ اہل اسلام کے مقتولین کی تعداد بڑھ گئی مگر ان کے شیرازہ حملوں میں کمی نہ آئی بلکہ شہداء کی لاشوں کو دیکھ کر اور جوش پیدا ہو گیا۔

یجائنگر کا پلہ ابھاری تھا۔ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ جائیں تاہم جنگ کا یہ انداز رام راج کے وہم و خیال سے دور تھا۔ وہ اہل اسلام کو کھیرے لکڑی کے طرح کاٹ ڈالنے کیلئے آیا تھا مگر اس نے دیکھا کہ ایک گرتا تھا تو آگے بڑھ کر دو حملہ آور ہو جاتے۔ یہ دیکھ کر وہ زرو جو ابھر بٹنٹے لگا تاکہ لوگ میدان میں جا کر سروں کی بازیاں لگا دیں۔

عین اسی وقت تمراج اور تنگناوڑی نے بھرپور حملہ کیا جس سے مہینے اور میرے کی اگلی صفیں درہم و برہم ہو گئیں۔ حسین نظام شاہ قلب لشکر میں تھا اس نے شدید ریلے کے باوجود اپنے پاؤں زمین پر جمادئے۔ سیکڑوں تیردہنے بائیں اور سر پر سے گزر گئے مگر اس نے اپنے نشان لشکر کو بلند رکھا۔ عادل شاہی مقدمہ الجیش ٹوٹ چکا تھا اس کا سپہ سالار محمد کشور خاں زخمی تھا۔ وہ نظام شاہی علم کے قریب آگیا اور علی عادل شاہ میدان سے ہٹ کر یجائنگر کی فوج پر عقب سے حملہ آور ہو گیا۔

ایسے میں حسین نظام نے اپنی مخصوص توپ میدان ملک سر کرنے کا حکم دیا جس میں پیسے بھرے جاتے تھے۔ اس توپ کے چلتے ہی حسین نظام نے پوری طاقت سے رام راج کی فوج خاصہ پر یلغار کی جو اسکی تاب نہ لاسکی۔ رام راج استا گھبرا گیا کہ کرسی سے اتر کر پھر سنگھاسن پر آ بیٹھا۔

اس درمیان حسین نظام کا فیل مست غلام علی چٹکھاڑتا ہوا اس طرف کو بڑھا۔ اس نے رام راج کے گردا گرد دھڑے ہوئے سپاہیوں کو روند ڈالا۔ کہاں اسکو اپنے قریب پا کر بھل گئے لگے اور سنگھاسن زمین پر آ گیا۔

اس غضب کی جنگ مغلوبہ سرزمین دکن نے کاہے کو دیکھی ہوگی۔ ایک لو

دوسرے کی خبر نہ تھی۔ صحیح معنی میں یہ جنوبی ہند میں کفر و اسلام کی فیصلہ کن جنگ تھی۔ کسی نے رام راج کی طرف توجہ نہ کی۔ صرف ایک برہمن اسکے پاس رہ گیا تھا فیلبان نے ہاتھی کو سنگھاسن کے زرو جو اہر کی خاطر اس طرف بڑھایا تو برہمن سمجھا کہ کچلنے کیلئے آ رہا ہے۔ اس نے چلا کر کہا یہ رام راج ہے اسکو چھوڑ دے تجھے مالا مال کر دے گا۔

یہ سنتے ہی فیلبان نے سنگھاسن کے بجائے رام راج کو ہاتھی کی سونڈ سے اٹھوایا اور اسکو لے کر رومی خاں افسر توپخانہ کے پاس آگیا۔ اس نے فی الفور حسین نظام کے پاس پہنچا دیا اور حسین نظام شاہ نے بیک ضرب شمشیر اس کا سرتن سے جدا کر دیا اور سر کو نیزے پر بلند کر کے اعلان کرایا کہ رام راج قتل ہو گیا۔

لڑتے ہوئے سپاہیوں کی نظر اس سر پر پڑی تو ہمت پست ہو گئی۔ انہوں نے جانیں بچانے کیلئے بھاگنا شروع کر دیا۔

اسلام کے بہادروں نے انکے قتل میں کوتاہی نہ کی مگر کہاں تک مارتے میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ مقتولوں کی تعداد ایک لاکھ سے تین لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ مال و اسباب اور جو اہرات جو وہ چھوڑ کر گئے انکا کوئی شمار نہ ہو سکتا۔

مسلم سلاطین نے اسی میدان میں سجدہ ہائے شکر ادا کیے۔ غنیمت کی تقسیم یوں قرار پائی کہ جو کچھ جسکے ہاتھ لگا، وہ اسی کا ہاتھی بادشاہوں کے۔ (۷۶)

نواح یجائنگر کے تمام بت خانے سمار کر دئے گئے بڑی بڑی عمارتیں توڑ ڈالی گئیں۔ تنگناوڑی کسی گوشے میں چھپ گیا تھا اس نے اٹلی بھیج کر حسین نظام کی منت و سماجت کی۔ اس نے یجائنگر کا اصل ملک اسکو واپس کر دیا۔ عادل شاہی اور قطب شاہی مملکتوں کے جو قلعے رام راج نے ضبط کیے تھے وہ انکو واپس ہو گئے۔

سلاطین جب اپنے مقامات پر واپس ہو چکے تو رام راج کا چھوٹا بیٹا علی عادل شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے تنگناوڑی پر زور ڈالا کہ انا کنڈی تمراج کو دیا جائے۔ تنگناوڑی کو مجال سرتابی نہ تھی۔ اس وقت سے رام راج کی سلطنت چھوٹے بڑے دو حصوں میں بٹ گئی اور نسلاً بعد نسل چلتی رہی۔

آگے چل کر خود انھیں کے بعض سرداروں نے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا اور



ایک طوائف الملوکی پیدا ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد علی عادل شاہ نے قلعہ بیجاپور اور چندر کوٹی اپنے ملک میں شامل کر لیے مگر وہ تنگناوڑی اور تمراج کے مقبوضات نہ تھے۔

کچھ دنوں بعد حسین نظام بحری کا انتقال ہوا تو مرتضیٰ نظام بحری اس کا جانشین ہوا۔ علی عادل شاہ سے اسکی ان بن ہو گئی کیونکہ تمراج اور تنگناوڑی ایک دوسرے کے حریف بن گئے اور یہ دونوں ان کے پشت پناہ تھے مگر مخالفت نے طول نہیں کھینچا۔

۹۷۴ھ میں علی عادل شاہ اور مرتضیٰ نظام نے مل کر برابر پر لشکر کشی کی مگر موسم برسات آجانے کے سبب واپس ہو گئے۔

۹۷۵ھ میں علی عادل شاہ نے مملکت نظام شاہی کے بعض پرگنوں پر قبضہ کر لیا جنہیں ۹۸۰ھ میں مرتضیٰ نظام نے شدید جنگ کے بعد واپس لیا اور اسی سلسلے میں چند پرگنوں عادل شاہ کے بھی لے لیے۔ ان جنگوں میں عادل شاہ کی کافی فوج ضائع ہو گئی۔

قلعہ اودنی رام راج کا مشہور قلعہ تھا جسکو سلاطین بہمنی فتح کرنا چاہتے تھے مگر فتح نہ کر سکے تھے۔ اب اسریچانگر کا ایک سردار قابض ہو گیا تھا اس نے سکھ بھی اپنے ہی نام کا جاری کیا تھا۔ علی عادل شاہ نے اس پر فوج کشی کی اور آنکس خاں کو آٹھ ہزار سوار، بڑے توپخانے اور پیادوں کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ آخر طویل محاصرہ سے تنگ آکر قلعہ دار اماں کا طالب ہوا۔ یہ ایک فتح عظیم تھی۔

انہیں دنوں بعض امراء کی مساعی سے اسکے اور مرتضیٰ نظام کے تعلقات بحال ہوئے اور دونوں نے مل کر تسخیر برار کا منصوبہ بنایا۔ پھر علی عادل شاہ قلعہ تورگل فتح کیا جس پر رام راج کے ایک سپاہی نے قبضہ کر لیا تھا۔ اسی سلسلے میں بعض ایسے قلعوں کو بھی مسخر کیا جن کی تسخیر میں مصطفیٰ خاں سپہ سالار کو لوہے کے چنے چبانا پڑے۔

مضافات کے رائے اور راجے خود بیجاپور آکر پٹکا اور شمشیر مرصع پاکر سرفراز ہوئے۔۔۔ دور انیاں بہرہ دیوی اور جلوی بھی حاضر ہوئیں۔ انہیں علی عادل شاہ نے عورتوں کا خلعت عطا کیا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ عورتیں بزور شمشیر

حکومت کر سکتی ہیں تو عورتوں کا لباس کیوں پہنیں۔ علی عادل شاہ کو یہ جواب بہت پسند آیا۔ اس نے انہیں بھی پٹکا، شمشیر مرصع، اسب تازی اور مردانہ خلعت عنایت کیا۔ اس وقت سے ان علاقوں پر عورتیں اسی پوشاک اور وضع قطع میں حکومت کرتی ہیں۔

علی عادل شاہ کی تسخیری مہمات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور بیجاپور کی مملکت وسیع سے وسیع تر ہوتی رہی۔ مختلف مقامات پر شدید بغاوتیں ہوئیں جنہیں طاقت کے بل پر کچل دیا گیا۔ اس طرح اندر اور باہر دشمنوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ علی عادل شاہ، چونکہ لاؤلد تھا لہذا ۹۸۸ھ میں اس نے اپنے چھوٹے بھائی طہما سب بن ابراہیم کو ولی عہد نامزد کر دیا تاکہ اسکے بعد تخت و تاج کیلئے کوئی تنازعہ نہ ہو۔

فرشتہ نے لکھا ہے کہ علی عادل شاہ قوم لوط کی علت میں مبتلا تھا۔ دو خواجہ سرا اصرار کر کے احمد اباد بیدر سے بلوائے گئے تھے جو اگرچہ نس کئے تھے مگر اس فعل کو پسند نہ کرتے۔ ان سے جب علی عادل شاہ نے خواہش کی تو انہوں نے رات پر نالا۔ رات میں ایک خواجہ سرا اسکے ساتھ خالی حجرے میں گیا اور قرولی نکال کر اس کا کام تمام کر دیا۔

یہ بیان خلاف عقل نہیں کیونکہ ترکستان سے افغانستان تک یہ بات عام تھی اور ہندوستان کے پٹھان علاقوں میں آج تک اس کا رواج ہے۔ علی عادل شاہ کی رگوں میں بھی ترکی خون تھا مگر اسکے اسلاف کے بارے میں کبھی کچھ سنا نہیں گیا جبکہ پردہ نشینوں کو چھوڑ کر بعض تاریخی ہستیاں بھی اس میں ملوث پائی جاتی رہیں۔ محمود دایاز کے ناموں کو تقدس کے نقاب ڈال کر صرف حسن پرستی تک محدود کر دیا جائے تو ہمایوں کیلئے اسی فرشتہ کا بیان ہے۔

”اسی سال امیر الامراء علی قلی خاں سیستانی المخاطب بہ خان زماں امیر پنج ہزاری و حاکم صوبہ شرقی، سے ایک امرنا شائستہ سرزد ہوا، جس سے حضرت (اکبر اعظم) کبیدہ خاطر ہوئے۔ بات یہ تھی کہ ایک لڑکا شام بیگ احدیوں میں ملازم تھا جو حسن صورت و سیرت اور تناسب اعضاء کے سبب ہمایوں کا منظور نظر ہوا تھا،



علی تکی خاں سیستانی اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ حقیقت زبان زد عام ہوئی تو اکبر اعظم نے شاہم بیگ کی طلبی کا حکم دیا جس میں شامل ہونے پر لشکر بھیجا گیا۔ (۷۷)  
ہمارے نزدیک یہ بھی صرف حسن پرستی ہے مگر مبارک شاہ خطیبی اور خسرو کا استرداد ممکن نہیں کیونکہ چور موقعہ واردات پر پکڑ لیا گیا تھا اسی طرح علی عادل شاہ کی صفائی بھی نہیں دی جاسکتی کیونکہ نس کا خواجہ سرا قتل کی وجہ یہ بتاتا تھا کہ وہ ایسے فعل پر تیار نہیں تھا۔ بادشاہ نے جب کہا تو اسکی مردانہ غیرت دامنگیر ہوئی اور جو اباس نے خنجر گھونپ دیا۔

اس سلسلے میں بعض شبہات ضرور پیدا ہوتے ہیں کہ جب علی عادل شاہ نے اسکو بیدر سے بلوایا ہو تو کسی دشمن نے اسکو قتل پر تیار کر کے نہ بھیجا ہو وہ خنجر کو کمزوروں میں چھپائے شاہ کی خواب گاہ میں گیا اور موقع پاتے ہی اس نے وار کر دیا۔ پھر جو بیان اس نے دیا مورخ نے وہی قلم بند کر دیا۔

یہ قیاس اس لئے بھی قابل تسلیم ہے کہ والی بیدر خواجہ سراؤں کو بھیجنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے علی عادل کے زور ڈالنے پر مجبور ہو کر بھیجے تھے۔ واقعہ کی نوعیت خواجہ سرا کے عمل اور بیان سے سمجھی معلوم ہوتی ہے جسکو محمد قاسم ہندو سراؤں فرشتہ نے قلم بند کیا۔

بات قابل غور اس لئے بھی ہے کہ علی عادل شاہ حسن پرست تھا۔ خواجہ سرا بھی اچھی صورت کے رکھنا چاہتا ہوگا لہذا اس نے اسکو بیدر سے بلوایا اور وہاں سے وہ بھیجا گیا تو اس مقصد کیلئے آمادہ کر کے پھر ایک خواجہ سرا کا انکار، کچھ سمجھ میں نہیں آتا پھر اگر علی عادل شاہ میں یہ مرض تھا تو مقربین کو معلوم ضرور ہوگا اور ان میں بعض بڑے مقدس اور گرانقدر نام شامل ہیں جیسے فتح اللہ شیرازی، شاہ ابو القاسم آنجو، مرتضیٰ خان آنجو، میر شمس الدین محمد صدر جہاں اور بڑے بڑے علماء اور سادات کرام۔

بہر حال قتل اپنی جگہ پر اور وجہ قتل تاریخی پھر بھی فرشتہ نے اسکو خسرو شہید کے سے کہتے ہی لفظوں سے یاد کیا شاید اسکے غیر معمولی محاسن کی بنا پر۔ علی عادل شاہ نے اپنے بعد ایک وسیع سلطنت چھوڑی۔ یہ اسکے وقار کی بات تھی کہ دوبار اکبر اعظم کے سفیر اسکے دربار میں باریاب ہوئے۔

### ابراہیم عادل شاہ ثانی

آغاز سلطنت میں کئی سرداروں نے بغاوت کی جسکو فرد کر دیا گیا پھر مرتضیٰ نظام نے سرحدی علاقوں پر قبضے کی کوشش کی جسکو ناکام بنا دیا گیا۔ ان مرحلوں میں چاند بی بی بھی شامل رہی۔ اسی دوران کشور خاں نے سید مصطفیٰ خاں سپہ سالار کو دھوکا دے کر قتل کر دیا۔ یہ بات چاند بی بی کو بہت ناگوار ہوئی۔ وہ سادات کو بہت عزیز رکھتی تھی۔ اس پر کشور خاں نے چاند بی بی پر الزام لگادیا کہ وہ بیجا پور کی وفادار نہیں، یہاں کی خبریں اپنے بھائی مرتضیٰ کو بھجواتی رہتی تھیں۔ نو عمر ابراہیم عادل شاہ اسکی باتوں میں آگیا اور کشور خاں نے چاند سلطانہ کو خواجہ سراؤں اور جنوں کے جھرمٹ میں قلعہ ستارہ بھیج دیا۔

کشور خاں سلطنت بیجا پور پر قبضہ کرنے کا پورا منصوبہ بنا چکا تھا لیکن اسکی سازش کھل گئی اور اسکو احمد نگر کی طرف بھاگنا پڑا پھر وہ قطب شاہ کی طرف روانہ ہوا مگر راستے میں ایک اردستانی کے ہاتھوں سید مصطفیٰ کے خون کی پاداش میں مارا گیا۔ اسکے بعد کئی امراء نے بغاوتیں کیں لیکن وفادارانہ سلطنت نے انکو دبا دیا۔

۸۸۹ھ میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بڑا بیٹا محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا اور مرتضیٰ نظام کے تعاون سے اس نے پورے قلعہ درک فتح کرنے کی کوشش کی پھر چالیس ہزار سوار لیکر بیجا پور کی بڑھا۔ قلعہ میں تین ہزار سوار اور جشی غلاموں کے سوا کوئی فوج نہ تھی۔ مجبوراً جشی امراء قلعہ بند ہو گئے۔

چاند سلطانہ موجود تھی۔ اس نے ابو الحسن اور شاہ طاہر کو میر حملہ مقرر کیا۔ اس عرصے میں حملہ آوروں نے قلعہ کی دیوار ایک جگہ سے توڑ دی لیکن چاند بی بی کی سرپرستی میں اہل قلعہ نے راتوں رات وہ دیوار مکمل کر لی اس اثنا میں یہ امید بھی پیدا ہو گئی کہ صوبائی امراء ملک لے کر پہنچ جائیں گے۔ محاصرین ہر ممکن کوشش کر چکے تھے مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی لہذا مایوس ہو کر نظام شاہی فوج احمد نگر کی طرف واپس ہو گئی اور قلی قطب شاہ بعض علاقے فتح کرتا ہوا تلنگانہ کی طرف چل پڑا مگر اسکی ساری مساعی رائیگاں گئیں۔ ابراہیم عادل شاہ نے جلد ہی اپنے علاقے واپس لے لیے۔

اب اسکو بادشاہ کی کمزوری ہی کہنا چاہئے کہ امراء کی منہ زوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ علی الاعلان ایک دوسرے سے ٹکر جاتے اور بادشاہ کو خاطر میں نہ لاتے ان میں دلور خاں اپنے



اوجھے ہتھکنڈوں کے سبب کامیاب ہوا۔ اس نے اکثر امراء کو ٹھکانے لگا دیا۔ شاہ ابوالحسن کو پھیلے قید کیا پھر قیدی میرا رڈالا، چاند سلطانہ کو نظر بند کیا اور ابراہیم عادل شاہ کو مجبور محض بنادیا۔ اکتفا صرف اسی پر نہیں کی بلکہ خطبہ امیر موقوف کرا کے خطبہ چار یار جاری کر دیا۔

۹۹۲ھ میں مرتضیٰ نظام نے اپنے بیٹے میران شاہ حسین کا رشتہ ابراہیم عادل کی بہن خدیجہ سلطان سے مانگا شادی کے بعد چاند بی بی سلطان عروس کے ساتھ احمد نگر روانہ ہوئی۔ پھر ابراہیم عادل شاہ ثانی کا عقد قلی قطب شاہ کی بہن سے ہوا۔

چونکہ مرتضیٰ نظام شاہ نیم دیوانہ ہو چکا تھا لہذا اس نے میران حسین نظام کو قید میں ڈال دیا تھا۔

اسی سال میران حسین قتل کر دیا گیا اسماعیل نظام تخت نشین ہوا اور جمال خاں مہدوی نے حکومت پر حاوی ہو کر مسلک مہدویہ کو رواج دیا۔ اس پر ۹۹۷ھ میں ابراہیم عادل نے پھر احمد نگر کی طرف کوچ کیا۔ بلبل خاں حبشی مصافات کی بعض بغاوتیں فرد کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ ابراہیم عادل نے کچھ دنوں قلعہ شاہ درک میں اس کا انتظار کیا پھر آگے بڑھ گیا اور جمال خاں اسماعیل نظام کو ساتھ لے کر مقابلے پر آگیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اپنی کمزوری محسوس کر کے صلح کر لی۔ اس عرصے میں بلبل خاں اس سے آ ملا۔

دلاور خاں اور بلبل خاں میں بڑی چشمک تھی۔ کچھ دنوں بعد دلاور نے اسپر الزام تراشی کر کے قید کر دیا پھر آنکھوں سے اندھا کر دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایک طرف سلطنت عادل شاہیہ میں دلاور خاں نے ابراہیم عادل شاہ کو شاہ شطرنج بنا رکھا تھا، دوسری طرف احمد نگر میں ہر طرف انتشار پھیلا ہوا تھا۔ حسین نظام کا پوتا بادشاہ تو بن گیا تھا مگر عملی طور پر جمال مہدوی کے ہاتھ کا کھولنا بنا ہوا تھا۔

احمد نگر کا انتزاع سلطنت دراصل حسین نظام کے مرنے کے بعد شروع ہو گیا تھا۔ مرتضیٰ نظام نے اپنے بھائی برہان شاہ کو قید کر دیا تھا مگر وہ موقع پاتے ہی فرار ہو گیا اور اکبر اعظم کی پناہ میں چلا گیا۔ وہاں سے ایک بار وہ دکن آیا مگر کامیابی نہ ہوئی تو ابراہیم عادل شاہ سے رجوع کیا۔ اس نے والی برار کو ہموار کیا۔

جمال خاں کو اسکی اطلاع ملی تو اس نے بھی مقابلے کیلئے کوچ کیا۔ اس درمیان آہنگ خاں حبشی جمال سے ٹوٹ کر ابراہیم عادل سے آ ملا۔ جمال خاں موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے میدان سے ہٹ کر جنگل کی طرف چلا گیا۔ دلاور خاں اسکی کمزوری کو سمجھ کر بادشاہ کی اجازت کے بغیر اسکے سر پر پہنچ گیا۔ جمال خاں کوئی راستہ نہ دیکھ کر ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ سلمے آگیا۔

بہادر دونوں تھے۔ لڑائی بڑی تیزی سے شروع ہو گئی۔ اس موقع پر دلاور خاں کی غداری نے اس سے انتقام لیا۔ عادل شاہی امراء عین الملک انکس خاں اور عالم خاں وغیرہ کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور اسکو دشمنوں کے زرخے میں چھوڑ دیا۔ جمال خاں اسکو کمزور پا کر ٹوٹ پڑا مگر دلاور خاں کسی طرح بچ کر نکل گیا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

ابراہیم عادل شاہ امرائے برکی کو آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ جمال خاں کی رسد بند کرنے کیلئے متعین کر چکا تھا اور ایک جھیل کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا دلاور خاں نے حسب سابق حکم لگا دیا کہ اگلے دن کوچ ہوگا۔ چونکہ امرائے خاصہ خیل دلاور خاں کے تابع تھے لہذا ابراہیم عادل شاہ خاموش رہا لیکن اس نے وفادار امیروں کو بلا کر بعض احکام دیدئے۔

۱۴ رجب ۸۹۸ھ کو ابراہیم عادل نے خاصے کے گھوڑے طلب کیے ان پر مع غلاموں کے سوار ہوا۔ رستے میں اس نے الیاس خاں کو مع سو سواروں کے ساتھ لیا پھر عین الملک اور آنکس خاں بھی آئے اور ابراہیم عادل شاہ تین ہزار کی جمعیت سے دلاور خاں کے سر پر جا پہنچا۔

دلاور خاں محو عشرت تھا پھر بھی اسکو خبر لگ گئی اور وہ پانچ ہزار سواروں اور بکثرت ہاتھیوں کے ساتھ مقابلے پر آگیا عین الملک نے اس سے کہلوایا کہ ہم بادشاہ کے ساتھ یہاں تک آگئے تھے تم لے جانا چاہو تو لے جاؤ۔ دلاور خاں اس فریب میں آگیا صرف پانچ سو سوار اور چند ہاتھی لے کر آگے بڑھ آیا۔

جیسے ہی وہ بادشاہ کے قریب پہنچا ادک خاں خاصہ خیل نے بجلی کی طرح



کو نہ کر اسپر وار کیا۔ دلاور خاں نے گھوڑا پیچھے ہٹایا لیکن اوک خاں کے دوسرے وار پر تلوار کی چمک سے گھوڑا الف ہو گیا اور دلاور خاں زمین پر گر گیا۔

اسکی فوج بادشاہ کا غیظ و غضب دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ دلاور خاں مع بیٹوں کے بھاگ کھڑا ہوا۔ شاہی سواروں نے تعاقب کیا مگر وہ نکل گیا اور اس نے احمد آباد بیدر پہنچ کر دم لیا۔

کہا جاتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ سنی تھا مگر اس نے شروع میں خطبہ ائمہ اثنا عشر باقی رکھا اور خطبہ چار یار موقوف نہیں کیا مگر اذان میں علیا ولی اللہ کا انصاف کر دیا۔ اس طرح شاید وہ دونوں کو خوش رکھنا چاہتا تھا اس لئے خود اسکا کوئی خاص مسلک نہ تھا۔

دلاور خاں حبشی بیجاپور سے بھاگ کر احمد نگر بیدر میں پناہ گزیں ہوا تو بہان نظام شاہ سربر آرائے حکومت تھا جمال خاں قتل ہو چکا تھا اور اسماعیل بن بہان مقید دلاور مقرب بارگاہ بن گیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اس سے دلاور کی واپسی کا مطالبہ کیا جو اباً دلاور خاں ۴۰۰ھ میں بہان نظام کو بیجاپور پر محالایا اور قصبہ بنگلہ تک پہنچ گیا مگر ابراہیم عادل شاہ کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوئی۔

اس عرصے میں اس نے دلاور خاں سے کہلوا یا کہ اسکی قیمت جانے کے بعد معلوم ہوئی، وہ چاہے توجاہ و منصب اسی طرح موجود ہے۔ دلاور یہ خبر پاتے ہی چل پڑا اور پہنچتے ہی اسکی آنکھوں میں نیل کی سلائی پھیر دی گئی۔ چھ برس بعد ستارہ کے قید خانے میں قید ہستی سے آزاد ہوا۔

اس سے فرصت پا کر ابراہیم عادل نے بہان نظام پر توجہ دی اور وہ بیجاپوری فوجوں سے شکست پر شکست کھاتا رہا۔ آخر اس نے صلح کی درخواست کی اور وہ قبضہ نہ ہوئی تو قلی قطب شاہ سے سفارش کرائی اور ابراہیم عادل شاہ نے بعض شرائط کے ساتھ منظور کیا۔

پھر ابراہیم عادل شاہ نے بعض دیگر فتوحات حاصل کیں۔ اسکے بعد ہی شاہزادہ اسماعیل بن طہماسپ کا قتلہ کھڑا ہو گیا جسکو دلاور خاں نے قلعہ ننگوان میں قید کر دیا تھا۔ بادشاہ نے اسکو آزاد کر کے ایک قلعہ میں آرام و اسائنش کے ساتھ رہنے

کا بندوبست کر دیا تھا۔ اسماعیل نے بعض امراء کو ملا کر بہان نظام شاہ سے سازش کی بہان نظام کی فوجیں حدود بیجاپور میں داخل ہو گئیں اور ایک افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا۔

شاہزادہ اسماعیل کی فوج کئی حصوں میں منقسم تھی مگر اس نے بیجاپوری لشکر کے پہنچتے ہی پرے حملیے۔ سمنے پر خود شاہزادہ عین الملک اور دوسرے امراء کے ساتھ تھا۔ اسکو سہیل خاں خواجہ سرانے شکست دی۔ شاہزادہ چاہتا تھا کہ بھاگ کر بہان نظام شاہ سے ملحق ہو جائے مگر وہ گھوڑے سے گر گیا اور گرفتار ہو گیا۔ بہان نظام احمد نگر واپس ہو گیا۔

عین الملک شاہزادہ اسماعیل کے قصبے میں مارا گیا تھا۔ اس کا بیٹا عالی شان رام راج رائے نلکنڈا کے پاس پناہ گزیں ہوا تھا اور اس کا مقرب بن گیا تھا۔ اس زمانے میں رائے نلکنڈہ نے اسکے مشورے سے بہان نظام شاہ سے ایک معاہدہ کیا۔ چنانچہ حسب قرار داد ۴۰۳ھ میں بہان نظام نے مرتضیٰ آنجو کو بارہ ہزار سوار دے کر روانہ کر دیا مگر کسی جنگ کی نوبت نہ آئی تھی کہ بہان نظام کی علالت کی خبر پہنچی اور حبشیوں اور دکنیوں نے اس فوج کو ٹھکانے لگا کر جمال خاں کی طرح اقتدار سنبھال لینے کا منصوبہ بنالیا۔

مرتضیٰ آنجو بسرعت واپس ہو گیا۔ انہیں دنوں بہان نظام کا انتقال ہو گیا اور ابراہیم نظام شاہ باپ کا جانشین ہوا چونکہ اسکی ماں حبشی تھی اس لئے حبشی اور دکنی اسکے مطیع ہو گئے۔

ابراہیم عادل شاہ کو بہان نظام کی عہد شکنی سے تنگ رہا تھا لہذا وہ بیجاپور سے پورے جاہ و خشم کے ساتھ روانہ ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ کا خیال تھا کہ نو عمر بادشاہ کی طرف سے دست صلح بڑھایا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا بلکہ امراء اور عمائدین اسکو میدان جنگ میں لے آئے اور شاہ بیجاپور نے تیس ہزار سوار دے کر حمید خاں اور شجاع خاں کو انکی طرف بڑھنے کا حکم دیدیا۔

حرب نظام شاہی کا ایک مخصوص انداز تھا کہ لشکر کے گرداگرد دیواروں اور بندوبست کا حصار بنایا جاتا تھا اور ارا بے زنجیروں اور رسیوں سے مضبوط کر دیتے



جاتے تھے۔ ایسا ہی اس موقع پر بھی ہوا۔ حمید خاں نے اپنے طور پر صفیں ترتیب دیں۔ جنگ شروع ہوئی تو احمد نگر کی توپیں آگ لگنے لگیں جس کا جواب آلات اتش بازی سے ملا۔ پھر فوجیں ایک دوسرے سے متصادم ہو گئیں۔ بڑی ہولناک جنگ ہوئی۔ عادل شاہی فوج کو شرمناک شکست ہوئی۔ فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ باقی لوگ اسی ہاتھی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

سہیل خاں اور عنبر خاں چند امراء کے ساتھ مصروف پیکار رہ گئے اس اثناء میں ابراہیم نظام شاہ خود بہادری کے زعم میں ان پر حملہ آور ہو گیا۔ ناگاہ ایک تیرا کے سر پر آکر لگا جس سے وہ جان برباد ہو سکا۔ فتح شکست میں بدل گئی اور لشکری اسکی لاش لے کر راہی احمد نگر ہو گئے۔

ابراہیم عادل شاہ نے یجاپور کی سمت مراجعت کی تو رستے میں ماہ ذی الحج تمام ہوا۔ اس نے نہر بیورہ عبور کر کے قیام کیا اور عزاداری سید الشہداء حضرت امام حسین میں مصروف ہوا اور لوازم عاشورہ محرم الحرام بجالا کر کوچ کیا۔ یجاپور پہنچ کر وہ نظم سلطنت کی دیکھ بھال کرتا رہا اور محرم ۱۰۰۵ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا اور اسکی جگہ علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ جس نے مغلوں سے نبرد آزمائی کی اور تاحیات اسکو جاری رکھا۔

### سلطنت نظام شاہی

نظام الملک بحری کا اصل نام تیما بہت ولد بہرہو تھا جو برہمنان یجا نگر کی اولاد میں تھا۔ سلطان احمد شاہ بہمنی کے عہد میں وہ مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوا اور مشرف بہ اسلام ہو کر غلامان شاہی میں داخل ہوا۔ احمد شاہ نے اسے اپنے بیٹے محمد شاہ کو عطا کر دیا اور وہ اسکے ساتھ رہنے لگا۔ مکتب میں بھی اسکے ساتھ بیٹھتا اس نے فارسی بھی پڑھ گیا۔

محمد شاہ بچپن میں اچھی طرح بول نہ سکتا تھا لہذا تیما بہت عرف حسن اسکے مانی الضمیر کو ادا کر دیتا تھا۔ اس طرح پہلے بہرہو پھر بحری مشہور ہو گیا اور جب وہ شکاری جانوروں کا داروغہ مقرر ہوا تو اسکی سطوت و شوکت بڑھ گئی پھر اسے نظام الملک کا خطاب ملا اور وزیر اعظم خواجہ جہاں کی عنایات سے تنگ کا صوبہ دار بنادیا گیا۔

اب اس کا شمار امرائے کبیر میں ہوتا تھا۔ خواجہ جہاں کے قتل پر وہ ملک نائب اور سر لشکری کے منصب سے سرفراز ہوا۔ محمد سلطان محمد شاہ کے انتقال پر اس کے بیٹے سلطان محمود کا وکیل سلطنت قرار پایا۔

نظام الملک بحری کے توسط سے اس کا بیٹا ملک احمد منصب دار بنایا گیا اور پرگنات دولت آباد کی جاگیر پر اس نے زور بازو سے قبضہ کیا پھر دیگر فتوحات میں مشغول تھا کہ ملک حسن نظام الملک کے قتل کی خبر کان میں پڑی اور وہ بسرعت جتیر پہنچ گیا۔ وہاں سے قصبہ بیر، سیو کا اور پٹن کو مسخر کیا جو اس کا کار عظیم تھا اس سے پورے علاقے پر اسکی ہیبت طاری ہو گئی۔

سلطان محمود کو اس کا غلبہ پسند نہ آیا۔ بہادر الزمان شیخ مودی عرب اسکے حکم پر احمد نظام الملک کی تادیب کیلئے روانہ ہوا۔ احمد نظام شاہ جمعیت کشیر اسکے ساتھ دیکھ کر لڑائی کو نالتا رہا۔ ظریف الملک افغان اس کا امیر الامراء تھا، وہ اجازت لیے بغیر شیخ مودی کی طرف بڑھ گیا اور یکے بعد دیگرے اسکی دو فوجوں کو ہپا کیا۔ اسکے ساتھ صرف تین ہزار سوار تھے مگر حوصلے بڑھ چکے تھے اس لئے خود شیخ مودی سے بھی جانکر آیا اور باحال خراب شکست یاب ہوا۔

احمد نظام شاہ جاکنہ میں مقیم تھا۔ یہ خبر پا کر وہ نصف شب میں آزمودہ کار سواروں کو لے کر نکلا اور مودی کی سپاہ پر اس غضب کا شب خون مارا کہ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بکھرا دیں۔ شیخ مودی اور دکنی وحشی اکثر امراء کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب سلطان محمود نے عظمت الملک دبیر کو اٹھارہ امرائے نامدار اور لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا۔ احمد نظام شاہ نے ان کے ساتھ بھی اپنے طور پر جنگ کی کبھی ایک سے لڑا کبھی دوسرے سے۔ اتنی بڑی فوج متحیر تھی کہ وہ کب اور کس مقام پر ہوتا ہے سلطان محمود بہمنی نے تاخیر ہونے پر عظمت الملک کے بجائے جہانگیر خاں کو متعین کیا جو مشاہیر دکن میں تھا۔

احمد نظام شاہ اپنے میں براہ راست مقابلے کی طاقت نہ پا کر کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ منتقل ہوتا۔ آخر سر گھاٹی جیور کو مسدود کر کے اس میں استقامت



اختیار کی۔ جہانگیر خاں سپہ نگار کے قریب پہنچ گیا مگر احمد نظام شاہ بہانے بہانے ایک ماہ گزار لے گیا۔ آخر ۳ رجب ۸۹۵ھ کو اعظم خاں کو ساتھ لے کر گھائی سے نکلا اور بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتا ہوا جہانگیر خاں کے سر پہنچ گیا۔

بہمنی لشکر ابھی سوکر بیدار نہ ہوا تھا کہ اس بلانے ناگہانی سے دوچار ہوا۔ جہانگیر مع تمام امراء کے مارا گیا۔ احمد نظام شاہ نے قریب کے باغ کے چاروں طرف یادگار کے طور پر چہار دیواری کھنڈادی اور آگے چل کر اسپر بلند و بالا عمارت تعمیر کرائی جو سلاطین نظام شاہیہ کی عظمت کا نشان رہی۔ اور یہی وقت ہے جب صحیح معنی میں سلطنت نظام شاہی کا قیام عمل میں آیا۔

۸۹۹ھ میں احمد نظام شاہ تسخیر دولت آباد کے سلسلے میں محمد آباد بیدر گیا پھر دولت آباد اور جنیر کے درمیان ۹۰۱ھ میں ایک شہر آباد کیا جس کا نام احمد نگر رکھا پھر یہی شہر دار السلطنت قرار پایا۔

۹۰۵ھ میں سلطان محمود گجراتی نے بہان پور پر حملہ کیا تو عادل خاں فاروقی نے احمد نظام شاہ سے مدد مانگی اور وہ پندرہ ہزار سوار لے کر بہان پور کا عازم ہوا۔ عماد الملک بھی لشکر برار لیکر پہلے ہی سے پہنچ چکا تھا۔

احمد نظام نے پانچ ہزار پیادے توپچی اور تیراندازرات کی تاریکی میں گجراتی لشکر کے قریب پہنچا دئے۔ ایک گجراتی فیلبان کو پہلے ہی غریباجا چکا تھا۔ اس نے دو تہائی رات گزرنے پر اپنا مست ہاتھی کھول دیا جو جھنجا جھنجاڑتا گجراتی لشکر کو پامال کرنے لگا۔

عین اسی وقت توپچیوں نے توپوں کے فائر کیے اور تیراندازوں نے تیروں کی باڑھ ماری۔ گجراتی فوج میں قیامت برپا ہو گئی۔ سلطان محمود گجراتی کو یقین ہو گیا کہ احمد نظام شاہ بحری نے شب خور مارا ہے۔ شور و غل کی آوازوں میں ایک دوسرے کی نہ سنتا۔ ایسے میں سلطان محمود گجراتی بدحواس ہو کر نکل بھاگا۔ امراء لشکر جب لڑنے کیلئے تیار ہوئے اور سلطان کو اپنی جگہ پر نہ پایا تو انہوں نے بھی کوچ کر دیا۔

احمد نظام شاہ بھی بسرعت اس مقام سے چل کر دولت آباد آیا اور قلعہ کا

محاصرہ کر لیا مگر سلطان محمود گجراتی کے آنے کی خبر سن کر وہاں سے مل گیا اور اسکے وہاں سے جاتے ہی پھر دولت آباد پہنچ گیا۔ اسی زمانے میں ملک اشرف دلی دولت آباد کا انتقال ہو گیا۔ احمد نظام شاہ بحری کو باسانی اسپر قبضہ مل گیا۔

وہ ایک معرکہ سلطان محمود گجراتی سے کرنا چاہتا تھا مگر عمرے وفانہ کی اور ۹۱۴ھ میں ہفت سالہ برہان کو دلی عہد بنا کر داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ بہت ہوش مند، بہادر، رعایا پرور اور منصف مزاج حکمران تھا، حنفی المسلك اور کسی حد تک پابند شریعت بھی تھا۔

### برہان نظام شاہ بحری

سات سال کا بادشاہ اکابر امراء کے رحم و کرم پر تخت و تاج کا مالک ہوا۔ بعض امیروں نے دعویٰ دار سلطنت کھڑے کئے مگر کسی کی پیش نہ گئی آخر وہ عماد الملک کو تسخیر احمد نگر کیلئے چرمھالائے۔ مکمل خاں سپہ سالار خواجہ جہاں دکنی کی مدد سے صغیر سن بادشاہ کو لے کر مقابلے کیلئے نکلا اور جنگ عظیم کے بعد عماد الملک کو شکست ہوئی۔

مکمل خاں نے برہان نظام شاہ کو ساتھ لیکر تعاقب کیا۔ حاکم برہان پور نے درمیان میں پڑ کر صلح کرادی۔ ۹۲۴ھ میں مکمل خاں نے پرگنہ پاتری فتح کر لیا جسپر عماد الملک نے قبضہ کر لیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد مکمل خاں پیرانہ سانی کے باعث خانہ نشین ہوا اور اس کا بیٹا منصب جلیل سے سرفراز کیا گیا۔

۹۲۸ھ میں شاہ طاہر احمد نگر پہنچے اور برہان نظام شاہ کے ہم جلسیوں میں شامل ہوئے۔

شاہ طاہر فاطمین مصر کی نسل سے تھے۔ ۵۶۴ھ کے بعد صلاح الدین ایوبی نے جب سادات پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تو ان کے اسلاف نے ترک وطن شروع کیا۔ ایک سید قزوین کے قریب موضع خوند میں اقامت پزیر ہوا اور سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا شاہ طاہر تک پہنچتے پہنچتے حلقہ ارادت بہت وسیع ہو گیا۔

محبان اہل بیت کیلئے یہ زمانہ بہت صبر آزما تھا۔ مشائخ اپنا اصل عقیدہ ظاہر کیے بغیر مرید بناتے تھے۔ اند جل جلالہ علی مرتضیٰ اور اہل بیت قدسی صفات ان کا



موضوع گفتگو رہتے۔ کسی اور کے بارے میں اچھا یا برا وہ کہتے ہی نہ تھے۔ صفی الدین اردبیلی کی خانقاہ کا بھی یہی انداز کار تھا اور دوسرے سجادہ نشینوں کا بھی جن میں شاہ طاہر اور ان کے اجداد بھی تھے۔

۹۲۶ھ میں شاہ طاہر میرزا شاہ حسین کے ذریعے صفوی دربار تک پہنچے اور منصب تدریس کا شان پر متعین ہوئے۔ جلد ہی ان کے گرد عقیدتمندوں کا ہجوم ہونے لگا۔ اس سے بعض مقامی رئیسوں کو حسد پیدا ہوا کہ لوگ انکی محفلوں کو چھوڑ کر شاہ طاہر کی مجلس میں ادب سے جا بیٹھتے ہیں پھر شاہ طاہر اپنے نسب کو فاطمین مصر سے ملاتے تھے مگر تبلیغ آل رسول کے مسلک کی کرتے تھے کیونکہ یہی مسلک مصر کے آخری خلیفہ کا تھا۔

اس سے رئیسوں نے شاہ طاہر پر اتہام تراشی کی اور شاہ اسماعیل صفوی کو لکھا کہ وہ عقائد باطلہ کی اشاعت کرتا ہے۔ شاہ اسماعیل نے اسکی گرفتاری کا حکم دیدیا جسکی اطلاع میرزا شاہ حسین نے شاہ طاہر کو دیدی اور وہ فرار ہو گئے۔ ایک کشتی میں اہل و عیال کے ساتھ عازم ہندوستان ہوئے اور کشتی نے انہیں بندر کو وہ پہنچا دیا جہاں سے وہ یجا پور آئے مگر اسماعیل عادل شاہ نے ان پر توجہ نہ کی تو حج و زیارت کو چلے گئے۔ واپسی پر قلعہ پرندہ پہنچے جہاں کا حاکم مخدوم خواجہ جہاں دکنی تھا۔ اس نے انہیں برہان نظام شاہ کی خدمت میں باریاب کیا۔

شاہ طاہر نے سب سے پہلے صحت عقائد پر توجہ دی اور دلائل و براہین سے مذہب مہدیت کا بطلان کیا پھر ۹۳۰ھ میں برہان نظام شاہ اور اسماعیل عادل شاہ کی ملاقات کرائی اور آپس میں رشتہ داری قائم کرائی جسکے نتیجے میں ۹۳۱ھ میں ایک جنگ ہوئی جس میں برہان نظام شاہ کو شکست ہوئی۔

پھر امیر برید کو ساتھ لیکر برہان نظام نے ایلچور فتح کیا۔ عماد الملک برہانپور سے سلطان محمد شاہ فاروقی کو مدد کیلئے لایا مگر دونوں منہزم ہوئے۔ انہوں نے سلطان بہادر شاہ گجرات کے پاس مدد کیلئے سفارت روانہ کی۔ وہ خلجی سلطان پر فتح پاکر مغل سلطنت کا ہمسرہ ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس استدعا پر پھولانہ سمایا اور پورے دکن کو مسخر کر لینے کا خواب دیکھنے لگا اور ۹۳۵ھ میں سلطان پور کے رستے سے دکن

میں وارد ہو گیا۔

برہان نظام شاہ نے اسماعیل عادل شاہ سے اعانت حاصل کی اور اکاد کا لڑائیوں میں عماد الملک اور سلطان محمد شاہ کو سپا کیا مگر سلطان بہادر کا لشکر ایک بحر ذخار کی طرح تھا، اس کا مقابلہ وہ کیا کرتا لہذا میدان چھوڑ دیا اور دوبارہ اسماعیل عادل شاہ سے مدد مانگی، اس نے مزید پانچ ہزار سوار بھیج دئے لیکن گجراتی لشکر کے سامنے اس مجموعی فوج کی حقیقت کیا تھی۔ اگر بات صرف شجاعت کی ہوتی تو برہان نظام اور علی برید کم نہ تھے مگر تعداد افواج تو پٹانے اور ہاتھیوں پر وہ غالب کیونکر آتے لہذا صلح کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

اس مرحلے میں شاہ طاہر نے بہت مدد کی۔ سفارت کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دئے۔ برہان نظام شاہ کو لے جا کر سلطان بہادر سے ملوایا اور سلطان بہادر نے برہان شاہ کو خطاب شاہی کے ساتھ چتر زنگا اور پرچم عنایت کیا۔

۹۳۸ھ میں نظام برہان سے اسماعیل عادل شاہ کی جنگ ہوئی جس میں سپاہ احمد نگر نے شکست کھائی۔ ۹۳۹ھ میں دونوں کے مابین صلح ہو گئی اور اسکے بعد ہی اسماعیل عادل شاہ کا انتقال ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد برہان نظام کا سب سے چھوٹا بیٹا شہزادہ عبدالقادر تب محرقہ میں مبتلا ہوا اور اسکے بچنے کی کوئی امید نہ رہی اور بادشاہ بالکل مایوس ہو گیا تو شاہ طاہر نے دبی زبان سے کہا۔

اگر شاہزادے کا بخار ایک رات میں اتر جائے تو آپ وعدہ کریں کہ زر خطیہ آئمہ معصومین کے نام پر سادات میں تقسیم کریں گے۔

”یہ آئمہ معصومین کون ہیں؟“ برہان نظام نے پوچھا اور شاہ طاہر نے سرور کائنات فاطمہ زہرا، حضرت علی اور دوازدہ آئمہ کے حالات بے کم و کاست بیان کر دئے اور جب برہان نظام نے وعدہ کر لیا تو اسی تسلسل میں کہا۔ صرف استہابی نہیں بلکہ اپنا اعتقاد بھی درست کریں گے اور آل رسول کے مسلک کی اشاعت پر توجہ فرمائیں گے۔“

برہان نظام کو بچنے کی کوئی امید نہ تھی پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ اولاد رسول



اتنی بابرکت ہے تو وہ دوسروں کا دامن کیوں تھامے رہے اس نے ہر قسم کا وعدہ کر لیا پھر شاہ طاہر نے دعا پڑھ کر اسپر پھونکی اور ایک نظر اسپر ڈال کر چلے گئے۔ برہان نظام شاہزادے کو ایک رات کا مہمان سمجھتا تھا اس لئے خود بھی اسکے قریب بیٹھے سو گیا تو خواب میں دیکھا کہ۔

”ایک بزرگ نمودار ہوئے جتنکے دلہنے بائیں بارہ آدمی دکھائی دئے۔ بزرگ کے چہرے کی جلالت سے برہان نظام مودبانہ کھڑا ہو گیا کہ ایک آواز کان میں پڑی۔ جانتا ہے کہ یہ کون ہیں؟ حضرت رسالت پناہ ہیں اور یہ بارہ نفوس انکی اولاد میں ہیں جو دوازدہ امام کہلاتے ہیں۔ برہان نظام قدموں پر گر جانا چاہتا تھا کہ بزرگ نے فرمایا حق سبحانہ تعالیٰ نے علی اور ان کے فرزندوں کی برکت سے تیرے بیٹے کو شفادی۔ تجھے چاہئے کہ میرے بیٹے طاہر کے کہنے پر عمل کرے۔“

اسکے بعد وہ سب نظروں سے اوجھل ہو گئے اور برہان نظام شاہ کی آنکھ کھل گئی۔ عبدالقادر تپ کی شدت میں لحاف اپنے اوپر ڈالنے نہ دیتا تھا مگر اس وقت برہان نظام شاہ نے دیکھا تو لحاف اسپر پڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا کہ لحاف کس نے ڈالا جو ابابہر ایک نے انکار کیا بلکہ دور بیٹھی ہوئی دایہ نے کہا۔

”میں اسکی طرف دیکھ رہی تھی کہ لحاف خود بخود اٹ کر اسکے اوپر جا گرا۔“

اب برہان نظام اسکو اس حالت میں دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔ شکر کے الفاظ اسکے منہ سے نکلے پھر وہ کافی دیر تک خاموش رہا اور جب خوشی کا غلبہ کچھ کم ہوا تو اس نے طاہر شاہ کو بلانے کیلئے آدمی بھیجے۔ انہوں نے انکو سجادہ عبادت پر پایا جو رات بھر دستار ہاتھوں پر رکھے محو دعا رہے تھے۔ ایک آدمی کے بعد فوراً دوسرا پہنچا تو انہیں شک ہوا کہ شاید انکی دعا قبول نہیں ہوئی پھر بھی وہ شکر الہی کرتے ہوئے چل پڑے اور برہان شاہ ان کو دیکھتے ہی حیرت سا پڑا۔

میں آئمہ اشعا عشر کا مذہب اختیار کرتا ہوں۔

طاہر شاہ کو خدا کی رحمت پر یقین کلی تھا پھر بھی بشریت کے تقاضے سے ایک وغدہ سا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے اسی وقت مصلیٰ منگو کر پہلے دو رکعت نماز شکرانہ پڑھا اور پھر برہان نظام شاہ سے تفصیل دریافت کرنے لگے۔ اتنے میں شاہزادہ اٹھ کر آئے۔

خود باہر آگیا طاہر شاہ نے اسکی پیشانی کا بوسہ لیا پھر برہان نظام سے پورا واقعہ سنا اور اسکو بتایا۔

”آل محمد کے دوستوں سے دوستی اور دشمنوں سے دشمنی رکھئے یہی ہمارا مذہب ہے۔“

پھر انہوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا۔

”عجلت نہ فرمائیں۔ مسلمانوں کے ہر مسلک کے علماء کو طلب کیجئے، ہر نظریہ فکر کے دلائل و براہین سماعت فرمائیے پھر فیصلہ کیجئے۔ اعجاز دل پر صداقت کا سکھ ضرور بٹھا دیتا ہے لیکن عقل سے بھی اس مسلک کو سمجھنا ضروری ہے جسکو آپ اختیار کرنے جارہے ہیں۔“

برہان نظام شاہ نے اسی پر عمل کیا۔ ملا پیر محمد استاد، افضل خاں نانپہ، ملا داؤد دہلوی اور دوسرے تمام علماء جو احمد نگر میں موجود تھے بلائے گئے۔ سب نے ایک دوسرے سے مناظرہ کیا اور اپنے مذہب کو برحق قرار دیا۔ تب برہان نظام نے طاہر شاہ سے کہا: ”ان کے علاوہ کوئی اور مذہب ہے۔“

طاہر شاہ نے بتایا: ”پانچواں مذہب شیعہ ہے جو آئمہ اشعا عشر کو مانتا ہے۔“

شیخ احمد نجفی کو پہلے سے بلایا گیا تھا۔ اس نے مذاہب اربعہ سے مناظرہ کیا کوئی قائل ہوا یا نہیں لیکن اکثر مقامات پر لوگوں کی زبانیں بند ہو گئیں پھر شاہ طاہر نے کتب اہل سنت کے حوالوں سے بحث کی، واقعہ قرطاس اور مسئلہ فدک کے ساتھ حدیث توریث کا حوالہ دیا کہ رسول اکرمؐ نے ایک طرف بیٹھی گوہبہ نامہ لکھ کر دیدیا دوسری طرف حضرت ابو بکرؓ کے بیان کے مطابق ان سے یہ کہہ دیا کہ ابنیاء اپنی سیراث نہیں چھوڑتے لیکن نہ ماننے والے سے کوئی بات سنوائی نہیں جاسکتی۔ مجبوراً خود برہان نظام شاہ نے اپنا خواب بیان کیا اور عبدالقادر کے بارے میں بتایا کہ ایک عرصے کی تپ محرقہ ایک ساعت میں غائب ہو گئی۔

اسپر اکثر علمائے مجلس، مقربان بارگاہ، غلامان ہندی و حبشی اور دیگر متعلقین اسی وقت دائرہ شیعیت میں داخل ہو گئے، خطبے سے اصحاب ثلثہ کے نام نکال دئے گئے اور آئمہ اشعا عشر کے اسمائے مقدس سرور کائنات کے بعد بڑھادئے گئے۔



ملا پیر محمد نے باہر نکل کر برہان نظام کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور کوئی بارہ ہزار سواروں اور پیادوں نے قلعہ کو گھیر لیا۔ برہان نظام شاہ نے صورت حال سے آگاہ ہو کر قلعے کے دروازے بند کر دئے اور فصیل پر توپیں چڑھوا دیں۔ پھر برہان نظام شاہ چار سو سوار، ایک ہزار پیادے اور پانچ ہاتھی لیکر چتر سبز اور علم لیکر قلعہ سے براہ ہو کر ایک جماعت نے آگے بڑھ کر اعلان کیا۔

جو سرکار کا دولت خواہ ہو، وہ چتر و رایت کے سایے میں چلا آئے۔

اسپر اکثر امراء اور افسران فوج ادھر سے ٹوٹ کر ادھر آ گئے اور ملا پیر محمد ایک قلیل سپاہ کے ساتھ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ برہان نظام شاہ نے بعض افسروں کو بھیج کر اسکو گرفتار کرایا اور قتل کا حکم دیدیا مگر طاہر شاہ کی سفارش پر قید کرنے پر اکتفاء کی اور چار سال بعد رہا کر دیا۔ (۷۸)

برہان نظام شاہ نے خواب دیکھنے کی جگہ پر ایک عمارت عالی تعمیر کرا دی جس میں حسین نظام نے مسجد کا اضافہ کیا۔

اسکے بعد برہان نظام شیعیت کے فروغ میں ہمہ تن مصروف ہو گیا لیکن کسی پر جبر نہیں کیا جسکے نتیجے میں لوگ خود اس عقیدے کو قبول کرتے رہے۔ اس میں شاہ طاہر اور دوسرے علماء کی تقریروں نے بھی اہم کردار ادا کیا کیونکہ لوگوں کو حقیقت کا علم ہی نہیں تھا جب معلوم ہوا تو ذہنی انقلاب آیا۔

آج بھی یہی کیفیت ہے کہ روشنی پر پردے ڈال دئے جاتے ہیں اور غلط باتیں منسوب کر کے جھوٹی روایات کا سہارا لیا جاتا ہے پھر تاکید یہ کی جاتی ہے کہ خبردار شیعوں کی مجلسوں میں نہ جانا، اس سے بغض صحابہ پیدا ہوتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ کیا کیا ہے صحابہ نے جو ان سے بغض پیدا ہو گا؟ اگر کچھ نہیں کیا ہے تو ڈرنا کیا ان حالات کی شہرت ہوئی تو سلطان محمود گجراتی، میران مبارک شاہ فاروقی،

ابراہیم عادل شاہ اور عماد الملک نے باہم ایک منصوبہ بنایا کہ احمد نگر فتح کر کے آپس میں تقسیم کر لیں۔ اس خبر پر برہان نظام شاہ نے سلطان گجرات اور برہان پور کو تحائف بھیج کر ہموار کر لیا اور اسی درمیان ابراہیم عادل شاہ نے جو شیعہ سپاہی اور تہ انداز تعصب میں برطرف کیے تھے ان سب کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کر لیا اور ابراہیم

عادل شاہ کے حملے سے قبل خود بیجا پور کی طرف چل پڑا۔

احمد نگر اور بیجا پور کی فوجوں میں ایک ہونا ک جنگ ہوئی جس میں ابراہیم عادل شاہ ہزیمت یاب ہوا۔ سو ہاتھی اور کئی توپخانے برہان نظام شاہ کے ہاتھ آئے۔ پھر چار سال کی مدت میں کئی لڑائیاں ہوئیں اور ہر مرتبہ برہان نظام شاہ کامیاب ہوا ۹۳۹ھ میں ابراہیم عادل شاہ اور اسد خاں کے درمیان نا اتفاقی ہو گئی جو

بیجا پور کی طرف سے قلعہ نکلوان کا حاکم تھا تو برہان نظام شاہ امیر برید کے تعاون سے بیجا پور کی طرف بڑھا اور یہ مشہور کر دیا کہ اسد خاں نے ہم مذہب ہونے کی بنا پر قلعہ نکلوان حوالے کرنے کیلئے بلایا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کو یقین ہو گیا، وہ مقابلے پر نہیں آیا

برہان نظام شاہ نے شوالا پور کے قریب پانچ پرگنوں پر قبضہ کیا پھر ولایت مرچ کلہرا، مان اور باس کو تاراج کیا۔ اس موقع پر اسد خاں واقعی اس سے آملہ کیونکہ اس پر جو تہمت لگائی گئی تھی اسکے سبب وہ عادل شاہ کے پاس نہ جاسکتا تھا۔ چھ ہزار سوار اسد خاں کے ساتھ تھے اس سے برہان نظام کی طاقت بڑھ گئی۔ ابراہیم عادل شاہ اسکے مقابلے کی تاب نہ لاسکتا لہذا حسن آباد گلبرگہ کی طرف چلا گیا اور برہان نظام نے اس کا تعاقب کیا۔

اس عرصے میں عماد الملک بیجا پور کی مدد کو آ گیا تو اسد خاں بھی اس سے جا ملا اور برہان نظام کمزور پڑ گیا۔ ابراہیم عادل شاہ مقابلے پر آیا تو وہ دولت آباد کی طرف ہٹ گیا اس درمیان امیر برید کا انتقال ہو گیا تو برہان نظام نے صلح کر لی۔

۹۵۰ھ کے بعد برہان نظام اور عادل شاہ میں جنگ ہوئی جس میں پہلے احمد نگر کو کامیابی ہوئی پھر اس نے شکست کھائی۔ چونکہ علی برید اپنے باپ کی روش کے خلاف بیجا پور سے جا ملا تھا لہذا فرصت پاتے ہی برہان نظام شاہ نے علی برید کے قلعوں میں اوسہ کو مسخر کیا۔ اس اثناء میں علی برید نے مدد کیلئے ابراہیم عادل کو بلایا مگر برہان نظام نے دونوں کو شکست دی پھر یکے بعد دیگرے کئی قلعے فتح کر لیے اور قلعہ قندھارا کی طرف متوجہ ہوا۔ علی برید اور ابراہیم عادل نے ایک بار پھر مقابلہ کیا اور کافی گھوڑے ہاتھی چھوڑ کر میدان سے بھاگنا پڑا۔

۹۵۶ھ میں شاہ طاہر نے رحلت فرمائی۔ ایک متبر عالم حدیث دفعہ اور تفسیر



ہنچا تو وہ پٹن کی طرف چلا گیا تاکہ دریا عماد الملک، میران مبارک فاروقی اور علی برید سے مدد حاصل کرے۔ اس مدت میں رام راج نے احمد نگر فتح کر کے اسکو تباہ و برباد کر ڈالا۔ حسین نظام سے کچھ اور نہ بنا تو یجپاپور کی سرحدوں کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ حسین نظام کیلئے اسکے علاوہ کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا کہ رام راج سے صلح کی درخواست کرے۔ اس نے تین شرطیں رکھیں: قلعہ کلیان اسکو دیا جائے، جہاں گیر خاں کو قتل کیا جائے جس نے یجپانگر کے لشکر کو بہت نقصان پہنچایا تھا اور حسین نظام خود رام راج کی خدمت میں حاضر ہو کر اسکے ہاتھ سے پان کا بیڑا کھائے۔ بہان نظام کے بہادر بیٹے کے سامنے دو راستے تھے: ایک سلطنت احمد نگر سے دست برداری، دوسرا ایک یار و نادر کا خون! وہ مسلسل سوچتا رہا مگر خود اپنے ہاتھوں جہانگیر خاں کا قتل استیسا آسان تو نہ تھا تاہم اسکو منظور نہ کرنے کی صورت میں پوری سلطنت کی تباہی، لاکھوں مسلمانوں کا خون اور تمام مساجد کا انہدام جس کا اندازہ تسخیر احمد نگر میں ہو چکا تھا۔ آخر ان تمام باتوں کو ایک طرف رکھ کر اس نے جہانگیر خاں کے سر سے ان کا توازن کیا تو جہانگیر خاں کے سر کا پلہ بہت ہلکا معلوم ہوا اور اس نے رام راج کی شرطیں مان لیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ باونا اور شجاع جہانگیر خاں حسین نظام کی بزدلی کی بھینٹ چرہ گیا لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو حسین نظام کی بے چارگی اسی کی مقتضی تھی اور دور اندیشی کا مطالبہ بھی ہی تھا۔ سلطنت احمد نگر کی بقاء سے کتنے ہی جہانگیر خاں پیدا ہو سکتے تھے۔ سلطنت پر برہمن مسلط ہو جاتے تو مسلمانوں اور ان کے مذہب کا خدا حافظ تھا۔

حسین نظام قلعہ کلیان کی چابیاں اور جہانگیر خاں کا سر لے کر رام راج کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا اور اسکے ہاتھ سے لیکر پان بھی کھالیا جو اسکے عقیدے میں بخش تھا لہذا اسی وقت طشت اور آفتابہ منگو کر کلی کی اور ہاتھ غوطہ کیا۔

رام راج کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور وہ کالے سانپ کی طرح بیچ و تاب کھانے لگا اور اس نے بھی طشت و آفتابہ منگو کر ہاتھ دھویا گویا وہ بھی حسین نظام کو ناپاک سمجھتا ہے۔ پھر اس نے قلعہ کلیان کی چابیاں علی عادل شاہ کو بھجوا دیں۔

میں کامل، ریاضی اور دیگر علوم میں ماہر ایسے باکمال کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اسکے بعد بہان و ابراہیم ایک بار پھر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئے اور عید کے دن بہان نظام نے حملہ کر کے لشکر عادل شاہی تباہ کیا اور قلعہ کلیان و پرندہ فتح کیے پھر رام راج سے صلح کر کے قلعہ شوالاپور پر قبضہ کیا اور رام راج نے راجپور اور مدگل کو مسخر کر لیا۔

۹۶۰ھ میں بہان نظام نے یجپاپور کے بعض پرگنہ فتح کیے، ۹۶۱ھ میں یجپانگر کی فوجوں کو ملا کر یجپاپور کا محاصرہ کیا۔ عادل شاہ تاب مقابلہ نہ لاکر بنانہ کی طرف بھاگ گیا۔ اسی دوران بہان نظام شاہ بھری اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اسکی لاش امانٹار کھوادی گئی پھر کر بلانے معلیٰ لے جا کر دفن کی گئی۔

### حسین نظام شاہ بھری

بھائیوں اور بعض امراء کی مخالفت کے باوجود وہ تیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور آہستہ آہستہ ہر خلفشار پر اس نے قابو پایا۔ اس کا سب سے بڑا مخالف ابراہیم عادل شاہ تھا۔ وہ اپنے مقبوضات واپس لینے کی خاطر حملہ آور ہوا مگر حسین نظام کی تدبیر یا مقدر کی خوبی سے شکست کھائی۔ پھر ابراہیم قطب شاہ سے اسکی سخت جنگ ہوئی۔ گو لکنڈہ کے سپہ سالار قبول خاں نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ بعض امراء نے نظام شاہیہ مارے گئے اور انکی فوجوں کو فرار ہونا پڑا۔

آخر حسین نظام نے ابراہیم قطب شاہ سے صلح کر لی اور کچھ دنوں بعد اسکے تعاون سے قلعہ گبرگہ پر ہلہ بولا۔

ابراہیم عادل شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ علی عادل شاہ کا عہد تھا۔ گبرگہ کا قلعہ حسین نظام کے حصار میں تھا۔ فتح قریب تھی کہ قطب شاہ کچھ سوچ سمجھ کر ساتھ چھوڑ گیا تو حسین نظام بھی احمد نگر کی طرف پلٹ گیا۔

۹۶۶ھ میں حسین نظام نے عماد الملک کی بیٹی سے عقد کر کے اس سے رشتہ ہموار کیا۔ ۹۶۷ھ میں قلعہ کالند فتح کیا۔ اس عرصے میں علی عادل شاہ رام راج رائے یجپانگر سے تعلقات استوار کر کے احمد نگر فتح کرنے کا عزم ہو گیا اور اسکے ساتھ ہی ابراہیم قطب شاہ کو بھی اس نے ملا لیا۔ جب یہ متحدہ لشکر جہاں احمد نگر کے قریب



حسین نظام نے زہر کا یہ گھونٹ لی تو لیا تھا لیکن ضمیر کی آواز پر بہت دنوں تک سو نہ سکا۔ اب اسکے سامنے دو مقصد تھے علی عادل شاہ سے انتقام لینا اور متکبر رام راج کو سزا دینا لیکن اسکی فوجی طاقت اتنی نہ تھی کہ بیک وقت ان دونوں سے نبرد آزما ہو سکتا اس لئے قلعہ کی درستی کے بعد اس نے سب سے پہلے لشکر پر توجہ کی۔ ۹۴۰ھ میں اس نے اپنی بیٹی بی بی جمال کی شادی ابراہیم قطب شاہ سے کی اور اس سے ایک مضبوط رشتہ قائم کیا پھر قلعہ کلیان کو مسخر کیا اور علی عادل شاہ اور رام راج کی فوجوں سے سخت ٹکری مگر برسات کے سبب تو بخانہ دلدل میں پھنس گیا اور حسین نظام اور ابراہیم قطب شاہ دونوں کو شکست ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

فوجیں تعاقب میں تھیں مگر حسین نظام نماز ظہر کا وقت آنے پر گھوڑے سے اتر پڑا، سپاہیانہ لباس علیحدہ کیا اور نماز ادا کر کے پھر سوار ہو گیا۔ تعاقب میں آنے والے فوجی قریب آنے کی جرات نہ کر سکے اور وہ گھوڑے پر روانہ ہو گیا۔

رام راج علی عادل شاہ بہان عماد الملک اور علی برید کی افواج بڑھتی ہی رہیں۔ مجبوراً حسین نظام پھر احمد نگر کو خدا پر چھوڑ کر جتیر کی طرف ہٹ گیا۔ اس مرتبہ رام راج کے لشکر نے پہلے سے زائد احمد نگر کو لوٹا اور اتنی بربادی کی کہ مسجدیں کھنڈر بن گئیں۔ حسین نظام نے جہانگیر خاں کا خون جن باتوں سے پچھنے کیلئے دیا تھا وہی سب کچھ عمل میں آیا اور وہ نقصان مایہ اور شہادت ہمسایہ دونوں میں بٹکا ہوا۔ حسین نظام نے بھی اپنی قوت کے بقدر بجا پوری علاقوں کو تاراج کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہ کیا تھا لیکن اس سے اس غارت گری کا بدل تو نہ ہو سکتا جو علی عادل شاہ کی لائی ہوئی بلارام راج کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئی تھی۔

اس کا احساس خود علی عادل شاہ کو بھی تھا۔ آخر وہ اعمال ماضی کا کفارہ ادا کرنے پر تیار ہوا۔ حسین نظام کو اس سے نفرت تھی مگر بات آگئی تھی کفر و اسلام کی لہذا وہ رام راج کے خلاف اتحاد کرنے پر تیار ہو گیا اور اس نے تمام مسلم سلاطین کو ایک پرچم تلے جمع کر لیا۔

میدان تالی کوٹہ کی خوفناک جنگ دکن کی تاریخ میں کفر و اسلام کی سب

سے بڑی جنگ تھی جس کا عنوان حسین نظام نے جہانگیر خاں کے خون سے لکھا تھا لیکن اس کا کم سے کم نتیجہ یہ نکلا کہ اسکے بعد کئی صدیوں تک اس سرزمین پر اسلام کا پرچم ہراتا رہا۔

رام راج اور اسکی سلطنت نیست و نابود ہو گئی اور پھر اسکی اولاد مسلمانوں کے رحم و کرم پر زندہ رہی۔ وقتی طور پر مورخ نے حسین نظام کو مطعون کیا کہ اس نے رام راج کو خوش کرنے کیلئے خود اپنے سرفروش کا خون کر دیا لیکن اگر حسین نظام رام راج کی شرائط قبول نہ کرتا اور احمد نگر میں برہمن راج قائم ہو جاتا تو عادل شاہی حکومت کتنے دن زندہ رہتی جس کا ایک حصہ رام راج پہلے ہی ہڑپ کر چکا تھا اور گو لکنڈہ بھی اپنے سرحدی علاقے کھو چکا تھا، انجام یہ ہونا تھا کہ بیجانگر کی سرحدیں پھیلتی جاتیں اور دکن کی پوری بساط پر تنخانے ہی تنخانے نظر آتے جن کا توڑ ڈالنا مغلوں کیلئے آسان نہ ہوتا اس لئے زائد سے زائد حسین نظام کے عمل کو خود غرضانہ دور اندیشی کا نام دیا جاسکتا ہے جس کا دور رس نتیجہ محاربہ تالی کوٹہ میں برآمد ہوا۔

اس جنگ میں یوں تو دکن کے تمام مسلم سلاطین شامل تھے لیکن ان کا ہیرو رام راج کے ہاتھوں کئی بار شکست خوردہ حسین نظام شاہ بھری تھا۔ جنگ سے فارغ ہو کر حسین نظام بڑے فخر و مباہات کے ساتھ احمد نگر واپس ہوا لیکن اسکی زندگی نے وفانہ کی اور چند ہی روز بعد وہ ابدی آرام گاہ کی طرف سدھار گیا۔ شاید اس کا مقصد حیات پورا ہو چکا تھا اور اب دکن کو اسکی ضرورت نہ رہی تھی۔

### مرد تضحی نظام شاہ بھری

شہرہ آفاق حسین نظام کے بیٹے میں باپ کی سی صلاحیت نہ تھی۔ اسکی ماں خونزہ ہمایوں بھی شوہر کے بعد امور سلطنت میں دخیل ہو گئی تھی۔ اس نے علی عادل شاہ کے حملوں کا توڑ کیا اور دونوں میں صلح کرادی پھر دونوں نے مل کر برابر حملہ کیا کیونکہ اس نے رام راج کے مقابلے میں کوئی تعاون نہ کیا تھا۔ اس حملہ میں برابر کو بہت نقصان پہنچا اور دونوں بادشاہ انتقام لے کر واپس ہو گئے۔

۹۴۵ھ میں علی عادل شاہ نے نظم مملکت کمزور پڑ جانے کے سبب کئی علاقے



فتح کر لیے۔ مرتضیٰ نظام نے حقیقت سے مطلع ہو کر ماں کو بڑے احترام کے ساتھ نظر بند کر دیا۔ اس نے خود مرتضیٰ کو گرفتار کر لینے کا بندوبست کیا اور امراء احمد نگر میں سخت کھینچا تانی ہونے لگی جسکے نتیجے میں سلطنت کمزور پڑ گئی۔ آخر مرتضیٰ نظام نے اپنی والدہ کو گرفتار کر لیا۔

سلطنت کی اس بد نظمی سے عادل شاہی امیر کشور خان نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ حدود نظام شاہی داخل ہو گیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ ۹۸۰ھ میں اسکی سرکوبی کیلئے روانہ ہوا تو وہ قلعہ دارور میں محصور ہو گیا جو ہر طرح مضبوط و مستحکم تھا۔ نظام شاہی لشکر کے قریب پہنچتے ہی اندر سے گولہ باری اور تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ امراء کی رائے تھی کہ پیچھے ہٹ کر توقف کیا جائے مگر مرتضیٰ نظام جوش غضب میں بڑھتا چلا گیا۔ کئی گولیاں اسکو مس کرتی ہوئی گزر گئیں مگر اس نے پرواہ نہ کی۔

آخر نظام شاہی لشکر بھی تیر اندازی کرتا ہوا بڑھا۔ شدید جنگ ہوئی ایک تیر کشور خان کو جا کر لگا اور وہ موقع ہی پر گر گیا پھر اسکے ساتھ والوں کے حوصلے پست ہو گئے اور مرتضیٰ نظام قلعہ میں داخل ہو گیا۔

کشور خان کے بعد دو عادل شاہی امیر عین الملک اور نور خان دس بارہ ہزار سواروں کے ساتھ احمد نگر کی طرف بڑھے۔ انہیں گھیر کر زندہ پکڑ لیا گیا۔ نظام شاہ کے دل میں علی عادل شاہ سے کدورت پیدا ہو گئی مگر شاہ ابوالحسن نے سفارت کے فرائض انجام دے کر اسے دور کر دیا۔

انہیں دنوں ساحل پر قلعہ ریکندہ کے مغربی عیسائیوں نے مسلمانوں کو بہت پریشان کیا۔ مرتضیٰ نظام نے خود جا کر ان کا محاصرہ کیا یہ قلعہ جدید آلات حرب سے مسلح تھا توپ کی ضربوں اور گولوں سے کافی مسلمان شہید ہو گئے نظام شاہ کے بعض غدار امیر چوری چھپے انہیں ضروریات کی چیزیں پہنچا دیتے تھے۔

مسلمان جو فرنگیوں کی قید میں تھے ان میں سے دو مسلمان دیواریں بچانہ کر نکل آئے۔ انہوں نے سارا حال مرتضیٰ نظام سے کہہ سنایا اور وہ طویل محاصرہ سے تنگ آکر احمد نگر واپس ہو گیا یہاں پہنچ کر اس نے تمام امراء کو مجبوس کیا اور جنگی

کو بلند مرتبہ بنایا۔

برار میں عماد الملک کے مرنے کے بعد برہان عماد الملک برائے نام بادشاہ تھا۔ سارے اختیارات تغال خاں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ مرتضیٰ نظام نے اسکو لکھا کہ برہان عماد الملک اب بڑا ہو گیا ہے شاہی اختیارات سے اسکے حق میں دست بردار ہو جائے مگر اس نے جواب سخت دیا تو مرتضیٰ نظام نے جنگیز خاں کو متعین کیا۔

تغال خاں اور اسکا بیٹا شمشیر الملک ایک لشکر گراں لیکر مقابلے پر آئے۔ زبردست جنگ واقع ہوئی مگر جنگیز خاں بھوکے شیر کی طرح حملے پر حملے کرتا رہا۔ انجام کار دونوں باپ بیٹے شکست کھا کر بھاگے۔ دو سو ستر منتخب ہاتھی جنگیز خاں کے ہاتھ آئے تغال خاں فرار ہو کر کسی نہ کسی طرح برار جا پہنچا۔ مرتضیٰ نظام نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا مگر اس کا فتح ہونا آسان نہ تھا لہذا جنگیز خاں نے مکر و حیل کر کے اسکو فحش کیا اور تغال خاں کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ مرتضیٰ نظام نے اس مملکت کو اپنے امیروں میں بانٹ لیا اور بیدر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسکے بعد ہی محمد شاہ فاروقی نے برہان عماد الملک کو دریا عماد الملک کا خطاب دیکر تخت برار پر بٹھا دیا۔ امراء نظام شاہی سے کئی جنگیں ہوئیں جن میں فاروقی کو شکست ہوئی لیکن دریا عماد الملک برار کے ایک حصے پر قابض رہا۔

"اسکے بعد مرتضیٰ نظام شاہ خبط یا خلل دماغ کے سبب سولہ سال تک گوشہ نشین رہا اور مہمات ملکی تمام کے تمام اراکین دولت انجام دیتے رہے۔ ایک یا دو خدمتگاروں کے علاوہ کوئی اسکے پاس جانہ سکتا۔ جب کوئی اہم مرحلہ درپیش ہوتا مرتضیٰ نظام اندر ہی سے اسکی ہدایات دیدیتا تھا۔" (۷۹)

مرتضیٰ نظام کے پورے عہد کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ایک جنون کی سی کیفیت شروع ہی سے پائی جاتی تھی، جو کچھ اسکے دماغ میں سما جاتا اسپر وہ کسی پاگل کی طرح عمل کرتا تھا، جیسا کہ کشور خان کے معرکے میں اس نے کیا تھا کہ توپوں کی گولہ باری میں بڑھتا ہی چلا گیا تھا پھر شاہ میرزانے مختلف طریقوں سے اسکے ذہن نشین کرایا کہ جنگیز خاں غدار ہے اور اسکو ہٹا کر سلطنت پر قبضہ کرنا



چاہتا ہے تو اس نے جنگیز خاں کو زہر دلوادیا۔

وہی اور غیر متوازن دل و دماغ کا فرمانروا حد سے زائد اہتمام پسند بن گیا تھا جس سے اسکو نفرت ہو جاتی اسکی جان کے لالے پڑ جاتے اور جسکو چاہتا تو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کا ایک خوبصورت غلام صاحب خاں تھا جو اسکو بہت عزیز تھا اس حد تک عزیز کہ لوگوں کو صاحب خاں سے اسکے گھناؤنے تعلقات کا شبہ ہوتا جسکو ناممکن نہیں کہا جاسکتا لیکن مرتضیٰ نظام ایک مذہبی بادشاہ تھا، سادات نواز اہل بیت کا دلدادہ اور شیعیت کے فروغ میں دیوانگی کی حد تک مہمک، اس سے ایسی توقع نہ ہو سکتی پھر بھی مرتضیٰ نظام کی عزت گزینی میں اسکے پاس جانیوالوں میں ایک دو غلاموں کے علاوہ صرف صاحب خاں تھا جو بے دھڑک اندر جاسکتا تھا۔ اس لئے شبہات کو یکسر رد نہیں کیا جاسکتا۔

ایک روایت کی رو سے اسکی گوشہ نشینی جہانگیر خاں کو زہر دلوانے کے بعد شروع ہوئی اور حقیقت کا انکشاف ہونے پر وہ احتیاد نام تھا کہ خود اپنے کو اپنا چہرہ نہ دکھا سکتا لہذا چھپ کر بیٹھ گیا تھا پھر اس کا عادی ہو گیا۔

مرتضیٰ نظام کی گوشہ نشینی ملک کیلئے اس اعتبار سے مفید تھی کہ لوگ اس کا نشانہ ستم بننے سے محفوظ تھے لیکن اسکے بجائے دوسرے امراء عوام پر مظالم کے پہاڑ ڈھا رہے تھے جن میں صاحب خاں پیش پیش تھا۔ وہ بادشاہ کے حکم کا غلط حوالہ دے کر اتنی سنگدلانہ اور بیرحمانہ حرکتیں کرتا کہ امراء تک بغاوت پر آمادہ ہو جاتے۔ احمد نگر خانہ جنگی کا اکھاڑہ بن گیا تھا جس کا اثر بیجا پور، احمد آباد، بیدر اور گولکنڈہ پر بھی پڑا اور ہوس ملک گیری میں ایک دوسرے کے سرحدی علاقوں پر تاخت کرنے لگا سب سے زیادہ متاثر خود سلطنت احمد نگر ہوئی۔

مرتضیٰ نظام کو جب ان حالات سے مطلع کیا گیا تو اس نے اسکی گرفتاری یا قتل کا حکم دیدیا اور خداوند خاں نے اس کا کام تمام کر دیا۔

۹۸۸ھ میں علی عادل شاہ وفات پا گیا اور ابراہیم عادل شاہ ثانی اس کا جانشین ہوا۔ پھر کچھ عرصے بعد ابراہیم قطب شاہ جو اررحمت میں جا بسا اور قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا تاجدار ہوا۔

پھر مرتضیٰ نظام اور قلی قطب شاہ نے مل کر بیجا پور کے بعض قلعوں کو فتح کرنے کیلئے متحدہ حملہ کیا مگر ناکام ہو کر واپس ہو گئے۔

۹۹۲ھ میں سپہ سالار لشکر نظام سے صلابت خاں کے لشکر کا مجاہدہ ہوا پھر صلح ہو گئی اسکے بعد صلابت خاں نے مرتضیٰ نظام کا علاج کرانے کی تدابیر کیں۔ کچھ دنوں کے وقفے سے سید مرتضیٰ اور خداوند خاں احمد نگر پر حملہ آور ہوئے۔ شاہزادہ میران مرتضیٰ اور صلابت خاں نے انکو شکست دی اور وہ دونوں مع شاہزادہ بہان اکبر اعظم کے پاس جا کر فریادی ہوئے اس نے مرزا عزیز کو کلتاش کے ساتھ ان سب کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ بعض سرداروں نے لشکر مغل کا مقابلہ کیا مگر کوئی فتح برآمد نہ ہوا۔

اسی دوران صلابت خاں نے مرتضیٰ نظام کے مزاج کی یکسوئی کی خاطر ایک خوبصورت گانے والی اسکے ساتھ لگا دی تھی جو مرتضیٰ نظام پر چھا گئی اور دولت و جائداد سے نوازی گئی۔

شاہزادہ میران بن مرتضیٰ کا عقد عادل شاہ کی بہن سے ہو چکا تھا۔ انہیں دنوں اسکی رخصتی عمل میں آئی مگر مرتضیٰ نظام نے بدگمان ہو کر اسکو قید کر دیا۔ اسکی طبیعت اعتدال پر نہ آئی تھی، اکثر دیوانوں کی سی حرکتیں کر بیٹھتا۔ آخر بعض امراء نے میران حسین کو قید سے نکال کر اسکو تخت نشین کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مرتضیٰ نظام کی حالت روز بروز خراب ہوتی رہی۔ آخر وہ ۹۹۹ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا اور اسکی لاش کر بلانے معلیٰ بھیج دی گئی اسکے دور میں شیعیت کو بہت فروغ ہوا۔ سادات اور محبان آل رسول کو وظائف ملتے رہے۔ مرتضیٰ نظام جیسا بھی ہو مگر عزائے امام حسین پر اس نے اپنی توجہ مبذول رکھی جسکے لئے جائدادیں وقف تھیں۔

### میران حسین بن مرتضیٰ نظام

میران حسین سولہ سال کی عمر میں باپ کے بعد تخت پر بیٹھا۔ وہ ظالم و اوباش تھا لہذا امراء نے بہان شاہ بن حسین نظام کے دو بیٹوں میں سے کسی ایک کو تخت نشین کر نیکا فیصلہ کر لیا اور بارہ سال کے اسماعیل کو بادشاہ بنادیا جس سے



بعض امراء نے اتفاق نہ کیا۔ ان میں جمال خاں پیش پیش تھا جو مہدوی مذہب رکھتا تھا وہ ایک بڑی جماعت لیکر چڑھ دوڑا۔ اسپر مرزا خاں نے میران حسین کو قتل کر دیا اور سر اس کا جمال خاں کے پاس بھیج دیا۔ اس نے مشتعل ہو کر قلعہ پر حملہ کر دیا اور امراء جانیں بچا بچا کر بھاگ نکلے۔

جمال خاں قلعہ پر قابض ہو گیا۔ اس نے اسماعیل بن برہان نظام شاہ کو تخت نشین کر دیا اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

### اسماعیل بن برہان نظام شاہ

جمال خاں سید محمد جو پوری کا ملنے والا تھا۔ بہت سے حبشیوں کو اس نے اس مذہب میں داخل کیا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اپنے ایک افسر فوج دلاور خاں کو اسکی سرکوبی کیلئے تعینات کیا مگر وہ صلح کر کے پاکی زوجہ میران شاہ کی لیکر بیجاپور واپس ہو گیا۔

برہان شاہ بن حسین نظام ابٹک اکبر اعظم کے پاس مقیم تھا۔ جب اس کا بیٹا تخت احمد نگر پر بیٹھا تو اس نے اکبر اعظم سے پھر مدد کی درخواست کی مگر مغل فوج کے دکن آنے سے تمام دکنی متحد ہو جاتے اس لئے اکبر نے راجہ علی خاں حاکم اسیر کو مدد کیلئے لکھا۔ برہان شاہ ایک فوج کے ساتھ برار میں داخل ہوا مگر جہانگیر خاں حبشی کے مقابلے میں منہزم ہوا پھر اس نے اپنی جاگیر ہنڈیہ سے برہان پور آکر راجہ علی خاں اور ابراہیم عادل شاہ کی اعانت سے فوج اکٹھا کی اور ان دونوں کی معیت میں آگے بڑھا۔

جمال نے سپہ سالار برار امجد الملک مہدوی کو بلا کر راجہ علی خاں اور برہان شاہ کے مقابلے پر روانہ کیا اور خود ابراہیم عادل شاہ کی طرف بڑھا اور اسکے مقدمہ لشکر دلاور خاں حبشی کو شکست دی۔ اس عرصے میں امراء برار نے برہان شاہ کی اخاعت کر لی لہذا جمال خاں انکی طرف متوجہ ہوا مگر بیجاپوری لشکر نے اسکو گھیرے میں لے لیا اور اسکی رسد بند کر دی۔

جمال خاں اور اسکا لشکر شدت تشنگی سے بیتاب تھا لہذا قریب کے دریا کی طرف بڑھا جہاں برہان شاہ اور راجہ علی خاں پہلے سے موجود تھے مجبوراً جمال نے

میدان کار از گرم کیا۔ دکن میں مہدیوں کی موت و حیات کا سوال تھا لہذا ان کا پلہ بھاری پڑ رہا تھا کہ اچانک بندوق کی ایک گولی جمال کے ماتھے پر آکر بیٹھ گئی اور وہ زمین پر گر گیا جسکے بعد فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بانیان فساد کو قتل کیا گیا اور اسماعیل شاہ کو گرفتار کر لیا گیا۔

### برہان شاہ بن حسین نظام

برہان شاہ ۹۹۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ مرتضیٰ نظام کے وقت میں اس نے خروج کیا تھا اور مشہور کیا تھا کہ مرتضیٰ نظام مر گیا۔ یہ خبر سنتے ہی مرتضیٰ نظام پس پردہ سے برآمد ہوا، ہاتھی پر سوار ہو کر بازار میں آیا اور خواجہ زین سمنانی کی دوکان کے قریب ہاتھی روک کر پوچھا۔

”کیا بیچتا ہے؟“

”کھانے پینے کی ہر قسم کی دوا ہے۔“ اس نے جواب دیا اور مرتضیٰ نظام نے کہا

”دیوانگی کی دوا بھی ہے تیرے پاس؟“

”ہر طرح کے اجراء لئے جلاب موجود ہیں۔“ اس نے بتایا اور مرتضیٰ نظام نے گوش گزار کیا۔

”لیکن میں دیوانہ تو نہیں ہوں۔ مشائخ کی طرح احتکاف میں رہ کر بادشاہت کرنا چاہتا ہوں تو میرے بھائی نے مجھ پر لشکر کشی کی ہے۔“

”وہ دیوانہ ہے جو آپ کو دیوانہ کہتا ہے۔“ خواجہ زین نے جواب دیا اور مرتضیٰ نظام نے ایک تھیلی اشرفیوں کی اسکی طرف پھینک کر ہاتھی آگے بڑھا دیا۔ دوسرے دن مرتضیٰ نظام نے صلابت خاں کو متعین کیا جس نے برہان شاہ کو شکست دی۔ وہ بھاگ کر پہلے قطب الدین غزنوی کے پاس گجرات پھر اکبر اعظم کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اسکی بدولت تخت احمد نگر حاصل کرنے کی دیرینہ آرزو پور ہوئی اور اسماعیل شاہ کے بعد احمد نگر کا بادشاہ بنا۔

تخت نشین ہوتے ہی اس نے مذہب مہدوی کو غیر قانونی قرار دیا اور خطبہ اشیا عشر جاری کیا۔ بھاگے ہوئے تمام امراء دھیرے دھیرے حاضر ہو گئے اور نظم



سلطنت میں ایک امتحان پیدا ہو گیا۔

ابراہیم عادل شاہ احمد نگر کی بحالی برداشت نہ کر سکا اس نے مطالبہ کر دیا کہ تین سو ہاتھی جو دلاور خاں سے نظام شاہیوں نے چھینے تھے وہ واپس کیے جائیں۔ اسپر دونوں میں ایک طویل اور مسلسل جنگ ہوئی اور برہان شاہ شکست یاب ہوا۔ اسکے ڈیڑھ سو ہاتھی بجاپور کو مل گئے پھر بعض عمائدین سلطنت نے درمیان میں پڑ کر صلح کرادی۔

پھر برہان شاہ نے قلعہ ریکندہ پر لشکر کشی کرائی جس میں مرتضیٰ نظام کو اپنے امراء کی غداری کے سبب کامیابی نہ ہو سکی تھی مگر برہان شاہ نے فرنگیوں کو سخت سزائیں دیں، کوئی سو فرنگی اور عیسائی قتل کئے پھر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ سالاران لشکر نے ایسے انتظامات کیے تھے کہ فرنگی قلعہ چھوڑ کر چلے جاتے مگر اسی عرصے میں برہان شاہ نے نفس امارہ کا شکار ہو کر بعض امراء کی خواتین پر دست ہوس دراز کیا اور وہ محاصرہ چھوڑ کر فوراً احمد نگر آگئے جسکے نتیجے میں فرنگیوں نے خود مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ پھر برہان شاہ ابراہیم عادل شاہ سے لڑھ گیا جس میں اسکی کافی فوج فناء ہو گئی۔ شعبان ۱۰۰۳ھ میں وہ مر گیا اور اس کا بڑا بیٹا ابراہیم باپ کی جگہ تخت احمد نگر پر متمکن ہوا۔

### ابراہیم شاہ بن برہان شاہ

برہان شاہ کا اتابک میاں منجواں کا وکیل ہوا۔ اخلاص خاں نے اگرچہ بغاوت کی تھی لیکن ابراہیم شاہ نے اسے معاف کر دیا اور احمد نگر میں دوپارمیاں ہو گئیں: ایک میاں منجواں کی دوسری اخلاص خاں کی۔

اخلاص خاں کا گروہ بڑا سرکش اور بے ادب تھا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ کے سفیر سے بدتمیزی کی اور بجاپور سے احمد نگر کا بگاڑ ہو گیا اور اخلاص خاں اپنا لشکر لیکر بجاپور کی طرف چل پڑا۔

میاں منجواں کی کوشش جب بادشاہ کو روکنے میں کارگر نہ ہوئی تو اس نے چپکے سے سپہ سالاران فوج بجاپور حمید خاں سے کہلوا دیا کہ اخلاص خاں نے بادشاہ کو بہکا دیا ہے، میں اسے سمجھا لوں گا لہذا حمید خاں اپنے لشکر کو بچھے ہٹا لے گیا۔ اخلاص خاں

نے اسکو کمزوری پر محمول کیا اور آگے بڑھ کر حمید خاں کو جالیا۔ مجبوراً حمید خاں کو جنگ کرنا پڑی۔

لڑائی شروع ہوتے ہی نظام شاہی میمنے نے عادل شاہی میسرے کو پسپا کر دیا اور نظام شاہی فوج لوٹ میں لگ گئی۔ بیوقوف ابراہیم شاہ تھوڑے سے سوار اور چند ہاتھیوں کو لے کر حملہ آور ہو گیا مگر قریب پہنچتے ہی ایک عادل شاہی سپاہی کے نیزے کا شکار ہو گیا۔

بجاپور کے افسر ہیل خاں نے اسکو پاکی میں ڈال کر احمد نگر کی طرف روانہ کر دیا اور نظام شاہی لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔

میاں منجواں نے سب سے پہلے احمد نگر پہنچ کر ابراہیم شاہ کے طفل شیرخوار شاہزادہ بہادر کو قلعہ جوند میں نظر بند کر دیا اور بارہ سال کے ایک لڑکے کو یہ کہہ کر تخت پر بٹھا دیا کہ یہ خاندان نظام شاہی سے ہے۔

### احمد شاہ بن طاہر شاہ

چاند بی بی بہادر کو تخت نشین کرنا چاہتی تھی مگر امراء نے ایک سال سات ماہ کے بچے کو مناسب نہ سمجھا۔ احمد شاہ میاں منجواں کی سرپرستی میں فرمانروائے احمد نگر بن گیا لیکن اس حقیقت کے انکشاف میں بھی دیر نہ لگی کہ وہ خاندان نظام سے نہیں ہے۔

اسپر میاں منجواں اور اخلاص خاں سے سخت جنگ ہوئی اور جیشیوں نے ایک مجہول النسب بچے کو بادشاہ بنالیا۔

اسی دوران شاہزادہ مراد کی فوجیں احمد نگر کے قریب پہنچ گئیں جسے اکبر اعظم نے تسخیر دکن کیلئے مامور کیا تھا۔

### چاند بی بی

میاں منجواں محرم ۱۰۰۴ھ میں جیشیوں کو شکست دے چکا تھا کہ عبدالرحیم خانخاناں اور راجہ علی خاں کے عساکر ذخار قدرے فاصلے سے خیمہ زن ہو گئے بیس ہزار مغل اور راجپوت، مسلح اور آہن پوش افغان اس جاہ و خشم سے اکر پہنچے تھے کہ پورے دکن کی طاقت مرعوب ہو جاتی مگر سوال تھا وطنیت کا۔ اس موقع پر دشمن



تہا چاند بی بی تھی اور قلعہ احمد نگر مگر دکن کی شیردل خاتون منٹھی بھر سرفروشوں کے ساتھ مغلوں کے ٹڈی دل کے سلنے سنہ تانے کھڑی رہی۔

چاند بی بی نے اس موقع پر آہنگ خاں حبشی کو یاد کیا۔ وہ پانچ ہزار سواروں کے ساتھ احمد نگر کے نزدیک پہنچا اور معلومات حاصل کر کے قلعہ کے مشرقی جانب بڑھا۔ اسی دن مراد نے وہ سمت خالی دیکھ کر فوجوں سے پرکرائی تھی۔ آہنگ خاں اس سے واقف نہ تھا مگر پہنچ ہی گیا تھا تو اس نے جوہر مردانگی دکھائے اور لڑتا بھرتا چار سو آدمیوں کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گیا۔

شاہ علی ایک مرد ضعیف باقی لشکر کے ساتھ پلٹ گیا۔ دولت خاں نے تعاقب کر کے تقریباً نو سو آدمی قتل کر دئے۔

چاند بی بی نے براہ راست تباہی کی داستان ابراہیم عادل شاہ کو تحریر کی۔ اس نے بیس ہزار سوار دے کر سہیل خاں کو روانہ کیا، منٹو بھی انکے ساتھ ہوا۔ پھر مہدی قلی سلطان گولکنڈہ کی طرف سے آکر اس مہم میں شامل ہوا۔

شاہزادہ مراد کو اسکی خبر ہوئی تو اس نے کوشش کی کہ اس لشکر کے نزدیک پہنچنے سے قبل قلعہ کو فتح کر لے۔ اس نے ایک سرنگ کھدوانا شروع کر دی جو دیوار کے نیچے تک جاتی تھی پھر چار سرنگیں اس نے اور کھدوائیں، دیوار اور برجوں کی جڑوں میں چھید کیے۔ یہ نقبیں بارود سے بھری گئیں اور اندر توپیں بھی رکھ دی گئیں اور سوراخ گارے اور چونے سے بند کر دئے گئے۔ دوسرے دن بعد نماز جمعہ ان میں آگ دے کر قلعہ کو اڑا دینے کا منصوبہ تھا کہ شاہزادہ مراد کے لشکر کا ایک شخص خواجہ محمد خاں شیرازی جسکے اقارب برسوں سے احمد نگر میں رہتے تھے وہ شب کی تاریکی میں حصار کے نیچے پہنچا اور اس نے اہل قلعہ کو مغل فوج کے ارادوں سے باخبر کر دیا۔

شہزادی چاند بی بی نے راتوں رات ایک سرنگ صاف کرادی پھر صبح سے دوپہر تک دوسری سرنگ کی بارود نکالی۔ تین سرنگیں اب بھی رہ گئی تھیں کہ مغل لشکر پہنچا اور آتے ہی اس نے سرنگ میں آگ دیدی۔ ایک سربفلک شعلہ بلند ہوا اور اتنا زبردست دھماکا ہوا کہ زمین ہلنے لگی۔ دیوار متزلزل ہو گئی۔ دوسرں گیں چھوٹی

بھی میاں منٹو کے شریک ہو گئے۔ چاند بی بی سلطانہ اس سے ناخوش تھی مگر بات تھی احمد نگر کی اس لئے چاند بی بی کی حمیت و عظمت اسکی متحمل نہ ہوئی کہ وہ احمد نگر کو بے یار و مددگار چھوڑ دے اس لئے جب میاں منٹو احمد شاہ کو لیکر مدد حاصل کرنے کیلئے احمد نگر سے باہر گیا تو اس نے عنان مدافعت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

اسی دن بہادر شاہ ولد ابراہیم شاہ کو اپنے طور پر تخت نشین کیا گیا اور چاند بی بی نے نام لے لے کر بہادروں کو بلوایا۔ شمشیر خاں حبشی اور افضل خاں تفرشی کہ یگانہ روزگار تھے، سب چاند بی بی کے تابع فرمان ہو گئے۔

۲۰ ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ کو جب شاہزادہ مراد کے حکم پر مغل پہاڑیوں سے اتر کر احمد نگر کے شمال میں نمودار ہوئے اور کالاہو ترہ کے میدان میں انہوں نے صفیں آراستہ کیں تو چاند بی بی نے حصار کے اندر اپنے بہادروں کو مستعد پیکار کر دیا پھر فصیلوں سے چند توپوں کے فائر کروائے جن سے مغلوں کے پردوں میں رخنے پیدا ہوئے۔

دن تمام ہونے پر شاہزادہ مراد نے بہان نظام شاہ کی بنوائی ہوئی باغ ہشت ہشت میں قیام کیا۔ ۲۴ تاریخ کو ابو الفضل اور شہباز خاں نے شہزادہ مراد کے حکم کے بغیر امراء و غریاء کی تاریخ کا حکم دیا۔ احمد نگر کے مکانات اور عمارتیں دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو گئیں۔ شہباز خاں بہت متعصب سنی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لنگر دروازہ امام کو بھی پامال کر دے اور سادات جو وہاں مقیم تھے انہیں تہہ تیغ کر ڈالے مگر اسکی اطلاع شاہزادہ مراد اور خانخانان کو ہو گئی انہوں نے سختی سے روک دیا، شہباز خاں کو ملامت کی اور سامان لوٹنے والوں کو سخت سزائیں دیں۔

اتنا برا وقت تھا احمد نگر پر کہ نظام شاہی طاقت تین تفرقہ ہو گئی تھی، بڑے بڑے وفادار چلے گئے تھے، میاں منٹو عادل شاہ کی سرحد میں مقیم تھا آہنگ خاں حبشی بھی حدود بیجا پور کے اندر کسی تائید غیبی کا منتظر تھا۔ اخلاص خاں پوری مغل طاقت سے نکر جانے کا نعرہ لگاتا تھا وہ دولت آباد میں پڑا ہوا تھا۔ اسکو کچھ غیرت و امنگیر ہوئی تو دس ہزار سوار لے کر چلا مگر خانخانان نے دولت خاں لودھی کو پانچ چھ ہزار دے کر بھیج دیا اور وہ بری طرح شکست یاب ہوا۔



تھیں۔ وہ بھی پھٹیں مگر ان کے اثرات ایسے نہ تھے۔

احمد نگر کے جو لوگ تیسری سرنگ صاف کر رہے تھے دیوار گرنے سے وہ دب گئے۔ مرتضیٰ خاں آہنگ خاں، شمشیر خاں اور افضل خاں وغیرہ بھاگ کر ایک طرف ہو گئے۔ وہ اتنے سراسیمہ اور بدحواس تھے کہ کچھ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا لیکن کیا دل گردہ تھا حسین نظام کی بیٹی کا کہ جیسے ہی اسکو اس ہولناک واقعہ کی اطلاع ہوئی وہ اسلحہ زیب تن کر کے پابرمہ اٹھ کھڑی ہوئی الی ہوئی تلوار اسکے ہاتھ میں تھی اور وہ بھری ہوئی شیرینی کی طرح حجاب جہرے پر ڈالے گھوڑا اڑاتی ہوئی مہندم دیوار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسکو دیکھ کر تمام امیر بھی گوشوں سے نکل آئے اور سلطانہ چاند بی بی نے ٹوٹی ہوئی دیوار کے برابر انسانوں کی دیوار کھڑی کر دی۔

دکنی توپچیوں اور پیکان اندازوں نے بھی اس موقع پر جانوں کی بازیاں لگا دیں۔ چاند بی بی کی ہمت اور حوصلے نے ان کو زندگیوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ مغلوں کے حربوں کو بھی روکتے اور اتنی سرعت سے گولے برساتے کہ جو مغل دستے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے وہ گولوں اور تیروں کی ضرب سے بے جان ہو کر گر جاتے۔ سہ پہر سے اندھیرا ہونے تک اکبر اعظم کے لشکری اس تعداد میں کام آئے کہ خندق پہنچ گئی۔

بجپور اور احمد نگر نے اب تک دکن کی آب رو کو سجادہ زہد و تقویٰ پر دیکھا تھا اور ایام عزا میں سیاہ پوش پایا تھا لیکن آج وہ فاطمہ زہرا کی کنیز کے روپ میں علی کے کسی سرفروش کا کردار ادا کر رہی تھی سہرے پر اب بھی جتاب مریم کی معصومیت تھی مگر بشرے سے حیدر کرار کا تہور اور عباس علمدار کا جلال آشکار تھا۔

رات کا اندھیرا جب لشکر اور قلعہ کے درمیان حائل ہو گیا اور مغل ہزاروں جانیں گنوانے کے باوجود فتح کے قریب بھی نہ پہنچ سکے تو انہوں نے لڑائی موقوف کر دی اور فوجیں واپس ہونے لگیں مگر چاند بی بی اسی طرح کھڑی رہی۔ اب اس نے محافظ احمد نگر کے بجائے معمار مملکت نظام کا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ معماران چابکدست کوئی پچاس گز ٹوٹی ہوئی دیوار بنانے میں مصروف ہو گئے۔ اس کام کا آغاز جب چاند بی بی نے پہلی اینٹ اپنے ہاتھ میں لیکر کیا تو نہ کوئی امیر لشکر رہا اور نہ کوئی

مزدور۔ معمار اینٹیں چنتے رہے اور پچاس گز کی چوڑائی میں انہیں مسلسل مصالحہ پہنچتا رہا۔

صبح کو مغل امراء نے دیکھا تو پوری دیوار ایک سرے سے دوسرے سرے تک کئی گز بلند ہو چکی تھی۔ اس میں پہلا جیسا استحکام تو نہ تھا مگر وہ اہل حصار کیلئے اتنی معاون ضرور ہو گئی تھی کہ اندر سے باہر والوں کو نشانہ بنایا جاسکتا۔

یہ رات احمد نگر کیلئے بڑی بھیانک تھی مگر اتنی تاریخ ساز جس نے دکن کو ہمیشہ کیلئے سر بلند کر دیا اور اس سرزمین کی ہمت و شجاعت ایک انسانی پیکر میں مرتکز ہو کر آج بھی دنیا کے بہادروں کیلئے ولولہ انگیز ہے۔

اور اسکو چاند بی بی کا غیر فانی کردار ہی کہنا چاہئے کہ بہادر مغل امراء بھی عش عش کرنے لگے اور اسکے بعد سے وہ ہمیشہ چاند بی بی کے بجائے چاند سلطانہ کے لقب سے یاد کی گئی۔

دوسرے دن مغلوں کا حملہ کچھ شدید ہوتا لیکن سہیل خاں کے نزدیک پہنچ جانے کی اطلاع گشت کرنے لگی۔

مغلوں کو رسد کی تنگی تھی، بیماریاں بھی پھیل رہی تھیں اور چاند بی بی نے بھی ان کے دانت کھٹے کر دئے تھے، انہوں نے سمجھ لیا کہ دکن کی تسخیر کچھ آسان نہیں لہذا انہوں نے سہیل خاں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ چاند بی بی دب کر صلح کرنے کی قائل نہ تھی مگر تقاضائے وقت کو اس نے محسوس کیا لہذا ابرار سے دست کش ہو گئی اور مغل چاند سلطانہ کی بہادری کی داستانیں بیان کرنے کیلئے آگرہ کی طرف واپس ہو گئے۔

احمد شاہ کو ابراہیم عادل شاہ نے اپنے ملک میں جاگیر دیدی اور بہادر شاہ احمد نگر کا بادشاہ بنا دیا گیا۔

### بہادر شاہ بن ابراہیم شاہ

محمد خاں میاں کو چاند بی بی نے پیشوا بنایا مگر اس نے وفاداری کے بجائے اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی اور آہنگ خاں اور شمشیر خاں وغیرہ کو تدبیر سے گرفتار کر لیا۔ دوسرے امراء یہ دیکھ کر ادھر ادھر چلے گئے۔ چاند بی بی بجپور کی



ملکہ رہی تھی۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ کو لکھا اور وہاں سے ۱۶۰۵ھ میں پھر کہیں  
خاں کو روانہ کیا گیا جس نے محمد خاں کو گرفتار کر لیا اور چاند بی بی نے آہنگ خاں کو  
وکیل سلطنت بنادیا۔

اس مدت میں مغلوں نے حدودِ برار سے تجاوز کر کے نظام شاہی مملکت کے  
سرحدی حصوں پر قبضہ کر لیا تھا لہذا ایک بار پھر بیجا پور سے سہیل خاں اور گولکنڈہ سے  
مہدی قلی سلطان مدد کیلئے آئے خانخانان، شاہزادہ مراد وغیرہ سب برار میں مقیم  
تھے۔ ان کے لشکر بھی حرکت میں آگئے۔ ۸۔ جمادی الثانی ۱۶۰۵ھ کو ہنگامہ رزم و  
پیکار گرم ہوا۔

سہیل خاں کا مقابلہ راجہ علی خاں اور راجہ جگناتھ راجپوت سے ہوا۔ اس نے  
ان دونوں کو ہلاک کر کے انکی فوجوں کو شکست دی مگر امرائے نظام شاہی اور قطب  
شاہی نے افواج اکبری سے شکست کھائی۔ سہیل خاں مصروف کارزار رہا اور شام سے  
پہلے مغلوں کے یمن اور لیسا پر اتنا زبردست حملہ کیا کہ فوجوں کے پاؤں اکٹھے ہو گئے۔  
صادق محمد خاں شہزادہ مراد کو لے کر نکل جانا چاہتا تھا مگر خانخانان نے قدم  
میدان سے نہ ہٹایا۔ دکنی فوجیں اپنے کوفاتح سمجھ کر لوٹ مار میں لگ گئیں مگر  
سہیل خاں ایک جماعت قلیل کے ساتھ خانخانان کے مقابل فردکش رہا۔ صبح  
ہوتے ہی دونوں کے درمیان بڑی ہولناک جنگ ہوئی اور سہیل خاں کو مغلوب  
ہو کر راہ فرار ناپنا پڑی۔

شہزادہ مراد کا کہنا تھا کہ اسی تسلسل میں احمد نگر فتح کر لیا جائے مگر خانخانان  
نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ اسکی شکایت شہزادہ مراد نے اکبر کو لکھی۔ اکبر نے  
خانخانان کو واپس بلالیا اور ابوالفضل کو سپہ سالار بنادیا۔

اس اثناء میں چاند بی بی اور آہنگ خاں میں شدید اختلافات ہو گئے۔ آہنگ  
خاں نے علاقہ بر مغلوں سے چھین لیا۔ کچھ دنوں بعد دکن ہی میں شہزادہ مراد کا  
انتقال ہو گیا اور شہزادہ دانیال اسکی جگہ پر بھیجا گیا پھر خود اکبر اعظم عازم دکن ہوا۔  
اس نے برہانپور میں قیام کر کے نسخہ اسیر کی ہمہ اپنے ذمے لی اور خانخانان اور شہزادہ  
دانیال کو احمد نگر کی طرف روانہ کیا۔

آہنگ خاں پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ احمد نگر سے جا چکا تھا۔ مغلوں نے  
جب محاصرہ کر کے سرنگیں بنانا شروع کیں تو چاند بی بی نے امرا کو رائے دی کہ  
مغلوں سے مقابلہ کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی اس لئے کسی قیمت پر بھی ان سے  
صلح کر لینا چاہئے خواہ اس میں قلعہ احمد نگر دینا ہی کیوں نہ پڑے اس پر امراء اور عوام سب  
بگڑ گئے اور قلعے میں در آئے۔ بہادر شاہزادی ہزاروں کا مقابلہ تو کرنے سکتی۔ لڑی اور  
لڑتی ہوئی ماری گئی اس طرح اہل دکن نے اپنا ایوان شجاعت خود بے چراغ کر دیا۔  
مغل سرنگیں مکمل کر چکے تھے۔ ان کا کوئی روکنے والا نہ رہا تھا۔ انہوں نے سرنگوں  
میں آگ دیدی۔ دیوار حصار گر گئی۔ مغل قلعہ میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے اکثر امراء  
کو چاند بی بی کے اس طرح قتل کیے جانے پر بڑا غم و غصہ تھا۔ یہ غصہ ظالم اور بزدل  
دکنیوں پر اترا۔ وہ تہہ تیغ ہوئے اور اپنی سزا کو پہنچے۔ بہادر شاہ اسیر ہو کر اکبر کے  
پاس برہانپور لے جایا گیا اور قلعہ گوالیار بھیج دیا گیا۔

#### مرتضیٰ بن علی بن برہان شاہ

اس تباہی کے بعد امراء نے قلعہ پرندہ میں شاہزادہ مرتضیٰ کو تخت نشین کیا  
اس عرصے میں عنبر نامی حبش نے ایک چھوٹی سی حکومت قائم کر لی۔ دوسری  
حکومت راجو دکنی نے بنائی پھر دونوں نے مسطور مرتضیٰ شاہ کی اطاعت کر لی مگر  
دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے کو زیر کرنے کی فکر میں رہے۔

۱۶۰۴ھ میں عنبر نے مغلوں کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ خانخانان اسکی  
شجاعت سے متاثر تھا۔ اس نے ایک علاقہ اسکو دیکر صلح کر لی۔

عنبر نے پہلے مرتضیٰ شاہ کو شکست دی پھر جنگ و جدل کے بعد قلعہ پرندہ فتح  
کیا۔ اس مدت میں راجو دکنی نے بھی مغلوں سے جنگ کر کے شکست کھائی۔ یہ  
دونوں سردار اسی طرح لڑتے رہے اور مغل آہستہ آہستہ دکن پر چھاتے چلے گئے۔

اب دکن میں مغلوں کے قدم جم چکے تھے لہذا اکبر اعظم کے ایما پر شہزادہ  
دانیال کی شادی ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی سے عمل میں آئی جس کا عقد اس سے پہلے  
ہو چکا تھا مگر دکن کی سرزمین دانیال کو بھی راس نہ آئی اور برہانپور پہنچ کر اس کا بھی  
انتقال ہو گیا۔



دکن میں مغلوں کی فتوحات سے بڑی ہلچل تھی لہذا جب عنبر نے راجو پر فتح پا کر طاقت حاصل کر لی تو اس نے سرزمین دکن کے نام پر مغلوں کے خلاف تمام بچی کچھی طاقتوں کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کرنا شروع کر دیا اور وہ دکن کا واحد سہارا بن گیا۔

### سلطنت برادر

فتح اللہ کفار بھانگر کی اولاد میں تھا، اسیر ہو کر احمد آباد بیدر لایا گیا تو مشرف بہ اسلام ہوا۔ خواجہ جہاں کاوان کی عنایت سے سہ سالہ برادر مقرر ہوا اور عماد الملک کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۸۸۲ھ میں وہ بھی دوسروں کی طرح آزاد حکمران بن گیا۔ اسکے مرنے پر علاء الدین عماد الملک تخت پر بیٹھا۔

عماد الملک نے دوسروں کی طرح اپنی شاہی کا اعلان کیا اور سلطان محمود کی حمایت میں کئی جنگوں میں شریک ہوا۔ عادل شاہی اور نظام شاہی لڑائیوں میں بھی اسکی شرکت پائی جاتی ہے۔ ۹۳۰ھ میں اس نے بادشاہ گجرات کو دکن آنے کی دعوت دی اور اس کا خطبہ اپنے ملک میں پڑھوانا پڑا۔

دریا عماد شاہ اسکے بعد بادشاہ ہوا۔ اس نے اتحاد و اتفاق سے اپنا زمانہ بسر کیا۔

برہان عماد اس کا جانشین ہوا جسکو ایک سردار تغال خاں نے قید کر لیا اور برادر کا سکہ و خطبہ اپنے نام کا جاری کر دیا۔ تغال خاں سے سلاطین دکن کے کئی معرکے ہوئے۔ آخر ابراہیم قطب شاہ کے سہ سالہ جنگیز خاں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور برادر احمد نگر کے تابع ہو گیا پھر مغلوں کے قبضے میں چلا گیا۔

### حکومت بریدیہ

خواجہ شہاب الدین یزدی قاسم برید نام کے ترکی غلام کو دکن لایا تھا۔ اس نے اسکو سلطان محمد شاہ فاروقی کے ہاتھ فروخت کیا جو بالاخر اسکے امیروں میں شامل ہوا۔ سایاجی مرہٹہ کے مقابلے میں اسکو فتح حاصل ہوئی تو وہ مرہٹہ سردار کی بیٹی اپنے عقد میں لایا اور پائین اور جانہ کے مابین اسکی جاگیر تقابض ہوا۔ پھر مرہٹہ لڑکی کے عزیز و اقارب مسلمان ہو کر اسکی فوج کی قوت بن گئے۔

سلطان محمود بھمنی کی زوال پذیر سلطنت میں اسکی طاقت قابل ذکر ہو گئی

لیکن اس نے احمد آباد بیدر میں کوئی دخل اندازی نہیں کی اور قلعہ اوسہ میں اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا۔

۹۱۴ھ میں اس کا انتقال ہوا تو امیر برید اس کا جانشین ہوا جو ایک عرصہ تک اسماعیل عادل شاہ کا سپہ سالار رہا آخر عمر میں برہان نظام شاہ کی مدد کیلئے گیا اور دولت آباد کے اطراف میں فوت ہوا۔ بزار حمدل حکمران تھا۔ مدت حکومت چالیس سال رہی

علی برید اسکی جگہ تخت پر بیٹھا جس نے برہان نظام کی حمایت سے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور سلطان محمود بھمنی کی وفات پر بیدر کو مرکز حکومت بنایا۔ برہان نظام نے شاہ طاہر کو اسکے جشن تاجپوشی میں بھیجا تھا جنکے ساتھ اس نے بدسلوکی کی لہذا برہان نظام نے چڑھائی کر کے اوسہ اور گیر اور قندھارا اس سے چھین لیا

۹۸۴ھ میں مرتضیٰ نظام کی طرف سے صاحب خاں نے قلعہ احمد آباد کا محاصرہ کیا تو اس نے علی عادل شاہ سے مدد مانگی۔ اس نے شرط یہ رکھی کہ فلاں فلاں دو خواجہ سرا اسکو بھیج دے جائیں۔ علی برید انہیں بھیجتا نہ چلتا تھا لیکن ضرورت نے مجبور کر دیا اور ان میں سے ایک خواجہ سرا نے جاتے ہی علی عادل شاہ کی خواب گاہ میں داخل ہو کر خنجر کے وار کر کے علی عادل شاہ کو قتل کر دیا۔ نوعیت واقعہ سے اس خیال کو پوری تقویت پہنچتی ہے کہ خواجہ سرا بیدر سے منصوبہ قتل کر گئے تھے

علی عادل شاہ کی طرف سے مدد پہنچتے ہی مرتضیٰ نظام نے محاصرہ اٹھالیا۔ اسکے بعد علی برید ۳۵ سال حکومت کر کے انتقال کر گیا۔ اس کا بیٹا ابراہیم برید باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا۔ سات سال بعد وہ بھی مر گیا۔ قاسم برید تین سال تک زندہ رہا۔

پھر چار برس کا بچہ علی برید تخت نشین کیا گیا۔ ۱۰۱۲ھ میں علی مرزا نام کا ایک شخص جو اسی خاندان کی فرد تھا علی برید کو محمد قلی قطب شاہ کی سلطنت کی طرف بھگا کر بادشاہ بن گیا جس سے مغلوں کو مقابلہ کرنا پڑا اور اس کا علاقہ مغلوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا پھر اسکے حصہ بجزے ہو گئے۔



### سلطنت قطب شاہی

سلطان قلی ترکان بہار لو سے تھا اور ایک روایت کے مطابق وہ میرزا جہاں شاہ بادشاہ عراق کا نواسہ ہوتا تھا، ہمدان میں پیدا ہوا تھا اور سلطان محمد شاہ بہمنی کے عہد میں وارد و کن ہوا پھر سلطان بہمنی کے غلاموں میں شامل ہوا۔ اپنے علم، امانت و دیانت کے سبب خواتین حرم میں اسکا اعتبار قائم ہوا اور جاگیروں کے محصولات پر مامور ہوا۔

اس نے اجرت یومیہ پر لوگوں کو رکھ کر اس خدمت کو انجام دیا اور چوروں اور رہزنوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس پر قطب الملک کا خطاب ملا اور گولکنڈہ کی جاگیر سے نوازا گیا۔ سلطنت بہمنی کے کمزور پڑنے پر اس نے بھی امارت میں عادل شاہی نظام شاہی اور برید شاہی کی طرح شاہانہ شکوہ کا مظاہرہ کیا اور خطبہ ائمہ اثنا عشر جاری کیا اسکی مملکت اگرچہ زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس نے ترویج شیعیت اور فضائل اہل بیت کی اشاعت میں زیادہ کد و کاوش کی پھر بھی سلطان محمود بہمنی کی حیات تک احمد آباد بیدر کا احترام باقی رکھا اور سلطان کو نذرانے اور تحائف بھیجتا رہا۔

۹۰۴ھ میں ایک ترکی غلام نے حملہ کر کے اسکو قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں ولی عہد سلطنت جمشید قلی کی سازش تھی۔

### جمشید قطب شاہ

بیٹا بالکل باپ کے نقش قدم پر تھا۔ اس نے سلطنت بیجاپور کے بعض سرحدی مقامات فتح کیے پھر اسد خاں لاری سپہ سالار بیجاپور سے اس کا مقابلہ ہوا۔ خود اسد خاں سے اسکی دو بدوڑائی ہوئی جس میں وہ سخت زخمی ہوا۔ انجام کار اسکو شکست ہو گئی پھر حدود کے تعین کے ساتھ باہم صلح ہو گئی۔

یہ شکست جمشید قطب کو فراموش نہ ہو سکی وہ تپ دق میں مبتلا ہو گیا اور ۹۵۷ھ میں جاں بحق ہو گیا۔

### سلطان ابراہیم قطب شاہ

ابراہیم سلطان قلی کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا بہت پابند شرع، مدبر اور توش مند مگر حد سے زائد محروم الامزاج تھا۔ ۹۶۵ھ میں اس نے حسین نظام سے اتحاد کر کے

علی عادل شاہ پر چڑھائی کی پھر غیر جانبدار بن کر چلا آیا۔ پھر جب علی عادل شاہ رام راج اور امیر برید حسین نظام کے خلاف متحد ہوئے تو رام راج نے اسکو بھی طلب کیا چونکہ وہ رام راج کا زمین منت تھا اس لئے انکار نہ کر سکا مگر عین فتح کے وقت چلا آیا کیونکہ وہ دوسروں کی خاطر جنگ و جدل کا قائل نہ تھا اور جنگ بھی کیسی اسکے ہم مسلک کے خلاف۔

۹۷۱ھ میں وہ علی عادل شاہ کے خلاف حسین نظام کا شریک ہوا اور اسی سلسلے میں بی بی جمال دختر حسین نظام سے اس کا عقد ہوا۔ ۹۷۲ھ میں رام راج کے خلاف حسین نظام اور علی عادل شاہ نے اتحاد کیا تو حمیت اسلامی میں وہ بھی مسلم اتحاد میں شامل ہوا۔

پھر اس نے مرتضیٰ نظام اور عادل شاہ کے جھگڑے میں مرتضیٰ نظام کا ساتھ دیا مگر عادل شاہ کو مصالحت کا خط لکھا جو عادل شاہ نے مرتضیٰ نظام کے پاس بھیج دیا اور مرتضیٰ نظام اور قطب شاہ میں ٹھن گئی جسکے بعض دوسرے وجوہ بھی تھے۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور قطب شاہ کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسکے بعد کئی لڑائیوں میں اس نے شرکت کی اور ۹۸۹ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

### حلیم الدؤف محمد قلی قطب شاہ

ابراہیم قطب شاہ کے تین بیٹے تھے: محمد قلی، خدا بندہ اور سحان قلی۔ محمد قلی قطب شاہ باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس کی خصوصیات میں بادشاہت کی ایک انصافی حیثیت تھی۔ وہ ایک مجتہد عصر، متبحر عالم زاہد شیک نفس، دیوانہ آل رسول، ادیب باکمال، شاعر عدم المثال تھا، عربی اور فارسی پر پورا عبور رکھتا اور مقامی بولیوں سے بھی واقف تھا۔ فارسی کا اچھا شاعر تھا اور فی زمانہ یہ تحقیق بھی ہو گئی ہے کہ اردو کا بھی پہلا شاعر ہی تھا۔

محمد قلی شاہ کے یہ اوصاف آبائی تھے جس کا ابتدائی نقطہ سلطان قلی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ نقطہ بدرجہ پھیلتا رہا اور پھیلتے پھیلتے ایک حرف جلی بن گیا جس کا نام محمد قلی عبادت گزار پڑا۔

یہ خاندان بلاشبہ حامل سیف و قلم تھا لیکن اس نے سیف سے زیادہ قلم کو



اہمیت دی۔ یجپور اور احمد نگر کی سلطنتیں اپنی وسعت میں گوکنڈہ سے بڑھ گئیں۔ ان کا مادی جاہ و جلال زبان زد عام مگر محمد قلی قطب شاہ کو جو علمی عظمت حاصل تھی سب مل کر بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکتے۔ یقیناً حسین نظام اور چاند سلطانہ کے نام صفحات تاریخ میں روشن ہیں مگر محمد قلی قطب شاہ کو وہ بزرگی حاصل ہے کہ سران بھی اسکے تصور کے سامنے خم ہو جاتے ہیں۔ اس کی قلمی سطوت اور علمی جبروت اہل نظر سے خراج عقیدت لیے بغیر نہیں رہتا۔

تخت نشین ہونے کے بعد قلی قطب شاہ نے شاہ میرزا اصفہانی کی بیٹی سے شادی کی اور خاندان نظام شاہیہ سے اپنے تعلقات استوار کیے۔ محمد قلی قطب شاہ کو ملک گیری کی طرف کوئی رغبت نہ تھی بلکہ اپنے ملک کی تعمیر اور رعایا کے مسائل حل کرنے کی طرف اس کا رجحان تھا لیکن تخت و تاج کے تقاضوں کو بھی نظر انداز نہ کیا جاسکتا لہذا مرتضیٰ نظام نے جب یجپور کی طرف رخ کیا تو وہ بھی روانہ ہو گیا اور سپہ سالار احمد نگر مرتضیٰ سبزواری سے جاملانگر قلعہ درک پر یجپور کے محاصرے نے طول کھینچا تو وہ اٹکاف جان کو پیش نظر رکھ کر واپس ہو گیا اور اپنے سپہ سالار مصطفیٰ خاں کو تسخیر گبر کہہ کیلئے روانہ کر دیا۔

مصطفیٰ خاں اور دلاور خاں سپہ سالار یجپور میں سخت جنگ ہوئی اور مصطفیٰ خاں منہزم ہوا جسکے بعد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ میں صلح ہو گئی اور چونکہ طبعاً قلی قطب شاہ کو جنگ و جدل پسند نہ تھی لہذا پھر کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ ۹۹۲ھ میں خواجہ علی شیرازی کی تحریک پر قلی قطب شاہ کی بہن کی شادی ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ عمل میں آئی۔

مشہور ہے کہ قلی قطب شاہ اٹھتی جوانی میں ایک طوائف بھاگ متی پر عاشق تھا اور وہ جس مقام پر رہتی تھی، اسکی آب و ہوا ٹھیک نہ تھی لہذا اس نے گوکنڈہ سے آٹھ نو میل پر ایک شہر آباد کرادیا تھا جس کا نام بھاگ نگر رکھا تھا پھر حیدر آباد رکھ دیا اور اسی کو دارالسلطنت قرار دیا۔

حیدر نام کی رعایت بظاہر حضرت علی کی ولا ہو سکتی ہے لیکن ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ شاہ طہماسپ صفوی کا اصل نام حیدر میرزا تھا اس نسبت سے اس نے حیدر آباد تجویز کر دیا ہو کیونکہ اسکی بیٹی کی نسبت شاہ عباس صفوی کے بیٹے سے ملے ہو گئی تھی۔

بہر حال محمد قلی قطب شاہ ایک اقبال مند حکمران تھا۔ میر محمد مومن استرآباد کیلئے سے عالم اس کے دربار کی زینت تھے۔ دونوں بھائی خدا بندہ اور سبحان قلی اس کے وفادار رہے اور وہ بھی بھائیوں کو اپنی سلطنت سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ قلی قطب شاہ نے ابٹیک تحفے تحائف بھیج بھیج کر مغل شہنشاہ کو بہلانے رکھا تھا لیکن احمد نگر کے انجام کے بعد سے وہ اپنے کو بھی محفوظ نہ سمجھتا لہذا ہر وقت چوکنا رہتا اور فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کی ہر ممکن تدبیر کرتا رہتا تھا۔ اس طرح اسکی زندگی گزر گئی۔

محمد قلی قطب شاہ کے شاندار دور حکومت کے بعد محمد پھر عبداللہ قطب الملک تخت گوکنڈہ پر بیٹھا۔ اس نے میر جملہ سلطان کو اپنا وزیر اعظم بنایا جو تدبیر اور حسن انتظام میں اپنا جواب نہ رکھتا۔ اس نے نظم حکومت کو انہیں خطوط پر استوار کیا جسپر محمد قلی قطب شاہ نے ڈالا تھا اور ہر لحاظ سے اسکو ایک شیعہ سلطنت بنا دیا جسکی نظیر اگلے ادوار میں صرف لکھنؤ پیش کر سکا لیکن مغل فوجیں بار بار یجپور اور گوکنڈہ کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں اس لئے عبداللہ اور میر جملہ دونوں میں سے کسی کو سکون میسر نہ آسکا۔

حالات کا تقاضا کیا تھا اور وہ کیا کر سکتے تھے؟ اس کا فیصلہ آسان نہ تھا پھر بھی یجپور کی طرح گوکنڈہ بھی جانوں کی بازیاں لگائے بغیر اپنے کو مغلوں کے رحم و کرم پر ڈالنے کیلئے تیار نہ تھا۔ (۸۰)



اب شاہزادہ خرم کو اودے پور سے دکن بھیجا گیا۔ اس نے سکندر عادل شاہ ملک عنبر اور والی گولکنڈہ کو صلح کے پیغامات بھجوائے جو قدرے تامل سے سب نے منظور کر لیے اور مغل سفیروں کو نذرانے پیش کیے۔

۱۶۲۹ء میں شاہجہاں پھر دکن آیا۔ اس مدت میں ملک عنبر نے اپنے کو سنبھال لیا تھا۔ علی عادل شاہ نے مہابت خاں کے توسط سے اقتدار کی سند حاصل کر لی تو ملک عنبر اکیلا رہ گیا۔ ۱۶۳۳ء میں اس نے قطب الملک سے دو سال کی رقوم وصول کیں جو وہ فوج کیلئے سالانہ دیا کرتا تھا پھر عادل شاہ کے عمال کو قتل کیا اور بیدر کو لوٹا۔ آخر میں بیجاپور پر حملہ سحائی کر دی۔ مہابت خاں نے بہانپور کا لشکر عادل شاہ کی مدد کیلئے بھجوا دیا تو عنبر نے محاصرہ اٹھالیا لیکن مغلوں اور عادل شاہ نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مجبوراً ملک عنبر نے پلٹ کر جنگ کی اور ایسی جنگ کہ مغلوں اور عادل شاہی لشکر دونوں کو مار بھگایا۔ ان کے بڑے بڑے سردار گرفتار ہو گئے عنبر نے بیجاپور ملک پور اور بہانپور تک کے علاقے تاراج کر ڈالے جس سے مغلوں کی ساک پر ضرب کاری لگی۔

بات یہ تھی کہ دکنی مغل اقتدار کو قبول کرنے پر تیار نہ تھے اس لئے ملک عنبر کو ہر قسم کی مدد مل رہی تھی۔ اسی عرصے میں شاہجہاں نے جہانگیر سے بغاوت کی تو ملک عنبر نے اس کا تعاون حاصل کر لیا۔ یا قوت غلام جب بہانپور فتح کرنے بڑھا تو شاہجہاں بھی اسکے ساتھ تھا لیکن جب شاہجہاں کو معافی مل گئی تو وہ علیمدہ ہو گیا مگر ملک عنبر اور یا قوت مغلوں کے سامنے سینے تانے کھڑے رہے۔

انہیں دنوں میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ نظام شاہ کے حبشی غلام کی محبوبہ خاں جہاں لودی مغل حاکم فریفتہ ہو گیا۔ محبوبہ نے پانچ لاکھ نقد اور دو تین لاکھ کے زیور لیکر بالا گھاٹ نظام شاہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اسکی جرئت اتنی بڑھ گئی تھی کہ جب عادل شاہ نے حملہ کیا تو اس نے فوج کی قیادت کر کے عادل شاہ کو شکست دیدی۔

شاہجہاں نے تخت نشین ہوتے ہی بالا گھاٹ کا مطالبہ کیا۔ نظام شاہ نے

## دکن کے آخری حصار

دکن میں اکبر کی مداخلت بہان شاہ کے اسکے پاس پناہ لینے سے شروع ہوئی جس میں پہلی بار کوئی کامیابی نہیں ہوئی پھر مراد کے حملے کو چاند بی بی نے پسپا کیا اور آخر کار برار اور احمد نگر پر مغلوں کا پرچم ہرانے لگا۔

اب بیدر، بیجاپور اور گولکنڈہ رہ گئے تھے جہاں اکبر اعظم کے سفیر پہنچتے رہے تھے تینوں سلطنتوں نے مظاہرہ دوستی کیا تھا لیکن مغل دکن پر پورا تسلط چاہتے تھے لہذا جہانگیر نے ۱۶۱۶ء میں دکن کی مہم کا آغاز کیا اور ۸ ذی الحجہ ۱۰۱۷ء کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ شاہزادہ پرویز کو روانہ کیا۔ اب دکن میں صرف ایک طاقت رہ گئی تھی ملک عنبر کی جس نے سلطنت نظام شاہی کے مالقی علاقے پر احمد نگر کی مردہ حکومت میں جان ڈالی تھی اور اس کا مرکز اورنگ آباد کو بنایا تھا۔ جہانگیر کو صورت حال کا علم ہوا تو اس نے خانخاناں خاں جہاں اور راجہ مان سنگھ وغیرہ کو شاہزادے کی مدد کیلئے بھیجا لیکن یہ لشکر دکن کو فتح نہ کر سکا اور اسکو ملک عنبر سے صلح کرنا پڑی۔

دوسری بار مغل لشکر ۱۶۲۱ء میں دکن پہنچا۔ اس عرصے میں ملک عنبر نے فرنگیوں سے ایک توپخانہ حاصل کر لیا تھا جو مغلوں کے توپخانے سے بہتر تھا لہذا ملک عنبر نے سخت مقابلے کے بعد مغلوں کو شکست دیدی۔

۱۶۲۳ء میں جہانگیر نے پھر دکن پر فوج کشی کرائی۔ ملک عنبر نے فوج کے دو حصے کر دیے تھے۔ ایک حصہ نے جنگ میں شکست کھائی تو ملک عنبر نے دوسرے حصے کو لیکر استاز بردست حملہ کیا کہ مغل لشکر میں زلزلہ پیدا ہو گیا لیکن افسروں نے اپنے قدم مضبوطی سے جمائے رکھے اور سنبھل کر یلغار کی تو عنبر کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ دولت آباد کی طرف فرار ہو گیا۔



لے پنے پروردہ مرہٹہ سردار ساہو جی بھونسلہ کو بھیج کر خاندیش پر حملہ کر دیا تاکہ مغلوں کی توجہ ادھر مبذول ہو جائے اور قلعہ بیر کا مسئلہ التواء میں پڑ جائے۔

دکنی مغلوں کے مقابلے میں ہر قیمت پر اپنی سرزمین کو بچانا چاہتے تھے لہذا نظام شاہ نے مرہٹوں کی سرپرستی کر کے انکو اپنی دفاعی قوت بنالیا تھا نظام شاہ کی ان ترکیبوں کو سمجھ کر شاہجہاں خود دکن کا عازم ہوا۔ اسکی ایک وجہ اور تھی کہ مغل سلطنت کا باغی خاں جہاں لودی بھی نظام شاہ سے مل گیا تھا اور اسکی قوت بڑھ گئی تھی

۱۶۳۹ء میں برہانپور پہنچنے سے قبل شاہجہاں نے ارادت خاں، راجہ گج سنگھ اور شائستہ خاں کی سرکردگی میں فوجیں دکن روانہ کیں اور کوئی کامیابی ہوتے نہ دیکھ کر آصف خاں کو سپہ سالار بنا کر بھیج دیا۔ ان فوجوں نے منصور گڑھ، دہارو مسخر کر لیا۔ دباؤ بڑھتے دیکھ کر عادل شاہ ثانی والی بیجاپور نے صلح کی بات بحیثیت شروع کر دی جس سے مغلوں کی پیش قدمی کچھ رک گئی۔ یہی عادل شاہ کا منشاء تھا۔ اسکے بعد جب دکنیوں سے افواج شاہی کا مقابلہ ہوا تو انہیں شکست ہوئی اور دکنیوں نے اپنے مفتوحہ علاقے واپس لے لیے۔

ملک عنبر کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا فتح خاں جانشین ہوا۔ اس عرصے میں مرتضیٰ نظام شاہ کی جگہ اس کا بیٹا برہان لے چکا تھا۔ اس نے شروع ہی سے مغلوں کے خلاف زبردست مہم چلا رکھی تھی لہذا مغل امراء کی سازش سے فتح خاں نے اسکو گرفتار کر لیا اور شاہجہاں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے گلا گھونٹ کر مار ڈالا تاکہ ہر ایک کو طبعی موت کا یقین ہو جائے۔ پھر فتح خاں نے احمد نگر کے کئی بادشاہ امراء کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور برہان کے دس سالہ بیٹے حسین کو تخت پر بٹھا دیا۔

اس طرف سے فراغت پا کر شاہجہاں نے آصف خاں کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا تاکہ سابقہ بد عہدیوں کی سزا دی جاسکے۔ ۱۶۴۱ء میں فتح خاں کا بیٹا عبدالرسول شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور آٹھ لاکھ نذرانہ پیش کیا جس سے خوش ہو کر شاہجہاں نے نئے نظام کا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا۔

لیکن بیجاپور کا قصبہ اسی طرح چلتا رہا۔ آصف خاں نے بھالکی اور سٹانپور

وغیرہ فتح کر لیے تھے۔ عادل شاہ نے مصطفیٰ چالیس لاکھ نذرانے اور اطاعت کی پیش کش کر دی مگر نہ روپیہ بھیجا اور نہ اطاعت کی۔ اس فریب سے یہ فائدہ ہوا کہ شاہی لشکر میں رسد کی کمی ہونے لگی۔ مجبور ہو کر آصف خاں نے بیجاپور کے علاقوں پر تاخت شروع کر دی۔ آخر ذی الحجہ ۱۰۴۱ھ میں شاہجہاں دکن کو مہابت خاں پر چھوڑ کر آگرہ واپس ہو گیا۔

مرہٹہ سردار شاہ جی بھونسلہ ہنوز احمد نگر سے وابستہ تھا لیکن اب وہ حدود سے تجاوز کرتا جا رہا تھا لہذا نئے نظام حسین شاہ نے اسکی جاگیر ضبط کر کے فتح شاہ کو دیدی جس سے وہ ناراض ہو کر عادل شاہ کے پاس بیجاپور چلا گیا اور وہاں سے ایک لشکر لے کر مغلوں کے مقابلے پر آگیا جو دولت آباد کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فتح خاں یقیناً مغلوں سے ملا ہوا تھا لیکن دولت آباد کی تسخیر کا مطلب یہ تھا کہ پورا دکن مغل سلطنت میں شامل ہو گیا اس لئے وہ عادل شاہ کے اکسانے پر دولت آباد پہنچ گیا۔

مغل لشکر جب شاہ جی بھونسلہ کو شکست دینے کے بعد آگے بڑھیں اور دولت آباد کے سلمے پہنچا تو ان پر قلعہ سے شدید گولہ باری ہوئی۔ مہابت خاں خود دولت آباد کے محاذ پر تھا اس نے لشکر کا اک حصہ عادل شاہ اور بھونسلہ کو روکنے کیلئے متعین کر دیا جو دولت آباد کو بچانے کیلئے قریب پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے مغلوں کا زور کم کرنے کیلئے ایسا انتظام کیا کہ انہیں رسد پہنچنے نہ پائے۔

مغلوں نے دکنی فوج میں سازش کا جال بچھا رکھا تھا۔ وہ فتح خاں کے ایک سردار محلدار خاں کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ مہابت خاں نے اسکو بھونسلہ پر لگا دیا اور محلدار خاں نے پہاڑی علاقے میں جا کر اسکے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ، چار سو گھوڑے اور چار سو ہاتھی اسکے ہاتھ لگے۔

محلدار خاں کے مغلوں کی طرف ہو جانے سے فتح خاں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اس نے پھر مغلوں سے صلح کر لی اور ۹ ذی الحجہ ۱۰۴۳ھ کو قلعہ مغلوں کے حوالے کر دیا۔ احمد نگر کے کم سن بادشاہ حسین کو گرفتار کر لیا گیا اور قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا گیا۔



شاہی حدود میں رہنے نہ پائے۔

شاہ جی بھونسلا اس طرح اطاعت کرنے والا نہ تھا۔ اس نے مغلوں اور عادل شاہی لشکروں سے کئی بار مقابلہ کیا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتا رہا مگر تابہ کے آخر اس نے عادل شاہ کی نوکری کر لی اور کٹ پتلی نظام شاہ کو اعظم خاں کے حوالے کر دیا۔ اس طرح احمد نگر کے چپے چپے پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

### اورنگزیب اور دکن

اسی سن میں شاہجہاں نے اورنگزیب کو دکن کا وائسرائے بنا کر بھیج دیا۔ دکن کے موجودہ مغل مقبوضات میں دولت آباد احمد نگر اور اسکے مضافات، بالا گھاٹ میں تلنگانہ، خاندیش میں آسیر اور برہانپور برار شہر الپور اور قلعہ کار بل شامل تھے اورنگزیب نے قلعہ اودگیر، اڑیسہ اور جتیر وغیرہ فتح کیے۔ ۱۶۳۶ء میں وہ دکن سے واپس ہوا تو آخری نظام شاہ اور اسکے رشتہ داروں کو ساتھ لیا جو قلعہ گوالیار بھیج دیئے

اسی سال اسکی شادی ہوئی پھر دکن واپس ہو کر اس نے بکھانہ کے آٹھوں قلعوں پر قبضہ کیا اور راجہ بکھانہ کو سلطانی پور کی جاگیر دیدی۔

اب دکن کی صورت حال یہ تھی کہ نظام شاہی، برار اور ہیدر کی حکومتیں ختم ہو چکی تھیں۔ گولکنڈہ اور بیجاپور باقیات الصالحات کی طرح باقی تھیں ان کو دکن کے مریض نیم جان سے تعبیر کیا جاسکتا لیکن احمد نگر نے برش شمشیر کے جو جوہر دکھائے تھے ان کے پیش نظر دکن کے نیم مردہ شیروں کو بھی شیریں سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مغلوں کے ٹڈی دل لشکروں کے سامنے عبداللہ قطب شاہ یا علی عادل شاہ ثانی کی حقیقت کیا تھی پھر بھی اورنگزیب نے گولکنڈہ پر حملہ کرنے کے بجائے پہلے اسکی طاقت کمزور کرنے کی تدابیر اختیار کیں۔

میر جملہ سلطان کو گولکنڈہ میں کئی اختیارات اور بڑا اعزاز حاصل تھا مگر جب اسکو مغل حکومت میں اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی گئی تو اسکی وفا کے قدم ڈگمگائے حقیقت یہ ہے کہ گولکنڈہ اور دہلی کی حکومتوں کا کوئی توازن اور تقابل ہی نہ تھا۔ اکتفا صرف اسی پر نہیں کی گئی بلکہ عبداللہ قطب شاہ کو شاہجہاں کی طرف سے فرمان

اب مہابت خاں نے ظفر نگر کا رخ کیا۔ درمیان میں کئی بار بیجاپور کے لشکر سے مقابلہ ہوا مگر مہابت خاں انکو پسپا کرتا ہوا بڑھتا رہا اور ظفر نگر کو حصار میں لے لیا۔ آخر اسکو فتح کر لیا۔

راجہ بھارت کو قطب شاہ کی طرف بھیجا گیا تھا۔ قطب شاہی فوجوں نے کئی مرتبہ اس سے ٹکری مگر شکست کھائی۔ آخر تلنگانہ میں قلعہ دیکور پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح مہابت خاں کی کوششیں دکن میں بڑی حد تک بار آور ہوئیں۔ ۱۶۳۵ء میں شاہجہاں نے والی گولکنڈہ کو اطاعت کا پیغام بھیجا اور اپنے ملک میں شاہ ایران کا خطبہ موقوف کرنے کا حکم دیا۔ قطب الملک نے اسکی تعمیل کی اور شاہجہاں کا اطاعت گزار بن گیا۔

اسی طرح کا ایک فرمان عادل شاہ کے نام بھی بھیجا گیا۔ اس نے بظاہر تو اطاعت کا وعدہ کر لیا مگر درپردہ بغاوت پر آمادہ رہا اسکی اطلاع شاہجہاں کو ملی تو اس نے لشکر کشی کا حکم دیدیا۔ شاہ جی بھونسلا نے اس درمیان نظام شاہی خاندان کے ایک لڑکے کو تاجدار بنالیا۔ مغل لشکر جب خاں دوراں، خان زماں، شائستہ خاں اور علی وردی خاں کی ماتحتی میں دکن پہنچا تو شاہ جی بیجاپور کے سپہ سالار اندولہ خاں کو لیکر مقابلے پر آگیا۔

مغلوں نے اپنی فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ علی وردی خاں کی سرکردگی میں احمد نگر کی سمت بڑھا۔ اس نے قلعہ دہرپ، سبجانی اور احمد نگر کے دیگر علاقے فتح کیے۔ شائستہ خاں نے جیزیر حملہ کیا۔ بھونسلا کے بیٹے کو شکست دے کر اسکے مقبوضات لے لیے۔

خاں دوراں نے بیجاپور کے علاقے تباہ کر ڈالے۔ قصبوں اور شہروں کو اجاڑتا وہ نواح بیجاپور میں پہنچا، گلبرگہ کے قریب میراپور کو برباد کر دیا اور قلعہ سردھوان کو مسخر کر لیا جو بیجاپور کا دروازہ تھا۔ مجبوراً عادل شاہ اطاعت پر آمادہ ہو گیا۔ شاہجہاں نے بعض شرائط پر اسکے ملک کا کچھ حصہ اور احمد نگر کے وہ مقبوضات جو بھونسلا کے تصرف میں تھے اسکے لئے چھوڑ دئے اور پابندی عاید کی کہ نظام شاہی خاندان کی کوئی فرد باقی نہ رہے اور مرہٹہ سردار شاہ جی اگر نوکری نہ کرے تو عادل



بھیج دیا گیا کہ میر جملہ اور اسکے بیٹے محمد امین کو فلاں فلاں منصب دیدئے گئے لہذا انہیں گوکنڈہ کی ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔

عبداللہ قطب شاہ لاکھ کمزور ہی لیکن ابھی تک دکن کا بادشاہ تھا۔ اپنی ب عزتی برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ان دونوں کو بھیجنے کے بجائے قید کر دیا۔ اس پر اورنگزیب کا بیٹا سلطان محمد ایک بڑا لشکر لیکر گوکنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ قطب شاہ کو حیدرآباد کے مرکزی شہر میں اسکی اطلاع ملی نا طاقت بادشاہ میں مغلوں سے براہ راست ٹکرائیے کا یار نہ تھا۔ اس نے میر جملہ اور محمد امین کو رہا کر دیا اور حیدرآباد سے آکر گوکنڈہ کے مضبوط قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا۔

سلطان محمد نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، لیکن گوکنڈہ کا قلعہ فتح کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ ادھر قطب شاہ نے بھی سوچا کہ صدقہ دینے سے بلارہ ہو سکتی ہے لہذا اس نے ایک کڑور روپیہ تادان جنگ بھی ادا کر دیا۔

۱۶۶۶ھ میں میر جملہ کو قلمدان وزارت پانچ لاکھ روپیہ اور شش ہزاری منصب اور معظم خاں کا خطاب عطا کیا گیا اور سعد اللہ خاں کے انتقال پر یہ عہدہ مستقل ہو گیا۔ اسکے بیٹے محمد امین کو خانی کا خطاب اور دو ہزاری منصب دیا گیا۔

۱۶۶۶ھ میں علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ہوا تو امرائے بیجاپور نے اسی خاندان کے ایک لڑکے سکندر کو تخت نشین کر دیا۔

مغلوں نے اسکو سنہرا موقع قرار دیا اور سکندر کو مجہول النسب مشہور کر کے بیجاپور پر حملہ بول دیا۔ میر جملہ خود دکنی تھا۔ وہ ایک لشکر جہاز لے کر دہلی سے دکن پہنچا اور نگزیب نے خاں جہاں کو اورنگ آباد میں چھوڑا اور خود چاندور سے آگے بڑھ کر بیدر کا محاصرہ کر لیا اسکے بعد گلبرگہ فتح کیا۔ اس دوران شاہ جی کے بیٹے سیولچی نے مغل لشکر پر چھاپہ مارا جو احمد نگر کے خاکستر پر مرہٹہ راج کے خواب دیکھ رہا تھا۔

مغل لشکر نے ایک ایک کر کے بیجاپور کے بہت سے قلعے فتح کر لیے۔ سکندر عادل شاہ نے ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ بطور تادان جنگ ادا کرنے کا وعدہ کر لیا مگر اسکے مفتوحہ قلعے واپس نہیں ہوئے۔

شاہجہاں کی بیماری اور دکن سے اورنگزیب کی واپسی کے بعد مرہٹوں کو

میدان صاف ملا۔ کل وہ دکنی درباروں میں معمولی نوکریاں کرتے تھے پھر انہیں فوجی دستوں کی صورت میں منظم ہونے کا موقع ملا جن کا کام سلاطین دکن کے اشاروں پر لوٹ مار کرنا تھا۔ اب پانچ میں سے تین بادشاہ ختم ہو چکے تھے۔ صرف بیجاپور اور گوکنڈہ باقی تھے جن میں بیجاپور کو ماضی کے مقابلے میں دیکھا جاتا تو گویا وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا، گوکنڈہ اندر کی طرف ایک دائرے میں سمٹ کر کچھ کچھ تو انا تھا۔ مرہٹوں کو سیولچی نے منظم کیا تو وہ اس طرح ابھرے کہ جہاں موقع ملا وہاں لوٹ مار کر کے دولت اکٹھا کی پھر پونا کے قریب ایک قلعہ لے کر اسکو اپنا مستقر بنالیا اور آہستہ آہستہ ایک مملکت کا طور ڈال دیا۔

کل کے آقا ج انکی نظر میں حقیر تھے۔ بیجاپور کے بعض علاقے تو انہوں نے لے ہی لیے تھے اسکے ساتھ مغلوں کے علاقوں کو بھی معاف نہیں کیا اور جلد ہی وہ دن آگیا کہ سیولچی نے راجہ ہونے کا اعلان کر دیا جسکے پاس بری فوج بھی تھی اور بحری بیڑا بھی۔

مغلوں نے ابتداً مسلم فرمانرواؤں کو ختم کرنے کیلئے مرہٹوں کی پیٹھ ٹھونکی تھی اور ان سے اپنی فتوحات میں مدد لی تھی۔ اب انہوں نے بڑے بڑے دھوکے دئے تھے شدید تر نقصانات پہنچائے تھے۔ پھر بھی اورنگزیب چار پانچ سال بعد جب دکن کے بچے کچے باقیات کو ختم کرنے کے درپے ہوا تو اس نے ۱۶۷۶ھ میں سیولچی اور نیلتی سے صلح کر لی اور دکن کے مرہٹان ناتواں کو تلوار کا لوہا پختانے کیلئے مرہٹوں کی تلواریں مستعار لے لیں۔

جنوبی ہند کا چپہ چپہ مرہٹوں کا جانا بوجھا تھا۔ انکے اجداد اسی سرزمین پر کبھی احمد نگر، کبھی بیجاپور کے وفادار سپاہیوں کی حیثیت لڑتے رہے تھے اب مغلوں کے لئے اسی سرزمین کو مسخر کرنے جارہے تھے لہذا نیلتی کو معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس نے قلعہ پھل تن فتح کیا پھر بڑھتا چلا گیا۔ بیجاپور کے پاس صرف تھوڑا سا علاقہ رہ گیا تھا۔ عو اسلاف کے نام و نشان کے طور پر باقی تھا اور تھوڑے سے سرفروش تھے۔ انہوں نے قدم قدم پر فداکاریاں دکھائیں مگر ہر مورچے پر شکست کھائی اور ان کا بہادر اور وفادار سردار یا قوت جشی مارا گیا۔



راجہ جے سنگھ کو اورنگزیب نے حکم دیا تھا کہ یجاپور کو ختم کیے بغیر واپس نہ ہو۔ وہ اسکے قریب پہنچ گیا تھا لیکن گولکنڈہ کی فوج سکندر عادل شاہ کی مدد کیلئے آگئی تو حملوں کی رفتار سست پڑ گئی پھر موسم کی خرابی کے باعث حملہ آوروں کو واپس ہونا

اورنگزیب نے شیعہ دشمنی میں سانپوں کو دودھ پلا کر بھیجا تھا۔ یجاپور اور گولکنڈہ دونوں کو اپنا انجام معلوم تھا لیکن ان کا عقیدہ تھا کہ عرت کی موت وہ ہے جو آخری سانس تک مدافعت کر کے حاصل ہو اس لئے انہیں تلوار نکرے نکرے ہو جانے تک لڑنا تھا، وہ لڑتے رہے تھے اور آئندہ بھی آخری سانس تک لڑتے رہنے کا عزم تھا۔

ادھر اورنگزیب کا فیصلہ تھا کہ ان بدعتیوں سے دکن کو پاک کر کے رہے گا حالانکہ بدعتی اسکے گرداگرد بڑھتے ہی جا رہے تھے: شائستہ خاں، علی وردی خاں اور مہابت خاں وغیرہ تو پہلے ہی سے تھے جن میں اس نے میر جملہ اور محمد امین کا اضافہ کر لیا تھا۔ شاہجہاں سے اس نے گولکنڈہ میں فرمان بھجوا دیا تھا: تبرا بند کیا جائے اور خطبہ امامیہ کے بجائے خطبہ چاریار جاری کیا جائے۔ اسکے سفیر کی موجودگی میں اس پر عملدرآمد کر لیا گیا تھا اسکے بعد وہ سب کچھ ہونے لگا تھا جو ہوتا آیا تھا۔

ظلم کی یہ نوعیت بھی انصاف طلب ہے کہ خطبہ امامیہ ایک فرقے کا عقیدہ ہے، اسکو ترک کر کے وہ خطبہ چاریار پڑھے، جس کا کسی کے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں اور جو ہمیشہ سرکاری ہدایت کے رواج میں داخل رہا مگر اورنگزیب کو عصبیت نے اندھا کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ راجپوت اکبر اعظم کے وقت سے سلطنت مغلیہ کے وفادار تھے اب مغل دشمن بن گئے تھے اور مرہٹے جو مستقل دشمن تھے وہ اسکی پناہ میں آ گئے تھے۔

آخر ۱۰۹۲ھ میں خود اورنگزیب دکن کی طرف روانہ ہوا۔ سیولجی اپنے بعد ایک بڑی طاقت اور ایک مضبوط حکومت چھوڑ گیا تھا مگر اورنگزیب کو اس سے زائد گولکنڈہ اور یجاپور سے ضد تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں کوئی دم خم نہیں ہے۔ اگر وہ ان کو یخ ذہن سے اکھاڑ پھینکنے کے بجائے مغل سلطنت کے زیر سایہ انہیں زندہ رہنے

دیتا اور مرہٹوں کا استیصال ان کے ذریعے کراتا تو انکو کامیابی ہو جاتی کیونکہ دکن کی سرزمین ان سے مانوس تھی۔ ہندو مسلمان سب ان کے علم کے نیچے بسر کرتے چلے آئے تھے۔

لیکن عصبیت میں پہلے اس نے گولکنڈہ پر توجہ کی کیونکہ وہ یجاپور کی مدد کیلئے آجاتا تھا۔

گولکنڈہ کی فوجوں نے کئی محاذوں پر مغلوں کا سخت مقابلہ کیا لیکن کہاں گولکنڈہ کا قنیل لشکر اور کہاں مغلوں کے ٹڈی دل انہیں مسلسل شکست ہوتی رہی آخر دلی گولکنڈہ نے گرانقدر رقوم کے وعدے اور بیش قیمت تحائف پر صلح کر لی۔

اسکے بعد اورنگزیب نے یجاپور کا رخ کیا مگر اہل دکن نے مغلوں کو چاروں طرف سے گھیر کر رسد بند کر دی پھر مزید مدد پہنچ جانے پر مغلوں نے کئی لڑائیوں میں یجاپوریوں کو پسپا کیا۔ اسپر تنگی اورنگزیب کو شہزادہ معظم پر شبہ ہوا کہ وہ اہل دکن سے مل گیا ہے اس نے اسکو نظر بند کر دیا مگر کچھ دنوں بعد چھوڑ دیا۔

سکندر عادل شاہ نے زندگی کی آخری لڑائی لڑی تھی۔ اسکے تمام بڑے بڑے سردار مارے جا چکے تھے۔ اب مغلوں سے ایک ٹکر بھی لینا خود کشی کے مرادف تھا لہذا اس نے قلعہ کی چابیاں اورنگزیب کو بھجوا دیں پھر خود بھی حاضر ہو گیا۔

اورنگزیب نے اسکو عادل خان کا خطاب دیا اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ بعض امراء کو بھی خلعت اور منصب دئے۔ اس طرح یوسف عادل شاہ کا ہرایا ہوا پرچم سو برس کے بعد ہمیشہ کیلئے سرنگوں ہو گیا۔

اب گولکنڈہ دکن کا آخری حصار تھا مگر بقول مفتی شوکت علی فہمی "اورنگزیب کو قطب شاہی حکمرانوں سے دلی نفرت تھی" لہذا یجاپور سے فارغ ہوتے ہی اس نے فوجوں کا رخ اس سمت میں موڑ دیا۔

عبداللہ قطب شاہ کے بعد ابوالحسن تانا شاہ گولکنڈہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا جو بزم کی جان اور رزم کی آبرو تھا، اچھا شہوار اور بہادر تھا، سخی متواضع عدل پرور اور رعیت نواز بھی۔ اسکی نفاست مزاج کی داستانیں آبجک زبان زد ہیں۔ اسکو زمانے کے حالات نے سب کچھ بتا دیا تھا اور انجام بھی اس سے ڈھکا چھپا



نہ تھا پھر بھی اس نے مغلوں کو دانتوں چنے چبوا دئے اور اب اور نگزیب نے پوری قوت سے یلغار کی تھی تو اس نے اور اسکے سالاروں نے موت اور زندگی کی لڑائیاں بھی لڑ کر دیکھ لیں۔

آخر ابوالحسن قلعہ گوکنڈہ میں محصور ہو گیا۔ اس کا سپہ سالار تھوڑے سے جیالے سورماؤں کو لیکر نکل گیا جو برسوں تک مغلوں پر چھاپے مارتا رہا پھر سراغ نہیں ملتا کہ وہ لڑتے لڑتے مر گیا یا اس نے اطاعت کر لی۔

قلعہ گوکنڈہ کا فتح کرنا اتنا آسان نہ تھا ابوالحسن ایک عرصے تک مدافعت کرتا رہا پھر اسکی طرف سے صلح کیلئے ہر ممکن پیش کش ہوئی مگر اور نگزیب نہیں مانا تو اس نے سوچا کہ جب بچ سکنے کی کوئی امید نہیں تو اپنے وفاداروں کو کٹوانے سے کیا فائدہ لہذا اس نے تمام ممتاز افراد کو جمع کیا اور اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ قلعہ میں جو کچھ ہے وہ ان سب کا ہے جو کوئی نکل سکے اور جو کچھ لے جائے وہ لے جائے اور جو محفوظ کر سکے وہ محفوظ کر لے۔ پھر اس نے قلعے کے دروازے کھلوا دئے اور مغل فوج اندر داخل ہو گئی۔

قطب شاہی سپاہی ہتھیار ڈال چکے تھے۔ اور نگزیب کے امراء جب اسکو پوچھتے ہوئے پہنچے تو وہ دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا۔ انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ تانا شاہ انکو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے بڑے احترام سے انہیں کھانسی دعوت دی۔

اسکے بشرے پردہ اطمینان و سکون تھا کہ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اسپر مغل سردار روح اللہ خاں نے بڑے استعجاب سے کہا۔

”آپ تو اس طرح بیٹھے ہیں جیسے آپ کو شکست کے بجائے فتح حاصل ہوئی ہو۔“

ابوالحسن نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

”تشویش کس بات ہو جس نے بادشاہت دی تھی اس نے چھین لی۔ میں راضی برضا ہوں۔ اسکی مشیت ہے کہ ایک فقیر سے دختر سلطان کی شادی کرادی اور اسکو تخت پر بٹھا دیا۔“

اس نے روح اللہ خاں کی طرف دیکھا اور بڑے یقین کے ساتھ کہا۔  
”مطمئن ہوں کہ میں نے تخت و تاج کو بچانے میں کوتاہی نہیں کی۔ اب وہی اسکو باقی رکھنا نہیں چاہتا اور مجھے دوبارہ فقیری کی زندگی دینا چاہتا ہے تو میں انکار کیوں کروں اور اسکی مرضی کے سامنے سر کیوں نہ جھکاؤں؟“

پھر اس نے ہاتھ روح اللہ خاں کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسکو دسترخوان پر بٹھالیا اور دوسرے امیروں کو بھی کھانے میں شریک کیا۔

کھانا ختم ہونے پردہ اٹھا، گھوڑے پر سوار ہو کر شہزادہ اعظم کے خیمے میں آیا کیونکہ معظم قید میں تھا۔ اعظم کے گلے میں اس نے موتیوں کی مالا ڈالی اور قلعہ کی چابیاں پیش کیں۔ اعظم اسکو اور نگزیب کے سامنے لایا اور اور نگزیب نے قلعہ دولت آباد میں اسکے آرام و آسائش کا بندوبست کر دیا۔

اس موقع پر یہ روایت بھی فراموش نہیں کی جاسکتی جو زباں زد ہے کہ اور نگزیب نے اس سے پوچھا۔

”تمہیں کس طرح کی موت دی جائے؟“

”میرے لئے تلوار و خنجر کی ضرورت نہیں ہے کوئی گندی عورت میرے قریب سے گزار دی جائے“ تانا شاہ نے جواب دیا اور ایک گھوسن کو اسکے قریب لے آیا گیا۔ ابوالحسن کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں اور اسکی روح اسی وقت پرواز کر گئی۔  
واللہ اعلم بالصواب۔

یہ ہوا انجام دکن کی اس عظیم سلطنت کا جس نے ہندوستان میں عداوت کی وہ روایات پیش کیں جو ملک کے شمال جنوب، مشرق و مغرب ہر طرف پائی جاتی ہیں۔ (۸۱)

jahir.abbas@yahoo.com



حیدر علی کا تعلق نوائے قبائل سے تھا جو ابتدائے مرہٹواڑی اور کوکن کے ساحل پر آباد ہوئے تھے پھر سلطنت ہہمنی کے زمانے میں دکن پہنچنا شروع ہوئے۔ جب ہہمنی سلطنت پانچ حصوں میں بٹ گئی تو وہ بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ وغیرہ میں ملازمتیں کرنے لگے اور بعض اچھے عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ یہ حکومتیں ختم ہوئیں تو انہوں نے پھر ترک وطن کیا۔ بلارمی، انت پور، میور، پائیں گھاٹ اور جنوبی ارکاٹ میں مسلمانوں کی جو آبادیاں پائی جاتی ہیں وہ مسلم تارکین وطن کی ہیں۔ انہیں میں نوائے قبائل بھی شامل تھے جنگی ایک تعداد میور کی فوج میں تھی۔ اس تعداد میں سے ایک جیلے سپاہی حیدر علی نے اقتدار حاصل کیا۔ نوائے نصر بن کناہ کی نسل سے تھے اور کوفے سے نو میل کے فاصلے پر وائے میں آباد تھے لہذا بنو وائے کہہ کر پکارے گئے اور ہندوستان میں کثرت استعمال سے نوائے ہو گئے۔ حیدر علی اسی قبیلے سے تھا۔

کرشناراج، میور کا راجہ تھا لیکن سارے اختیارات تندرراج وزیر کے ہاتھ میں تھے۔ میوری فوج جب نواب ناصر جنگ کی مدد کو ارکاٹ گئی تو حیدر علی بھی اس میں شامل تھا اور جب محمد علی والا جاہ کی طلبی پر تہہ چا پلی بھیجی گئی تب بھی حیدر علی اسکے ساتھ تھا۔ ان معرکوں میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دئے اور وہ ایک دستہ فوج کا افسر یعنی نانک بنادیا گیا۔ پھر ڈنڈی گل کا فوجدار مقرر ہوا۔

پچھلی جنگوں میں مرہٹوں نے تادان جنگ کے عوض میور کا تمام علاقہ اپنے پاس رہن رکھ لیا تھا۔ اب وہ قبضے کیلئے آئے تو راجہ نے کچھ رقم دے کر ملنے کی کوشش کی مگر مرہٹے راضی نہ ہوئے تو ڈنڈی گل سے حیدر نانک کو بلوایا گیا۔

اس عرصے میں حیدر علی کی شہرت ہو چکی تھی۔ مرہٹے اس سے خائف ہوئے اور جو کچھ ملائیکر چلے گئے۔ پھر حیدر علی نے رانیوں کی درخواست پر وزیر اور راجہ کی کشیدگی دور کرائی اور وہ افواج میور کا سپہ سالار بنادیا گیا لیکن اسکی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر جلد ہی راجہ نے اسکے خلاف سازش کی اور چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے مرہٹوں کو بلالیا۔ حیدر علی بروقت باخبر ہو گیا اور سرنگاپیم سے بھاگ کر بنگلور

## میور

### حیدر علی

اور نگرزب نے بادی النظر میں دکن کو مکمل طور پر مسخر کر لیا تھا لیکن صحیح معنی میں بدامنی اسکے بعد ہی شروع ہوئی۔ مرہٹہ ریاست سیولٹی کے مرنے کے بعد کمزور پڑی تھی تو اسکے حصے بخرے ہو گئے مگر دوسری طرف مغل سلطنت بھی کمزور پڑ گئی تھی اور ہر صوبہ مطلق العنان ہو گیا تھا جسکے نتیجے میں دکن پر کبھی مسلمان بھاری پڑے اور کبھی ہندو اور چھوٹی بڑی ہندو مسلم ریاستیں وجود میں آتی رہیں۔

ویسے بیجانگر (وجیانگر) کے خاکستریہت سی چھوٹی ہندو ریاستیں وجود میں آگئی تھیں جو آخر وقت تک باقی رہیں جن میں بعض کا رقبہ چند وہہات پر مشتمل تھا اور بعض کچھ بڑی تھیں جیسے تنجاور، مدور اور میور۔ یہ سب خانہ جنگی کا شکار تھیں۔

میور کا راجہ چک دیورایا اور نگرزب کا حلقہ اطاعت لگے میں ڈال چکا تھا پھر بھی ایک طاقتور حکمران تھا۔ ۱۷۰۲ء میں اس کا انتقال ہونے پر وزیر رانی کنتی پورا کو برسر اقتدار لائے پھر ڈڈگر کرشناراج، اسکے بعد چامراج تخت پر بیٹھا مگر ان میں سے کوئی اتنا باصلاحیت نہ تھا کہ نظم حکومت پر حاوی ہو سکتا۔ آخر میں کرشناراج ثانی نے راج گدی سنبھالی۔

انتزاع سلطنت مغلیہ پر پورے ملک کی طرح دکن بھی طوائف الملوکی کا شکار تھا اور میور کی حالت تو بہت خراب تھی۔ راجہ اور وزیر آپس میں لڑ جاتے اور ایک دوسرے پر گولہ باری کرنے لگتا۔ مرہٹوں اور مسلم امراء کے حملے اس پر مستزاد تھے۔ ایسے میں میور کی فوج سے ایک سپاہی ابھر کر سامنے آیا جس کا نام حیدر علی تھا جس نے غیر ملکیوں کی دشمنی میں عالمگیر شہرت حاصل کی۔



آکر پناہ گزین ہوا۔

حیدر علی نے پوری نیک نیتی سے میسور راج کی خدمت کی تھی جس کا یہ صلہ ملا تو اس کا باغی نہ ہونا ممکن نہیں تھا جو سرمایہ بھی اسکے پاس تھا اس نے اس سے کچھ سپاہی بھرتی کیے اور انکو تربیت دے کر لڑنے کے قابل بنالیا۔

اس اثنا میں راجہ کی فوج اور مرہٹوں نے بنگلور کو آکر گھیر لیا۔ حیدر علی کے پاس تھوڑے سے سپاہی تھے۔ وہ ان فوجوں کے مقابل آیا تو اپنے سپاہیوں کو سمیٹ کر پہلے ایک حصہ پر حملہ آور ہوا پھر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دوسرے پر ٹوٹ پڑا۔ اس طرح اس نے ایک کے سنہلنے سے قبل دوسرے کو کاٹنا شروع کر دیا۔ اسکے سپاہی بھی طریق جنگ میں اسکے قدم بقدم تھے۔ تھوڑی دیر کی جنگ میں اس نے سب کو مار بھگایا اور مال غنیمت مل جانے کے بعد تو بنگلور اسکی فوج کی چھاؤنی بن گیا۔ ۱۷۶۱ء میں اس نے سرنگاپٹم پر بھی قبضہ کر لیا اور راجہ کی سابقہ عنایات کے پیش نظر تین لاکھ کی قدیم جاگیر اسکے لئے چھوڑ دی۔

پھر نواب بسالت جنگ کے توسط سے مغل شہنشاہ نے اسکو میسور کی صوبہ داری کی سند بھی دیدی۔

حیدر علی کے اقتدار کی جنگ دراصل ۱۷۶۱ء سے شروع ہوئی پہلے اس نے پایلگاروں کو مطیع کیا پھر بد نور کو فتح کیا جہاں اسکو ایک غزانہ مل گیا جس سے اس نے اپنی طاقت میں اضافہ کیا اسکے بعد نارتوں کو شکست دی اور پورے ملیبار کو تسخیر کر لیا۔ ۱۷۶۵ء میں مرہٹوں نے اسپرچمھائی کی اور مسلسل لڑائیوں میں حیدر علی کی طاقت زائل ہونے لگی تو اس نے سات لاکھ نقد دے کر پچاس لاکھ مزید دینے کا وعدہ کر کے ان سے صلح کر لی۔

اب نواب حیدر علی ابھرتے ہوئے سورج کی طرح پورے ہندوستان میں مشہور ہو چکا تھا لہذا محمد علی والا جاہ نظام الملک اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسکے خلاف ایک باہم اتحاد کیا اور انکی مشترکہ فوجیں میسور کی طرف بڑھنے لگیں ایک مرہٹہ سردار بھی ان کے ساتھ تھا۔

حیدر علی صرف بہادر ہی نہ تھا، مدبر اور سیاستدان بھی تھا۔ اس نے اپنے مایہ

نازیبیت پٹو سلطان کو بھیج کر مدراس کا محاصرہ کر لیا جس سے انگریزوں کی پیش قدمی رک گئی مگر فرنگی شاطر اس سے زائد چالاک تھے۔ انہوں نے ایک جعلی خط حیدر علی کی طرف سے ٹیپو کو بھجوا دیا جس میں محاصرہ اٹھا کر چلے آنے کی ہدایت تھی۔ ٹیپو نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔

حیدر علی پر جب حقیقت حال منکشف ہوئی تو اس نے خود پوری طاقت کے ساتھ مدراس کو حصار میں لے لیا اور انگریزوں کو بے دست و پا بنادیا۔ مجبوراً انہوں نے صلح کی درخواست کی اور لکھ کر دیدیا کہ حیدر علی جب ان سے مدد مانگے گا تو وہ اپنی فوج بھیجیں گے۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی سال ۱۷۶۰ء میں مرہٹوں نے میسور پر ہلہ بول دیا۔ حیدر علی نے حسب معاہدہ انگریزوں سے مدد مانگی مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا مغل سلطنت کے اس دور میں مرہٹے جس طرف کا رخ کرتے تو اس تعداد میں کہ زمین ان کے قدموں سے پامال ہو جاتی۔ یہ جنگ چار سال تک جاری رہی۔ مرہٹوں کو ہر طرف سے مدد مل رہی تھی اور حیدر علی تنہا ان کے مقابلے پر ایستادہ تھا۔ آخر موتی تالاب کی لڑائی میں اسکو مکمل شکست ہوئی۔ سرنگاپٹم میں دم لے کر حیدر علی نے از سر نو تیاری کی اور آٹھ دن مرہٹی لشکر پر شیخوں مارنے لگا جس سے مرہٹے بھی عاجز آگئے لیکن لڑائی حیدر علی کی سرزمین پر ہو رہی تھی اور اسکی فوجی طاقت بھی کمزور پڑ چکی تھی اس لئے اس نے ۳۶ لاکھ تاوان جنگ دے کر صلح کر لی۔

اس کمی کو حیدر علی نے کورگ اور کڑپہ فتح کر کے پورا کیا۔ اس دوران یورپ میں فرانس اور انگلستان کی ہفت سالہ جنگ چھڑ گئی۔ فرانسیسی حیدر علی کی پناہ میں تھے انکی کوٹھی ماہی ملیبار میں واقع تھی جسرا انگریزوں نے حملہ کر دیا تو حیدر علی نے ۱۷۷۸ء میں کرناٹک پر چڑھائی کر دی۔ انگریز مورخین نے اس جنگ میں حیدر علی کے طوفانی حملوں کا اعتراف کیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رات حیدر علی نے سیکڑوں بیلوں کے سینگوں میں فنیٹے باندھے، سارے بیلوں کو رسوں سے آپس میں ہمرشتہ کیا، رات کی تاریکی میں انگریزی کیمپ کے قریب ان فنیٹوں کو روشن کر دیا اور انکو کیمپ کی طرف ہنکا دیا۔



بیل بھڑک بھڑک کر بھاگے۔ انگریزوں نے یہ سمجھا کہ حیدر علی نے شب خون مارا ہے۔ وہ بیلوں پر گولیاں چلاتے ہوئے دوڑ پڑے۔

اس وقفے میں حیدر علی نے عقب سے حملہ کر دیا اور کاٹ کر رکھ گیا۔

یہ جنگ جاری تھی کہ ۱۷۸۲ء میں ارکاٹ کے قریب نواب حیدر علی کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے پیچھے شجاعت کی ہزاروں داستانیں چھوڑ گیا۔ نوائٹ کی اکثریت شیعہ تھی اور حیدر علی بھی نسلی طور پر آئمہ اشیا عشر کا ملنے والا تھا۔ اسکو زندگی بھر اطمینان سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا مگر محرم میں مجلسیں منعقد کرتا تھا اور ماتم حسین میں سیاہ پوش ہو جاتا تھا۔

ملک گیری کیلئے کوئی جنگ جہاد کی تعریف میں نہیں آتی لیکن حیدر علی کی جنگ میں وطنیت کا ایک پہلو مضمحل تھا۔ اس نے غیر ملیوں کو ملک سے نکلنے کیلئے تلوار اٹھائی تھی لہذا میدان جنگ میں اسکی موت شہادت کے قریب ضرور پہنچ جاتی ہے

### ٹیپو سلطان، ضیغم ہندوستان

ٹیپو نے محاذ جنگ پر ایک ہاتھ میں گھوڑے کی نگام دوسرے میں عنان سلطنت سنبھالی۔ حیدر علی کا بیٹا اسد اللہ کا پیر و تھا۔ وہ بھپڑے ہوئے شیر کی طرح انگریزوں پر گھن گرج کے ساتھ برستارہا۔ دو سال میں اس نے انکی حالت تباہ کر دی اور انہیں اپنی شرائط پر صلح کرنے کیلئے مجبور کر دیا۔

حیدر علی نے جن مخاصمانہ حالات میں استقرار سلطنت کیا تھا ٹیپو سلطان کو ان سے بھی برے حالات کا سامنا تھا۔ مرہٹے پہلے دن سے دشمن ہو رہے تھے اور ہم عصر مسلمان امیر جل بھن کر کباب ہوئے جارہے تھے۔ ان میں نظام الملک پیش پیش تھا وہ انگریزوں پر سلطان کی فتح سے مارے جلن کے مرہٹوں سے مل گیا اور میسور کے خلاف ایک معاہدہ کر لیا۔

ٹیپو سلطان کا مقصد باہمی جنگ و جدل کے بجائے یہ تھا کہ غیر ملیوں کو ہندوستان سے نکال دے اس نے نظام الملک سے رشتہ داری قائم کرنے کی پیش کش کی تاکہ دو مسلمان حکمران آپس میں نہ لڑیں لیکن نظام نے یہ کہہ کر انکار کر دیا

کہ وہ ایک نائک کے خاندان سے سمدھیانہ قائم نہیں کر سکتا۔

اب شیردل سلطان مجبور تھا وہ بھی میدان میں آگیا۔ چار سال تک جنگ ہوتی رہی۔ ٹیپو کی رگوں میں حیدر علی کا خون تھا اور اسکی گرمی شباب پر تھی۔ اس نے ہر محاذ پر دشمن کو شکست دی اور سلطنت خداداد میسور کی حدیں پونا اور حیدر آباد سے جا کر مل گئیں۔ دنیا دشمن تھی لیکن سلطان ٹیپو اس دور میں ہندوستان کی آبرو بن گیا اور اسکی سفارت پولین بونا پارٹ تک پہنچ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹیپو کو انگریزوں سے جتنی نفرت تھی انگریز اس سے اسی قدر خائف تھے۔ وہ موقع کے منتظر تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ مرہٹوں اور نظام کی جنگ میں سلطنت خداداد کی طاقت کمزور پڑ چکی ہے تو انہوں بغیر کسی اطلاع کے میسور پر حملہ کر دیا مگر ٹیپو اتنا نرم نوالہ نہیں تھا جسکو باسانی حلق سے اتار لیا جاتا۔ دو برس کی لڑائی میں ٹیپو نے انگریزی طاقت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

اس صورت حال میں لارڈ کلاؤس کو یقین ہو گیا کہ ٹیپو سلطان سے وہ اپنی قوت پر جیت نہیں سکتا لہذا ایک طرف اس نے میسور میں سازش کا جال بکھایا دوسری طرف مقامی طاقتوں سے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی اس میں اسے فوری طور پر کامیابی ہو گئی اور مرہٹے اور نظام اس کے اتحاد میں شامل ہو گئے۔

سازش میں ہر مقام پر انگریزوں کو ایسے مہرے مل گئے جسکو استعمال کر کے وہ شہنشاہ شجاعت کو مات دے سکتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ٹیپو میں بہادری تو تھی مگر حیدر علی کی سی سوجھ بوجھ نہ تھی۔ سلطان ٹیپو کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہے۔ جن لوگوں پر اس نے حد سے زائد احسانات کیے تھے، جو اس کے ہاتھ پاؤں تھے وہی دھوکا دے گئے تو وہ کیا کرتا۔ کشن رائے کی شہادتی سے بنگلور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا گنجام مہدی خاں نائٹ کی بمکھرا می سے نکل گیا۔ گھر کے بھیدیوں نے لنکا ڈھادی تو سلطان کو دکھ تو بہت ہوا مگر اس نے ہوش و حواس برقرار رکھے۔

بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا اور سلطان تازہ ولولوں کے ساتھ مد مقابل تھا لہذا انگریز واپس ہو گئے۔ اس اثناء میں مرہٹوں کی کمک پہنچ گئی اور انگریزوں نے



پھر سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔

اپنوں کے فریب اور امراء کی غداری سے سلطان دل شکستہ ہو چکا تھا۔ آخر اس نے ۱۷۹۲ء میں نصف سلطنت دے کر انگریزوں سے صلح کر لی۔ وہ بھی ٹوٹ چکا تھا اور اسکی سلطنت بھی بٹ چکی تھی لیکن شیر کا دل اور لوہے کا کلیجہ تھا حیدر علی کے بیٹے کا کہ نئے حوصلے اور تازہ امنگوں کے ساتھ فوجی تنظیم اور ملکی تعمیر میں لگ گیا اور چھ سات برس بعد انگڑائی لے کر اٹھا تو دنیا کو محسوس ہوا کہ جنگل کا شیر خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اب اسکے پاس بحری بیڑا بھی تھا اور اتنی مضبوط فوج جو وقت پڑنے پر سیہ پلائی دیوار بن سکتی تھی۔

لیکن کتنے بے ضمیر تھے اہل ہندوستان کہ جو طاقت سفید فام قوموں کو مادر وطن سے نکلنے کیلئے فراہم کی گئی تھی اسکو دیکھ کر وہ جلتے تھے۔ ٹیپو نے سلطان ترکی اور والی افغانستان دونوں سے خط و کتابت کی تھی اور ان کو مدد دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس مدت میں انگریزوں نے صرف یہ کام کیا تھا کہ اپنے تجارتی ذہن کے تحت سلطنت خداداد کے عہدہ داروں کو خریدتے رہے تھے اور ایسے سبز باغ دکھائے تھے کہ اگر انہوں نے ٹیپو کو ختم کر دیا تو انکی دنیا جنت بن جائے گی۔

ان میں سے بیشتر سلطنت کے ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے اور سلطان کی طرف سے انہیں گرانقدر عطیات بھی ملتے رہتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزوں سے وہ اس سے زائد کس چیز کی توقع کر رہے تھے کہ اپنے ملک کی کشتی ڈوبنے پر تیار ہو گئے۔

امراء میں میر صادق، میر معین الدین، بدر الزماں نانٹھ، میر غلام علی لنگڑا، میر قمر الدین اور پورنیا، دوسرے درجے کے لوگ ان کے علاوہ تھے۔ پورنیا کو میوور میں ہندو راج کا خواب دکھایا گیا تھا اور قمر الدین کو ریاست گرم کنڈہ کے تخت کی امید دلائی گئی تھی۔ یہ سب انگریزوں کے تابع فرمان بن گئے اور ان کے حکم کے منتظر ہو گئے اور آخر انہیں ایک دن تعین وقت کے ساتھ ایک منصوبہ مل گیا۔

غدار پورنیا وزیر مالیات تھا۔ اس نے وہ دن فوج کو تنخواہ تقسیم کرنے کا مقرر کر دیا اور انگریزی فوج جب سرنگا پٹم کی طرف بڑھی تو پیش تر فوجی تنخواہ لینے

کیلئے گئے ہوئے تھے۔

میر قمر الدین فوج کا سپہ سالار تھا اس نے انگریزوں کی پیش قدمی میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔ شہزادہ فتح حیدر نے بڑھ کر روکنے کا ارادہ کیا تو قمر الدین نے اسکو منع کر دیا شہزادہ یہ سمجھا کہ سپہ سالار کا کوئی جنگی منصوبہ ہو گا جسکے تحت روکا جا رہا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا اور انگریز فوجیوں نے سرنگا پٹم کے گرد ایک حصار بنالیا۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کی دوپہر کو سلطان ٹیپو دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا کہ اسکو اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور طاؤس نامی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اس موقع پر فرانسیسی مشیروں نے کہا کہ اسکے پاس ابھی بہت سے قلعے ہیں وہ نکل چلے اور کسی قلعہ میں پناہ لے کر تیاری کرے مگر سلطان کو یا تو ہر ایک کے بک جانے کا علم نہ تھا یا اسکی شجاعت نے پیٹھ دکھانا مار سمجھا ہوا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر باہر آگیا اور شمالی فصیل کی طرف بڑھتی ہوئی انگریزی فوج کو اس نے روک لیا۔

جنوبی فصیل پورنیا کی غداری سے انگریزوں کے قبضے میں آچکی تھی۔ سلطان شمالی فصیل پر پہنچا تو منکھرام میر صادق نے اسکی اطلاع انگریزوں کو کر دی۔

سلطان کے ساتھ صرف اسکے ذاتی محافظ تھے ان وفاداروں نے جانیں دیدیں مگر انگریزوں کو دوپہر سے سہ پہر تک بڑھنے نہ دیا حالانکہ ادھر سلطان کی موجودگی کی اطلاع پا کر انگریزوں نے دباؤ بڑھا دیا تھا مگر ان کا مقابلہ شیروں سے تھا جو مرنا جانتے تھے پسپائی کو تنگ سمجھتے تھے۔

اس وقفے میں سلطان نے دیکھا کہ انگریز جنوب میں اندرونی فصیل پر آگئے ہیں۔ وہ تیزی سے واپس ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ محل میں پہنچ کر بارودی سرنگوں میں آگ لگا دے جو اس نے اسی دن کیلئے ہتھیار کھی تھیں لیکن غداری اپنی آخری بلندیوں کو پہنچ چکی تھی۔ میر صادق نے ڈڈی دروازے کو پہلے سے بند کر دیا تھا جو سلطان کی آمد رفت کا راستہ تھا۔ سلطان اس راہ کو مسدود پا کر اندرونی دروازے کی طرف بڑھا اسکو انگریزوں نے تین طرف سے گھیر رکھا تھا۔

مسلسل جنگ کے باعث سلطان کو بہت پیاس لگی تھی۔ اس نے غلام سے پانی طلب کیا۔ اس کم بخت نے دسپے سے انکار کر دیا اور کہا "اپنے کو انگریزوں کے



حوالے کر دیجئے۔“

عقل انسانی تحریر میں پڑ جاتی ہے کہ سرنگا پٹم میں کتنے نمکھرام تھے۔ چھوٹے سے بڑے تک سب ملک و قوم کے دشمن اور سلطان کے خون کے پیاسے جبکہ سلطان کی سیرت کا جائزہ لیا جائے تو حد درجہ نیک نفس، اقربا پرور اور حقوق آشا۔ اس نے ہر ایک کو اسکی حیثیت سے زائد نوازا تھا۔ صورت حال کو سمجھ کر شاید اس کا کلیجہ پھٹ گیا ہو کہ اس دنیا میں رہنے سے کیا فائدہ جس میں اتنے تنگ انسانیت بستے ہوں۔ اس نے غلام پر ایک نظر ڈالی اور اسکی زبان سے نکلا۔

”شریر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے“

پھر باحمیت اور غیرت دار سلطان موت یا زندگی کی جنگ کرنے لگا بچے کچے ساتھیوں میں ایک ایک کر کے گرتا رہا۔ سلطان کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا لیکن اسکی بندوق اس وقت تک چلی جب تک اسکے ایک ہاتھ میں ذرا سی سکت بھی باقی رہی پھر وہ اس دنیا سے اپنا رشتہ توڑ گیا جس میں اب وہ رہنا بھی نہ چاہتا تھا۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کا سورج جب مغرب میں ڈوبا تو ڈوبتے ڈوبتے اس نے اپنی کرنوں سے افق ہندوستان پر ایک نام لکھا۔

### سلطان فتح علی ٹیپو شہید :

یہ نام آج بھی جبین حریت پر درخشاں ہے اور جب تک یہ نام باقی ہے اس وقت تک چند غلط آدمیوں کے نام بھی لیے جاتے رہیں گے جو انسانیت کے دامن پر ایک بد نما داغ ہیں۔

مشرق کی سرزمین نے مغرب کے سفید فام انسانوں کو انکی شقاوت اور بیرحمی کے سبب کبھی پسند نہیں کیا۔ بالخصوص ہندوستان میں تو ان کا وجود ہمیشہ ایک بوجھ قرار دیا گیا مگر کھل کر جس شخص کے ان خلاف پہلانیہ لگا یا وہ حیدر علی تھا اور پھر اس کا عظیم بیٹا جسکی آواز باز گشت آج بھی فضاے بسیط میں گونجتی ہے۔

”ہندوستان صرف ہندوستان والوں کا ہے۔“

ٹیپو ایک شیعہ باپ کا بیٹا اور شیعہ اسلاف کی اولاد میں تھا مگر عملی زندگی میں وہ پہلے انسان پھر شیعہ تھا اور شیعیت کے زادیہ نگاہ سے اس کا یہ انداز غلط نہ تھا۔

کیونکہ اسلام صرف انسان کو انسان بنانے ہی کیلئے آیا تھا البتہ شیعہ نقطہ نظر سے اس نے عزاداری میں بعض ترمیمات کی کوشش کی تھی جو پسند نہیں کی گئیں اور اسی پر ایک حلقے نے کہہ دیا کہ وہ سنی تھا۔

فکر کا یہ انداز بھی عجیب ہے کہ مشہور و معروف دشمن اہل بیت محمود احمد عباسی تو یہ کہتا ہے ہیں کہ تمام مغل سلاطین شیعہ نہیں تو نیم شیعہ تھے حالانکہ ان میں سے شیعہ کش بھی تھے اور وضع دار سنی بھی اور ٹیپو جو پشت در پشت شیعہ تھا اسکو سنی کہہ دیا گیا اور اسکی اگلی نسلیں ساری کی ساری شیعہ رہیں۔

میرے ایک بزرگ کلکتہ میں سلطان ٹیپو کے پوتے جانی صاحب کے مکان پر مجلس عزاء میں شریک ہوئے تھے ان کا کہنا تھا کہ جانی صاحب کا صاحب اہل بیت انہوں نے کم ہی دیکھا ہے۔

سنی سازی ہی کرنا ہے تو تاریخ کو مسخ کرنے کے بجائے صداقت کو ذہنوں میں بسا کر کی جائے مگر عمل اسکے خلاف ہوتا ہے۔ شیعوں کے پاس بیٹھنے کو منع کیا جاتا ہے انکا لٹریچر نہ پڑھنے کی ہدایت کی جاتی ہے حالانکہ جو برحق ہوتا ہے وہ کسی کا سامنا کرنے سے نہیں ڈرتا۔ ایک گروہ سامنا کرنے پر توتیاں ہوتا ہے مگر اکثریت کے زعم کے ساتھ اور قوت بازو کے بل پر اس سے سر تو کٹ سکتے ہیں دل جھک نہیں سکتے۔

یہ بات ہم مسلسل کہتے آئے ہیں مگر کوئی توجہ نہیں کی جاتی بلکہ جواب میں خوش اخلاقی کی بجائے تلوار بے نیام کر لی جاتی ہے۔ خدا رحم کرے اس ذہنیت پر! (۸۲)

jabir.abbas@yahoo.com



علی وردی خاں نے بڑے دبدبے کے ساتھ حکومت کی کہنے کو وہ نا طاقت  
مغل بادشاہ کا صوبہ دار تھا مگر عملی طور پر آزاد حکمران تھا۔ ۶ اپریل ۱۷۵۶ء کو اسکا  
انتقال ہوا تو سراج الدولہ اس کا جانشین ہوا۔

### سراج الدولہ

علی وردی خاں کے کوئی اولاد نہ تھی لہذا اس نے اپنے نواسے مرزا محمد  
کو گود لے لیا تھا اسکو سراج الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ سراج الدولہ ۱۱۳۵ھ  
میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۱۶۱ھ میں جب اسکے باپ در بھنگ کے ہٹھانوں کے ہاتھوں مارے  
گئے تو علی وردی خاں نے اسکو بہار کا ناظم بنادیا۔ آٹھ سال بعد علی وردی خاں کے  
انتقال پر وہ بنگال کا فرمانروا ہوا۔

اس کا چچا صولت جنگ فوجدار پورنیہ علی وردی خاں کے بعد خود حکومت  
بنگال کا امیدوار تھا لہذا سب سے پہلے سراج الدولہ کو اسکی طرف توجہ کرنا پڑی۔ علی  
وردی خاں کو شاید خاندانی دشمنی پیدا ہونے کا احساس تھا۔ اسی لئے اس نے مرتے  
وقت سراج الدولہ کا ہاتھ میر جعفر اور ہندو اکابرین کے ہاتھ میں دیا تھا۔ ان میں سے  
چند تو اسکے وفادار رہے اور باقی خفیہ خفیہ اسکے خلاف سازشوں میں شریک ہو گئے۔  
سراج الدولہ کی رگوں میں بہادروں کا خون تھا۔ وہ شجاع بھی تھا اور مدبر بھی لیکن  
حد درجہ اعتماد اور نسلی روابط کے سبب غداروں کو پہچان نہ سکا لہذا جب اسکو  
انگریزوں کی معاونانہ کارروائیوں کی اطلاع ملی تو پورنیہ کے بجائے فورٹ ولیم کی  
طرف چل پڑا۔

علی وردی نے اپنے عہد میں انگریزوں کو بنگال سے نکال دیا تھا اور وہ فورٹ  
ولیم میں سمٹ کر رہ گئے تھے پھر آہستہ آہستہ پھیلنے لگے اسپر سراج الدولہ نے تمام  
مغربی تاجروں کو کوئی تعمیر یا قلعہ بندی نہ کرنے کا حکم دیا۔ فرانسسیسیوں نے تو مان  
لیا مگر انگریز نہیں مانے۔

اسکے علاوہ کرشن داس مہاجن ۵۳ لاکھ روپیے کا غبن کر کے دھاکہ سے بھاگا  
تھا۔ وہ بھی انگریزوں کی پناہ میں تھا۔ سراج الدولہ نے اسکی واپسی کا مطالبہ بھی کیا

## بنگال

### علی وردی خاں

بنگال میں شیعہ کس زمانے میں اور کس مقام پر پہلے پہل پہنچے، اس کا کوئی  
تعیین نہیں کیا جاسکتا۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ بحری راستوں سے تاجروں کے ساتھ کچھ  
لوگ ساحلی مقامات پر وارد ہوئے۔ ان علاقوں کے بیشتر مغل صوبہ دار شیعہ رہے  
تھے لہذا انکی فوجوں کے ساتھ کوئی تعداد بہار سے بنگال پہنچی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ  
پر ہے کہ شائستہ خاں کی گورنری میں جب میر مراد حاکم جہانگیر آباد (دھاکہ) نے  
حسینی دالان تعمیر کرایا تو شیعہ وہاں موجود تھے جنہوں نے دلی سے آئی ہوئی ضریح کو  
حسینی دالان میں رکھا پھر مجلس کی اور عاشور کا جلوس نکالا۔

اس سلسلے میں نواب مرشد قلی خاں کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے جو مقصود  
آباد کا ساکن اور قوم کا برہمن تھا۔ حلقہ بگوش اسلام ہو کر وہ اس علاقے کا حاکم ہوا اور  
اس کا نام مرشد قلی رکھا گیا۔ نام کا انداز بتایا ہے کہ اسکو کسی ایرانی نے مسلمان  
بنایا تھا۔ مرشد قلی حاکم مقصود آباد اپنی کارگزاری کے باعث نواب مرشد قلی خاں بن  
گیا پھر اس نے مقصود آباد کے ملحق ایک بستی بسائی اور آہستہ آہستہ پورے شہر کا نام  
مرشد آباد ہو گیا۔ (۸۳)

علی وردی خاں ۱۷۴۰ء میں جب بنگال کا صوبہ دار ہوا تو مرشد آباد کو آباد  
ہونے پندرہ سال گزر چکے تھے اور وہاں شیعوں کی خاصی آبادی پائی جاتی تھی لہذا اسکو  
عزاداروں کے فروغ میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ مجلسیں پہلے سے ہوتی  
تھیں، تفریے رکھے جاتے تھے، علی وردی خاں کی توجہ سے اس میں اضافہ ہوا اور  
شیعوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی رہی جس میں خود علی وردی خاں کے بکثرت اہل  
خاندان شامل تھے۔



اور انگریزوں کی طرف سے انکار ہونے پر اس نے ورلہ رام اور حکم بیگ کی سرکردگی میں اپنی فوج روانہ کر دی جس نے قاسم بازار فیکٹری کا محاصرہ کر لیا اور ہنگی کی رسد روک دی۔

مئی ۱۷۵۶ء میں فیکٹری انچارج نے سراج الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مطالبات تسلیم کر لیے اس پر سراج الدولہ نے تمام انگریز قیدیوں کو عرت کے ساتھ رہا کر دیا لیکن فوجی افسر ڈریک نے اسکی پرواہ نہیں کی اور دو فوجی دستے ساگر سکھ اور قلعہ تھانہ کی طرف روانہ کر دئے جو شکست کھا کر پسپا ہوئے۔

پھر سراج الدولہ نے تیس ہزار کے لشکر سے فورٹ ولیم کا محاصرہ کر لیا۔ انگریزوں نے ۲۰ جون ۱۷۵۶ء کو ہتھیار ڈال دئے اور فورٹ ولیم سراج الدولہ کے قبضے میں آگیا۔ حالات معمول پر آچکے تھے کہ بعض انگریزوں نے شراب سے مدہوش ہو کر محافظوں کو گالیاں دیں اور ان پر حملہ بھی کیا۔ وہ گرفتار کر کے ۱۸ فٹ لمبے اور ۱۵ فٹ چوڑے کمرے میں بند کر دئے گئے جس میں دو کھڑکیاں تھیں۔

قیدیوں میں چند زخمی بھی تھے جنکے مہلک زخم آئے تھے اور درد کی شدت کو کم کرنے ہی کیلئے انہوں نے کثرت سے شراب پی لی تھی وہ اس میں مر گئے۔

مشرقی حکمرانوں کو بدنام کرنا انگریزوں کا پرانا سیاسی حربہ تھا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں وہ یہی کرتے آئے تھے کرناٹک میں بھی انہوں نے یہی کیا تھا اس واقعہ سے بھی بلیک ہول کی کہانی گڑھ لی اور ڈیڑھ سو سال تک بے گناہ سراج الدولہ کو بدنام کرتے رہے حالانکہ بعض انگریز مورخوں نے خود اسکی تردید کی ہے۔ لیکن وہ سراج الدولہ کو قالم مشہور کرتے یا بیدادگر، اس سے خود ان کے مظالم پر پردہ تو نہیں پڑ سکتا جو خود انہوں نے آگے چل کر بنگال پر ڈھائے۔

کلکتہ کے بعد سراج الدولہ نے پورنیہ کا راج محل فتح کیا اور دہلی سے حکومت کی سند حاصل کی۔ اس عرصے میں کرنل کلایو اور امیر البحر وائسن مدارس سے بنگال آگئے۔ انہوں نے بعض چھوٹے مقامات پر قبضہ کر کے سراج الدولہ کے عامل کلکتہ سے سازش کر کے کلکتہ لے لیا اور سراج الدولہ کو نامہ و پیام سے بہلانے لگے۔

احمد شاہ ابدالی ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ سراج الدولہ کو اسکے حملہ کا خدشہ

لگا ہوا تھا لہذا اتفاقاً وقت کے مطابق سراج الدولہ نے انگریزوں سے فروری ۱۷۵۷ء کو ایک معاہدہ کر لیا اور بنگال کے انگریزی مقبوضات انہیں واپس کر دئے۔

میر جعفر، درلہ رام، جگت سیٹھ اور دوسرے بہت سے لوگ اندر ہی اندر انگریزوں کی طرف ٹوٹ چکے تھے۔ سراج الدولہ اپنی طاقت کو کمزور پارہا تھا اسکو احساس تھا کہ خود اسکے وفادار غدار بن چکے ہیں مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ کون کون سرفہرست ہیں۔

یورپ میں فرانس و انگلستان کی جنگ ہفت سالہ چھڑ چکی تھی اور انگریزوں نے ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات پر تصرف حاصل کر لیا تھا۔ علی وردی کا جانشین اندر اور باہر دونوں طرف کے دشمنوں میں گھر گیا تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ انگریزوں کے جائز و ناجائز مطالبات پورے کر کے انہیں بہلا دے میں رکھے اور برے وقت کو ٹال لے جائے مگر انگریز میر جعفر کو حکومت بنگال کا خواب دکھا کر اپنی غلامی میں لے چکے تھے۔ سراج الدولہ اس سے سوتے میں بھی ایسی توقع نہ کر سکتا کیونکہ اسکے لئے وہ علی وردی خاں کے بجائے تھا اور اسکی فوج کے بڑے حصے کا افسر علی تھا ممکن تھا کہ میر جعفر کو کسی وقت نصیر کی آواز سنائی دیتی لیکن اس کا بیٹا میرن صاحب حکومت کیلئے دیوانہ ہو رہا تھا اس نے باپ کو وفاداری کی طرف دیکھنے بھی نہ دیا اور خود انگریزوں کو پل پل کی خبر پہنچاتا رہا۔

### جنگ پلاسی

۱۳ جون ۱۷۵۷ء کو کلایو جدید اسلحہ سے لیس لشکر اور توپخانہ لیکر شمال کی طرف بڑھا۔ نواب سراج الدولہ کو اسکی خبر ملی تو پچاس ہزار پیادے اٹھارہ ہزار سوار اور پچاس توپوں کے ساتھ وہ بھی دریائے بھاگیرتی کے کنارے پہنچ کر خیمہ زن ہو گیا جس سے تھوڑے فاصلے پر پلاسی کی آبادی تھی۔

انگریزی فوج مقابلے پر آکر ٹھہری اور لڑائی شروع ہوئی تو سراج الدولہ نے انگریزوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی لیکن بائیں بازو کی فوج نے حرکت نہ کی جو میر جعفر کے ماتحت تھی۔ سراج الدولہ خود قلب لشکر میں تھا جسکے آگے توپخانہ



تھا۔ افسر تو بخانہ میردن نے حق و فاد اکیا مگر انگریزی تو بخانہ اس سے بہت اچھا تھا پھر بھی لڑائی شام تک جاری رہی۔ اس اثناء میں میردن گولی لگنے سے جاں بحق ہو گیا۔ یہی ایک افسر تھا جو بہادروں کی طرح لڑا تھا۔ اسکی موت سے سراج الدولہ کا دل ٹوٹ گیا۔

اندھیرا ہونے پر صورت حال سراج الدولہ کے سامنے آچکی تھی۔ اسکی فوج غدار افسروں سے بھری ہوئی تھی۔ سب غدار بھی باقی تھے جن پر وہ اعتماد کر سکتا لیکن اس سے انگریزوں کے سخت لشکر کا مقابلہ تو نہ ہو سکتا اور اسکو انگریزوں سے اتنی نفرت تھی کہ انکے ہاتھوں گرفتار ہونے کی ذلت برداشت کرنے پر تیار نہ تھا لہذا اس نے میدان چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور تھوڑے سے سرفروشن کو لے کر روانہ ہو گیا۔ شاید میر جعفر کی نظر اسکی نقل و حرکت پر لگی ہوئی تھی اس نے اپنے داماد میر قاسم کو مع میر داؤد کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔ یہ سب سراج الدولہ کے ناہمالی اہل خاندان سے تھے۔ اس نے راج محل جا کر پناہ لی تو یہ لوگ بھی جا پہنچے اور سوتے میں اسکو گرفتار کر لیا۔

بنگال کا حکمران ایک قیدی کی حیثیت سے خود اپنے ہی مرکز حکومت مرشد آباد لایا گیا۔ اسکو قید کرنے والے انگریز نہ تھے بلکہ خود اسکے اپنے تھے اور وہ لوگ تھے، علی وردی خاں نے اسکو جنگی وفاداری کے حوالے کیا تھا۔

انگریزوں نے ہر طرح جو اس سال فرمانروا کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اور وطن فروش مورخین نے جی بھر کر اسکے کردار کو مسخ کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ بزدل تھا اور نہ اس میں عاقبت اندیشی کی کمی تھی البتہ اس نے ایک غلطی کی کہ اپنے وابستگان پر اعتماد کیا اور آج وہی لوگ اسکے خون کے پیاسے تھے۔

وہ ایک بند کمرے میں مقید کیا گیا تھا۔ ایک رات میر جعفر کا بیٹا میرن شمشیر بکف اسکے کمرے میں داخل ہوا۔ سراج الدولہ مصلے پر تھا جیسے ہی اس نے نماز ختم کی میرن نے عقب سے اسکی گردن پر تلوار ماری۔ سراج الدولہ منہ کے بل گر گیا تو میرن پے درپے تلواروں کے وار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ علی وردی خاں کا نواسہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں واقع ہوئی۔ اس نے سو برس پہلے ۱۷۵۷ء میں غیر ملکی اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور مشرقی خودداری پر اپنے خون سے مہر لگادی تھی جو میر جعفر کے ماتھے کا کلنک بن گئی۔ اسکی بنگال کے تخت پر بیٹھنے کی آرزو تو پوری ضرور ہوئی مگر ”غر کلائیو“ کی حیثیت سے پھر میر جعفر اسی نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ (۸۴)

### بنگال کی فرمانروائی

کلائیو ذاتی طور پر فتح پلاسی کے بعد بنگال میں اہل ہند کی حکومت کا قائل نہ تھا لیکن دوسرے انگریز افسر اکدم ایسے اقدام کے حق میں نہ تھے لہذا اس نے میر جعفر کو نواب کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا لیکن اسر استنے مطالبات عاید کردئے جن سے جلد ہی میر جعفر عاجز آگیا پھر اس نے کلائیو کو ذاتی طور پر بہت کچھ دیا تھا مگر کمپنی کیلئے اپنے وعدے پورے نہ کر سکا۔ اس سے اختلافات پیدا ہونے لگے اور کلائیو کے بنگال سے جانے کے بعد سے اختلافات زیادہ بڑھ گئے۔

ادھر مغل بادشاہ سراج الدولہ کے قتل اور میر جعفر کی تخت نشینی سے خوش نہیں تھا۔ اسکے اشارے پر مرہٹوں نے بنگال پر حملے شروع کردئے اور خود اندرون ملک بھی بغاوتیں ہونے لگیں کیونکہ علی وردی خاں نے اہل بنگال کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ وہ سراج الدولہ کے دردناک انجام سے مشتعل تھے۔ نواب کے ملازمین اور کمپنی کے افسروں میں بھی ٹکراؤ ہونے لگا۔ ان حالات میں انگریزوں کو نواب جعفر علی سے بدگمانی بھی پیدا ہو گئی اور وہ اسکو اپنے مفاد کیلئے ناکارہ قرار دینے لگے۔

آخر انگریزوں نے اپنے دوسرے مہرے میر قاسم کو آزمانے کا فیصلہ کیا جو میر جعفر کا داماد بھی تھا اور حکومت بنگال میں وزارت کے عہدے پر بھی فائز تھا۔ میر جعفر نے جو سلوک سراج الدولہ کے ساتھ کیا تھا میر قاسم وہ اپنے خسر کے ساتھ کرنا چاہتا تھا لیکن نوابی کا منصب حاصل کرنا اس کا بھی نصب العین تھا۔

انگریزوں نے کچھ زائد مراعات پر مرشد آباد میں میر قاسم سے ایک معاہدہ کیا اور میر جعفر کو معزول کر دیا۔ مگر آپس کی رقابت بنگال کے حکمران خاندان کا مقدر



بن چکی تھی لہذا میر قاسم کے تخت پر بیٹھتے ہی اسکے خلاف سازشیں ہونے لگیں لیکن وہ اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں بہادر بھی تھا اور مدبر بھی۔ اس نے دشمنوں کو دوست بنانے کی سعی کی اور کمپنی کو بھی راضی رکھنے میں کوشاں رہا مگر اسکو کامیابی نہیں ہوئی اور اسکے دل میں انگریزوں کی طرف سے شبہات پیدا ہو گئے۔

اسی زمانے میں پٹنہ کی فوجوں کیلئے اسلحہ سے بھری ہوئی دو کشتیاں مونگیر سے گزریں، میر قاسم نے اسکو اپنے خلاف جنگی تیاریوں پر محمول قرار دیا اور کشتیاں رکو الیں۔ انگریزوں کی طرف سے ان کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ اسلحہ وہ دینے کو تیار ہے لیکن اس سے قبل پٹنہ سے فوجیں ہٹائی جائیں۔ انگریزوں نے اسکو اپنے خلاف بغاوت تصور کیا۔

میر قاسم انگریزوں کیلئے ایک معاندانہ جذبہ رکھتا تھا مگر ان سے لڑنے کے قابل نہ تھا لہذا اس نے دونوں کشتیاں واپس کر دیں لیکن اس سے بات کچھ بنی نہیں۔ صلح سے مایوس ہو کر مجبوراً میر قاسم کو میدان میں آنا پڑا اور اسکی فوجوں نے پٹنہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہ گویا اسکی طرف سے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ میر قاسم نے انگریزوں سے کھلے میدان میں ایک مقابلہ کیا جس میں اسکو شکست ہوئی۔ آخر اس نے فرار ہو کر پٹنہ میں پناہ لی۔ انگریزوں نے پٹنہ پر چڑھائی کی تو اسکی قید میں جتنے انگریز اور انگریزوں کے ہندو دوست تھے سبکو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صرف ایک انگریز ڈاکٹر کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ میر قاسم کی نظر میں ڈاکٹر زائد اور انگریز کم تھا۔

انگریز فوجیں قلعہ پٹنہ کو گھیرے ہوئے تھیں میر قاسم نے مدافعت کی اور جب اس میں کامیابی کا امکان نظر نہ آیا تو اپنے جرم من مشیر شمر کو لے کر اودھ کا عازم ہو گیا۔

### جنگ بکسر

جنگ پلاسی کے بعد ہندوستان میں انگریزی حکومت کا سنگ بنیاد پڑ چکا تھا۔ دکن کا ایک حصہ پہلے ہی ان کے اقتدار میں آچکا تھا۔ بنگال میں کہنے کو نواب علی

دردی خاں کے شاہی خاندان کی حکومت تھی لیکن درحقیقت سکھ اور حکم انگریزوں کا چلتا تھا۔ دکن میں حیدر علی ۱۷۶۱ء میں سلطنت خداداد میسور کی بنیادیں مستحکم کر چکا تھا لیکن ابھی وہ اتنا مضبوط نہ تھا کہ میر قاسم اسکی پناہ میں جانے کا خیال بھی کر سکتا پھر فاصلہ بھی اتنا لمبا تھا کہ وہاں تک انگریز اسکو پہنچنے نہ دیتے۔

ان حالات میں اودھ کی واحد حکومت تھی جس میں میر قاسم انگریز کی دسترس سے دور رہ سکتا اس لئے وہ امداد کا طالب ہو کر اودھ کی حدود میں داخل ہو گیا۔ فنیں آباد میں حکومت اودھ کی تیسری نسل تھی۔ سحارت خاں برہان الملک نادر شاہ کے قیام دہلی ہی میں انتقال کر چکے تھے۔ صفدر جنگ عمر کا بڑا حصہ مغل شہنشاہ کی خدمت میں گزار چکے تھے۔ شجاع الدولہ نے پہلی بار اپنی طاقت کو اودھ میں سمیٹ کر قابل ذکر بنایا تھا اور اب تک اپنے کو دلی کا وزیر الممالک نواب اودھ کہتا تھا۔

شجاع الدولہ صرف نام ہی کا شجاع نہ تھا بلکہ معنوی اعتبار سے بھی صفدر جنگ کا جانشین کہے جانے کا اہل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار دریا عبور کرتے وقت گھڑیاں نے ایک نانگ منہ میں دبا کر اسکو کھینچ لیا۔ شجاع الدولہ اسکی قوت سے کھنچ کر اسکے منہ میں چلا گیا مگر اس نے حواس برقرار رکھے اور خنجر نکال کر گھڑیاں کا منہ چاک کر ڈالا اور بچ کر نکل آیا۔ اس وقت سے اسکی ایک نانگ لنگ کرنے لگی تھی۔ اس کے سفیر ہندوستان کے ہر حصے میں اور باہر کاہل تک پھیلے ہوئے تھے۔ سراج الدولہ کے انجام کا حال بھی اسکو معلوم تھا اور انگریزوں کی طاقت بھی اس سے ڈھکی چھپی نہ تھی پھر بھی ملک میں غیر ملکی تسلط کی کھنک اسکے دل میں ہوتی رہتی مگر وہ تنہا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میر قاسم جب اودھ پہنچا تو وہ ایک سوچ میں پڑ گیا ناہم اس نے بنگال کے فرمانروا کا خیر مقدم کیا اور اسکے ساتھ مرہٹوں اور شاہ عالم سے رابطہ قائم کیا۔

اس کا منشاء یہ تھا کہ ہندوستان کی بنی کچی قوت سمیٹ کر انگلستان کے سفید فام تاجروں سے ایک فیصلہ کن جنگ کر لی جائے۔ اسی طرح انگریز خود اس سے لڑنا نہ چاہتے تھے کیونکہ ہندوستان کے فرمانرواؤں میں صرف اسی میں کچھ دم ٹم باقی تھا اس لئے وہ ایسے غیر یقینی حالات میں اسکو چھوڑنا نہ چاہتے لہذا انہوں نے دوستانہ انداز



میں اس سے میر قاسم اور شمر کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ شجاع الدولہ نے جواب دیا کہ اسکی حمیت و شرافت پناہ میں آئے کمزوروں کو قاتلوں کے حوالے کر دینے کی اجازت نہیں دیتی۔

اس جواب کے رد عمل سے بھی وہ واقف تھا لہذا اسکے بعد ہی اپنا لشکر لے کر پٹنہ کی سمت روانہ ہو گیا جہاں ایک ہلکی سی جھڑپ میں اس نے پسپائی اختیار کی اور بکسر پہنچ کر مادھوراؤ مرہٹہ کا انتظار کرنے لگا۔ انگریز اس سے زیادہ چالاک تھے۔ وہ اپنی پوری طاقت اور سب سے بڑا توپخانہ لے کر مقابلے پر آگئے۔ اس اثناء میں کلایو انگلستان سے واپس آگیا تھا۔

شاہ عالم شجاع الدولہ کے ساتھ تھا، بدلے ہوئے حالات میں بھی وہ ہندوستان کی آبرو تھا اور اسی لئے شجاع الدولہ اسکو لے کر انگریزوں سے لڑنا چاہتا تھا تاکہ اسکی جنگ و طبیعت کی جنگ قرار پائے۔ انگریز پہلے ہی سے اس نکتے کو سمجھے ہوئے تھے اور اب تک لڑائی شروع نہ کرنے میں انکی یہی مصلحت تھی کہ پہلے شاہ عالم کو توڑ لے تب شجاع الدولہ سے نبرد آزما ہوں۔ آخر انہیں خفیہ خط و کتابت سے اس میں کامیابی ہو گئی اور ایک رات شاہ عالم شجاع الدولہ کے کیمپ سے بلا کچھ کہے سنے انگریزی کیمپ میں پہنچ گیا اسکے بعد ہی انگریزوں نے مقابلے کیلئے مورچے بنالیے۔

شجاع الدولہ نے شاہ عالم اور مرہٹوں پر بھروسہ کیا تھا مرہٹے اب تک پہنچنے نہ تھے اور شاہ عالم اس طرح ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اودھ کے بہادر فرمانروا کو معلوم تھا کہ نہ اسکی فوج کے ہتھیار انگریزی ہتھیاروں کے برابر ہیں اور توپخانہ تو انگریزی توپخانے سے ٹکر ہی نہیں لے سکتا پھر بھی وہ پیٹھ تو دکھانہ سکتا لہذا اس نے مقابلے پر صفیں آراستہ کر لیں۔

مقابلہ غیر متناسب تھا۔ دن بھر کی ہولناک جنگ میں شجاع الدولہ کا بہت نقصان ہوا۔ اسکو یقین ہو گیا کہ اگلی جنگ میں اسکی فوج کا صفایا ہو جائے گا لہذا اس نے میر قاسم سے کہہ دیا کہ وہ جس طرف چاہے چلا جائے۔ انگریزوں سے مزید جنگ اودھ کی فوجوں کی طاقت سے باہر ہے اسکے بعد سنے انگریزوں سے صلح کی بات چیت شروع کر دی اور پچاس ہزار تادان جنگ اور الہ آباد اور کڑہ کے دو ضلع

انگریزوں کو دے کر جان چھڑالی۔ فیض آباد واپس پہنچ کر بھی وہ اس شکست کو نہیں بھولا اور اس نے شب و روز محنت کر کے بڑی مضبوط فوج تیار کر لی لیکن پھر انگریزوں سے کسی میدان داری کی نوبت نہیں آئی۔

اکتوبر ۱۷۶۳ء میں جنگ بکسر کے بعد مرہٹوں نے انگریزوں سے جنگ کی اور شکست کھائی اور انگریزوں نے بنگال پر مکمل قبضہ کر لیا اس دوران میر جعفر کا انتقال ہو گیا تھا اور اسکے نابالغ بیٹے کو تخت پر بٹھادیا گیا تھا کچھ دن بعد انگریزوں نے اس کا پچاس لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور خود بنگال کے حکمران ہو گئے (۸۵)

اب مرشد آباد کی حیثیت بدل چکی تھی۔ شیعہ حکمرانوں کی اولاد انگریزوں کے وظائف پر زندہ تھی مگر تعزیه داری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ محرم میں برسوں تک ماضی کی شان و شوکت باقی رہی پھر اس میں قدرے تبدیلی آئی۔ محل کے احاطے کا امام باڑہ جو ۱۸۳۷ء میں تعمیر ہوا تھا اب بھی موجود ہے میر جعفر نے ایک بارہ دری بنوائی تھی اسکے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے کئی مشہور امام باڑے بھی ہیں جو محرم میں کر بلا کے شہیدوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

حکومت بنگال کی عملداری مغل دور سے بہار اور اڑیسہ پر مشتمل تھی اور ان علاقوں میں اکثر شیعہ عمال بھی متعین ہوتے رہے تھے اسکے علاوہ مختلف اوقات میں سادات کی بعض بستیاں بھی جا بجا آباد ہو گئی تھیں۔ خود عظیم آباد میں کئی مقتدر خاندان رہتے تھے۔ علی دردی خاں کے زمانے میں ان سب کو پشت پناہی حاصل ہوئی اور بعض صاحبان سیف نے چھوٹے بڑے علاقوں میں جاگریں بھی حاصل کیں جسکے نتیجے میں پہلے شیعیت بہار میں متعارف ہوئی پھر وہ پھیلنے لگی۔

محرم اور تعزیه داری جس طرح پورے ہندوستان میں تعلیمات اہل بیت کے تعارف کا ذریعہ رہی تھی اسی طرح بہار میں بھی اسکو فروغ حاصل ہوا اور ایک دن وہ بھی آگیا جب اسکے کئی مقامات مرشد آباد سے ٹکر لینے لگے۔

بہار میں اشاعت تشیع بہت کچھ مقامی علماء کی رہنمائی سے ہے۔ انہوں نے خود اپنی علمیت اور سیرتوں سے عوام کو متاثر کیا اور تبلیغ کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔



## سلطنت اودھ

یدھ بمعنی جنگ ، اودھ بمعنی وعدہ، یدھ سے ایودھیا بنا اور چونکہ رام چندر جی نے ۱۳ سال بعد اس سرزمین پر آنے کا وعدہ کیا تھا لہذا اس کا نام اودھ پڑا اور ایودھیا اس کا مرکز قرار پایا۔

پانچویں صدی ہجری میں جب سید سالار مسعود غازی سلطان محمود سے نظریاتی اختلاف کے سبب علیحدہ ہوئے اور ایک لشکر جرار کے ساتھ داخل ہندوستان ہوئے تو بہت سے ممتاز سادات اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھے۔ ان میں سے سید نجم الدین نے بنارس پر حملہ کیا اور جنگ میں شہید ہوئے بنارس کے قریب ان کا مزار ہے جو فاطماں کہلاتا ہے۔

ان کے بیٹے اپنے قبل سے مفتوحہ علاقے میں واپس آئے اور عیش نام کی ایک بستی آباد کی جو جائس کہی جاتی ہے۔

سید سالار نے موجودہ لکھنؤ کے علاقے پر قبضہ کیا تھا ان کے ایک ہندی نژاد سردار لکھنا نے اس مقام پر ایک قلعہ بنوایا تھا جو لکھنا کی مناسبت سے لکھنؤ ہو گیا۔ وجہ تسمیہ کی بعض دوسری روایات بھی ہیں۔

اس مقام کی آبادی بڑھتی رہی اور علماء و فقہاء وہاں آباد ہوتے رہے۔ مسلمان بادشاہ اسکو علاقائی مرکز بناتے رہے اور وہاں صوبہ دار متعین ہوتے رہے۔ مغلوں کے درمیانی دور میں یہاں شیخوں کے ایک قبیلے نے قبضہ کر لیا تھا جو کہنے کو مغلوں کے باجگزار تھے مگر حقیقتاً خود سر اور آزاد تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں آگرہ کے صوبہ دار سعادت خاں کو حسن خدمات کے صلے میں اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا اور سادات بارہہ اور نادر شاہ کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دینے پر برہان الملک کے خطاب سے نوازا گیا۔

سعادت خاں نے شیوخ کو زیر کر کے اس حکومت کی داغ بیل ڈالی جس نے اطراف و اکناف میں شیعیت کے چراغ روشن کردئے مگر اس نے اپنا مرکز حکومت اجودھیا رکھا۔ پھر اسکے قریب پھوس کے بنگلوں سے ایک شہر آباد کیا جس کا نام بنگلہ

پڑا۔ اسی بنگلہ کو اسکے جانشین صفدر جنگ نے آباد کر کے اس کا نام فیض آباد رکھا۔ ۱۱۵۳ھ میں نادر شاہ کے قیام ہی میں برہان الملک کا دلی میں انتقال ہو گیا۔

## مرزا مقیم ابو المنصور صفدر جنگ

ابو المنصور برہان الملک کا داماد تھا۔ اس نے فیض آباد کو مرکز حکومت بنایا لیکن اس کا قیام زیادہ تردلی ہی میں رہتا تھا۔ ۱۱۵۵ھ میں علی وردی کے ہمراہ مرہٹوں کے مقابلے پر متعین کیا گیا اور اس نے مرہٹوں کو پسپا کیا۔ انجام کے طور پر چٹار، رہتاس اور الہ آباد کا صوبہ عطا کیا گیا اور صفدر جنگ کا خطاب دیا گیا۔

صفدر جنگ کا عسکری شکوہ اور سطوت و جبروت اس دور میں ضرب المثل تھا۔ ۱۱۶۱ھ میں اس نے احمد شاہ ابدالی کو شکست دی اور دلی میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔

۱۱۶۷ھ میں بادشاہ سے اختلافات ہو گئے جسکے پس پردہ نظام الملک کا ہاتھ تھا اور صفدر جنگ دلی سے مستقلاً اپنے مرکز حکومت میں آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دلی میں کسی نے اسکو دیر اثر زہر دیا تھا جسکے نتیجے میں فیض آباد پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ لاش حسب وصیت دلی لے جا کر دفن کی گئی اور سنگ سرخ کا مقبرہ بنوایا گیا۔

## جلال الدین حیدر شجاع الدولہ

صفدر جنگ کے بعد اس کا شہرہ آفاق بیٹا ۱۱۶۷ھ میں تخت نشین ہوا جو بائیس سال کی عمر میں واقعی شیر کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ بہادر ایسا کہ بیک ضرب شمشیر بھینسے کی گردن ازادیتا، گو سفند کا کدہ ہاتھوں سے چیر ڈالتا، چڑھتے دریا میں تیر جاتا تھا۔ ایک بار گھاگھرا میں مگر مچھ نے حملہ کر دیا تو شجاع الدولہ نے خنجر سے اس کا کدہ چیر ڈالا اور اسکو کھینچ کر کنارے لے آیا، انگلیوں میں اتنی طاقت تھی کہ چٹکی سے روپے کو مسل ڈالتا، پیکان انداز اس بلا کا کہ تیر چلاتا تو شیر کی پیشانی چھید کر اندر اتر جاتا تھا۔

جنگ بکسر میں جب شجاع الدولہ کو انگریزوں سے شکست ہوئی تو دل شکستہ واپس ہوا مگر اس دن سے ملک کی ساری آمدنی فوجی تیاری کیلئے وقف کر دی۔



ایک انفرادیت تھی۔ مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کی جنگ محرم میں ہوئی تھی تو اس نے میدان جنگ میں سیاہ لباس میں علم لیکر فوج میں گشت کیا تھا۔

۱۸۰۷ء میں وہ اٹاوہ فتح کر کے واپس ہوا تو محرم شروع ہو گیا تھا۔ شجاع الدولہ علی گڑھ کے قریب موضع جلالی میں قہم گیا اور وہاں کپڑے کا امام باڑہ بنا کر آداب تعزیه داری بجالایا۔

اس شغف و انہماک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اودھ میں تعزیه داری عام ہونے لگی اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

مجموعی طور پر اسکی خصوصیات میں سپہ گری، شاعری، خطاطی، موسیقی، تہذیب و شائستگی، نفاست مزاج شامل تھیں اور حب اہل بیت اور تعزیه داری ان پر مستزاد تھی۔ عتبات عالیات میں بھی اس نے نذرانے پیش کیے۔

۱۸۰۸ء میں بیالیس سال حکومت کر کے اس کا انتقال ہوا تو ہر گھر ماتم کدہ بن گیا، نہ صرف لکھنؤ بلکہ ملک کے طول و عرض میں اس کا غم منایا گیا۔ کوئی ہر دل عزیز بادشاہ مرتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کا عالیشان مزار فیض آباد میں واقع ہے

### وزیر الممالک مرزا یحییٰ آصف الدولہ

شجاع الدولہ کا بیٹا ۱۸۰۸ء میں مسند آرائے حکومت ہوا۔ اس نے اپنا مرکز حکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا۔

بلاشبہ آصف الدولہ کا پیشہ آبائے گری تھا، شمشیر زنی اور پیکان اندازی گھٹی میں پڑی تھی مگر وہ رزم سے زائد بزم کا آدمی تھا اور اسکو اودھ کے خاندان شاہی کا حاتم کہا جاتا تھا۔

روہیلکھنڈ کی جنگ میں آصف الدولہ نے شجاع الدولہ کے ساتھ جو ہر شجاعت دکھائے تھے اور ثابت کیا تھا کہ اسکی رگوں میں صفدر جنگ کا خون ہے۔ علی محمد خاں نواب رام پور شجاع الدولہ کا ساختہ و پرداختہ تھا۔ اسکو جب اسکے بھائی غلام محمد خاں نے قتل کر دیا اور خود نواب بن گیا تو آصف الدولہ کو تلوار اٹھانا پڑی غلام محمد خاں سرسٹھ ہزار روہیلوں کو مقابلے پر لے آیا مگر شجاع الدولہ کی تربیت یافتہ فوج انکو خاطر میں کیا لاتی۔ انہوں نے بری طرح شکست کھائی اور آصف

توپوں اور بندوقوں کے بڑے بڑے کارخانے قائم کرائے جسکے نگران فرانسسیسی شمر و اور موثر لاک تھے۔ انہوں نے انگریزی توپوں سے بہتر توپیں تیار کرائیں۔ شجاع الدولہ خود بھی ان کارخانوں کی دیکھ بھال کرتا۔ صبح سے کئی گھنٹے تک فوج کو پریڈ کراتا اور نشانہ بازی کی مشقتیں دیکھتا تھا۔ اس طرح اس نے ایک لاکھ تیس ہزار کا لشکر تیار کیا تھا۔

اسی فوج کے بل پر اس نے روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ اور اٹاوہ فتح کیا۔ الہ آباد انگریزوں کے قبضے سے نکال لیا اور پٹنہ سے بارہ تک حکومت کی حدیں بڑھالیں۔ ہر دوار، میان دوآبہ کا علاقہ اور الہ آباد سے جہانگیر نگر تک، شاہجہاں پور سے رہتاس تک مملکت میں تو وسیع کر لی جو اس دور کی سب سے بڑی اور زر خیز حکومت تھی۔ اسکے مخبروں کا سلسلہ پونا اور کابل تک پھیلا ہوا تھا۔ افغانستان کی خبر اسکو ساتویں دن مل جاتی تھی۔

علاقوں کا نظم و نسق مثالی تھا۔ خود شجاع الدولہ شیعہ مذہب رکھتا تھا مگر سنیوں کے مذہبی رسوم میں برابر شریک ہوتا اور سنی شیعوں سے بڑھ چڑھ کر عزاداری میں حصہ لیتے تھے۔

محرم میں سبیلیں اور تعزیه شیعہ سنی سب رکھتے تھے۔ شربت اور شیرینی چرمھائی جاتی تھی۔ تعزیوں کے جلوس میں طبل، تاشا، جھانچھ، نقارہ، روشن چوکی، بجتی تھی۔ پٹے اور بانے کے مظاہرے بھی ہوتے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یا حسین کے نعرے بلند کیے جاتے۔ بعض تعزیوں کے آگے سوز خوانی بھی ہوتی تھی۔

شجاع الدولہ سیاہ پوش، سروپا برہنہ خود ہاتھ میں علم لے کر چلتا جس میں تلوار اور مشک لٹکی ہوتی اور سینیہ زنی کے ساتھ خود بھی نوحہ پڑھتا تھا۔ غاشور کا یہ جلوس اودھ سے مختص کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اس سے قبل دلی میں عہد عالمگیر میں اس سے ملتا چلتا جلوس نکلتا تھا اور اس سے پہلے گوکنڈہ میں اور قیاس غالب ہے کہ جس طرح سلاطین شرقیہ نے جو پور میں امام باڑہ بنانے کی نظیر قائم کی تھی، اسی طرح وہ جلوس بھی ضرور نکالا ہوگا جو پہلے پہل سلطان معز الدولہ نے جو تھی صدی کے وسط میں بغداد کی سڑکوں پر نکالا تھا پھر بھی شجاع الدولہ کے مظاہرہ عقیدت میں



الدولہ فاتحانہ انداز میں داخل رام پور ہوا۔

رام پور روہیلوں کیلئے تھا۔ آصف الدولہ نے احمد علی خاں کو باپ کی مسند پر بٹھایا۔ اہل رام پور کو انعام و اکرام سے نوازا اور لکھنؤ کی طرف مراجعت کی۔ یہ شاید آصف الدولہ کی نیت کی برکت تھی کہ آگے چل کر نوابین رام پور حلقہ بگوش اہل بیت ہو گئے۔ انہوں نے تعزیر داری کو بھی فروغ دیا اور عتبات عالیہ کی خدمت بھی کی۔

آصف الدولہ کا خدم و حشم اس وقت کے تمام ہندوستانی حکمرانوں کے مقابلے پر رکھا جائے تو لکھنؤ کا پلہ ابھاری پڑتا ہے لیکن آصف جاہ نظام الملک اور سلطان ٹیپو کے نام لیے جائیں تو دو انگریزوں کے دوست اور ایک انگریزوں کا دشمن ہے اور انگریزوں کے دوستوں کو تو لا جائے تو آصف الدولہ کے کردار میں کوئی کمی پائی نہیں جائے گی۔ شجاع الدولہ نے وقت کے دھارے کا رخ دیکھ کر ہندوستانی حکمرانوں کے باہمی اتحاد کا جائزہ لیا تھا اسکے بغیر انگریزوں کو شکست نہ دی جاسکتی تو اتحاد ممکن نہ تھا لہذا شجاع الدولہ نے اپنی بقاء کی خاطر انگریزوں سے دوستی کر لی تھی یہ دوستی آگے چل کر انگریزوں کی بالادستی میں بدل گئی لیکن اس کا کم سے کم نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ آصف الدولہ کو ایک جنگ کے سوا کوئی جنگ کرنا نہیں پڑی۔

انگریزوں کا دوسرا دوست آصف جاہ نظام الملک تھا۔ اسکے مقابلے میں آصف الدولہ کو پرکھا جائے تو اودھ کے فرمانروا نے مادر وطن سے غداری تو نہیں کی اور کسی شیر دل ٹیپو کا خون اپنی گردن پر نہیں لیا البتہ سلطان ٹیپو سے آصف الدولہ کا تقابل نہ ہو سکتا کیونکہ ان دو کرداروں نے رزم و بزم کو آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ ٹیپو وہ منارہ عظمت تھا ہندوستان کی وطنیت جسکو ہمیشہ سلام کرتی رہے گی۔ اسی کے ساتھ آصف الدولہ نے انسانیت اور دردمندی کے وہ چراغ روشن کیے تھے جو آج تک کہاوت بنے ہوئے ہیں۔ جسکو نہ دے مولیٰ اسکو دے آصف الدولہ!

اودھ کے حکمرانوں نے رعایا کے ساتھ باپ جیسا سلوک روا رکھا۔ ہندو و مسلم، سنی و شیعہ کا کبھی کوئی امتیاز نہیں برتا۔ عزاداری کے فروغ میں اعجاز و کرامت کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی روش کو کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہے۔

یہ آصف الدولہ کی علم پروری اور سخاوت و فیاضی تھی کہ اہرنقی ہوئی دلی کے باکمال لکھنؤ میں اکٹھا ہو گئے اور مغل سطوت و شوکت جمنائے ساحل کو چھوڑ کر گو متی کے کنارے آ بسی۔

آصف الدولہ کو اودھ کا گل سرسبد کہنا بے محل نہ ہوگا۔ ایک ذات میں شجاعت و شرافت، تہذیب و تمدن، جدت و ندرت، فلسفہ اور ایمان سب قدرت نے جمع کر دیا تھا جسکے آمیزے سے لکھنؤی کلچر کا خمیر تیار ہوا جو اپنی آب و تاب حلاوت و نفاست میں جواب نہ رکھتا لیکن بعد میں مبالغہ اور غلو پیدا ہوا تو اس کی شکل کہیں کہیں سے بدل گئی مگر تلاش کیا جائے تو اودھ کی اصل تہذیب کے نمونے اب بھی پائے جاتے ہیں۔

آصف الدولہ کا طرہ امتیاز انسانیت اور دینداری تھی۔ اودھ کا غرمانہ عوام اور عزاکیلئے کبھی بند نہیں ہوا۔ ایک بار سخت قحط پڑا تو حکومت نے غلہ باہر سے منگوانے کا انتظام کیا اور لنگر خانے کھلوائے لیکن شرفاء تہی دست اور فاقہ زدہ ہونے کے باوجود دست سوال پھیلانہ سکتے لہذا آصف الدولہ نے امام باڑے کی تعمیر شروع کرادی۔ دن کی تعمیر میں مشاق معمار کام کرتے رات میں باہر کی دیواریں بنائی جاتیں۔ رات میں کام پر آنے والوں کیلئے مردیا عورت کی قید نہ تھی۔ برقعہ پوش عورتیں اور بھیس بدلے ہوئے مرد آتے اور اپنے اپنے نام لکھوا دیتے۔ کام کرتے یا نہ کرتے مگر دو تہائی رات گزرنے پر انہیں مزدوری مل جاتی اور وہ چلے جاتے۔

آصف الدولہ کا معمول تھا کہ صبح کو فوج کی پریڈ دیکھ کر امام باڑے جاتے اور رات کی بنی ہوئی دیواریں کوئی نہ کوئی خالی نکال کر توڑوا دیتے اس طرح قحط کا زمانہ گزار دیا۔ غرمانہ خالی ہو گیا مگر عام لوگوں کا پیٹ بھرتا رہا اور امام باڑے کا ایک حصہ بھی مکمل ہو گیا۔

یہ امام باڑہ عجوبہ روزگار تو نہ بن سکا لیکن ہندوستان کی نادر عمارتوں میں ضرور ہے۔ بیچ کا ہال ۳۳۰ فٹ لمبا اور ۶۰ فٹ چوڑا ہے جس میں کوئی ستون نہیں ہے۔ یہی اسکی صنعت کافن ہے۔ چاروں طرف صحیفیاں بنی ہوئی ہیں۔ آگے کا دالان بھی اسی طرح کا ہے۔ ایک انگریز سیاح کا بیان ہے:



”اس عمارت میں کثرت سے جھاڑ لٹک رہے ہیں جسکی رو بہلی ڈالوں، پھل دار ترشی ہوئی قلموں کی چمک دمک، آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے جو جھاڑ بہت وزنی اور لٹکانے کے قابل نہیں ہیں، وہ فرش پر رکھے ہیں۔ ان کا نچلا حصہ گھیر دار ہے اور اوپر کی جانب گاؤم۔ بیچ میں سنہرے اور روہیلے تعزیے آٹھ آٹھ دس دس فٹ اونچے رکھے ہیں۔ ان کے علاوہ نوابان اودھ کے زر بفتی پٹکے جن پر آیات قرآنی کڑھے ہوئے ہیں لٹک رہے ہیں۔ بڑے بڑے نقرئی اور طلائی علم ڈھالیں تلواریں بھالے مرصع جن پر آیات قرآنی اور اسمائے الہی لکھے ہیں نصب ہیں۔ مشہور سپہ سالاروں کے عمامے بھی رکھے ہیں اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں۔“

آصف الدولہ کو خدا ترسی کے کاموں کے ساتھ ساتھ عزائے امام سے بڑی دلچسپی تھی۔

”تعزیه داری بڑی عقیدت سے کرتے تھے۔ محرم میں پیادہ گشت کرتے اور شہر کے تعزیوں پر نذر چرمھاتے۔ دوسرے امراء اور اہل شہر بھی محرم میں تعزیوں کی زیارت کو نکلا کرتے اور نذریں چرمھاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کوئی گلی کوچہ ایسا نہ تھا جس میں تعزیہ نہ رکھا جاتا ہو اور کوئی فرقہ ایسا نہ تھا جو تعزیہ نہ رکھتا ہو۔

دولت مند ہندوؤں نے عالیشان امام باڑے بنوائے جنہیں مہاراجہ جھاڑ لال، راجہ نکیت رائے راجہ بلاس رائے، راجہ مہرا اور مہاراجہ میوہ رام کے امام باڑے مشہور تھے۔ میوہ رام کے امام باڑے کا خرچ تین لاکھ سالانہ تھا۔“ (۸۶)

شیعہ امراء کے امام باڑے اسپر مستزاد تھے جن میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا پھر کر بلائے معلیٰ کی ہو ہو نقلیں بننا شروع ہوئیں جو اپنے بانیوں کے ناموں سے منسوب ہوئیں۔

ہنر برجنگ نواب آصف الدولہ کا زمانہ لکھنؤ کے زریں عہد کا آغاز تھا اور عزاداری کے اس دور کا افتتاح تھا جو آگے چل کر ضرب المثل بنا۔

آصف الدولہ نے کر بلائے معلیٰ سے نجف اشرف تک نہر بنوانا شروع کی تھی جو غازی الدین حیدر کے زمانے میں مکمل ہوئی جس کا نام نہر آصفی ہے۔ ۱۲۱۱ھ میں اس عظیم فرمانروا کا انتقال ہو گیا۔

### سعادت علی خاں یحییٰ السلطنت

یہ تاجدار نواب آصف الدولہ کا سوتیلا بھائی تھا ہوش مند، مدبر اور شجاع لیکن انگریزوں کی گرفت لکھنؤ پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی لہذا انگریزوں کی مدد سے بادشاہ ہوا۔

انتظامات سلطنت میں اس نے بہت سی اصلاحات کیں، دیوانی اور فوجداری عدالتوں کا مضبوط نظام قائم کیا، غیر آباد زمینیں آباد کیں اور انگریزوں کے دباؤ سے فوج کی بڑی تعداد کم کر کے صرف چھتیس ہزار کر دی۔ سعادت علی خاں مزاجاً اس مداخلت کا مطلب سمجھتا تھا مگر سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کا انجام اسکے سامنے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لکھنؤ کی فوج لاکھ منظم سپہ سالاروں سے چاروں بھی لڑ نہیں سکتی اور کسی دیسی حکمران سے مدد ملنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور جب جنگ کا سوال تھا ہی نہیں تو فوج کتنی ہی ہوتی، کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

اس طرح آصف الدولہ کے بعد اودھ کی سلطنت انگریزوں کے رحم و کرم پر رہ گئی تھی تو سعادت علی خاں اپنے فیصلے سے اس کا خاتمہ کیوں کراتا لہذا اس نے دور اندیشی اور ضبط و تحمل سے کام لیا اور ہندوستان کے سفید فام اقوام کی مکمل بالادستی قبول کر لی۔

۱۲۱۲ھ میں سعادت علی خاں نے عنان حکومت ہاتھ میں لی اور بہت سی اصلاحات کے بعد پہلے پہل لکھنؤ میں محکمہ اخبارات قائم کیا۔

سعادت علی خاں نے انگریزوں کے ساتھ بڑا وقت گزارا تھا اور یہ شروع ہی سے انگلستان کے تاجروں کی پالیسی رہی تھی کہ وہ ہندی شہزادوں کو اپنے پاس رکھ کر ذہنوں کو بدلنے کی کوشش کرتے تھے۔ سعادت علی خاں میں حریت مزاج کے علاوہ انہوں نے بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں جو لکھنؤ کے تعمیری دور میں نمایاں ہوئیں۔ ممکن ہے سعادت علی خاں نے اچھی باتوں کی طرح انہیں اپنایا ہو۔

لکھنؤ کی خوبصورتی بہت کچھ سعادت علی خاں کی زمین منت ہے اور لکھنؤ کی ادبی اور علمی خدمات اس دور کو کبھی فراموش نہیں کر سکتیں۔ مولانا عبدالحلیم شرر کو لکھنا پڑا کہ انکی ذاتی قابلیت اہل کمال کی قدر دانی پر مجبور کرتی تھی۔



ادباء و شعراء کی تو کوئی گنتی نہ تھی اور یہ سب وظیفہ خوار تھے۔ نوازش پائے گرانقدر اسکے علاوہ تھیں۔ یہی صورت علمائے کرام کی بھی تھی۔ فرنگی محل لکھنؤ کا کوری، سندیلہ، یلح آباد، ایٹھی، بہرائچ، نصیر آباد، غازی پور، سنبھل، فرخ آباد اور دور دور تک ہر بڑے مقام پر حنفی المسلک علماء کو ماہانہ تنخواہیں ملتیں۔ شیعہ علماء کی قدر دانی بھی اسی طرح کی جاتی اور ہر مذہبی مسئلے میں شیعہ و سنی علما سے مشورہ لیا جاتا۔ اسی کے ساتھ تعزیر داری میں فرمانروا کا شغف اپنی جگہ پر تھا۔ اسکی اشاعت پر بھی سعادت علی خاں نے خاص توجہ کی اور کہا جاتا ہے کہ ایام عزاک و سعت اسی دور کی بات ہے لیکن اس سے قبل دکن میں پہلم کا جلوس نکلنے کے تاریخی شواہد ہیں اور دلی میں بھی یہ جلوس نکلتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے مقامات پر بارہ روز کے بعد سلسلہ عزائم منقطع ہو جاتا ہو اور پھر ۲۰ صفر کو جلوس نکلتا ہو اور سعادت علی خاں نے ۱۳ محرم سے ۱۹ صفر تک کا دورانیہ بھی ایام عزائم میں مسلسل کر دیا ہو۔

ادودھ کے کسی حکمران نے دین میں کبھی جبر نہیں کیا بلکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ہر تہوار میں خود بھی شرکت کی، بالخصوص اتحاد ملی کی خاطر مودت اہل بیت کیلئے کبھی دباؤ نہیں ڈالا حالانکہ نبی کریم کا ارشاد گرامی تھا کہ لا اسلمکم اجر الا المودة فی القربہ جسکو ہر مسلمان مانتا ہے لیکن شجاع الدولہ سے لے کر سعادت علی خاں تک کسی نے سنیوں کو مجالس میں شرکت پر مجبور نہیں کیا۔ وہ خود خوشی سے آتے اور جلوس میں تعزیر بھی انہیں کے زیادہ ہوتے۔

اسکے برعکس سلطان محمود غزنوی سے عہد عالمگیر تک شیعوں کی حالت زار دیکھی جائے تو عقیدے کا اظہار گردن زدنی تھا۔ اکبر کے دور میں ابوالفضل کے والد پر "رافضی" ہونے فتویٰ لگایا گیا تھا تو ابوالفضل نے جواب دیا تھا کہ وہ ہر مکتبہ فقہ کے عالم ہیں، فقہ امامیہ کو بھی جانتے ہیں مگر جلنے اور عمل پیرا ہونے میں فرق ہے دوسری مثال بد نصیب شہزادی زیب النساء کی ہے۔ وہ اپنے محل میں عزاداری کرتی تھی تو اورنگزیب نے خود اسکو زہر دیدیا یا دلوا دیا۔

اسکے مقابلے پر لکھنؤ میں نہ صرف سنیوں کا اعزاز و احترام کیا جاتا تھا بلکہ معاش کیلئے مشاہرے بھی دئے جاتے تھے البتہ حکمران شیعہ تھے اور مراسم عزائم

دلچسپی لیتے تھے لہذا یہ بھی بعض حلقوں کو گوارا نہیں ہوا اور دلی سے تحفہ اشیا عشریہ شائع کر دی گئی جو اس زمانے میں شیعہ سنی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کیلئے پہلا پتھر تھا جسکے بعد قلمی مناظرہ شروع ہو گیا۔

دلی میں حکیم مرزا محمد کامل اور حکیم شریف خاں نے تردیدی جواب لکھا۔ حضرت غفران آب نے تین کتابیں اور سلطان العلماء نے ایک کتاب لکھی پھر جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بڑا تحقیقی مواد منظر عام پر آ گیا لیکن اس کا بد یہی نتیجہ یہ نکلا کہ شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی۔ آپس کا شادی بیاہ ترک ہو گیا اور آہستہ آہستہ درمیانی دوری بڑھتی رہی۔

علمائے فرنگی محل مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جوابات میں بعض باتیں ان کے عقیدے کے خلاف جاتی تھیں پھر بھی انہوں نے بڑی رواداری کا ثبوت دیا اور اپنی طرف سے منافرت بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔

سنیوں کی طرف سے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور غیر ملکی سرمائے سے ایسی ایسی کتابیں چھپ رہی ہیں جن میں آئمہ معصومین پر کچھ اچھالی جاتی ہے مگر شیعوں کی طرف سے خاموشی ہے۔ اسکے بہت سے اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ شیعوں میں مطالعہ کا ذوق کم ہو گیا ہے۔ وہ کتاب خرید کر پڑھتے ہی نہیں ہیں تو چھاپنے کا حاصل کیا۔ غنیمت ہے کہ مجالس سید الشہدائے انہیں کچھ مل جاتا ہے جس سے وہ بالکل تہی دامن نہیں رہتے۔

اس چمقلش کے باوجود عزاداری پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ سنی اسی طرح تعزیر رکھتے رہے، لکھنؤ کی رونقیں بڑھتی رہیں اور ان میں ایک طرح کی رواداری پیدا ہو گئی جو سعادت علی خاں کا امتیاز ہے۔

سعادت علی خاں کے شاہانہ طمطراق اور رعب و دبدبہ نے لکھنؤ کی شوکت و شکوہ کو بڑھا دیا تھا لہذا کسی حاسد نے زہر دیدیا۔ قیاس غالب یہ ہے کہ شاطران فرنگ جلد جلد حکمران بد لانا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے لئے زیادہ مراعات حاصل کر سکیں اس لئے انہوں نے اپنے معمول کے مطابق کچھ لوگوں کو خریدا اور لائق فرمانروا کو رستے سے ہٹا دیا۔ ۱۲۲۷ھ میں یہ بیدار مغز فرمانروا اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔



اودھ کے اعلان بادشاہت سے عام ذہنوں پر اثر ضرور پڑا ہوگا مگر جاننے والے جانتے تھے کہ بادشاہ نہ قلل الہی ہوتا ہے اور نہ ایشور کا اوتار، بلکہ بادشاہ وہ ہوتا ہے جسکے بازوؤں میں طاقت دماغ میں تنظیمی صلاحیت اور تلوار میں کاٹ ہو۔ تمام دنیا میں تخت و تاج اسی طرح حاصل کیا گیا نام اس کا خلافت رکھا گیا یا بادشاہت لیکن تھا وہ سب کچھ کسی قوم یا کسی گروہ کی اجتماعی طاقت اور انفرادی صلاحیت کا حاصل

### شاہ زمین غازی الدین حیدر

اب اودھ کی سلطنت مختلف نوعیتوں سے انگریزوں کی سرپرستی میں تھی۔ حکمران داخلی اور خارجی طور پر بندھتے چلے جا رہے تھے۔ سعادت علی خاں کے انتقال پر گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز خود لکھنؤ آیا۔ سعادت علی خاں سے اسکے پہلے کے تعلقات تھے۔ ۱۲۲۹ھ میں اس نے سعادت علی خاں کے بڑے بیٹے غازی الدین حیدر کو تخت نشین کیا اور اسکے ایماء پر اودھ کے چھٹے فرمانروا نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور اپنا علیحدہ سکہ جاری کیا۔

غازی الدین حیدر ایک خوش نصیب بادشاہ تھا جسکو اودھ کے خزانے میں سترہ کروڑ روپیہ، نواب ہو بیگم کا ایک کروڑ اندوختہ اور بے شمار جواہرات ہاتھ آئے جس سے اس نے بادشاہت کا افتتاح کیا۔

وارن ہیسٹنگز کے خود لکھنؤ آنے کا سبب بادی النظر میں اظہار ہمدردی تھا لیکن دراصل وہ جائزہ لینے آیا تھا اودھ کی دولت کا اور مغل بادشاہت کے وقار پر ایک ضرب کاری لگانے کیلئے اور یہ دونوں مقصد پورے کر کے وہ چلا گیا۔

ہندوستان کی حکومت کی مالک ایک عرصے سے ایسٹ انڈیا کمپنی تھی لیکن اس نے مغل بادشاہ کو برائے نام باقی رکھا تھا کیونکہ اہل ہندوستان کو "مغل بادشاہ" کے لفظ سے ایک ذہنی وابستگی تھی حالانکہ وہ بادشاہ ہونے کے بجائے صرف کمپنی کا وظیفہ خوار تھا اور اسکی حکومت لال قلعہ کی چہار دیواری تک محدود تھی۔ انگریزوں نے اس ترکیب سے باور کرایا کہ اصل بادشاہ وہ ہیں بلکہ بادشاہ گریں جسکو چاہیں بادشاہ بنادیں لہذا انہوں نے ایک بادشاہ بنادیا جسکے پاس ملک بھی تھا اور تھوڑی بہت طاقت بھی تھی کہنے کو ایک بڑے ملک کا فرمانروا لیکن درحقیقت انگریزوں کا دست نگر۔

غازی الدین حیدر کو انگریزوں نے اپنی سیاست کیلئے بادشاہ بن جانے پر آمادہ کیا تھا تو اسکو کیا عذر ہو سکتا۔ ابھی کل برائے نام مغل بادشاہ نے وزیر الممالک بنایا تھا تب بھی اسلاف نے قبول کر لیا تھا حالانکہ وزیر الممالک کی طاقت و حکومت خود بادشاہ سے زائد تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اودھ کا کوئی حکمران عقل و غرور سے خالی نہ تھا لیکن انگریزوں کے سامنے اپنی نا طاقتی کو جانتا تھا اس لئے اندھے جوش میں کسی ایسی غلطی کا ارتکاب کرنا نہ چاہتا جس سے بادشاہ کے بجائے فقیر بن جاتا۔ اس کا خیال ہر ایک نے رکھا کہ اسکی رہی سہی جو طاقت ہے وہ برقرار رہے اور کوئی وقت پڑنے پر وہ بالکل بے دست و پا ثابت نہ ہو لہذا غازی الدین حیدر نے اصلاحات کی طرف متوجہ ہونے سے قبل فوج پر توجہ کی اور اسکو کیل کالٹے سے درست رکھا۔

غازی الدین حیدر نے امور سلطنت کا آغاز سادات اور علماء کے وظائف کے اجراء سے کیا، پھر بے سہارا کنواری لڑکیوں کی شادیوں کیلئے ایک محکمہ قائم کیا۔ مقامی تعمیرات شروع کرنے سے قبل نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ پر توجہ کی اور وہاں ایسے اقدامات کیے جن سے اس کا نام آج تک روشن ہے عالیشان عمارتوں کے ساتھ لکھنؤ میں ایک نہر کھدوائی جو اب بھی اسکے نام سے منسوب ہے۔

برما کی لڑائی میں اس نے انگریزوں کو ایک کروڑ اور نیپال کی لڑائی میں ایک کروڑ روپیہ دیا اور اسکے عوض کھیری گڑھ اور ترائی کے علاقے واپس لیے جو کبھی اودھ کے عملداری میں شامل تھے۔

لکھنؤ میں پہلا چھاپہ خانہ اسی نے قائم کیا۔ اشاعت کی سہولت مل جانے کے



سبب تصنیف و تالیف کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ اہل علم اور شرفاء کا بھی قدرداں تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے وزیر شاہ ولی خاں کا بیٹا منصور علی خاں فکر معاش میں لکھنؤ آیا تو غازی الدین حیدر نے اسکی عزت بھی کی اور امتنا و وظیفہ مقرر کر دیا کہ وہ باوقار طریقہ پر زندگی بسر کر سکتا۔

اودھ کے تاجداروں نے ہر شعبہ حیات میں جدت طرازیوں کی تھیں اور ایرانی کھانوں میں ترمیم و اضافہ سے کچھ کا کچھ بنادیا تھا۔ غازی الدین حیدر نے بھی روٹیوں میں جدتیں کیں اور نان نعمت قسم کی چیزیں تیار کرائیں جو فی زمانہ کوئی باومچی شاید پکا بھی نہ سکے۔ شعراء نوازی اور ادب پروری میں بھی اس کا دور یکچھ نہ تھا غزنی میں عہد محمودی میں ایک ہزار مدرسے تھے غازی الدین حیدر کے دور میں ان کا شمار تو نہیں کیا گیا لیکن شہر کی وسعت اور ہر گلی میں کئی مدارس سے تخمینہ کیا جاسکتا ہے کہ انکی تعداد کیا ہوگی اسی طرح علماء اور باکمالوں کا بھی کوئی شمار نہ تھا۔

اپنے پیش روؤں کی طرح عزائے امام میں اسکو بھی خاص شغف تھا تعزیر داری کی اشاعت میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ حضرت علی کی نقل روضہ پوری دل جمعی سے تعمیر کرائی۔ امام حسین کی نقل روضہ سبز بلور سے بنوا کر لندن سے منگوائی اور اس کا جلوس پورے شاہانہ وقار کے ساتھ نکلوا یا۔ جب تک وہ زندہ رہا اس جلوس میں سروپا برہنہ شروع سے آخر تک شریک رہتا اور منزل پر پہنچا کر واپس ہوتا۔ ۱۲۴۲ھ میں اس نے وفات پائی اور اپنے ہی بنوائے ہوئے روضہ شاہ نجف میں سپرد خاک کیا گیا۔

### نصیر الدین حیدر سلیمان جاہ

غازی الدین حیدر کا اکوتا بنیا ۱۲۴۳ھ میں تخت نشین ہوا: اچھا شہسوار، فنون حرب میں ماہر مگر نفاست مزاج سب پر حاوی تھی۔ شاہانہ سطوت و شوکت نے اسکے دور کو حقیقتاً عہد زریں بنادیا تھا۔ خود بھی حسین تھا اور ہر چیز میں حسن کا خواہاں رہتا۔ اسی لئے اسکے دور میں لکھنؤ کے دن روز عید اور راتیں شب برات ہوتی تھیں۔ وہ حقیقتاً سلیمان جاہ تھا۔

اسکی پرورش انگریزی طرز پر ہوئی تھیں لہذا مشرقی شان و شکوہ پر انگریزیت

کی چھاپ لگ گئی تھی۔ کئی انگریز ہم جلیس بھی تھے ایک معلم، ایک حفاظتی دستے کا کپتان، ایک بال ترلشنے والا۔ دو سیاح اتفاق سے آگئے تھے وہ بھی مقرب بن گئے تھے ان میں سے ایک نے لائف آف این ایسٹرن کنگ میں لکھا ہے۔

"بیس برس قبل لکھنؤ گیا تھا اس وقت نصیر الدین حیدر فرمان روا تھے میں نے کھتہ میں لکھنؤ کی عجیب داستانیں سنی تھیں۔ باشندے قدرتی طور پر بہادر اور جنگجو ہیں۔ گلی کوچوں میں مہیب صورت لوگ ڈھال تلوار بندوق اور پستول سے مسلح نظر آتے ہیں۔ یہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ میرے وہم و گمان سے بھی زائد تھا۔ پہلے تو مجھے ایوان شاہی دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ یہ گنجینہ محلات و قصور تھا جس کا سلسلہ گو متی کے کنارے کنارے دور تک چلا گیا تھا۔

دوسری طرف وسیع رمنہ تھا جس میں شاہی توشہ خانہ تھا۔ اس میں اسقدر کثیر اور مختلف اقسام کے جانور تھے جن کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ صد ہا ہاتھی گینڈے تیندوے، چیتل، پاڑھے، ہرن، ایرانی بلیاں، چینی کتے، کچھ کھلے بندوں کچھ بند۔" اسکی تصدیق دوسرے انگریز مصنفین نے بھی کی ہے۔ ہشپ، میر نے عام لوگوں کی سپاہیانہ زندگی کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"باشدگان لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپن سے پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تیر اور برچھے یہاں لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں۔ جس طرح انگریز و امیاں بچوں کے ہاتھوں میں کھلونے دیتی ہیں اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے تیغے اور کاٹ کی تلواریں کھیلنے کو دی جاتی ہیں۔ اس شہر کے ٹلی کو پے میری نظروں کو بالکل الوکھے معلوم ہوئے۔ گویا عالم رویا میں میرا گزرا ایسے ملک میں ہوا ہو جہاں نواص و عوام پہنواں پیدا ہوتے ہیں جنکے چہروں سے جنگجوی ٹپکتی ہے۔ جیسا کہ میں نے لڑکپن میں قصہ کہانی کی کتابوں میں پڑھا تھا۔" (۸۷)

بعض مصنفین نے اودھ کی فوج کا تذکرہ بھی کیا ہے اور اسکو ایشیا اور یورپ کے اسلحہ سے لیس بتایا ہے۔

اس سپاہیانہ ماحول میں بادشاہ کا پرستان بھی اپنی جگہ پر ہے جو مسجد کے زیر سایہ خرابات کے مرادف ہے لیکن اودھ کا ہر حکمران حدود شرع سے کبھی باہر نہیں



نکلا لہذا نصیر الدین حیدر سے حرام کاری کی نسبت بھی نہیں دی جاسکتی جس کا اندازہ اسکے مذہبی شغف سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس پرستان کے ساتھ ایک زنانہ پلٹن بھی تھی ایک سیاح لکھتا ہے۔

”حرم شاہی کے نوادر میں جو چیز یورپ کو عجیب معلوم ہوگی وہ وہاں کی زنانہ فوج ہے میں نے خود ان مرد مناسپاہیوں کو زنانی ڈیوڑھی پر ظالیہ کرتے دیکھا ہے۔ عرصے تک ان کے عورت ہونے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ میں انکو پستہ قدم مرد سمجھتا رہا جو اپنے لائے بالوں کا جوڑا سر پر رکھ کر پگڑی سے چھپالیتی تھیں۔

وردی وہی تھی جو مردوں کی ہوتی، مردوں ہی کی طرح ہتھیار بند بھی ہوتیں ہاتھ میں سنگیں چڑھی ہوئی بندوق، کمر میں پیٹی، شانے پر کار تو سوں کا پرتلہ، بقیہ وہی وضع جو احاطہ بنگال کے فوج کی ہوتی ہے۔“

یہ وہ دور تھا جب زنانی پولیس یا زنانہ فوج کا تصور شاید یورپ والوں کے ذہنوں میں بھی نہ آیا تھا۔ نصیر الدین حیدر کو حرم کی حفاظت کیلئے عورت کو مسلح کرنے کا خیال ممکن ہے اس لئے آیا ہو کہ وہ خواجہ سراؤں پر اعتماد نہ کرتا ہو۔

اس کا دماغ جدت طرازیوں میں بہت تیز تھا۔ اس نے ہر شعبے میں کوئی نہ کوئی ندرت پیدا کی النبتہ اس نے عیسائی ننوں کی طرز پر جو اچھوتیاں بنائی تھیں وہ فقہی زاویہ نگاہ سے کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ علماء نے اسکے خلاف احتجاج کیا مگر بادشاہ کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی تھی۔ بچپن ہی سے اسکے مزاج میں فسد تھی اس نے کسی کی نہیں سنی۔ یہ اچھوتیاں حضرت جنت سے منسوب ہوتی تھیں۔ انکو کوئی چھو بھی نہ سکتا لیکن نصیر الدین حیدر کے بعد وہ ختم ہو گئیں۔

نصیر الدین حیدر نے رفاہ عام کے بہت سے کام کیے۔ گو متی پر لوہے کا پل بنوایا، انگریزی اور یونانی دواخانے عریاء کیلئے کھولوائے اور محتاج خانہ تعمیر کرایا۔ یہ سب کچھ ان رقوم کے علاوہ تھا جو روزانہ حاجت مندوں کو تقسیم کی جاتی تھیں۔ بیس پچیس لاکھ کی لاگت سے ایک رصدخانہ بھی بنوایا تھا۔

عیش و عشرت کے ان مناظر میں بھی ایک بانگن تھا۔ بادشاہ اس ماحول سے نکلتا تو شیرانگن بننے کی کوشش کرتا۔ شکار کا اہتمام بھی بڑے عیمانے پر کیا جاتا۔

پھر قیام لکھنؤ میں ہاتھیوں، گینڈوں اور دوسرے جانوروں کی لڑائیاں بھی صرف تفریح نہ تھیں، ان میں شجاعت اور جنگ آزمائی کے مظاہرے بھی کیے جاتے۔

ان حقائق کے باوجود نصیر الدین حیدر ایک مومن حق پرست تھا۔ عباداری میں اس کا شغف دیکھ کر محسوس ہوتا کہ وہ پیدا ہی غم حسین کیلئے ہوا ہے۔ ۲۹ ذی الحج سے وہ سیہ پوش ہوتا تو پورا ماحول غم انگیز ہو جاتا۔

تعزیه داری پچھلے ادوار میں جس طرح ہوتی تھی نصیر الدین حیدر نے اس میں اضافہ کیا۔ بہت سے نئے امام بازے اور کر بلائیں بنائی گئیں۔ نصیر الدین حیدر نے زنانے محل کے قریب بارگاہ دوازدہ امام تعمیر کرائی۔ چھتر منزل کے قریب امام بازہ اور پار کی کر بلا تعمیر کرائی۔

بادشاہ کا معمول تھا کہ محرم میں کوئی سنگی اور مالی کا انجام نہ دیتا اپنے کو صرف حسین اور غم حسین کیلئے وقف رکھتا۔

لکھنؤیوں تو محرم کی پہلی تاریخ سے عراخانہ معلوم ہوتا لیکن پانچویں سے علم ماتمی دستوں کے ساتھ درگاہ حضرت عباس پہنچنے لگتے پھر المناک گہما گہمی میں اضافہ ہوتا رہتا۔ ساتویں کو حضرت قاسم کی مہندی نکلتی جسکے مختلف جلوس گوشے گوشے میں نظر آتے آٹھویں، نویں اور دسویں محرم کو ہائے ہائے حسین کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہوتیں۔ دسویں محرم قیامت خیز مناظر پیش کرتی۔ شاہی جلوس میں تو پورا شکوہ شاہانہ دکھائی دیتا۔ کیا سواری نکلتی ہوگی کسی بادشاہ کی جس طرح بلور کا تعزیه کر بلا پہنچایا جاتا مسلمان اور ہندو امراء کے تعزیوں کا شکوہ بھی کچھ کم نہ ہوتا۔

اور تعزیوں کا مشترک جلوس تو عوامی جذبات کا عکاس ہوتا اور فضا سے غیر شعوری طور پر ایک آواز آتے محسوس ہوتی۔ کاش یہ مجمع روز عاشور کر بلا میں موجود ہوتا!

بزرگوں کی طرح اس نے عتبات عالیات میں نذرانے پیش کیے۔ شعر و ادب کی سرپرستی کی۔ ڈرامے کی ابتداء اسی کے زمانے میں ہوئی اور مختلف اصناف ادب اور موسیقی کی ترقی ہوئی۔

بحیثیت مجموعی نصیر الدین حیدر ایک اولوالعزم بادشاہ تھا۔ عیش و عشرت کا



راستہ اسکو بہت دکھایا گیا مگر اس نے اپنا سپاہیانہ انداز نہ چھوڑا لہذا اسکو زہر دیدیا گیا۔ ظن غالب ہے کہ اس میں سفید فام دوستوں کا ہاتھ ہوگا۔  
۱۲۵۳ھ میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

### ابو الفتح محمد علی شاہ

انگریزوں نے جنگ ہسر میں شجاع الدولہ کو شکست دیدی تھی لیکن اودھ کے سورمانے جلد ہی ایک لاکھ تیس ہزار فوج اور ایک بڑا توپخانہ تیار کر لیا تھا مگر سیاسی صورت حال کے پیش نظر اس نے انگریزوں سے ٹکر نہیں لی۔ یہی صورت حال آصف الدولہ کے وقت تک برقرار رہی مگر اسکے بعد سے انگریز پوری طرح اودھ میں دخیل ہو گئے اور جب انہوں نے سعادت علی خاں کو تخت نشین کرایا تو فوج کی تعداد صرف چھتیس ہزار کرا دی کہ وہ خود مدد کیلئے موجود ہیں تو بلاوجہ بڑی فوج کے مصارف کیوں برداشت کیے جائیں۔

انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے کام کے آدمی کو تخت نشین کراتے رہیں گے تو فوج کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جائے گی مگر ان کا یہ مقصد پورا نہ ہو سکا۔ ایک کے بعد دوسرا نیا تاجدار جب بھی آیا تو انگریزوں کا عمل و دخل تو یقیناً بڑھ گیا مگر کمزور فوج کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ شاطران فرنگ نے سعادت علی خاں اور نصیر الدین حیدر کو زہر دلو کر راستے سے ہٹایا تھا مگر اب تک انکی مقصد براری نہ ہوئی تھی لہذا اس بار انہوں نے ایک بوڑھے آدمی کو تخت پر بٹھایا۔

چونکہ نصیر الدین حیدر کے کوئی اولاد نہ تھی لہذا سعادت علی خاں کا تیسرا بیٹا ابو الفتح محمد علی شاہ ۱۲۵۳ھ میں تاج و تخت کا مالک ہوا۔ ترسٹھ سال کا تاجدار بظاہر ناکارہ تھا لیکن صفدر جنگ کا جانشین امور سلطنت میں ماہر ثابت ہوا۔ پہلے دن سے اس نے رعایا کی فلاح و بہبود پر توجہ دی اور شان و شکوہ سے زیادہ رفاہی کاموں کی طرف متوجہ رہا۔

اس فرمانروا کا رجحان مذہبیت کی طرف زیادہ تھا۔ اسکے دور میں شیعہ علماء کا اقتدار کچھ بڑھ گیا لیکن علمائے فرنگی محل کی عزت و توقیر اپنی جگہ پر رہی۔ سب سے پہلے اس نے ایک بڑی جامع مسجد کی بنیاد رکھی جو اسکے مرنے کے بعد مکمل ہوئی۔

حسین آباد کا موجودہ امام باڑا محمد علی شاہ کی یادگار ہے۔ اسکے دونوں پہلوؤں پر چار سو مکانات تعمیر کرائے جو شریف منزل اور رئیس منزل کے نام سے موسوم ہیں پھر بھپئی میں حجاج اور زائرین کیلئے ایک سرائے بنائی اور پچاس لاکھ روپے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس جمع کرائے تاکہ اسکے منافع سے سرائے کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔

یہ محمد علی شاہ کا حسن انتظام تھا کہ کمپنی کے پاس بادشاہان اودھ کی جتنی رقم تھیں ان سب کا حساب کیا اور کچھ رقم اس میں شامل کر کے وقف حسین آباد قائم کیا جو ہندوستان کا سب سے بڑا وقف ہے اور اب تک اسکے منافع سے چلتا ہے۔  
عقبات عالیات کیلئے بھی محمد علی شاہ نے بہت کچھ کیا جسکی الگ الگ تفصیلات قلم بند ہو چکی ہیں۔

عزاداری کی طرف محمد علی شاہ کا خاص التفات تھا۔ دوسرے بادشاہوں نے اگرچہ کوئی کمی نہ کی تھی مگر محمد علی شاہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی زیادہ توجہ کی۔ منشی لطف علی نے ایک مومی ضرع بنائی جس کا کام انتہائی نازک تھا اور ہزاروں شمعوں کے جلنے سے بھی اسپر گرمی کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ ضرع محمد علی شاہ کے امام باڑے کی زینت بنی۔

یہ ضرع اب تک ایک ہی خاندان کی صنعت ہے جو ہر سال بارہ فٹ اونچی ضرع تیار کرتا ہے۔

حسین آباد کا امام باڑہ اپنی صنعت کے اعتبار سے شیشے کے کام کا اچھا نمونہ ہے۔ عیش باغ کی موتی تحصیل اور عراخانہ بھی اس اہل ایمان بادشاہ کی یادگار ہے۔  
رومی دروازے کی طرح ایک دروازہ بھی محمد علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مختصر سی مدت حکومت میں ایک بادشاہ کیا کچھ کر گیا کہ عزائے حسین سے متعلق اسکی تعمیرات مختلف جہتوں سے محرم میں نمایاں نظر آتی ہیں۔  
۱۲۵۸ھ میں چھ سال حکومت کر کے محمد علی شاہ کا انتقال ہو گیا۔



### امجد علی شاہ ثریا جاہ

محمد علی شاہ کا یہ بیٹا ۳۵ برس کی عمر میں فرمانروائے اودھ ہوا۔ متقی، پرہیزگار، زاہد شب زندہ دار اور علماء کا حد درجہ محقق۔ اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مطابق شراب پر پابندی لگادی، تاز کے درخت کٹوا دینے کا حکم صادر کیا۔ محکمہ قضاۃ میں شیعہ مجتہد مقرر کیے۔ علمائے فرنگی محل پہلے ہی سے موجود تھے۔ فاضل برہمن ہندوؤں کیلئے مقرر کیے گئے۔ زکواہ کا ایک محکمہ الگ سے قائم ہوا اور تقسیم زکواہ کیلئے مستحقین کی قید رکھی گئی۔ اسی طرح قتل و قصاص کے سلسلے میں بھی محتاط اقدامات کیے گئے اور حکومت شرعیہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔

ہجڑوں اور زنانوں کو شہر سے نکال دیا گیا اور طوائفوں کو تائب ہو کر کسی کے عقد میں داخل ہو جانے کی ہدایت کی گئی۔ عتبات عالیات کیلئے بھی امجد علی شاہ نے گرنقدر نذرانے بھجوائے جنکی تفاسل موقع محل سے درج کی گئی ہیں۔ تصنیف و تالیف کے شعبے میں بہت کام ہوا۔ ان گنت مایہ ناز کتابیں شائع ہوئیں۔ تذکرہ بہار بے غراں اور خوش معرکہ زبیا اسی عہد کی تصانیف ہیں۔ شاہان اودھ کے مکمل حالات پر مشتمل ایک کتاب بھی لکھی جا رہی تھی مگر ریزیدنٹ نے کچھ ایسی ترکیبیں کیں کہ اس کا سارا مواد تلف ہو گیا۔ یہ کتاب شائع ہو جاتی تو انگریزوں کیلئے شاہان اودھ پر کچھ چھلوانے کا موقع نہ رہتا۔

شہر کی رونق اور تعمیرات میں اضافے کیلئے بھی امجد علی شاہ نے خصوصی انتفات کیا۔ نئے لکھنؤ میں حضرت گنج آباد کرایا۔ لکھنؤ سے کانپور تک پختہ سڑک بنوائی۔ غازی الدین حیدر نے لندن سے لوہے کا ایک پل بنوایا تھا امجد علی شاہ نے اسکو مکمل کرایا۔

امین الدولہ نے اسی عہد میں امین آباد آباد کیا، منصف الدولہ نے کربلائے معلیٰ کی نقل روضہ لکھنؤ میں تعمیر کرائی جو دیانت الدولہ کی کربلا کہلاتی ہے۔ پھر شرف الدولہ نے روضہ کاظمین تعمیر کرایا۔

کشمیر کے راجہ نے اسی زمانے میں مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ وہ ترک وطن کر کے آئے تو امجد علی شاہ نے کشمیری محلہ ان سے آباد کیا اور ہند

خاندانوں کو مقبرہ جناب عالیہ میں رہنے کی جگہ دی گئی جو اب تک وہاں مقیم ہیں۔ شعرو شاعری میں بہت ترقی ہوئی اور انیس و دہیر نے مرثیے پر مہر و دام ثبت کر دی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے۔

" زبان و شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگرچہ پوچھئے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد و قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشاپور تھا۔" (۸۸)

امجد علی شاہ نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح بعض اختراعات کیں لیکن ترویج اسلام اور فروغ شیعیت میں اس کا زیادہ حصہ ہے۔ ۱۲۶۳ھ میں امجد علی شاہ کا انتقال ہو گیا۔

### سلطان عالم محمد و امجد علی شاہ اختر

امجد علی شاہ کا بیٹا اور سعادت خاں برہان الملک کا آخری وارث ۱۳۶۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ چہرے پر اسلاف کا تہور، آنکھوں میں آب گو متی کی چمک، ناک نقشے میں ہندوستان کا تناسب، رنگ روپ میں ایرانیست غالب، بحیثیت مجموعی مردانہ شباب و جمال کا وہ پیکر، جسکو دیکھ کر ایک مہوش فرنگ دیکھتی ہی رہ گئی تھی اور اسکے دل کے کسی گوشے میں یہ آرزو پیدا ہوئی تھی کہ کاش یہ آہو نژاد شیر اس کے حصے میں ہوتا۔

واجد علی شاہ نے زمام حکومت سنبھالتے نظم و نسق پر توجہ کی اور جہاں جہاں کچھ کمی پائی اسکی درستی کی، غریبوں کی مدد اور مظلوموں کی فریاد رسی کو اپنا شعار بنایا۔

وہ ایک بادشاہ تھا اور سبکی سبائی بساط سلطنت اسکو ملی تھی پھر خود استیا خوبصورت تھا کہ نسائیت کی حیا امیز نگاہیں اسکے چہرے کا طواف کرتی تھیں لہذا عین و عشرت کی طرف مائل نہ ہونا ناممکن تھا پھر بھی دامن اہل بیت اسکے ہاتھوں میں تھا اس لئے قدم کبھی دائرہ شریعت سے باہر نکلنے نہیں پایا۔

واجد علی شاہ کی راتیں یقیناً رنگینیوں میں گزرتی تھیں مگر اس طرح نہیں جیسے اوباش اپنی راتوں کو کالا کرتے ہیں بلکہ اسکے برعکس تاجدار لکھنؤ کی راتوں میں



حسن کی پاکیزگی شباب کی کیف آگئیں انگڑائیوں میں جذب ہو کر ایک مستانہ فضا پیدا کرتی تھیں اس فضا میں وہ ایک رند خرومند کی طرح بہکنے کی اداکاری کرتا مگر رات گزرتے ہی اذان کی آواز کان میں پڑتی تو سجادہ عبادت پر جا کھڑا ہوتا۔

اسکی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی۔ روزے چھوٹے ضرور مگر ان کا شرعی کفارہ اس نے ادا کیا۔ جو عورت اسکے حرم میں داخل ہوتی وہ مشکوٰۃ یا مسموعہ۔ بادشاہ ہوں پر ڈورے ڈالنے والی خوبصورت عورتیں ہر زمانے میں پائی جاتی رہی ہیں مگر واجد علی شاہ پر عورتیں عاشق ہوتی تھیں، خود وہ اسی کی طرف التفات کرتا جو اسکی نظروں میں جگہ بناتی ورنہ بیشتر لڑکیوں کو عنایات خسروانہ سے نوازنے پر اکتفا کرتا۔

نصیر الدین حیدر کا پرستان اب بھی پایا جاتا تھا مگر جان عالم نے اس میں اتنے اضافے کیے کہ واقعی پرستان بنادیا۔ ایک بہت بڑے ہال میں چالیس گز لمبا اور بیس گز چوڑا سنگ مرمر کا حوض تعمیر کرایا۔ اسکے چاروں طرف تخت بچھوائے۔ جھاڑ، فانوس، کنول، مردنگ سے آراستہ کرایا، پھولوں کے گل دستے جا بجا ترتیب سے سجوائے، بیچ کے تخت پر ایک زرنگار مسہری بچھوائی اور پورے ہال کو اتنا منظر آفریں بنادیا کہ انسان عالم خیال میں بہنچ جائے۔

پریوں کا انتخاب اس نے خود کیا تھا جو سیکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ اندر پری رشک پری، یاسین پری، سلیمان پری، بلقیس پری، ماہ رخ پری وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب فنون رقص و سرود کی ماہر ہوتیں ان کے دونوں بازوؤں پر جڑو پڑ گئے ہوتے اور واجد علی شاہ خود راجہ اندر بنتا۔ اسی پرستان میں اردو کے پہلے ڈرامے اندر سبھا کی تخلیق ہوئی۔

● شہنشاہ جہانگیر سادہ گزارنے کیلئے کشمیر جاتا تھا واجد علی شاہ ہر سال باغ ارم بنواتا اور اس میں برسات کا لطف لیتا۔

ایسی ہی وہ تفریحات تھیں جن پر عیاشی کا رنگ چرما کر اہل قلم کے ہاتھوں ایک پاکباز فرمانروا کو بدنام کر دیا گیا ہے تاکہ حکومت کی ضبطی کا جواز پیدا ہو سکے۔

برطانیہ کے مسنید فام تاجروں کے انداز تجارت کا جائزہ لیا جائے تو وہ ہندوستان میں خرید و فروخت دونوں کرتے تھے۔ نروخت میں یورپ کی مصنوعات

تھیں جنکے اچھے پیسے ہندوستان میں مل جاتے تھے، خرید میں ہندوستان کے غلام تھے جنکی قیمت ادا کر کے وہ انگلستان نہ لے جاتے بلکہ ہندوستان ہی میں چھوڑ دیتے تھے۔

یہ غلام افریقہ کی سیاہ چمڑی کے غلاموں کی طرح نہ ہوتے اور نہ انکی پشت پر غلامی کا ٹھپہ لگایا جاتا بلکہ صرف حلقہ بگوش بنا کر مقامی فرمانرواؤں کے درباروں میں جگہ بنانے کیلئے آزاد کر دیا جاتا اور ایک صورت یہ بھی تھی کہ جنکی جگہ درباروں میں موجود تھی انہیں خفیہ طریقہ پر خرید لیا جاتا کہنے کو تو وہ اس فرمانروا کے وفادار ہوتے مگر عملاً حق بینک انگریزوں کا ادا کرتے۔ ایسے غلام پہلے دن سے بنائے جاتے رہے تھے اور ہندوستان میں انگریزوں کی کامیابی کا بنیادی راز یہی غلام تھے۔ دوسرے نمبر پر ان کے آلات حرب آتے تھے۔

ہندوستان کی طوائف الملوکی کو دیکھ کر جب پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز سب نے حکومت کے خواب دیکھنا شروع کیے تو جنگی آلات میں انگریزوں کو یورپ کی دوسری قوموں پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی البتہ سازش اور رشوت میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکا اور وہ سب پر بازی لے گئے۔

سترھویں اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کی تاریخوں کے ورق الٹ کر دیکھے جائیں تو ہر محاذ پر انگریزوں کی کامیابی کا انحصار انہیں زر خرید غلاموں پر رہا ہے خواہ سرنگا پٹم میں ضعیف ہندوستان کی جنگ ہو یا سندھ میں میروں کی لڑائی، ان آلات کار کی نفی کر دی جائے تو یورپ کے عیار جنگ ہار چکے تھے لیکن گھر کو آگ خود گھر کے چراغوں سے لگ گئی تو انگلستان کے ڈاکوؤں نے آگ بجھانے کے بجائے سب کچھ لوٹ لیا حتیٰ کہ عورت و حرمت بھی محفوظ نہیں رہی۔

سندھ، میور، بنگال اور اودھ ہندوستان کی بچی کچی آبرو تھے جو انگریزوں کیلئے خطرہ بنے ہوئے تھے بغیر انکی تسخیر کے وہ کہہ نہ سکتے کہ ہندوستان ہمارا ہے۔ اسی لئے جب انہوں نے لکھنؤ پریوینن جیک ہرایا تو لکھنؤ کا املا لکھا LUCK-NOW اور ہمیں فخر ہے کہ یہ چاروں حکومتیں شیعہ تھیں۔ بالفاظ دیگر ہم نے حریت وطن کیلئے غیر ملکی غاصبوں کا آخر دم تک مقابلہ کیا جو ہمارا طرہ امتیاز رہا ہے۔

بہر حال انگریز نے اس کامیاب حربے کو اودھ میں آخری بار آزمایا ہے تھے



اور سازش کا جال انہوں نے آصف الدولہ کے بعد سے بچھانا شروع کر دیا تھا۔ سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور اب سلطان عالم واجد علی شاہ۔ پانچ بادشاہوں کے دور میں وہ اندازہ کرتے رہے کہ اگر اودھ پر ہاتھ صاف کیا جائے تو اسکے اثرات مابعد کیا ہوں گے؟ لیکن ہندو مسلمان، سنی و شیعہ سب میں فرمانرواؤں کا قبول عام دیکھ کر انہیں بغاوت عام کے خطرات محسوس ہوئے لہذا وہ انتظار مزید کرتے رہے۔

واجد علی شاہ ایک عالم و فاضل، زاہد و عابد رحمہ اللہ اور منکر مزاج بادشاہ تھا پری جمالوں کے جھگھٹ اور شعروادب کی محفلوں سے اسکو خاص دلچسپی تھی لیکن انگریزوں نے یہ بھی دیکھا کہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر وہ کسی جرنیل کی وردی میں فوجی پریڈ بھی لیتا ہے، حکومت کے کاموں کیلئے بھی وقف نکالتا ہے اس لئے ایک طرف تو انہوں نے رائے عامہ خراب کرنے کی کوشش کی دوسری طرف غلاموں کو خریدنے کیلئے مہروں کی تھیلیوں کا سائز کچھ بڑا کر دیا۔

نیک نفس بادشاہ کو اپنے معتمدین پر بھروسہ تھا اور انگریزوں کی طرف سے اسے ایسا کوئی اندیشہ بھی نہ تھا کیونکہ وہ انکی مرضی کے خلاف چلتا ہی کب تھا، جو وہ اسکے درپے آزار ہوتے۔ بادشاہ کے معمولات میں جمالیاتی یا ادبی محفلیں، سہمی خدمتیں اور عزائے امام حسین، تین چار چیزیں شامل تھیں جن میں کبھی کبھی انگریز بھی شرکت کرتے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عزاداری میں غلو کی حد تک بڑھ گیا تھا اور اس نے ایام عزاء کو اربعین سے آٹھ ربیع الاول تک وسعت دیدی تھی تو یہ طریقہ امجد علی شاہ کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔ ہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تاجدار غم اہل بیت کو جزو ایمان قرار دیتا تھا اور عشرہ محرم میں بجز مجلس و ماتم کوئی کام کرتا ہی نہ تھا اور اسکے بعد بھی خاص خاص تاریخوں میں اپنے کو ایسے ہی مشاغل کیلئے وقف رکھتا۔ اسکے دور میں تعزیه داری بھی دوسری باتوں کی طرح اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

واجد علی شاہ کو اودھ کے بادشاہوں میں تہذیب و تمدن کی ترقی اور علم و ادب کی اشاعت میں خصوصی فوقیت حاصل ہے۔ جتنی کتابیں اس زمانے میں چھپیں اسکی نظیر ادوار ماسبق میں نہیں ملتی۔ علم و فن کے جتنے باکمال اس نے لکھنؤ

میں جمع کیے تھے وہ ہندوستان کے کسی ایک شہر میں پائے نہیں جاتے۔ شہریت اور شہر کی رونق کی مثال تو مشرق کیا، شاید مغرب میں بھی تلاش سے نہ ملے گی۔ لکھنؤ کی آبادی ساڑھے سات لاکھ تھی۔ عمارتوں میں اکبر اعظم کے عہد کا اکبری دروازہ، ایک فرانسیسی تاجر کا تعمیر کردہ فرنگی محل، شیوخ کا مچھی بھون، اور نگزیب کی مسجد شاہ پیر محمد منصور جنگ کا قلعہ جلال آباد، آصف الدولہ کے ایرانی طرز کے چار سو باغ، امام باڑہ آصفی، باؤلی، شیش محل، دولت خانہ۔

سعادت علی خاں کی کوٹھیاں، باغات، حضرت عباس کی درگاہ کربلائے تالکٹورہ، ریزیڈنسی کی عمارت یعنی بیلی گارڈ، غازی الدین حیدر کا شاہ نجف سعادت علی کا مقبرہ اور نہر، نصیر الدین حیدر کی کربلا، چھتر منزل خیرات خانہ، شفا خانہ، رصد گاہ، موتی محل اور ملکہ زمانی کا امام باڑہ۔

محمد علی شاہ کا حسین آباد، شریف منزل، رئیس منزل، ملکہ جہاں کی کربلا۔ امجد علی شاہ کا بطنین آباد اور لوہے کا پل، واجد علی شاہ کے صدہا باغ، قیصر باغ، چاند والی بارہ دری اور قصر البکا۔

یہ تھیں لکھنؤ کی وہ عمارتیں جو عام دنوں میں اودھ کی سطوت شاہی کا آئینہ ہوتیں اور ایام عزاء میں بقعہ نور ہونے کے باوجود ایک سو گوارانہ جلال کا مظہر بن جاتیں۔ ایسا محسوس ہوتا کہ انسان تو انسان صامت و جامد پتھر بھی کربلا اور اسیران کربلا کی داستانیں بیان کر رہے ہیں۔

انہیں کو دیکھ کر بعض فرانسیسی اور انگریزی سیاحوں نے لکھا کہ انہوں نے اتنا خوبصورت شہر روئے زمین پر نہیں دیکھا اور اسی بنیاد پر لکھنؤ کو عروس البلاد کہا جاتا تھا۔

واجد علی شاہ کا یہ دار السلطنت اپنے شہریوں کے فضل و کمال کے سبب بھی یگانہ روزگار تھا اور خود واجد علی شاہ رعایا میں محبوب تھا اور قبول عام کے باعث شاہان عالم میں ایک بلند مقام رکھتا تھا۔

ہنومان گڑھی کا واقعہ اور مولوی امیر علی کی شہادت، اللہ واجد علی شاہ کے عہد حکومت پر ایک بد نما داغ ہے لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں انگریزوں



کے سیاسی ہتھکنڈوں کو دخل تھا۔ کئی ذمہ دار عہدہ داران کے پروردہ تھے۔ انہوں نے ریزیدنٹ کی ہدایت پر صحیح نوعیت معاملہ بادشاہ کے سامنے رکھی ہی نہیں اور بالا بالا احکام صادر کر دئے جس سے نیک طینت اور خدا ترس فرمانروا کی بدنامی ہوئی اور ایک طبقہ غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ یہی انگریزوں کا منشاء تھا پھر بھی واجد علی شاہ کا ذاتی کردار اتنا بے داغ تھا کہ دوست تو دوست دشمن بھی اسکی تعریف کیے بغیر نہ رہے۔

نجم الغنی مولف تاریخ اودھ نے شاہان اودھ کو مطعون کرانے کیلئے کتنے ہی واقعات مسخ کیے ہیں لیکن واجد علی شاہ کیلئے لکھا ہے۔

”یہ بادشاہ اسقدر رحمدل اور رقیق القلب تھا کہ باوجود اسقدر سلطنت اور زور و زر کے اس نے سن شباب میں کسی پر طیش اور بیرحمی نہیں کی بلکہ گالی تک زبان پر نہیں آئی، نہ کسی موافق و مخالف کو ظلم سے ستایا۔“

”اپنی ذات سے عادل تھا مواقف یا مخالف، اپنے یا بیگانے کی عدل میں رعایت نہیں کی۔“

”باوجود اس سلطنت، جاہ و حشمت اور شباب کے اس بادشاہ میں غرور و نخوت، جس سے ہزاروں میں کوئی امیر خالی نہیں، نام کو نہ تھا۔“

سکینیہ بنت الحسین کے مولف مولانا عبدالحلیم شرر رقم طراز ہیں۔

”دس سالہ حکومت کرنے کا انجام یہ تھا کہ ساری رعایا خوش تھی۔ ہر مذہب و ملت والے مطمئن تھے، اطراف مملکت کے تمام ہندو مسلمان جان نثار کرنے کو تیار تھے۔“

عبدالحلیم شرر کا ایک بیان بحوالہ گذشتہ لکھنؤ، قابل ملاحظہ ہے۔

”بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ ان کا پرانا مقولہ تھا کہ میری دو آنکھیں ہیں: ایک شیعہ ایک سنی۔ ایک بار دو شخصوں میں مذہبی اختلاف پر مارپیٹ ہو گئی۔ بادشاہ نے دونوں کی معزولی کا حکم دیا بلکہ اپنے وہاں ممنوع الملازمت کر دیا۔

بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوگا کہ سارا انتظامی کاروبار سنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیراعظم منہم الدولہ بہادر سنی تھے، منشی السلطان جو ایک

زمانے میں سب سے مقرب سارے جانور خانے کل اہل قلم اور کئی محکموں کے افسر اعلیٰ تھے سنی تھے بخشی امانت الدولہ بہادر، جسکے ہاتھ سے کل ملازموں حتیٰ کہ محلوں اور شاہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی، سنی تھے، عطار الدولہ اور داروغہ مستبر علی خاں جو آخر میں سب سے بڑے عہدہ دار ہوئے کل کاروبار کے مالک تھے دونوں سنی تھے۔

اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ امام باڑہ بسطین آباد، محل کے خاص امام باڑے، بیت البکا کا انتظام، مجلسوں اور مذہبی تقریبوں کے بجالانے کا انصرام بھی سنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کبھی کسی نے محسوس ہی نہیں کیا کہ کون سنی ہے اور کون شیعہ ہے۔“

عصبیت سے بالاتر رہنا صرف واجد علی شاہ تک محدود نہ تھا اودھ کے کسی بادشاہ نے ہندو مسلمان، سنی شیعہ میں کبھی کوئی تفریق نہیں کی اور ساری رعایا کو ایک نظر سے دیکھا۔ اس قبول عام میں واجد علی شاہ کو خصوصیت حاصل تھی۔ لکھنؤ کی تہذیبی اور تمدنی جلوہ نمائی میں یوں تو سارے حکمرانوں نے حصہ لیا مگر واجد علی شاہ نے ہر شعبہ حیات میں جو نفاست پیدا کی اس سے گو گنڈہ کے ابوالحسن تانا شاہ کی روح پھڑک اٹھی ہوگی۔

اور اردو ادب تو اس طباع اور فاضل بادشاہ کے احسانات کو فراموش کر ہی نہیں سکتا۔

ان حقائق کے باوجود انگریزوں نے سلطنت اودھ کے خاتمے کا فیصلہ کر لیا پھر بھی عواقب سے خائف تھے جیسا کہ کوہ نور لاہور نے اپنی ۲۹ جنوری ۱۸۵۶ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

ملک اودھ کی ضبطی کے کاغذات مرتب ہو چکے ہیں لیکن گورنر جنرل کو فساد کا اندیشہ ہے اور بڑا خطرہ یہ ہے کہ انگریزی فوج کے سپاہی اودھ کے رہنے والے ہیں۔ انگریزوں نے اس سے قبل کئی بار ایسا ارادہ کیا تھا مگر ہر مرتبہ بادشاہ کی عوامی مقبولیت دیکھ کر وہ ڈر گئے تھے۔ انکی اندر سے باہر تک سازش کا جال کچھ چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ علی نقی خاں کے بعض عمائدین کو بھی چاہیے تھا کہ ایسی



احتیاط کے طور پر ہندوستان سے لندن تک آپس میں مشورے ہوتے رہے۔ آخر خطرات کے کھلاڑیوں نے ضبطی اودھ کا فرمان صادر کر دیا۔

حکومت اودھ کے دست و بازو انگریزی احکام کی تعمیل کیلئے تیار تھے۔ کانپور کی انگریز فوج گنگا کے پل کی طرف بڑھی تو اودھ کی توپوں نے اپنے دہانے سیدھے کر دئے مگر ان کو بتایا گیا کہ خود بادشاہ کی یہی مرضی ہے۔

اس موقع پر گرد و نواح کے تعلقہ داروں اور زمینداروں کی بے چینی کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ اپنے آدمی لکھنؤ کی طرف دوڑائے اور بادشاہ سے اجازت طلب کی کہ وہ انگریزوں کو روک سکتے ہیں، لکھنؤ سے مقابلے کیلئے فوج روانہ کی جائے۔

خود واجد علی شاہ کو بھی خبر مل چکی تھی۔ دل شکستہ بادشاہ کو انگریزوں کی جارحیت سے زائد اپنوں کی غداری کا غم تھا۔ لکھنؤ کے مسلح عوام اور فوج میں اتنا دم خم تھا کہ وہ کسی مدت تک انگریزوں کو روکے رہتے۔ جوش کا تقاضا تو یہی تھا جو زمینداروں اور تعلقہ داروں نے کہلوا یا تھا۔ اودھ کا تاجدار تھوڑی دیر کیلئے اپنی فوج کا کماندار بن گیا اور خیال ہی خیال میں اپنے سرداران لشکر کو ٹٹولنے لگا۔ ہر طرف سرفروش ہی سرفروش نظر آئے۔ اسکو یقین ہو گیا کہ ایک ایک آدمی مرجائے گا مگر پیٹھ نہ دکھائے گا۔ پھر ایک سوال پیدا ہوا۔

”کیا انگریزوں کو مکمل شکست دی جاسکتی ہے؟“

اس کا جواب اثبات میں ملنا مشکل تھا پھر بھی واجد علی شاہ نے فرض کر لیا کہ اسکے جاں نثار نئے آلات سے مسلح انگریزی لشکر کو کانپور تک پساکر لے جائیں گے اور پھر آگے بڑھنے نہ دیں گے مگر جب انگریز ہندوستان کے دوسرے حصوں سے اپنی طاقت سمیٹ لائیں گے اور اودھ کی زخم خوردہ طاقت ان سے مقابل ہوگی تو کیا عہدہ برآ ہو سکے گی؟

واجد علی شاہ میں یقیناً سلطان فتح علی ٹیپو کی سی شجاعت نہ تھی مگر صفدر جنگ کا پوتا موت سے ڈرنے سکتا پھر بھی دورانیشی دامنگیر ہوئی اور جب اسکو اپنے آخری سوال کا جواب ”ہاں“ میں نہ مل سکا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

”جب ایسے تمام وفادار کنوادینے کے بعد بھی انگریزوں کو اس ملک سے نکالا نہیں جاسکتا تو کیوں انہیں خاک و خون میں لتھاڑا جائے۔“

جذبات عقل پر حاوی ہو رہے تھے۔ بادشاہت اور اسکے سارے لوازمات کو چھوڑنا کچھ آسان نہ تھا مگر واجد علی شاہ نے تصور میں میدان کو اپنے سرفروشوں کی لاشوں سے پٹا ہوا دیکھا اور اسکے بعد بھی فتح کے امکانات نہیں پائے تو راضی برضائے الہی ہو کر کہلوا دیا۔

”انگریز ہماری حد میں آہی چکے ہیں تو آنے دو انہیں۔“

پھر انگریز بلا کسی خون خرابے کے لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے پہلے حکومت کے اسلحہ پر قبضہ کیا پھر سپاہیوں سے ہتھیار رکھوائے اور اودھ کے آخری تاجدار کی خدمت میں حاضر ہو گئے، فوجی سلام کر کے حکمنامہ لکھے ہاتھ میں دیا جان عالم واجد علی شاہ اخترا کے لئے تیار تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اپنا ہی ایک شعر ان کی زبان پر آ گیا۔

در و دیوار بہ حسرت سے نظر کرتے ہیں  
رخصت اے اہل وطن، ہم تو سفر کرتے ہیں

انگریزوں نے بادشاہ کو نااہل ثابت کرنے کیلئے کتابیں لکھوائیں، مذمت کیلئے کئی اخبار جاری کرائے لیکن اودھ کے محبوب فرمانروا کی گرفتاری اور ملک کی ضبطی سے ہر طرف انگریزوں کے خلاف منافرت کا طوفان اٹھ پڑا۔ واجد علی شاہ نے جذبات کو قابو میں رکھ کر جس خون کو بہنے سے بچالیا تھا وہ بہہ کر رہا اور پورا شمالی ہندوستان مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر اسکی لپیٹ میں آ گیا۔

ہندو مسلمان، سنی شیعہ ہزار ہا جاں نثار اپنے اپنے سپاہیوں کے ساتھ ٹکل پڑے اور انگریزوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا لیکن تنظیم و اتحاد اہل ہندوستان میں ہوتا تو سفید غیر ملکی شروع ہی سے ٹھہرنے پاتے ویسا ہی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی ہوا۔ انگریز جرنیلوں نے نام بنام انکی بہادری کی داد دی ہے یقیناً حریت پسندوں کو بیشتر محاذوں پر شکست ہی ہوئی تھی مگر شکست تو ہونا ہی تھی کیونکہ وہ نگرانیوں میں بٹ بٹ کر لڑ رہے تھے اور جذبہ حریت میں جانیں دے رہے تھے۔



خون بہا اور اس سے ہزار گنا خون بہا، جتنا اودھ کے آخری بادشاہ نے بچایا تھا لیکن کہنے کو تو رہ گیا کہ وفاداروں نے جانوں کے ساتھ اپنی جائیدادیں بھی اودھ کے فرمانروا پر قربان کر دیں۔

واجد علی شاہ کو بھی اپنے متعلقین سے بڑی محبت تھی۔ بعض لوگ ان کے عالم اسیری میں کھلتے گئے اور مٹیابرج جاکر جان عالم سے ملے تو انہوں نے بیان کیا کہ بادشاہ اس طرح ٹوٹ کر ہم آغوش ہوتے تھے جیسے کوئی بچہ ہوا بہت پیارا عزیز مل گیا ہو۔ جانے والے کو اس حالت میں بھی کوئی گرانقدر تحفہ دے بغیر انہوں نے واپس نہ ہونے دیا۔

ان کے بعد لکھنؤ اس طرح سونا ہو گیا تھا جیسے کسی سہاگن کی مانگ اجڑ گئی ہو، فرق نہیں آیا تو عزائے امام حسین میں۔ محرم کا چاند نظر آتے ہی ہندو مسلمان سب اسی طرح سو گوار نظر آتے بلکہ رقت انگیز مناظر میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ کھلتے میں بھی واجد علی شاہ نے تعزیه داری میں کوئی کمی نہیں کی سب کچھ اسی طرح انجام دیتے رہے جسکی روایت لکھنؤ میں قائم کی تھی بلکہ عزاکر کی حد تک تو خود انگریزوں نے وہاں ایسے عناصر جمع کر دئے تھے جن سے مجلسوں اور جلوسوں کو بڑا فروغ ہوا۔

میران سندھ، علی وردی خاں کا بچا کھچا خاندان، سلطان ٹیپو کے وارث اور اودھ کے باقیات الصالحات، ان سب نے مل جل کر مٹیابرج، ہنگلی اور بعض دوسرے علاقوں میں عزاکر خانے قائم کر دئے اور کر بلا کے شہیدوں کا پیغام اجنبی لوگوں تک پہنچانے لگے۔

بنگال کی حد تک ہنگلی وقف نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا جو حلی محمد حسن شرازی نے قائم کیا تھا: اسکی پیدائش انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں بمقام ہنگلی ہوئی تھی۔ انگریزوں کے دور میں اس نے بڑی دولت پیدا کی اور بنگال کے مختلف حصوں میں جائیدادیں خرید کیں چونکہ لاوڈ تھا لہذا تمام جائیداد اہل اسلام کے رفاہی کاموں کیلئے وقف کر دی ہنگلی میں ایک عالیشان امام باڑہ اور ایک کالج قائم کیا اور غریب بچوں کیلئے تعلیمی وظائف کا التزام کیا۔ شیر بنگال مولوی فضل الحق نے اسی

وقف کے وظیفے سے تعلیم حاصل کی تھی۔

اس عظیم محب اہل بیت نے جیسور میں بھی ایک امام باڑہ بنوایا تھا اور عزاداری میں اپنے شغف کی ایک نظیر قائم کی تھی جو اب بھی اسی وقف سے ہوتی ہے شیعہ کو سنی بنادینے کی مہم میں ہنگلی وقف کے بھی سنی وقف ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا مرحوم مولوی سید علی نے زندگی بھر مقدمے لڑ کر جھوٹوں کو جھوٹا ثابت کیا۔ حد ہے احسان فراموشی کی! ایسے ہی کئی وقف ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی پائے جاتے ہیں، جن میں حسین آباد لکھنؤ اور محمود آباد کے وقف بھی ہیں جسکی آمدنیاں صرف عزائے سید شہدائے صرف ہوتی ہیں۔ (۸۹)



منارہ ہائے ہدایت

تولیت کعبہ  
صوفیائے کرام  
فقہائے امامیہ  
مشاہد سادات  
صراط مستقیم

ہمارے عقائد

ہماری تاریخ

مختصر تاریخ آل محمد ایک تحقیقی دستاویز

تاریخ شعیان علی کا دردناک افتتاحیہ

قیمت

ایک سو ستر روپے



## تولیت کعبہ

### نقطہ آغاز

تولیت کا خیال ذہن میں پیدا ہوتے ہی ایک نام معاً ذہن میں آجاتا ہے اور وہ نام ہے حضرت ابوطالب کا، جن کا کردار دور جاہلیت سے شروع ہوتا ہے۔ آپ بیک وقت پیغمبر اسلام اور کعبہ، دونوں کے متولی نظر آتے ہیں اور یہ اسی استحقاق تولیت کی بات تھی جو خلاق عالم نے کعبے کو ابوطالب کے بیٹے کا مولود قرار دیا جو ایک طرح پر مشیت کا اعلان تھا کہ کعبے کی تولیت ابوطالب کی نسل کا موروثی منصب ہوگی

آنحضرت کی زندگی تک یہ منصب برقرار رہا۔ علی نے بیت داور کو اصنام سے پاک کیا، سورہ برأت کی تلاوت کا فرض ادا کیا اور اس کی حفاظت کے لئے اپنی تلوار کو بے نیام رکھا۔ پھر انقلاب وقت نے دوسرے دعویدار پیدا کر دیئے اور ورثائے ابوسفیان اسلام اور حرمت کعبہ دونوں کو دمشق اٹھالے گئے۔

دمشق سے یہ شرف بغداد منتقل ہوا۔ کعبہ مکے میں تھا اور اس کے محافظ ہفتوں کی مسافت پر بغداد میں اقامت گزریں تھے..... کتنی ستم ظریفی ہے کہ اسلام مدینے کا، محور اسلام مکے میں اور اس کی نگرانی بغداد سے کی جا رہی تھی جبکہ بانی اسلام کی نسلی، مستند اور برحق وراثت مدینے میں موجود تھی مگر اس کو جائز استحقاق کے جرم میں گردن زدنی قرار دیا جا رہا تھا کیونکہ ان ورثاء نے قلم کے بجائے تلوار کا استعمال ناجائز قرار دیا تھا..... اور حصول دنیا کے لئے جیت تلوار کی ہوئی تھی۔



عباسی خلافت میں جب تک دم خم رہا، وہ کعبے کی متولی بھی رہی، مسلمانوں کی محافظ اور اسلام کی نام نہاد سربراہ بھی..... اس نے یہ اعزازات برقرار رکھنے کے لئے شیعہ آئمہ کو محسوس بھی کیا، زہر بھی دلوایا اور تہہ تیغ بھی کرتی رہی، علی کے شیعوں پر اتنے مظالم کئے کہ دور دور تک کوئی اہل بیت کا نام یوں باقی نہ رہا لیکن ان حالات میں بھی شیعہ علماء کی زبان اور نوک قلم چلتی رہی اور حضرت جنت کی غیبت کے بعد اس کے اثرات رونما ہونا شروع ہو گئے۔

سرور کائنات نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہم میں سے کوئی حصول اقتدار کے لئے تلوار نہ اٹھائے گا۔ سارے آئمہ کرام اسی کی ہدایت کرتے رہے لیکن اسلام کی تبلیغ اور آل رسول کی حرمت کا اظہار تو علماء کے فرائض میں داخل تھا وہ اپنا کام کرتے رہے پھر اہل سیف پر اپنا تحفظ بھی لازم ہو گیا اور اس کے لئے ظالموں کی تلواں کند کر دینا یا توڑ ڈالنا ضروری تھا لہذا مردان جنگ آزماسروں سے کفن باندھ باندھ کر سر میدان آگئے پھر بنی بوہسہ نے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔

تاریخ میں پہلی بار شیعوں کی ایک مضبوط حکومت قائم ہوئی تھی جس کا سلطان خلافت بغداد کا متولی بھی تھا اور عباسی خلیفہ کے ساتھ تولیت کعبہ میں جس کا نام بھی لیا جاتا تھا اس اقتدار کا دورانیہ یوں تو دو سو برس رہا مگر ڈیڑھ سو برس تک تو اپنا بیخ خلافت اس کے رحم و کرم پر زندہ رہی۔

بغداد میں شیعوں کی یکجائی بہت پہلے شروع ہو چکی تھی مگر محلہ کرخ میں اپنے طور پر زندہ رہنے کا حق اسی زمانے میں حاصل ہوا جو سنی اکثریت کو کیونکر گوارا ہو سکتا..... شیعہ ان کے نزدیک ایسے تو نہ تھے کہ وہ ایک جماعت بن کر قابل ذکر قرار پائیں لہذا اکثریت کا زعم روایتی جارحیت کی شکل میں امنڈ پڑا اور شدید فرقہ وارانہ فساد و قوے میں آگیا۔

حکومت شیعہ تھی وہ جانبداری سے کام لیتی تو بغداد کو اجاڑ دیتی لیکن عماد الدولہ نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو انصاف اور رواداری کا درس دیا تھا لہذا طاقت نے ثالثی کا کردار ادا کیا اور طرفین کی باہم منافرت کو کم کر دیا گیا۔

دو سو برس میں کئی بار ایسا ہوا اور طرفین کو برابر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ شیعہ پہلے کی طرح کچلے نہیں گئے۔ یہی دوران کے لئے عافیت کا تھا۔

### غزنوی اور سلجوقی

بوہیہ سلطنت جب خاندانی منافشات کا شکار ہوئی اور سبکتگین نے سامانی حکومت کے خاکستر پر غزنی کا ایوان سلطنت تعمیر کر لیا تو بوہیہ کے ملحق علاقوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا اور اس کے بیٹے سلطان محمود نے تو ایران کی سرحد تک فتح و ظفر کے پرچم ہرا دیئے۔ اس کے بعد مدینہ و بغداد کے خطبات میں خلیفہ کے ساتھ سلطان محمود کا نام بھی لیا جانے لگا۔ گویا وہ کعبے کا متولی تھا۔

پھر غزنویوں کی جگہ طغرل بیگ نے لی جو ایک متعصب سنی تھا۔ فتوحات کے سیلاب میں اس نے شیعوں کو اس طرح غرق کیا کہ بعض علاقوں میں تو شیعوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ یہ گویا ان کے لئے مصیبتوں کے دوسرے دور کی نشاۃ ثانیہ تھی۔

پھر سلجوقی حکومت مضبوط ہوتی رہی اور شیعوں پر ستم رانی کے انداز بدل بدل کر آزمائے جاتے رہے۔

بغداد کا محلہ کرخ اپنی اجتماعی آبادی کے لمحہ اولین سے نگاہوں میں کھٹکتا رہا تھا۔ بوہیہ دور میں بھی فسادات ہوئے مگر ایک غیر جانبدار حکومت کے سبب اس میں شدت نہیں آنے پائی مگر اب تو شیعہ بے یار و مددگار ہو گئے تھے لہذا کرخ پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے جانے لگے۔

۴۰۱ھ، ۴۰۶ھ، ۴۰۸ھ، ۴۲۳ھ، ۴۲۴ھ اور اس کے بعد آئے دن کبھی دن دھاڑے، کبھی رات میں چھپ کر، کانوں کو آگ لگانا، مسجدوں کو مسمار کرنا، کتب خانے جلاتا، جو سلمے پڑ جائے اس کو تہہ تیغ کر دینا، نہ صرف معمول بن گیا بلکہ داخلی ثواب سمجھا جانے لگا۔

۴۳۸ھ میں ابو عبد اللہ الجلاب، باب الطاق کے قریب قتل کئے گئے اور انہیں کی دوکان میں لاش کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ ان پر اہل بیت کی فضیلت بیان کرنے کا الزام تھا۔







حکومت میں عہدے نہ دینا فرمانروا کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے جس پر اس کو اعتماد نہ ہو، اس کو وہ کوئی ذمہ داری سونپے یا نہ سونپے مگر عہد ایوبی میں کوئی مظلوم شیعہ فریاد لے کر گیا تو مستوجب عتاب ہوا، بے گناہی کو شیعوں کا عین گناہ قرار دیا جاتا رہا۔ یہ صورت حال ایوبیوں کی دو نسلوں تک بروئے کار رہی پھر ترکان عثمانی کا عہد آگیا جنہوں نے اپنے پیش روؤں کو بھی مات کر دیا..... ایوبی بھی اپنے عروج تک کعبے کے متولی تھے۔

تجزیہ خیز یہ حقیقت ہے کہ صلیبی جہاد میں کئی شیعہ جرنیل اور متعدد افسران فوج نے ایوبی لشکر کے ساتھ حق جہاد ادا کیا تھا جتنے بارے میں صلاح الدین جانتا تھا اور انکی خدمات کا معترف تھا پھر بھی اسکی شیعہ دشمنی کم نہیں ہوئی۔

### ترکان عثمانی

ترکوں کی حکومت کا آغاز بھی اسی طرح ہوا جس طرح دوسری حکومتیں قائم ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی قبیلے کی یک جہتی اور تلوار کی تیزی سے اپنے وجود کو منوایا اور ایک چھوٹے سے مرکز پر ٹھہر کر اس طرح پھیلے کہ عظیم سلطنت ترکیہ کے بانی بن گئے۔

ترکان عثمانی کے قبیلے کا نام اوغوز تھا جو مشرق سے مغرب کو ہجرت کرتے رہے۔ جو شاخ انقرہ کے نواح میں آکر آباد ہوئی اس کا سردار ارطغرل بیگ تھا جو عثمان خان کا دادا تھا۔ اس قبیلے کو سلجوقی سلطان علاء الدین سے جاگیر ملی تھی جو مشرقی اناطولیہ میں تھی۔

یہ علاقہ سلجوقی اور عیسائی جنگوں کا آماجگاہ تھا اور اس سے تھوڑے سے فاصلے پر تاتاری حکومت کی سرحد شروع ہوتی تھی لہذا ارطغرل کو عیسائی اور تاتاریوں دونوں سے جنگ کرنا پڑی..... قبیلے اور علاقے کی باگ ڈور جب عثمان خان کے ہاتھ آئی تو زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا صلح پسند مسلمانوں نے اپنی حفاظت اور باہمی اتحاد کے لئے ایک تحریک چلائی تھی جس کا نام انی تحریک تھا۔ عثمان خان بھی اس میں شریک ہو گیا پھر ایک

باقاعدہ فوج بنائی اور رومی عیسائیوں نے جو مسلم علاقے لئے تھے ان کو واپس لیا۔۔۔۔۔ ۱۳۲۶ء میں وہ ایک بڑے علاقے کا مالک تھا۔ جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ بروصہ کا محاصرہ تھا کہ عثمان خان کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد اورخان نے باپ کی جگہ لی اور فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ یورپ کی سرحد تک ابھرتی ہوئی اس سلطنت نے ہاتھ پاؤں نکالے تو مشرق و مغرب میں پھیلی چلی گئی۔ اورخان کے بعد سلطان مراد تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں ایشیا و یورپ دونوں براعظموں میں عثمانی مقبوضات کا اضافہ ہوا پھر بایزید یلدرم اس کا جانشین ہوا جو اپنے پیش روؤں سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ۱۴۰۲ء / ۸۱۰ھ میں امیر تیمور قہر الہی کی طرح اس سلطنت پر ٹوٹ پڑا اور یلدرم اس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔

بایزید کے بعد سلطان محمد تخت نشین ہوا۔ اس نے عثمانی حکومت میں چار چاند لگا دیئے پھر مراد ثانی نے عنان حکومت سنبھالی اور تیس سال بعد محمد ثانی قسطنطنیہ کا فرمانروا ہوا جسکو چند ناکامیاں ہوئیں پھر بھی اس نے اہل یورپ کے دانت کھٹے کر دیئے۔ ۱۴۸۱ء میں بایزید ثانی کا دور شروع ہوا۔ ۱۵۱۲ء میں سلیم اول تخت پر بیٹھا۔ اس نے مصر اور بعض دوسرے علاقے مسخر کئے۔ اس کے عہد حکومت میں ایران کی صفوی حکومت مضبوط ہو چکی تھی۔

۱۵۲۰ء / ۹۲۷ھ میں سلیمان ذیشان ترکی کا حکمران ہوا۔ ۱۵۶۶ء میں اس کے انتقال پر اس عظیم سلطنت کا انحطاط شروع ہوا اور کمزور سے کمزور تر سلاطین آتے جاتے رہے۔ بغاوتیں اور خانہ جنگی آئے دن کا کھیل ہو گیا۔ حتیٰ کہ ترکی یورپ کا مرئیض نیم جاں مشہور ہو گیا۔ سلیم ثانی، مراد ثالث اور محمد ثالث، سب نامراد حکمران گزرے مراد رابع آخری جنگجو سلطان تھا، وہ بھی ترکی کو سنبھال نہ سکا۔

۱۶۴۰ء / ۱۰۵۰ھ میں وزراء کی حکومت بنی۔ وہ بھی ناکام رہی۔ نت نئی آزمائشوں میں ترکی اندر کی طرف سمٹا رہا اور روس کی حدیں پھیلی رہیں..... غنیمت ہو کہ ترکی کا انجام دوسری سلطنتوں کی طرح نہیں ہوا اور خدا نے کمال اتاترک کو پیدا کر دیا جس نے ذوقی ناؤ کو شکستہ حالت میں ساحل سے ہمکنار کر دیا۔ (۹۰)



”مظالم کی فہرست بڑی طویل ہے۔ بڑے بڑے جید عالم ان کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ کعبے کے متولیوں نے اپنے مقبوضات میں متوکل کا دور تازہ کر دیا۔ مدینے میں بھی سادات و شیعوں کا قتل کیا گیا۔ سلطان سلیم ثانی نے عراق سے عجم تک پھیلے ہوئے شیعوں کی مردم شماری کرائی پھر ان کو قتل کرادیا۔ ان کی تعداد چالیس ہزار بتائی جاتی ہے۔“ (۹۱)

شہید ثانی شیخ زین العابدین ترکی عالم تھے۔ انہیں حج کے دوران مکے سے گرفتار کرایا گیا۔ سلطان سلیمان پاشا نے چالیس روز ایک مکان میں مجبوس رکھا پھر قسطنطنیہ میں قتل کرادیا۔ لاش تین روز تک پڑی رہی پھر دریا میں پھینک دی گئی۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اہل بیت کا نام لیتے تھے۔

اسیے ان گنت واقعات ہیں جن کو اسیہ اور بنی عباس کے جانشینوں کا کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔

ترکوں سے تولیت کعبہ سعودیوں کو ملی جو آج تک باقی ہے۔

#### محمد ابن سعود

۱۱۳۹ھ / ۱۷۳۶ء سے ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء تک۔ سلطنت نجد کا بانی محمد بن سعود قبیلہ حنیفہ سے تھا جس قبیلہ سے مسئلہ کذاب گزرا ہے جو ورعہ میں بڑا شیخ مانا جاتا تھا، اس کے دور میں ایک شخص محمد ابن عبد الوہاب ۱۱۱۱ھ میں بمقام عینہ میں پیدا ہوا اور ۱۲۰۶ھ میں مر گیا۔ اس نے اپنے نزدیک مذہب اسلام میں اصلاح یا تجدید کی اور بنی تمیم میں اپنے عقائد پھیلانے لگا۔ اس پر شہر کا حاکم مزاحم ہوا اور محمد بن عبد الوہاب ورعہ کے شیخ محمد بن سعود کے پاس چلا آیا اس نے اس کی حمایت کی اور اس کے جدید مذہب کو اپنے علاقے میں رائج کیا، جو محمد بن عبد الوہاب کے نام پر دہائی کہلاتا ہے۔ پھر رئیس ورعہ نے محمد بن عبد الوہاب سے رشتہ داری قائم کر لی اور وہابی تحریک پھیلانے میں بڑی جدوجہد کی۔ نتیجے میں لوگوں سے جنگ کی نوبت آگئی۔ اہلساکے مشہور قبیلہ بنی خالد اور بجزان کے قبیلہ مکرمی نے اس کا سدباب کیا لیکن وہ بھی اس سیلاب کو نہ روک سکے۔ شرفائے مکہ نے ایک جدید فرقہ قرار دے کر اس کو حج سے ردک دیا اور شریف مکہ نے اس کی اطلاع قسطنطنیہ بھیج دی۔ اب محمد بن

چودھویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کو اس سلطنت کے اٹھان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بڑی طاقت بن گئی اور اس نے زوال پذیر ایوبی سلطنت کی جگہ لے لی پھر تولیت کعبہ بھی اس کی تحویل میں آگئی۔ اس سلطنت کی حدود چونکہ مسلمانوں کے معروف علاقوں سے دور تھیں اس لئے منگولیا کے طوفان کا اس پر زیادہ اثر نہیں پڑا پھر ہلاکو خان کے ورثاء کی سلطنت جب انحطاط پذیر ہوئی اور امیر تیمور سرقند سے نکل کر عراق و ایران پر حملہ آور ہوا تو ترکوں کی حکومت شباب پر تھی۔ انہوں نے طاقت کے زعم میں سخت مزاج مغل کو لٹکار دیا۔ بایزید یلدرم کی شکست اور گرفتاری ترکوں پر ایک ضرب شدید تھی مگر وہ اس کو تھیل گئے اور یلدرم کے جانشینوں نے حکومت کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال لیا۔

کہا جاتا ہے کہ محی الدین ابن عربی اور مولانا روم کی تعلیمات کا ترکوں پر بڑا اثر تھا اور اسی کی بنیادوں پر انہی تحریک چلائی گئی تھی جس کی بدولت عثمان خان استقرار حکومت میں کامیاب ہو گیا۔ ترکوں میں اخوت تھی، بھائی چارہ تھا لیکن جب ان کا سابقہ شیعوں سے پڑا تو انہوں نے بڑی عصبیت کا مظاہرہ کیا اور بعض فرمانرواؤں نے تو اتنے مظالم ڈھائے کہ انسانیت کا نپ اٹھے۔

شروع کے عظیم فرمانرواؤں سے صغوی اور قاجاری بادشاہوں کے معرکے ہوئے تو اس کو ملک گیری کی ہوس پر محمول کیا جاسکتا ہے مگر عوامی سطح پر انہوں نے جو ستم توڑے، ان کو بربریت کے سوا کچھ کہا نہیں جاسکتا اور بغداد تو تختہ مشق ہی بنا رہا۔ قسطنطنیہ کے فرمانروا جب اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تو کرخ کی گلیاں انہوں نے سادات اور شیعوں کے خون سے رنگ دیں پھر جب صغویوں نے اس کو چھین لیا تو وہ اپنے مقتول اور زخمی چھوڑ کر چلے گئے۔

یہ عمل کئی بار دہرایا گیا اور ترکوں نے ہر مرتبہ وہی سب کچھ کیا جو اس سے قبل ہوتا رہا تھا۔ پھر جب ایک عہد نامے کی رو سے بغداد پر ترکوں کا قبضہ مسلم ہو گیا تو شیعہ ان حالات میں آگے گویا وہ تقیہ میں زندہ ہوں۔



سعودی شیعہ قبیلہ کے بجائے حکمران بن چکا تھا۔ اس نے ۱۱۰۸ھ / ۱۷۹۵ء میں تیس برس حکومت کر کے انتقال کیا۔

### عبد العزیز بن محمد بن سعود

۱۱۷۹ھ سے ۱۲۱۸ھ تک۔ اس کی حکومت کے پہلے دس سال ہمسایہ قبائل بنی خالد بنی مکرمی اور بنی متفق سے لڑنے میں گزرے۔ ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۵ء میں عبدالعزیز نے الحسا اور قطیف پر قبضہ کر کے خلیج فارس کے ساحل پر اقتدار قائم کر لیا۔ بصرہ و بغداد کے ترکی حکمرانوں اور ان کے اتحادی بنی متفق نے ان کے خلاف ہر کوشش کر ڈالی مگر ناکام رہے۔ ۱۷۹۹ء / ۱۲۱۲ھ میں پاشائے بغداد اور عبدالعزیز میں چھ سال کی عارضی صلح ہو گئی۔ ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۳ء میں سرور شریف مکہ نے ان کو ایک خاص محصول کی ادائیگی پر زیارت مقدسہ کی اجازت دیدی لیکن اس کے جانشین غالب نے ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۹ء سے اس اجازت کو منسوخ کر دیا اس پر وہابیوں نے ۱۷۹۰ء / ۱۲۰۳ھ، ۱۷۹۵ء / ۱۲۰۸ھ اور ۱۷۹۸ء / ۱۲۱۲ھ میں حجاز پر حملے شروع کر دیئے۔ آخر مجبور ہو کر ۱۷۹۸ء میں شریف غالب نے صلح کر لی اور وہابیوں کو حج کی عام اجازت دیدی۔ عبدالعزیز نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ شریف کے علاقے پر تاخت نہ کرے گا۔

۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۱ء کو عبدالعزیز نے اپنے بیٹے سعود کے ماتحت فوج روانہ کی اور کر بلا کو فتح کر لیا اور حکم دیا کہ کافر اور مشرک شیعوں کو مارا جائے اور قتل عام کیا جائے۔ اس طرح سات ہزار کر بلائی مارے گئے۔ ان مقتولوں میں مولانا فخر الدین عبدالصمد ہمدانی صاحب بحر المعارف بھی ہیں۔ وہابیوں نے روضہ سید الشہداء کا کچھ احترام نہ کیا۔ مقدس مقامات کی بے حرمتی کی، جو نقد و جنس غرانہ درگاہ میں جمع تھا وہ سب لے لیا۔

۱۲۱۴ھ / ۱۸۰۰ء اور ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء میں سعود بن عبدالعزیز حج کے لئے آیا تو اشیر تہامہ اور بنی عرب کے قبائل جو اب تک شریف غالب کے ماتحت تھے، سب سعود سے آٹے اور ایک مرتبہ پھر شعلہ جنگ بھڑک اٹھا۔ ۲۵ شوال ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۸۰۳ء کو وہابیوں نے طائف پر قبضہ کر لیا ہزار ہا آدمی قتل کئے اور ۸ محرم

۱۲۱۸ھ مطابق ۳۰ اپریل ۱۸۰۳ء کو سعود فاتحانہ مکہ معظمہ میں داخل ہو گیا۔ ۱۳ روز وہاں قیام کیا، مسلمانوں کو اپنے طریقہ کی ہدایت کی اور سلطان روم کو فتح مکہ کا حال لکھ بھیجا، اپنا ایک ہدایت نامہ بھی روانہ کیا پھر جدہ کا محاصرہ کر لیا۔

شریف غالب وہاں موجود تھا وہ جواب دیتا رہا اتنے میں سعود کو خبر پہنچی کہ (۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں) عبدالعزیز ایک شیعہ عبدالقادر جیلانی کے ہاتھ سے مارا گیا لہذا وہ جدہ کا محاصرہ اٹھا کر درعیہ چلا گیا اور اپنے باپ کی جگہ نجد کا سلطان ہو گیا۔ شریف غالب میدان خالی پا کر مع فوج مکہ آ گیا اور از سر نو اس پر قبضہ کر کے جو وہابی موجود تھے ان کو نکال دیا تاہم ان کے لئے مزید مراعات منظور کر لیں۔ طائف بدستور وہابیوں کے قبضہ میں رہا جہاں عثمان مصالحتی ان کی طرف سے مستظم تھا۔ ۱۸۰۰ء / ۱۲۱۳ھ سے وہابیوں نے خلیج فارس کے ساحل پر اقتدار جمانا شروع کیا اور چند ہی سال میں بحرین پر بھی قابض ہو گئے پھر اس ایٹم کے قبائل بنو جو اسم بھی ان کے شریک ہو گئے۔

### سعود بن عبدالعزیز

۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء سے ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۳ء تک بغداد اور عمان پر خفیف حملوں کے بعد سعود نے طے کیا کہ شریف مکہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے پتہ ناچہ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں اس نے مدینہ منورہ پھر ذی الحج میں مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا۔ بقیہ حکومت بچانے کے لئے شریف غالب نے اطاعت قبول کر لی۔

اس دوران وہابی تحریک تمام حجاز میں پھیلی رہی۔ حاجیوں کے کارواں جو ترکی سے آتے تھے روک دیئے گئے، خطبہ سے ترکی سلطان کا نام نکال دیا گیا، سعود نے ایک خط لکھ کر مطالبہ کیا کہ نہ صرف والی دمشق بلکہ خود سلطان بھی وہابی تحریک کو قبول کر لے۔ والی دمشق نے جواب صاف دیا تو سعود نے جولائی ۱۸۱۰ء / ۱۲۲۸ھ میں حوران پر حملہ کیا اس کے بعد سعود نے خلیج فارس پر حملہ بول دیا۔ اس طرح انگریزوں کو ۱۸۰۹ء میں ان کے خلاف بیزاروانہ کرنا پڑا۔ جس نے ۱۳ نومبر ۱۸۰۹ء کو اس ایٹم پر قبضہ کر کے سعود کے بیڑے کو برباد کر دیا۔

سلطان روم خود نصاریٰ سے جنگ میں مصروف تھا اس لئے وہابیوں نے



اس قدر زور پکڑا کہ ترکی سلطان کو خود اپنی سلطنت جاتے رہنے کا خطرہ پیدا ہو گیا لہذا اس نے محمد علی پاشا کو حکم دیا کہ مصری فوج لے کر سعود کی سرکوبی کر دے۔ محمد علی نے اپنے بیٹے طوسون پاشا کی سرکردگی میں فوج روانہ کر دی جس نے نومبر ۱۸۱۱ء میں منیع البحر اور منیع البرقع کر لیا لیکن مدینہ کی طرف پیش قدمی کرتے وقت صفر اور حدیدہ کے مقام پر سعود کے بیٹوں عبداللہ اور فیصل نے عربوں کی مدد سے ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء میں ایسی شکست دی کہ بہت کم لوگ بچ کر گرتے پڑتے مصر کو واپس ہو سکے۔ بہت مال و اسباب وہابیوں کے ہاتھ آیا۔ ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں محمد علی خود جدہ آیا اور اس کی فوج تمام مقبوضات وہابیہ کو فتح کرتی ہوئی صفر اور حدیدہ تک پہنچ گئی اور ماہ رمضان میں حسن تدبیر سے بلا مقابلہ فتح کر لیا۔ سپہ سالار لشکر وہابیہ کو ایک لاکھ ریال رشوت دی اور دوسرے افسروں کو اٹھارہ اٹھارہ ہزار ریال نقد کے علاوہ ان کے وظیفے بھی مقرر کر دیے۔ یہ سارا کام شریف غالب کی پیروی اور کوشش سے انجام پایا، جو بظاہر وہابیوں کا دوست تھا مگر درپردہ دشمن۔

ذی قعدہ ۱۲۲۷ھ میں لشکر سلطانی مدینہ میں داخل ہوا اور اوائل محرم ۱۲۲۸ھ میں دریا کے رستے جدہ جا پہنچا۔ شریف غالب چھپ کر فوج وہابیہ سے ٹکل کر سلطانی لشکر میں آگیا، مکہ اور جدہ میں سلطانی فوج کے داخل ہوتے ہی عثمان مضائق طائف سے فرار ہوا لیکن گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، جہاں وہ قتل کر دیا گیا پھر محمد علی پاشا نے تمام وہابیوں کو چن چن کر قتل کرادیا۔ اسی اثنائے ۸ جمادی الاول ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۸۱۳ء کو سلطان سعود ۶۸ سال کی عمر میں انتقال کر گیا اور اس کا بیٹا عبداللہ اس کا جانشین ہوا۔

### عبداللہ بن سعود

۲۷ اپریل ۱۸۱۳ء سے ۹ ستمبر ۱۸۱۸ء تک۔ ۱۵ جنوری ۱۸۱۵ء کو محمد علی پاشا نے تربہ فتح کر لیا، پھر اشیر کی طرف بڑھا اور قفقذہ ہوتا ہوا مکہ آگیا۔ مارچ میں طوسون پاشا حناکیہ کی سمت سے نجد میں داخل ہوا اور اس کے قلعہ بند شہر پر قبضہ کر لیا جہاں عبداللہ بن سعود سے دوچار ہوا۔ وسط ۱۸۱۶ء تک دونوں میں صلح کی طویل گفتگو ہوتی رہی مگر صلح نہ ہو سکی۔

ستمبر ۱۸۱۶ء میں ابراہیم پاشا بن محمد علی نے مصری فوج کی کمان لے لیا تھا میں لے لی، ۱۸ مہینے کی خوفناک خونی جنگوں کے بعد وہ درعیہ کے دروازوں تک پہنچ گیا اور اس کا محاصرہ کر لیا جو اپریل ۱۸۱۸ء سے ستمبر تک قائم رہا۔ آخر ۶ ستمبر کو شہر فتح ہو گیا اور سلطان عبداللہ نے تین دن تک قصر الدرعیہ میں محصور رہ کر ہتھیار ڈال دیے۔ ابراہیم پاشا نے عبداللہ اور محمد بن عبد الوہاب کے خاندانوں کو قاہرہ بھیج دیا پھر محمد علی نے قاہرہ سے سلطان عبداللہ اور اس کے رفقاء کو قسطنطنیہ روانہ کیا جہاں ۱۷ ستمبر ۱۸۱۸ء کو ان سب کو قتل کر دیا گیا۔

### مشاری بن سعود

۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۹ء سے ۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۰ء تک طوسون پاشا نے ۱۸۱۹ء میں نجد چھوڑا تو عبداللہ مقتول کے بھائی مشاری نے درعیہ میں پھر حکومت قائم کر لی۔ محمد علی نے اس کے استیصال کے لئے حسین بے کو روانہ کیا جس نے اسے گرفتار کر کے قاہرہ روانہ کر دیا لیکن وہ راستہ ہی میں مر گیا۔

### ترکی بن عبداللہ بن سعود

۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۰ء سے ۱۲۳۹ھ / ۱۸۳۴ء تک۔ وہ مصری حملوں کے وقت سدر بھاگ گیا تھا۔ مشاری بن سعود کے بعد اس نے ریاض میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا لیکن مصریوں نے شکست دے کر نکال دیا۔ ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۲ء میں اس نے ریاض کے کمزور مصری دستے پر اچانک حملہ کر دیا پھر حجاز کے والیوں سے لڑنے کے بعد محمد علی کو سالانہ رقم دینے پر راضی ہو گیا، مگر ۱۸۲۰ء میں اس نے پھر علاقہ الحسا کو جس پر ۱۸۱۳ء سے ترک قابض تھے فتح کر لیا اور بحرین پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد وہابیوں کا دار حکومت درعیہ کے بجائے ریاض قرار پایا لیکن ۱۲۳۹ھ / ۱۸۳۴ء میں مشاری بن عبد الرحمن بن مشاری بن حسن بن مشاری بن سعود نے ترکی کو قتل کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا۔

### مشاری بن عبد الرحمن

۱۲۳۹ھ / ۱۸۳۴ء صرف چالیس روز حکومت کرنے پایا تھا کہ فیصل بن ترکی بن عبداللہ نے اسے بمقام ہنوف قتل کر دیا اور سلطنت پر قبضہ کر لیا۔



**فیصل بن ترکی (بار اول)**

۱۲۳۹ھ / ۱۸۳۴ء میں برسر اقتدار آیا۔ ۱۸۳۷ء میں فرمانروائے سوم سعود کے بیٹے خالد نے مصری فوج کی مدد سے بغاوت کی اور فیصل کو ریاض میں شکست دی اس کے بعد دوسری لڑائی میں مصری فوج کے سپہ سالار خورشید پاشا نے بھی فیصل کو وہم میں پسپا کیا، گرفتار کر کے مصر بھیج دیا جہاں وہ قید کر دیا گیا مگر ۱۸۴۱ء میں رہا کر دیا گیا۔

**خالد بن سعود**

۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء سے ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء تک۔ ۱۸۴۰ء میں مصری فوج کی واپسی کے بعد عبداللہ بن شینان بن ابراہیم بن شینان بن سعود نے دسمبر ۱۸۴۱ء / ۱۲۵۷ھ میں اسے ریاض سے نکال دیا۔ اس نے جدہ میں جا کر سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۸۶۱ء میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

**عبداللہ بن شینان**

۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۲ء سے ۱۲۵۹ھ / ۱۲۴۳ء تک بمشکل سال بھر حکومت کر سکا تھا کہ فرمانروائے ہشتم فیصل بن ترکی نے جو ۱۸۴۱ء میں رہا ہو چکا تھا ریاض فتح کر کے اسے قید کر لیا اور وہ قید ہی میں مر گیا۔  
**فیصل بن ترکی (بار دوم)**

۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء سے دسمبر ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء تک مدبرانہ عاقلانہ اور مصلحانہ کوششوں سے حکومت کرتا رہا۔ اس کے عہد میں جبل شمر کے قبیلہ ابن رشید نے جو اس کا دوست تھا بغاوت کی، ۱۳ رجب ۱۲۸۲ھ مطابق دسمبر ۱۸۶۵ء کو وہ ہیضہ سے مر گیا۔  
**عبداللہ بن فیصل بن ترکی (بار اول)**

دسمبر ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء تا ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۱ء میں اس کے بھائی سعود بن فیصل نے تخت سے اتار کر خود قبضہ کر لیا اور اس کو جلاوطن کر دیا۔

**سعود بن فیصل بن ترکی (بار اول)**

دسمبر ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۲ء تک۔ اس کے ابتدائی عہد حکومت میں جلاوطن

عبداللہ کی درخواست پر ترکوں نے المساء اور قطیف پر قبضہ کر لیا اور باوجود سعود کی مسلسل کوششوں کے دونوں مقامات انہی کے قبضہ میں رہے یہاں تک کہ سعود نے انتقال کیا۔

**عبداللہ بن فیصل بن ترکی (بار دوم)**

۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء سے ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء تک۔ سعود کی وفات کے بعد اس نے پھر تخت حاصل کر لیا اور اپنے بھائی محمد اور سعود کے بیٹوں کی مخالفت کے باوجود اس پر قابض رہا۔ ۱۸۸۳ء میں اس کو ابن رشید والی حائل کی جنگ میں شرکت کرنا پڑی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سعود کے بیٹوں نے اسے ۱۸۸۴ء میں جلاوطن کر دیا۔

**محمد بن سعود بن فیصل**

۱۸۸۵ء۔ اس کا عہد حکومت بہت ہی مختصر اور غیر اہم ہے اس کے بعد اس کا چچا عبدالرحمن بن فیصل تخت نشین ہوا۔

**عبدالرحمن بن فیصل**

۱۸۸۶ء۔ اس کو محمد ابن رشید والی حائل نے تخت سے اتار دیا اور اس کی جگہ عبداللہ بن فیصل بن ترکی کو نجد کی حکومت دیدی۔  
**عبداللہ بن فیصل (بار سوم)**

۱۸۸۷ء سے ۱۸۸۸ء تک۔ عبدالرحمن کی سعی کے باوجود ریاض حائل کا محکوم رہا۔ ۱۸۹۱ء میں محمد بن رشید والی حائل نے ریاض فتح کر لیا اور وہاں کا تخت فیصل کے تیسرے بیٹے محمد کو دے دیا۔

**محمد بن فیصل**

محمد بن فیصل کی وفات کے بعد ریاض پر محمد ابن رشید والی حائل کے عمال حکومت کرتے رہے۔

**عبدالعزیز السعود بن عبدالرحمن بن فیصل**

عبدالعزیز نے کویت کے شیخ مبارک کی مدد سے مارچ ۱۹۰۲ء میں ریاض پر قبضہ کر لیا اور ابن رشید کے حملوں کو کامیابی سے روکتا رہا۔ اس پر ابن رشید نے ترکوں کی مدد حاصل کی لیکن چونکہ خود حائل میں بدامنی پھیل گئی تھی اس لئے وہ کچھ



نہ کر سکا۔ آخر سلطان عبدالعزیز نے عوام کی مدد سے ایک مرتبہ پھر ریاض کی خود مختار حکومت قائم کر لی۔

۱۹۱۳ء میں اس نے الحسا اور اس کا مشہور شہر حنوف ترکوں سے فتح کر لیا اور الحسا کو سلطنت نجد میں شامل کر لیا۔ ۱۹۲۳ء میں اس نے عبداللہ بن محبت الرشید امیر جبل شمر حائل کو اپنا باج گزار بنالیا۔ ۱۹۲۴ء کے آخر میں اس نے طائف اور مکہ شریف حسین کو شکست دے کر فتح کر لیا۔ پھر دسمبر ۱۹۲۵ء میں مدینہ بھی فتح کر لیا۔

۱۹۲۴ء سے شریف حسین تخت حجاز اپنے بیٹے علی کو دے کر فیصل کے پاس عراق چلا گیا، فتح مکہ کے بعد علی نے اپنی سکونت و حکومت جدہ میں قائم کی، دسمبر ۱۹۲۵ء میں ابن سعود نے جدہ بھی فتح کر لیا اور علی بھی فیصل کے پاس بغداد چلا گیا۔

کعبے کے نجدی متولین کی شروعات اور ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو محمد بن عبدالوہاب کا ذہن اور محمد بن سعود کی امارت کو اساسی حیثیت حاصل ہوگی پھر صرف محمد بن سعود کی شیوخیت کا عمل دخل دکھائی دے گا۔ اس کے بعد جس تیزی سے ان کے نظریے نے ہاتھ پاؤں پھیلانے اور جس سرعت سے استقرار حکومت کیا، اس کے لئے صرف ورعہ کی محدود آمدنی کافی نہ ہو سکتی لہذا ماننا پڑے گا کہ نفاذ تحریک اور توسیع مملکت کے لئے رقوم کہیں نہ کہیں سے آتی تھیں۔

اور اس دور کی بساط سیاست پر صرف شاطران فرنگ کا سکہ چلتا تھا۔ ہندوستان کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ عراق و ایران اور ترکی میں مسلم آبادیاں اور مسلم حکومتیں تھیں۔ انگریزوں کا ٹکراؤ جب بھی ہوا تھا تو مسلمانوں سے اور جب ہو سکتا تو صرف مسلمانوں سے اور مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت ان کا جذبہ ایمانی تھا۔ جس میں کچھ دراڑیں تو پڑی ہی ہوئی تھیں، کوئی بڑا شکاف اور ڈال دیا جاتا تو اجتماعی طاقت مجروح ہو جاتی اور یہ قوم ٹکڑوں میں بٹ جاتی تو وہ جس ٹکڑے کو چاہتے، اس کو پاش پاش کر دیتے اس لئے انگریزوں نے سعودی آلہ کار استا تو انا بنانے کی کوشش کی کہ اسلام اور مسلمان دونوں اس کی ضرب سے تمللا اٹھیں۔

یہ فراست کامیاب ہو کر رہی۔ وہابی مسلک ترمیمی اسلام کی شکل میں سامنے آیا تو قدامت اس کی تاب نہ لاسکی، رسالت اور آثار رسالت سب اس سے متاثر ہوئے پھر سعودی پشت پناہی کے لئے انگریز منظر عام پر بھی آگئے اور ۲۶ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انہوں نے ابن سعود سے ایک معاہدہ کر لیا جس کی رو سے برطانیہ نے اس کی حکومت تسلیم کی، بیرونی جارحیت کی صورت میں تحفظ کی ذمہ داری لی اور سیاسی اعتبار سے سعودی حکومت کو اپنا پابند بنالیا۔ پھر اس میں امریکہ کی دخل اندازی بھی شروع ہو گئی۔

مسلمانوں میں تفرقہ سازی اور نفاق پروری کے لئے ابن سعود کی جو بھی اہمیت ہو لیکن آمدنی کے لحاظ سے اس کا انحصار حج کے موسم پر تھا اور حاجیوں پر عاید کئے ہوئے ٹیکس پر پوری قوم زندہ تھی لیکن ۱۹۳۵ء میں تیل کی دریافت کے بعد سے سارا ملک دولت مندوں کی صف میں جا کھڑا ہوا جس کے بعد سعودی مسلک کی اشاعت میں بجلی کی سی تیزی پیدا ہو گئی۔

اسلامی اعتبار سے وہابی نظریات کا جائزہ علمائے کرام کا کام ہے ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ حنفی، شافعی اور مالکی مکاتیب فقہ ہزار گیارہ سو سال تک اسلام کی جن تعلیمات پر عمل کرتے رہے، کیا وہ غلط تھیں۔ اس طویل مدت میں کتنے بڑے بڑے عالم، مجتہد، صاحبان نظر پیدا ہوئے، انہیں اتنا بھی علم نہیں تھا کہ وہ ان باتوں کو سمجھ سکتے جو صحرائے نجد میں ہوش سنبھالنے والے محمد بن عبدالوہاب نے سمجھ لیں۔ ..... وہابی مسلک کی رو سے تمام صوفیاء، فقہاء اور علماء اور ان کے متبعین سب مشرک قرار پاتے ہیں۔

### کد بلا کی نارا جی

جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے انہوں نے شہروں سے اٹھنے والی ایسی آوازوں کو صدا بصحر قرار دیا تو خود صحرا سے جو آواز اٹھی، اس پر کیا کان لگاتے۔ ان کا ایک جادہ مستقیم ہے۔ اس پر وہ چلے آ رہے ہیں اور چلتے رہیں گے۔ ان کے لئے ایسا کوئی اجتہاد قابل اعتناء کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کون اہل بیت کا



دوست ہے اور کون دشمن؟ اس زاویہ نگاہ سے نجد کے سعودی پچھلے متولین کعبہ سے بازی لے گئے اور انہوں نے تو شیعوں پر اس قدر ظلم و ستم توڑے کہ چٹگریز کی بربریت کو پیچھے چھوڑ دیا۔

۱۲۱۶ھ میں سعود بن عبدالعزیز نے نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کو تباہ کر دیا۔ جو بیس ہزار کا لشکر لے کر وہ عراق پہنچا، اور کربلا کو حصار میں لے لیا اور قتل عام شروع کر دیا۔ عوام، پہرے دار اور زائرین درندہ صفت نجدیوں کے سامنے مدافعت کے قابل بھی نہ تھے وہ بیدریغ قتل ہونے لگے۔ مورخین نے ان کی تعداد سات ہزار سے زائد بتائی ہے۔

پھر اس لشکر نے روضہ حسینی کو مسمار کرنا شروع کیا اور خزانے پر قبضہ کر لیا۔ لوٹ میں زرد جو اہر کے علاوہ ایک بہت بڑا موتی بھی تھا۔ بیس طلائی تلواریں، قیمتی جڑاؤ، ہتھر، سونے چاندی کے ظروف، فیروزے، میرے اور بیش قیمت ساز و سامان سب پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ چار کشمیری شالیں، دو ہزار چاندی کی تلواریں، بے شمار بندوقیں اور دوسرے اسلحہ فروش اور دوسرا اسباب ان دشمنوں کے ہاتھ لگا جن کو لے کر وہ واپس ہو گئے..... اس کا استقام فتح علی قاچار نے مسقط اور نجد میں لیا۔

اس کے بعد یہ ویران اور اجاڑ روضہ مہینوں میں آباد ہو سکا۔ سبط رسول کے مزار کی رونق تو بتدریج دوبارہ واپس آگئی اور عقیدتمندوں نے اس کو پہلے سے زیادہ مزین کر دیا مگر تاریخ میں ان صحرائیوں کے نام کا ایک سیاہ باب تحریر ہو گیا جو آج بھی اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار پھر انہوں نے نجد و کربلا پر غارتگری کی کوشش کی تھی مگر حفاظت کا معقول انتظام دیکھ کر ان کی ہمت نہیں پڑی۔

### انہدام مدینہ

تاریخی کا یہ سلسلہ صرف ان مشاہد تک محدود نہیں رہا، راہ چلتے جو بھی زیارت گاہ انہیں نظر آئی، اس کو مسمار کر دیا مگر دوسرے ہی برس عبدالعزیز ابن السعود موت کے گھاٹ اتار دیا گیا: کربلا کی یلغار میں سعود بن عبدالعزیز نے ایک

افغانی ملا کے بیٹوں کو قتل کر دیا تھا، اس نے اپنے بیٹوں کے انتہام میں ۱۲۱۸ھ میں عبدالعزیز کو قتل کر دیا۔ اس میں بغداد کے ترکی حکمران کی سازش بھی شامل تھی..... بعض مورخین نے اس کا نام عبدالقادر جیلانی لکھا ہے۔

غارت گری کے اس سلسلے میں حکومتوں کی تبدیلی کے بعد مدینہ بھی بری طرح تاراج کیا گیا اور سادات اور شیعوں کا نام و نشان تو پوری مملکت سے مٹا دیا گیا۔ مہندم ہونے والے مقبروں اور مساجد کی تعداد چھ درجن سے زائد ہے۔ مقدس مقامات کی بربادی کی ابتدا خود حضور کے روضہ مقدس سے کی گئی۔ جس کے بعد خانہ حضرت علی، مولد جناب فاطمہ زہرا، بیت خدیجہ بنت خویلد، مکان حضرت حمزہ، خانہ ارقم، قبرستان جنت معلیٰ، قبور شہدائے بدر کو کھدوا کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔

جنت المعلیٰ کے کا مشہور و معروف قبرستان تھا جس میں قاسم فرزند محمد (آنحضرت کے صاحبزادے)، جناب عبدالطلب، حضرت ابوطالب، جناب خدیجہ الکبریٰ اور ان گنت علماء، فقہا اور محدثین کی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ پھر مدینہ طیبہ میں جنت البقیع پر توجہ کی گئی اور اس کو تو اس طرح برباد کیا گیا کہ کسی قبر کا سراغ ہی نہیں ملتا۔

اس قبرستان میں بڑے بڑے بزرگان دین کے مزارات واقع تھے۔ خود حضور کا معمول تھا کہ وہاں تشریف لے جاتے اور مرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت فرماتے۔ آپ کی اکلوتی بیٹی جناب فاطمہ بھی اس میں دفن تھیں، حضرت امام حسن، حضرت امام زین العابدین، امام محمد باقر، امام جعفر صادق کی دائمی آرام گاہیں یہاں بنی ہوئی تھیں۔

۸ شوال ۱۳۴۲ھ کو سعودیوں نے انہیں اس طرح برباد کیا کہ جا بجا چند ہتھر نظر آتے ہیں، کسی قبر کو شناخت نہیں کیا جاسکتا۔

یہ وہ عمائدین اسلام تھے جن کی عظمت کو خانہ کعبہ جانتا ہے اور جن کے نام خانہ کعبہ کی حرمت کے ضامن ہیں۔ ان کے مشاہد کا انہدام ان لوگوں نے کیا ہے جو خادم حرمین شریفین کہلاتے ہیں اور جو دور حاضر میں کعبے کے متولی ہیں۔



## صوفیائے کرام اور شیعیت

تصوف اور شیعیت ایک بحث طلب موضوع ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ صوفیوں کے چار بڑے سلسلوں میں تین حضرات علیؑ تک جاتے ہیں اور سرور کائناتؐ کی ذات اقدس پر ختم ہوتے ہیں، ایک حضرت ابو بکرؓ کے توسط سے حضورؐ تک پہنچتا ہے۔

تصوف خود شناسی اور خدا شناسی کا نام بھی ہے اور خود فراموشی میں منزل حق تک پہنچنے کا راستہ بھی۔ اسلام میں تصوف کی کتنی گنجائش ہے؟ یہ علماء و فقہاء کے طے کرنے کی بات ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خدمت اسلام کی جن مہمات کو مسلم تلواریں اور علماء کی طلاقت لسانی سر نہ کر سکی، ان کو صوفیائے کرام کے انسانیت گیر اخلاق نے سر کر لیا۔ سجادہ تصوف کی وسعت کائنات کی پہنائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے یا نہ سمیٹ سکے لیکن خانوادہ رسالت کی محبت کے جلوے اس میں ضرور نظر آتے ہیں اور مولائے انس و جان علیؑ ابن ابی طالب سے ایک ربط بے پایاں دکھائی دیتا ہے۔ بساط تصوف کو مختصر لفظوں میں بیان کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ:

”حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ، جن پر شجر ولایت کی اہتمام ہو گئی، اسی شجر سے درخت طوبیٰ کی طرح بہت سی شاخیں نکل کر تمام عالم کو اپنے نور سے چمکا رہی ہیں اور تمام دنیا حضرت علیؑ کے نور جمال ولایت سے روشن ہو رہی ہے۔ خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد امجاد اور عالی نژاد نواسوں نے ان کمالات

(جو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمان)۔

کہنے کو تو یہ ایک ترمیمی عقیدے کی بات ہے لیکن حقیقتاً سابقین کی عظمت پر بھرپور ضرب ہے اور کھلا اعلان ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد گیارہ سو برس تک ایک تنفس بھی ایسا نہیں گزرا جو شرع اسلام سے واقف ہوتا اور سمجھ سکتا کہ یہ تمام امور بدعت ہیں۔

اور ہمارے نزدیک تو یہ صرف اہل بیت سے دشمنی کا ایک بہانہ ہے۔ دین رسولؐ کے نام لیوایہ بھی پسند نہیں کرتے کہ رسولؐ اور ان کی اولاد کا نشان تک باقی رہے۔

ابن سعود ان مظالم کی چھاؤں میں تخت سلطنت سے معزول ہو گیا اور شاہ فیصل نے اس کی جگہ لے لی، پھر شاہ خالد نے عنان حکومت سنبھالی اور اب شاہ فہد کا طوطی بول رہا ہے لیکن خدا ظالم کی رسی دراز کرتا ہے، اس کو معاف نہیں کرتا۔ آل رسولؐ اور محبان علیؑ کے دشمن اس سے قبل بھی گزرتے رہے ہیں اور آخر ان کا انجام کیا ہوا؟ لیکن رسولؐ اور ان کی اولاد کا پرچم آج بھی سر بلند ہے اور تا قیامت سر بلند رہے گا! (۹۲)



سے وراثت حقیقی اور نسبت ذاتی کے سبب پوری طرح فنیض حاصل کیا اور اپنی ذاتی عصمت کی وجہ سے باطنی حکومت کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے قاہری حکومت کو دوسروں کے سپرد کر دیا۔

علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس حقیقت نگاری کے بعد چند فارسی اشعار میں اظہار عقیدت کرتے ہیں:

”مملکت دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب وہی حضرات ہیں، حکومت ایمان کے حکام وہی حضرات ہیں۔“

حضرت نوح کی کشتی ہو یا حضرت موسیٰ کا سمندر، سب میں اللہ کے مقصود و مراد ہی حضرات ہیں۔

نور ولایت خاندان نبوت سے کبھی جدا نہیں ہوتا اور نہ آسمان ولایت ان قطبوں کے بغیر کسی اور چیز پر قائم رہ سکتا ہے۔ اہل بیت میں آنحضورؐ کا نور جلوہ نما ہے جس طرح چاند میں آفتاب کا نور ہوتا ہے۔

ازل سے ابد تک اس کا ظہور ہے کیونکہ یہ نور نور جادو دانی ہے۔ (۹۳)

سنی فقہ میں تصوف کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو محدث دہلوی نے پیش کیا ہے، دوسرا اس کی نفی کرتا ہے پھر بھی اکثریت تصوف کی قائل ہے لیکن تصوف اگر ظاہر و باطن، تزکیہ نفس اور واجبات و محرمات کی پابندی کا وہ محتدل نظام ہو جس میں ترک دنیا، ترک لذات، ترک معاشرت، ترک ذات یعنی چلہ کشی، گوشہ نشینی اور خواہ مخواہ کی خبر پوشی کو کوئی اہمیت نہ دی گئی ہو اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی ہو اور اس کا معیار حقوق اللہ اور حقوق عباد کی ادائی ہو تو مذہب شیعہ اس کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

ان حدود میں ”تصوف صفائے باطن کا نام ہے، پاکباز، متقی، شریعت کا عامل، عقائد صحیحہ کا حامل، جس کی دعائیں اثر، جس کی نگاہ میں تاثیر ہو، جو اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل کرنے کے لئے شرعی اعمال اور فقہی عبادات کا پابند ہو اور صوفی کہا جائے تو شیعوں کا کوئی فقیہ اسے برا نہیں کہتا۔“ (۹۴)

بالفاظ دیگر طریقت اگر دائرہ شریعت سے باہر نہ لگے تو اسلامی بھی ہے اور علوی بھی، ہماری تاریخ میں صرف انہیں صوفیائے کرام کی جگہ ہے جنہوں نے فقیروں کا بھیس بدل کر صرف تماشائے اہل کرم نہیں دیکھا اور اللہ کے کھوکھلے نعرے نہیں لگائے بلکہ بہلول دانا کے لب و لہجہ میں نعرہ ہائے حق بھی بلند کئے۔

اشاعت اسلام کے افق ماضی پریوں تو دنیا کے ہر حصے میں مقدس صوفیاء کے چہرے درخشاں و تابندہ دکھائی دیتے ہیں لیکن کچھ چہرے ایسے بھی ہیں جن کی پیشانیوں کی صوفضائے بسیط میں محمد وآل محمد کے نام لکھتی چلی جاتی ہے۔ ماحول اسلامی ہو یا غیر اسلامی ہو، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں، وہ ایک مصلح انسانیت بن کر کبھی راجپوتانہ کے ریگستان میں، کبھی برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں وارد ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح حضورؐ بت پرست عربوں میں شمع توحید جلانے کے لئے آئے تھے، کوئی نہیں جانتا کہ یہ رحمت بدوش انسان کس مشرب کے ماننے والے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اچانک اپنے نظریہ عقیدت کا اظہار نہیں کرتا بلکہ پہلے مقامی زبان میں گفتگو کر کے لوگوں سے بے تکلف ہوتا ہے، آہستہ آہستہ ان میں احساس انسانیت پیدا کرتا ہے پھر محمد وآل محمد سے آشنا کراتا ہے آخر میں فاران کی چوٹی سے نشر ہونے والا پیغام گوش گزار کرتا ہے۔

یہ ہیں صحیح معنی میں تصوف کے غیر فانی کردار، جنہیں ہندوستان کے ریگزار میں خواجہ معین الدین اجمیری کا نام دیا گیا، سندھ میں لعل شہباز قلندر کہا گیا اور کشمیر میں سید علی ہمدانی۔

یہ صوفی اپنے مسلک کے لحاظ سے نہ سنی تھے اور نہ شیعہ بلکہ نور وحدانیت اور جمال اسد اللہیت کے رمز آشائے تھے، ان صوفیاء کو اگر تقسیم کیا جائے تو وہ دو گروہوں میں بانٹے جاسکتے ہیں: ایک وہ جو سلسلہ خلافت کے قائل تھے لیکن علی اور آل رسول کی عظمت کے سامنے کسی کو گردانتے نہ تھے، دوسرے وہ جو عقیدہ تشیع پر ایمان رکھتے مگر دونوں میں سے کوئی غیر مسلموں کے سامنے ان اندرونی مسائل کو نہ رکھتا۔ انہیں تو توحید و رسالت اور رسالت کے ذیل میں اجرائے رسالت کو پیش کرنا تھا اور خود مسلمانوں کے مابین بھی ان متنازعہ مسائل کو رکھ کر جادہ تصوف



کو اختلافی بنانا نہیں تھا لہذا وہ عموماً صرف اپنے مسلک کی بات کرتے اور محمدؐ اور آل محمدؐ کی سیرتوں سے تجاوز نہ کرتے۔

تصوف کی شیعیت میں کوئی گنجائش نہیں پھر بھی صوفیوں میں ایک تعداد شیعوں کی بھی پائی جاتی ہے جنہوں نے اپنے حلقہ ارادت اور سجادہ تصوف کو صرف خانہ فاطمہ کی تجلیوں سے منور کیا اور اپنی تبلیغ میں چہارہ معصومین کے علاوہ کسی کے نام نہیں لئے۔

ایسے صوفیاء کے لئے بڑی مشکلات تھیں۔ حکومتیں سنیوں کی تھیں وہ اگر اہل بیت کا نام لیتے تو نہ صرف زبان کاٹی جاتی بلکہ گردن بھی اتار لی جاتی لہذا انہوں نے اپنے مسلک کو غیر متنازعہ بنائے رکھا اور خدا شاسی اور خود شاسی پر اکتفاء کرتے رہے پھر اس تعلیم کی اصلی درس گاہ کا نام لیا۔

صوفیائے کرام کی اکثریت نے عالم اسلام اور سرزمین کفر، ہر ماحول میں ذات باری کے تعارف کے ذیل میں اولاد رسولؐ کے نام روشن کئے، کس کا کیا عقیدہ تھا؟ اس کا سراغ لگانا مشکل ہے کیونکہ ہر ایک کا طریقہ کار الگ الگ تھا، وہ بظاہر دنیا کے جھمیلوں سے کٹ کر بنی نوع انسان کو انسانیت کا درس دیتے تھے اور ذہنوں کو قبولیت اسلام کے لئے تیار کرتے تھے البتہ بعض صوفیوں کا مسلک کچھ واضح ہو گیا ہے تو ان کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا ہے۔

شیعہ عقیدے کے صوفیاء کا انداز تبلیغ بھی یکساں نہ تھا ان کی ایک نظیر میں تو بہلول دانا کو پیش کیا جاسکتا ہے جن کا زمانہ کافی طویل تھا، انہوں نے سات عباسی خلفاء کا دور دیکھا اور امام جعفر صادقؑ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک کی زیارت کی۔ انہیں عارف آل محمدؐ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ بڑے اہل علم اور دانائے راز تھے۔ ہمہ وقت ایک بیخودی کے عالم میں نظر آتے مگر جہاں موقع ملتا، حقوق اہل بیت کا نعرہ بلند کر دیتے۔ لوگ توجہ سے سنتے ضرور لیکن جس کو اپنے سروپا کا ہوش نہ ہو، حکومت اس کی گرفت کیا کرتی۔

ارباب تصوف کی اس قسم میں جو اپنے عقیدے کا اظہار نہ کرتے، ایک جلی نام صفی الدین اردبیلی کا ہے جو ہلاکو کے نوں جانشین سلطان ابو سعید کے

در باری عالم بھی تھے اور جن کا حلقہ ارادت کافی وسیع تھا۔ خانقاہی حلقے کے اس عظیم درویش نے مریدوں کی ایک فوج تیار کر لی تھی جن کا وظیفہ علیؑ تھا۔ اٹھتے بیٹھتے علیؑ، سوتے جاگتے علیؑ۔ صفی الدین کے یہ مرید یقیناً مسلمان تھے مگر بجز آل محمدؐ انہیں کسی اور سے یا اقتدار سے کوئی سروکار نہ تھا اور نہ صفی الدین کے کسی جانشین نے اس کا اظہار کیا۔

عقیدے کا اظہار تو شاہ اسماعیل صفوی نے اس وقت کیا جب اس کی حکومت مضبوط ہو گئی اور وہ اپنے کو بادشاہ کہنے کے قابل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ جو صرف علیؑ کو جانتے تھے، انہیں علیؑ کو امام برحق مان لینے میں کیا تکلف ہو سکتا شیعہ درویشوں کی آخری قسم لعل شہباز قلندر اور شاہ عبداللطیف بھٹائی وغیرہ کی تھی جنہوں نے خلافت کے خلاف تو کچھ نہیں کہا مگر اپنے مریدوں کو اس راستے پر ڈالتے رہے جس میں دشمنان آل محمدؐ سے نفرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آخری قسم میں وہ صوفیاء ہیں جن کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا مگر ان کا نعرہ یہی رہا کہ بے حب اہل بیت عبادت حرام است۔ اس قسم میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں نام ہیں اور ان میں خواجہ معین الدین اجمیری سرفہرست ہیں۔

شام، ہویا لبنان، عراق، ہویا افغانستان، ایران، ہویا ترکستان، جرائر شرق الہند، ہویا ملائیشیا، کشمیر، ہویا ہندوستان، پھر برصغیر ہندوستان کا کوئی حصہ بنگال، پنجاب، راجپوتانہ، شمالی ہند یا دکن، جدر نظر اٹھتی ہے، خانقاہیں ہی خانقاہیں دکھائی دیتی ہیں اور مکران سے سندھ تک تو مقابلہ صوفیائے عظیم کی وہ کثرت ہے کہ ان کے حلقہ ہائے ارادت کا تصور کیا جائے تو شہر کے شہر بس جائیں۔

ان میں کون سنی تھا اور کون شیعہ؟ اس کی نہ تحقیق ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تحقیقی ثبوت ملتا ہے کیونکہ دشمن اہل بیت تو کوئی تھا ہی نہیں البتہ ایک معیار یہ بنایا جاسکتا ہے کہ عبادار امام مظلوم کون تھا؟ تو تذکرے جو ملتے ہیں، ان میں عباداری کا کوئی ذکر نہیں ہے، سمعی معلومات کے تحت پاکستان میں امام بری، لعل شہباز، شاہ عبداللطیف بھٹائی، عبداللہ شاہ غازی اور بعض دیگر صوفیاء کے اسمائے جمیل قابل ذکر قرار پائیں گے جن میں ملتان اور دوسرے مقامات کے صوفیوں کو



شامل کر لیا جائے تو تعداد سیکڑوں تک پہنچے گی۔

اور ہندوستان میں تو ہزاروں کی گنتی ہوگی جن میں خواجہ اجمیری، سید سالار مسعود غازی، حلہ دار علی شاہ، سید اشرف جہانگیر سمنانی، صرف نام لکھے جائیں تو پوری کتاب درکار ہوگی، ان سب نے علی اور ولایت آل رسول کے چراغ روشن کئے اور بجا طور پر ان کے تذکروں کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہوں گے جس کی سعادت کوئی اہل قلم حاصل کرے گا۔

اسلام کے ان دیوانگانِ خردمند نے شیعیت کی کوئی خدمت کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن حضور سرور کائنات کی عزت کی برگزیدگی کو کبھی فراموش نہیں کیا ہمارے نزدیک یہی شیعیت کی روح ہے لہذا ہمارے سران کی عظمتوں کے سامنے خم ہیں اور ہم ان کے تصور کو بھی موجب شرف سمجھتے ہیں۔

کہنے کو حضور سرور کائنات فقہ کے بانی اور جمیع ائمہ معصومین اس کے معمار ہو سکتے ہیں لیکن درحقیقت ہمارے امام معمار نہیں بلکہ مفسر و محافظ ہیں، معمار تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اس کی اشاعت کی اور اس پر عمل کر کے دکھایا، اس کا سلسلہ دور رسالت سے شروع ہو چکا تھا۔

”تاریخی مسلمات میں ہے کہ علی ابن ابی طالب سب سے پہلے اعلان اسلام کرنے والے، سب سے پہلے مرتب و مفسر قرآن، سب سے پہلے جامع و مرتب احادیث نبویہ ہیں۔“ (۹۵)

آپ کا مدونہ ایک صحیفہ تھا جس میں احکام قصاص، تصریح بدعات، کسی بدعتی کو پناہ دینا یا ایجاد بدعت اور مسلمانوں سے غداری وغیرہ سے متعلق اقوال درج تھے۔ یہ صحیفہ دوسری صدی ہجری تک پایا جاتا تھا۔

اسی زمانے میں بعض صحابہ نے بھی احادیث جمع کیں، جن میں ابو رافع کی کتاب سنن و احکام قضایا، حضرت سلمان فارسی کی کتاب سلمان، حضرت ابوذر غفاری کی کتاب ابوذر شامل ہیں۔ صحیفہ جابر بن عبد اللہ، رسالہ سمرہ بن جندب ان کے علاوہ تھے۔ جامع احادیث میں سعد بن عبادہ، عبد اللہ ابن عمر، عبد اللہ بن عمرو عاص، ابو ہریرہ دوسی کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔ عبد اللہ ابن عباس کا نمایاں نام بھی اسی تعریف میں آتا ہے۔

ابو رافع اہل بیت کے فداکاروں میں تھے۔ آپ کے دونوں بیٹے علی اور



عبید اللہ، امیر المومنین کے خازن بیت المال اور میر منشی تھے۔ علی بن رافع نے ترتیب ابواب کے ساتھ وضو اور صلوٰۃ سے متعلق احادیث جمع کیں۔

اصبغ ابن نباتہ مجاشعی امیر المومنین کے مخصوصین میں تھے۔ بعض فراہین علویہ آپ ہی سے منقول ہوئے ہیں۔

سلیم ابن قیس ہلالی نے اپنی معروف کتاب میں حضرت علی، سلمان فارسی، ابو ذر غفاری، مقداد اور عمار یا سر وغیرہ سے احادیث کو سن کر جمع کیا۔

حضرت سیثم ثمار نے امیر المومنین کے حوالے سے احادیث کو قلم بند کیا۔ آپ کی کتاب بڑی بلند پایہ تھی۔

محمد بن قیس بخلی نے حضرت علی سے مرویہ احادیث اور خود حضرت علی کے اقوال اپنی کتاب میں لکھے تھے۔

امیر المومنین کی بیان کردہ حدیثوں کو ابن مرہ اور عبید اللہ بن عمر جعفری نے جمع کیا۔ ربیعہ بن سبیع کی کتاب زکوة الانعام سے متعلق تھی۔

جابر ابن یزید جعفری، ابان بن تغلب، زرارہ بن اعین، ابو حمزہ شمالی، زید نرسی سلسلہ حدیث کے جلی نام ہیں جو اپنے اپنے ادوار میں مقربین بارگاہ امامت بھی رہے اور صاحبان کتب بھی۔ ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جن کو معصومین نے سند اعتبار دی لیکن راویوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو احادیث کی غلط نسبت آئمہ سے دیدیتے تھے جیسے مغیرہ ابن سعید اور ابو الخطاب۔

اس طرح مجامیع کی تعداد چھ ہزار چھ تھی لیکن آنحضرت کے بعد سے آج تک شیعان علی کا وجود ایک لحظہ کے لئے بھی برداشت نہیں کیا گیا۔ آئمہ علیہم السلام پر جو کچھ گزری وہ تو گزری ہی، عام شیعوں کو بھی بیدریغ قتل کیا جاتا رہا۔ ان کے گھروں کو بار بار جلایا گیا۔ علمی ذخائر کو برباد کر دیا گیا۔ بغداد میں شیعہ محلوں کی آتش زنی کے شعلے آج بھی اوراق تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ تلکبری شیخ معنی، سید مرتضیٰ اور شیخ طائفہ کے کتب خانوں کی آگ جاہلانہ تعصب پر نوحہ کناں ہے تاہم ہمارے جامعین احادیث کو جب کبھی زمانے نے تھوڑی سی مہلت دی تو انہوں

نے طول و عرض میں منتشر کتب کو یکجا کیا اور بمشکل چار سو کتابیں حاصل ہو سکیں جو "اصول اربعہ" کہلاتی ہیں۔ ان میں سے چوبیس اب بھی موجود ہیں۔

تدوین احادیث میں امام محمد باقر اور امام جعفر صادق کی علمی فیض رسانی کو بھی بڑا دخل ہے۔ بالخصوص امام جعفر صادق نے تو انہوں اور بیگانوں سب پر باب علوم کو وا کر دیا تھا۔ آپ کے تلمذہ کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے جن میں بسند علامہ سلیمان ندوی، امام ابو حنیفہ، امام مالک، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، شعبہ، ابو عاصم، یحییٰ انصاری بھی شامل تھے۔

شمع امامت کی ضیاء پاشی فقہ و حدیث تک محدود نہ تھی بلکہ ہر شعبہ علم کی تدریس کی جاتی تھی: فلسفہ، فلکیات، طبیعیات، کیمیا وغیرہ کے تشنگان علوم بھی آتے اور جابر ابن حیان کی طرح امام کیمیا بن جاتے۔

عظمت درس گاہ کے لئے اتنا کہنا کافی ہو گا کہ طالب علم کسی مسلک کا کیوں نہ ہوتا مگر صادق آل محمد کے حلقہ درس میں شامل ہونے کے بعد اپنے کو جعفری کہنے میں فخر محسوس کرتا اور ایک بار کوئی جعفری مشہور ہو گیا تو اس کی نسل نے اس نسبت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا حتیٰ کہ دنیا اسکو نسل سیدہ کونین سے گردلنے لگی۔

امام موسیٰ کاظم عمر کے بیشتر حصے میں گرفتار زنداں رہے اور اسی زمانے میں شیعوں کے اندر بعض اختلافات بھی پیدا ہو گئے پھر امام رضا بغداد و سامرہ منتقل ہو گئے اور یہ منتقلی حضرت جت کے دور تک طول پکڑ گئی۔ اس دوران شیعہ ایک مدو جزر کی کیفیت سے دوچار رہے تاہم اب وہ پردہ گنہامی میں نہ تھے بلکہ ایک نمایاں گروہ کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے اور اسی مناسبت سے آئمہ علیہم السلام کا فیض جاری تھا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب شیعوں کو اپنے علمی ذخیرے محفوظ کرنے کا موقع ملا اور ابو جعفر برقی، ابو جعفر کلینی، ابو جعفر صدوق اور ابو جعفر طوسی نے اپنے اپنے مجموعہ ہائے احادیث مرتب فرمائے اور ان سے "اصول" کی تدوین ہوئی۔



### ابو جعفر برقی

ابو جعفر احمد بن محمد برقی کے جد اعلیٰ جناب زید شہید کے سرفروشوں میں تھے اور دوسرے بزرگ خاصان اہل بیت میں شمار ہوتے، سب کے سب ادیب و فقیہ اور صاحبان تصانیف تھے۔ خود ابو جعفر محدث، قلم کار، تاریخ و جغرافیہ کے ماہر اور شاعر تھے۔ "المحاسن" آپ کی شہرہ آفاق تالیف ہے جو نوے ابواب میں ہزاروں صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ بعض دوسری تالیفات اور تصنیفات بھی بتائی جاتی ہیں جیسے کتاب الرجال۔

آپ نے ۲۷۴ھ میں بمقام قم انتقال فرمایا اور علم و فضل اپنی وراثت میں چھوڑ گئے۔ اسی سلسلے میں ایک نام علم الدین ابو محمد فضل بن شاذان نیشاپوری متوفی ۲۶۰ھ کا بھی آتا ہے، جنہوں نے اساسی طور پر حدیثیں جمع کیں۔

### محمد بن یعقوب کلینی

شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی ثقہ الاسلام علاقہ رے میں کلین نامی قصبے کے باشندے تھے۔ ایک عرصے تک بغداد میں رہے۔ بڑے بڑے کتب خانوں اور اکابر علماء سے استفادہ کیا اور بیس سال کی محنت سے احادیث کا وہ مجموعہ تیار کیا جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ "کافی" ہزاروں کتابوں اور لاکھوں روایتوں کا نچوڑ ہے۔ آپ نے اپنی کتاب میں سولہ ہزار نو سو احادیث جمع کی ہیں جن میں چھ ہزار چار سو بانوے حدیثیں ہر لحاظ سے مستند ہیں، باقی کو ضعیف یا تحقیق طلب کہا جاسکتا ہے صحیح اور قوی احادیث سے اصول و فروع کی مکمل رہنمائی ہوتی ہے۔

بلاشبہ "تمام شیعہ جوامع حدیث میں کافی کا درجہ سب سے مقدم مانا گیا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی ہر ہر حدیث صحیح السند اور قطعی الورد ہے۔ ہم حدیث کی کسی کتاب کو قرآن مجید کی طرح معصوم اور جرح و تعدیل کے میزان اعتبار سے بلند نہیں سمجھتے۔" (۹۶)

شیخ کلینی کے شاگردوں میں ابو الحسن احمد، محمد بن ابراہیم، صفوانی وغیرہ مشہور عصر میں سے تھے۔ ۳۲۹ھ میں وراثت پائی اور بغداد کے باب کوفہ میں دفن ہوئے

### شیخ صدوق

شیعہ جامعین حدیث میں تیسرا اہم نام شیخ ابو جعفر صدوق کا ہے۔ آپ کا خاندان بابویہ صدیوں تک علمی وجاہت کی ضمانت رہا۔

آپ کے والد ابو الحسن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قم کے وجیہ ممتاز شہری اور مشہور و با اثر عالم تھے۔ تجارت ذریعہ معاش تھا۔ راست بازی کا جوہر امتنا نمایاں ہوا کہ لوگ صدوق (بہت بڑا سچا) کہنے لگے۔ علم و عمل، فقہ و حدیث میں اتنی مہارت اور عظمت پائی کہ لوگ فتوؤں کو حدیث کا درجہ دینے لگے۔ شاید آپ ہمیشہ الفاظ حدیث ہی میں جواب دیتے ہوں گے۔ قم کی دینی ریاست کے باوجود تجارت کے سلسلے میں بغداد وغیرہ میں آمد و رفت رہتی تھی اور ان مقامات پر بھی تبلیغ دین اور نشر علوم میں حصہ لیتے تھے۔ کئی اہم کتابوں کے مولف اور مصنف ہیں۔ "۳۳۹ھ جس سال بہت ستارے ٹوٹے اور محمد سمری و کلینی نے انتقال فرمایا، اسی سال علی بن حسین بابویہ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔" (۹۷)

شیخ ابو جعفر محمد صدوق کی ولادت ۳۰۵ھ میں ہوئی، آپ نے ستر استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ندرت فکر سے آنحضرت کی احادیث کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا اور اس کا نام "المسلسلات" رکھا۔ حدیثیں بیان کرتے وقت آپ تاریخ، دن اور مقام بتا دیا کرتے تھے جو انتہائی تحقیق اور تجربہ پر ولادت کرتا ہے۔ حلقہ تدریس واسط، قزوین، بصرہ، کوفہ، نیشاپور اور مدائن تک پھیلا ہوا تھا۔ آپ کی معرکہ آرا تصنیف من لایحضر الفقیہ ہے لیکن وہ بھی وضعی حدیثوں سے پاک نہیں۔

آپ کے حلقہ تلامذہ میں شیخ مفید ابو محمد ہارون، حسین بن عبید اللہ، علی بن احمد، ابو عباس احمد بن علی بہت نامور ہوئے ہیں۔ ۳۸۱ھ میں بمقام رے انتقال فرمایا۔

رجال و احوال علماء سمیت ان کی تالیفات کی تعداد تین سو بتائی جاتی ہے جن میں من لایحضر الفقیہ بھی شامل ہے۔ تفسیر قرآن ان کے علاوہ ہے۔



### شیخ مفید

محمد بن محمد بن نعمان بغدادی، شیخ صدوق کے ارشد تلمذہ میں تھے۔ آپ ۳۲۶ھ کو واسط میں پیدا ہوئے۔ ابتدائے عمر سے بہت ذہین، نکتہ رس اور حاضر جواب تھے، مسلسل مطالعے نے آپ کے جوہر قابل کو ابھار دیا اور شیخ صدوق کے فیض نے اس پر اتنی جلا کی کہ افق احادیث و فقہ کا درخشندہ ستارہ بن گئے۔

عملی زندگی میں آئمہ معصومین کی تاسی میں کوشاں رہتے، رات بہت تھوڑی دیر سوتے پھر عبادت یا مطالعے میں مصروف ہو جاتے۔

آپ کی عمر کا بڑا حصہ بغداد میں گزرا، محلہ کرخ کی مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ایک مسجد میں مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تھا اور ہمہ تن علوم اہل بیت کی اشاعت اپنا شعار بنالیا تھا۔ ان کا کتب خانہ کئی بار لوٹا گیا مگر اپنے بانی کی برکت نیت سے پھر بھی باقی رہا۔

آپ کی تصانیف کی تعداد دو ڈھائی سو بتائی جاتی ہے۔ ۴۱۳ھ میں انتقال فرمایا

### سید مرتضیٰ

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے والد ماجد سید شریف حسین بن موسیٰ حقیقتاً نقیب الطالبین تھے اور والدہ گرامی فاطمہ بنت حسین عابدی ہر لحاظ سے مومنہ تھیں۔ رجب ۳۵۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، آپ کے چھوٹے بھائی سید رضی مولف پنج البلاغہ چند سال بعد پیدا ہوئے۔

فاطمہ بنت حسین کو بڑی تمنا تھی کہ ان کے بیٹے علوم دین میں یکتائے زمانہ ہوں۔ غالباً انہوں نے سیدہ عالمیان سے دعا کی ہوگی، چنانچہ مشہور ہے کہ ایک رات شیخ مفید نے خواب دیکھا کہ جناب معصومہ دونوں کو لائی ہیں اور فرما رہی ہیں کہ ان دونوں کو فقہ پڑھا دو۔ صبح کو شیخ نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ ایک برقعہ پوش معظّمہ دروازہ مسجد پر نمودار ہوئیں جن کے ساتھ دو بچے تھے، انہوں نے شیخ سے درخواست کی کہ انہیں اپنے حلقہ تلامذہ میں داخل کر لیں۔

شیخ نے اس کو سیدہ کو نین کا حکم قرار دیا اور ہاتھ پھیلا کر دونوں بچوں کو

خوش آمدید کہا۔ یہ بچے سید مرتضیٰ اور سید رضی تھے۔

شیخ کی تربیت اور دونوں بھائیوں کی صلاحیت کہ وہ علم و تقویٰ کے آفتاب بن گئے اور آج تک سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، السید الشریف، ذوالمجدین، ذوالتمنین کے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں اور سید رضی کو یہ شرف حاصل ہے کہ مدون خطبات و مکتوبات امیر المومنین کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

سید مرتضیٰ کا مدرسہ علم و فقہ کا گہوارہ تھا اور کتب خانے میں اسی ہزار کتابیں موجود تھیں۔ دونوں بھائی درس و تدریس کو بھی عبادت قرار دیتے اور مستحق طلباء کی مدد بھی کرتے تھے۔

۲۵ ربیع الاول ۴۳۶ھ کو سید مرتضیٰ نے وفات پائی۔ سید رضی کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کاظمین میں شیخ مفید اور سید رضی کی قبروں کے نزدیک سید مرتضیٰ کی ابدی آرامگاہ بنی ہوئی ہے۔

### ابو جعفر محمد طوسی

شیخ ابو جعفر محمد طوسی، شیخ الطائفہ کتب اربعہ میں دو کتابوں کے مولف ہیں فردوسی کی سرزمین طوس آپ کا وطن تھا۔ اسی مقام پر ۳۸۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والد حسن بن علی اپنے عہد کے شیخ المحدثین تھے، لہذا بچپن سے عنفوان شباب تک کا زمانہ گھریلو تعلیم و تربیت میں گزرا پھر بغداد پہنچے جہاں محلہ کرخ میں مسجد نقطویہ نحوی میں اصول کافی کا درس ہوتا تھا۔ شیخ مفید کا مدرسہ اور سید مرتضیٰ کا جامعہ اتنی بڑی درس گاہیں تھیں کہ جیسے علوم کے دریا بہتے ہوں۔ ان کو دیکھ کر شیخ طوسی کے قدموں میں ایک زنجیر سی پڑ گئی اور ۴۰۸ھ سے آپ نے بغدادی سکونت اختیار کر لی۔

یوں تو شیخ طوسی نے کتنے ہی بزرگوں سے استفادہ کیا لیکن شیخ مفید اور سید مرتضیٰ سے بڑا فیض حاصل کیا۔ حصول علم کی لگن اور ذہانت نے جلد ہی اتنی صلاحیت پیدا کر دی کہ شیخ مفید کی ایک کتاب کی شرح کرتے ہوئے تہذیب الاحکام "لکھنا شروع کر دی۔ ۴۳۶ھ میں جب سید مرتضیٰ نے وفات پائی تو آپ مسند مفید و سید کے وارث قرار پائے۔



تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ درس و تدریس بھی شیخ طوسی کا محبوب مشغلہ تھا مگر شیعوں کا قسمتی مدوجزر انہیں بھی متاثر کئے بغیر نہ رہا۔ بنی ہودہ کا زوال شروع ہوتے ہی محلہ کرخ پر آفت آگئی۔ سچو تھی صدی ہجری کی تیسری دہائی میں مدارس، مساجد اور کتب خانے جلا دیئے گئے۔ پھر قادر باللہ کے دور میں ۳۶۲ھ میں تینتیس مسجدیں اور تین سو دوکانیں نذر آتش کی گئیں اور بیس ہزار آدمی مارے گئے۔ رجب ۳۹۸ھ میں شیخ طوسی کو ذاتی طور پر نقصان پہنچایا گیا۔ ان کی بے عزتی کی گئی..... اس کے بعد سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ سلطان محمود نے مجد الدولہ کا وہ کتب خانہ پھونک دیا جس میں شیعہ اور معتزلہ عقائد کا بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ پھر غزنوی اور سلجوقی تسلط نے شیعوں کو بنی امیہ کا زمانہ یاد دلایا۔ انسانی جانوں اور رہنے کے مکانات سب پر غارت گری کی گئی۔

شیخ طوسی کی درس گاہ اور ان کا سارا سامان جلا دیا گیا، شیعہ خوف و ہراس کے عالم میں ترک سکونت کرنے لگے ایسے میں ۴۲۸ھ میں شیخ بھی تنگ آکر نجف اشرف منتقل ہو گئے۔

باب مدنیۃ العلم کی سرزمین علم و عمل کی سرزمین تھی۔ شیخ طوسی نے وہاں نئے سرے سے تدریس و تصنیف کی زندگی کا آغاز کیا اور ایک حلقہ درس قائم کیا جو آج تک باقی ہے۔ فی الحال حکومت عراق کے ظلم کے سبب یہ مدرسہ بند ہے ۲۲ رجب ۴۶۰ھ کو پچھتر سال کی عمر میں آپ نے انتقال فرمایا اور اپنے سکونتی مکان میں دفن ہوئے۔

ایک بیٹا ابو علی حسن اور دو بیٹیاں آپ نے یادگار چھوڑیں۔ بیٹیوں کی اولاد میں رضی الدین علی بن طاووس اور محمد بن ادریس نامور علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ تلامذہ کی تعداد تین سو بتائی جاتی ہے جن میں ابو الصلاح تقی الدین حلبی، قاضی ابن سراج طرابلسی، شیخ سلیمان بن حسن، ابو ابراہیم اسمعیل بن محمد، ابو اسحق بن محمد قمی، حافظ شہید شیخ ابو علی محمد اور آدم بن یونسفی بہت معروف ہیں۔

"شیخ طوسی کا محور تحقیق شش پہل تھا: قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ، رجال و کلام، ہر موضوع پر انہوں نے کتابیں لکھیں جن کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ کتاب

تہذیب اور کتاب استبصار آپ کی مہتمم بالشان تصانیف ہیں۔ یوں تو ہر کتاب محقق طوسی کی فاضلانہ بصیرت کی شہادت دیتی ہے مگر موخر الذکر دونوں کتابیں احادیث سے متعلق ہیں اور کافی اور من لہ محضر کی شمولیت میں ہماری کتب اربعہ کو مکمل کرتی ہیں۔" (۹۸)

شیخان علی کی احادیث کا یہ ذخیرہ بظاہر بہت کافی معلوم ہوتا ہے لیکن وہ لئے لئے اور جملے جملے سرمایے کا باقی الصالحات ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے امام جعفر صادق کا یہ ارشاد پیش نظر رکھنا ضروری ہو گا۔ آپ نے فرمایا:

"مغیرہ بن سعید نے میرے پدر عالی مرتبت کے اصحاب کی کتابوں میں کچھ ایسی حدیثیں خفیہ طور پر بڑھادی ہیں جو انہوں نے بیان نہیں کی تھیں لہذا خدا سے ڈرو اور ہم سے منسوب کی ہوئی احادیث کو قبول نہ کرو جو حکم خدا اور سنت رسول کے خلاف ہوں۔"

خود حضورؐ نے پہلے ہی اس کی پیشین گوئی فرمادی تھی:

"میرے بعد غلط روایت کرنے والوں کی کثرت ہوگی جو بھی مجھ سے کوئی غلط حدیث منسوب کرے گا وہ اپنی جگہ جہنم میں بنائے گا۔" (۹۹)

ہمارے جامعین احادیث محقق طوسی اور شیخ صدوق دونوں نے کوشش کی کہ غیر معتبر حدیثوں کا انتخاب نہ کریں لیکن زمانے کی دست برد سے بچا کچھا اثاثہ تھا ہی تھوڑا لہذا وہ وضعی احادیث سے دامن بچانہ سکے اور انہیں خود اپنی منتخبہ حدیثوں میں سے ایک تعداد کی تردید کرنا پڑی۔ اس طرح ہزاروں احادیث میں سے مستند حدیثیں ایک تہائی سے زائد نہیں رہیں جن پر ہمارے ایمان کی عمارت کھڑی ہوئی ہے اور یہی وہ اثاثہ روایات ہے جس پر نہ حنبلیت کے جھکوڑے اثر کر سکے اور نہ وہابیہ کے طوفان۔

تحقیق طلب احادیث پر بعد کے علماء نے کام کیا جو ہر دور میں ظلمت شکن رہے اور جن کے نام آج بھی بقائے عقیدہ کی ضمانت ہیں۔

شیخ ابو الفتح محمد بن علی صاحب کز الفوائد ۴۴۹ھ میں اور بعض دوسرے اکابر اس سے قبل گزر چکے تھے، شیخ طوسی کے بعد چھٹی صدی ہجری سے گیارہویں صدی



ہجری تک باب مدینہ العلم کی سرزمین، کربلا، کاظمین، حله اور دوسرے مقامات پر علوم اہل بیت کی شمعیں روشن ہوتی رہیں اور اکابر علماء کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور اس کے بعد چودہویں صدی ہجری تک ایک نظر ڈالی جائے تو علماء کی گنتی لاکھوں میں ہوگی۔ ان میں وہ مشاہیر بھی ہیں جن کی عظمت کے سامنے اپنے آپ کو اپنے غیروں کے سر بھی جھک جاتے ہیں۔

ابو الفتوح رازی حسین بن علی متوفی ۵۵۹ھ صاحب تفسیر روض الجاں اور امین الدین ابو علی فضل بن حسن طبرسی متوفی ۵۴۸ھ مولف تفسیر مجمع البیان اسی عہد کے عالم ہیں۔

### نصیر الدین طوسی

ان میں ایک روشن نام شیخ الاسلام نصیر الدین ابو جعفر محمد بن محمد کا ہے جو ساتویں صدی ہجری کی دوسری دہائی میں بمقام طوس پیدا ہوئے۔ آپ ہیئت داں اور مجتہد بھی تھے۔ اسمعیلی خلیفہ ناصر لدین عبد الرحیم کی ملازمت میں تھے۔ خلیفہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر قلعہ الموت میں نظر بند کر دیا۔ ۶۵۳ھ میں ہلاکو خان کے حملے کے وقت آپ اسی قلعے میں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حسن بن صباح کے جانشین شیخ رکن الدین خورشید کو گرفتار کرنے میں تاتاریوں کو آپ سے مدد ملی تھی لہذا ہلاکو خان نے خوش ہو کر آپ کو وزارت کے عہدے پر فائز کر دیا۔

لیکن حقیقتاً ہلاکو کا قاعدہ تھا کہ جس مقام کو وہ تاراج کرتا، وہاں کے علماء کو یرغمال بنا کر ساتھ رکھتا۔ نصیر الدین طوسی بھی اسی تعریف میں تھے جن کے جوہر قابل سے ہلاکو متاثر ہو گیا اور اس نے آپ کی قدر افزائی کی۔

”اور یہ محقق طوسی کی عالمانہ بصیرت تھی جس نے تاتاریوں کی نظر میں اہل بیت کا وقار بلند کر دیا اور مشاہد مقدسہ ان کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچ گئے پھر تاتاری آل رسول کے حلقہ بگوش ہونا شروع ہو گئے اور انہوں نے شیعوں کو اپنے اقتدار میں شامل کر لیا۔“ (۴۰)

شیخ الاسلام نصیر الدین طوسی متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں اصول عقائد پر آپ کی دو کتابیں بہت اہم ہیں۔

### علامہ حلی

ابو القاسم جعفر بن حسن بن یحییٰ بن سعید المعروف بہ علامہ حلی کا زمانہ بھی تقریباً وہی ہے۔ آپ ۶۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الثانی ۶۷۶ھ میں بمقام حله انتقال فرمایا۔

آپ ساری عمر جہاد بالقلم اور جہاد باللسان کرتے رہے۔ فقہ میں شرایع الاسلام اور مختصر النافع، اصول دین میں المعارج آپ کی بلند پایہ تصانیف ہیں اور تاتاریوں کو حلقہ بگوش اسلام بنانا آپ کا بے مثال کارنامہ ہے۔

اس تسلسل میں بعض جلیل القدر علماء کے اسمائے گرامی ناقابل فراموش ہیں: شیخ الاجل محمد بن شیخ الطائفہ متوفی ۴۹۴ھ، شیخ ابو جعفر محمد بن ابی القاسم آملی متوفی ۴۴۰ھ، ابو المکارم حمزہ بن علی الحلبي متوفی ۵۸۵ھ، ابو جعفر محمد بن علی الحلبي متوفی ۵۸۸ھ، شیخ ابن ادریس محمد بن احمد علی متوفی ۵۹۸ھ، شیخ اجل ابو الفضل شاذان قمی متوفی ۶۱۸ھ، شیخ الفقہاء ابو ابراہیم محمد بن جعفر ربیعہ اللہ متوفی ۶۳۵ھ، شیخ الفقیہ جعفر بن محمد متوفی ۶۵۰ھ، صاحب الکرامات السید رضی الدین بن طاووس متوفی ۶۶۳ھ۔

آیہ اللہ المطلق شیخ جمال الدین علامہ حلی متوفی ۷۲۶ھ بھی انہیں میں شامل ہیں۔ انہوں نے تبلیغ دین کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور غیر مسلم تاتاریوں کو شیعہ بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

نصیر الدین کاشانی علی بن محمد متوفی ۷۵۵ھ، فخر الحققین، محی الدین محمد بن حسن متوفی ۷۷۱ھ، تاج الدین السید الموید الجلیل عالم نسابہ محمد بن قاسم نجفی متوفی ۷۷۹ھ بساط شیعیت کی چند اہم شخصیات ہیں۔

### شہید اول

افقہ الفقہاء، الشہید اول المحروق محمد بن جمال الدین صاحب ”لمعہ فی الفقہ“ ایک روشن نام ہے جن کا زہد و تقویٰ مختلف العقائد لوگوں میں بھی مسلم تھا۔ ان کے ایک ہم جماعت ابن جماعہ، قاضی دمشق نے انہیں قید میں ڈلوادیا۔ پھر ۹ جمادی



الاول ۸۶۶ھ کو حاکم شام کے حکم سے پھانسی دیدی گئی اور لاش کو نذر آتش کر دیا گیا

زین الدین، شیخ فقیہ ابو الحسن حارثی متوفی ۸۲۰ھ، فاضل مقداد ابو عبد اللہ المقداد نجفی صاحب، کنز العرفان متوفی ۸۲۶ھ جمال المساکین الشیخ الزاہد احمد بن محمد متوفی ۸۲۶ھ، شیخ شمس الدین محمد شامی متوفی ۸۳۱ھ کے اسمائے گرامی کے بعد ایک زندہ جاوید نام ثقت الاسلام نور الدین علی بن علی، المحقق کرکی متوفی ۹۳۷ھ کا ہے

### شہید ثانی

شہید ثانی، شیخ جلیل زین الدین علی بن محمد، صاحب شرح لمعہ، ترکی میں ۹۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ عام زندگی میں فضائل اہل بیت بیان کرتے رہے جس سے لوگ متاثر ہوتے۔ اس کی شکایت مکہ سے سلطان سلیمان پاشا تک پہنچی اور سلطان کے حکم سے مکہ ہی میں چالیس روز تک قید رکھے گئے پھر قسطنطنیہ بھیج دیئے گئے جہاں ۹۶۶ھ میں شارع عام پر قتل کئے گئے۔ لاش تین روز پڑی رہی پھر سمندر میں پھینک دی گئی۔

محمد احمد بن محمد اردبیلی مدفون نجف اشرف ۹۹۳ھ، عالم جلیل محمد علی بن محمد شارح اصول کافی متوفی ۱۰۰۰ھ، مولانا جمال الدین حسن بن علی، فرزند شہید ثانی متوفی ۱۰۱۱ھ، چند نامور علماء ہیں۔

### شہید ثالث

ہندوستان میں شیعہ علماء کب سے پہنچنا شروع ہوئے؟ یہ شیعوں کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے لیکن سب سے پہلے جس نام نے شہرت دوام حاصل کی وہ قاضی نور اللہ شستری کا ہے۔ آپ ۹۵۶ھ میں بمقام شوستر پیدا ہوئے۔ ۹۹۵ھ میں بعہد اکبری وارد ہندوستان ہوئے حکیم ابو الفتح گیلانی کے ذریعے دربار تک پہنچے اور لاہور کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔

جہانگیر کے زمانے میں اگرہ آکر مقیم ہو گئے۔ اسی زمانے میں بعض حاسد علماء نے باہم سازش کر کے آپ کے ایک رسالے الخاق الحق میں کچھ اضافے کئے جو جہانگیر کے مرشد سلیم چشتی کے لئے ہتک آمیز تھے۔ یہ رسالہ خاموشی سے جہانگیر کے

سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے غیظ و غضب میں آکر چالیس علماء سے قتل کے فتاوے لئے۔ قاضی شستری نے اس تحریر سے اپنی لاعلمی قاہر کی مگر اسے قبول نہیں کیا گیا۔

صابر و شاکر ہو کر جب حضرت نور اللہ شستری دور رکعت نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو آخری سجدے سے سر اٹھاتے ہی جلاوٹے علماء کی موجودگی میں آپ کی زبان گدی سے کھینچی، پھر پگھلا ہوا سیسہ زبردستی پلا دیا گیا، عالم بے ہوشی میں خاردار درے لگوائے گئے اور آخر میں سر قلم کر دیا گیا۔ ۱۸ جمادی آخر ۱۰۱۹ھ یوم جمعہ کو مذاہب اربعہ کا یہ عالم "شہید ثالث" کے درجے پر فائز ہو گیا۔

قاضی نور اللہ کی بے گناہی زبان زد عام تھی مگر غصہ و عصبیت اور محلاتی سازشیں اپنا کام کر گئیں۔

کہا جاتا ہے کہ ملکہ نور جہاں نے ان تمام علماء کو ایک دعوت میں یکجا کر کے اور مرغین کھانے کھلانے کے بعد تہہ تیغ کر دیا تھا مگر یہ چربیا لے ہوئے ونبہ تہجد گزار سید کے خون کا بدل تو نہ ہو سکتے۔

ایشیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان علماء میں ایک نام محسن فیض کاشانی کا ہے جو ایک جلیل القدر عالم اور فیض کاشانی کے بیٹے تھے، ۱۰۰۷ھ میں بمقام کاشان پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علوم آل محمد حاصل کرنے کے لئے شیراز پہنچے۔ شیخ ماجد، ملا صدرا، شیخ بہائی، محمد طاہر قمی، شیخ محمد مازندرانی، شیخ سلیمان شیرازی سے فیض حاصل کیا، جوہر قابل دیکھ کر ملا صدرا نے داماد بنالیا۔ آپ محدث فلسفی، متصوف تھے، ۱۰۹۲ھ میں انتقال فرمایا۔

ایک بیٹے محمد کو یادگار چھوڑا جو علم الہدی کے نام سے مشہور ہیں، تلمذہ کی ایک طولانی فہرست ہے، تصانیف تقریباً دو سو ہوں گی جن میں صافی، اصفی اور کتاب الوافی کو خصوصیت حاصل ہے۔

محمد بن حسین شیخ الاسلام شیخ بہائی متوفی ۱۰۴۱ھ ایک نامور عالم گزرے ہیں جن کا دور محسن فیض سے پہلے کا تھا۔ ان کے بعد کتنے ہی برگزیدہ علماء کے نام آتے ہیں جن میں ایک نام شیخ حر عاملی کا ہے۔ آپ کا پورا نام شیخ حسن بن علی تھا اور



سلسلہ نسب حضرت عرب بن یزید الریاحی سے جا کر مل جاتا تھا۔ جبل عامل کا قریہ مشعر خاندانی وطن تھا۔ اسی مقام پر ۸ رجب ۱۲۳۳ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔  
خاندان کے علماء سے آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر طوس آئے مگر علمی ماحول نے واپس نہ جانے دیا۔

سادہ مزاج عبادت گزار، حق گو، فقیہ و محدث، خطیب و ادیب تھے۔ ۲۱ رمضان ۱۲۴۲ھ کو وفات پائی۔ آپ کی بیشتر تصانیف تحقیقی اور وقیع ہیں۔ تفصیل وسائل الشیعہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔

یہی زمانہ علامہ مجلسی کا بھی ہے جن کے دور کو ثقہ الاسلام کلینی کے عہد کی نشاۃ ثانیہ کہا جاسکتا ہے بلکہ علامہ کلینی نے دین کی جو عمارت کھڑی کی تھی، اس کو استحکام مزید اسی دور میں ملا۔

مقصود علی مجلسی ایک تاجر پیشہ بزرگ تھے جن کا خاندان جبل عامل سے ہجرت کر کے اصفہان میں آباد ہو گیا تھا۔ انہوں نے محمد تقی اور محمد صادق دو بیٹے چھوڑے۔ ان دونوں نے علامہ عبد اللہ شستری سے علوم دین حاصل کئے۔

### علامہ مجلسی

علامہ محمد تقی مجلسی (۱۲۰۳ھ تا ۱۲۷۰ھ) میں حدیث و فقہ کے متبحر عالم تھے۔ ان کے گھر میں ۱۲۳۷ھ میں محمد باقر مجلسی کی ولادت ہوئی۔ آپ نے عالمانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ دو بڑے بھائی ملا عزیز اللہ متوفی ۱۲۷۲ھ اور ملا عبد اللہ بھی تھے اور بہنیں بھی عالمہ اور فاضلہ تھیں لہذا سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے علم و عمل کا سابقہ رہتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے محمد باقر مجلسی طب و منطق فلسفہ و ریاضی، حدیث و فقہ، لغت و ادب، قرآن و تفسیر میں باکمال ہو گئے۔

آپ کو استاد جو ملے وہ بھی یگانہ عہد: حسن علی بن عبد اللہ، سید محمد حیدر طباطبائی، میر محمد مومن اور علامہ محسن فیض۔ ماحول نے صلاحیت پر جلا کی تو تصنیف و تالیف میں لگ گئے، حکومت کی طرف سے قدر افزائی نے حوصلوں کو بڑھا دیا اور ایک ہزار سال میں تمام علماء نے جتنا کام کیا تھا، فرد واحد نے اس کا کام تہتر سال کی عمر میں کر دکھایا۔ بحار الانوار آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے، مراۃ العتول فی

شرح الکافی میں آپ نے مستند اور ضعیف احادیث پر رائے زنی کی ہے۔ ۱۱۱۱ھ میں انتقال فرمایا۔

آپ کے حلقہ درس میں شامل ہونے والے یوں تو سیکڑوں ہیں چند معروف ناموں میں علامہ سید نعمت اللہ جمری، مرزا عبد اللہ آفندی، ملا عبد اللہ اردبیلی، ملا محمد فاضل، ملا محمد بن حسن اصفہانی اور ملا محمد حسین بن یحییٰ نوری ہیں۔  
علامہ مجلسی تلمذہ کی طرح کثیر الاولاد بھی تھے۔ چار بیٹوں اور تین بیٹیوں کی نسل مشہور ہوئی۔

مولانا محمد صالح شارح اصول کافی متوفی ۱۲۸۰ھ، مربی الفقہاء والمحدثین حسین بن محمد متوفی ۱۲۹۸ھ علامہ مجلسی سے پہلے کے عالم تھے۔ بعد کے لوگوں میں فاضل ہندی شیخ جلیل محمد بن حسن صاحب کشف اللثام متوفی ۱۱۳۷ھ، علامہ مازندرانی، شارح دعاء الصباح متوفی ۱۱۷۳ھ، محقق بہمانی متوفی ۱۲۰۸ھ، آیت اللہ و صاحب الکرامات سید محمد مہدی متوفی ۱۲۱۲ھ قابل ذکر ہیں۔

اسی سلسلے میں شیخ عبد اللہ بن نور اللہ بحرانی بھی آتے ہیں۔ علامہ محمد رضا بن عبد اللطیف بھی جنہوں نے الشافی حدیث آل المصطفیٰ لکھی، شیخ اکبر جعفر بن شیخ خضر نجفی مصنف کشف الغطاء متوفی ۱۲۲۸ھ بھی اور فقیہہ جلیل مرزا قمی ابوالقاسم بن محمد مصنف قوانین الاصول متوفی ۱۲۳۱ھ بھی۔

### بعض علمائے اکابر

اکابر علماء کے کچھ مزید اسمائے گرامی مرتضیٰ حسین فاضل نے "مطلع انوار" میں تحریر فرماتے ہیں:-

میرزا اسمعیل ہمدانی دسویں صدی ہجری، میر باقر داماد متوفی ۱۲۴۱ھ، امیر حسن طالقانی بارہویں صدی ہجری، شیخ ابراہیم گیلانی مرشد خاندان صفویہ، سید ابراہیم بن محمد باقر صاحب ضوابط الاصول متوفی ۱۱۶۳ھ، الحاج ابوتراب بارہویں صدی ہجری، ابوطالب ابن تراب بارہویں صدی ہجری، بہاء الدین گیلانی اور باقر بن محمد حارثی بارہویں صدی ہجری، میر تقی مشہدی وقاضی جعفر بارہویں صدی ہجری حبیب اللہ مرزا جان متوفی ۹۹۴ھ، حسن عراقی وارد سندھ دسویں صدی ہجری، حسن



بن عبدالرزاق و مہدی بن ابوالقاسم شہرستانی و نور الدہر گیلانی و نصیر الدین بیضاوی و حلجی نصیر شیرازی گیارہویں و بارہویں صدی ہجری، شیخ مہدی کاتب، سید مہدی ابن ہدایت اللہ اصفہانی۔

اس سلسلے میں بعض جلی نام اور بھی ہیں:-

شیخ یونس سید العلماء میر محمد ابراہیم قزوینی محمد اسماعیل شیرازی و محمد امین شیرازی و محمد تقی مشہدی و محمد حسین مازندرانی و محمد حسین نبیرہ محمد باقر و اخوند مسیحافسانی و محمد علی قاسمی و محمد قاسم بن خیر اللہ حسنی و حسینی و شیخ الاسلام محمد مسیح گیارہویں و بارہویں صدی ہجری، عبد اللہ تسری متوفی ۱۲۲۱ھ، میرزا محمد بن ابو تراب حسینی متوفی ۱۲۰۰ھ، حسینی گلستانہ متوفی ۱۲۰۰ھ، شیخ علی بن محمد تاجی و عنایت اللہ گیلانی و سید قاسم نجفی و قرام الدین محمد قزوینی و کمال الدین فسوی و محمد گیلانی سراب و شیخ محمد بحرینی و محمد بن صالح قزوینی کاشف الاسرار و حسین خونساری و امیر زین العابدین انصاری و رضی الدین بن آقا حسین خونساری و شرف الدین علی دست غیب و عبدالرزاق نجفی و عبدالکریم اردکانی گیارہویں و بارہویں صدی ہجری فضل اللہ مازندرانی، محمد صادق اردستانی متوفی ۱۳۳۲ھ، شمس الدین بن فاضل مجتہد، محمد سعید گیلانی، عالمی جعی، ملا محمد صالح مازندرانی متوفی ۱۲۹۸ھ، شیخ صالح بن عبدالکریم بحرانی متوفی ۱۲۹۸ھ، سید عباس بن علی مکی مولف نزمۃ المجالس متوفی ۱۱۸۰ھ میر تقی مشہدی۔

بعض عظیم علماء کے نام نامی کتابوں کی ورق گردانی سے اور دستیاب ہونے ہیں جنہوں نے علوم اہل بیت کے چراغ روشن کیے:-

قطب الدین محمود رازی متوفی ۷۹۹ھ، کمال الدین حسین طیب متوفی ۹۷۴ھ، محمد بن حسن طوسی قمی، عبد اللہ تسری، حسن بن الفضل متوفی ۵۶۸ھ، شیخ حسین عالمی متوفی ۹۸۲ھ، سید شریف جرجانی متوفی ۸۱۶ھ، سید تقی الدین، افضل قاسمی وغیرہ۔

علاوہ اوحید شیخ احمد جرجانی متوفی ۱۱۵۰ھ، آقا جمال الدین خونساری ۱۱۵۵ھ، شیخ اسماعیل، حلجی محمد طاہر محدث، سید محمد طاہر خاتون آبادی، میرزا محمد طاہر بن

مرتضیٰ طباطبائی وغیرہ کے تسلسل میں دہلی کے شیخ اسلام محمد حسن نبیرہ شہید ثانی متوفی ۱۱۹۳ھ کا مقدس نام آتا ہے۔

علمائے عظام کے اس بے ترتیب سلسلے کو چھوڑ کر اگر ماضی کے افق پر ہر شہر کو دیکھا جائے تو شیعوں کے بسنے اور اجر کرنے کے ساتھ ساتھ علماء کا عروج و زوال بھی نظر آئے گا اور وقت کی مساعادت اور نامساعدت سے ان کے مجاہدانہ کارناموں کا احاطہ بھی ہو سکے گا لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ صفحات تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو واقعات کے اتار چڑھاؤ میں چمکتی ہوئی تلواروں اور سیاسی تدبیر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر علماء کا کام تو جنگ و جدل سے بچ کر تمدن پر اپنے گہرے نقوش قدم بنانا ہی ہوتا ہے اس لئے ہم صرف ان کی موجودگی اور نقل و حرکت کا اندازہ ہی کر سکتے ہیں۔

اس زاویہ نگاہ سے مکہ، مدینہ یا پورے حجاز کو دیکھا جائے تو خود اولاد رسول ہی ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئی تھی، شیعوں کی سرپرستی کون کرتا لہذا شیعہ شہروں کے بجائے قبائل ہی میں پائے جاتے رہے اور بہت کم لوگوں کو قالم حکومتوں نے مکہ یا مدینہ میں بسنے دیا البتہ یمن میں شیعہ آبادیاں غلطے بھی پائی جاتی تھیں اور آج بھی موجود ہیں اور شیعہ علماء بھی۔

عراق میں کوفہ شیعوں کا سب سے بڑا شہر تھا مگر وہ کئی بار شیعوں سے خالی کرایا گیا پھر آباد ہوا، بحالت موجودہ کوفہ اور مضافات کوفہ میں ہر طرف شیعہ ہی شیعہ ہیں اور اسی سبب سے علماء دینی رہنمائی کے لئے سکونت پذیر ہیں۔

بغداد وہ مقام ہے جس کے گلی کوچوں میں سادات کا خون بہایا گیا، شاہی محلات کی دیواروں میں اولاد رسول چنی گئی، قید خانوں میں ان کی لاشوں کے انبار لگائے گئے پھر بھی وہاں بہت سے دینی مدرسے ہیں جن میں مدرسہ مرجانیہ کو ایک امتیاز حاصل ہے۔ علماء بھی ایک بڑی تعداد میں اقامت پذیر ہیں جن کا تعلق کاظمین کر بلانے معلیٰ اور نجف اشرف سے ہے۔

حلد شیعان علی کی ایک منفرد آبادی ہے جس کو سیف الدولہ صدقہ بن منصور مزیدی نے آباد کیا تھا۔ اس مردم خیز شہر نے بڑے بڑے عالموں کو پیدا کیا



جن کے نام مذہب اہل بیت کی سطوت کا نشان ہیں۔ ابن ادریس، علمائے آل طاؤس، آل سعید، مجد الدین محمد بن طاؤس، شیخین ابن عرندس، ابن القیم، سید مہدی، سید حیدر وغیرہ وغیرہ۔

کر بلا کا نام ہی بقائے دین کی ضمانت ہے۔ شیخ یوسف البحرانی صاحب حدائق، محمد باقر بیہانی شارح المفاتیح، خاندان مرزا محمد، میر علی طباطبائی صاحب ریاض سید محمد مجاہد، علامہ کبیر، بحر العلوم طباطبائی وغیرہ وغیرہ جن کی گنتی دشوار ہے

نجف اشرف کا عظیم نام ویدہ دل کو روشن کر دیتا ہے۔ شیخ الطائفہ کے سجادہ علوم کی وسعت یہاں سے ہند، ایران، افغانستان اور افریقہ تک پھیل چکی ہے۔ علماء کے اسمائے گرامی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

اس کے ذیل میں ایک اہم ترین نام کا نظمیں کا ہے۔ شیخ اسد اللہ التستری صاحب مقائیس، سید محسن الاعرجی صاحب محمول، شیخ محمد حسن آل یاسین، شہید الورع ابراہیم بن محمد، شیخ جابر، عبدالحسین کاظمی۔

سامرا سلسلہ امامت کا آخری مرکز ہے۔ جہاں سید مرزا حسن شیرازی نے علوم کے چراغ روشن کئے جو آج تک اپنی روشنی پھیلا رہے ہیں۔

بصرہ اہل تشیع کا قدیم مستقر رہا ہے لیکن تاریخ نے ہمیشہ اس کو کوفہ کی سطح پر پایا ہے اور اسی مناسبت سے ہر دور میں شیعہ اور علماء دونوں پائے گئے۔

شام اور شیعہ بظاہر دو متضاد لفظ ہیں لیکن حضرت ابوذر غفاری نے وہاں اہل بیت کے لئے زمین ہموار کی تھی پھر اسیران کر بلائے اپنی مظلومیت کے جھنڈے گاڑ دیئے، صداقت اندر ہی اندر رنگ دکھاتی رہی اور دمشق سے نکل کر حلب و بعلبک اور دوسرے مقامات پر اثر انداز ہوتی رہی۔ حلب میں بنی زہرہ اور آل حمدان سے سیکڑوں علماء گزرے ہیں جنہوں نے شیعیت کی اشاعت کے لئے عمریں وقف کر دیں اور مخالفین سے بڑے بڑے مناظر کئے۔

جبل عامل حضرت ابوذر غفاری اور علماء کی سرزمین ہے جس کی عظمت کے لئے شہید اول اور شہید ثانی کے نام کافی ہیں۔ شیخ حسن بن شہید ثانی اور بہت سے

اکابر علماء یہاں کی خاک سے پیدا ہوئے۔ شیخ ابراہیم یحییٰ، شیخ علی خاتونی، سید ابوالحسن بن سید حیدر، شیخ حسن سلیمان، شیخ محمد حر، الاسعد علی بک وغیرہ کے نام علمی سر بلندی کی ضمانت ہیں۔

بعلبک بھی اسی طرح کا مردم خیز خطہ ہے۔ وہاں کے امراء بھی اہل علم ہوئے ہیں جن میں ایک جلی نام امیر موسیٰ حر فوشی کا ہے۔ امیر محمد اور ابن محصوم وغیرہ بھی اسی سلسلے کے عالم ہیں..... شیعیت کے پھیلتے ہوئے دامن میں بحرین کے علماء کے اسمائے گرامی زندہ رہیں گے۔

مراقش و مصر میں شیعہ علماء نے جو کارنامے انجام دیئے وہ عراق و عجم کے علماء سے کم نہیں ہیں۔

نام گنوانے ہی پر اکتفا کی جائے تو بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں جید علماء کی گنتی ہزاروں سے تجاوز کر جاتی ہے جو عراق و ایران اور ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔

ان میں سے برصغیر کے ممتاز علماء و فقہاء کی ایک فہرست مرتضیٰ حسین فاضل نے "مطلع انوار" میں شامل کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان و قلم کے ان مجاہدوں نے بڑے شہروں سے نکل کر دوسرے مقامات پر بھی اہل بیت کو متعارف کرایا اور تاریکی میں پڑے ہوئے نام نہاد مسلمانوں کو روشنی دکھائی۔

ملا علی کھمبات متوفی ۶۵۰ھ، ملا شاہ محمد طاہر احمد نگر متوفی ۹۵۲ھ، ملا فتح اللہ شیرازی گجرات متوفی ۹۹۷ھ، ملا احمد ٹھٹھوی بن نصر اللہ فاروقی صاحب تاریخ الفی وغیرہ لاہور مدفون بمقام مکی سندھ ۹۹۶ھ، حکیم ابو الفتح گیلانی صاحب، شرح اخلاق ناصری وغیرہ حسن ابدال متوفی ۹۹۷ھ، ابو الفضل و فیضی، پیشوائے اعظم محمد مومن حیدر آباد دکن متوفی ۱۲۲۱ھ، ملا سید شریف بن شہید ثالث آگرہ متوفی ۱۲۲۰ھ، ملا سید علاء الدولہ بن شہید ثالث آگرہ متوفی ۱۲۵۰ھ، ملا محمد سید شریف بن شہید ثالث آگرہ متوفی ۱۲۵۰ھ، ملا محمد شفیع یزدی گوالیار متوفی ۱۲۸۱ھ، ملا نظام الدین محمد مدنی حیدر آباد متوفی ۱۲۸۶ھ، ملا شمس الدین محمد بن علی حیدر آباد، ملا شیخ محمد بن کمال الدین بحرینی حیدر آباد متوفی ۱۲۸۸ھ، ملا شیخ احمد بن صالح بحرینی حیدر آباد جنہیں



اورنگ زیب نے جلاوطن کیا، متوفی بمقام شیراز ۱۱۲۴ھ، ملا سید علی خان حیدر آبادی لاہور متوفی بمقام شیراز ۱۱۸۰ھ، ملا محمد سعید مازندرانی دہلی لاہور مونگیر متوفی ۱۱۱۶ھ، ملا محمد رفیع مشہدی دہلی متوفی ۱۱۲۳ھ، ملا اسد اللہ بن ملک برخوردار مکی سندھ متوفی ۱۱۴۲ھ، شیخ محمد علی حزیں بنارس متوفی ۱۱۸۰ھ، ملا محمد عسکری جوہپور ۱۱۹۰ھ، سید قمر الدین اورنگ آباد متوفی ۱۱۹۵ھ، ملا محمد علی بادشاہ فیض آباد متوفی ۱۱۹۵ھ کے اسمائے گرامی لوح تاریخ پر ثبت ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگیاں صرف اسی مقصد کے لئے وقف کر دی تھیں کہ نامساعد حالات میں بھی اعلائے کلمۃ الحق کرتے رہیں۔

احمد بن حسین خوانی صاحب شرائع الاسلام اورنگ آباد متوفی ۱۰۹۵ھ، احمد الشیخ مہذب الدین صاحب الرسالہ الاعتقادیہ بصرہ اور حیدر آباد متوفی ۱۰۸۵ھ، احمد بن محمد شیخ کی نبیرہ شہید اول دکن اور مکہ معظمہ متوفی ۱۱۱۰ھ، سید ابو المعالی بن شہید ثالث بنگال متوفی ۱۰۴۶ھ، ملا ابراہیم لاہور متوفی ۱۰۶۰ھ، نواب ابراہیم خان صاحب بیاض ابراہیمی گوجرانوالہ متوفی ۱۱۲۱ھ، ابو الحسن تانا شاہ حواشی تفسیر کشاف دولت آباد متوفی ۱۱۱۱ھ وغیرہ کے نام تبلیغ شیعیت کے لئے یادگار ہیں جن میں ایک نام امین الدین خاں حسین صاحب رشحات الفنون مکی سندھ متوفی ۱۱۲۷ھ بھی شامل ہے۔

ان اسمائے گرامی میں مندرجہ ذیل نام شامل کیے جائیں تب بھی فہرست مکمل نہ ہوگی۔

احمد ربیعہ شیخ احسانی گجرات و دکن متوفی ۱۱۳۷ھ، احمد الجزائری صاحب شرح ارشاد، حیدر آباد متوفی ۱۱۰۴ھ ملا احمد الاعراج صاحب حل غائتہ البیان متوفی ۱۳۰۱ھ، سید باقر حسین مترجم مقتل ابی مخنف جوہپور متوفی ۱۳۲۰ھ، اولاد حسین امرہوی صاحب نیرنگ زمانہ متوفی ۱۳۳۸ھ، اولاد حیدر فوق بلگرامی صاحب اسوۃ الرسول متوفی ۱۳۳۸ھ۔

تیرہویں صدی کے مبلغین اسلام کے نام مختلف مقامات پر آتے رہے ہیں چند نام ان مقدس بزرگوں کے اور درج کئے جاتے ہیں:-

احمد بیہانی حاشیہ صمدیہ بنام محمودیہ وغیرہ اودھ اور حیدر آباد متوفی ۱۲۳۵ھ

شیخ احمد یحییٰ صاحب نغمتہ الیمن بھوپال بمبئی بنارس پونا متوفی ۱۲۵۶ھ، احمد حسین زنگی پوری حاشیہ شمس بازغہ متوفی ۱۲۷۲ھ، راجہ امداد علی خان صاحب، منہج السداد کنتور متوفی ۱۲۹۲ھ، سید امداد علی صاحب بحر المصاب کیرانہ ضلع مظفر نگر متوفی ۱۲۹۰ھ، مرزا ابو طالب اصفہانی و لکھنوی کھٹہ متوفی ۱۲۲۰ھ، ابو علی امرہوی صاحب بادی الخلفین باندہ متوفی ۱۲۷۲ھ، مرزا باقر علی دہلوی صاحب فضائل مرتضوی میرٹھ متوفی ۱۲۹۰ھ، ملا محمد جواد ۱۲۷۴ھ، مولانا حشمت علی خیر اللہ پور متوفی ۱۲۵۳ھ، اعجاز حسین کنتوری لکھنؤ متوفی ۱۲۸۶ھ، ابو القاسم تسری حیدر آباد متوفی ۱۲۲۳ھ، اولاد حسین شکوہ آبادی صاحب انوار الربوبیہ لکھنؤ متوفی ۱۲۶۲ھ، سید احمد علی صاحب تحفۃ المعجزات محمد آباد ضلع اعظم گڑھ متوفی ۱۲۹۵ھ۔

برصغیر میں چودھویں صدی ہجری میں بعض صاحبان تصانیف ہیں، ان کے مقدس نام کبھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔

شیخ امراد علی صاحب متاع الاخرہ لکھنؤ متوفی ۱۳۱۴ھ، شیخ احمد دیو بندی صاحب اسرار الہدی دیوبند متوفی ۱۳۱۵ھ، شیخ احمد علی برستی صاحب اختلاف البخاری برست ضلع کرنال متوفی ۱۳۱۶ھ، ارشاد حسین جوہپوری حاشیہ برتھہ جوادیہ لکھنؤ متوفی ۱۳۳۱ھ، سید آغا خلیف زین العابدین مولف الحقیقۃ الخلفاء الہ آباد متوفی ۱۳۲۱ھ، آفتاب حسین دہلوی استاد مولانا مقبول احمد لاہور متوفی ۱۳۲۱ھ، حاجی آل محمد امرہہ متوفی ۱۳۲۵ھ، ابو الحسن (ابو صاحب) مصنف بحث نبوت متوفی کر بلائے معلیٰ ۱۳۱۳ھ، ابو القاسم حائری مفسر قرآن مجید لاہور متوفی ۱۳۲۳ھ، باقر مہدی لکھنوی صاحب مجموعہ خطوط عربیہ متوفی ۱۳۳۸ھ، احمد علی دفاخانی تفسیر قرآن مجید انگریزی مدراس متوفی ۱۹۷۰ھ، شیخ بادشاہ حسین تفسیر قرآن مجید انگریزی بسواں ضلع سیٹاپور متوفی ۱۳۵۶ھ، علامہ سید علی حائری لاہور متوفی ۱۳۶۳ھ، ابو الحسن (میرن صاحب) مخزن طہارت حیدر آباد متوفی ۱۳۴۰ھ، ابو الحسن کشمیری صاحب اسعاف المامول لکھنؤ متوفی ۱۳۴۲ھ، ابو الحسن (منن صاحب) مؤلف التجزی فی الاجتہاد لکھنؤ متوفی ۱۳۵۵ھ، ابو الحسن بن سید مقبول حسین گوپال پور بہار ۱۳۹۴ھ، ابن حسن جاسی مؤلف الرائے السدید فی مسائل الاجتہاد لکھنؤ متوفی ۱۳۶۴ھ، سید احمد کبیر



مسلخ عزالہ اور ۱۳۶۰ھ، احمد حسین خان نوشیہ مولف تاریخ احمدی پریانواں رائے بریلی متوفی ۱۳۶۸ھ، امجد حسین صاحب جوتہ المعارف آلہ آباد متوفی ۱۳۵۰ھ، امداد امام اثر صاحب المصباح الظلم پٹنہ متوفی ۱۳۵۳ھ، امداد حسین کاظمی مترجم قرآن مجید گجرات پنجاب متوفی ۱۳۹۵ھ، مرزا احمد علی دستور العمل اسلام لاہور متوفی ۱۳۹۰ھ، ابرار حسین پاروی خطیب متوفی حیدرآباد ۱۳۷۵ھ، علامہ ابن حسن جارحوی مصنف فلسفہ آل محمد کرلہی ۱۳۹۳ھ، مرزا مہدی آغا پویا متولدیز و مترجم قرآن مجید انگریزی متوفی کرلہی ۱۳۹۳ھ، اظہر حسین زیدی مولف خطیب آل محمد، مولانا سعادت حسین خان تاریخ مصائب الشیعہ متوفی لکھنؤ۔

اولاد رسول کے یہ ترجمان اگرچہ ایک مخصوص خطہ ارض سے تعلق نہیں رکھتے لیکن حقیقتاً اس سلسلے کی ایک کڑی تھے، علمائے سلف نے جس کو مدنیہ، نجف، کربلا، کاظمین اور قم سے مربوط کر دیا تھا، لہذا کسی کو کسی جگہ تک محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس کو جہاں موقع ملا، اس نے وہاں خیر شکن کا نعرہ اور عباس کا علم بلند کر دیا۔ حضرت حجت کے بعد سے آج تک ان گنت عارفان حقیقت گزر چکے ہیں۔ ان میں سے ایک تعداد وہ بھی ہے جس کو کوئی نہیں جانتا۔ جن کے نام سنیہ بسنیہ روایتوں سے یا معتقدین کی قلم کاری کے طفیل ہم تک پہنچے ہیں، ان میں نعمت اللہ جزائری متوفی ۱۱۱۲ھ میر محمد صالح خاتون آبادی، محمد بن علی یوسف بحرانی، سید ہاشم بن سلیمان متوفی ۱۲۰۷ھ، بھی شامل ہیں اور ان کے بعد وہ نام ہیں جن کی عظمتوں کے سامنے آج بھی ہماری گردنیں خم ہو جاتی ہیں۔

### علامہ طبرسی اور دیگر علماء

حسین بن محمد تقی طبرسی ۸ شوال ۱۲۵۳ھ کو نور، طبرستان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے کسمپرسی کے عالم میں علامہ محمد علی محلاتی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ۱۲۷۸ھ میں عراق کے ساکن ہو گئے، کربلا میں شیخ العراقین عبدالحسین طہرانی سے، نجف میں شیخ مرتضیٰ انصاری سے فیض حاصل کیا، ۲۰ جمادی الاخر ۱۳۲۰ھ کو نجف میں انتقال فرمایا۔

مستدرک الوسائل، مستدرک بحار، النعم الثاقب اور میزان آپ کی محرکات تصانیف ہیں۔ مجلسی ثانی کہے جاتے ہیں۔

سید عبد اللہ شہر ۱۱۸۸ھ میں بمقام نجف پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے پدر محترم سید محمد رضا عابدی سے حاصل کی پھر سید محسن اعرجی اور شیخ کبیر سے استفادہ کیا ۱۲۳۲ھ میں کاظمین میں وفات پائی۔

جامع المعارف آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے جو دو سو اکہتر احادیث کی شرح پر مشتمل ہے۔

شیخ عباس قمی متوفی ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ، سفینۃ البحار کے مصنف ہیں۔ آپ نے چھوٹی بڑی ڈیڑھ سو کتابیں تحریر فرمائیں جن سے علوم اہل بیت کی صراحت و وضاحت ہوتی ہے۔

شیخ ابو علی حائری صاحب منتہی المقال، شیخ الحدیث آقا عبد اللہ مامقانی، آیت اللہ سید حسن الصدر، ہمارے سجادہ علم کے روشن چراغ ہیں۔

### غفران مآب

حضرت غفران مآب سید دلدار علی صاحب عماد الاسلام متوفی لکھنؤ ۱۲۳۵ھ، سید مہدی خلف غفران مآب متوفی ۱۲۳۰ھ احمد بن مولانا مہدی متوفی ۱۲۳۳ھ، سید المفسرین سید علی خلف غفران مآب صاحب تفسیر توضیح المجید اردو متوفی ۱۲۵۹ھ، مفتی سید محمد قلی کنتوری صاحب تشبیہ المطاعن و تقلیب المکائد متوفی ۱۲۶۰ھ، فقیہ کبیر شیخ محمد حسن نجفی مصنف جواہر الکلام، سید العلماء سید حسین خلف غفران مآب متوفی ۱۲۷۳ھ، عمدۃ العلماء سید محمد ہادی بن سید مہدی متوفی ۱۲۷۵ھ، سید مرتضیٰ بن سلطان العلماء متوفی ۱۲۷۷ھ، رئیس العظیم مرتضیٰ بن امین مصنف الرسائل و المکاتب متوفی ۱۲۸۱ھ، ملک العلماء بندہ حسن بن سلطان العلماء مترجم قرآن مطابق تفسیر آئمہ، ان سب نے سرزمین اودھ کو فضائل آل محمد سے آشنا کیا اور علوم اہل بیت کی وہ شمعیں جلائیں جن کی روشنی میں علماء کا کارواں ہدایت آگے بڑھتا رہا اور بھولے بھٹکے مسافروں کو کربلا و نجف کا راستہ دکھاتا رہا۔



### علمائے مابعد

ان کے علاوہ تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری میں علمائے حق کی ایک بڑی تعداد مسلک اہل بیت کی اشاعت میں ہمہ تن مصروف نظر آتی ہے جن میں سے بعض کے نام ملاحظہ کیلئے پیش ہیں:-

شیخ ابراہیم رشتی، ابوتراب قزوینی، اسمعیل خاتون آبادی، امین الدین اودے گیر، بہاء الدین بن محسن عالی، جعفر الاعظم، شیخ جعفر شستری، حسن آل یسین، سید حسن بجنوری، سید حسن شہرستانی، مرزا حسین خلیل، سید حیدر، شیخ خلیل اللہ طالقانی، ملا رضا شیخ رضا المظفر، ملا شاہ محمد اصفہانی، عبد علی بن حسین، عبد الکریم اردکانی، مرزا عبد اللہ شیرازی، عبد الوہاب مازندرانی، سید عبد الہادی، علاء الدین محمد گلستانہ، شیخ علی چوقانی، شیخ علی گنا آبادی، شیخ علی آل کاشف الغطاء، علی بن مرزا خلیل طہرانی، شیخ علی رضا قزوینی، لطف اللہ خوئی، لطف اللہ شیرازی، لطف اللہ مازندرانی، سید محمد ترک، سید محمد فیروز آبادی، محمد بن رضی، محمد اسمعیل یزدی، محمد حسین مازندرانی، محمد حسین بن علی ہمدانی، محمد حسین بن ہاشم کاظمی، محمد شریف کر بلائی، محمد علی طہرانی، محمد مہدی نجفی، سید محمود جوتی، مرزا محمد ہاشم نجف، محمد یوسف استرآبادی، نوح بن قاسم جعفری، مرزا نصیر اللہ مشہد، ملا محمد اکبر ترشیزی، محمد باقر صوفی، محمد باقر طباطبائی، محمد تقی بن محمد باقر، شیخ محمد جعفر نجفی، سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب خلق غفران مآب متوفی ۱۲۸۲ھ، ممتاز العلماء سید محمد تقی بن سید حسین متوفی ۱۲۸۹ھ

جن علماء کے سین وفات معلوم ہو سکے ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

آغا بزرگ محسن طہرانی متوفی ۱۳۸۹ھ، ابراہیم کلباشی متوفی ۱۲۶۲ھ، ابوتراب خوشناری متوفی ۱۳۳۶ھ، ابو القاسم طباطبائی متوفی ۱۳۰۸ھ، شیخ احمد احسانی متوفی ۱۲۲۳ھ، سید احمد نجفی متوفی ۱۳۵۶ھ، اسد اللہ بن سید محمد باقر اصفہانی متوفی ۱۲۹۰ھ، سید اسمعیل صدر متوفی ۱۳۳۸ھ، جمال الدین گہا لکانی متوفی ۱۳۴۴ھ، سید جواد تبریزی متوفی ۱۳۸۴ھ، حسن بن جعفر متوفی ۱۲۶۲ھ، سید حسین حمای نجف متوفی

۱۳۴۹ھ، مرزا حسین نجف ۱۳۲۶ھ، مرزا حیرت متوفی ۱۳۱۴ھ، مرزا خلیل متوفی ۱۳۲۶ھ، ملا ورنندی متوفی ۱۲۸۵ھ، شیخ زین العابدین مازندرانی متوفی ۱۳۰۹ھ، ملا محمد تقی برغانی متوفی ۱۲۶۳ھ، ابو نصر رضی الدین طبرسی، شیخ عباس آل کاشف الغطاء متوفی ۱۳۲۳ھ، شیخ عباس قمی متوفی ۱۳۵۹ھ، عبد الباقی بن ملا صالح مازندرانی، عبد الحسین شرف الدین متوفی ۱۳۴۴ھ، عبد الحسین رشتی متوفی ۱۳۴۳ھ۔

علمائے کرام کے چند مزید نام جن کے سین وفات تحریر ہیں:-

عبد الکریم زنجانی متوفی ۱۳۸۸ھ، سید علی آل بحر العلوم متوفی ۱۲۹۸ھ، سید علی صاحب ریاض المسائل متوفی ۱۲۳۱ھ، مرزا علی ابن ابیہد حسن شیرازی متوفی ۱۳۵۵ھ، محمد باقر موسوی متوفی ۱۳۳۰ھ، محمد باقر اصفہانی ۱۲۹۰ھ، مرزا محمد تقی شیرازی متوفی ۱۳۳۸ھ، شیخ محمد جواد بلاغی متوفی ۱۳۵۲ھ، شیخ محمد جواد لبنان متوفی ۱۴۰۰ھ، محمد حسین مازندرانی متوفی ۱۳۰۴ھ، محمد حسین شہرستانی متوفی ۱۳۱۱ھ، محمد حسین بن محمد خلیل شیرازی متوفی ۱۳۳۹ھ، شیخ محمد رضا آل یسین متوفی ۱۳۴۱ھ، محمد صادق بحر العلوم متوفی ۱۳۹۹ھ، شیخ محمد طہ نجف متوفی ۱۳۲۳ھ، محمد علی سکاکی، محمد علی شہرستانی متوفی ۱۲۴۹ھ، شیخ موسیٰ بن جعفر متوفی ۱۲۳۱ھ، آقائے نائنی محمد حسین مرزا متوفی ۱۳۵۵ھ۔

علی نقی بن حسن طباطبائی متوفی ۱۲۸۹ھ، شیخ الشریعت فتح اللہ اصفہانی متوفی ۱۳۳۹ھ، سید کاظم رشتی متوفی ۱۲۵۹ھ، محسن الامین العالی متوفی ۱۳۴۱ھ، محسن بن خضر متوفی ۱۲۴۰ھ، محسن بن عیسیٰ النجفی، شیخ محمد حسن جواہر الکلام متوفی ۱۲۶۶ھ، محسن حسین یزدی متوفی ۱۳۰۵ھ، محمد حسین بن عبد الرحیم حائری متوفی ۱۳۶۲ھ، شیخ مرتضیٰ انصاری متوفی ۱۲۸۱ھ، سید مصطفیٰ کاشانی، شیخ آل کاشف الغطاء، سید مہدی شہرستانی متوفی ۱۲۱۶ھ،

علامہ کبیر سید محمد قزوینی متوفی ۱۳۰۶ھ، محمد بن محمد باقر نجفی متوفی ۱۳۰۶ھ، شیخ الفقیہ محمد حسن بن المولیٰ عبد اللہ مامقانی متوفی ۱۲۲۳ھ، الزاید الورع المجدد میرزا محمد حسن شیرازی متوفی ۱۳۱۲ھ، آیتہ اللہ الشیخ میرزا حسین میرزا خلیل متوفی ۱۳۲۲ھ، استاذ العلماء شیخ غراسانی محمد کاظم متوفی ۱۳۲۹ھ۔



یہ تمام اکابر ملت اسی عہد میں عراق و ایران میں تحفظ شیعیت کرتے رہے۔ ان علماء کا ہندوستان سے ایک مضبوط رابطہ تھا۔ لکھنؤ کے بیشتر علماء نجف و کربلا سے علوم کے خزانے لے کر آتے اور ہمالہ سے اس کماری تک پھیلے ہوئے مسلمانوں میں لٹاتے رہتے۔

### علمائے لکھنؤ

ان میں فردوس مآب سید حامد حسین متوفی ۱۳۰۶ھ۔۔۔ صاحب عبات الانوار بھی ہیں۔ آپ کی عظیم تالیف رجال، حدیث و درایت کا شاہکار ہے۔ اسی دور کا ایک روشن نام سید محمد عباس کا بھی ہے جو بہت سے نامور شاگرد چھوڑ کر ۱۳۰۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

شمس العلماء سید محمد ابراہیم بن سید محمد تقی متوفی ۱۳۰۶ھ، زبدۃ العلماء سید علی نقی بن سید حسین متوفی ۱۳۰۹ھ، سید ابو صاحب متوفی ۱۳۱۳ھ، ملاذ العلماء سید ابوالحسن عرف پنچھن خلف اکبر سید بندہ حسن متوفی ۱۳۰۸ھ، تاج العلماء سید علی محمد بن سلطان الغطاء متوفی ۱۳۱۲ھ، عماد العلماء سید مصطفیٰ میر آغا بن عمدة العلماء متوفی ۱۳۲۳ھ، سید محمد حسین خلف اکبر سید بندہ حسن متوفی ۱۳۲۵ھ، سید ابوالقاسم قی فقیہ و مفسر متوفی ۱۳۲۳ھ، سید محمد تقی بن سید محمد ابراہیم متوفی ۱۳۲۰ھ۔

افقہ الفقہاء سید محمد باقر متوفی ۱۳۲۶ھ، قدوة العلماء سید آقا حسن متوفی ۱۳۲۸ھ بھی اسی بساط پر تبلیغی سرگرمیوں کے فعال عالم ہیں جن کا سلسلہ عہد حاضر تک پہنچ جاتا ہے۔

یوسف الملتہ سید یوسف حسین نجفی امروہوی متوفی ۱۳۵۵ھ، سید محمد ہادی متوفی ۱۳۵۷ھ، ظہور الملتہ سید ظہور الحسن متوفی ۱۳۵۹ھ، نجم الملتہ سید نجم الحسن متوفی ۱۳۶۰ھ، سید سبط نبی نوگانوواں سادات متوفی ۱۳۵۸ھ، مفتی محمد علی متوفی ۱۳۶۱ھ، افقہ زمان سید سبط حسین جو پور متوفی ۱۳۷۲ھ، عمدة العلماء سید کلب حسین متوفی ۱۳۸۳ھ۔ سید حسین بن سید محمد ہادی متوفی ۱۳۸۵ھ، مفتی احمد علی متوفی ۱۳۸۹ھ، مولانا سید علی واعظ مولانا سلطان علی واعظ مولانا اکبر مہدی سلیم جرولی، مولانا آغا مہدی، مفتی نصیر اللہ جہادی، مولانا مصطفیٰ جوہر، علامہ رشید ترابی کرلہی، سعید الملت محمد سعید لکھنوی، بشیر انصاری، نجم الحسن کراروی، حافظ

کفایت حسین، کتنے ہی عالم ہیں جنہوں نے زندگیاں مقصد حسینی کے لئے وقف کر دیں اور بے شمار اہل علم ہیں جو ان سب کے نقوش قدم پر چل رہے ہیں۔ ناصر الملتہ سید ناصر حسین، علامہ سید علی نقی اور ڈاکٹر مجتبیٰ حسین اس دور کے وہ عالم تھے جنہوں نے بڑے گہرے نقوش قدم چھوڑے ہیں۔

نجف، کربلا، کاظمین، قم اور دوسرے مقدس مقامات پر تبلیغ و تدریس اپنے اپنے انداز پر جاری ہے۔ ہمارے علماء ہمہ تن علوم آل محمد کی اشاعت میں مستغرق ہیں۔ جو شخصیتیں مقاصد حیات پورے کر کے جا چکی ہیں ان کے نام ماضی قریب کے افق پر درخشاں ہیں جن میں آیت اللہ شیخ جوادی بلاغی، شیخ الشریعت علامہ اصفہانی متوفی ۱۳۳۹ھ، شیخ عبداللہ بن شیخ محمد حسن مامقانی متوفی ۱۳۹۱ھ، آیت اللہ عبداللہ بن شیخ محمد حسن مامقانی متوفی ۱۳۵۱ھ علامہ مرزا حسین نائنی متوفی ۱۳۵۵ھ، مجتہد اعظم سید حسین بروجردی متوفی ۱۳۸۰ھ، مجتہد اکبر سید ابوالحسن اصفہانی متوفی ۱۳۶۵ھ، شیخ ضیاء الدین عراقی مجدد اصول فقہ متوفی ۱۳۶۶ھ اپنے اپنے عہد کے روشن مینار تھے اور فی زمانہ آقائے شریعت مدار اور آقائے ابوالقاسم خونی علوم اہل بیت کا علامہ ہیں۔

آیت اللہ آقائے محسن الحکیم طباطبائی متوفی ۱۳۹۱ھ آقائے باقر الصدر شہید اور آیت اللہ روح اللہ خمینی بانی انقلاب ایران اس سلسلے کی آخری کڑیاں ہیں جن کی بعد رشد و ہدایت کی بساط پر نامور علماء کے نئے چہرے ابھرتے جا رہے ہیں۔

ان علماء نے کن کن حالات میں جہاد باللسان اور مجاہدہ بالقلم کیا، ان کی تفصیل ایک مکمل موضوع ہے لیکن ایک حقیقت مسلم ہے کہ ان میں سے اکثریت عالم یا عمل تھی۔ ان کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اہل بیت کے حلقہ بگوش ایسے ہیں تو خود اہلیت کرام کیا ہوں گے!

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیہ اولیٰ ہو جس کی فقیری میں شان اسد الہی یقیناً وہ ایک بوریہ نشین کے نائب تھے لیکن تاج و تخت ان کی نگاہوں میں بیچ فرمانروائی بے قیمت تھی وہ اپنے مقتدیان دین کی تاسی میں لوگوں کو بزور شمشیر



سرتنگوں کرنے کے بجائے ذہنی انقلاب سے دلوں کو مسخر کرتے اور حقیقت کی روشنی دکھا کر آنکھوں پر پڑے ہوئے باطل کے پردے ہٹا دیتے تھے۔

شیعہ زمان و مکان کے فصل سے اکثر و بیشتر ایمان کی آزمائشوں میں مبتلا رہے لیکن ہمارے علماء نے ان ادوار ابتلاء میں بھی ہانی بن عروہ، حجر بن عدی اور سیثم تمار کو یاد رکھا اور ان کی زبانوں نے اعلائے کلمۃ الحق میں کمالت نہیں کی۔ نتیجے میں جو ان سے ملتا وہ اپنے مقام پر جا کر سوچتا: کتنے غلط رنگ میں دکھائی گئی تھی اسلام کی تصویر ہمیں، حقیقت کیا ہے اور بتایا کیا گیا تھا۔ انجام کار خود بخود ایک تطہیر قلب کا عمل واقع ہو جاتا اور حرا بن یزید الریاحی کی طرح کوئی نہ کوئی لشکر شام سے نکل کر فوج حسینی میں شامل ہو جاتا۔

یہی سب کچھ دیکھ کر عوام کو منع کیا گیا کہ خبردار مجلسوں میں نہ جانا۔ اس سے بعض صحابہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ ممانعت فہم سے بالاتر ہے اور ان کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نام نہاد اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ مجلسوں میں جانے سے شاید یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ وہاں حقائق ایمان بیان کئے جاتے ہیں مہینہ کرداروں پر چرچا ہوا ملمع اتر جاتا ہے اور اصل تصویریں سامنے آ جاتی ہیں۔

کیا ستم ظریفی ہے کہ اسلام انسانوں کو انسان بنانے کے لئے آیا تھا اور یہاں اسلام کو انسانوں سے چھپایا جاتا ہے، پیغام جن کے نام تھا انہیں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے..... اس کے برعکس صحیح اسلام کے پیرو ہر ایک کی بات سننے کے لئے آزاد ہیں۔ ان پر ایسی کوئی پابندی عاید نہیں کی جاتی کہ کسی مکتبہ فکر کے عالم کی تقریر نہ سنیں بلکہ روکنے کے بجائے ترغیب دی جاتی ہے کہ سنیں ضرور تاکہ ان کو جھوٹ سچ کا اندازہ ہو سکے۔

بات صرف مجالس کی نہیں ہے بلکہ قصیدہ خوانی کی محفلوں اور ماتم کے اجتماعات سے بچنے کی تاکید بھی کی جاتی ہے۔ نام نہاد خلفائے بنی امیہ و بنی عباس نے اگر مدح اہل بیت کرنے والوں کی زبانیں قطع کرائیں تو اس کے اسباب تھے لیکن یہ ادوار گزر جانے کے بعد علماء کی حق گوئی اور شعراء کی مدح سرائی سے کسی کی

حکومت پر ضرب تو نہیں پڑتی پھر کیوں اولاد رسول کا بیان سننے پر قدغن لگائی جاتی ہے شاید صرف اس لئے کہ کعبے کے بت شکن کا نام لینے سے تاریخ کا صنم کدہ مسمار نہ ہو جائے اور صدیوں سے مسلسل تراشے ہوئے بت اچانک منہ کے بل گر نہ جائیں۔

وضعی اسلام کے اجارہ دار اگر یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہماری باتوں پر کان نہ دھریں گے تو وہ نہ دھریں مگر دوسروں کو کیوں روکتے ہیں کہ وہ بھی حقیقت سے نا آشنا ہیں..... بغض صحابہ پیدا ہونے کا خدشہ کس لئے لاحق ہے۔ صحابہ کو تو ہم بھی مانتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ بڑی سے بڑی غلطی کو طرفداری میں خطائے اجتہادی قرار دے دیتے ہیں ہم صادق و امین مکہ کے غلام جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ کہہ دیتے ہیں۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس نے غلط روی اختیار کی، اس کو غلط کہیں۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ میزان صفین کے دونوں پلے برابر۔ خلیفہ وقت بھی برحق اور خلیفہ پر حملہ کرنے والا بھی حق پر۔ خلیفہ پر تبرا کرنے والا بھی صراط مستقیم پر اور خود خلیفہ لائق تبرا ہونے کے باوجود قیامت تک کے لئے خلیفہ! دونوں میں سے کوئی برا نہیں۔

آپ یقیناً جانتے ہیں کہ ہر آدمی اس ہٹ دھرمی کو ماننے پر تیار نہ ہو گا اسی لئے منع کرتے ہیں کہ جہاں ایسی باتیں ہوتی ہوں وہاں نہ جایا کریں۔

ہمارے علماء اور فصحاء انہیں حقائق کو سامنے رکھ کر فیصلہ مخالف پر چھوڑ دیتے تھے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جب رسول کی نیابت کے لئے شوریٰ کی شرط رکھی گئی تھی تو پھر حضرت ابو بکر کے بعد حضرت عمر کی نامزدگی کیسی اور جب باغ فدک مال مسلمین قرار پایا تھا تو حضرت عثمان نے اپنے بیٹے اور داماد کو کیوں دے دیا پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بنی فاطمہ کو واپس کر دیا اور بعد کے سلاطین نے دوبارہ کیوں ضبط کر لیا..... آخر فیصلہ کون سا صحیح تھا؟

اسی طرح کے کتنے ہی مسائل ہیں جن سے واقفیت کے بعد لوگ ان کے حل تلاش کرتے رہتے اور لا جواب ہو کر صراط مستقیم پر آ جاتے۔ یہ کارنامہ ہے ہمارے علماء، فقہاء، فصحاء اور شعراء کا کہ تلواروں کی چھاؤں میں بھی وہ آل محمد کی صداقت کو سر بلند کرتے رہے۔ کس نے کس کو سیدہ کونین کی عظمت سے



روشاس کرایا، کس نے کس کو علی کا حلقہ بگوش بنایا؟ یہ حقائق صدیوں کی گرد میں چھپے ہوئے ہیں لیکن تاریخ نے یہ ضرور دیکھا کہ جن علاقوں میں اپنے کو علی کا دوست کہنا گردن زدنی تھا وہاں جب اہل بیت کا نعرہ بلند کیا گیا تو بھیانک ماحول کے سنائے میں چاروں طرف سے لبیک لبیک کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور ہر قسم کا ظلم و ستم برداشت کرنے کے باوجود آج بھی ہماری تعداد ساری دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کا بیس سے پچیس فیصد تک ہے۔

اس میں علماء کرام کی مساعی کے ساتھ ساتھ دوسرے عوامل کی کار فرمائی ضرور ہے لیکن اساسی طور پر اس کو علماء کی جدوجہد اور معجز بیانی کا نتیجہ ہی قرار دیا جائے گا۔

اکابر کے ناموں کی یہ فہرست سورج سے اس کی شعاع لے لینے کے مترادف ہے۔ تفصیلی کارناموں کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں کیونکہ انہوں نے نہ صرف حقوق آل محمد ادا کئے بلکہ بنی نوع انسان کی وہ خدمتیں بھی انجام دیں جن کے لئے خلاق عالم نے حضرت آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تھا۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان عظیم المرتبت علماء نے مختلف شعبہ ہائے علوم و فنون پر اپنے دائمی نقوش ثبت کئے ہیں۔ آیت اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء نے سرسری طور پر گروہ تابعین پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے اور بعض نام گنوائے ہیں جو ایک طرح کا خلاصہ تحریر ہے۔

"احنف بن قیس، سدید بن غفلہ، عطیہ عوفی، حکم بن عتیبہ، سالم ابن ابوالجعد، علی ابن جعد، حسن ابن صالح، سعید ابن جبیر، اصبح ابن نباتہ، سلیمان ابن مہران، اعمش اور یحییٰ ابن یعمر عدوانی وغیرہ۔"

"ان کے بعد تبع تابعین کی وہ سربرآوردہ شخصیتیں ہیں جنہوں نے علوم اسلامی کی تاسیس کی، جیسے ابوالاسود دؤلی واضح علم نحو، خلیل ابن احمد موجد فرہنگ و عروض، ابو مسلم معاذ ابن مسلم الہراء موسس علم صرف، جنگی شیعیت کا اعتراف سیوطی نے بھی کیا ہے (الہر مزجلہ ۳)۔"

"یعقوب ابن اسحق عربی ادب کے پیشوا، نیز مفسرین کی جماعت میں امت کے عظیم دانشور جناب عبداللہ ابن عباس کا اسم گرامی ہے اور ان کا تشیع مہر نیم روز سے زیادہ روشن ہے، ان کے بعد جابر ابن عبداللہ انصاری، ابی بن کعب، سعید ابن جبیر، سعید ابن المسیب اور علوم قرآن کے جامع اولین محمد ابن عمرو اقدی کے نام آتے ہیں۔ ابن ندیم وغیرہ نے ان کے شیعہ ہونے کا اقبال کیا ہے۔ الرغیب واقدی کی تفسیر ہے۔"

علم حدیث کی بنیادیں رکھنے والوں میں سرکار رسالت کے آزاد کردہ غلام اور کتاب الاحکام والسنن والقضاہ کے مصنف ابورافع ہیں۔ یہ امیر المومنین علیہ السلام سے خصوصی ربط رکھتے تھے و نیز حضرت کے دور حکومت میں مرکزی خزانہ عامرہ کے معتمد تھے۔ ان کے فرزند بھی اس سلسلے کے دو نمایاں افراد ہیں۔ علی ابن ابورافع امیر المومنین علیہ السلام کے سیکریٹری تھے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے باپ کے بعد فقہ میں تصنیف کا کام کیا اور ان کے بھائی عبداللہ ابن رافع نے تاریخ و وقائع نگاری کی طرح ڈالی۔

جن حضرات نے علم کلام کی عمارت کھڑی کی، ان میں ابو ہاشم بن محمد بن حنفیہ کو اولیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر ان کی متعدد جلیل القدر کتابوں کا نشان ملتا ہے پھر عیسیٰ ابن روضہ تابعی کے کارنامے سامنے آتے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ اعظم واصل ابن عطاء اور ابو حنیفہ سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ اس ضمن میں سیوطی کا یہ خیال درست نہیں کہ موخر الذکر علم کلام کے اولین مصنف تھے۔

بعد ازاں مشہور شیعہ اکابر کا دور آتا ہے جن میں قیس ابن الماصر، محمد ابن علی احول معروف و مومن طاق، ہشام ابن حکم اور ال نو نجت شامل ہیں۔ یہ گرامی قدر خاندان سو سال سے زیادہ عرصے تک مذہب و ملت کی خدمات انجام دیتا رہا۔ ان کے مصنفات میں "نص الیاقوت" وغیرہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ نیز ہشام احول اور الماصر کے تلامذہ، ابو جعفر سکاک بغدادی، ابو مالک ضحاک حضرمی، ہشام ابن سالم، یونس ابن یعقوب وغیرہ، ہم کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔



یہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے دہریوں سے تبادلہ فکر و نظر کر کے انہیں زبردست ذہنی شکستیں دیں اور توحید و امامت جیسے عناوین کے لئے ناقابل تردید ثبوت مہیا فرمائے۔

وہ لوگ جنہوں نے حضور ختمی مرتبت کی زندگی، معجزات، غزوات اور حسن کردار کے نمونوں کو جمع کرنے کی سعی فرمائی، ان میں:-

”عالم اسلامی کی پہلی شخصیت ابان ابن عثمان الاحمر تابعی (متوفی ۱۴۰ھ) یہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ ان کے بعد ہشام ابن محمد، محمد ابن سائب کلبی، محمد ابن اسحق مطلبی اور ابو مخنف ازدی کے شاہکار سامنے آتے ہیں بعد کے تمام لکھنے والے اس فن میں ان کے محتاج رہے۔

مورخین کی فہرست پر نگاہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کل بلند پایہ قلم کار شیعہ تھے

مثلاً کتاب المحاسن کے مولف احمد ابن محمد ابن خالد برقی، نصر ابن مزاحم منقری، ابراہیم ابن محمد ابن سعد ثقفی، عبد العزیز جلودی بصری امامی، احمد ابن یحییٰ بن جن کی تاریخ السیاق یورپ میں شائع ہو چکی ہے۔ محمد بن زکریا، ابو عبد اللہ الحاکم، مروج الذهب کے مصنف المسعودی، آداب السلطانیہ کے مولف محمد ابن علی ابن طباطبائی اور ان جیسے سیکڑوں افاضل ہیں جن کے شمار کا موقع نہیں۔“

شعروادب کے مشاہیر کا سلسلہ حضور کی نعت خوانی کے سلسلے میں حضرت ابو طالب سے چلتا ہے جو متفقہ طور پر پہلے قصیدہ گو مانے جاتے ہیں اور پہلے مسلمان جو شیعہ علی نہ سہی مگر شیعیان علی کے مرشد اعلیٰ ہیں:-

”میری دانست میں محمد کا دین یقینی طور پر تمام ادیان عالم میں سب سے اچھا دین ہے۔“

لیکن ذکر ہے حضرت علیؑ کے شیعوں کا تو اس میں ان گنت نام ہیں:-

”نابنہ جعدی (جنگ صفین کے سورما) عروہ ابن زید الخیل (جنگ صفین کے شمشیر زن) لبید ابن ربیع عامری ابو طفیل عامر ابن واثلہ، ابو الاسود دؤلی اور بانس سحاف کے مصنف کعب ابن زہیر وغیرہ۔

فرزوق، کیست، کثیر عرہ، سید حمیری، قیس ابن ذریح وغیرہ

وعمل خراسی، ابو نواس، ابو تمام، بحر بن، دیک الجن، عبد السلام، ابو الشیخ حسین ابن ضحاک ابن رومی، منصور تھری، ابی شح سلی محمد ابن دسب اور صریح الخوانی وغیرہ جن میں مردان ابن ابی حفصہ اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد شامل ہیں ابن ہانی اندلسی، ابن التعاویذی، صاحب مجون حسین ابن الحجاج، مہیار ویلی اور امیر الشعراء ابو فراس حمدانی جن کی بابت کہا گیا ہے کہ شعر کی ابتداء بادشاہ سے ہوئی اور خاتمہ بھی بادشاہ پر ہوا۔

کشاجم، ناشی صغیر، ناشی کبیر، ابو بکر خوارزمی، بدیع ہمدانی، طغرانی، شمس الخلافہ، جعفر، عمارہ یمنی وداعی، زہبی، ابن بسام بغدادی، سبط ابن تعاویذی سلامی اور نامی۔ تیمتہ الدہر ثعالبی کی چار جلدوں کے بیشتر اساتذہ فن شیعہ ہی ہیں۔

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں کہا جاتا تھا کہ شاید شیعوں کے علاوہ کوئی ادیب یا شاعر ہوتا ہی نہیں ہے۔ متنبی اور ابو العلاء کے بارے میں بھی ایک خیال تھا کہ وہ شیعہ ہیں کیونکہ ان کے بعض اشعار سے ان کا جھکاؤ اہلبیت کی طرف محسوس ہوتا ہے کوئی ادیب یا شاعر شیعہ نہ ہوتا تو اس کے لئے بھی ایک کہاوت تھی کہ اپنے کلام سے تو وہ بالکل شیعہ لگتا ہے..... ان شعراء میں قریشی، علوی اور اموی سب شامل تھے لیکن شاذ ہی کوئی غیر شیعہ ہوتا تھا۔

فصل ابن عباس، ابو ذہیل حمی، دسب ابن ربیعہ وغیرہ جن میں آگے چل کر بعض گرانقدر ناموں کا اضافہ ہوا مثلاً شریف رخی و مرتضیٰ، شریف ابو الحسن علی حماتی وغیرہ۔ اسی سلسلے کا ایک گرانقدر نام شریف ابن شجری کا ہے۔

بنی امیہ کے شیعہ شعراء میں یوں تو بہت سے نام ہیں لیکن عبدالرحمن ابن حکم، خالد ابن سعید ابن غاص اور مروان ابن محمد سرحدی بہت بلند پایہ ہیں۔ مروان نے کہا ہے:-

”ہاں، میں اموی نژاد ہوں لیکن حاشا، مجھے بنو امیہ سے کوئی سروکار نہیں۔“

ایک طویل فہرست ہے ناموں کی جن میں نجدیات و عراقیات کے شہرت

یافتہ مصنف ابیوردی بھی شامل ہیں۔



تسلسل بیان میں "جب بڑے بڑے فرمانرواؤں، عظیم سیاستدانوں اور مدبر وزراء کی تاریخ سامنے آتی ہے تو یہاں بھی شیعہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ فاطمی اور بویہی حکمرانوں کے علاوہ آل حمدان، بنی مزید، بنی دبیس، عمران ابن شاہین، مقلد ابن مسیب عقیلی اور قرداش ابن مسیب جیسے سلاطین شیعہ ہی تھے۔ وجیہ الدولہ ذوالقرنین تغلبی اور مغرب و افریقہ کے فرمانروا تمیم ابن معز کی شیعیت بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ اس فہرست میں مزید اور بہت سے نام آسکتے ہیں۔

اور وزراء کی صف میں تو سب شیعہ ہی شیعہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسحق کاتب، غالباً یہ پہلے شخص ہیں، جن کے لئے رسمی طور پر وزیر کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ ابو سلمہ خللانی کوئی، یہ پہلے عباسی خلیفہ کے پہلے وزیر تھے۔ سفاح نے ان کی انتظامی قابلیت کے پیش نظر سلطنت کے حملہ امور حوالے کر دیئے تھے۔ ابو سلمہ نے وزیر آل محمد کے لقب سے شہرت پائی لیکن پھر آل محمد کی دوستی ہی کے باعث سفاح کے سفاک ہاتھوں سے شہید ہوئے۔ ابو عبد اللہ یعقوب ابن داؤد، مہدی عباسی کے وزیر تھے۔ خلیفہ نے پورا نظم و نسق ان کو سونپ دیا تھا۔

"آخر میں انہیں بھی زنداں کی صورت دیکھنا پڑی، آل نوبخت اور بنی سہل تو وزارت کے گھرانے ہی کہلاتے ہیں، فضل ابن سہل، حسن ابن سہل ماموں رشید کے وزراء تھے۔ اسی طرح بنو الفرات میں سے حسن ابن علی دور مقتدر میں تین مرتبہ وزارت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ابو الفضل جعفر، ابو الفتح علی ابن محمد رکن الدولہ کے وزیر تھے۔ طاہر غرامی کی اولاد کو ماموں نے وزارت سپرد کی۔

مہلبی، ابو ولف عیسیٰ، صاحب ابن عباد اور عظیم سیاستدان ابو القاسم وزیر مغربی، ابو عبد اللہ حسین ابن زکریا جو شیعہ کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں، ان کے سوا ابراہیم صولی، طلحہ ابن زریک، مصر کے سپہ سالار افضل اور ان کے فرزند، ابو الحسن جعفر ابن محمد، ابن فطیر، ابو المعالی ہبہ اللہ وزیر مستنصر اور موید الدین محمد ابن عبد المکریم قتی پہلے ناصر کے پھر طاہر کے وزیر ہوئے۔ اس کے بعد مستنصر نے وزارت پیش کی۔ حسن بن سلیمان براء کے عہد میں چیف سیکریٹری تھے۔ یہ بھی شیعہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

نیز مصنف الاوراق صولی، یحییٰ، ابن سلامہ حصکی اور صاحب فہرست ابن ندیم کی تحریر کے مطابق ابو جعفر احمد ابن یوسف اور ان کے بھائی ابو محمد ابن قاسم کے اہل بیت کی شان میں کہے ہوئے قصائد و مرثیہ آپ اپنی نظیر ہیں..... اور ملاحظہ ہو صولی کی الاوراق۔ یہ ماموں کے زمانے میں معتمد عمومی تھے بلکہ اس کے بعد کے دور میں بھی یہ عہدہ ان کے پاس رہا۔ اسی طرح ابراہیم یوسف اور ان کے فرزند، نیز عربی زبان کے ناقد اور معتمد کے مصنف ابو عبد اللہ محمد ابن عمران مرزبانی کا نام بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ سمعانی نے ان کے تشیع کا ذکر کیا ہے و علی هذا القیاس، سیکڑوں ہستیاں ہیں جن کی انتظامی قابلیت، سیاسی بصیرت اور قومی خدمت کا ریکارڈ پیش کرنے کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔

ہمارے والد علام نے شیعوں کے مختلف طبقوں کے حالات جمع کرنے کی کوشش فرمائی تھی چنانچہ دس جندوں میں علماء، حکماء، سلاطین، وزراء، ہست داں اور اطباء وغیرہ جیسے تیس طبقوں پر حروف تہجی کے مطابق روشنی ڈالی ہے۔ اس مجموعہ کا نام ہے "المصون الشیعہ فی طبقات الشیعہ، مگر حق یہ کہ یہ ضخیم تالیف بھی جامع نہیں۔" (۱۰۱)

شیعیت کے یہ معمار بادی النظر میں مختلف شعبہ ہائے حیات میں منقسم تھے لیکن حقیقتاً بہت سی باتیں ان میں مشترک تھیں اور علم دین میں تو سب کو دستگاہ حاصل تھی۔ ایک عالم جلیب بھی ہوتا، فلسفی بھی، فکیات میں دخل رکھتا اور شعر و ادب کا ذوق بھی۔ اسی طرح ایک شاعر یا ادیب خواہ سیاسیات سے مس نہ رکھتا ہو مگر فقہ اور علوم آل محمد سے ناواقف نہ ہوتا۔ یعنی ایک سیاست دان، چاہے مکمل فقیہ نہ ہو لیکن شرع اسلامی اور بعض دوسرے علوم کا ماہر ضرور ہوتا۔

اور صرف انہیں مشاہیر پر موقوف نہیں ہر شیعہ علی ایک اچھا تیغ زن اور کسی حد تک عالم با عمل ضرور ہوتا۔ اور یہ امتیاز اس دور کا ہی نہیں ہے، ایک صدی قبل تک شیعہ بچے کی تربیت آغوش مادر سے شروع ہوتی تو گوشہ قبر تک جاری رہتی اور کوئی شیعہ تقیہ میں ہو یا کھلے عام شیعہ ہو، پہچانا انہیں اوصاف سے جاتا تھا کہ اس کا علم شش جہت ہوتا ہر آدمی عالم تو نہ ہو سکتا مگر اس کی معلومات اتنی ضرور ہوتیں



کہ کسی دوسرے فرقے کے عالم کا منہ بند کر دیتا اسی لئے شروع ہی سے غیر شیعہ اپنے بچوں اور جوانوں کو ہدایت کرتے کہ شیعوں کے پاس بیٹھنا نہ کریں۔

ہمارے علماء کو ابتداء ہی سے ان حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تقیہ کے عالم میں بھی وہ ذہنوں کو منقلب کرتے رہتے اور تھوڑی بہت آزادی ملتی تو دل الٹ رکھ کر دیتے۔ ہر ایک کا طریقہ کار الگ الگ تھا لیکن انہوں نے اپنا مقصد زندگی ہی یہ بنا رکھا تھا کہ غاصبوں کو بے نقاب کرتے رہیں۔

حضرت عمار یاسر، حضرت ابو ذر غفاری اور حضرت سلمان فارسی جو مسالک عمل بنا گئے تھے، وہ ان پر عمل پیرا رہے۔ شاعروں نے مدح اہل بیت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ علماء نے اپنے خطبات اور بحث و مباحثہ سے۔ کچھ کام سیاست دانوں نے بھی کیا۔ وہ چور دروازے سے ظالموں میں داخل ہوتے اور اپنے کو ان کا معتمد علیہ بناتے پھر پروان علی کی جتنی حفاظت کر سکتے، کرتے رہتے اور غیر جانبدارانہ لب و لہجہ میں اہل بیت کی فضیلت بیان کرتے رہتے۔

اس لائحہ عمل کا آغاز حضرت معاویہ کے عہد میں حضرت عقیل اور بعض دوسرے اصحاب سے ہوتا ہے پھر ابو الہاشم بن محمد حنفیہ نے اس فریضہ کو انجام دیا تسلسل میں یوں تو بہت سے اسمائے گرامی آتے ہیں مگر تقریباً ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی محب علی پایا ضرور گیا اور بنی عباس کے دور میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی جن کے سہارے اولاد فاطمہؑ میں سے بے شمار لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور کہنے ہی افراد کی جانیں محفوظ ہو گئیں۔

تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو سامانی، سلجوقی، غزنوی اور ایوبی دور میں چھپے ہوئے شیعوں کی نشاندہی ہوتی ہے جنہوں نے شیعیت کے ارتقاء میں خواہ کوئی کار نمایاں انجام نہ دیا ہو لیکن افراد کا تحفظ ضرور کیا اور انہیں افراد کے دم سے اگلی نسلیں پروان چڑھیں۔

شیعیت کا ارتقاء بلا شک و شبہ علمائے اولوالعزم کے تجربہ علمی کا رہن منت ہے جنہوں نے ایک طرف عظمت آل محمدؐ کے پرچم ہرائے، دوسری طرف احادیث و

روایات کا وہ ذخیرہ یکجا کر گئے جن کے سہارے ہم آج مغرورہ کرداروں کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔

چھوٹے بڑے عالموں کی فہرست بنانا ممکن ہو تو تعداد لاکھوں میں ہوگی کیونکہ صرف جید اور باکمال اہل علم کے نام ہزاروں میں ہیں جن میں سے صرف تھوڑے سے لوگوں کے اسمائے گرامی قلم بند کئے گئے ہیں۔ کس عالم نے کس کس طرح جہاد بالقلم اور مساعی باللسان کیں، ان کی کچھ تفصیل اکابر نے علیحدہ علیحدہ کتب میں تحریر کی ہیں۔

اس کتاب میں تو صرف ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے تاکہ شیعیت کی توسیع میں ہمارے علماء کی خدمات کا ایک اندازہ ہو جائے اور دوسرے عوامل میں علماء کی افادیت کا تعین ہو سکے۔



مقام وقوع کے اعتبار سے یہ جگہ کبھی دریا کے نشیبی ساحل میں تھی اور یہاں کشتیاں لنگر انداز ہوتی تھیں۔ انتہائے خشک ہونے پر اس مقام کو "نے جف" کا نام ملا۔

قدیم ماخذ میں نجف کو بانقیا، طور، ربوہ، غزی، ظہر الکوفہ، جودی اور لسان بھی لکھا گیا ہے۔ مشہد علی اس کا صفاتی نام ہے۔

۲۱ رمضان ۵۴۰ھ / ۶۶۱ء کو حضرت علیؓ ظہر الکوفہ، غزی میں سرمد لحد کیے گئے۔ ملک کی سیاسی صورت حال کی بناء پر حضرت علیؓ کی قبر مخفی رکھی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ وصیت کے مطابق ایک جیسی چالیس قبریں بنائی گئی تھیں۔ بنو امیہ کا دور ختم ہوتے ہی مزار پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ امام جعفر صادقؑ نے بتا کید لوگوں کو زیارت کی ترغیب دی پھر آپ کو فے آئے تو اپنے جد بزرگوار کی قبر پر خود بھی حاضر ہوئے۔ اسی دور میں پہلے عباسی خلیفہ سفاح کے چچا داؤد بن علی عباسی (۱۳۳ھ / ۷۵۰ء) نے قبر پر ایک قیمتی لکڑی کا صندوق رکھوایا۔ اس کے بعد سے قبور نجف و کر بلا پر صندوق رکھے جاتے ہیں۔

### تعمیر مزار

مشہور ہے کہ ایک دن ہارون رشید شکار کھیلنے کیلئے اس علاقے میں آیا تو اس نے کچھ غیبی نشانات دیکھے جو قبر کی صحیح جگہ کا اشاریہ تھے لہذا اس نے وہاں پر بختہ مزار بنوا دیا۔

ہارون الرشید نے قبر کے گرد ایک خوب صورت سفید چار دیواری اور سرخ پتھر کا ایک گنبد بنوایا تھا جس پر سبز رنگ کا خول چڑھوایا تھا۔ یہ خول مدت تک خزانہ مزار میں محفوظ رہا۔ شاید یہ تلافی انہدام مزار حسینؑ کی ہو یا وہ کسی غیبی تہدید سے مجبور ہو گیا ہو۔ بنو عباس کے خلفاء میں واثق باللہ (۲۳۲ھ / ۸۴۶ء) بھی نجف آیا تھا جس کا ثبوت قصیدہ اسحاق بن ابراہیم موسلی کے وہ اشعار ہیں جو تاریخ الکوفہ میں موجود ہیں۔ اسکے بعد مختصر نے قدرے توجہ کی، مقتنی نے کئی مرتبہ مزار پر حاضری دی۔ مستنصر باللہ نے ۶۳۳ھ / ۱۲۲۶ء کے بعد ضریح کی تعمیر کی اور مزار کی شان و

## مشاہد سادات

اس کا نقطہ آغاز حضرت سرور کائنات کا مزار اقدس ہے جو محمد اللہ اب تک پورے ہادیانہ جلال کے ساتھ موجود ہے۔ شاید سعودی عرب امت مسلمہ کے غیظ و غضب سے ڈرتا ہے ورنہ پورے نجد کی قبور اطہر کی طرح اسکو بھی زمین کے برابر کر چکتا یا اسکے قدیم و جدید آقاؤں کی سیاسی مصیحت اسکی اجازت نہ دیتی ہو اور وہ مانع ہوتے رہے ہوں کہ کہیں مذاہب عالم کی طرف سے کوئی سوال نہ اٹھ جائے۔

اس مشہد رشد و ہدایت کے بعد جنت البقیع کی منزلت ہے جو سیدہ نساء العالمین کی ابدی آرام گاہ ہے اور جس میں حضرت امام حسینؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت امام محمد باقرؑ، حضرت جعفر صادقؑ، حضرت ابراہیم بن محمد مصطفیٰؑ حضرت عبداللہ بن جعفر طیار، حضرت عقیل ابن ابی طالب کے مزارات بھی واقع ہیں۔ حضرت علیؑ کی والدہ گرامی جناب فاطمہ بنت اسد کا مدفن بھی اسی میں بنا ہوا تھا لیکن اب وہ سب مٹا دئے گئے ہیں۔ دور سے سطح زمین نظر آتی ہے، قریب کوئی جا نہیں سکتا، جانے کی اجازت ہوتی، تو شاید کوئی صاحب ایمان خاک کی خوشبو سونگھ کر بتا دیتا کہ یہ بنت رسول کا مشہد مبارک ہے

### نجف اشرف

ان مقدس مزاروں کے معجزات و کرامات چونکہ فضائل آل رسول کا ایقان دلوں میں پیدا کرتے ہیں اس لئے وہ تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ سادات کی اصطلاحی تعریف اولاد سیدہ کونین: ان کے جد اعلیٰ محمد مصطفیٰ ہیں لیکن وہ سب امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کی نسل سے ہیں لہذا فخر مخلوقات بعد سرور کائنات کو سرنامہ قرار دیا جاتا ہے۔



شوکت میں اضافہ کیا اس نے اس موقع پر عوام کو انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ بنو عباس کے علاوہ بہت سے ارباب اقتدار نے بھی وقتاً فوقتاً عمارت کی تعمیر، توسیع و تزئین اور وقف و آباد کاری میں حسب حیثیت حصہ لیا جس سے نجف کی آبادی بتدریج بڑھنے لگی، علما اور طلبہ، کوفہ و بغداد سے آکر جمع ہونے لگے۔ اس سلسلے میں پہل سادات نے کی۔ ۲۴۹ھ میں جب یحییٰ بن عمر حسینی نے کوفہ میں خروج کیا تو عراق کے حسینی سادات کچھ ابھر کر سامنے آئے۔ ۲۵۰ھ / ۸۶۴ء میں مستعین نے انہیں شہید کروادیا، مگر ان کے فرزند عمر نے عرت و اقتدار حاصل کیا اور مشہد علوی کی تجدید و اصلاح کرائی۔

تیسری صدی ہجری کے وسط میں طبرستان کے علوی حکمرانوں میں زیدیوں کے داعی محمد بن زید (۲۴۰ھ / ۸۵۴ء) نے ایران سے قیمتی پتھر بھیج کر کر بلا اور مشہد علوی کی تعمیر و تزئین کی، مزار پر ایک بڑا اور شاندار احاطہ بنوایا جس میں کئی محرابیں تھیں تاکہ زائرین حرم دھوپ اور بارش سے محفوظ رہ سکیں۔ حسن بن یحییٰ اور محمد بن زید نے سادات و اشراف کے لیے ہدایا بھیجے اور املاک وقف کیں۔

۲۶۰ھ / ۸۷۴ء میں موصل کے ایک امیر عبداللہ بن حمدان نے قوت و اقتدار حاصل کیا تو نجف کی آبادی کے ساتھ مزار علوی کی تزئین اور آرائش پر توجہ دی۔ اس نے حجرے کیلئے چاندی اور شیشے کے قیمتی آلات، فرش فروش ہدیہ کیا۔ ۳۶۹ھ / ۹۸۰ء میں عمران بن شاہین نے صحت یابی کے بعد ایک مسجد بنوائی اور اہل نجف کو داد و ہش سے نوازا اور مزار کو قیمتی سامان سے آراستہ کیا۔ حرم نجف میں اب بھی "ایوان عمران" کے نشان محفوظ ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے وسط میں بنو بویہ نے سیاسی قوت حاصل کی اور بغداد کی حکومت میں سیاہ و سفید کے مالک بن گئے تو انہوں نے مشاہد پر خاص توجہ کی۔ شہنشاہ عضد الدولہ نے حضرت علی کے روئے کو از سر نو تعمیر کرایا: عمارت، صحن اور مسجد کے تمام حصوں کی از سر نو تزئین کرائی، دیواروں کو لکڑی کے کام سے مزین کرایا، چھتوں میں اعلیٰ درجے کی قندیلیں لگوائیں، قبر پر نئی نفیس لکڑی کا صندوق رکھوایا جس پر چاندی کے نقش بنے ہوئے تھے۔ ایوان میں قیمتی پردے ڈلوائے،

قالین و شمع دان رکھوائے، خوشبو کا اہتمام کیا، شہر کے گرد حصار کھنچوایا اندر زائرین و علما کے لئے مکانات بنوائے اور ان کے ساتھ بڑے بڑے وقف قائم کیے۔

عضد الدولہ کے بعد اس کی اولاد اور اخلاف نے نجف کی توسیع و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے ساتھ حمدانی بھی پوری طرح اس شہر کی زینب و زین اور قاہری و معنوی رونق بڑھانے میں کوشاں رہے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت علی کی بھی چالیس قبریں بنائی گئی تھیں اور ان میں سے کسی ایک میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا تھا تاکہ بنی امیہ صحیح قبر کو تلاش کر کے لاش کی بے حرمتی نہ کر سکیں۔ ہارون رشید کے سے دشمن اہل بیت کو قبر کا نشان ملنا سمجھ میں نہیں آتا البتہ عضد الدولہ کے بارے میں بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اسکو کسی غیبی رہبری پر اصل قبر مل گئی جسکو اس نے ۴۰۰ھ میں بنوانے کی سعادت حاصل کی، ابو محمد حسن بن سہمان وزیر سلطان الدولہ بویہی نے نجف کی شہر پناہ دوبارہ تعمیر کرائی۔

بنی بویہ کھلم کھلا شیعہ تھے لہذا ان کے دور میں شیعوں کو اپنے مذہبی مراسم کے بجالانے اور علانیہ جلسہ کرنے اور جلوس نکالنے کے مواقع ملے۔ ۳۵۳ھ / ۹۶۴ء سے بغداد کے شیعہ غدیر، محرم، رمضان کے مراسم ادا کرنے کے لئے جلوس لے کر نجف و کر بلا پہنچتے تھے۔ زائروں کا دستور تھا کہ قافلے کی صورت مضافات سے بغداد آتے اور وہاں سے سفید علم لے کر نجف جاتے تھے۔

۴۴۸ھ / ۴۵۶ء میں جب بغداد کے محمّد کرخ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا اور علماء و اکابر کے گھر اور مدرسے جلانے گئے، کتب خانے تباہ ہو گئے تو بغداد کے بہت سے لوگ نجف ہجرت کر گئے۔ مہاجرین میں شیخ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی بھی تھے۔ شیخ طوسی نے نجف پہنچ کر مدرسے کی تاسیس جدید کی، جس کے بعد نجف علوم دین کا شہر بن گیا اور شیخ طوسی کے مدرسے کی بین الاقوامی حیثیت ہو گئی۔

۴۷۹ھ / ۴۸۶ء میں ملک شاہ سلجوقی نجف آیا تو اس نے ازراہ عقیدت مزار حضرت علی کی خدمت کی۔ شہریوں کو مال و دولت سے نوازا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سبخر بھی جب نجف آیا تو اس نے بھی امرائے سابق کی طرح مزار علوی میں ہدیے اور



نذرانے پیش کیے۔ مزید برآں اس نے نجف کے شہریوں کو پانی کی قلت سے بچانے کیلئے نہر یا متبادل انتظام کرنے کا حکم دیا لیکن چونکہ کوفے سے نجف کی بلندی تقریباً پینتیس میٹر تھی اس لئے منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا اور مدتوں اہل نجف پانی کی تکلیف سے دوچار رہے۔

۶۸۶ھ / ۱۲۷۷ء میں عطا ملک جوینی نے فرات سے نہر نکال کر اقلیدسی اصول پر دور دراز کا چکر دے کر نجف تک پانی پہنچایا۔ نہر شہر کے نیچے سے گزرتی تھی شہر کے لوگ کنویں کھود کر پانی حاصل کر لیتے تھے۔ اسے "قنات" کہتے ہیں۔ اس نہر کے نگران تاج الدین تھے لہذا نہر کا نام "تاجیہ" پڑا۔ دوبارہ شاہ اسماعیل نے اسکو صاف کروایا۔

سلطان سلیمان قانونی کے بعد ترکوں نے پھر "قناتی" کے نظام کو درست کرایا۔ الحیدریہ کی نہر سلطان عبدالحمید ثانی نے بنوائی۔ ۱۹۱۲ء میں فرات کا پانی لوہے کے پائپ کے ذریعے لایا گیا۔ آج کل قنات کا نظام ٹیوب ویل سے بدل گیا ہے۔

چھٹی صدی کے خاتمے کے قریب جب ناصر الدین اللہ عباسی نجف آیا تو مزار اور شہر بارونق تھا۔ مدارس و مساجد آباد تھیں۔ خلیفہ نے مزار پر ایک ضریح نذر کی شہریوں کو تحائف و ہدایا عطا کیے۔ اسی زمانے میں عبدالکریم بن احمد بن طاووس حسینی (۶۹۳ھ / ۱۲۹۳ء) نے نجف پر کتاب لکھی جس کا نام "فرجی الغری بصرحتہ القری" ہے۔ اس کتاب کا خلاصہ مع اضافہ جمیل الدین ابو منصور حسن بن مطہر حلبی (۷۲۶ھ / ۱۳۲۵ء) نے "الدلائل البرہانیہ فی تصحیح الحضرة الغرویہ" کے نام سے کیا

۷۲۸ھ / ۱۳۲۷ء میں جب ابن بطوطہ قادسیہ سے نجف پہنچا تو اس نے نجف کی وسعت، آبادی، بازار، مساجد، مدارس، رسوم و آداب کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور سب کو ضابطہ تحریر میں لایا۔

خلیق احمد نظامی نے محمد شاہ تغلق (۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے بغداد نامی امیر کے ہاتھ ایک کڑور تنگے عراق کے مقامات مقدسہ میں تقسیم کر نیکیے لیے بھیجے تھے۔ (سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۲۸)

نجف کی تاریخ کا اہم دور صفوی بادشاہوں سے شروع ہوتا ہے۔ ان میں سے شاہ اسماعیل اول نے ۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء میں نجف کو از سرنو تعمیر کرایا، صدیوں پرانے صندوق کو بدل کر نیا صندوق رکھا، بہت بڑا وقف قائم کیا، علما اور عوام کی امداد کی، نہر نجف کو جاری کیا۔ ۹۵۸ھ / ۱۵۵۰ء میں شاہ عباس اول نے، ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۳ء میں مرزا تقی وزیر شاہ نے، ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۳ء میں شاہ صفی اول نے، مزار اور شہر کو چار چاند لگا دیے۔ ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء میں عثمانی بادشاہ سلطان مراد نے غیر معمولی دریا دلی سے نجف و آستان علوی کی مرمت کرائی

نادر شاہ ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء میں زیارت کیلئے نجف آیا تو اس نے گراں بہا تاج سونے کی بھاری زنجیر، جو اہر نگار مجمر، اگر داں اور شمع دان نذر کیا، ایوان و عمارات پر طلاکاری، کاشی کار کام کرایا۔ قبر انور پر اب تک نگرانی کا صندوق تھا اس نے فولاد کی طلاکار ضریح نصب کی، گنبد پر سونے کا ملمع کرایا، شہر پناہ کو از سرنو بنوایا، شہر کی آب رسانی کے لئے حکم دیا کہ جہاں جہاں مٹی اور ریت کا دباؤ زیادہ ہو وہاں تانبے اور سیسے سے نالیاں بنادی جائیں۔

۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء میں فتح علی شاہ قاجار نے پانچ سال میں بیرونی خندق، شہر پناہ اور مضبوط برجوں اور دروازوں سے نجف کو قلعہ بند کر دیا۔ ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء میں ناصر الدین شاہ قاجار زیارت کو آیا تو اس نے بھی حرم اور شہر میں ضروری افسانے کیے، تزئین و آرائش کرائی اور ہر چیز کو باقاعدہ رکھنے کی ہدایت کی، ایک تاج بھی نذر کیا جس کے ہیرے پر سورۃ الملک کندہ تھی، فولادی صندوق پر چاندی کا صندوق رکھوایا۔ سلطان محمد جعفر فرزند کاوہ قیمتی چولی صندوق مزار پر اب بھی موجود ہے جس کی تاریخ نذر ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء ہے

### بر صغیر اور نجف

نجف کی تعمیر و ترقی میں بر صغیر کے ارباب ہمت کا بھی حصہ ہے۔ عراق و ایران سے ہندوستان کے سیاسی و مذہبی روابط ہمیشہ استوار رہے۔ مسلمانوں کے ابتدائی عہد سے لے کر انگریزوں کے آخری دور تک یہاں کی حکومتیں مقامات مقدسہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتی رہی ہیں۔ ہر زمانے میں نجف کے علماء



سادات اور شعراء درباروں میں آتے رہے یہاں کے سلاطین نے بھی جب کوئی سفارت بغداد بھیجی تو عتبات عالیات کے لیے تحف و ہدایا ضرور ارسال کیے۔ دکن کے سلطان نظام شاہ اور محمد شاہ ہمسئی کی والدہ نے زر کثیر سے مستحقین کو بلا و نجف کی مدد کی، حرم کے لیے نذرانے ارسال کیے۔ ۹۵۶ھ / ۱۵۴۹ء میں ملا شاہ طاہر اور ۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء میں احمد نظام شاہ، ۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء میں برہان نظام شاہ اور ۹۹۹ھ / ۱۵۸۸ء میں مرتضیٰ نظام شاہ فوت ہوئے دوران کی لاشیں دفن کرنے کے لیے کر بلا لائی گئیں تو نجف و کر بلا کے لیے شاہی اوقاف قائم ہوئے۔ نظام شاہی سلاطین کے ساتھ قطب شاہی خاندان کے فرمانروا بھی پیچھے نہ تھے۔ انہوں نے مشاہد کی گرانقدر خدمات کیں۔

نجف و کر بلا کی تاریخ میں نوابان اودھ کا خراج عقیدت آج تک یادگار ہے نواب آصف الدولہ نے سات لاکھ روپے عراق ارسال کیے جن سے نجف و کر بلا میں بڑی بڑی تعمیرات مکمل ہوئیں، ایک نہر بنائی جو نہر آصفی کہلاتی ہے۔ آصف الدولہ کے دور میں غفران مآب نجف گئے اور وہاں سے سند اجتہاد لے کر لکھنؤ آئے جن کی سعی سے کچھ دن بعد لکھنؤ نجف ہند سمجھا جانے لگا۔

اودھ کے پانچویں فرمانروا غازی الدین حیدر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک کروڑ روپے اس شرط پر دیے کہ پانچ لاکھ روپے سالانہ میں سے ڈھائی لاکھ روپے نجف و کر بلا کے عالم بزرگ کو بھیجے جائیں، مبارک محل کی تنخواہ دس ہزار روپے مقرر کی تھی، مبارک محل اور باقی دوسروں نے وصیت کے ذریعے اپنے بعد وہ روپے بھی نجف و کر بلا کے لیے مخصوص کر دیا۔ یہ معاہدہ محرم ۱۲۴۱ھ / ۱۱ اگست ۱۸۲۵ء کو مکمل ہوا تھا۔ مدت تک تین لاکھ روپے سالانہ "خریدہ اودھ" کے نام سے عراق جاتے رہے اور مدارس و طلبائے نجف پر خرچ ہوتے رہے۔

محمد علی شاہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء نے ڈیڑھ لاکھ روپے بھیجے جن سے عام تجدید و تعمیر نجف و کر بلا ہوئی۔ پندرہ ہزار روپے امجد علی شاہ نے روانہ کیے کہ نجف میں نہر کو درست کیا جائے۔ ۱۲۶۳ھ میں یہ کام انجام کو پہنچا۔ نواب ملکہ جہاں اہلیہ محمد علی شاہ اودھ (۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء) زیارت کے لیے گئیں تو وہاں بہت بڑی سرائوانی،

مکان خریدے اور وقف کیے۔ نجف میں انہوں نے اپنے شوہر کا تاج اور شمشیر نذر کی نوابان مرشد آباد و حیدر آباد و رام پور، فیض آباد و محمود آباد، خیر پور و لاہور کے اوقاف و خدمات کی فہرست طویل ہے۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ افتخار کچھ کم نہیں ہے کہ نجف اشرف کا سب سے بڑا درس مسجد اردو میں ہوتا ہے، جو سید محمد خان ہندی نے ۱۳۴۰ھ میں تعمیر کی۔ قزلباش نواب کا مدرسہ اپنی کاشی کاری خوبصورتی اور فیض رسانی کی وجہ سے لاہور کی خدمت کا نشان امتیاز ہے۔

نجف بارہ سو برس سے اسلامی، بالخصوص شیعہ، دانش گاہ بنا ہوا ہے۔ موجودہ حکومت سے پہلے اسی فیصد آبادی علماء و طلبہ کی تھی۔ گلیوں، بازاروں میں عمامہ و عبا پوش، بغل میں کتابیں دبائے گروہ درگروہ نظر آتے تھے۔ فقہ و اصول میں بارہ بارہ ہزار طلبہ شرکت کرتے تھے۔

### مزار مبارک حضرت علی

مزار علوی شہر نجف کی عالیشان عمارت ہے۔ اس کا گنبد اپنی ہیئت کے لحاظ سے بہت خوبصورت و متناسب ہے۔ بھاری گنبد اور اونچے کلس پر سونے کا کام دن رات چمکتا، دور سے نظر آتا ہے۔ طلائی میناروں اور گنبد کی خوشنمائی ہی نجف کا مادی حسن ہے۔ حرم کی چار دیواری میں باب قبلہ، باب طوسی، باب الساعۃ جیسے دروازوں سے صحن میں داخلہ ہوتا ہے۔ وسیع صحن کے درمیان مزار کی سنگیں عمارت خوبصورتی اور فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ برآمدہ اونچا نفیس پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ اس کے دونوں طرف دو مینار ہیں۔ میناروں کے اوسط میں بلند و طلائی دروازہ ہے، جس کے محراب اور خاق در طاق پر، ڈاٹ چڑھے ہوئے سونے سے رات کو دن اور دن کو سورج کی پاسبانی کا گمان ہوتا ہے۔ ایوان میں داخل ہونے کی لئے طلائی دروازہ ہے۔ بالائی گنبد کے حدود میں "ید اللہ فوق ایدیم" اور میناروں کی طلاکاری پر "اللہ اکبر، اللہ اکبر" درج ہے۔ اسی تاریخ کے ساتھ محمد علی اصفہانی نے سورۃ فتح لکھی ہے۔ درو دیوار پر کاشی کا کام یحییٰ نفیس ہے۔ خوش نوییوں کے لکھے ہوئے اشعار، آیات اور کتابت اسپر مستزاد ہیں۔ ضریح کا ایوان مربع ہے۔ بڑے ہال



میں مجوف گنبد کا اندرونی حصہ اور چھت گوشے اور ان میں ہندی محرابیں، قوسین اور فنی نزاکتیں، ان کے اندر باریک و لا جواب شیشہ کاری اور روشنی، وسط میں چاندی سونے کی نفیس ضریح ہے جس پر چاندی کی جالی ہے۔

موجودہ ضریح ۱۳ رجب ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء کو ملا طاہر سیف الدین نے نصب کی تھی۔ ضریح کے اندر صندوق، اس کے اوپر دو قدیم قرآن مجید کے قلمی نسخے رکھے ہوئے ہیں جن میں ایک بخط حضرت علی اور دوسرا بخط امام حسن ہے۔ ضریح کے اوپر محفل کی چادر ہے، اس پر چھت میں لٹکے ہوئے جھاڑ فانوس، سونے کی بھاری قندیلیں اور جواہرات کے ہدیے، زمین پر اعلیٰ درجے کے پتھروں کا فرش اور بے حد قیمتی قالین ہیں۔ پہلوؤں میں رواق ہیں جن میں داخلے کے چار دروازے ہیں: باب طلا، باب طوسی کے مقابلے میں باب فضہ، باب راد ہے۔ چوتھا دروازہ بھی چاندی کا ہے۔ رواق کے شمالی رخ پر منبر ہے جس پر منبت کاری کی گئی ہے۔ مغربی رواق میں بڑا سا کمرہ یا توشہ خانہ ہے۔

مدارس: نجف دراصل شہر علم ہے۔ اس میں کم و بیش بیس مدرسے ہیں۔ نجف و کر بلا، قم اور مشهد میں مدرسہ اس عمارت کو کہتے ہیں جس میں طلبا رہتے ہیں اور پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ یہ مدرسے بڑی خوبصورت دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتوں پر مشتمل ہیں۔ ایک ایک مدرسے میں دو دو سو، بلکہ اس سے زیادہ طلبہ رہتے ہیں۔ ہر مدرسے میں بڑے بڑے تہ خانے ہیں جو گرمی کے موسم میں ٹھنڈے رہتے ہیں۔ سب سے بڑا مدرسہ "مدرسہ کاظم یزدی" ہے۔ "مدرسہ اخوند" کے نام سے تین مدرسے، دو مدرسے حسین خلیلی کے نام سے، مدرسہ ہندی تعمیر نواب فتح علی خان قزلباس، بڑا مدرسہ جسے جامعۃ النجف کہتے ہیں، بہت مشہور ہیں۔ نجف کا یہ مدرسہ جدید وسیع و عریض انگریزی طرز کا ہے، اسی طرح مدرسہ خوئی بھی ہے۔ ان مدرسوں میں متعدد ممالک سے آئے ہوئے طلبہ رہتے ہیں، مگر ۱۳۸۰ھ کے انقلاب کے بعد نجف علماء و طلبہ سے خالی ہو چکا ہے۔

نجف میں درس مساجد میں ہوتا ہے، گھروں پر اور مدرسوں میں نجی سبق پڑھائے جاتے ہیں۔ درس خارج کے لیے مسجدیں استعمال ہوتی ہیں۔ جس کا طریقہ

یہ ہے کہ سو سے ہزار طلبہ تک مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ استاد منبر پر بیٹھ کر لیکچر دیتا ہے۔ پھر سوال و جواب اور بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ اصول فقہ اور فقہی استدلال کے کم از کم دو الگ الگ بڑے درس ہوتے ہیں۔ فارغ التحصیل طلبہ استاد کی تقریر لکھتے جاتے ہیں۔ یہی درس اجتہاد کی صلاحیت ابھارتے ہیں اور اسی سے فارغ ہو کر طلبہ مجتہد بنتے ہیں۔ اس قسم کی تدریس اور مدارس کی وجہ سے نجف کا نام حوزہ علیہ رکھا گیا ہے۔

نجف میں شیعہ مذہب کے نامور عالم و مدرس ہمیشہ سے رہتے چلے آ رہے ہیں عموماً "مرجع اکبر" اسی شہر میں رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں آیت اللہ سید محسن الحکیم مرجع اکبر تھے۔ ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء میں ان کی رحلت کے بعد مرجع اکبر دو قرار پائے۔ آیت اللہ سید ابو القاسم الخوئی جو اب بھی نجف میں ہیں دوسرے آیت اللہ سید باقر الصدر تھے جو شہید کر دیے گئے۔ حال ہی میں حضرت خوئی بھی رحلت فرما گئے۔

کتاب خانے: نجف کا شمار دنیا کے قدیم ترین مراکز درس میں ہوتا ہے۔ یہاں کے علماء ہزار سال سے علوم اسلامی کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اس لیے ہر گھر میں کتابیں اور ہر گلی میں کتاب خانے ہیں۔ آج کل بڑے اور مشہور کتاب خانوں میں شیخ عبدالحسین الامینی کا کتاب خانہ، امیر المومنین اور سید محسن الحکیم کا مکتبہ الحکیم بہت اہم ہیں۔

نجف جدید شہری ضروریات سے آراستہ ہے۔ تجارت، صنعت و حرفت، جدید مدارس، ہسپتال، تفریح گاہیں، آثار قدیمہ سب کچھ موجود ہے، عرب ادب و خطیب، مصنف و ناشر بکثرت ہیں۔ شہر کی چار دیواری توڑ دی گئی ہے اور شہر ہر طرف پھیل چکا ہے۔ قدیم وضع کے مکان کم ہوتے جارہے ہیں، پرانی بستیاں اور محلے کھد چکے ہیں، چوڑی سڑکیں اور کشادہ بازار بن گئے ہیں اور باب مدینہ العلم کا مشہد مقدس دور حاضر کا خوبصورت شہر بنتا جا رہا ہے لیکن روضہ کی جلالت آج بھی ترجمان ہے اس حقیقت کی کہ ختم المسلمین کا نائب اول بعد شہادت بھی اسلام و ایمان کی شعاعیں بکھیر رہا ہے۔ (۲۲)

سے آگے چل کر دو کے بجائے چار مراجع ہو گئے تھے جن میں حضرت آیت اللہ خمینی بھی تھے۔



### مذہبِ اہلِ علی

تدفین شہداء کو اگر نقطہ آغاز قرار دیا جائے تو کربلائے معلیٰ کی تاریخ ۱۲ محرم ۶۱ھ سے شروع ہوتی ہے جسکے کچھ دنوں بعد بنی اسد نے گنج شہیداں کے قریب ایک خام مسجد بنالی تھی تاکہ نماز پڑھنے کے بہانے وہ وہاں جمع ہوتے رہیں اور قبر امام مظلوم کی زیارت بھی کرتے رہیں پھر قبر پر ایک سائبان بھی ڈال دیا۔

پھر جناب مختار ثقفی کے عہد میں ابراہیم بن مالک اشتر نے پہلے پہل ایک تعمیر کرائی اور قریب ہی کچھ لوگوں کو آباد بھی کر دیا جسکی تاریخ مروان اور عبدالملک اور پھر منصور دوانیقی نے کرائی اور کہا جاتا ہے کہ اس عمارت کو بھی مسمار کر دیا جو مختار ثقفی کے مختصر عہد میں بنائی گئی تھی لیکن یا تو عمارت پوری طرح مہدم نہیں ہوئی یا پھر اسکی مرمت عقیدتمندوں نے کر لی ہو کیونکہ ہارون رشید کے دور میں عمارت بھی تھی اور قبر سید الشہداء کے قریب ایک بیری کا درخت بھی لگا ہوا تھا۔ ہارون رشید نے انہدام مزار کے ساتھ اس درخت کو بھی کٹوا دیا تاکہ نہ نشان قبر رہے اور نہ کوئی ایسی علامت جو قبر کی نشاندہی کر سکے۔

ہارون کے بعد امین و مامون کا عہد آیا تو ۱۹۳ھ میں مزار مطہر پر دوسری بار ایک قابل ذکر عمارت کھڑی کی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسکی تعمیر مامون نے کرائی تھی لیکن ہارون رشید کے انتقال کے بعد اگر سن تعمیر واقعی ۱۹۳ھ ہے تو اسکو مامون نے نہیں بنوایا کیونکہ آل رسول کی ظاہری تالیف قلب کی سیاست کا آغاز اس نے ۱۹۹ھ کے بعد کیا۔ پانچ چھ سال امین و مامون کے جھگڑے میں گزر گئے۔ حالات بالکل غیر یقینی تھے۔ کوئی کہہ نہ سکتا کہ کامیابی کا سہرا کس کے سر بندھے گا؟ یہ تو طاہر بن حسین کی تلوار تھی اور اسکی مدبرانہ صلاحیت کہ میدان مامون کے ہاتھ رہا لہذا گمان غالب یہ ہوتا ہے کہ ہارون رشید کا قافلہ دور ختم ہوتے ہی کسی جھپے ہوئے شیعہ امیر نے سوچنا شروع کر دیا ہو کہ امام مظلوم کی قبر سونی پڑی ہے اور وہ نرم بستر پر آرام کر رہا ہے لہذا اس نے اپنے معتمدین کو بھیج کر تعمیر شروع کرا دی ہو۔

اس خیال کو تقویت اس لئے پہنچتی ہے کہ چند سال تک سادات کشی کی

پالیسی نرم پڑ گئی تھی۔ عباسیوں کی خانہ جنگی میں کسے اتنا یار تھا کہ اس طرف توجہ کرتا۔ ممکن ہے خود طاہر بن حسین نے یہ شرف حاصل کیا ہو اور جب مامون کا استقرار خلافت ہوا تو روضہ مقدس بنا بنایا موجود تھا جسکو مامون نے مہدم نہیں کرایا کیونکہ اب وہ سادات کیلئے تلوار کا استعمال خطرناک سمجھتا تھا اس نے امیر معاویہ کے اسلحہ خانے سے زہر کی بوتلیں مستعار لے لی تھیں اور انہیں کے استعمال کو اس نے تقاضائے وقت قرار دے لیا تھا۔

یہ تعمیر ۲۳۲ھ تک باقی رہی بلکہ اسکے زب و زین میں اضافہ ہوتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض عباسی بھی حلقہ عقیدت میں شامل ہوتے رہے تھے، متین مانی جاتی تھیں، مرادیں برآتی تھیں، نذر و نیاز کا سلسلہ جاری تھا کہ خونخوار متوکل عباسیوں کا تاجدار بن گیا اور سادات کی گردنیں اتروانے کے ساتھ قبر بارگاہ امام ڈھانے کا عز بھی کر لیا گیا۔

روایات متواترہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چار مرتبہ اس نے انہدام مزار مقدس کی کوشش کی۔ پہلی بار ۲۳۲ھ میں جب ایک مخفیہ زیارت کو چلی گئی تھی اور دربار سے غیر حاضر تھی پھر ۲۳۶ھ اور ۲۳۷ھ میں اور آخری بار ۲۴۷ھ میں مگر ہر مرتبہ اسکو ناکامی ہوئی۔ بیلوں نے مزار کے قریب پہنچتے ہی ہر ممکن تشدد کے باوجود آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور فوج نے خود اس کام کو کرنا چاہا تو عقیدت مند سامنے آگئے۔ عباسی اپنی کمائوں سے جو تیر چھوڑتے وہ اس طرح پلٹ کر آتے کہ خود ان کے سینے چھد جاتے۔ اس طرح ایک بڑی تعداد کیفر کردار کو پہنچ گئی اور اسکو مایوس ہو کر واپس ہونا پڑا۔

اور اسکے بعد ہی متوکل کو اسکے بیٹے متصر کے اشارے پر ترک غلاموں نے ہلاک کر دیا کیونکہ اب وہ علی اور اولاد علی کے ساتھ فاطمہ زہرہ کی شان میں بھی گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا تھا جسکو متصر نے سن لیا تھا اور بار بار روکنے کے باوجود وہ نہ مانا تو متصر نے اسکو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔

متصر نے تخت نشین ہوتے ہی فوج کی وہ چوکیاں ہٹوا دیں جو زائرین کو روکنے کیلئے متوکل نے متعین کی تھیں اور ۲۴۷ھ میں روضہ اطہر کی تعمیر بھی کروائی



جو تلافی مافات تھی مگر ابھی متوکل کے حاشیہ بردار زندہ تھے۔ انہیں متوکل کا یہ عمل نہ بھایا۔ انہوں نے اتنی کمزور تعمیر کی کہ ۹-۱۰ ذی الحجہ ۲۷۳ھ کو اسکی چھت دفعہ گریز ہوئی۔ مخصوصی کے ایام تھے۔ اس سانحے سے ان گنت زائرین دب کر شہید ہو گئے۔ دس سال بعد ۲۸۳ھ میں محمد بن زید والی طبرستان نے جو تھی بار روضہ مقدس کی تعمیر کرائی۔

”بلاد عجم سے بہت سامان انہوں نے اندونوں روضوں کی مضبوط عمارت بنانے کیلئے بھیجے۔ حائر مقدس پر بلند قبة بنوایا جس میں دو دروازے تھے۔ پھر حائر کے گرد اگرچہ چار دیواری کھڑی کی اور بہت سے مکانات بنوائے اور امکان بھر کر بلا کے رہنے والوں اور مجاوروں کے ساتھ داد و ہش کی۔“ (۳۳)

۳۶۹ھ میں ایک ذاکو ضبہ بن اسدی نے حرم کا خزانہ اور تمام ساز و سامان لوٹ لیا جسکو سلطان عضد الدولہ نے سخت سزا دی اور پھر روضہ حسینی کی پانچویں تعمیر بنی بوہہ کے عظیم حکمران شہنشاہ عضد الدولہ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ یوں تو تمام بوہی سلاطین حد درجہ راسخ العقیدہ شیعہ تھے مگر معز الدولہ اور عضد الدولہ کو ان سب میں ایک امتیاز حاصل تھا۔ وہ ہر سال نجف و کربلا کی زیارت کو جاتا اور اہل کربلا کیلئے خرچے کے منہ کھول دیتا۔

روضہ سید الشہداء کی تعمیر کیلئے اس نے غیر معمولی التزام کیا، قبة کو از سر نو بنوایا اسکے رواقوں کو راستہ و پیراستہ کرا کے مرصع کر دیا، ضریح اقدس کی خوبصورتی بڑھانے پر خاص توجہ کی اور اسکی تزئین پر بے شمار دولت صرف کی، حائر کے ارد گرد مکانات اور بازار بنوائے، شہر کے چاروں طرف بلند و بالا شہر پناہ تعمیر کرائی اور اسکو کسی قلعہ کی طرح محفوظ کر دیا، دور دراز سے نہر کاٹ کر کربلا پہنچائی اور پانی کی فراہمی کے ساتھ روشنی کا بھی انتظام کیا۔

۳۷۱ھ میں جب وہ کربلا آیا تو درہمیں سے بھرا ہوا پورا صندوق سادات میں تقسیم کر دیا، عوام اور مجاوروں کو دس ہزار درہم دے اور نگران روضہ کو ایک ہزار ایک لاکھ پاؤنڈ ستوا اور خرے اور پانچ سو کپڑے تقسیم کیے پھر نجف اشرف میں اس سے زائد عطیات دئے۔

اسی زمانے میں عمران بن شاہین نے سرزمین حائر پر مسجد اور رواق تعمیر کیا جو آج بھی رواق عمران کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک موقع پر منت مانی تھی جو پوری ہوئی اور اس نے نجف کربلا اور کاظمین میں مسجدیں بنوادیں۔ نجف کی مسجد حرم مقدس کے رواق سے ملی ہوئی تھی جسکو شاہ عباس صفوی نے اپنی تعمیرات کے سلسلے میں رواق سے الگ کر دیا۔ مسجد عمران کے دو دروازے تھے: ایک باب طوسی کے پاس دوسرا صحن میں مگر اس کا نشان اب مٹ گیا ہے

بوہی سلاطین نے نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کیلئے بڑی جائدادیں وقت کی تھیں۔ تاریخ کربلائے معلیٰ کے مولف نے تاریخ عراق کے انگریز مولف لوئگریک کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ترکان عثمانی کا عراق پر قبضہ ہوا تو:۔

”سلطان مراد چہارم نے مفتی یحییٰ کو حکم دیا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی کا قبة پھر سے تعمیر کیا جائے۔ اسکے لئے بے شمار اوقاف وقف کیے گئے۔ ان کا اکثر حصہ شیعوں کی جائدادوں پر مشتمل تھا۔“

خان پاشا کبیر نزد کربلا اور بازار نجف کا شیخ خالد ایسی ہی جائدادیں ہیں ورنہ کربلا اور نجف سے شیخ عبدالقادر جیلانی اور خالد بن ولید کا کیا کام۔

”ماہ ربیع الاول ۴۰۷ھ میں مشہد حسینی اور تمام رواق جل گئے۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ خدام نے دو بہت بڑی شمعیں روشن کی تھیں، یہ دونوں آدھی رات کو گر پڑیں جس سے سب کچھ جل اٹھا اور ہر طرف آگ پھیل گئی۔“

بلند و بالا گنبد اور رواق بھی اس آگ سے بچ نہ سکے، صرف حرم کا تھوڑا سا حصہ اور باہر کی شہر پناہ کی دیواریں بچ سکیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ایران و عراق میں شیعی اقتدار دم توڑ رہا تھا مگر شیعوں کے بچے کچے شمشیر زن نزدیک و دور پائے جاتے تھے اور بغداد سے بوہی اثرات پوری طرح ختم نہیں ہوئے تھے۔ غزنوی سلطنت مضبوطی سے اپنے پاؤں جما چکی تھی اور خلافت بغداد سے اس کا رابطہ تھا۔ عباسی خلافت کوئی تین سو سال تک شیعوں کے رحم و کرم پر زندہ رہی تھی اب اسکو غزنوی سلطان کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی تو



دل میں دبی ہوئی چنگاریاں پھوٹ نکلی تھیں لیکن روضہ سید الشہداء کی جلالت دیکھ کر اس کا یارا نہ تھا کہ انہدام مزار کا کوئی کھلا ہوا منصوبہ بنایا جاسکتا لہذا بعض دشمنان اہل بیت نے سازش کر کے یہ راستہ اختیار کیا اور مزار مقدس کو شدید نقصان پہنچا دیا۔ اس میں خلیفہ کی سازش کا شبہ اس لئے ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں آتش زنی کے واقعات دوسرے شیعی علاقوں میں بھی ہوئے لیکن بات چھی نہیں رہتی۔ ہر طرف ایک ہلچل پڑ گئی۔ قادر باللہ صورت حال سے گھبرا گیا اور اس نے ابن سہلان کو وزیر اعظم مقرر کر دیا جس سے امید تھی کہ وہ حالات پر قابو پالے گا۔ یہ توقع پوری ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے روضہ اطہر پر توجہ دی۔ تباہ شدہ حصے کی مرمت کرائی اور اسکو پہلے کی طرح دیدہ زیب بنا دیا پھر حائر حسینی کی چہار دیواری نئے سرے سے تعمیر کرائی جو کربلا کی چھٹی تعمیر تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ۴۰۰ھ میں وہ سخت بیمار ہوا تھا تو اس نے نجف اشرف میں منت مانی تھی کہ وہ صحت یاب ہو گیا تو روضے کے چاروں طرف دیوار اٹھوا دے گا۔ یہ منت بھی اس نے پوری کی۔

اس طرح عقیدتمندوں کے قلوب کی تالیف ہو گئی مگر اب شیعہ پھر ماضی کے حالات دوچار ہو رہے تھے۔ سلجوقیوں کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ دنیا بھول چکی تھی کہ کبھی بویہی سلاطین بغداد میں خلیفہ گر رہے تھے۔ اب شیعہ پھر دہشت گردی اور بے چارگی کا شکار تھے لہذا خلیفہ مسترشد کی نیت کربلا کی شان و شوکت دیکھ کر غراب ہو گئی اور ۵۲۶ھ میں اس نے اپنی فوج کے ساتھ چھاپہ مارا۔ حائر مقدس کے خزانے زرو جو اہر اور بیش قیمت سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ ان سب پر اس نے قبضہ کر لیا اور بغداد اٹھوالے گیا۔ پھر اس کا ایک حصہ اس نے اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا کہ قبر کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ شیعہ اس کے احسان مند ہیں کہ اس نے مزار اقدس کے ساتھ کوئی بے ادبی نہیں کی۔

ابن سہلان نے روضہ مطہر میں جو تعمیرات کی تھیں وہ بہت مضبوط تھیں۔ ۵۴۵ھ میں جب ناصرالدین اللہ تخت خلافت پر بیٹھا تو وہ اسی زار حالت میں تھیں مگر ناصر بڑا محب اہل بیت تھا۔ اس نے کھل کر اپنی شیعیت کا اعلان تو نہ کیا تھا لیکن

عباسیوں کے فلسفہ خلافت کا دل سے قائل نہ تھا اتفاق سے زمانہ بھی اسکو ایسا ملا تھا کہ وہ اپنے بازوؤں پر اعتماد کر سکتا۔

سلجوقی سلطنت آخری ہچکیاں لے کر دم توڑ چکی تھی۔ ایوبی سرزمین حصوں بخزوں میں بٹ چکی تھی البتہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ میں کچھ دم خم تھا تو وہ خلافت بغداد پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھا لہذا ناصرالدین اللہ نے فوجی طور پر بھی اپنے کو مضبوط کر لیا تھا اور اپنی حدود سلطنت میں ایک ہوشمند فرمانروا کی طرح امن بھی قائم رکھا تھا۔

آل رسول کی عظمت کا وہ اس حد تک احترام کرتا تھا کہ کاظمین کو اس نے جائے امن قرار دے رکھا تھا۔ کوئی مجرم بھی وہاں پناہ لے لیتا تو خلیفہ اس کا مواخذہ خود امام عالی مقام پر چھوڑ دیتا۔ اس نے تمام عتبات عالیہ کی تزئین پر توجہ دی۔ سامرہ میں جالی دار سرداب بنوایا اور جالیوں پر آیات کندہ کرائیں۔

زائرین کی تعداد پچھلے ادوار میں گھٹ گئی تھی مگر ناصرالدین اللہ نے اتنی سہولتیں فراہم کیں کہ وہ سیکڑوں کے بجائے ہزاروں میں کربلا و نجف پہنچنے لگے۔ ابن سہلان کا بنایا روضہ اگرچہ مضبوط تھا لیکن ناصر کی ہدایت پر اسکے وزیر محی الدین محمد مقدادی نے دیواروں پر ساکھو کی لکڑی چڑھوا دی۔ روضے کے حسن و جمال میں اضافہ کیا اور حریر و دیبا کے نئے پردوں سے آراستہ کیا۔ اس طرح ناصرالدین اللہ مشاہد کے معماروں میں شامل ہو گیا۔

ابن بطوطہ نے ۷۶۷ھ میں روضہ مقدس کو دیکھا تھا۔ اس نے لکھا۔ "پھر ہم نے شہر کربلا کی طرف سفر کیا جہاں امام حسین کا مزار مبارک ہے۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے جسکے چاروں طرف کھجور کے باغ ہیں۔ فرات کا پانی انہیں سیراب کرتا ہے۔ کربلا میں ایک بہت بڑا مدرسہ ہے اور ایک پاکیزہ جگہ جہاں آنے جانے والوں کی غیافت کی جاتی ہے۔ روضے کے دروازے پر حاجیوں اور خدام کا ہجوم رہتا ہے۔ ضریح پر سونے اور چاندی کی قندیلیں آویزاں ہیں اور دروازوں پر ریشمی پردے ہیں۔" (۱۰۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن سہلان کی تعمیر اور خلیفہ ناصرالدین اللہ کی



آرائش ابھی باقی تھی، حالانکہ اس مدت میں چنگیزی تلواروں نے عراق و ایران کی سرزمین کو خون سے لالہ زار کر دیا تھا، مسلم سلاطین کی جگہ ہلاکو خاں کی اولاد نے لے لی تھی مگر مشاہد مقدسہ سیاسی انقلابات اور آشوب زمانہ میں بالکل محفوظ رہے تھے بلکہ غازا خان اور خدا بند خان نے تو مشاہد کی گرانقدر خدمات انجام دی تھیں۔ اسکے بعد آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں سلاطین جلائر کا دور آگیا جن کا پایہ تخت ہلاکو خاں کے وقت سے تبریز چلا آ رہا تھا۔

تاریخوں کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان میں سے جس کسی نے جو بھی عقیدہ اختیار کیا ہو لیکن وہ سب محب اہل بیت تھے اور ہلاکو خاں کی اولاد تو غازان خاں کے بعد سے علی الاعلان شیعہ ہو گئی تھی۔ جلائر انہیں کی ایک شاخ تھے۔ انہوں نے خاندان ہلاکو کے کمزور پڑنے کے بعد عراق و خراسان کی حکومت حاصل کی تھی۔ اس خاندان کا بانی شیخ حسن تھا۔ اسکے انتقال پر سلطان اولیس جلائری تخت نشین ہوا۔

سلطان اولیس نے اپنے غلام مرجان کو بغداد کا حاکم بنایا تھا جو باغی ہو گیا اور جب اولیس اسکی سرکوبی کیلئے تبریز سے روانہ ہوا تو مرجان نے کر بلا جا کر روضہ اقدس میں پناہ لے لی اور اسی دوران وہ منارہ تعمیر کرایا جو ماوند عبد کے نام سے مشہور ہے پھر اس نے اپنی ساری دولت اور جائداد سب امام کیلئے وقف کر دی۔

سلطان اولیس جلائری جب بغداد فتح کر کے کر بلا پہنچا اور اسکو یہ حقیقت معلوم ہوئی تو اس نے مرجان کو بتصدق امام علیہ السلام معاف کر دیا اور پچھلے تمام اعزازات بھی بحال کر دئے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ احساس پیدا ہوا کہ جو کام خود اسکو کرنا چاہئے تھا وہ اسکے غلام نے انجام دیا۔

اسکے فوراً بعد اس نے حائر مقدس کو نئے سرے سے بنانے کا حکم دیدیا۔ یہ کام جاری رہا اور اسکے بیٹوں شاہ حسین اور شاہ احمد نے اسکو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ کر بلائے معلیٰ کی آٹھویں تعمیر تھی۔

۷۹۵ھ میں بعض گروہوں نے کر بلا والوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ امیر تیمور نے انکی سرکوبی کی اور سارا مال و متاع واپس کرایا۔ ۷۹۶ھ میں وہ کر بلائے

معلیٰ کی زیارت کو آیا تو اس نے مزار مقدس کے گرد ایک گنبد ماحلقہ بنوا دیا۔ اہل بیت کرام کے یہ عقیدت مند یقیناً دنیا و آخرت میں سرخرو رہیں گے لیکن کسی دور میں دشمنوں کی بھی کمی نہیں رہی۔ نویں صدی ہجری کے اوائل میں غالیوں کا ایک گروہ پیدا ہوا جن میں کچھ شیعہ بھی تھے۔ انہوں نے جنوبی عراق میں ایک حکومت قائم کر لی۔ فلاح بن محمد آل شمشع ان کا بانی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ حضرت علیؑ کی روح اسکے اندر حلول کر گئی ہے۔ محمد بن فلاح اس کا بیٹا تھا اور علی بن محمد پوتا۔ یہ ایسے دعووں میں ایک دوسرے پر سبقت کر گئے۔ کوئی مہدی ہونے کا مدعی ہوا اور کوئی الوہیت تک پہنچ گیا۔

ان کے ہاتھوں مشاہد مقدسہ کو بڑے نقصانات ہوئے۔ انہوں نے اس ہتھر کو جلادیا جو قبہ امیر المومنین کو گھیرے میں لیے تھا۔ فلاح ۷۵۲ھ میں اور محمد بن فلاح ۸۶۶ھ میں مر گیا تو علی بن محمد جانشین ہوا جو اپنے کو مولیٰ علی کہتا تھا اور باپ دادا کی طرح نہایت شقی القلب تھا؛ علی خدا ہیں اور خدا کو موت نہیں آتی۔ وہ پوری قہر سامانی سے اٹھا تو ان حاجیوں کو مار ڈالا جو زیارت نجف کیلئے آئے تھے اور نجف و کر بلا دونوں کو لوٹ لیا۔ آخر صفویوں نے ان کی سرکوبی کی اور راہ راست دکھائی۔

ان کے ہاتھوں جو تاریخی ہوئی وہ یقیناً حد سے زائد اور افسوسناک تھی مگر شیعہ سلاطین نے اسکی تلافی کر دی۔ ان میں سلطان حسین، شاہان قراقویونہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قرا یوسف، اسکندر و جہاں شاہ ابن قرا یوسف نے تو روضہ حسینی کی عظمت و رونق بڑھانے میں اپنی حکومت کے غرٹے لٹا دئے اور مشاہد کی گہما گہمی دوبالا کر دی۔

اس طرح تخریب کے دوش بدوش تعمیر بھی چلتی رہی لیکن نویں صدی ہجری کے بعد ساڑھے تین سو چار سو برس تک تعمیر ہی تعمیر ہوئی۔

سلطان اولیس جلائری نے روضہ مقدس کی جو تعمیر کرائی تھی وہ بڑی حد تک مکمل تھی پھر بھی شاہ اسمعیل نے صفویہ حکومت کے قیام کے بعد نجف و کر بلا دونوں کی مرمت کرنے کی سعادت حاصل کی اور آبادی کیلئے خاصے انتظامات عمل میں لایا



اماموں کی روحوں سے مدد کی درخواست کی اور جب نجف کی زیارت کو چلا تو قبة مبارک پر نظر پڑتے ہی چار فرخ پہلے ہی گھوڑے سے اتر کر پاپیادہ ہو گیا۔ بعض ساتھیوں نے جب اس کا سبب دریافت کیا تو کہا: قبة پر نظر پڑتے ہی میرے جسم میں تھر تھری پیدا ہو گئی، گھوڑے پر بیٹھنے کی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ کسی نے کہا ابھی نجف بہت دور ہے، آپ پیدل نہیں جا پائیں گے۔ سلطان سلیمان نے کہا، میں قرآن مجید سے تغاول کرتا ہوں جب میں نے مصحف کھولا تو یہ آیت نکل: فَاخْلُجْ لَعَلَّيْكَ اَنْتَکَ بِالْوَادِ الْعَقْدٰی طوٰی۔ سلطان کچھ دور گھوڑے پر چلتا اور کچھ دور ننگے پیر۔ اسی حالت میں پورا راستہ طے کر کے روضہ نجف میں داخل ہوا۔ (۲۶)

یہ بیان سلطان سلیمان کی عقیدت کا مظہر ہے جسکی تردید ایک فاضل کام ہو گا کیونکہ اہل تسنن میں ہر زمانے میں ایک گروہ ایسا پایا جاتا رہا ہے جو آل رسول کی عظمت کا قائل تھا اور سنی عقیدے کے صوفیاء کا تو اصل مسلک ہی یہی تھا۔ سلطان سلیمان قانونی نے کاظمین کی مسجد کو مکمل کیا جو شاہ اسمعیل صفوی نے بنانا شروع کی تھی۔ پھر تمام مشاہد کیلئے جائدادیں بھی وقف کیں۔ اسکے ساتھ ہی سنی وقف بھی بنائے مگر سو برس بعد سلطان مراد نے تمام شیعہ اوقاف کو سنی وقفوں میں شامل کر دیا بلکہ شیعوں کے جو دوسرے وقف تھے وہ بھی سنی اوقاف کا حصہ بنا دئے۔

سلطان سلیمان نہ صرف شیعوں کی طرح زیارات کو جایا کرتا تھا بلکہ کربلائے معلیٰ کی اصلاحات میں اس نے بعض پیش بہا خدمات بھی انجام دیں۔ دریا کا پانی چڑھنے سے کبھی کبھی شہر میں پانی بھر جاتا تھا اس نے کنارے کنارے بند بنوا دئے جو آج بھی روف سلیمانی کہلاتے ہیں، نہر حسینیہ کی درستی کرائی اور روضہ اقدس کیلئے نذرانے بھی پیش کیے۔

مشاہد کے سلسلے میں شاہان صفویہ کا مذہبی شغف تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ اسمعیل صفوی کے بعد شاہ طہماسپ نے اپنے پندرہ سالہ دور میں کئی مرتبہ حائر حسینی پر توجہ کی.... حائر میں منارہ عبد کی مرمت کرائی بلکہ تقریباً تعمیر نو کی،

ایک نہر بنوائی جو نہر شاہ کہلاتی ہے۔ امام موسیٰ کاظم کی ضریح کے گرد ایک عالی شان عمارت تعمیر کرائی۔ تحائف و ہدایا، جو اس نے مشاہد کی نذر کیے وہ بہت بیش قیمت تھے۔ روضہ اقدس سید الشہداء پر زربلغت کے غلاف چڑھوائے۔ سونے کی قندیلیں لٹکوائیں۔ دیواروں پر نقش و نگار بنوائے اور فرش کو آراستہ کیا۔

مجاہدوں کو اس نے جو نذرانے دئے وہ بھی گرانقدر تھے۔ زائرین اور عزباء میں درہم و دینار تقسیم کیے۔

وہ جب اپنے دارالحکومت میں واپس ہوا تو تمام ملک سے نجاروں اور کاریگروں کو یکجا کر کے مشہدوں کیلئے نئے نقشی صندوق بنوائے اور پرانے صندوقوں کو ہٹوا کر مزاروں پر نئے صندوق نصب کرائے۔ اس نے اپنے ملک کی تعمیر کے ساتھ ساتھ خانوادہ رسالت کے ان علامیوں کے فراموش نہ کیا لیکن عراق پر اسکی حکومت زیادہ دن برقرار نہ رہ سکی اور بقول مسٹر لونگریک مولف فورسچرین:

”ترکی کا شاہ سلیم متضاد صفات کا حامل تھا۔ نئی شیعہ حکومت کا جاہ و جلال عظمت و شوکت اسکو حد سے زیادہ شاق گزرتی تھی۔ اس نے سنی مذہب کی حمایت میں اعلان جنگ کر دیا اور اپنی حکومت کے ابتدائی مہینوں میں شیعوں کا بری طرح قتل عام کیا، جہاں بھی انہیں پایا ہلاک کر دیا۔“ (۱۰۵)

مذہب کے نام پر اس نے عراق حملہ کر دیا۔ فریقین کے مابین کئی جنگیں ہوئیں۔ ترکی افواج کو خود عراق کے اندر سے بھی مسلسل مدد مل رہی تھی جسکے نتیجے میں عراق پر ترکی کا قبضہ ہو گیا لیکن سلطان سلیمان قانونی نے جب ۹۴۱ھ میں عراق کا اقتدار اپنے ہاتھوں میں لیا تو حالات کے تقاضے سے اس نے سلطان سلیم کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ اسکی نظر میں مشتعل شیعوں کے جذبات بھی تھے اور ان عظیم ہستیوں کا دبدبہ بھی جسکے نام پر لوگ گردنیں کٹوا دینا مقصد حیات سمجھتے تھے لہذا اس نے جہان بانی میں عصبيت کے خانے کو خالی چھوڑ دیا۔

”سلطان سلیمان عثمانی ۱۸ جمادی الاول ۹۴۱ھ کو بغداد میں داخل ہوا تو اس نے روضہ امام موسیٰ کاظم اور امام محمد تقی کے روضوں کی زیارت کی پھر امیر المومنین اور امام حسین کے روضوں کی زیارت کا قصد کیا۔ ان دونوں



روضہ مطہر کے اندرونی حصوں کو ٹھیک کرا کے انکی ارائش کی، حرم مبارک کی مسجد میں اضافہ کرایا، صحن حسینی میں شمال کی جانب وسعت دی۔

اسی طرح قبل و بعد کا ہر بادشاہ کچھ نہ کچھ کرتا رہا۔ ۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس اعظم نے دوبارہ بغداد فتح کر لیا تو اس نے زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اسکے جذبہ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار وہ امراء و وزراء کو لے کر اصفہان سے خراسان تک پیادہ گیا اور مشہد مقدس کی زیارت بجالایا۔

شاہ عباس ایران کی آبرو تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ امور مملکت سے بہت کم وقت ملتا پھر بھی تاحیات داسے درے سنے اور قدمے وہ عتبات عالیہ کی خدمات کی عرت حاصل کرتا رہا۔

نادر شاہ کو بعض مورخین نے خونی اور لشر الکھا ہے۔ اس تعریف میں اسکے کئی پیش رو بھی آتے ہیں۔ جیسے صاحبقران امیر تیمور، سلطان محمود غزنوی۔ محمود کو تو بانس پر اس لئے چرمھایا گیا کہ وہ سخت شیعہ دشمن تھا۔ یقیناً نادر شاہ میں ایسی کوئی عصبیت نہ تھی۔ کاش وہ ایسا ہوتا تو احمد شاہ ابدالی سازش کر کے اسکو قتل نہ کر سکتا۔ دوسرا امتیاز محمود کو یہ حاصل تھا کہ اس نے فقہ حنفی پر ایک کتاب لکھی تھی مگر غرٹے کو بھرتا رہا تھا اور مرتے وقت اسکو دیکھ کر ڈاڑھیں مار مار کر روتا تھا۔ اسکے مقابلے پر نادر شاہ کو دیکھا جائے تو جو دولت وہ ہندوستان سے لایا تھا اس کا بڑا حصہ اس نے نجف اور مشہد امام رضا کی نذر کر دیا تھا۔ اسکی بیوی دختر سلطان حسین صفوی نے ایک عالیشان مسجد بنوائی تھی جسپر در کثیر صرف کیا تھا۔ کربلائے معلیٰ پر بھی اس نے خاصی توجہ کی اور وہاں بھی اپنی دولت کا ایک حصہ صرف کیا۔

سلاطین قاجار کا عہد بھی دینی سعادت میں شاہان ماسبق سے کچھ نہیں رہا۔ قبة مبارک پر ابٹک کاشانی نقش و نگار بنے ہوئے تھے، سلطان آغا محمد خاں، پہلے قاجاری فرمانروا نے ۱۲۰۷ھ میں اسکو سونے سے مزین کیا اور مناروں پر بھی سونے کے پتر چڑھوائے مگر وہ پتر شاید کچھ پتلے تھے اس لئے کالے پڑنے لگے۔ آغا محمد خاں کے بعد فتح علی شاہ تخت بیٹھا اور اسکو خبر ہوئی تو اس نے وہ پتر اکھڑا کر انکی جگہ سونے کی موٹی اینٹیں جڑوا دیں۔ اسی طرح کاظمین کے دونوں قبوں کو بھی سونے سے

منڈھوا دیا۔ اسکے بعد ہی نجد سے وہا بیت کا طوفان اٹھا اور اس نے کربلا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مسلمانوں کو حدیث و سنت پر عمل کرتے ساڑھے دس یا گیارہ صدیاں بیت چلکیں، شیعوں کے آئمہ اثنا عشر، اہل السنۃ و الجماعت میں امام ابو حنیفہ امام مالک، امام شافعی امام احمد بن حنبل، امام غزالی امام فخر الدین رازی، صوفیائے کرام میں داتا گنج بخش، خواہ اجمیری، لعل شہباز قلندر اور ان پر مستزاد غوث جیلانی اور بڑے بڑے برگزیدہ بزرگ ترویج اسلام میں زندگیاں گزار کر جاچکے تو نجد میں محمد بن عبد الوہاب پیدا ہوئے اور انہوں نے نعرہ لگایا

محمد بن عبد اللہ صل اللہ علیہ والہ وسلم ہمارے ہی جیسے انسان تھے ہماری ہی طرح پیدا ہوئے اور ہماری طرح مر گئے، نہ پیدائش سے پہلے ہمیں کوئی نفع و نقصان پہنچا سکتے تھے اور نہ مرنے کے بعد۔ عبد کا براہ راست تعلق معبود سے ہے۔ ہر واسطہ بدعت ہے۔ انسان کے مرتے ہی اس کا نامہ اعمال بند ہو جاتا ہے۔ نکات کلام پاک یا خیر و خیرات سے اسکو کوئی ثواب نہیں پہنچتا۔ نذر و نیاز بدعت، نشان قبر باقی رکھنا بدعت وغیرہ وغیرہ۔

یعنی کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ ابٹک اکابر امت نے جو تعلیمات دی تھیں وہ غلط تھیں، ابٹک مسلمان جو کچھ کرتے رہے تھے وہ اصل اسلام کے خلاف تھا۔ یہ تین ساڑھے تین سو سال پہلے کا فلسفہ ہے جس کا آوازہ دولت کی ریل پیل کے ساتھ ہندوپاک میں گونج رہا ہے۔

نجد میں اکابر کی قبروں کا انہدام ان کے دائرہ اقتدار میں تھا لہذا اسکو انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی تاریخی کے منصوبے بنانے لگے اور ۱۲۱۶ھ کے آخر میں ایک دن نجد کا لشکر عازم کربلا ہو گیا۔ مسٹر لونگریک لکھتا ہے۔

”ماہ نیساں کی ۲ تاریخ کی شام ہوتے ہوتے خبر پھیل گئی کہ وہابی کربلا کے قریب آئے ہیں جبکہ شہر کے باشندے نجف میں زیارت بجالا رہے تھے۔ کربلا میں جو لوگ رہ گئے تھے انہوں نے جلدی سے شہر کے دروازے بند کر لیے مگر وہابی جو کئی ہزار



کہا جاتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندوستان کا کوئی بادشاہ کر بلائے محلی کی زیارت کو آیا تھا۔ وہ اس حالت کو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اس نے خوبصورت بازار تعمیر کرائے، خانہ برباد لوگوں کیلئے مکانات بنوائے، شہر کے چاروں طرف ایک بہت مضبوط شہر پناہ تعمیر کرائی جس میں حسب ضرورت برج اور دیدبان بنوائے، برجوں میں آلات دفاع نصب کرائے تاکہ پھر کوئی وہابی قریب پہنچنے کی جرئت نہ کر سکے۔

ہندوستان میں اس وقت اودھ کے علاوہ کہیں بادشاہت نہ تھی اور شاہان اودھ نے پہلے دن سے مشاہد مقدسہ میں دلچسپی لی تھی۔ عزاداری سے انکا شغف اور ولائے اہلیست کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی سے قبل نواب آصف الدولہ نے نہر آصفی بنوائی تھی، جسکی مرمت محمد علی شاہ اودھ نے کرائی اور اسکو آب رسانی کے قابل بنایا۔

اودھ میں سعادت علی خاں غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر اور محمد علی شاہ کے ادوار یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔

محمد علی شاہ نے حضرت حرکاروضہ بنوایا اور امجد علی شاہ نے آقائے محمد حسین نجفی (جواہر الکلام) کے ذریعہ کر بلا کی خدمت کے بعد حضرت عباس کاروضہ مطلقا کرایا پھر کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کے مزارات تعمیر کرائے، نجف میں نہر حسینی نکلوائی اور مسجد کوفہ کا مینار تعمیر کرایا۔

کر بلا کے قتل و غارت سے پورے عالم اسلام میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ سلطان فتح علی شاہ کو بھی خبر مل چکی تھی اس نے تھوڑے وقفے سے اس غارت گری کا بدلہ لیا۔۔۔۔ ایسے میں شیخ جعفر آل کاشف الغطا نے شیعی حلقوں کا دورہ کیا اور ہر طرف سے عطیات کے انبار لگ گئے۔

۱۲۳۲ھ میں سلطان فتح علی شاہ کے بیٹے مرزا محمد علی گورنر کرمان شاہ نے حائر مقدس کی مرمت کرائی اور حرم مطہر کی تزئین میں زر کثیر صرف کیا۔ پھر فتح علی شاہ کی ملکہ نے دونوں مناروں پر سونا منڈھوایا۔ آگے چل کر ناصر الدین قاجار نے قبة کو مطلقا کرایا اور صحن کے مغربی حصہ کو وسیع کرایا پھر ۱۲۷۹ھ میں ناصر الدین قاجار نے

سواروں کی تعداد میں تھے وہاں آکر اتر پڑے۔

انہوں نے اپنی طاقت کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا اور شہر پناہ کی دیوار میں ایک جگہ سوراخ کر لیا۔ اسکے اندر سے داخل ہو کر انہوں نے شہر کے دروازے کھول دیے اور سب کے سب اندر داخل ہو گئے۔ کر بلا کے باشندوں پر ایک دہشت طاری تھی۔ وہ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ سید خودہابی سیدھے ضریح مقدس کے پاس پہنچے اور اسکو مہدم کرنا شروع کر دیا۔ ہر چیز توڑ پھوڑ ڈالی۔۔۔۔۔ بڑے بڑے آئینے چکنا چور کر دیے اور حرم میں جتنی قیمتی اور نفیس اشیا تھیں، بادشاہان عرب اور شاہان فارس کے نذر کئے ہوئے تحفے اور ہدایا تھے، سب ہی لوٹ گئے۔ اسی طرح دیواروں میں جو قیمتی پتھر تھے چھت میں جو سونا تھا شمع دان قالین بیش قیمت جھاڑ فانوس مرصع دروازے غرض کہ اس قسم کی جتنی بھی چیزیں تھیں توڑتاڑ کر باہر دھیر کر دی گئیں۔ (۱۰۷)

عراق پھر ترکوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ ترکی فوج جب تک بغداد سے آئے وہ اپنا کام کر کے چلتے ہیں۔

کر بلا جائے امن تھا۔ مسلح محافظ حرم کے اندر داخل بھی نہ ہو سکتے پھر بھی نہتے شہریوں نے مدافعت کی۔ کوئی پچاس آدمی وہاں قتل ہوئے اور پانچ سو آدمی باہر صحن میں مارے گئے۔ پھر وہابی شہر میں داخل ہوئے۔ ایک ایک گھر کو انہوں نے لوٹ لیا۔ جو سامنے پڑا اسکو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ ایسے مقتولین میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس قتل عام میں ایک افغانی ملا کے بیٹے بھی قتل ہوئے تھے۔ اس ملا نے نجد جا کر شاہ عبدالعزیز کو قتل کر دیا۔

بعض مورخین نے اس لشکر کی تعداد بیس ہزار لکھی ہے اور ان اشیاء کی تفصیل بھی دی ہے جو وہابی لے گئے تھے اور جنگی قیمت بے حساب تھی۔ ۲۰ محرم ۱۲۶۱ھ کے بعد یزید کے جانشینوں کی کر بلا پر یہ سب سے بڑی یلغار تھی جس سے امام حسینؑ کا روضہ بالکل ویران ہو گیا لیکن جلد ہی کر بلا سے بھاگے ہوئے لوگ واپس آ گئے۔ انہوں نے جس حد تک ممکن ہو سکا روضہ حسینی کی مرمت کی اور آہستہ آہستہ اسکی رونق بڑھنے لگی۔



شیخ عبدالحسین طہرانی کو رقمِ خطیر کے ساتھ کربلائے معلیٰ روانہ کیا۔ انہوں نے قبہ حسینیہ پر پھر سے سونا چڑھوایا۔ ایوانات پر کاشی کے نقش و نگار بنوائے۔ فرش کی درستی کر کے قبرِ امام کے سرہانے صحن کو وسعت دی اور صندوق چونکہ وہابیوں نے جلاؤالا تھا لہذا اسکی جگہ نیا صندوق نصب کرادیا۔ ناصرالدین قاجار نے کاظمین اور سامرا میں بھی بہت سی اصلاحات کیں۔

اسکے بعد پورے مشرق وسطیٰ میں مذہبیت کم ہونے لگی۔ عتبات عالیہ میں زائرین کو تعداد بھی گھٹنے لگی نصف صدی تک کوئی اصلاح یا مرمت نہ ہو سکی۔ ایسے میں ۱۳۵۲ھ میں تیسرا اور مشہور منارہ جو سلطان اولیس جلازری کے غلام مرجان نے تعمیر کرایا تھا، حکومت عراق کے حکم سے بلا سبب مہدم کرادیا گیا۔

یہ منارہ چھ سو برس سے روضہ سید الشہداء کی رونق بنا ہوا تھا۔ اسکے انہدام کی بجز اسکے کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس سے جو اوقاف وابستہ ہیں انہیں سنی اوقاف میں شامل کر دیا جائے یہی ہوا مگر شیعہ احتجاج کے علاوہ کبھی کیا سکتے تھے۔

اسکے ایک سال بعد بوہری پیشوا سید نالما طاہر سیف الدین کربلا کی زیارت کو آئے تو آپ نے اصلاحات و تعمیر پر بڑی دولت خرچ کی اور شیعوں کی تالیفِ قلب اور اجرِ آخرت کیلئے مغربی منارہ کو اپنے صرف سے تعمیر کرادیا جو پہلے سے زائد پر شکوہ ہے پھر ۱۳۵۸ھ میں آپ نے ضریح مقدس پر چاندی کی نئی جالی نصب کرائی جو ہندوستانی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔

۱۳۶۰ھ میں آپ نے دونوں مناروں پر نیچے سے اوپر تک سونا منڈھوایا اور ان گرانقدر خدمات کی یاد تازہ کر دی جو داعی صغیر محمد بن الحسن الحسنی شاہ طبرستان نے ۲۸۳ھ میں انجام دی تھیں۔

کربلا نجف کے بعد دوسرا علمی مرکز تھا جس کا تذکرہ انگریز مورخین نے کیا ہے اور مختلف ممالک کے سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں جسکی تفصیل درج کی ہیں مگر اب مدرسہ زینبیہ، مسجد ناصر الدین، مدرسہ صدر اعظم نوری، جامع راس الحسین، جامع سردار حسن خاں، مدرسہ سردار حسن خان کے صرف نام لیے جاسکتے ہیں کچھ مسجدیں باقی ہیں جن میں طلباء کو درس دئے جاتے ہیں۔

## روضہ ابی الفضل العباس

تدفین شہداء کا شرف یقیناً بنی اسد کو حاصل ہے لہذا حضرت عباس کو بھی انہیں لوگوں نے دفن کیا۔ اسکے بعد اس شرف کیلئے کسی کا نام نہیں آتا لیکن ایک روایت تذکروں میں پائی جاتی ہے کہ ابراہیم بن مالک اشتر جب تعمیر مشہد حسین کیلئے کربلا آئے تو وہ حضرت عباس کی قبر پر جا کر کھڑے ہوئے۔ بچپن کے ساتھی تھے آپس میں بے تکلف بھی رہے تھے۔ انہوں نے سلام کے بعد حضرت عباس کو مخاطب کر کے کہا

”عباس! حسین تو امام تھے۔ تم تو امام نہیں تھے کات کر رکھ دیتے ان بزدلوں کو۔“

ایک فحشے کیلئے سنانا سا طاری ہو گیا پھر حضرت عباس کی آواز سنائی دی۔ ”کیا کرتا ابراہیم! آقائے لڑنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ پانی لانے کا حکم دیا تھا وہ لایا تو مگر خیام تک پہنچا نہ سکا!“

مالک اشتر کا بیٹا بڑا بہادر تھا مگر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسکے بعد اس سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ حضرت ابوالفضل کا روضہ پہلے کس نے بنوایا۔

پھر کسی مومن کے جذبہ عقیدت کا تصور کیا جائے تو کربلا کے ساتھ نمایاں طور پر جو نام ذہن میں ابھرتے ہیں ان میں امام حسین اور حضرت عباس سرفہرست ہیں اس لئے پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جس نے روضہ امام کی تعمیر کی وہ حضرت عباس کے مزار کو نظر انداز نہ کر سکا ہوگا اسکے دل میں سیدہ کونین کی رضا کا احساس ضرور پیدا ہوا ہوگا جو حضرت عباس کی زیارت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی لہذا مزار اقدس حسینی کے بیشتر معمار روضہ حضرت عباس کے بھی معمار ہیں۔

حائر مقدس کے شمال مشرق میں تین سو میٹر کے فاصلے پر سپہ سالار لشکر کربلا کا روضہ واقع ہے جو ساحل فرات سے زیادہ دور نہیں اور اپنے مقام وقوع کے لحاظ سے آج بھی نوعیت جنگ کی پوری داستان بیان کرتا ہے۔



روضہ اقدس کی عظیم عمارت سنگ رخام کی بنی ہوئی ہے۔ قبر مطہر پر چاندی کی جالی لگی ہے۔ چاروں طرف حرم حسینی کی طرح بڑے بڑے رواق ہیں جو صاحب مزار کی جلالت کو آشکار کرتے ہیں۔

عالی شان گنبد کے کاشانی نقش و نگار اپنے فن کا شاہکار ہیں۔ قبة کے آگے دو نہایت خوبصورت اور سر بلند منارے میں ان پر بھی کاشانی نقوش بنے ہوئے ہیں اور چوٹی سونے سے منڈھی ہوئی ہے۔ مناروں کے مقابل باب قبلہ پر ایک بڑا برج بنا ہوا ہے جس کا گھڑیاں جمتا ہے تو پورا شہر گونج اٹھتا ہے۔ صحن چاروں طرف بلند دیواروں سے گھرا ہوا ہے جو اگرچہ بہت وسیع نہیں ہے مگر کشادہ اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

گنبد کے نیچے جو ضریح ہے وہ نقرئی ہے لیکن اندر قدیم فولادی ضریح رکھی ہوئی ہے۔ ضریح کے اوپر ڈھال تلوار اور ایک مشکیزہ رکھا ہوا ہے جو آپ کے منصب کا ترجمان ہے۔

حضرت عباسؓ کی صداقت و جلالت زباں زد عام ہے۔ آپ بحیب الدعوات مشہور ہیں، کوئی آپ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا۔

### کاظمین شریفین

تعمیر بغداد سے فراغت پا کر منصور دوانیقی نے دریائے دجلہ کے دوسرے کنارے چھ میل کے فاصلے سے ایک قبرستان بنوایا تھا جس کا نام باب المتین رکھا تھا جو آگے چل کر قبرستان قریش کے نام سے موسوم ہو گیا۔ امام موسیٰ کاظمؑ اور امام محمد تقیؑ جب اس قبرستان میں مدفون ہوئے تو وہ کاظمین کے نام سے مشہور ہو گیا۔

دور بنی عباس کے عروج تک انکی قبروں پر کوئی سائبان تک نہ تھا۔ بنی بویہ کے استقرار حکومت پر سب سے پہلے معزالدولہ نے اس پر توجہ کی اور روضے کی تعمیر کرائی پھر جلال الدولہ نے اس میں اضافے کیے۔ ۴۳۳ھ کے شیعہ سنی فساد میں سنیوں کا سرغنہ مارا گیا اور سنی اسکو دفن کرنے کیلئے اس قبرستان میں لائے تو انہوں نے اشتعال میں تمام قیمتی سامان لوٹ لیا اور روضہ مقدس کو آگ لگادی جس سے لکڑی کا گنبد جل گیا۔ ۴۷۹ھ میں ملک شاہ سلجوقی نے مرمت کرا کے پھر مزین کر دیا

۶۲۲ھ میں الظاہر بامر اللہ کے عہد میں گنبد پھر جلایا گیا۔ گنبد کی نئی تعمیر اس نے شروع اور اسکے جانشین مستنصر باللہ نے مکمل کی۔ ہلا کو خان کے بغداد پر حملے میں کاظمین کو بھی نقصان پہنچا مگر روضہ اسی حالت میں رہا۔ عقیدہ مندوں نے معمولی مرمت کرا دی۔ ۹۲۶ھ میں شاہ اسمعیل صفوی نے اپنے جد اعلیٰ کی خدمت کی سعادت حاصل کی اور روضے کو شایان شان بنادیا۔ اس کا تاریخی پتھر آج تک موجود ہے ۱۲۵۵ھ میں محمد شاہ قاجار نے اسکو زرو جواہر سے مرصع کیا اور ایک عالی شان بارگاہ بنادیا۔

روضے کی چہار دیواری حجروں سمیت کاشانی کام سے مزین ہے۔ صحن کے سات دروازے ہیں: در قبلہ، در صافی، در صاحب العصر، در قریش، در مسجد، در فرہادیہ اور باب اللاد۔ صحن بکا، وسیع اور شاندار ہے۔ وسط صحن میں روضہ مبارک واقع ہے جسپر پہلو بہ پہلو دو گنبد اور چار منارے ہیں جن پر سونے کے پتر جڑے ہوئے ہیں۔ عمارت کے نیچے کا حصہ زمین سے ایک گز تک سنگ مرمر کا ہے۔ اسکے اوپر کاشی کی گلکاری اور آئینہ بندی ہے۔ اندر کے دروازے چوکھٹ باز و ٹھوس چاندی کے ہیں اور پٹوں پر سونے کے پتر جڑے ہوئے ہیں۔ ایوان بلند اور طلائی ہے۔ زیر قبة نقرئی اور طلائی قندیلیں لٹکائی گئی ہیں اور زرنگار شامیانے کے نیچے فولادی ضریحیں نصب ہیں جنکے نقرئی جال پر چادریں پڑی رہتی ہیں۔

مقدس ضریحوں کے شمال سنگ سفید کی عالی شان مسجد ہے۔ نجف و کربلا کی طرح یہاں بھی خزانہ اور توشہ خانہ ہے۔ دریائے دجلہ کے پل کے اس پار اس خونی دیوار کے آثار پائے جاتے ہیں جس میں بے گناہ سادات زندہ چنوائے جاتے تھے۔ (۳۸)

### سامرا

وہ شہر جس میں خانوادہ رسالت کی سطوت آخر دفن بھی ہے اور نظروں سے پوشیدہ بھی یہاں امام علی نقی اور امام حسن عسکری کے مزارات بھی ہیں اور وہ غار بھی واقع ہے جس میں حضرت حجت نے غیبت اختیار فرمائی تھی۔



روضہ بادی النظر میں زیادہ پر شکوہ نہیں ہے لیکن جن ذوات مقدسہ سے اسکی وابستگی ہے انکی جلالت سے قریب پہنچتے ہی سر عقیدت سے جھکنے لگتے ہیں۔ رواق روضہ میں جناب حکیمہ خاتون بنت امام علی نقی اور جناب نرجس خاتون والدہ ماجدہ حضرت تھت کے مزار بنے ہوئے ہیں جن پر نظر پڑتے ہی تاریخ ماضی کی ایک ایک بات سامنے آجاتی ہے۔

مزار مقدس کی چہار دیواری بادشاہ اودھ کی بنوائی ہوئی ہے۔ گنبد کے کس پر سونا بھی محمد علی شاہ نے چڑھوایا تھا اور ایک مسافر خانہ بھی بنوایا تھا۔

### دمشق

اس شہر کی قدامت ادوار ماقبل تاریخ میں دور دور تک بڑھتی چلی جاتی اور ان حدود سے جا کر مل جاتی ہے جب حضرت آدم کو زمین پر آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ شہر سے دو میل کے فاصلے سے سلوانامی پہاڑی پر حضرت ذوالکفیل اور حضرت آدم کے بیٹوں قابیل و ہابیل کی قبریں بنی ہیں اور اسی پہاڑی کے وسط میں ایک کمرے کے اندر حضرت محمد حنفیہ ابن علی کا مزار مبارک ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ محمد حنفیہ بھی کبھی قبر جناب زینب اور مزار سکینہ بنت الحسین کی زیارت کیلئے آئے تھے۔

کمرے کے ایک کونے میں وہ سوراخ بنا ہوا ہے جس سے اصحاب کہف کا غار نظر آتا ہے۔ باہر اصحاب کہف کے کتے کی قبر ہے۔

پہاڑی پر زیتون کا وہ درخت بھی ہے جو حضرت موسیٰ کے عصا سے درخت بن گیا تھا۔ وہ خشک ہو جاتا ہے تو اسی جگہ دوسرا درخت پیدا ہو جاتا ہے۔

شہر سے باہر ایک بڑا قبرستان واقع ہے جسکے مقبرے ہماری تاریخ کا حصہ ہیں: سکینہ بنت الحسین، ام کلثوم بنت امیر المؤمنین، فاطمہ صغریٰ بنت الحسین، عبداللہ ابن جعفر، مؤذن رسالت حضرت بلال، حضرت ام سلمہ، حضرت ام حبیبہ، عبداللہ ابن ام مختوم، عبداللہ بن سید سجاد عبداللہ بن امام جعفر صادق، حجر بن عدی، مکد بن اسو الکندی، ابوبی بن کعب۔

ان مزارات میں بہت سے تحقیق طلب ہیں مگر ان سے یہ انکشاف ضرور ہوتا

ہے کہ زندان شام میں بہت سے بچے مر گئے اور ہو سکتا ہے کہ بعض خواتین بھی دمشق کی خاک کا بیوند ہو گئیں اور وطن واپس نہ ہو سکیں۔

زندان شام کھنڈر کی صورت میں باقی ہے۔ اس میں رقیہ بنت الحسین کا مزار موجود ہے جسکو ہماری تاریخ میں سکینہ بنت الحسین سمجھا گیا ہے۔ سکینہ کی قبر عام قبرستان میں بنی ہوئی ہے۔ ناموں کی تبدیلی کی صحت اگر کی بھی جائے تو اس سے کوئی افادی پہلو پیدا نہیں ہوتا۔

بازار دمشق کا وہ پھانک بھی اب تک موجود ہے جس سے گزر کر اسیران اہل بیت دربار میں لائے گئے تھے۔

امویوں کی عالیشان مسجد بھی باقی ہے اور اسکے ایک گوشے میں وہ منبر بھی ہے جس پر بیٹھ کر امام زین العابدین نے خطبہ دیا تھا۔ کربلا کے اسیر دو چہوتروں پر لا کر کھڑے کئے گئے تھے۔ یہ چہوترے بھی پائے جاتے ہیں۔

دمشق سے دس میل پر جناب زینب کا روضہ اقدس ہے جو قریۃ زینبیہ کہلاتا ہے۔ آپ کی وفات کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے لیکن اغلب یہی ہے کہ آپ نے دمشق میں وفات پائی اور اس باغ میں دفن ہوئیں جو حضرت عقیل کی ملکیت تھا سرآغا خاں کی والدہ نے آپ کے مزار پر ازراہ عقیدت ایک عمارت تعمیر کرائی، قبر پر بیش قیمت ضریح نصب کی اور زائرین کے قیام کیلئے حجرے بھی بنوائے۔ بعض حجرے دوسرے حضرات نے بھی بنوائے پھر حبیب بنک کے مالک "حبیب" نے چاندی کی ایک ضریح چڑھائی اور ایک امام باڑہ بھی تعمیر کرایا۔

مدینہ اور مصر میں بھی جناب زینب کی قبریں بتائی جاتی ہیں۔ اصل قبر کہیں بھی ہو ہر جگہ وہ مقصد حسینی کو پورا کرتی ہے اور ہر مقام پر تاریخ کربلا کا علامہ بنتی ہے اور ایک اسی قبر پر موقوف نہیں، کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک جا بجا اطفال آل رسول کی قبور ایک داستان مظلومیت بیان کرتی ہیں اور ان سے جو معجزے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ عظمت اہل بیت کا سکہ دلوں پر بٹھا دیتے ہیں۔

کربلا کے ارد گرد نزدیک و دور بنے ہوئے شہداء کے مزار بھی اسی تعریف میں ہیں۔ کتاب کی تنگ دامانی جنگی تفصیل لکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔



### مشہد مقدس

ایران کی روایتی تاریخ سے سہ چلتا ہے کہ مشہد مقدس کے موجودہ جائے وقوع پر جمشید نے ساکد نام کا ایک شہر آباد کیا تھا جسکے دو حصے تھے: طاران اور نوقان، نوقان نام کا ایک محلہ اب بھی پایا جاتا ہے۔

ایک دوسری روایت سکندر ذوالقرنین کے بارے میں ہے کہ جب وہ سرزمین طوس میں وارد ہوا تو اس نے خواب دیکھا کہ ایک نور زمین سے آسمان تک ساطع ہے اور ایک آواز اس کے کان میں آرہی ہے کہ:-

"اس مقام پر پیغمبر آخر الزمان کا آٹھواں وصی دفن ہوگا!"

اس خواب کو اس نے حکم غیبی قرار دیا اور گرداگرد ایک چہار دیواری کھنودی پھر نور طلوع ہونے کی جگہ پر ایک قبر کھودادی اور اس پر ایک تختی لگوادی۔

"مرقد وصی ہشتم ختم للمسلین!"

پھر وہیں پر ایک شہر آباد کیا جس کا نام "سناباذ" رکھا۔ اس روایت کو صرف عقیدے کی روشنی ہی میں مانا جاسکتا ہے مگر تاریخ کی آنکھ نے سناباذ کو ایک گاؤں کی حیثیت سے موجود پایا۔

عباسی خلیفہ ہارون رشید جب رافع بن لیث کی بغاوت فرد کرنے کیلئے خراسان پہنچا تو سناباذ کے دہاتی محل میں قیام پذیر ہوا۔ وہاں وہ بیمار ہو گیا اور ۱۹۳ھ میں اسی بیماری میں انتقال کر گیا۔

اس واقعہ کے دس سال بعد ۲۰۳ھ میں مامون اعظم مرد جانے کیلئے اسی راستے سے گزرا اور وہ بھی اسی محل میں ٹھہرا۔ اسکے ساتھ امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بھی تھے جنکو مامون نے ولی عہد سلطنت بنایا تھا یعنی مامون کے بعد ہونیوالا بادشاہ۔ آئمہ اثنا عشر کے ملنے والوں کے وہ آٹھویں امام تھے۔ وہ بھی مامون کے ساتھ مروجہ رہے تھے مگر مامون نے انہیں زہر آلود کر کے انکو رکھلا دئے اور وہ اسی مقام پر رحلت فرما گئے۔

سناباذ نوقان کو تمام شیعہ دنیا میں عزت و تکریم کا جو مقام حاصل ہے، وہ

عباسی خلیفہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس مقدس امام کے روضے کی وجود سے ہے اور وقت گزرنے پر اسی روضے کی وجہ سے یہ جگہ ایک معمولی گاؤں سے بڑھ کر بہت بڑے شہر کی شکل اختیار کر گئی پھر اسے "المشہد" کے نام سے پکارا جانے لگا، جس کا نام "ضريح خانقاه" ہے یعنی ایسے شہید کا مدفن جو آنحضرت کے اہل بیت میں سے ہو۔

مشہد اول دن سے جہانگیری اور جہانبانی کی زد پر رہا اور ایران و عراق میں طاقتوں کے اتار چڑھاؤ کا اس پر اثر پڑتا رہا۔ سبکتگین نے خراسان کو فتح کیا تو روضہ اقدس کو مسمار کر دیا۔ ایک عرصے تک وہ اسی عالم میں پڑا رہا پھر ایک رات محمود نے امیر المومنین کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا، "محمود اکب تک یہ حالت باقی رہے گی؟" محمود حضرت علی کا اشارہ سمجھ گیا اور اس نے اسکے بعد ہی سبکتگین کے عمل کی تلافی کر دی اور مزار اقدس کو نئے سرے سے بنوا دیا۔

اسکے بعد غوریوں کے خراسان پر حملے میں قلعہ کے ساتھ حرم اقدس کی عمارت کو بھی نقصان پہنچا چونتیس برس کے بعد سلجوقی عہد میں ابو طاہر قمی نے قبة مبارک کو ٹھیک کرایا۔

پھر ایشیا جب چنگیز خاں کے زرد طوفان سے متاہ ہوا تو چنگیز کے چھوٹے بیٹے توئی خاں نے شہر کی غارت گری کے ساتھ ساتھ قبة اقدس کو بھی برباد کر دیا۔

ایک صدی تک قبر مطہر بلا قبة کے رہی۔ آخر الجا تو خاں عرف خدا بندہ نے روضہ انور کی نئے سرے سے تعمیر کرائی پھر خدا بندہ کے بیٹے ابو سعید نے درو دیوار پر کاشی کا کام بنوایا۔ قبر اطہر پر تفرنی قندیلیں آویزاں کیں، دروازوں پر سونے کے تاروں سے بنے ہوئے ریشمی پردے ڈلوادئے۔ موجودہ قبة خدا بندہ ہی کا تعمیر کردہ ہے

۷۹۱ھ / ۱۳۸۸ء میں طوس پر تیمور کے بیٹے میران شاہ نے ضرب کاری لگائی

کیونکہ یہاں کا مغل حکمران باغی ہو گیا تھا اور اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا لہذا میران شاہ کو اس کے باپ نے اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ کئی ماہ کے محاصرے کے بعد طوس کو تاراج کر دیا گیا۔ شہر کھنڈروں کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ دس ہزار باشندے تہ تیغ کر دئے گئے۔



جو لوگ اس بربادی اور قتل عام سے بچ سکے انہوں نے روضہ امام میں آکر پناہ لی۔ اس وقت سے طوس بالکل ویران ہو گیا اور مشہد اس علاقہ کا صدر مقام بن گیا

ایران کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح اس شہر نے بھی اپنی چار دیواری کے اندر بغاوتوں اور معرکوں کے ہولناک مناظر دیکھے۔ غزنوی سلطان مسعود کے زمانے میں یہاں کے گورنر نے ۱۰۳۷ء میں حضرت امام رضا کے روضہ اقدس کی حفاظت کے لیے دفاعی مورچے بنوائے۔ ۱۱۲۱ء میں شہر کے ارد گرد ایک فصیل بنوادی گئی، جس سے کچھ مدت تک حملوں سے بچنے کا انتظام ہو گیا تاہم ۱۱۹۱ء میں غوری شہر کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن انہوں نے مقدس حدود کے اندر غارتگری کرنے سے احتراز کیا۔ ۱۲۹۶ء میں مغلوں کا ایک نڈی دل سلطان غازان کے زمانہ میں یہاں آیا تھا۔ اس شہر کے بڑے محسنوں اور مقبرہ امام کے عقیدت مندوں میں پہلا تیموری بادشاہ شاہرخ (۸۰۹ھ / ۱۳۰۶ء تا ۸۵۰ھ / ۱۳۴۶ء) اور اس کی نیک سیرت بیوی ہے۔

ایران میں صفوی خاندان کے عروج کے ساتھ مشہد کے لیے بھی ایک نئے دور آغاز ہوا۔ اس خاندان کے سب سے پہلے بادشاہ اسمعیل اول (۹۰۷ھ / ۱۵۰۱ء تا ۹۳۰ھ / ۱۵۲۳ء) ہی نے شیعہ مذہب کو سرکاری قرار دے دیا۔ اس کے منصوبوں میں مقدس شہروں، بالخصوص مشہد اور قم کی حفاظت شامل تھی اور اس حکمت عملی پر اس کے جانشین بھی کار بند رہے۔

انہوں نے مزار مقدس کی تعمیر میں خاص سرگرمی کا اظہار کیا۔ اس لحاظ سے طہماسپ اول جو اسمعیل اول کا جانشین تھا (۹۳۰ھ / ۱۵۲۳ء تا ۹۸۳ھ / ۱۵۷۶ء) اور شاہ عباس اول (۹۹۵ھ / ۱۵۸۶ء تا ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) کو ایک امتیاز حاصل ہے۔

سولہویں صدی میں ازبکوں کے متواتر حملوں سے شہر کو بے اندازہ نقصان پہنچا اور ۱۵۸۹ء مشہد کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ شیبانی عبدالمومن نے چار ماہ کے محاصرے کے بعد اہل شہر کو اطاعت قبول کر لینے پر مجبور کر دیا۔ شہر کے بازاروں میں خون کی ندیاں بہ نکلیں اور اندھا دھند لوٹ مار نے مقدس رقبہ کے دروازوں تک

کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شاہ عباس اول ۱۵۸۵ء میں جب قزوین میں تخت پر مہمکن ہوا تو وہ بھی ۱۵۹۸ء تک شہر کو ازبکوں سے واپس نہ لے سکا۔

طہماسپ ثانی کے عہد حکومت میں یعنی ۱۶۲۲ء میں ابدالی قبیلہ کے افغانہ نے خراسان پر حملہ کیا اور مشہد پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضے میں بھی شہر اور شہریوں کی تباہی ہوئی اور روضے کو بھی نقصان پہنچا۔

۱۶۲۶ء میں دو ماہ کے محاصرے کے بعد نادر شاہ کے اسے دوبارہ حاصل کیا۔ اس نے اپنے لیے یہاں ایک مقبرہ تعمیر کر لیا اور روضے کی رونق بڑھانے پر توجہ کی۔ نادر شاہ کے انتقال کے بعد مدعیان تاج و تخت کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی، جس میں ایرانی سلطنت کا اتحاد و اتفاق پارہ پارہ ہو گیا۔ نادر شاہ کی حکومت کا سارا مشرقی حصہ، بالخصوص خراسان احمد شاہ درانی کے قبضہ میں چلا گیا۔ کریم خان زند نے خراسان حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی پھر احمد شاہ اور اس کے جانشین تیمور شاہ نے خراسان کا علاقہ باج گزار امیر کی حیثیت سے نادر شاہ کے پوتے کے سپرد کر دیا اور اس طرح خراسان دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل بن گیا تاہم اصلی حکمران ہونے کی حیثیت سے ان دونوں بادشاہوں یعنی احمد شاہ اور تیمور شاہ نے مشہد میں اپنے نام کے سکے جاری رکھے۔

نابینا شاہرخ کا عہد حکومت متواتر مگر مختصر وقفوں کو چھوڑ کر، کوئی نصف صدی تک قائم رہا اور اس عرصے میں کوئی اہم واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوا البتہ تیمور شاہ کی وفات (۱۲۰۷ھ / ۱۷۹۲ء) کے بعد آغا محمد خان بانی خاندان قاجار شاہرخ کی مملکت پر قابض ہو گیا۔ اس نے ۱۲۲۰ھ / ۱۷۹۵ء میں شاہرخ کو سزائے موت دی اور اس طرح ایران سے خراسان کی علیحدگی کا زمانہ ختم ہو گیا۔ شاہرخ کا بیٹا نادر مرزا ہرات کی طرف فرار ہو گیا تھا اس نے مشہد میں واپس آکر پھر عنان حکومت سنبھال لی۔ قاجاری فوج نے اس کا محاصرہ کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۱۸۰۳ء میں فتح علی شاہ نے کئی ماہ کے محاصرے کے بعد اسے دوبارہ فتح کر لیا۔

۱۸۲۵ء سے خراسان کا علاقہ ترکمانوں کے نڈی دل کی یلغاروں اور قبائلی سرداروں کی باہمی اور متواتر ناچاقی کی وجہ سے سخت مصیبت میں مبتلا رہا۔ پھر علاقہ کا



انتظام قائم کرنے کے لئے شہزادہ عباس مرزا قاجار فوج کے ساتھ خراسان میں داخل ہوا اور اس نے مشہد کو اپنا صدر مقام بنالیا اور ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء میں فوت ہو گیا۔ انیسویں صدی کا اہم سیاسی واقعہ یہ ہے کہ حسن خان سالار خراسان کے گورنر نے جو شاہ محمد عباس کا عمزاد بھائی تھا، بغاوت کی اور دو سال تک (۱۸۲۷ء تا ۱۸۲۹ء) شاہی افواج کا مقابلہ کرتا رہا۔ ناصر الدین قاجار کی تخت نشینی کے موقع پر (۱۸۲۸ء) خراسان حقیقی معنوں میں بالکل خود مختار تھا۔ آخر جب مشہد کے باشندے قحط سالی سے تنگ آکر سالار سے بگڑ گئے تو حسام الدولہ کی افواج شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

۱۹۱۱ء میں ایک شخص یوسف خان ہراتی نے مشہد میں محمد علی شاہ کے لقب سے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور کچھ عرصہ کیلئے اس نے رجعت پسندوں کے ایک گروہ کی مدد سے خراسان میں انتشار پیدا کر دیا۔ اس سے روسیوں کو مداخلت کا بہانہ مل گیا اور ۲۹ مارچ ۱۹۱۳ء کو انہوں نے ایران کے سیادت حق کی خلاف ورزی کر کے مشہد پر گولہ باری کی۔ کئی بے گناہ شہری اور زوار قتل ہوئے۔ ایران کے اس قومی اور مقدس مقام پر گولہ باری سے ساری اسلامی دنیا کو صدمہ ہوا۔ اس کے بعد ایرانیوں نے یوسف خان کو گرفتار کر کے اسے قتل کر دیا۔

بحالت موجودہ مشہد مشرقی ایران کا مرکز اور خراسان کے صوبے کا پائے تخت ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جس وقت سے افغانوں نے اس کے مشرقی حصے پر قبضہ کیا، یہ صوبہ اپنی پہلی وسعت کے لحاظ سے آدھا بھی نہیں رہا۔

قرون وسطیٰ میں طوس کے بعد نیشاپور پورے صوبے کا مرکزی شہر تھا۔ اسکی جگہ مشہد نے لی مگر نادری حکومت کے زوال کے بعد کوئی شہزادہ گورنری کے عہدے پر فائز ہوتا رہا پھر یہ منصب روضہ امام کے متولی کو ملتا رہا۔

### مشہد ایک شہر

ایران کے دوسرے شہروں کی طرح مشہد بھی کئی دیواروں کے حلقوں سے گھرا ہوا ہے جس سے اس کی شکل میں ایک دلفریبی پیدا ہو گئی ہے۔ دفاعی صورتوں کو مضبوط کرنے کے لیے جو مورچے تھے، یعنی ایک چھوٹی سی خندق اور اس کے ارد

گرد فصیل اور باہر کی طرف گردا گرد ایک چوڑی کھائی، یہ ساری تعمیر اب کھنڈر ہو چکی ہے اور بعض جگہ تو بالکل ہی ناپید ہے۔

قلعہ شہر کے جنوب مغربی حصے میں واقع ہے اور براہ راست دفاعی مورچوں کے سلسلے سے منسلک ہے۔ اس کی شکل مستطیل کی سی ہے جس کے کونوں پر چار بڑے بڑے برج ہیں اور کچھ چھوٹے چھوٹے برج بھی۔ محل شاہی جس کی تعمیر عباس مرزا نے شروع کی تھی لیکن جو ۱۸۷۶ء میں مکمل ہوا، اپنے وسیع باغات کے ساتھ خاص قلعہ سے وابستہ ہے جو اب خستہ ہو چکا ہے۔ یہ قلعہ اب گورنر کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ سرکاری عمارتوں کے سارے علاقے کو ایک کھلا میدان شہر سے علیحدہ کرتا ہے، جو توپ میدان کہلاتا ہے اور فوجی قواعد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

شہر کی دیواروں میں چھ دروازے ہیں۔ شہر چھ بڑے اور دس چھوٹے محلوں میں منقسم ہے۔ بڑے محلوں کے نام دروازوں کے نام پر لکھے ہوئے ہیں۔

سب سے بڑا بازار جو شہر کو تقریباً دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے، "خیابان" کے نام سے مشہور ہے۔ اسے شاہ عباس اول نے بنوایا تھا۔ یہ بازار ایک عمدہ سیرگاہ ہے اور سب سے بڑی شارع عام ہے، جہاں ہر وقت خاص کر دوپہر کو بڑی جہل پہل اور رونق رہتی ہے۔

نہر خیابان، جو نو فٹ چوڑی اور پانچ فٹ گہری ہے، اس بازار کے بیچ میں سے گزرتی ہے۔

حرم تک پہنچ کر بڑا بازار دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے: بالا خیابان شمال مغرب کی طرف اور پائین خیابان جنوب مشرق کی جانب جن میں سے پہلا دوسرے کی نسبت تقریباً تین گنا ہے۔ امام الرضا کے مقبرہ کے مقدس رقبہ کو بست کہتے ہیں اس کے علاوہ حرم شریف یا حرم مقدس یا حرم رضاوی کے نام بھی اس کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات اسے محض "امام" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں جیسا کہ ایران اور عراق میں یہ اصطلاح ایسی عمارت یا ایسے قطعہ زمین کے لیے بھی



استعمال ہوتی ہے جو کسی امام کے حوالے سے مقدس ہو۔

بست کی شکل مستطیل ہے، جس کا رقبہ ۹۰۰ فٹ x ۷۰۰ فٹ ہے اور یہ پائیں خیابان کے نصف میں واقع ہے۔ اس کے صحن مساجد، خانقاہیں، مدرسے، سرائیں، بازار اور سکونت مکان وغیرہ بطور خود ایک علیحدہ شہر ہیں جس کے گرد آگرد ایک دیوار بنی ہوئی ہے جو عملی طور پر اسے باقی شہر سے الگ کر دیتی ہے۔ خیابان سے حرم میں داخل ہونے کے دو راستے ہیں جن کے دروازے شمال اور جنوب میں واقع ہیں لیکن ان میں زنجیریں لگادی گئی ہیں، تاکہ کوئی گاڑی یا سواری کا جانور ان میں داخل نہ ہو سکے، کیونکہ بست کی زمین پاک ہے اور اس میں صرف پیادہ پا ہی چلنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی جانور اتفاقیہ طور پر وہاں آجائے تو وہ امام کے ادارہ انتظام کی ملک ہو جاتا ہے۔ بست کو جائے پناہ ہونے کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اگر مقروض یہاں آکر پناہ لے لیں تو وہ قرض خواہ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مجرموں کو متولی باشی کے حکم سے ہی حکام کے حوالے کیا جاتا ہے، ایسا عموماً تین دن کے بعد ہوتا ہے۔ بست کے سارے رقبے کا انتظام بست سے متعلق پولیس کرتی ہے۔ چوروں کے لیے یہاں ایک خاص قید خانہ بھی ہے۔ غیر مسلمین کیلئے بست میں داخلہ ممنوع ہے۔ پہلے اس پابندی میں زیادہ سختی نہ تھی مگر اب پورا عملدرآمد کیا جاتا ہے۔

### روضہ اقدس کے تزئین کار۔

مشہد کی تاریخ کے سلسلے میں کئی نام درج کیے جا چکے ہیں جن میں سلطان محمود نے خواب میں امیر المومنین کی تہدید پر تعمیر کرائی، سلطان سنجر کا بیٹا بارگاہ امام میں دعا قبول ہونے سے سخت یاب ہوا تو اس نے منت اتاری اور روضے کی مرمت کرائی الجا تو خدا ابندہ اور تیموری شاہزادے شاہرخ نے ثواب حاصل کرنے کیلئے توجہ کی اور شاہرخ کی بیوی گہر شاد نے فرط عقیدت میں آنکھیں پکھا دیں۔ مزار اقدس کے جنوب کی مسجد دارالسیادہ اس کے طحہ والان اور دارالحفاظ اسی ملکہ کے بنوائے ہوئے ہیں۔

تیمور کے پوتے سلطان حسین بایقرا (۱۴۶۹ تا ۱۵۰۶ء) کے وزیر شیر علی نے

صحن کہنہ کے جنوب میں عمارات بنوائیں، جن میں دلفریب اور شاندار ڈیوڑھی بھی شامل ہے۔ صفویوں کے اقتدار کے زمانے میں مشہد کیلئے پھر ایک درخشان عہد کا آغاز ہوا۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے روضہ امام علی الرضا کی زیبائش اور ترقی کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کی جسے انہوں نے اپنی سلطنت کا مذہبی مرکز بنالیا۔

اس سلسلے میں طہماسپ اول، عباس اول، عباس ثانی اور سلیمان اول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طہماسپ اول (۱۵۲۴ء تا ۱۵۷۶ء) نے صحن کہنہ کے شمالی حصے میں ایک مینار تعمیر کرایا جس پر سونا منڈھوایا اور روضہ کے گنبد پر خالص سونے کی چادریں چڑھوائیں اور اس کے اوپر ایک سنہرا کلس بھی لگوا دیا۔ ازبک ۱۵۸۹ء میں یہ قیمتی اور زیبائشی سامان اپنے حملے میں لوٹ کر لے گئے۔

عباس اعظم اول نے دوسرے صفوی بادشاہوں کے مقابلے میں (۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۷ء) مشہد کی سب سے زیادہ خدمت کی۔ عباس ثانی (۱۶۲۱ء تا ۱۶۶۶ء) نے اپنی توجہ صحن کہنہ کی مزید آرائش و زیبائش پر مبذول رکھی۔ اسکے بعد اس سلسلے میں سلیمان اول کا نام آتا ہے۔

غیر ممالک کے بادشاہوں نے بھی روضہ امام کے لیے گراں بہا عطیات دیے۔ شہنشاہ اکبر فرماں روا نے ہند ۱۵۹۵ء میں مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گیا اور ۱۶۱۲ء میں قطب شاہ فرمانروا نے دکن بھی زیارت سے مشرف ہوا۔

نادر شاہ (۱۷۴۷ء تا ۱۷۴۷ء) نے بھی اٹھارہویں صدی میں بڑی خدمت کی۔ اس نے، اس بیشمار دولت کا گران قدر حصہ، جو وہ ہندوستان کی مہم سے لایا تھا، اس عظیم المہبت زیارت گاہ کی زیبائش و آرائش پر خرچ کر دیا: صحن کہنہ کے جنوبی نصف حصے میں جو سلطان حسین بایقر کے زمانے کی عمارت تھی دوبارہ اسکی تجدید و تزئین کرائی، آستانہ عالیہ (ڈیوڑھی) کی زیبائش پر گراں بہا دولت صرف کی، اس پر سونے کی چادر چڑھوائی چنانچہ اس کو اب تک "نادری طلانی دروازہ" کہتے ہیں۔ ۱۷۳۰ء میں اپنی تخت نشینی سے پہلے نادر شاہ نے صحن کے بالائی حصے میں ایک مینار تعمیر کرایا جس پر سونا منڈھوایا جو صحن کہنہ کی شمالی جانب طہماسپ اول کے تعمیر



کردہ بینار کا جواب تھا۔

انیسویں صدی کے چار حکمرانوں، مثلاً فتح علی (۱۷۹۷ء تا ۱۸۳۲ء) نے بھی بڑی عقیدتمندی کے ساتھ پیشروں کی تقلید کی اور حضرت امام کے روئے پر مسلسل توجہ دیتے رہے۔

اس کے بعد، باوجود اسکے کہ متعدد بار غارت گری ہو چکی ہے، مشہد مقدس میں اب بھی بے شمار دولت موجود ہے۔

بعض قدیم آثار کو چھوڑ کر پوری عمارت اتنی اچھی حالت میں ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کی تعمیر معلوم ہوتی ہے۔ حرم کی تمام موجودات بھی ایسی ہی ہیں

مقبرے کا گنبد اپنے طغات کے ساتھ رقبہ حرم کے وسط سے بلند ہوتا ہے۔ اس کی شمالی اور مشرقی حدود میں دو وسیع مستطیل صحن ہیں یعنی صحن کہنہ اور صحن نو، جنوب میں گوہر شاد کی وسیع مسجد کی عمارتیں اس کے ساتھ مل جاتی ہیں۔

### حرم کی ساخت

بست میں داخل ہونے کا مقبول راستہ بالا خیابان کا دروازہ ہے اس میں ایک زنجیر لٹکی رہتی ہے۔ اسکے بعد سڑک ہے جو کوئی ۲۵۰ گز تک بازار سے گزرتی ہے اس میں دورویہ دوکانیں ہیں۔ یہ سڑک ایک عظیم دروازے پر جا کر ختم ہو جاتی ہے، جہاں سے صحن کہنہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کا شمالی حصہ شاہ عباس اول کے وقت کا بنا ہوا ہے اور جنوبی غالباً پندرہویں صدی کے آخری نصف میں (عہد سلطان حسین بایقرا) لیکن نادر شاہ نے اس کی مکمل مرمت کرا دی تھی۔ چار بڑے بڑے برج جن میں ستونوں والے مسقف ایوان ہیں اس صحن میں کھلتے ہیں۔ ان میں سے سادہ ترین برج وہ ہیں جو مغرب اور مشرق کی جانب واقع ہیں اور جنہیں عباس اول نے تعمیر کیا تھا۔ پہلے برج میں اب گھنٹہ گھر ہے اور دوسرے کے چبوترے پر نقارہ رکھ دیا گیا ہے جہاں ہر صبح و شام نو بت نوازی ہوتی ہے۔ مشرقی دروازے کے راستے عقیدت مند بست کے مشرقی مدخل پر پہنچ جاتے ہیں جو پائیں خیابان کے بیچ سے ہو کر گزرتا ہے۔ فن تعمیر کے لحاظ سے زیادہ موقر شمالی دروازہ ہے جسے عباس ثانی

نے تعمیر کرایا تھا اور خاص کر صحن کا جنوبی دروازہ یعنی نادر کا طلائی دروازہ جو نادر شاہ کے زمانے کا نمونہ فن ہے اور حرم کی سب سے دلکش عمارت ہے۔

ان دونوں دروازوں کے پاس ایک ایک بینار سو سو فٹ بلند ہے۔ ان کا اوپر کا حصہ سونے کی چادروں سے مٹا کر دیا گیا ہے۔ شمالی دروازہ ٹھہماسپ اول نے بنوایا تھا اور جنوبی دروازہ نادر شاہ نے۔ نادر شاہ نے صحن کے وسط میں ”چاہ نادر“ کی مشہور مٹمن عمارت بھی تعمیر کرائی تھی۔ اسے ستا خانہ نادر کہتے ہیں اس کے اوپر گلٹ کی چھتری ہے۔ یہ عمارت، سنگ مرمر کی ایک عظیم المٹم سل میں سے جو نادر شاہ صرف کنیر کر کے ہرات سے لایا تھا، تراشی گئی تھی۔

صحن کی دیواروں میں حجروں کی دو قطاریں بنی ہوئی ہیں۔ نیچے والی قطار میں مدرسے، کاریگروں اور خدام مسجد کے سکونت مکانات ہیں۔ حضرت کے اعلیٰ عہدے دار اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔ تمام صحن کے فرش پر، جس کی لمبائی سو فٹ کے قریب ہے اور چوڑائی تقریباً ۱۰ فٹ ہے، مشہد کے سیاہ پتھر کی فرش بندی کی گئی ہے جو کسی حد تک مقبروں کے پتھروں سے مشابہ ہے۔

نادر شاہ کے طلائی دروازے سے جنوب کی جانب روضہ اقدس کے احاطے کی طرف راستہ جاتا ہے جو ایوانوں اور کمروں سے گھرا ہوا ہے۔ اصل میں اس احاطے کے تمام رقبے میں سے اسی مرکزی حصے کو حرم مبارک کہنا چاہئے۔ چونکہ یہ اصطلاح بست کے تمام رقبے کے لیے استعمال ہوتی ہے لہذا اس کے لیے الروضۃ المطہرہ اور آستانہ کے نام استعمال ہوتے ہیں۔ طلائی دروازے میں سے گذر کر دارالسیادہ میں پہنچتے ہیں جو گوہر شاد نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ اس حرم میں بہترین ایوان ہے۔ زائر حجرہ مرقد کی زیارت دارالسیادہ کے ایک چاندی کے جنگلے میں سے کر سکتا ہے۔ جنوب مشرق کی جانب مڑ کر ایک چھوٹے سے کمرے کو جس کی زیبائش سادہ طریق سے ہوئی ہے آراستہ کیا گیا ہے۔ اسے دارالحفاظ کہتے ہیں۔

دارالحفاظ سے ملحق شمال کی جانب مقبرہ امام کا گنبد ہے۔ تربتی حجرے کا اندرونی حصہ تقریباً مربع شکل کا ہے، یعنی ۳۰ فٹ x ۲۷ فٹ۔ اس میں کوئی دیوچہ نہیں ہے۔ اس لیے اس کو طلائی چراغوں اور شمعدانوں کی ہلکی روشنی سے روشن



رکھا جاتا ہے۔ اس کو بڑی شان و شوکت سے آراستہ کیا گیا ہے۔ مزار اقدس شمالی مشرقی کونہ میں ہے جس کے گرد تین نہایت خوبصورت جنگلے بنے ہوئے ہیں جن میں سے ایک ۱۷۴۷ء کا ہے اور جس کے متعلق روایت ہے کہ نادر شاہ کے مقبرے سے جواب تباہ ہو چکا ہے یہاں منتقل کیا گیا تھا۔ عباس اول نے مزار کے تعویذ پر سونا منڈھوا دیا تھا۔ اس کے زیرین حصے کے آگے لٹکے ہوئے جبوترے میں فتح علی شاہ نے خالص سونے کا ایک مصنوعی دروازہ بنوا کر لگایا تھا جس میں جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔

دیوار کے حلقوں میں شیشے کے دروازوں کے پیچھے منت کے نذرانے رکھے رہتے ہیں (مثلاً جڑاؤ اسلحہ، زیادہ تر حکمرانوں کے عطیات وغیرہ)۔ دیوار پر دو کتبے لگے ہوئے ہیں۔ ان کتبوں کے ذریعے عمارت کی تاریخ تعمیر معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کا گنبد جو ۶۵ فٹ بلند ہے اور سفید تانبے کی چادروں سے منڈھا ہوا ہے، عباس اول نے ۱۶۰۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ۱۶۷۵ء میں سلیمان اول نے بیرونی کتبوں کی شہادت کے مطابق اسے صیقل کرایا۔ چونکہ حضرت امام کے مزار کا سلسلہ روایات کہیں منقطع نہیں ہوا اس لیے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ گنبد اپنے صحیح محل وقوع پر ہی تعمیر ہوا ہے۔

ہارون کے مزار کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ غالباً یہ قبر مقبرہ کے وسط میں تھی اور حضرت امام کی قبر، جو بعد میں فوت ہوئے، اسی جگہ ایک گوشہ میں بنائی گئی۔ لہذا ہارون کی قبر لاوارث بن گئی۔

حرم خاص کے دوسرے کمروں اور الگ تھلگ عمارتوں میں صرف اس گنبد ہی کا ذکر کیا جائے گا جو اللہ وردی خان کے نام سے منسوب ہے۔ یہ گنبد شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ اس کا نام اس کے بانی اللہ وردی خان کے نام سے مشہور ہے جو عباس اول کا مشہور جرنیل تھا۔

مقدس حجرے سے اگر شرقی دروازے کی راہ سے باہر نکلیں تو دو اور طقتہ کمروں میں سے ہوتے ہوئے ہم ناصر الدین کے طلائی دروازے تک پہنچ جاتے ہیں جو صحن نو میں کھلتا ہے۔ اس کے شمال میں پائین خیاباں ہے۔ فتح علی شاہ نے اس

دربار کی تعمیر ۱۸۱۸ء میں شروع کی تھی اس کے دو جانشینوں نے اس کام کو جاری رکھا اور اس کی تکمیل ۱۸۵۵ء میں ہوئی۔

اگر کوئی دارالسیادہ سے جنوب کی جانب مڑ جائے تو وہ ایک نہایت ہی خوش نما اور دلنریب مسجد کے احاطے میں پہنچ جاتا ہے جو ملکہ گوہر شاد نے تعمیر کرائی تھی۔ صحن کہنہ کی طرح اس کا صحن بھی ایک بے قاعدہ چوکور شکل کا ہے، جو شمالاً جنوباً تقریباً سو گز لمبا ہے اور ۹۰ گز چوڑا ہے۔ اس صحن کی چاروں دیواروں میں سے ہر دیوار کے وسط میں ایک ایک محرابدار ایوان ہے اور ان ایوانوں کو چھوڑ کر دیواروں کے باقی ماندہ حصے میں سکونتی حجرے بنے ہوئے ہیں۔ ایوانوں میں سب سے عمدہ ایوان مقصورہ ہے جو جنوبی دیوار کے ساتھ واقع ہے۔

اس ایوان میں نماز ہوتی ہے اور اس میں لکڑی کا ایک منبر رکھا ہوا ہے۔ مدخل کے دالان پر ایک نیلا گنبد ہے جس کے دونوں پہلوؤں پر دو بلند مینار ہیں جن پر نیلے شیشے کی ٹائلیں جڑی ہوئی ہیں۔ صحن کے وسط میں مسجد پیرزن ہے جو مربع شکل کا غیر مستطیل ہے اس کے گرد لکڑی کا ایک کٹہرا لگا ہوا ہے جس کے چاروں طرف ہتھیر کی گہری نالی میں پانی بہتا رہتا ہے۔

حرم مقدس کے پاس شہر کے مصروف ترین بازار واقع ہیں۔ مدارس اور حمام بھی اسی تسلسل میں بنے ہوئے ہیں۔ تمام عمارتیں سکونتی مکانوں کی طرح سب کی سب حضرت امام سے متعلق ہیں اور ان مجتہدین کے قبضے میں ہیں جو نظم و نسق کے ذمے دار ہیں۔ بست کی تمام جائداد بھی ان سے منسوب ہے۔ ان کے علاوہ حضرت امام کی ملکیت میں ایران کے تمام صوبوں میں اراضی، عمارتیں، نہریں بالخصوص مشہد کے قرب و جوار یا اس سے کچھ فاصلے تک موجود ہیں۔

اس کثیر آمدنی پر مستزاد ہیں وہ نذرانے جو زائرین کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں لیکن اخراجات بھی غیر معمولی ہیں۔ حکام خدام اور دیگر ملازمین کی تنخواہیں مجتہدین کرام کے وظائف، لنگر خانوں کے مصارف اور زائرین کا طعام جو تین روز تک مہمان رکھے جاتے ہیں۔



بھی ایک بہت بڑا کتب خانہ ہے جو پندرہویں صدی کے پہلے نصف میں سلطان شاہرخ نے قائم کیا تھا۔ کتابوں کے جو ذخیرے اس کے اور اس کے جانشینوں کے عہد میں جمع ہوتے رہے وہ زیادہ تر اس وقت ضائع ہو گئے جب عبدالمومن خان کے ازبکوں نے مشہد کو تاراج کیا۔ مخطوطات کی پوری پوری پڑتال کی جائے تو مفید نتائج برآمد ہونے کی امید ہے۔

مشہد میں مساجد کی کثرت خاص طور پر قابل ذکر ہے جو حرم مقدس، قبرستانوں، مقبروں مدارس یا دوسری مذہبی عمارتوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بے محل نہ ہوگا کہ اگر اس مصلیٰ کا بھی ذکر کر دیا جائے جو شہر سے باہر پائیں خیاباں کے دروازے سے آدھ میل کے فاصلے سے ہرات کی سڑک پر واقع ہے یہ کوئی تیس فٹ اونچا ایوان ہے جو ایک عظیم القامت محراب میں کھلتا ہے اور تقریباً ساٹھ فٹ بلند ہے۔

مشہد کی آبادی مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ نادر شاہ کے عہد میں آبادی سب سے زائد تھی کیونکہ وہ اکثر اپنا دربار یہیں لگایا کرتا تھا اور ہر لحاظ سے اس شہر کی رونق اور خوشحالی کے اضافہ میں کوشاں رہتا تھا۔ اس زمانے میں مشہد کی آبادی ساٹھ ہزار نفوس سے کم نہ ہوگی لیکن نصف صدی کے پر آشوب زمانے میں جو نادر شاہ کے عہد کے بعد شروع ہوا یہ شہر زوال پذیر ہو گیا، فی زمانہ مشہد کی آبادی ایک لاکھ بتائی جاتی ہے اور ایران میں آبادی کے لحاظ سے یہ تیسرے نمبر کا شہر ہے۔ یہاں بہت سے غیر ملکی ترکمان، افغان، اور ہندوستانی آباد ہیں اور تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ سب شیعہ ہیں۔ عیسائیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جو صرف چند آرمینی سوداگروں، انگریزی اور روسی سفارت خانوں کے متعلقین میں ہیں یہ سفارت خانے ۱۸۸۹ء میں قائم ہوئے تھے۔

اس شہر کے بعض لوگ اپنی بسر اوقات کے لیے زائرین کی خدمت بھی کرتے ہیں اور ان کے طعام و قیام کا انتظام بھی کرتے ہیں اور کچھ مقامی صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ صنعت گر، ماہرین فن انجینئر اور ذاکر بھی بکثرت پائے جاتے ہیں مگر ملک میں تعلیم کا تناسب کم ہے جو بتدریج بڑھتا جا رہا ہے۔ (۲۹)

مدارس کا خرچ بھی بہت زائد ہے۔ معلمین کی تنخواہوں کے علاوہ غریب طلباء کے وظیفے اور باہر سے آنیوالے مستحقین کا تمام صرف بھی برداشت کیا جاتا ہے نمایاں مدرسوں کی تعداد بیس بتائی جاتی ہے جن میں سے بعض بہت قدیم ہیں جن میں سے ایک ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں تیموری سلطان شاہرخ نے تعمیر کرایا تھا۔ سلیمان اول نے اس کی تجدید و مرمت کرائی۔ اسی حکمران کے عہد میں پر یزاد مدرسہ قائم ہوا جسے سلیمان نے مکمل طور سے دوبارہ تعمیر کرایا۔ عباس ثانی کے عہد میں دو مدرسے خیرات خان (۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء) اور مرزا جعفر نے (۱۰۵۹ھ / ۱۶۴۹ء) جاری کیے مجموعی طور پر پرانے مدرسوں کی تعداد زائد سے زائد نو ہے۔ قاجاریوں کے دور میں ایک توفیق علی شاہ کے عہد میں دو ناصر الدین کے عہد میں قائم ہوئے، دو اور مدرسے بھی جو بالکل کھنڈر ہو چکے تھے از سر نو بحال ہوئے۔

فن تعمیر کی خوبصورتی کے لحاظ سب سے عمدہ مدرسہ مرزا جعفر کا ہے جو ۱۰۵۹ھ / ۱۶۴۹ء میں تعمیر ہوا اور مرزا جعفر نے اس کے لیے ایک بہت بڑی رقم وقف کر دی کیونکہ وہ ہندوستان سے بے شمار دولت کما کر لایا تھا۔ اس مدرسے کی عمارت مشہد میں تیسرے درجے کی شان دار عمارت شمار ہوتی ہے جس میں مسقف ایوان طاقتور دار صحن اور گران بہا نقش و نگار بنے ہیں جو ایران کے مذہبی فن تعمیر کی بہترین مثال ہے۔ صرف مدرسہ مرزا جعفر ہی پر موقوف نہیں اس قسم کے دوسرے مدرسے بھی پائے جاتے ہیں جن کے لئے بڑے بڑے اوقاف موجود ہیں مثلاً پائین پاچن کے بانی وہ ایرانی تھے، جنہوں نے ہندوستان جا کر بے شمار دولت پیدا کی تھی۔ ان مدرسوں میں طالب علم رہتے بھی ہیں اور ان کے گزر اوقات کی کفالت اوقاف کی آمدنی سے ہوتی ہے۔ جو طالب علم مشہد میں نو سال کا نصاب تعلیم ختم کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے خواہاں ہوتے ہیں وہ مشہد علی یعنی نجف اشرف چلے جاتے ہیں اور وہاں کے اساتذہ کے درس میں شریک ہو جاتے ہیں۔

مشہد میں ایک یونیورسٹی بھی قائم ہو چکی ہے (۱۹۵۶ء) جہاں دیگر مضامین کے علاوہ اردو کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

بعض مدرسوں سے متعلق کتب خانے بھی ہوتے ہیں۔ نظام حرم کے پاس



یعنی بظاہر احترام سے مگر درپردہ مجبور کر کے۔ امام علی نقیؑ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ایک جماعت تشکیل دی ہے جو نبی عباس پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ درحقیقت یہ التزام تھا۔ متوکل کو خود بخود ایک اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس طرح اس نے امام کو بلوا کر اپنی نگرانی میں رکھا اور سادات پر قلم ڈھانے کا ایک بہانہ بھی تراش لیا۔ اس مفروضہ جرم میں جن لوگوں کو نشانہ ستم بنایا گیا وہ سب فقیہ شب زندہ دار اور زاهد متقی تھے۔ باری عبد العظیم کی بھی آنیوالی تھی مگر کسی محب اہل بیت نے اطلاع دیدی اور آپ بھیس بدل کر مدینے سے نکل کھڑے ہوئے راستہ بھی آپ نے بڑی احتیاط سے طے کیا کیونکہ عباسی کارندے بو سونگھ

کر فاطمہ کی اولاد کو گرفتار کر لیتے تھے۔ اس طرح آپ "رے" میں وارد ہوئے متوکل کو اسکے مخبروں نے خبر دی تھی کہ عبد العظیم کو امام علی نقی کا بہت تقرب حاصل ہے اس نے آپ کے قتل کا حکم صادر کر دیا تھا۔ آپ کو اس کا علم تھا لہذا "رے" میں بڑی احتیاط سے داخل ہوئے۔

اس شہر کا انتخاب آپ نے کیوں کیا؟ اسکی کوئی خاص وجہ کسی تذکرے میں نہیں ملتی۔ بادی النظر میں اس کا سبب یہی ہوگا کہ اسکو آپ نے دوسرے شہروں کے مقابلے میں محفوظ سمجھا ہوگا؛ تاہم ایک امتیاز اس شہر کو ضرور حاصل تھا کہ یزید ابن معاویہ کے خلاف پہلے پہل اسی شہر سے علم بغاوت بلند ہوا تھا اس لئے ممکن ہے کہ حضرت عبد العظیم نے اسکو تبلیغ اہل بیت کیلئے منتخب کیا ہو۔

آل رسول کے ترک وطن کا سلسلہ یوں تو معاویہ بن ابی سفیان کے دور سے شروع ہوا تھا پھر اس نے شدت اختیار کر لی۔ درمیانی ادوار میں کچھ کمی آگئی۔ منصور دوانیقی کے عہد میں پھر رفتار ہجرت تیز ہو گئی تھی اور متوکل کے زمانے میں شدائد انتہا پر پہنچ گئے لہذا آل فاطمہ زہراؑ بالخصوص سادات حسنی ایک بڑی تعداد میں آوارہ وطن ہوئے جن میں حضرت عبد العظیم بھی تھے۔

متوکل انہدام روضہ سید الشہداء میں کدو کاوش کر چکا تھا۔ محبان علی کے خون کی ارزانی تھی۔ ایسے میں حضرت عبد العظیم ہر طرف سے چوکنا پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے پہلے کئی مقامات پر ٹھہرے پھر "رے" پہنچے۔

## حضرت عبد العظیم

عراق و ایران کی زیارت گاہوں میں ایک مقدس نام شاہزادہ عبد العظیم کا بھی لیا جاتا ہے۔ ایران جانیوالا ہر زائر مشہد کے بعد شاہزادے کے مزار پر ضرور جاتا ہے اور عقیدے کے مطابق وہاں اسکی دعا پوری ہوتی ہے۔

حضرت عبد العظیم امام حسن کی نسل میں پانچویں پشت میں تھے۔ ابو القاسم سید عبد الکریم المعروف بہ عبد العظیم بن عبد اللہ بن علی بن حسن بن زید بن حسن ۱۷۳ھ میں بمقام مدینہ آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۵ شوال ۲۵۲ھ کو شہر "رے" میں وفات پائی۔

زندگی کے ۷۹ سال پورے کے پورے آپ نے گردش زمانہ میں بسر کیے۔ سادات پر زمین سنگ اور آسمان دور تھا۔ ہارون رشید نے حضرت امام موسی کاظم کو زندان میں ڈال دیا تھا پھر بھی امام سے آپ نے کبھی کبھی فیض حاصل کیا۔ ۱۸۳ھ میں امام کی شہادت کے وقت آپ کی عمر دس سال تھی پھر آپ نے امام رضا سے بھی استفادہ کیا۔ ماموں رشید کا دور آل رسول کیلئے استاصہر آزمانہ تھا لہذا آپ مدینے میں مقیم رہے۔

امام رضا کی شہادت کے بعد مامون چند روز سے زائد مسین نہ رہا اور اسکو امام محمد تقی کو بزور مدینے سے بلوا کر اپنی بیٹی ام الفضل کو آپ کے عقد میں دیدیا مگر مامون کی زہریلی سیاست کو پورا خاندان رسالت سمجھ چکا تھا اس لئے امام محمد تقی جلد ہی مدینے آگئے اور حضرت عبد العظیم انکی قربت سے بھی متغیض ہوئے

پھر معتصم کے آغاز خلافت سے جب دور منصور کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوئی تو شہزادہ عبد العظیم مدینے میں تھے۔ دو سال نہ گزرے ہوں گے کہ معتصم نے امام محمد تقی کو بجز بلوایا پھر آپ کو زہر دلوادیا۔

جب متوکل سربراہ آرائے خلافت ہوا تو اس نے بغداد کے بجائے سامرا کو دار الخلافت قرار دیا اور امام علی نقی کو اسی طرح طلب کیا جس طرح امام تقی گئے تھے



پروردگار پر ایسی روشنی ڈالتے کہ مادہ پرست بھی دنگ رہ جاتے

آپ کی فضیلت کیلئے یہ کچھ کم نہ تھا کہ آپ نے چار اماموں سے فیض حاصل کیا تھا اور عظمت کی دلیل یہ ہے کہ حضور سرور کائنات نے آپ کے مدفن کیلئے دو مومنوں کو خواب میں ہدایات دی تھیں اور بارگاہ الہی میں آپ کی منزلت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ کا مزار زیارت گاہ عوام و خواص ہے اور وہاں حاجتمندوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

ہماری نظر میں ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو مرنے کے بعد بھی اہل بیت کی عظمت و صداقت کا علامہ بنے ہوئے ہیں۔ (۱۱۵)

### حسین ٹیکری

عراق و ایران میں مشاہد مقدسہ کی معجزہ نمائی کسی بیان کی محتاج نہیں لیکن ہندوستان میں نقول روضہ نے بھی یہی کردار ادا کیا ہے۔ یہ نقول پکی اینٹوں کی بنی ہوئی ہوں، کر بلا یا روضہ عباس کہلاتی ہوں یا امام باڑہ اور عاشور خانہ، ان سے وقتاً فوقتاً ایسے اعجاز ظہور پزیر ہوتے رہتے ہیں جنہوں نے منزلت اہل بیت دلوں میں مرتسم کر دی ہے۔

اور عمومی سطح پر تعزیہ بھی امام حسینؑ کی نسبت کا مظہر بنتا رہا ہے۔ یہ تعزیہ مختلف مقامات پر مختلف اشیاء سے مختلف شکلوں میں بنایا گیا لیکن وہ روضہ امامؑ کی نقل ہی تصور کیا گیا کیونکہ روضے کی ساخت شروع میں کچھ تھی پھر اس میں ترامیم ہوتی رہیں اور بحالت موجودہ گنبد اور میناروں کی شکل میں ہمارے سامنے ہے لہذا کوئی جس طرح کا تعزیہ بھی بنائے، وہ اپنی نسبت سے یکساں طور پر اہم ہوتا ہے اور اسکو بارگاہ سیدہ کونین سے شرف قبولیت عطا کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے صوبہ مدھ پردیش کے شہر جاوہر میں تیس فیٹ اونچا کاٹھ کا تعزیہ بنایا گیا تھا جو ٹھوس لکڑی کے سبب استا وزنی تھا کہ دوسو آدمی اسکو مل کر اٹھاتے تھے۔ محرم کا چاند نمودار ہونے پر تعزیہ مزین کر کے چوک پر سجایا جاتا جہاں خلقت اسکی زیارت کرتی پھر معمول کے مطابق اس کا گشت ہوتا۔

انجانی جگہ پر زیادہ پوچھ گچھ بھی مناسب نہ تھی۔ چلتے چلتے محلہ ساربانان میں وارد ہوئے۔ وہاں کوئے بردگاں میں اندازے سے ایک مومن کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے سرداب میں آپ کے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ آپ بیشتر وقت نماز و مناجات میں گزارتے۔ کسی وقت ایک اجنبی کی حیثیت سے باہر نکلتے اور سامنے بنی ہوئی ایک قبر کے پاس جا کر ٹھہر جاتے جسکے بارے میں آپ نے بتایا کہ امام موسیٰ کاظمؑ کے صاحبزادے کی ہے۔ آپ کے اس قیام کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ آہستہ آہستہ شہر کے صاحبان ایمان کو آپ کے آنے کا حال معلوم ہو گیا اور وہ آپ تک پہنچنے لگے۔

اسی دوران ایک مرد مومن نے آنحضرتؐ کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے خاندان کی ایک فرد مقیم محلہ ساربانان اس دنیا سے سفر کر نیوالی ہے۔ اسکو عبد الجبار کے باغ میں سیب کے درخت کے پاس دفن کر دینا۔

وہ مالک باغ کے پہنچا تو اس نے بتایا کہ میں نے بھی اسی طرح کا خواب دیکھا ہے اور اس باغ کو شیعوں کی تدفین کیلئے وقف کرتا ہوں، خود مجھے بھی اسی میں دفن کیا جائے۔

شہزادہ عبدالعظیمؑ ”رے“ میں کوئی بڑی تبلیغی خدمت انجام نہ دے سکے پھر بھی ان کے وجود سے مقامی شیعوں میں ایک ارتباط باہم پیدا ہو گیا اور ایمان میں ایک جلا آگئی۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد حضرت عبدالعظیمؑ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، بعض روایات کے مطابق انکی قبر بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ”رے“ کے بعض مومنین کے توسط سے سامرہ میں امام علی نقیؑ سے ان رابطہ تھا اور امامؑ ان کیلئے کلمات عظیم استعمال فرماتے تھے۔۔۔۔۔ ملا باقر مازندرانی کا خیال تھا کہ عمال حکومت کو ان کے قیام کی اطلاع ہو گئی تھی اور کسی منبر کے ذریعہ انہیں زہر دلوادیا گیا حضرت عبدالعظیمؑ میں خانوادہ رسالت کے مقدس افراد کے تمام محاسن موجود تھے: امانت دار، متدین، متقی، زاہد اور راوی احادیث، تہجد گزار تھے، قرآن فہمی میں بڑا ورک رکھتے، مسائل فقہی پر انہیں پورا عبور تھا، بالخصوص توحید و عدل



تعزینوں کو جگمگاتے پایا۔ وہ سب شہر کی سمت دوڑ پڑے اور لوگوں سے یہ واقعہ ہنسایا  
خلقت خبر پاتے ہی چل پڑی اور پہاڑی پر جا کر دیکھا تو کوئی تعزیر تو موجود نہ  
تھا مگر مٹی سے اتنی مہک نکل رہی تھی کہ دور دور تک فضا معطر تھی۔

اسکے بعد جادو اور مضافات جادو شہدائے کربلا کی عقیدت میں اتنے  
سرشار ہوئے کہ بلا امتیاز مسلک و ملت ہر ایک نے حسب استطاعت اتنی رقوم جمع  
کر دیں کہ ٹیلے پر امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے روضے تعمیر ہو گئے اور یہ جگہ حسینؑ  
ٹیکری کے نام سے موسوم ہو گئی۔

زائرین کے آنے کا سلسلہ اول دن سے جاری ہو گیا تھا اور معجزوں کا تسلسل  
بھی قائم تھا لہذا جلد ہی اطراف و اکناف ہندوستان میں شہرت ہو گئی اور افریقہ تک سے  
لوگ حسین ٹیکری پہنچنے لگے۔

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں اللہ دینا لاڈک نام کا سیٹھ زیارت  
کیلئے آیا تو اسکی مراد برآئی اس نے امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے روضے کربلا کے  
اصل روضوں کی مطابقت اور مناسبت سے بنوادے اور زائرین کیلئے کوارٹر بھی  
تعمیر کرائے۔ روضہ امام کے احاطے میں سیٹھ کی قبر بھی بنی ہوئی ہے۔

زائرین اس کثرت سے پہنچتے ہیں کہ کبھی قیام کیلئے پچاس کوارٹر کافی نہیں  
ہوتے، مایوس سے مایوس مریض وہاں پہنچ کر صحت یاب ہو جاتا ہے۔ روضہ امام  
حسینؑ کے لوبان کی راکھ اور حضرت عباسؑ کے روضے میں بنے ہوئے کنویں کا پانی  
ہر مرض کا علاج بن جاتا ہے اور روضوں کا طواف جسموں میں توانائی پیدا کر دیتا ہے  
مجاور سب کے سب سنی ہیں اور اہل بیت کے عقیدت مند مقامی طور پر  
صرف اکاد کا شیعہ پائے جاتے ہیں البتہ ایام محرم میں کچھ شیعہ نظر آجاتے ہیں زائرین  
کی کوئی نہ کوئی تعداد تو روز ہی موجود رہتی ہے اور مجلسوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

جادو کا محرم یوں تو کوئی خصوصیت نہیں رکھتا لیکن ہندو عورتیں اور مرد  
اس تعداد میں دیہات سے آجاتے ہیں کہ حسین ٹیکری سے جادو تک آدمی ہی آدمی  
نظر آتا ہے۔ اس کا سبب شاید یہی ہے کہ جو دامن پھیلا کر آتا ہے وہ دامن بھر کر  
واپس جاتا ہے اور دامن اسی دولت سے بھر جاتا ہے جو مانگنے والا چاہتا ہے۔

جادو ایک ہندو ریاست تھی۔ بیشتر آبادی ہنود کی تھی کچھ مسلمان بھی بستے  
تھے جن میں شیعہ برائے نام تھے لیکن مسلمانوں کو امام سے بڑی عقیدت تھی اور وہ  
خلوص کے ساتھ محرم مناتے تھے۔ ۱۳۰۲ھ میں دسہرے کا ہتوار محرم میں پڑا اور آٹھ  
محرم کو رام لیلا جلوس نکلا تو اس میں کہاوت کے اعتبار سے باون گز کا راون بھی  
شامل تھا۔ جادو میں جو راون بنایا گیا تھا وہ حقیقتاً باون گز کا تو نہ تھا مگر بہت لمبا اور  
چوڑا تھا۔ جلوس اسی شاہراہ پر گزرا جس پر تعزیر رکھا ہوا تھا۔

ایسے مواقع پر اکثر ہندو مسلم فساد ہوتا تھا لیکن جادو میں ہندو غلبے کے  
سبب بے چارے مسلمان خاموش رہے اور انہوں نے جلوس کے گزر جانے کا راستہ  
دیدیا۔ راون جب تعزیر کے قریب پہنچا تو تعزیر راون کی اونچائی کے سامنے بہت حقیر  
نظر آنے لگا اور ہندو ایک تفاخر سے مسلمانوں کی طرف دیکھنے لگے۔ احساس کمتری  
میں مبتلا مسلمان سر جھکا کر رہ گئے مگر دوسرے ہی لمحے دنیا نے دیکھ لیا کہ امام کے  
ماننے والے اتنے سر بلند تھے کہ ہندو ان سے آنکھیں چار کرنا تو درکنار خود تعزیر کے  
سامنے سرنگوں تھے۔

راون جیسے ہی تعزیر کے مقابل پہنچا تعزیر نے اپنے مقام سے حرکت کی  
اور آہستہ آہستہ اتنا بلند ہو گیا کہ اس کا نچلا حصہ راون کے سر کے اوپر تھا پھر اسی طرح  
دھیرے دھیرے تعزیر نے اپنے مقام پر آکر قائم ہو گیا۔

شہید کربلا کے اس معجزے نے ہر دیکھنے والے کو سراپا حیرت بنادیا اور  
جب سب اس کیفیت سے باہر نکلے تو حسین حسین کی آوازیں آسمان پر دستک دینے  
لگیں۔ ۔۔۔ ان آوازوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی آوازیں بھی شامل  
تھیں۔ اسکے بعد مسلمانوں نے اپنے تمام تعزیر قریب کے دریا میں لے جا کر  
ٹھنڈے کر دئے اور خود اسی چوک میں آکر بیٹھ گئے۔

اس دریا کے کنارے موضع رو جھانہ میں جاروب کش بستے تھے۔ وہ علی  
الصباح اپنے اپنے کاموں پر جانے کیلئے گھروں سے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ جو  
تعزیر مسلمانوں نے ٹھنڈے کیے تھے وہ سارے کے سارے قریب کی پہاڑی پر  
رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا اور آنکھوں کو مل کر دوبارہ دیکھا تو



اور آبادی کے تمام اونچی ذات کے لوگ اسی مخلوط عقیدے کے قائل تھے۔ ایک دن اچانک تمام مورتیاں منہ کے بل گر پڑیں اور آگ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔

راجہ اطلاع پاتے ہی دوڑ پڑا اور جب یہ یقین ہو گیا کہ سب کچھ بغیر کسی تحریک کے عمل میں آیا ہے، آگ پر کسی نے پانی نہیں ڈالا۔ پروہت موجود تھا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہوا تھا۔ وہم پرست راجہ بڑی فکر میں پڑ گیا کیونکہ اتنی شبہ بات دیوتاؤں کے ناراض ہونے کی دلیل تھی۔ راجہ نے پنڈتوں، منتر یوں اور نجومیوں کو بلایا مگر وہ اپنے فن اور علم سے اسکی کوئی وجہ معلوم نہ کر سکے۔ اسی دوران یہ خبر ملی کہ قریب کے جنگلی ٹیلے پر چند مرد اور کچھ عورتیں آکر ٹھہری ہیں جو غیر ملکی معلوم ہوتی ہیں۔ راجہ مہابرن کو خیال ہوا کہ ممکن ہے اس واقعہ کا ان سے کچھ تعلق ہو لہذا اس نے انکی گرفتاری کیلئے سپاہی روانہ کر دیے۔

سات عورتیں اور چار مرد مجموعی طور پر گیارہ نفر تھے۔ عورتوں نے سپاہیوں کے پہنچتے ہی چہروں پر نقابیں ڈال لی تھیں۔ مرد سپاہیوں کو دیکھتے ہی شمشیر بکف اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سپاہی ان کے چہروں کی جلالت دیکھ دم بخود رہ گئے۔ ان کی ہمتیں جواب دے گئیں! آخر دو سپاہی واپس ہوئے اور راج کمار کو بلا کر لے گئے۔

راجکمار بکرما سہائے بھی انہیں دیکھتے ہی مرعوب ہو گیا پھر بھی اس نے راجہ کے حکم کا اعلان کیا اور ان میں سے قدرے سن رسیدہ بی بی نے خود اسی کی زبان میں جواب دیا۔

”ہم خدائے واحد کے بندے ہیں اور پیغمبر عرب کی اولاد میں ہیں۔ ہمارے سردار کو جو رسول کا نواسہ تھا کر بلا میں قتل کر دیا گیا، ہم قید سے چھوٹ کر مدینے پہنچے تو مگر ہمیں وہاں بھی رہنے نہیں دیا گیا۔ مجبوراً ہم نے پردیس اختیار کیا۔ ہماری طرف سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی پھر بھی تم پسند نہیں کرتے تو ہم کہیں اور چلے جائیں گے۔“

عرب کی خاتون سنسکرت میں گفتگو کر رہی تھی تو محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہی اسکی مادری زبان ہو۔ راجکمار تصویر حیرت بن گیا اور مزید تفصیل پوچھنے پر خاتون نے بتایا۔

ایسی ہی ایک زیارت گاہ شمالی ہندوستان کے ضلع بجنور میں ”جوگی پورہ“ کے نام سے بھی ہے جو بھٹ ہند کہلاتی ہے۔ وہاں کے معجزات بھی زبان زد عام ہیں اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر بنے ہوئے بعض روئے بھی اسی تعریف میں آتے ہیں جسکے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ (۱۱۳)

### بیباں پاک دامن

”لاہور کی تاریخوں اور تذکروں میں جو روایت درج ہے وہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد سے تیس سال پہلے کا ایک واقعہ ہے جو تاریخی اعتبار سے ۶۸۱ء کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔“ (۱۱۱)

۶۸۱ء کا مطلب ہے ۶۲ھ کا ادائل وسط یا آخر جب قدیم لاہور کے قریبی جنگل کے ایک ٹیلے پر کچھ پردیسی عورتوں اور مردوں کا ورد ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دریائے راوی کے کنارے کنارے دور تک جنگل کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ لاہور کی حیثیت ایک بنایاں بستی کی تھی جسپر ایک ہندو راجہ مہابرن حکمران تھا۔ بستی میں ایک بڑا مندر تھا جس میں رواج کے مطابق پتھر کی مورتیاں نصب تھیں جسکی پوجا کی جاتی تھی۔

اس مندر میں ایک افسانی چیز یہ تھی کہ اسکے آگے آگ بھی روشن رہتی تھی۔ شاید اس علاقے کے آریے ایران اور وسط ایشیا سے آگنی پوجا کا عقیدہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس طرح یہ مندر بت پرستی اور آگنی پوجا کا مشترک مرکز بن گیا تھا



مخاطب ہو کر اس نے سوالات کیے اور ایک بی بی کی آواز نے اسکو سب کچھ بتا دیا۔ یہ راجکمار پاک بیبیوں کے مزار کا پہلا مجاور تھا۔

راجکمار کے ساتھ بعض سپاہی بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ ان سب نے اس مقام پر ایک چبوترہ سا بنالیا اور اسکے گرد بیٹھ کر مصروف عبادت ہو گئے بی بی کی آواز انکی ہادی تھی جس نے انہیں سورتیں یاد کرائیں اور طریقہ عبادت تعلیم کیے

راجہ نے بہت کوشش کی انہیں پرانی راہ پر واپس لائے لیکن ان سب کی دنیا بدل چکی تھی اور وہ جس جگہ پہنچ چکے تھے وہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں تھی۔ خود راجہ بھی بیبیوں کی کرامات سے متاثر تھا۔ وہ خود مسلمان تو نہیں ہوا مگر اس نے راجکمار کو اسکے حال پر چھوڑ دیا اور کچھ زمین بھی اسکے لئے وقف کر دی۔ اس طرح کفرستان میں اسلام کی پہلی شمع روشن ہوئی اور اس روشنی میں مجاوروں کی تعداد بڑھتی رہی۔

روایتی تاریخ میں ایک واقعہ اور بیان کیا جاتا ہے کہ جب پاک بیبیوں کا واقعہ مشہور ہوا تو جاٹوں کا ایک سردار بالو اپنی خوبصورت اور پانچ بیٹی کو لے کر اس مقام پر آیا اور راجکمار سے اپنی بیٹی کی صحت کیلئے دعا کرنے کی استدعا کی پھر اجازت لی کہ یہ لڑکی یہاں پڑی رہے تو بیبیوں کی برکت سے شاید صحت یاب ہو جائے۔

راجکمار کا نام اب محمد جمال تھا۔ اس نے بی بی پاک دامن کے مزار پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو آواز آئی۔

”اس لڑکی کو مسلمان کر کے اس سے نکاح کر لو۔“

راجکمار کیلئے اس لڑکی سے عقد کرنا غور طلب تھا جسکے دونوں ہاتھ مفلوج تھے مگر بی بی کا حکم تھا اس لئے اس نے بالوجاہت کی اجازت سے اسکو مسلمان کیا اور اپنے عقد میں لے لیا۔

مزار کے گرد اگر داس نے رہنے کا انتظام کر لیا تھا۔ رات وہ اپنی جگہ پر سویا اور صبح کو بیدار ہوا تو لڑکی کو ہر طرح سندرست پایا اور اسکے چہرے پر نگاہ ڈالی تو وہ کسی

”میں مسلم شہید کی بیوہ رقیہ بنت علی ہوں، علم بردار لشکر کر بلا ابو الفضل العباس کی بہن؟“

دوسری پانچ بیبیوں کا تعارف کراتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

”عقیل ابن ابی طالب کی بیٹیاں ہیں اور میری نندیں۔“

پھر چھٹی خاتون کی طرف انگلی اٹھا کر بولیں۔

”ان کا نام حلیمہ ہے کہنے کو کنیز ہیں مگر رتبے میں ہمارے برابر۔ میں نے

بہت کہا مگر اس عالم میں انہوں نے ساتھ نہیں چھوڑا۔“

پھر انہوں نے چاروں مردوں کے نام بتائے۔

”ابو الفتح، ابو الفضل، ابو الکرام اور عبدالند، یہ سب ہمارے ہم قبیلہ ہیں

اور محافظ کے طور پر ہمارے ساتھ آئے ہیں۔“

راجکمار بہت متاثر ہو چکا تھا پھر بھی وہ نرم لہجے میں بولا۔

”راجہ کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ آپ کو دربار میں تو چلنا ہی پڑے گا۔“

اس جواب پر خاتون کو ہچکاچکی آگیا۔ انہوں نے قہر کی ایک نگاہ راجکمار پر ڈالی

تو وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا پھر زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

راجکمار کی یہ حالت دیکھ کر سپاہیوں نے ان کے گرد گھیرا بنالیا اور آہستہ

آہستہ گھیرے کو تنگ کرنے لگے۔ خدام اپنی ہوئی تلواریں لیے مدافعت پر آمادہ تھے

مگر خاتون نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھا کر ایک عجیب نگاہ سے آسمان کی طرف دیکھا۔ فضا

میں ایک بے چینی اور ہلچل پیدا ہوئی۔ معاً زمین اسی مقام پر شق ہوئی۔ بیبیاں مع

خدام کے اس میں سما گئیں اور زمین پھر برابر ہو گئی۔

سپاہیوں نے دہشت زدہ ہو کر بے ہوش راجکمار کو پانی کے چھینٹے دئے اور

ہوش میں آنے پر سارا ماجرا اس سے کہہ سنایا۔ راجکمار پاک بیبیوں سے اتنا متاثر ہوا

تھا اور کرامات نے کچھ ایسی عقیدت پیدا کر دی تھی کہ وہ پھر اس مقام سے ہلا نہیں۔

مجاور بن کر بیٹھ گیا۔ اسلام کے اصول تو اسکو معلوم نہیں تھے مگر توحید الہی کا قائل

ہو گیا اور پیغمبر عرب کا حلقہ بگوش بن گیا۔ پھر عالم خیال میں پاک بیبیوں سے



مزار تک آتے تھے اور اسی طرح واپس جاتے تھے۔" (۱۱۲)

تاریخی تحقیق کے نام پر اہل قلم اہل بیت کے واقعات کو جس طرح مسخ کرتے رہے ہیں اسکی ایک نظیر بی بی پاک دامن کے سلسلے میں بھی ملتی ہے۔ خاندان رسالت سے ان کا تعلق مشکوک کرنے کیلئے بعض کہانیوں کو تاریخ کا نام دیا گیا ہے اس لئے حقیقت کو واشگاف کرنے کیلئے حالات مابعد کر بلا پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

۱۱ محرم ۶۱ھ کو جب اسیران کر بلا کا قافلہ روانہ ہوا تو وہ مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھا۔ ان کی تعداد بعض نے چوراسی لکھی ہے بعض نے کچھ زائد۔ ان ۸۴ میں گیارہ بچے اور ایک امام زین العابدین، بیس عورتیں اور بادون بچیاں شامل تھیں۔ بچیوں میں بعض بڑی اور بعض بہت چھوٹی تھیں۔ تعداد اور تصریحات میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف ہے۔

ان میں رقیہ بنت علی زوجہ جناب مسلم بھی شامل تھیں اور ایک نام ام ہانی کا بھی ملتا ہے لہذا یہ مسلم ہے کہ وہ قید ہو کر دمشق پہنچیں اور قافلے کے بچے کھچے لوگوں کے ساتھ رہا ہو کر مدینہ واپس ہوئیں۔

ایک بدیہی حقیقت یہ بھی ہے کہ شہدائے بنی ہاشم میں اولیت کا شرف اولاد حضرت عقیل کو حاصل ہے اور تعداد میں بھی وہ زائد تھے۔ خود جناب مسلم اور ان کے دو بچے جو کوفہ میں شہید ہوئے ان کو جوڑ لیا جائے تو وہ بنی ہاشم کے کل شہداء کا کم و بیش نصف ٹھہریں گے۔

رہائی کے بعد مدینہ پہنچنے والے قافلے میں کتنے بچے واپس ہو سکے، اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا البتہ کر بلا سے کوفہ جانے والی شاہراہ پر دور دوریہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بنی ہوئی قبریں اسکی شہادت ضرور دیتی ہیں کہ یہ بچے تیز دوڑتے ہوئے اونٹوں کی پیٹھوں پر سے گر پڑے تھے جسکو صحرا میں دفن کر دیا۔ بعض قبریں کوفہ و دمشق کے طویل راستے پر بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں وہ بھی اس بلا نصیب قافلے کے بچوں ہی کی ہوں گی۔ ان بچوں میں آل عقیل کے بچے کس تعداد میں تھے؟ کوئی کیونکر بتائے؟

اسپرا کی طرح دمک رہا تھا راجکمار اسکو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خود لڑکی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیونکر اچھی ہو گئی۔ شاید اس مزار کی مٹی کا اثر تھا جو مزار کے گرد چکر لگاتے وقت اسکے جسم میں لگ گئی تھی۔

بالوجاٹ نے جب بیٹی میں یہ انقلاب دیکھا تو اسی وقت پورے قبیلے کے ساتھ مسلمان ہو گیا اور اسکے بعد "بیبیاں پاک دامنوں" کے عقیدتمندوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ لوگ بھی جو تھے تو بہت پرست مگر پاک بیبیوں کی کرامت پر جن کا اعتقاد تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے درود ہندستان سے قبل وقت کے فصل سے راجکمار کا نام بابا خاکی مشہور ہو گیا اور پاک دامن بیبیوں کے نام بھی بدل گئے۔ جناب رقیہ کو بی بی حاج کہا جانے لگا۔ یہ نام غالباً کرامت حاجت روائی کی سبب پڑا ہوگا۔ حضرت عقیل کی بیٹیوں کے نام بی بی تاج بی بی حور بی بی نور بی بی گوہر بی بی شہباز باں زد ہو گئے۔

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کی تحقیق کے مطابق کتابوں میں ان کے اسمائے مقدس ام ہانی ام لقمان اسماء، رملہ اور زینب پائے جاتے ہیں۔

کچی مٹی کا چبوترہ صدیوں تک مرکز عقیدت بنا رہا اور بابا خاکی کی اولاد کو مجاوری کا شرف حاصل رہا۔ غزنوی عہد میں ایاز نے اپنے قیام لاہور میں ایک خانقاہ کی تعمیر کرا دی تھی۔ شاید وہ بھی بیبیاں پاک دامنوں کے تقدس کا قائل تھا کیونکہ مشہور تھا کہ وہاں مانگی ہوئی دعا پوری ضرور ہوتی ہے۔

شہنشاہ اکبر کے زمانے میں خانقاہ کو نئے سرے سے تعمیر کرایا گیا جو اب تک باقی ہے اور زیارت گاہ عوام و خواص ہے۔

"یہ بھی کہا جاتا ہے کہ داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری جب لاہور آئے تو بی بی پاک دامن کے روضہ پر حاضر ہوئے اور وہاں چلہ کشی کی۔ وہ مقام جہاں داتا صاحب نے چلہ کھینچا تھا اب بھی موجود ہے۔

داتا صاحب کو اس روضہ اقدس سے کیسی عقیدت تھی اور وہ بی بی پاک دامن کا کتنا احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جاسکتا ہے کہ بی بی دامن کے مزار سے چالیس قدم کے فاصلے تک داتا صاحب گھٹنوں کے بل چل کر



قافلہ جب مدینہ پہنچا تو اہل قافلہ میں سے کسی کا پہچاننا آسان نہ تھا۔ کھال ہڈیوں سے چپک گئی تھی۔ بعض عورتیں چل تو سکتی تھیں مگر اس طرح جیسے مردہ کسی اعجاز سے حرکت کر رہا ہو۔ ان میں زینب کبریٰ بھی تھیں، ام کلثوم علیا بھی اور رقیہ عظمیٰ بھی۔

مدینے کا کیا عالم تھا؟ اسکی تصویر کشی الفاظ میں ممکن نہیں مگر تاریخ کی آنکھ نے دیکھا کہ مرد و عورتیں مار مار کر رو رہے تھے اور عورتیں کھلے سر اور ننگے پاؤں محلہ بنی ہاشم کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ پھر تلام میں کچھ کمی آگئی لیکن جانے والے روز جاتے رہے اور رواد کر بلا اور مصائب کوفہ و شام شب و روز بیان ہوتے رہے۔ گویا داغ بیل پڑ رہی تھی واقعہ عراقی۔

اہل مدینہ نے بعد رحلت رسول سیدہ کونین سے کہلوایا تھا کہ ان کے بین سے لوگوں کے معمولات زندگی پر اثر پڑتا ہے اس لئے دن کو رو لیا کریں یا رات کو! یہ تھی ابتداء رونے پر پابندی لگنے کی مگر اسکی تہہ میں جو بات تھی وہ کہی نہیں گئی کہ فاطمہ زہرا کی آواز سن کر سننے والوں کے دل ہل جاتے ہیں اور وہ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک بیٹی جس کا باپ کے غم میں یہ عالم ہے اسکو کس طرح محرومیوں کا نشانہ بنا دیا گیا؟ ذہنی انقلاب کو روکنے کی خاطر بلند آواز سے گریہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور شہزادی نے اس کے بعد سے روضہ رسول پر جا کر بین کرنا شروع کر دئے۔

آج اسی مدینے میں عامل بنی امیہ نے زینب دام کلثوم سے کہلوایا تھا کہ واقعات کر بلا اور سرگزشت دمشق کا بیان بند کر دیں ورنہ مدینہ چھوڑ کر کہیں چلی جائیں۔

دکھیاڑی زینب پر اس تہدید کا اثر کیا ہوتا۔ اس کے پاس یہی تو ایک شغل رہ گیا تھا اسکو وہ کیونکر چھوڑ دیتی اس نے سنی ان سنی کر دی مگر چالیس روز بعد جب ام کلثوم کا انتقال ہو گیا تو کر بلا سے حسین نے آواز دی۔ زینب ادھر چل پڑیں پھر سکینہ نے دمشق سے پکارا۔ پھوپھی میں اکیلی ہوں؟ زینب اس طرف روانہ ہو گئیں۔ وہاں سے حسین کی مظلومیت کا پرچم سر بلند کرنے کیلئے مصر گئیں۔

پھر مدینہ واپس آئیں تو ام سلمہ اور ام النہین صدموں کی تاب نہ لا کر خالق

حقیقتی سے جا ملی تھیں۔ زینب پھر واپس ہو گئیں۔ کر بلا گئیں وہاں سے دمشق پہنچیں سکینہ کی قبر کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اسکی خاک پر منہ رکھ دیا اور سکینہ کا نام لیتے لیتے سو گئیں اور پھر کبھی نہیں اٹھیں۔

رقیہ بنت علی بھی مدینہ واپس آئی تھیں۔ ان کا عالم بھی زینب دام کلثوم سے کچھ مختلف نہ تھا۔ وہ ہی کون گیا تھا جس کے لئے انہیں زندہ رہنے کا حوصلہ ہوتا۔ ان کا بھی وہی کام تھا جو زینب دام کلثوم کا تھا۔ بنی امیہ کی پابندی ان کیلئے بھی وہی تھی جو دوسری بہنوں کے لئے۔

جب ام کلثوم کی وفات کے بعد زینب نے مدینہ چھوڑ دیا تو رقیہ اور بنی ہاشم کی دیگر خواتین جو دمشق سے پلٹ کر آئی تھیں ان سب نے اس منصب کو جاری رکھا جو کر بلا کے شہیدان کے سر در گئے تھے۔ ولد و زحالات اور جگر خراش واقعات کو وہ بنی ہاشم کی فصاحت و بلاغت میں بیان کرتی رہیں، مدینے میں برپا ہونیوالی قیامت کو انہوں نے اسی طرح جاری رکھا۔

اس طرف بنی امیہ خون ناحق کی پردہ پوشی چاہتے تھے کیونکہ عرب سے عراق و ایران تک کا ہر چھوٹا بڑا فاطمہ کی اولاد کے قتل پر مشتعل تھا۔ اسیران کر بلا کو شام و کوفہ میں جو کچھ کرنا تھا اور کرچکے تھے۔ اب مدینے میں نواحی قبائل کے وفود کر بلا کی آواز باز گشت سن سن کر آرہے تھے۔ باہر سید سجاد آپ بیتی بیان کرتے اندر یہ نیم جان خواتین در دبھری داستانیں سناتیں اور نتیجے میں یزید پر لعنت کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو آج تک جاری ہے۔

پہلے بنی امیہ نے مقتولین کے سروں کو نیزوں پر چرمھایا تھا، اب خون شہیداں رنگ لایا تھا تو سارا الزام سپاہ کوفہ و شام کے سرداروں پر ڈال دیا گیا اور یزید کو مطعون کر نیوالوں کیلئے گرفتاری کا حکم ہو گیا۔ سید سجاد امام وقت تھے وہ اعلائے کلمۃ الحق میں کسی جابرانہ روش سے مرعوب کیا ہوتے مگر عورتوں نے سوچا کہ زبان بند رکھنا ان کیلئے ممکن نہیں ہے تو کیوں نہ زینب کبریٰ کی تاسی کریں اور ظالموں کی زد سے ہٹ کر دنیا کو مقاصد شہادت سے آشنا کریں۔

سادات کی نقل مکانی کا سلسلہ معاویہ کے وقت سے شروع ہو چکا تھا اور



حضرت عقیل ہی تھیں جنہوں نے جیتے ہی بھی کار نمایاں انجام دئے اور مرنے کے بعد اہل بیت کی عظمت کے چراغ روشن کر رہی ہیں لیکن شیخہ تحقیقین کو اس سے اتفاق نہیں مشاہد سادات کا دامن استواسیع ہے کہ پورے ایشیا پر بسیط ہے بلکہ یورپ کے بعض مقامات پر بھی اس کا پرتو پڑتا نظر آتا ہے۔

عرب، عراق، ایران، شام، لبنان، فلسطین، برصغیر ہندوستان و سندھ کے جس حصے میں دیکھا جائے کسی نہ کسی گوشے میں پرچم اہل بیت لہراتا نظر آئے گا۔ مختلف جگہوں پر اسکے مختلف نام ہیں مگر کام سب کا ایک ہے: آل رسول کی سر بلندی انکی صداقت و عظمت کا مظاہرہ! کوئی قبر خراسان کے کسی گوشے میں ہو پنجاب کی کسی پہاڑی پر مکران کے کوہستان میں یا سندھ کے ریگزار میں اس کا نام صفی الدین اردبیلی ہو، امام بری ہو، بابا کوہی ہو یا لعل شہباز قلندر وہ سب مشاہد سادات کے اجزاء ہیں اور ان کے بیان کیلئے ہزاروں صفحات ناکافی ہوں گے لہذا صرف عنوان کی خانہ پری پر اکتفاء کی جاتی ہے۔

بعض جلی نام یقیناً قابل ذکر تھے مگر بڑی مجبوری کے ساتھ ان کی ارواح مقدسہ سے معذرت کر لی گئی۔ توفیقات الہی نے ساتھ دیا تو بارگاہ اہل بیت میں ان کے اذکار کا نذرانہ ضرور پیش کیا جائے گا۔

### اہل بیت اور مشرق بعید

خانوادہ رسالت کیلئے کسی خطہ ارض میں تبلیغ اسلام کا سوال ہی کیا تھا جبکہ وہ اپنے وطن ہی میں محفوظ نہ تھے اور جانیں بچانے کی خاطر اطراف و جوانب میں چھپتے پھرتے تھے۔ جس کسی کو موقع مل جاتا وہ مسلم حکومت کی سرحدیں پار کر کے ان خطوں میں پہنچ جاتا جہاں کوئی اسلام کے نام پر انہیں واجب القتل قرار نہ دیتا۔

بعض خاندان سیستان و مکران چلے گئے تھے کچھ مراکش و مصر کی طرف۔ سیستان میں شنسب بن حریق کی حکومت تھی جو خود کوفہ آکر حضرت علی ابن ابی طالب کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ اسکی حکومت غور سے موجودہ بلوچستان تک تھی۔ ان حالات میں ہو سکتا ہے کہ جناب رقیہ اور بنات عقیل نے باقی زندگی صرف نظریہ کر بلا کی اشاعت کیلئے وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ قرائن و قیاسات کا یہ تاریخی استنباط دستاویزی ثبوت کا محتاج ہے مگر حالات کی روشنی میں صد فی صد صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مسلم کی ایک بیٹی اور دو بیٹوں کا کر بلا میں موجود ہونا ثابت ہے۔ عبداللہ و محمد جو اگرچہ بہت کم سن تھے مگر بنی ہاشم کی جنگ کا آغاز غالباً انہیں بچوں سے ہوا اور وہ یکے بعد دیگرے درجات شہادت پر فائز ہو گئے۔ بیٹی کا کچھ سہ نہیں چلتا کہ قید سے واپس ہو سکی یا نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جناب مسلم کی دوسری بیوی کے بطن سے ہو اور حضرت عقیل کی اولاد تو بیشتر قتل ہو چکی تھی بہت کم لوگ باقی تھے لہذا جناب رقیہ اور خاندان عقیل کی دوسری خواتین کیلئے نسلی کشش برائے نام رہ گئی تھی اس پر ظالم بنی امیہ کا دباؤ۔ قرین عقل ہے کہ جناب رقیہ بنت علی نے سوچا ہو کہ در ثناء کے بعد خود انہیں بھی شرکت جہاد کرنا چاہئے اور ان کیلئے یہی جہاد تھا کہ حق و باطل کی نوعیت جنگ کو کسی دوسرے رنگ میں پیش نہ ہونے دیں اس لئے علی کی تیسری بیٹی نے اس سمت کا رخ کیا جدھر جناب زینب کے پہنچ سکنے کا امکان نہ تھا۔

یقیناً وہ نکلی ہوں گی شنسب بن حریق کے علاقے کیلئے لیکن بنی امیہ کے خوف سے راستہ بدل بدل کر آگے بڑھیں تو دامن طرف جانے کے بجائے بائیں جانب چلی گئیں اور سیستان کے بجائے ہندوستان میں داخل ہو گئیں۔

قرائن اور امکانات کی روشنی میں علی کی بیٹی کا پنجاب پہنچ جانا بالکل سامنے کی بات ہے اور جناب زینب کی طرح حضرت رقیہ کا مدینے سے چلنا بعید القیاس نہیں پھر انجانے راستوں پر پہلے کے بجائے دوسرے راستے پر چل پرنا بھی بشریت ہے۔ اس لئے بیہیمان پاک دامنوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ جناب رقیہ اور بنات



سیستان و مکران کی طرح وہ ہندوستانی علاقوں میں پہنچے اور اکثر زندگیاں عبادت الہی میں گزار کر گناہی کی موت مر گئے۔ مقامی باشندے یہ تو جانتے ہیں کہ ایک نیک و پارسا آدمی کی قبر ہے مگر کسی کو یہ نہیں معلوم کہ مرینوالا کون تھا کہاں سے آیا تھا؟ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہیں موقع مل گیا۔ انہوں نے مقامی زبانیں سیکھ کر پہلے انسانیت کا درس عام کیا پھر اسلام سے آشنا کرایا۔ آخر میں محمد وآل محمد کی حقیقت بتائی۔ یہ لوگ عموماً حلقہ تصوف میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔

ترک و چین کرینوالے سادات عموماً خشکی کے مسافر رہے۔ تاریخ نے کسی دور میں اکبر کا مراثی کے سوا کسی اور سمت میں جاتے نہیں دیکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے جنوبی مشرقی اور مغربی ساحلوں پر بہت سے مزارات ایسے پائے جاتے ہیں جو سادات کرام یا محبان علی کے ہیں۔ اسلامی دور میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا قبیلہ نوائے معنی ملایا بھی انہیں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

مشرق بعید میں ملائیشیا، جاوا اور سماترا وغیرہ میں بعض قبروں کے کتبے دستیاب ہوئے ہیں ان کے نام پانچس دھنوں کیلئے ایک نشانہ ہی ضرور کرتے ہیں مگر ان کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا کیونکہ اسکے بعد شافعی تاجران جزائر میں کثرت سے پہنچنے لگے اور انکی متصوفانہ تبلیغ حلقہ اسلام کو وسیع سے وسیع تر کرتی رہی جس میں پہلے سے پہنچے ہوئے لوگ مدغم ہو گئے کیونکہ شاید انکی زندگیوں نے وفا نہیں کی یا اسلام کیلئے زمین ہموار کرتے ہی کرتے خدا کو پیارے ہو گئے۔

سماترا کے مسلمانوں کے بارے میں ایک سیاح کا بیان ہے۔

”محرم میں ہندوستانی مسلمانوں کی طرح باقاعدہ پٹے بازی کرتے ہیں،

شہادت حسین کا ذکر سنتے ہیں ان میں قوالیاں بھی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔“ (۱۱۴)

یہ غالباً شافعییت کے اثر سے ہو ا ہے مگر تعزیر داری کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چل سکا اتنے شبہوں کو بدعت نہیں سمجھا جاتا اس لئے ممکن ہے کہ کسی جزیرے میں اس کا رواج ہو الٹے برعکس عشرہ حرم منایا جاتا ہے۔

بنگلہ و آسام کے مختلف مقامات پر یقیناً ایسی قبور کا سراغ ملتا ہے جو صدنی صد خاندان رسالت سے متعلق افراد کی ہیں۔ سہٹ میں ایک مزار سید جلال شاہ کا

ہے جسپر گنبد بنا ہوا ہے۔ مزار میں سرخ آنکھوں والے کبوتر بکثرت پائے جاتے ہیں جو جلالی کبوتر کہلاتے ہیں مگر وہ گنبد کے اوپر جا کر کبھی نہیں بیٹھتے۔ جلال شاہ کے مزار پر منتین بھی مانی جاتی ہیں جو بنت رسول کا واسطہ دینے سے پوری ہوتی ہیں۔ اسی طرح کا ایک مزار میرپور مشرقی بنگال میں بھی ہے جو سید علی شاہ بغدادی کا مزار کہلاتا ہے۔ اس پر عام دنوں میں ایک کالی چادر پڑی رہتی ہے۔ اسکے اوپر سرخ چادر ڈال دی جاتی ہے لیکن یکم محرم کو سرخ چادر اتار لی جاتی ہے صرف کالی چادر رہ جاتی ہے۔ ۲۱ صفر کو پھر سرخ چادر ڈال دی جاتی ہے۔

مجاوروں کا کہنا ہے کہ اسکی وصیت سیکڑوں سال پہلے بابائے کی تھی۔ اس پر مسلسل عمل کیا جاتا رہا ہے۔ اس مزار پر بھی سیدہ کونین کے حوالے سے دعا قبول ہوتی ہے۔

اسی طرح بعض مقابر دوسرے مقامات پر بھی پائے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب بنی عباس کے طوفان قلم میں بچ بچا کر کسی طرح ان مقامات پر پہنچے اور اپنی زندگیاں تمام کر گئے۔ بکھرے گل ریاض ہمسر کہاں کہاں! ڈھاکہ کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے وہاں بھی شافعی مسلمان زیادہ پائے جاتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد سے حنفیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور کچھ شیعہ بھی پائے جاتے ہیں۔ غیر منقسم بنگال میں بھی جابجا شیعہ موجود تھے۔ شاید کوئی شیعہ عالم وہاں پہنچا ہو اور اس نے مسلک اہل بیت کی تبلیغ کی ہو۔

بزرگوں کے مزارات میں بعض قبور سادات کی معلوم ہوتی ہیں۔ مغل دور میں ڈھاکہ کا نام جہانگیر آباد تھا جو مرشد آباد کی گورنری میں شامل تھا۔ بنگال و بہار کے مشترکہ صوبے کے گورنر لگ بھگ ایک صدی تک شیعہ ہی رہے مگر ان میں سے کسی نے ترویج مذہب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

میر جملہ کے عہد تک یہ علاقہ محبان اہل بیت سے خالی تھا۔ شائستہ خاں کے دور میں میر مراد حاکم جہانگیر آباد تھا تو اس نے ایک رات خواب میں امام حسین کو دیکھا آپ نے ایک جگہ کا تعین کر کے میر مراد کو حکم دیا کہ اس جگہ امام باڑے کی تعمیر کرو اور ہمارے ذکر کی مجلس منعقد کرو۔



میر مراد سو کر بیدار ہوا تو فوراً تعمیل کیلئے روانہ ہو گیا۔ سبط پیغمبر کے حکم کو وہ ٹال نہ سکتا اس نے تعمیر شروع کرادی اور امام باڑہ بنکر تیار ہوا تو اس کا نام حسینی دالان رکھا گیا۔

اسکی اطلاع مرشد آباد اور مرشد آباد سے دہلی پہنچی تو مغض بادشاہ نے ایک ضریح بنوا کر بعض امراء کو روانہ کیا تاکہ امام باڑے کی نذر کرے اور رسول کے نواسے سے اسکے لئے دعائے مگر شدید سیلاب کے سبب وہ جہانگیر آباد پہنچ نہ سکا اور ضریح اسکے بجائے حاکم مرشد آباد نے جا کر امام باڑے میں چڑھائی۔ یہ ضریح اب تک موجود ہے۔

اسکے بعد سے شیخان علی ایام محرم میں جمع ہونے لگے اور حسینی دالان میں مجلس شروع ہو گئی جن میں آہستہ آہستہ اہل سنت بھی شریک ہونے لگے پھر اسی حسینی دالان سے عاشور کا جلوس برآمد ہونے لگا جو دھان منڈی میں اختتام پذیر ہوتا تھا۔ ضریح حسینی دالان میں واپس آجاتی اور تعزیے دھان منڈی میں دفن کر دئے جاتے۔

پاکستان بننے کے بعد ۲۰ صفر کا جلوس بھی نکالا جانے لگا۔

ایک بنگالی شیعہ نے بھی اسکے بعد اپنے گھر میں امام باڑہ بنوایا اور اس میں بھی مجلس منعقد ہونے لگیں پھر خوجوں کے اور اصفہانی کے امام باڑے بنے اور فی زمانہ ڈھاکہ میں جو محرم ہوتا ہے وہ کسی دوسری جگہ کے محرم سے کم نہیں۔

عرائے امام کا یہ سلسلہ شہروں تک محدود نہیں ہے۔ کوہستانی قبائل میں بھی نوعیت کی تبدیلی کے ساتھ اس کا رواج ہے۔ اراکان کی پہاڑیوں میں بسنے والے قبیلوں کو بھی ماتم کرتے دیکھا گیا ہے اور برما میں تو اس کا انداز ہی مختلف ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب برما پر جاپانیوں کی بمباری نے شدت اختیار کی اور لوگ جانیں بچانے کیلئے ترک وطن پر مجبور ہوئے تو ایک گروہ لکھنؤ بھی پہنچا اس نے دہکتے ہوئے انگاروں پر چل کر ماتم کیا۔ اسکے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس کا رواج ہو گیا۔

بریسوں نے ایک لمبی خندق کھودی تھی اور اسکو کولوں سے بھر کر ایک لمبا آتش کدہ بنادیا تھا۔ اس پر وہ سروپا برہمنہ دولہا دولہا کے نعرے لگاتے ہوئے آہستہ آہستہ گزرتے تھے۔ یہ عمل غسل کرنے کے بعد کیا گیا تھا اور پیروں پر کسی قسم کا مسانہ بھی لگایا نہیں گیا تھا لہذا اسکو جذبہ عقیدت کی کرامات یا حضرت قاسم کا معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

اس طرح کے مظاہرے برما سیام اور مشرق بعید کے ہر حصے میں ہوتے ہیں جو شہدائے کر بلا کا اعجاز ہے

یہ آگ کا ماتم دکنی ہندوستان میں بھی ہوتا تھا۔ نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔

دکن کے قدیم مرہٹوں میں بھی اس کا رواج تھا۔ اس میں ہندو مسلم کی کوئی قید نہ تھی۔ شہدائے کر بلا سے عقیدت رکھنے والے پاک و پاکیزہ ہو کر دہکتے انگاروں پر سے گزرتے تھے ہاتھ میں علم ہوتا اور وہ علی دولہا کے نعرے لگاتے۔ ممکن ہے اپنے جذبہ عقیدت کی آزمائش کرتے ہوں اس میں متیں بھی مانی جاتیں اور مراد برآنے پر اگلے محرم میں پاپیادہ اور سربرہمنہ انگاروں کو پھول سمجھ کر انگاروں میں راستہ بنایا جاتا۔ ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں بھی اسکے رواج کا پتہ چلا ہے مگر صرف دولہا کا نام لے کر شاید ان کا عقیدہ تھا کہ کر بلا کا دولہا انگاروں کو پھول بنا دیتا ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com



سکینہ بنت حسینؑ پر کچڑا چھلنے والے یہ بھول گئے کہ اس بچی کی عمر ۶۱ ھ میں چار سال سے کم تھی اور ۵ ربیع الاول ۶۱ ھ کو وہ دمشق کے قید خانے میں خاک کا پیوند ہو گئی جس نے حضرت عباس کے بعد پانی کا سوال تو نہیں کیا مگر جب شمر ذی الجوشن کا تازیانہ پڑا تو مدد کیلئے چچا کو آواز ضرور دی۔

کربلا کے اسیروں میں زینب کبریٰ ام کلثوم علیا، حضرت زین العابدین اور دیگر محذرات طاہرہ کی سیرتوں کو یقیناً اہمیت ہے اور ان کے کردار غیر فانی ہیں۔ فاطمہ زہرا کی اولاد مصائب کی ان منزلوں پر پہنچ چکی تھی جہاں وہ پہچانی نہ جاتی لیکن بیرحم بنی امیہ نے اس موقع پر گھناؤنی سازش کا آخری حربہ بھی استعمال کر ڈالا اور مقید خواتین میں پھوٹ ڈالنے کیلئے عورتوں کے گوش گزار کرایا کہ امام حسینؑ ان کے شہید و رثاء کو نہ لاتے تو وہ قتل نہ ہوتے۔ منشاء یہ تھا کہ عورتیں زینب و ام کلثوم کو زندان میں چھوڑ کر چلی جائیں اور اموی حکمران ان کو نواز کر متعلق قبیلوں کو منت گزار بنالیں لیکن باوفا اصحاب حسینؑ کی تربیت یافتہ خواتین اُس سے مس نہ ہوئیں بلکہ ایسی ہر تحریک پر وہ رسولؐ کی نواسیوں کے قدموں پر جاگریں اور اپنے وارثوں کی وفادار شجاعت کے کارنامے بیان کرنے لگیں۔

حسینی مشن کی تکمیل میں ان با عظمت خواتین کا بڑا حصہ ہے۔ علی کی بیٹیوں کی زبان ان کے منہ میں ہوتی تو وہ بھی شام و کوفہ کے بازاروں کو الٹ کر رکھ دیتیں پھر بھی ان سے جو کچھ ہو سکا وہ انہوں نے کیا۔ اپنے اپنے قبیلوں کا تعارف کرایا۔ رزم کربلا میں اپنے اپنے مردوں کے کارنامے بیان کیے اور اس طرح اہل قبائل کو ایک پیغام بھجوایا کہ تمہارے افراد نے آل رسولؐ کی حمایت میں گردنیں کٹوا کر نام روشن کر دئے۔

یہی بیانات تھے جو انقلاب کا پیش خیمہ بنے اور بعض امویوں کی چھپی ہوئی حمیت میں بھی ایک ابال پیدا ہونے لگا لیکن دمشق کا محض انقلاب حقیقتاً حسینؑ کی چار سال کی بچی نے لکھا۔ یوں تو اسکی تبلیغی مہم عشرہ محرم سے شروع ہو چکی تھی مگر ایک طرح پر اس کا آغاز سیدائیں کے قافلے کی کربلا سے روانگی کے بعد ہوا۔ سفر کے دوران سنگدل کو فیوں کے علاوہ کوئی اسکی تڑپ اور بے بسی کا دیکھنے والا نہ تھا مگر ان

## صراطِ مستقیم

### ماتم حسینؑ

سن اکسٹھ ہجری سے پندرہویں صدی ہجری تک اسلام کے مسلک ہدایت پر کوئی غیر مرنی خط مستقیم کھینچا جائے تو اسپر کوفہ و دمشق کے ایوانہائے تشدد، کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک کی سفاکانہ داستانیں منعکس ہوتی نظر آئیں گی۔ اہل نظر کو جو روسم کے وہ مناظر دکھائی دیں گے جن سے انسانیت کانپ اٹھے اور اہل سماعت کو ایسی جگر غراشیں سنائی دیں گی کہ حساس دل و دماغ جنکی تاب نہ لاسکیں۔ ان کے پس منظر میں شجاعان روزگار کے وہ نعرے جو صبح عاشور سے عصر تک بلند ہوتے رہے اور دوش ہوا پر شام و عراق اور عرب کی فضاؤں میں گونجنے پھر وقت کی طنائیں کھینچتے ہوئے ہر دور میں کربلا کی آواز باز گشت بن گئے۔

مستزاد ہیں جلے ہوئے خیموں کی راکھ پر بیٹھی ہوئی سیدائیں کے بین، جو شام غریبان کی بھیانک تاریکی سے شروع ہوئے لیکن آج تک افق ماضی سے سنائی دیتے ہیں۔ ان کے پیچ پیچ ایک بچی کی سسکیاں بھی کانوں میں پڑتی ہیں جس نے کبھی سنگدل کو فیوں کے دلوں کو منقلب کر دیا تھا اور بنظر غائر دیکھا جائے تو ماتم حسینؑ کا مرکز اول یہی بچی تھی جس نے کربلا کے باب مظلومیت پر مہر دوام ثبت کر دی۔



میں سے بعض اسکی حالت پر دل تھام کر رہ گئے۔ مردہ ضمیروں میں ایک احساس پیدا ہوا لیکن وہ شمر کو بیرحمی سے روک نہ سکے کیونکہ روکتے تو ان کے مفاد دنیا کو نہیں لگتی۔

عصر عاشور سے قبل کر بلا میں چھ ماہ کے بھائی نے زبان خشک ہونٹوں پر پھیر کر شاہی درندوں میں ایک ہلچل ڈال دی تھی، رو کوفہ میں چار سالہ بہن نے بعض دلوں کو ہلا ڈالا۔ نتیجہ وہاں بھی یہی نکلا تھا کہ حرمہ کے تیرہ شعبہ نے اصغر کو شہید کر دیا تھا، یہاں بھی سکینہ کو فتنے تک طمانچے پر طمانچے کھاتی رہی البتہ یزید کے دربار میں اور قید خانہ شام میں حسین کی معصوم بیٹی نے اپنے مرض کو ادا کیا اور اس طرح ادا کیا کہ عورتیں اپنے مردوں سے جو کچھ کہتی تھیں وہ تو کہتی ہی تھیں، بچوں نے بھی اپنے بزرگوں کو جھوٹا شروع کر دیا۔

”سکینہ کہتی تھی کہ اسکے باپ پیغمبر اسلام کے نواسے ہیں۔“

بزرگ اسکی تردید نہ کر سکتے انہیں اثبات میں جواب دینا پڑا اور بچوں نے وہ کہہ ڈالا جو کوئی غیر سیاسی ذہن کہہ سکتا ہے۔ ”ہم جن کا کلمہ پڑھتے ہیں انہیں کے نواسے کو مار ڈالا۔“

عام حالات میں اس تبصرے پر بچے ڈانٹ دئے جاتے مگر جو کچھ ہوا تھا اس سے مرد اور عورتیں سب متاثر تھے۔ دمشق کے وہ کوچہ بازار جنکو قیدیوں کی آمد پر مزین کیا گیا تھا انہیں میں ایک سو گوار نہ فضا پیدا ہونے لگی۔

عورتوں میں زینب و ام کلثوم اپنا تعارف کراتی رہیں اور واقعات کر بلا بیان کر کے عورتوں کو رلاتی رہیں اور در زندان پر کھڑے ہو کر سکینہ باپ اور چچا کی محبت کا ذکر کر کے خود بھی روتی رہی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی آبدیدہ کرتی رہی

یہ تھی مجلس حسین کی ابتداء جسکی داغ بیل دو ماہ چند روز کی زندگی میں حسین کی چہیتی بیٹی ڈال گئی اور مجلسوں کی بانی اگر فاطمہ زہرہ کی بیٹیوں کو قرار دیا جائے تو سکینہ کی فریاد اور نالہ و شیون ماتم حسین کا نقطہ آغاز ٹھہرے گا اور ہمارا طرز عزاء خواتین کر بلا اور سکینہ بنت الحسین کی تاسی کا مصداق ہوگا۔

### پہلی مجلس

تاریخ کی روشنی میں پہلی مجلس عزراہل بیت کی رہائی سے قبل زندان شام میں منعقد ہوئی پھر کر بلا میں مشاہد شہداء پر جہاں جابر بن عبد اللہ انصاری نے پہلی بار زیارت قبر حسین کا شرف حاصل کیا۔

پھر ورود مدینہ کے بعد شب و روز مجلس ہی مجلس، ماتم ہی ماتم۔ اب حسین کی لاڈلی بیٹی زندہ نہ تھی اسکی جگہ فاطمہ صغریٰ اور ام سلمہ نے لی اور خواتین مدینہ میں جو بھی آیا اس نے ایک شور ماتم بلند کیا۔ ہائے حسین کی صداؤں میں کسی کسی وقت ہائے سکینہ کی آواز بھی بلند ہو جاتی تھی۔

مدینے کے اموی اسکو برداشت نہ کرتے۔ انہوں نے فاطمہ کی بیٹیوں پر جبر کرنا شروع کر دیا کہ یہ ماتم بند کریں یا مدینہ چھوڑ دیں مگر زینب غریب کیا کرتی کہاں جاتی!

یہ تھی ابتداء ماتم حسین بند کرانے کی جسکی تقلید آج تک کی جاتی ہے۔

آخر چالیس روز بعد جناب ام کلثوم نے دنیا ہی چھوڑ دی تو زینب کے پاؤں کی وہ زنجیر ٹوٹ گئی تھی جو انہیں مدینے میں روکے ہوئے تھی۔ امویوں بھی زینب ہمہ وقت ایک کرب، ایک اضطراب میں مبتلا رہتیں۔ امویوں کا تشدد بڑھتا جا رہا تھا۔ زینب ماں کی قبر پر گئیں، نانا کے روضے سے رخصت ہوئیں، بھتیجے کو گلے سے لگایا، عزیز و اقارب اور اہل مدینہ کو خدا حافظ کہا اور مدینے سے اس طرح نکلیں جیسے انسانوں کے جھرمٹ میں کوئی خود اپنا جنازہ اٹھائے نکل رہا ہو۔

اور تھیں بھی وہ کسی میت سے کم نہیں! گوشت جسم میں تھا نہیں، کھال ہڈیوں سے چپک گئی تھی، قدم اٹھانے کی توانائی باقی نہ تھی، امویوں کی تلوار سر پر تلک رہی تھی، مدینے میں رہتیں تو بیان کر بلا نہ کرنا، بھائی کو، سکینہ کو، عباس کو علی اکبر کو، عون و محمد کو اور دوسرے شہداء کو یاد کر کے نہ رونا، امکان سے باہر تھا ادھر شاید سکینہ زندان شام سے آواز دے رہی تھی۔

”پھوپھی! میں اکیلی ہوں، چچا کو بھیج دو۔“

لیکن عباس فرات پر شانے کٹا چکے تھے۔ زینب انہیں کیونکر بھیجتیں لہذا کہا ہوگا



مدینہ، کربلا، دمشق اور مصر میں تو خود بنت علیؑ کی آواز سنائی دیتی ہے۔

دوسرے مقامات پر مظلومیت اپنی سرگزشت بیان کرتی ہے پھر بھی غور سے سنا جائے تو اس میں بھی زینب کبریٰ کا لب و لہجہ محسوس ہوتا ہے۔

حسینؑ کی بہن بلاشبہ کربلا کی آواز تھیں۔ ایک بار مدینے سے جانے کے بعد وہ کب واپس آئیں؟ یقین سے کہا نہیں جاسکتا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ سے زائد آنا نہ ہوا ہوگا کیونکہ دمشق سے آپ کا مصر پہنچنا بھی ثابت ہے اور مصر کہتا ہے کہ زہرا کی نامور بیٹی میری خاک میں آسودہ خواب ہے!

اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو جناب زینب ایکبار دمشق سے کربلا ہوتی ہوئی مدینے آئیں اور دوسرے سفر میں کربلا سے دمشق اور دمشق سے مصر گئیں جہاں سے واپس نہ ہو سکیں۔

بنیادی طور پر مصر جانے کے اسباب و عوامل کا پتہ نہیں چلتا۔ ہو سکتا ہے کہ دمشق میں مصر کا کوئی محب ال بیت ملا ہو اور اس نے اس سرزمین پر کربلا کا پیغام پہنچانے کی ترغیب دلائی ہو اور آپ تیار ہو گئی ہوں کیونکہ اب تو یہی آپ کا مقصد حیات رہ گیا تھا لیکن مصر میں آپ کا مدفن ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

حالات کا جائزہ لیا جائے تو زینب کبریٰ رہا ہو کر مدینہ پہنچنے کے بعد چھ ماہ زندہ رہیں۔ چالیس روز تک ام کلثوم کے ساتھ درد و غم کی داستانیں بیان کرتی رہیں ام کلثوم کے بعد ہفتہ عشرہ مدینے میں گزارا ہی ہوگا کہ عازم سفر ہو گئیں۔

اس طرح کم از کم پونے دو ماہ مدینے کے پہلے قیام میں کٹ گئے۔ باقی رہے سو اچار ماہ اس میں سے ایک ہفتہ مدینے کے دوسرے قیام کا نکال دیا جائے تو صرف چار ماہ رہ جاتے ہیں۔ اس میں کربلا اور دمشق کے دو سفر۔ کسی ایک سفر میں سفر مصر بھی شامل ہے حالانکہ ذاتی طور پر آپ کا مصر جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

محسوسات کا سہارا لے کر حقیقت کو سمجھا جائے تو اب زینب کیلئے مدینے کی کشش ختم ہو چکی تھی۔ ام کلثوم کے بعد ام سلمہ اور ام السنین بھی زندگی سے اپنا رشتہ توڑ چکی تھیں۔ باقیات الصالحات کیلئے امام وقت کافی تھے۔ زینب کربلا اور

”سکینہ! گھبراؤ نہیں، میں آرہی ہوں!“

اور زینب کربلا کی طرف روانہ ہو گئیں۔ سید الشہداء سے اور عظیم شہیدوں سے زینب نے کیا کہا اور انہیں کیا کیا جوابات ملے؟ اس کا تو علم نہیں لیکن کربلا سے چلتے وقت زینب نے بھائی کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا تھا۔

”بھیا! دمشق جا رہی ہوں، سکینہ یاد کرتی ہوگی!“

امویوں نے زینب کو مدینے سے نکالا تھا کہ مجلسیں بند ہو جائیں، ماتم نہ ہو مگر ہوا اسکے برعکس، کربلا کے شہیدوں میں ام کلثوم اور زینب کے ناموں کا اضافہ ہو گیا۔ امام زین العابدین، پورا خانوادہ رسالت اور محبان آل رسول سب اپنی اپنی جگہوں پر مجلسیں منعقد کرنے لگے اور خواتین کے بین کسی کے روکے رک نہ سکے۔

دوسری طرف زینب کبریٰ جہاں پہنچیں وہاں مجلس اور حسینؑ کا ماتم امویوں نے مدینے میں پابندی لگائی تھی مگر ذکر کربلا زینب کے سفر کے ساتھ پھیلتا رہا۔ کربلا سے دمشق تک جہاں جہاں آپ نے قیام فرمایا وہاں بنی امیہ کی قسادت اور اولاد فاطمہؑ کی مظلومیت کے چرچے ہونے لگے۔ پہلے صرف زینب خطیب تھیں آہستہ آہستہ انکی جگہ دوسروں نے لے لی۔ ایک بیان کرتا، سب سنتے اور شور گریہ بلند ہو جاتا۔

اس طرح یہ مجلسیں پھیلتی رہیں۔ اموی اور ان کے جانشین روکتے رہے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ہر دور میں مجلس و ماتم اور ہر دور میں ظالموں کی اولاد سدراہ مگر حق کا راستہ بند کرنے سے کبھی بند نہیں ہوا۔ کربلا ایک صراط مستقیم ہے جسکو حشر تک جانا ہے۔ یزید کسی عہد کا بھی ہو اس صراط مستقیم کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ابن خلدون کی ناصیت، امام غزالی کے فتاوے، ابن تیمیہ کے فقہی اجتہادات اور آخر میں محمد بن عبدالوہاب کی محمد و آل محمد دشمنی نہ کبھی اسکو روک سکی ہے اور نہ روک سکے گی۔ ظالم کی صفائی میں کتنا ہی کچھ کہا جائے کتابوں پر کتابیں لکھی جائیں لیکن مظلومیت اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

جو چپ رہے گی زبان خنجر ہو پکارے کا آستیں کا!



عشرہ محرم میں ہر سیدانی شمعیں جلا کر فرش ماتم پکھاتی اور اپنے بچوں کو کربلا کے واقعات ضرور سناتی تھی۔

کتنے بچے اور کتنے نوجواں اس سعادت کے جرم میں ماخوذ ہوئے، ان کا شمار ہونہ سکے گا۔ اسکے بعد قبر حسینؑ کی زیارت بھی ممنوع قرار دیدی گئی اور سفاک متوکل نے تو مزار مقدس ہی کو مہندم کر دینے کا عزم کر لیا کہ قبر ہی نہ ہوگی تو کوئی زیارت کرنے کہاں جائے گا! شہادت عظمیٰ کو، یزید و متوکل جیسے ہزاروں بادشاہ پیدا ہوتے، تب بھی کالعدم نہ کر سکتے۔ متوکل بھی یزید کی طرح ختم ہو گیا اور حسین کی عظمت دن دینی رات چو گئی ہوتی رہی۔

شیعہ جہاں کہیں اور جس حال میں ہوتے عشرہ محرم میں مجلسیں برپا کرتے اور حسینی پیغام کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرتے۔ سادات میں جب محبان علی شامل ہو گئے تو نظیریں اسکی بھی ہیں کہ جن کے دلوں میں آل رسول کی محبت کا شائبہ بھی تھا وہ افکار کر بلا بڑی دلچسپی سے سنتے اور پھر دوسروں سے بیان کرتے لیکن ایسا عموماً ان علاقوں میں ہوتا جہاں شیعہ اکثریت ہوتی یا شیعہ حاکم، جسکی مثالیں بنی عباس کے انحطاطی زمانے میں پائی جاتی تھیں۔

اور جب سے طاہروں نے آزادانہ حکومت قائم کر لی تھی اس وقت سے تو ذی الحج کی آخری تاریخوں ہی سے شہادت حسینؑ کا بیان ہونے لگا تھا۔

پھر علوی اور صفاری حکومتوں میں مجالس کا رواج بڑھ گیا تاہم عباسی خلفاء کے زیر اقتدار علاقوں میں اب بھی ماضی کی سی پابندیاں تھیں اور سادات صرف محفوظ جگہوں پر اپنے جد کا تذکرہ کرتے تھے۔

شیعوں کو ذکر حسینؑ کی کھلی آزادی تو آل بویہ کے اقتدار میں ملی اور معزالدولہ نے تو کھل کر شیعیت کا اعلان کر دیا۔ عباسی خلیفہ بویہ ہی سلطان کے تابع تھا کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں بعض خلفاء بھی حب اہلیت کے قائل ہو گئے تھے۔

سنی مورخین نے معزالدولہ کی شیعیت کو مطعون کیا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس عظیم فرمانروا کا سنیوں پر احسان ہے کہ اس نے اکثریت کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے خلافت کو باقی رکھا اور نہ خلافت کا تختہ الٹ کر اپنی

دمشق میں بٹ کر رہ گئی تھیں۔ دل و دماغ میں پھل، کرب و بے چینی کا وہ عالم کہ قرار سے کوئی واسطہ ہی نہ رہ گیا تھا، فاطمہ کی دکھیلیاری بیٹی رواروی کرتی ہوئی بھائی کی قبر پر پہنچتی کچھ کہتی رہتی، پھر عباسؑ، علی اکبرؑ اور ایک ایک کر کے ہر ایک کے مزار پر جاتی تھی، اندرونی اضطراب میں کمی نہ ہوتی تو سکینہ تصور میں آکر کھڑی ہو جاتی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ امام حسینؑ اس بیٹی کو بہت چاہتے تھے اور حضرت عباسؑ کو بھی وہ بہت پیاری تھی مگر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ زینب کو سکینہ سب سے زیادہ عزیز تھی۔ شاید اسی لئے اچانک بھائی کی قبر سے اٹھ کر دمشق کی طرف روانہ ہو جاتیں۔ ممکن ہے دل ہی دل میں کہتی ہوں۔

"میں آ رہی ہوں سکینہ، میں آ رہی ہوں!"

اس طرح سفر کرتے کرتے ۱۲ رجب ۶۲ھ کو کربلا کی شیردل خاتون اس دنیا سے سفر کر گئی۔

نشان قبر کئی مقامات پر پایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں مورخین کے مختلف بیانات ہیں لیکن سیرادل کہتا ہے کہ حسینؑ کی امانت کو زینب نے دمشق میں تنہا نہ چھوڑا ہوگا اور سکینہ کی قبر پر جا کر اسکو لوریاں دیتے دیتے وہ خود سو گئی ہوگی۔

### پہلا جلوس عزاء

حسینؑ کی پہلی ڈاکرہ اس خوش اسلوبی سے مجلس کا آغاز کر گئی کہ اس دور میں بھی اس کا انعقاد ہوتا رہا، جب محبان علیؑ نام بدل بدل کر تقیہ میں زندہ تھے امویوں کے جابر سلاطین محرم کا چاند نکلتے ہی اپنے کارندوں کو سراغ لگانے کیلئے بھیج دیتے اور وہ چمپ چمپ کر سن گن لیتے کہ ذکر کر بلا کہاں کہاں ہو رہا ہے اور اس طرح سادات کے پتے لگا کر انہیں تلوار کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

یہ سلسلہ بنی امیہ اور بنی عباس دونوں کے ادوار میں جاری رہا اور بنی عباس کی حکومت میں منصور دوانیقی اور ہارون رشید نے اسکو عروج پر پہنچا دیا۔ مامون کی پالیسی ان دونوں سے قدرے مختلف تھی مگر اسکے بعد پھر اسلاف کی پالیسی اور جب سے متوکل نے فقہ حنفیہ کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا اس وقت سے تو شیعوں کا خون استارزاں ہو گیا کہ پانی کی قیمت تھی مگر یہ خون مفت بہایا جاتا تھا۔ پھر بھی



باجماعت ماتم کی ابتداء اسی جلوس سے ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنیوں کی ایک تعداد آل رسول کی حالت کا تصور کر کے حسینی بن گئی اور باقی اتنے مشتعل ہوئے کہ بغداد میں شیعہ سنی فساد ہو گیا۔

یہ سوال اس وقت سے آج تک جواب کا محتاج ہے کہ ایک طبقہ اس مظاہرے کو دیکھ کر غصے میں بے قابو کیوں ہو جاتا ہے؟ کیا اسکے نزدیک یزید نے پیغمبر کی اولاد کے ساتھ جو کچھ کیا وہ حق بجانب تھا؟ اس کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ جلوس برا لگتا ہے اگر وہ خود یزید ہوتے تو وہ بھی ایسا ہی کرتے!

مجالس و ماتم سے یہ عناد اور کہا یہ جاتا ہے کہ کیا ہم اہل بیت کو ملتے نہیں؟ ہم بھی کہتے ہیں کہ رسول کا امتی اولاد رسول کا دشمن نہیں ہو سکتا پھر یہ معہ کیا ہے کہ حسین مرجع عقیدت اور ذکر حسین سے عداوت! شاید یزید بن معاویہ دلوں میں اس طرح گھر کر گیا ہے کہ اسکے سامنے حسین کی عقیدت ماند پڑ جاتی ہے۔ تب ہی تو تبعین کو ہدایت کی جاتی ہے کہ خبردار مجلس میں نہ جانا، اس سے بعض صحابہ پیدا ہوتا ہے۔

صحابہ سے ان کی مراد شاید یزید ہے کیونکہ اسی کی کر توت مجالس میں بیان کی جاتی ہیں اور وہی قابل نفرت قرار پاتا ہے کوئی فتویٰ دے یا حکم لگائے، مجلسیں تو بعد کر بلا سے ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی اور جلوس جو معزالدولہ نے نکالا تھا وہ تو بارگاہ سید الشہداء میں استیسا مقبول ہوا کہ نہ صرف بغداد بلکہ اطراف و جوانب میں اسکی تقلید کی جانے لگی پھر مصر و مرقش، ہندو سندھ اور اکناف و اطراف عالم میں ہر بڑے مقام پر نکلنے لگا جس میں امیر تیمور کے عہد سے تعزیه کا اضافہ ہو گیا۔

### پہلا امام باڑہ

قیاسی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ پہلا امام باڑہ بھی بغداد میں معزالدولہ ہی نے بنوایا ہوگا کیونکہ جلوس عزا کہیں سے نکل کر کسی مقام پر اختتام پذیر ہوا ہوگا اور پھر وہاں مجلس سید الشہداء بھی برپا ہوئی ہوگی۔ اصولاً اس مقام کو امام باڑے کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا اور نہ اسکے بعد کسی شیعہ فرمانروا کی

آزادانہ بادشاہت کا اعلان لمحات کی بات تھی۔ کون تھا جو معزالدولہ کا مقابلہ کرتا اور عوام مسلح ہو کر آتے تو بوجہ ہی لشکر کے سامنے کتنی دیر ٹھہر سکتے۔

بہر حال سنی اسکے احسان مند ہوں یا نہ ہوں لیکن شیعوں پر تو اس نے احسان عظیم کیا ہے کہ سرکاری طور پر عید غدیر کا جشن منوایا اور روز عاشور کو یوم غم و اندوہ قرار دیا۔

بلاشبہ اس نے شیعوں میں تبرے کی ابتداء کی مگر یہ جواب تھا امیر معاویہ کے دور سے اس وقت تک کے تبرے کا جسکی مدت ڈھائی سو سال سے زائد رہی تھی

ہماری نظر میں تو عظیم معزالدولہ کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بغداد کو عاشور کے دن سیہ پوش کر دیا اور ماتم حسین کا وہ جلوس نکالا جسکی بنیاد لاواشی میں سکینہ بنت الحسین نے رکھی تھی اور جسکی نظیریں زینب کبریٰ اور حضرت ام کلثوم نے قائم کی تھیں۔

محرم ۶۱ھ کے دوسرے عشرے میں سیدانیوں کا ایک قافلہ کربلا سے کوفہ لایا گیا تھا۔ اس قافلے میں اونٹوں کی تنگی پٹھوں پر بیٹھی ہوئی محذرات عصمت و طہارت کے ہاتھ پس گردن سے بندھے ہوئے تھے، گرد اور ریت میں آٹے ہوئے بال بھردوں پر پڑے تھے، اونٹ بے تحاشا دوڑتے تو بچے نیچے گر جاتے، سیدانیاں روتیں پیٹتیں، چیختیں چلاتیں مگر کوئی انکی فریاد سننے والا نہ تھا۔

پھر دس محرم ۳۵۳ھ کو چشم فلک نے ایک منظر دیکھا کہ منصور دوانیقی اور متوکل کا بغداد ایک سو گوارانہ فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ جو شخص گھر سے باہر نکلتا، وہ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے، ایک جلوس سیاہ پوشوں کا شاہراہ سے گزر رہا تھا جسکے ایک حصے میں عورتیں بال بکھرائے، سروں پر خاک ڈالے ہائے حسین ہائے حسین کے نعروں میں سنیہ کو بی کرتی، باحال پریشان آگے بڑھ رہی تھیں اور اس جلوس کی قیادت اس دور کا باجبروت سلطان معزالدولہ ویلی کر رہا تھا۔

یہ جلوس فاطمہ کے لال اور عترت رسول پر مونیوالے مظالم کی یاد میں نکالا گیا تھا اور اموی مظالم کے خلاف پہلا مظاہرہ تھا۔ اس مظاہرے کی تاسی ہر اس مقام پر کی گئی جہاں شیعہ آزادی کی سانس لینے کے حالات میں تھے۔ مجلسوں کے ساتھ



ہندوستان میں پہلا امام باڑہ سلاطین شرقیہ نے بنوایا۔ اس موقع پر دکن کی شیعہ سلطنتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن کا زمانہ تقریباً یہی ہے اور جو جذبہ ولا میں شرقیوں سے کسی طرح یکجہ نہیں تھیں اور جسکے عاشور خانے آج بھی انکی مودت کا علامہ ہیں۔

### تعزیه

تیمور صاحبقران کو شیعہ یا سنی کہنا اسکے ساتھ زیادتی ہوگی، وہ تو صرف برائے نام مسلمان تھا کیونکہ اسکے باپ دادا اسلام تو قبول کرچکے تھے مگر خواہ اس کا تعلق صرف تلوار اور تسخیر ممالک سے تھا تاہم امام حسینؑ سے وہ عقیدت ضرور رکھتا تھا اسی لئے جب موقع ملتا تو یوم عاشور کر بلا میں گزارتا تھا اور ہو سکتا ہے کہ معزالدولہ کا مروجہ جلوس اسکی موجودگی میں نکلتا ہو۔

ایک سید عالم سے اسکو بڑی عقیدت تھی اور یہ سید ہر سال تبرک کے طور پر اسکو کچھ نہ کچھ پیش کرتے تھے۔ وہ ان تبرکات کو محفوظ رکھتا تھا جن میں خاک پاک سے بنی ہوئی ایک ضریح اور ایک تسبیح بھی تھی اس تسبیح کے دانے عاشور کو سرخ ہو جاتے تھے۔

تیمور جس سال ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اس سال اس کا محرم سفر میں کٹا۔ دوسرے سال وہ فتوحات میں مصروف رہا تیسرے سال محرم آنے پر اسکے لشکریوں نے مطالبہ کیا کہ کئی برس ہو گئے ہیں انہوں زیارت کر بلائے معلیٰ نہیں کی۔ خود تیمور کو بھی اس بات کا احساس ہوا اور سوچتے سوچتے اسکو اس نقل روضہ کا خیال آیا جو اسکو سید موصوف نے پیش کی تھی سہتا نچہ اس نے وہ ضریح ایک کھلی عماری پر رکھوائی، تسبیح اسکے اوپر ڈلوائی اور ایک فوجی دستے کے جلو میں اسے لشکر میں گشت کرا دیا تاکہ لوگ روضہ نہیں تو نقل روضہ ہی کی زیارت کر لیں۔

غالباً محرم ۸۰۳ھ کا یہ واقعہ ہندوستان کی تاریخ عزا کا سنگ بنیاد ہے۔ اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں لیکن تعزیے کے سلسلے میں اور کوئی بات سامنے نہیں ہے پھر تیمور اور تیمور کے لشکریوں کی کر بلا سے عقیدت مسلم ہے اس لئے اس

طرف سے کوئی امام باڑہ تعمیر کیے جانے کا پتہ چلتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسکی وجہ کر بلائے معلیٰ کی قربت رہی ہو۔

اسکے بعد مراقش پر نگاہ جاتی ہے تو عشرہ محرم میں مسلسل مجلسیں منعقد ہونے کا سراغ تو لگتا ہے مگر مجلسوں کیلئے کوئی مخصص عمارت بنائے جانے کا تذکرہ کوئی مورخ نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شیعہ مورخ نے لکھا ہو اور آگے چل کر اس کا علم ہو سکے۔ سردست ہسٹری آف سیراسز کے حوالے سے پہلے امام باڑے کی تعمیر کا شرف فاطمین مصر کے دوسرے خلیفہ المعز کو دیا جاتا ہے جس نے قاہرہ آباد کرتے وقت محلات کے ساتھ مجلسوں کیلئے ایک علیحدہ عمارت بنوائی جو ہماری زبان میں امام بارگاہ کے نام سے موسوم ہو سکتی ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، تحقیق سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کس مقام پر اور کس دور میں جلوس کی ابتداء ہوئی لیکن مجلسوں کا ہونا اور امام باڑوں کا وجود تیمور سے بہت پہلے پایا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مسلم حکومت کی ابتدا ہی سے کسی شیعہ امیر نے امام بارہ بنوایا ہو لیکن یہ تاریخی طور پر ثابت نہیں الہیہ تعلق عہد میں شیعوں کے ذہنوں میں امام باڑے کا تصور تھا اور قرین عقل ہے کہ جس مقام پر مستقلاً مجالس سید الشہداء منعقد ہوتی ہوں، اسکو امام باڑہ کہہ دیا جاتا ہو تب ہی تو سلاطین شرقیہ نے جو پور میں قیام سلطنت کے بعد ہی امام باڑے کی تعمیر کرائی پھر مختلف علاقوں میں اسکو مختلف نام دے گئے، کہیں عاشور خانہ کہلایا، کہیں حسین چوک۔

منطقی طور پر سوچا جائے تو یہ خیال کسی امام باڑے کو دیکھ کر ہی پیدا ہوگا اور یہ امام باڑہ کب اور کس نے کہاں دیکھا؟ اسکی مدت طویل بھی ہو سکتی ہے اور مختصر بھی تاہم اس حقیقت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا ہے کہ سلاطین الشرق کے اسلاف جب ماتم کر بلا برپا کرتے ہوں گے تو اطمینان کی زندگی میں کوئی امام باڑہ بنانے کی آرزو دلوں میں انگڑائی لیتی ہوگی۔ یہ آرزو بچوں کو وراثت میں ملی اور انہوں نے حکومت ملتے ہی اس خواب کو پورا کر دکھایا۔

اس طرح امام باڑہ اگر آٹھویں ہجری میں کہیں اور پایا نہیں جاتا تھا تو



ہے اور پیغمبر اسلام کے معجز نما نواسے کی عظمت کو بھی جسکے سامنے تاریخ عالم کا کوئی کردار پیش نہیں کیا جاسکتا اور جب برہمنوں نے اپنے علوم سے امام حسین کی صداقت کی تصدیق کی تو ہندوستان کی عورتیں تعزیے کی سامنے چوک بھرنے لگیں۔

شب عاشور سے عصر عاشور تک تعزیے کے سامنے کھڑا رہنا ہندو عورت کی انتہائی عقیدت کا ثبوت ہے۔ وہ اپنے فاقے کو تعزیہ دفن ہونے کے بعد ہی دل پر بیٹھ کر اور فاطمہ زہرا کو بیٹے کی موت کا پرسادے کر توڑتی تھی۔ عقیدت کی یہ معراج بارگاہ حسینی کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ ہندوستان کا یہی مستقبل شاید سید الشہداء کے پیش نظر ہوگا تب ہی انہوں نے یزیدیوں سے کہا تھا کہ ان کیلئے ہندوستان کا راستہ ہی کھول دیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ عشرہ محرم میں ہر طرف کربلا کی آواز بازگشت سنائی دیتی تھی، اس پر ہندو عقیدت سے سر جھکا دیتے تھے لیکن مسلمانوں کے ایک گروہ نے پہلے کانوں میں انگلیاں دے لیں، اسکو بھی کافی نہ سمجھا تو عزاداری کے مخالف بن کر سامنے آگئے۔

چار سو اڑ کر اگر پھیلا غبار قتل گاہ  
ان کو ڈر تھا ساری دنیا کربلا ہو جائے گی

اور وہ مخالفت آج تک جاری ہے لیکن اس کا حاصل اس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ تھوڑے سے لوگ عزاداری کو بدعت سمجھ کر کنارہ کش ہو گئے ہیں باقی ہندو مسلمان، سنی شیعہ سب اپنے قدیم مسلک پر قائم ہیں اور محرم کا چاند افق مغرب پر ضوع ہوتے ہی ہر طرف ہائے حسین ہائے حسین کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

یہ شور ماتم کسی مخصوص ملک اور کسی شخص خطے سے متعلق نہیں پورا عالم اسلام اسکی لپیٹ میں آتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جہاں جہاں حسینی بستے ہیں وہاں مجلس و ماتم شروع ہو جاتا ہے البتہ تعزیے صرف ہندوستان ہی میں رکھے جاتے ہیں۔ اسکے سنے علاقے کی کوئی تخصیص نہیں۔ دامن ہمالہ سے راست کماری تک اور بنگال سے سندھ و کران تک ہر جگہ امام بارگاہیں سچی جاتی ہیں اور مقامی رواج کے مطابق ضریح یا تعزیے رکھے جاتے ہیں۔

روایت کو عموماً یقین کا درجہ دیا جاتا ہے اور قرائن و شواہد بھی اسکی تصدیق کرتے ہیں کیونکہ تیمور کے جائے کے بعد بھی دلی میں شب عاشور مقامی لوگوں نے مٹی کی ضریح نکالی اور یہ نکلنے والے بیشتر سنی المسلک تھے۔

اسکے بعد مٹی اور لکڑی کی ضریحوں کا رواج بڑھنے لگا۔ امیر صاحبزادے کے سامنے ادب سے کھڑا ہوا تھا، لوگ بھی کھڑے ہونے لگے۔ اسکے بعد ہندوستانی ذہن کے تحت امام حسین کی بارگاہ میں حاجتیں طلب کی جانے لگیں جو برائیں پھر مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی ضریحیں نکلنے لگے اور آہستہ آہستہ ضریح نے تعزیے کی شکل اختیار کر لی۔ ایک شخص شکل کے تعزیے کو تیموری کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تیمور کے قیام ہندوستان میں یہ تعزیہ بنایا گیا ہو۔

جلوس عاشورہ تو جا بجا نکلتا ہی تھا۔ اس میں تعزیے کا انصاف ہو گیا تو رونق بڑھ گئی اور جب امام کی طرف سے حاجت روائی بھی ہوئی تو تعزیہ مرکز عقیدت بن گیا۔ اسکے لئے ہندو مسلم، شیعہ سنی، اچھوت اور برہمن کی کوئی قید نہ تھی۔ امام حسین کی بارگاہ سب کیلئے کشادہ تھی۔ لوگ آتے ملتے اور انکی مرادیں برآتیں پھر اسی تعزیے نے واقعہ کربلا کو زبان زد کیا تو تعزیہ شور ماتم کا علامہ بن گیا۔

یہ وہ دور تھا جب محمد بن عبدالوہاب کے پیدا ہونے میں صدیاں باقی تھیں، عالم اسلام پر تصوف کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ صوفیائے کرام محبت اہلبیت کو جزو ایمان قرار دیتے اور غم حسین شعار دینی میں شامل تھا۔

تعزیہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کیونکر پہنچا؟ اسکی کوئی تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے جلوس عاشور میں تعزیہ ایک اہم جزو بن گیا پھر ہندو اور مسلمان راجاؤں کی عقیدت نے اسکے رواج کو آگے بڑھایا۔ آگے چل کر بعض شیعہ حکمرانوں نے اس میں انصاف کیے، بالخصوص شاہان اودھ نے اسکو اتنی وسعت دی کہ عزائے حسین کو شیعوں کا جزو حیات بنا دیا۔

اس طرح جلوس و تعزیہ کیلئے معزالدولہ اور تیمور صاحبزادے کے نام لیے جاسکتے ہیں لیکن حقیقتاً اسکے قبول عام میں اہل کربلا کی شجاعت و مظلومی کو بڑا دخل



وقت سے اسکی نشاندہی ہوتی ہے کہ مجلسوں اور جلوسوں کا رواج عام تھا، تب ہی تو لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے ایسے شعر کہے گئے جن سے سننے والوں کے دل روپڑیں۔ اس میں ادبیت کا شرف محمد قلی قطب شاہ والی گوکنڈہ کو حاصل ہے جنہوں نے فارسی سے ہٹ کر مقامی زبان میں بکائے حسین کی ریت قائم کی۔

اس سے ایک حقیقت اور منکشف ہوتی ہے کہ غم حسین داخل حنات تھا اس میں شیعہ اور سنی کی قید نہ تھی اور امام حسین محسن اسلام بلکہ محسن انسانیت قرار دئے جاتے تھے۔ مسلمانوں کیلئے اس میں پیغمبر برحق سے آپ کے نواسے کی نسبت کو یقیناً دخل تھا اور شاید اسی لئے مرثیے کی صنف سخن ہی واقعات کر بلا سے مختص ہو کر رہ گئی۔

مجلسوں کے بارے میں تو مسلم ہے کہ وہ مسلمانوں کی نقل مکانی میں ہمسفر رہیں اور مسلمان جس ملک یا جس مقام پر جا کر قیام پذیر ہوئے وہاں عشرہ محرم میں انہوں نے مجلسیں منعقد کرنا شروع کر دیں اور اس طرح کر بلا والوں کی صف ماتم پورے ایشیا میں بکھنے لگی۔

مجلسوں کی حد تک اگر بنظر غائر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ سلطان محمود کے ساتھیوں میں محبان اہل ریت کی ایک تعداد شامل تھی جن میں شیعہ جماعت تھی تھی اور سنی علی الاعلان، ان میں سے جو لوگ پنجاب میں یا کہیں اور رہ گئے وہ عشرہ محرم میں مجلسیں منعقد کرتے رہے۔

پھر شہاب الدین غوری نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو بکثرت لوگ ہندوستان کے مختلف مقامات پر بالخصوص دلی میں بس گئے اور محرم میں مراسم عزاء بجالاتے رہے۔ اس طرح جب تیمور ہندوستان آیا تو مجلسوں کا کافی رواج تھا جن میں روز عاشور کا جلوس شامل ہو گیا اور ضربح کے ساتھ خود تیمور کا علم جلوس کا طرہ امتیاز بن گیا۔

تیموری وضع کا تعزیه اور تیموری علم اب بھی بعض شہروں کے جلوس عزاء میں نکلتا ہے اور اسکو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ تیمور نے خود تعزیه بنوایا تھا اور اسکو جلوس کی شکل میں گشت کرایا تھا۔ بہر حال

عراق و ایران اور اسی طرح کے دوسرے مقامات پر جلوس میں شہید ہیں، علم اور ماتمی دستے ہوتے ہیں جو قمع اور زنجیروں سے ماتم کرتے ہیں اور اپنے کو ہولناک کر لیتے ہیں۔ اس مظاہرے کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم کر بلا میں ہوتے تو نصرت امام میں اس طرح خون میں نہا کر جہاد کرتے۔ بعض جگہ ہاتھوں سے ماتم بھی ہوتا ہے، بالخصوص جلوس عاشورہ کا منظر بڑا الم انگیز اور کرب ناک ہوتا ہے: سیاہ پوش اور بکھرے ہوئے بالوں کے ماتمی دستے گرد و غبار میں اسٹے ہوئے اور سنیہ کو بی کرتے ہوئے اس قافلے کی یاد تازہ کر دیتے ہیں جو رسیوں سے باندھ کر کر بلا سے کوفہ لے جایا گیا تھا۔

ان جلوسوں میں بعض جگہ امام حسین کا گھوڑا بھی ہوتا ہے اور حضرت عباس کا علم بھی۔ جلوس میں تابوت کی شمولیت اس آرزو کو ظاہر کرتی ہے کہ ہم ہوتے تو شہداء کے جنازے سرو پا برسنہ ہو کر اٹھاتے اور ان کی میتیں تین روز تک گرم ریت پر پڑی نہ رہتیں۔ یہ جلوس عراق و ایران کے تمام مقامات، مسقط، بحرین وغیرہ میں اٹھتے ہیں اور اب تو یورپ و امریکہ کے بعض مقامات پر بھی عاشور کے یہ مظاہر منعقد کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے جلوسوں میں مختلف اقسام کے تعزیوں کا اضافہ ہوتا ہے جنکو نقل روضہ کہا جاسکتا ہے اور بعض تعزیے تو ہوہو روضہ مقدس کی نقل ہوتے ہیں۔ ایسے تعزیے لکھنؤ میں اور لکھنؤ کے قریب محمود آباد میں اب بھی بنائے جاتے ہیں اور ان کو دیکھ کر آرزوئے زیارت کر بلا رکھنے والوں کی تمنا ایک حد تک پوری ہو جاتی ہے

جلوس تبت اور کشمیر میں بھی نکلتے ہیں اور انکی نوعیت بھی ہندوستان کے جلوسوں کی سی ہوتی ہے۔

بیانات متواترہ اور شواہد مسلسل کے بعد یہ مسلم ہو جاتا ہے کہ تعزیه پہلے پہل صاحبقران امیر تیمور نے نکالا لیکن تیمور کی واپسی کے بعد کن کن شہروں میں یہ جلوس نکلتا رہا، اس کا کوئی تحقیقی سراغ نہیں ملتا پھر بھی جب سے برج بھاشا میں شاعری کا آغاز ہوا اور اس میں داستان کر بلا سے متعلق منظومات پیش کی گئیں اس



دلی اس کا ابتدائی مرکز تھا جہاں مغل دور میں مجلس و ماتم دونوں کو فروغ ملا۔ اسکے اسباب میں صوفیائے کرام کے اتھفات اور بعض مغل بادشاہوں کی توجہ کو بڑا دخل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض سنی امراء کو بھی عزائے حسینؑ میں بڑا شغف تھا۔ وہ بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالتے تھے جسکے آثار انگریزوں کے عہد میں بھی پائے جاتے رہے اور مغل سلطنت کا زوال ہو جانے کے باوجود عزاداری میں فرق نہیں آیا۔

مثل مشہور ہے کہ عوام فرمانروا کے طور طریقے کی تقلید کرتے ہیں لہذا اہلیان دلی کا عزادار بن جانا ناگزیر تھا اور اس کے ساتھ اطراف و جوانب پر بھی اس کا اثر پڑنا چاہئے تھا اس لئے نہ صرف دلی بلکہ نزدیک و دور کی ان گنت بستیوں میں بھی اپنے اپنے طرز پر مظاہرہ غم ہونے لگا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخبار سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت احمد شہانی اور دیگر بزرگوں کا بھی اسی پر عمل رہا ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے احمد یار خان کو ان کے استفتاء کے جواب میں لکھا تھا کہ "سال بھر میں فقیر کے گھر پر دو مجلسیں ہوتی ہیں۔ ایک تو ذکر و ذات شریف (نبوی) اور دوسری مجلس ذکر شہادت امام حسینؑ روز عاشورہ۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ خود ذکر شہادت کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔"

### قدیم دلی کا محرم

علی جوادی زیدی نے اپنی کتاب "دہلوی مرثیہ گو" میں بڑے بڑے ارباب تصوف کے حوالے دئے ہیں اور ربط بیان میں صراحت کی ہے کہ۔

"دلی میں بیان مصائب کی روایت کافی قدیم ہے۔ امیر خسرو نے شہادت دی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی (ساتویں صدی ہجری) میں بھی دلی میں مجلسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں مقتل حسینؑ پڑھی جاتی تھی۔ پورے عشرے میں مخصوص دعاؤں کا درود ہوتا تھا عبارت میں ماتم اور سنیہ چاکی کا بھی اشارہ موجود ہے۔ سکندر لودی عاشور کے روز فقیروں اور درویشوں میں خیرات بانٹتا تھا، مجلس و فاتحہ و خیرات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ عبدالقادر بدایونی، عہد ہمایوں کے علماء و شعرا کے فصیح میں حیدر تویاتی کا یہ شعر درج کرتے ہیں۔

ماہ محرم آمد و شد گریہ فرض عین  
گر سیم خون بہ یاد لب تشنہ حسین

اور اسی کے ساتھ یہ تشریح کرتے ہیں کہ "لوگ اس کا یہ مطلع جو اس نے عزائے حضرت امام شہید مقبول و مقتول فلذہ کبر رسول مقبول میں نقش بند کیا تھا ایام عاشور میں پڑھا کرتے تھے"۔ فرخ سیر کے عہد کی عزاداری کا ایک ثبوت "سیر المتأخرین" نے پیش کیا ہے۔ غالباً اوائل فر ۱۶۱۲ھ کی بات ہے کہ میر جملہ بہار کی صوبہ داری پر متعین ہو کر دلی سے جانے لگے۔ شہر کے امرا ان کو رخصت کرنے گئے۔ روح اللہ خاں کے بیٹے نعمت اللہ خاں چند دن نہ جاسکے کیونکہ عشرہ محرم کی تعزیر داری میں مصروف تھے۔ عاشور کے بعد گئے اور یہ معذرت کی کہ اب تک نہ آنے کی وجہ ماتم داری تھی۔ میر جملہ نے طنزاً پوچھا کہ کیا آپ کے یہاں کسی کی موت ہو گئی تھی؟ نعمت اللہ خاں نے جواب دیا کہ نہیں سید الشہد کا ماتم تھا۔

نواب صدرالدین محمد خاں فائر دہلوی اور نگ زیب کے آخری عہد سے محمد شاہ کے زمانے تک دلی میں مقیم تھے۔ انہوں نے اپنی فارسی تصنیف "اعراض الصدور" کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ایام عاشورہ میں تمام محبان اہل بیت مشغول عزادار ہو جاتے ہیں اور وہ کتب توارخ جن میں اعدائے دین کے جو رسیم کا بیان ہوتا ہے پڑھتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے مغموں و مہموں ہوں۔ اس بنا پر یہ خیال ہوا کہ ان عبارات جانسوز کا خلاصہ اور کلمات غم اندوز کا اختصار لکھ دیا جائے۔ اس سلسلے میں "دادی غموم" کے جگر سوختوں میں ہر ایک نے رسالے لکھے ہیں۔ ان کے مطالب پڑھنے سے لکھنے والے کو حسرت عظیم حاصل ہوتا ہے اس لیے میں (فائر) نے یہ چاہا کہ والدال علی الخیر کفاعلہ کے مصداق اس ثواب میں داخل ہو جاؤں۔ اگرچہ حدیث کی کتابوں میں بعض امور مثل احوال شہر بانو و حضرت قاسم و پیران مسلم وغیرہ دوسرے طریقے سے لکھے ہوئے ہیں لیکن چوں کہ یہ قصے گریہ کا سبب ہوتے ہیں اور اصل مقصود بھی یہی ہے اس لیے ارباب سیر کی متابعت کی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر مصائب کر بلا کی کتابیں دلی اور قرب وجوار میں عہد عالمگیری اور اس کے قبل و بعد برابر تصنیف ہوتی رہتی تھیں اور محبان اہل بیت ایام محرم میں مراسم عزاداری



کے مطابق یہ شیعہ مذہب تھیں۔ ۱۷۲۲ء کے آس پاس ایک ہتھر جس پر نقش قدم شاہ مرداں تھا باہر سے لایا گیا اور ایک سنگ مرمر کے حوض میں نصب ہوا۔ ۱۷۲۸ء مطابق ۱۱۹۲ ہجری میں نواب قدسیہ محل نے جاوید خاں خواجہ سرا کے اہتمام سے چار دیواری، مجلس خانہ اور حوض بنوایا اور پھر ۱۸۰۰ء میں عشرت علی خاں نے بھی مجلس خانہ تعمیر کرایا۔ ۱۸۲۱ء میں صادق علی خاں نے نقار خانہ بنوایا۔ سرسید احمد خان لکھتے ہیں کہ اب یہ درگاہ خوب آراستہ ہے ہر مہینے کی بیسیوں کو یہاں مجلس ہوتی ہے اور رمضان کی بیسیوں کو بہت ہجوم ہوتا ہے محرم میں تعزیے آتے ہیں اور بہت ہجوم ہوتا ہے اور جس میدان میں تعزیے ٹھنڈے ہوتے ہیں اس کا نام کر بلا رکھا ہے۔ اس کی بھی چار دیواری اشرف بیگ خاں نے بنوادی ہے۔ مرقع دہلی کی روایت زیادہ قریب الہمد ہے اس کے مطابق درگاہ شاہ مرداں کی بنیاد عہد محمد شاہی میں پڑی اور نجف خاں اور سادات خاں کی نگرانی میں بنی۔ اس درگاہ کی وسیع عمارت میں لوگ محرم کی بارہویں تاریخ کو (جو زیارت امام حسین کا دن ہے) جمع ہوتے تھے۔ سواریوں کی کثرت اور وضع و شریف کی اتنی بھیر ہوتی کہ راہ مشکل سے مل پاتی۔ اس موقع پر اہل عرفہ اپنی دوکانیں سجاتے اور چوک خانے میں منقبت خواں قصائد عزا پڑھتے۔ کتاب خوانی کے بڑے بڑے اجتماعات دہلی میں سرعام ہوا کرتے تھے۔ بعد کے اردو شعرا میر غالب علی خاں کتاب خوانی میں یکتا اور بے مثال تھے اور میر فضل علی جنون کی کتاب خوانی کے سلسلہ میں قاسم نے کتاب کے باسلیقہ ہونے کا ذکر کیا ملا محمد شوستری خطا واقعہ خوانی میں بے مثال تھے۔

مرثیہ خوانی کا رواج بھی عام تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ رواج اورنگ زیب کے زمانے میں بھی ضرور رہا ہوگا۔ میر حسن نے ابوالحسن تانا شاہ کے ندیم شاہ قلی خاں شاہی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے مرثیے لوگ دکن سے ولایت ہندوستان میں تحفے کے طور پر لایا کرتے تھے۔ یہ تحفے بے سبب تو نہیں لائے جاتے تھے۔ یقیناً غنوار اور مرثیہ خواں مجلسوں میں پڑھتے رہے ہونگے۔

امام حسین کی ذات سے اسلام کے تمام فرقوں کو بھی عقیدت مندانہ شغف تھا اور مجلس عزا شیعہ اور سنی دونوں ہی برپا کرتے تھے۔ عزاداری میں مغل دربار بھی

بجالاتے تھے کم از کم محمد شاہی دور میں ماتم کا بھی رواج تھا۔ فضلی نے لکھا ہے۔

پھر ان سارے حاضران خاطر  
صدق سے جو کیے ہیں ماتم شاہ

ایسے لوگ بھی تھے جو نہ صرف ہر سال عزاداری کرتے تھے بلکہ اسے فرض مذہبی جانتے تھے۔ فضلی نے اس کی بھی شہادت دی ہے

اس کا واجب ہے تعزیر ہر سال

محمد شاہ کے دور میں چوک سدا اللہ خاں میں شیریں مقال واعظ چوبی کرسیوں کے منبر پر بیٹھ کر ہفت روزہ کی مناسبت سے وعظ کہتے تھے چنانچہ "مرقع دہلی" کی روایت کے مطابق محرم الحرام میں سرعام ذکر شہادت ہوتا تھا۔ کنور پریم کشور فراتی نے یہ چشم دید شہادت دی ہے کہ سفر میں بھی مراسم عزاء بجالاتے جاتے تھے چنانچہ جب افراسیاب خاں کی درخواست پر شاہ عالم آگرے کو روانہ ہوئے تو ۲ محرم کو لشکر شاہی سید پور (تعلقہ فتح پور سیکری) میں مقیم ہوا۔ وہاں شاہی اور دکنی دونوں ہی فوجوں نے مل کر "عزائے امامین" (امام حسن و امام حسین) کا انتظام کیا۔ پھر ۲۰ محرم کو اسی سفر میں شاہ عالم نے حکم دیا کہ "حضرت حسین و شہدائے کر بلا" کی فاتحہ کے لیے کھانے پینے کی چیزیں پوری احتیاط سے تیار کریں۔

بیان مصائب کے کئی طریقہ رائج تھے ان میں روضہ خوانی، کتاب خوانی اور واقعہ خوانی کافی مشہور تھے۔ نواب درگاہ قلی خاں نے محمد شاہی دور میں دلی کا سفر کیا تھا انہوں نے سفر کے حالات مرقع دہلی نامی کتاب میں جمع کیے ہیں ان کا چشم دید بیان ہے کہ اس دور کی دلی میں (خواجہ سرا) جاوید خاں کے عزا خانے کی طرح بہت سے "عاشور خانے" تھے جن میں مجلسیں ہوتی تھیں کہیں مختشم کاشی اور حسن کاشی کے مرثیے پڑھے جاتے تھے اور کہیں روضہ الشہدا۔ نواب شرف علی خاں کی طرح دوسرے امراء کے گھروں کے اندر تعزیر خانے تھے جہاں مراسم عزاء بجالاتے جاتے تھے۔ مقررہ مقامات پر لوگ ہجوم کی شکل میں آتے اور شور گریہ بلند ہوتا۔ درگاہ شاہ مرداں محمد شاہ بادشاہ دلی کی بیگم نے بنوایا تھا۔ یہ وہی بیگم ہیں جنہیں احمد شاہ نے نواب بانی اور پھر قدسیہ صاحب الزمانی کے خطاب سے نوازا۔ سرسید احمد کی روایت



واقعہ کر بلا سے ذہنی طور پر متاثر ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ مرزا راجہ رام ناتھ ذرہ جو عہد شاہ عالم میں پیش کاری نظارت پر مامور تھے اور بہت مقرب تھے محرم آتے ہی مصروف عزا ہو جاتے اور سبز پوشی اختیار کر لیتے تھے شربت کی سبیل لگاتے اور بہت خیرات کرتے تھے۔

ایام عزائیں سبز پوشی کا خاصا رواج تھا خواجہ محمد باسط دہلوی بھی جن کے دلی اور نواح میں سیکڑوں مرید تھے ایام عزائیں سبز لباس پہن لیا کرتے تھے۔ علی باسطی نے ان کے آداب تعزیه داری کا ذکر ایک شنوی میں کیا ہے اس کا ایک شعر ہے۔

باز در مجلس درآ با رخت سبز  
باز ماتم دار شو از تخت سبز

عزاداری کا سلسلہ صرف محرم کے ابتدائی بارہ دنوں تک ہی محدود نہیں رہتا تھا بلکہ پہلے (اربعین) یعنی ماہ صفر کی بیسیویں تاریخ تک جاری رہتا تھا۔ اسی بیاض باسطی سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

بار ماتم دار شو تا اربعین  
در عزائے ابن خیر السلین

منشی فیض الدین نے بزم آخر میں دلی کے دو آخری بادشاہوں کے طریق معاشرت کی تفصیلی حکایت بیان کی ہے اس سلسلے میں ایام عزا کا بھی ذکر آگیا ہے ان کا بیان ہے۔

”محرم کا چاند دکھائی دیتے ہی باجے بجنے لگتے، سبیلین گتیں، بادشاہ امائن حسنین کے فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے گلے میں سبز کفن جھولی ڈالتے، درگاہ میں جا کر سلام کرتے، نذر دیتے دس دن تک صبح کو کھانا اور شام کو شربت فقرا کو بٹتا، چھٹی کو بادشاہ لنگر میں کھینچتے، دوشدے (علم) بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتے اور کمر میں چاغری کی زنجیر، دوسید زنجیر پکڑ کر دوچار قدم کھینچتے پھر وہ زنجیر گلے میں ڈال دیتے اور علم سید لے جاتے، ساتویں کو مہندی اٹھتی، بادشاہ بیگمات جشنیں تر کنیاں خوبے وغیرہ ساتھ چلتے۔ جب مہندی امام باڑے میں پہنچتی، درگاہ میں چرمادی جاتی۔ آٹھویں کو

شامل تھا بلکہ تعزیه داری کی بنیاد ہی تیمور نے ڈالی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ معمولاً ہر سال کر بلا جایا کرتا تھا جس سال ہندوستان آیا اس سال وہ کر بلا نہ جاسکا تو اس نے کر بلا کی ایک شبیہ بنوائی۔ روضہ کر بلا کی یہی شبیہ تعزیه کے نام سے مشہور چلی آتی ہے۔ دکن کی حکومتوں پر حملہ کرنے کی وجہ سے اورنگ زیب کے معتقدات کی بہت سی تعبیریں کی جاتی ہیں۔ یہ حملے بنیادی طور پر مذہبی کم بلکہ سیاسی اقتدار کی بالادستی کے مظاہرے کے لیے تھے۔ اورنگ زیب راج عقیدے کا سنی تھا لیکن اس کے کئی ممتاز درباری شیعہ تھے نواب اسد خاں وزیر اعظم اور نعمت خان عالی دونوں ہی شیعہ تھے اور اورنگ زیب انکی شیعیت سے آگاہ تھا اورنگ زیب کی چہستی بیٹی زیب النساء اپنے استاد محمد سعید اشرف مازندرانی سے متاثر ہو کر قلعے میں عزاداری کرنے لگی تھی اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ اول غالباً خود شیعہ ہو گیا تھا اس دور میں قلعے کے اندر بھی کچھ بیگمات اور شہزادے تعزیه داری کرنے لگے تھے فرخ سیر کے عہد میں باقاعدہ طور سے قلعے کے اندر تعزیه داری ہونے لگی تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دلی میں عزاداری اور گھروں کے اندر تعزیه داری پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ تیمور کے بعد تعزوں کو ایسی اہمیت حاصل ہو گئی کہ عام راستوں پر ان کے جلوس نکلتے لگے نواب شاہ نواز خاں نے مراۃ آفتاب میں ان جلوسوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جن میں اوباش بھی جمع ہو جاتے تھے عاشور کے روز یہ لوگ تابوت بنا کر چلتے تھے اور لوگوں کو اپنی شمشیر بازی سے آزار پہنچاتے تھے اسلئے اورنگ زیب نے ان جلوسوں کی ممانعت کر دی لیکن اورنگ زیب نے عزاداری پر پابندی نہیں لگائی۔ مجلسیں برابر جاری رہیں اور گھروں میں بلکہ خود قلعے میں تعزیه بھی رکھے جاتے رہے فرخ سیر کے زمانے میں تعزوں کے جلوس پھر نکلتے لگے صفدر جنگ کے بعد عالمگیر ثانی (۱۷۰۴ء) نے تعزوں کے جلوس پر پھر پابندی عاید کر دی لیکن مشکل سے دو چار برس بند رہنے کے بعد پھر جاری ہو گیا اور آج تک جاری ہے اس میں سبھی اسلامی فرقے شریک ہیں۔

تعزوں کے علاوہ شاہراہ عام پر سبیلین بھی رکھی جاتی تھیں اور کم از کم شاہ عالم کے زمانے تک خاصی عام تھیں، مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی سبیلین رکھ کر



بادشاہ حضرت عباسؓ کے سقہ بننے لالہ کھار دے کی لنگی باندھ، مکر پر مشتبک رکھ شربت پلاتے اور مالیدہ پر نیاز دلوا کے تقسیم کراتے دسویں کو نیاز ہوتی۔ بادشاہ ظہر کے وقت برآمد ہوتے۔ موتی مسجد میں عاشورے کی نماز پڑھتے۔ دیوان خاص میں حاضری نیاز ہوتی۔ نیاز دلوائی جاتی۔ خود جکھٹے اور شاہزادے اور معزز امیر ساتھ دیتے پھر جامع مسجد سے تبرکات آتے۔ بادشاہ اور بیگمات زیارت کرتیں شام کو محل کے تبرکات کی زیارت ہوتی اور گونا و غیرہ بنتا۔

اکثر سلاطین قلعے میں تعزیه داری کرتے تھے فقیر یک بننے تھے کوئی نشا پچی کوئی نقیب بنتا کوئی تاش کوئی ڈھول کوئی جھا۔ تجھ تعزیوں کے آگے بجاتا تھا کوئی مرثیے پڑھتا تھا۔ مرثیہ خوانوں کو درگاہ سے چار چار طشتریاں بن چکنی ذلیاں بھنے ہوئے خربوزے کے بیج اور دھنیے ملا کرتی تھیں۔ بڑی دھوم سے علم اٹھاتے تھے (۱۱۶) ہندوستان میں ذکر حسینؑ کا نقطہ آغاز سندھ کے علاوہ کسی دوسرے خطے کو

قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن اس پر بعد زمانی کے پردے پڑے ہوئے ہیں، جو پور اور دکن وغیرہ قدرے روشنی میں ہیں مگر عزائے حسینؑ کی موجودہ شکل مغل دور میں آہستہ آہستہ بنتی رہی۔

اس طرح دلی کو عزاداری کا ابتدائی مرکز قرار دیا جاسکتا ہے پھر جو پور اور دکن کے نام آتے ہیں۔ یوں تو دکن کی چاروں شیعہ حکومتیں عزادار تھیں لیکن قطب شاہی فرمانروا اس میں پیش پیش رہے۔ آخر میں مرشد آباد اور لکھنؤ نے گرانقدر خدمات انجام دیں شاہان اودھ نے تو حب اہل بیت کو غلو کی حد تک پہنچا دیا تاہم ان کے خلوص نیت میں شک نہیں کیا جاسکتا اور یہ ان کے غیر معمولی شغف کا نتیجہ تھا کہ اس دور میں اور اسکے بعد ایام عزا کو ۲۵ ذی الحجہ سے ۸ ربیع الاول تک وسعت ہو گئی اور اس کا رواج آج تک شیعہ بساط عقیدت پر پایا جاتا ہے۔

ایک بدیہی حقیقت اور بھی ناقابل انکار ہے کہ ترویج عزا میں سجادہ ہائے تصوف کے انتفات کو بڑا دخل رہا۔ انہوں نے مجالس اور جلوس عزا کو ہو سکتا ہے کہ عرس سے تعبیر کیا ہو لیکن تعزیے کو ہمیشہ بڑی اہمیت دی اور اکثر خانقاہوں میں اب بھی تعزیے رکھے جاتے ہیں۔

عقلی طور پر ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے کہ ممکن ہے کسی صوفی نے عرس کے نظریے سے ضریح کے سلسلے قوالی کے بجائے سوز خوانی کرائی ہو جو دکن سے چلی تو پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ دکن کے حلقہ تصوف میں یوں تو بہت سے جلی نام ہیں مگر خیال حضرت گیسو دراز کی طرف جاتا ہے جنکے بارے میں کوئی محقق شاید موشگافی کر سکے۔

یہ تمام عناصر عزادلی کی تعزیه داری میں موجود تھے جو مغلوں کے انتزاع تک باقی رہے شاید انہیں کو دیکھ کر معروف دشمن اہلبیت محمود احمد عباسی نے کہہ دیا ہو کہ مغل بادشاہ شیعہ نہیں تو نیم شیعہ ضرور تھے۔ عباسی کا یہ تبصرہ کسی طرح صحیح نہیں ہے البتہ استناد ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے اکثر تعزیه دار تھے بعض کم بعض زیادہ۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عہد میں حکومت کی طرح تعزیه داری بھی زوال پذیر ہوئی۔

سلطنت کے انحطاط میں دلی بھی شیعوں سے خالی ہوتی رہی تھی پھر لکھنؤ کے عروج نے مشاہیر کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ بحالت موجودہ دلی میں عزاداری ہوتی ضرور ہے مگر اضنی کی گہما گہمی کی جھلک بھی اس میں نظر نہیں آتی تاہم ایک سو گوارانہ شکوہ پایا جاتا ہے اور جلوس اسی طرح نکلتے ہیں جس طرح دوسرے بڑے شہروں میں۔

اسکو کر بلا کے شہیدوں کا معجزہ ہی کہنا چاہئے کہ اطراف و اکناف ہندو سندھ میں کوئی بڑا گاؤں یا قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں تعزیه نہ رکھا جاتا ہو اور جہاں کے ہندو اور مسلمان تعزیے کو مرجع عقیدت نہ سمجھتے ہوں۔ دلوں میں اسلام کا نور ہو یا نہ ہو مگر ذہنوں پر سید الشہداء کا سکہ بیٹھا نظر آتا ہے۔

### باون دن کے کا تعزیه

دلی، جو پور، دکن، اودھ اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ایک وقت وہ بھی تھا جب اہل سنت کے تعزیے زیادہ ہوتے تھے۔ بلاشبہ ان میں سو گواری سے زائد عظمت امام کا شکوہ پایا جاتا تھا۔ ڈھول، باجہ، پٹا بنوٹ اور اسی طرح کے دوسرے مظاہرے ہوتے مگر اسکو اس عزم کا اظہار بھی قرار دیا جاسکتا ہے



شہر کی آبادی کم ہونے کا بھی اس پر اثر نہیں ہے کیونکہ اس کی کو مضافات سے آنے والے دیہاتی پوری کر دیتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تعزیے کے جلوس میں ایک میلے کی سی شان ہوتی ہے۔ گلی کوچوں میں آدمی ہی آدمی نظر آتا ہے لیکن ان سب کے دلوں میں کر بلا اور زبان پر امام بابا کا نام ہوتا ہے۔

### دکنی قبائل میں عزاداری

ہندوستان کے متمدن شہروں میں مختلف العقائد حلقوں کی عزاداری محتاج ثبوت نہیں۔ لکھنؤ، اگرہ، لاہور، کرلچی، ملتان، ہر مقام اپنی انفرادیت رکھتا ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ چھوٹے سے چھوٹا گاؤں محرم کا چاند نظر آتے ہی مصروف عزادار ہو جاتا ہے۔ اسکے لئے کسی خطہ ارض کی تخصیص نہیں۔ شاہان شرقیہ کی سرزمین ہو یا سلاطین دکن کا ملک اور آخر میں اودھ کی وہ سلطنت جو گویا عزاداری کے فروغ ہی کیلئے پیدا ہوئی تھی۔

ان میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں کیونکہ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ حالات نے جسکو جتنی مہلت دی، اس نے مقاصد کر بلا کی اشاعت میں کوتاہی نہیں کی اس لئے گنگا و جمن کا دوآبہ ہو یا گوامتی اور گھاگھرا کے ساحل، تبت کی برف پوش پہاڑیاں ہوں یا مکران کی سنگلاخ زمینیں، محرم میں ہر جگہ اور ہر طرف یا حسین یا حسین کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور مقامی زبانوں میں نوٹے اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔

گو لکھنؤ اور گھبراہ کے عاشور خانے یا حیدر آباد کا عراخانہ زہرا کچھ تعجب خیز نہیں، حیرت ہوتی ہے دکن کے گھنے جنگلوں اور مشرقی گھاٹ کی پہاڑی وادیوں میں بسنے والے قبیلوں کی امام حسین سے عقیدت دیکھ کر، تہذیب و تمدن سے جتنکا کوئی رشتہ نہیں لیکن کر بلا سے ان کا ایک روحانی رابطہ ہے۔ گوئڈ، بھیل، پاروی، کیکاڑی اور لمباڑے قبائل محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی تاڑ کے پتوں کا علم بنا کر اس تھونپڑی پر نصب کر دیتے ہیں جو صرف مراسم عزاداری کیلئے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہاڑی پر بنا ہوا ایک بہت پرانا قلعہ بھی ہے جس کا ایک حصہ صرف محرم میں کھولا جاتا ہے اور چالیس روز بعد بند کر دیا جاتا ہے۔

کہ وہ اس وقت موجود ہوتے تو اس شان سے نصرت امام کیلئے روانہ ہوتے البتہ ہندوؤں کے تعزیہ میں ایک المناک عقیدت نظر آتی جو یقیناً شیعوں سے مستعار لی گئی تھی اس میں ہندو انداز کا وہ اندھا جذبہ پایا جاتا جو کسی بڑے دیوتا کیلئے ممکن ہے۔ مثال کے طور پر شاہی کے ایک شہر خیر آباد کو لیا جاسکتا ہے جو راجہ ٹوڈرمل کا وطن تھا اور جہاں آج بھی ٹوڈرمل کی علامت مزار پائی جاتی ہے۔ اس قصبے میں تعزیہ داری کب شروع ہوئی؟ اس کا کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہ ہو سکا مگر ایک بات مسلم ہے کہ مغل دور میں اودھ کا یہ شہر باون محلوں پر مشتمل تھا لہذا ہر محلے سے ایک ڈنڈا منگوا کر تعزیہ بنایا گیا تھا جو آج بھی باون ڈنڈے کا تعزیہ کہلاتا ہے۔

اس تعزیے کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ چار بڑے ستونوں کو جس طرف سے بھی دیکھا جائے تین ہی ستون نظر آتے۔ یہ تعزیہ تقریباً پورے شہر کے ہر چوک پر جاتا ہے اور ہر محلے کے مظاہرہ عرا کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ عزاداروں میں ہندو مسلمان سنی و شیعہ کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ سب اسکے لئے یکساں جذبات رکھتے ہیں۔ بحالت موجودہ اس شہر کی حیثیت ایک چھوٹے سے قصبے کی رہ گئی ہے اور اس میں شیعوں کی آبادی برائے نام ہے لیکن تعزیہ اسی طرح اٹھتا ہے اور جلوس میں دودھ کی سبیلیں جا بجا پائی جاتی ہیں۔

تعزیہ شہر کے باہر ایک بڑی دہل میں لے جا کر دفن کیا جاتا ہے۔ یہ دہل پہلے سے کھود لی جاتی ہے اور ہندو عورتیں شب عاشور سے اس میں دودھ کی بالٹیاں لے جا کر ڈالتی رہتی ہیں۔ دہل کی کرامت یہ ہے کہ اسکی نچلی تہہ دودھ کو جذب نہیں کرتی یا بہت کم جذب کرتی ہے جس سے دودھ میں مٹی کی آمیزش ہونے نہیں پاتی۔ عورتیں منت مان کر دودھ سے لبالب دہل سے کٹوروں میں دودھ نکال کر استعمال کرتی ہیں اور جب انکی مراد برآتی ہے تو دودھ کی بالٹیاں اگلے سال دہل میں لا کر ڈالتی ہیں۔

یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چلا آ رہا ہے اور لوگوں کی عقیدت کم ہونے کے بجائے بڑھتی جاتی ہے۔



## گوالیار کی عزا داری

نوحوں کے ساتھ عزاداروں اور جلوس کے مناظر بھی درد و غم کا ایک تاثر پیدا کرتے ہیں۔ تعزیه داری کے قبول عام کا بنیادی نکتہ مظلومیت کی وہ داستان ہے جو بن کبے اہل نظر کی سمجھ میں آجاتی ہے اور دل اتنی بے حسنی سے دوچار ہو جاتا ہے کہ ذاتی عقیدے اور مذہبی تصورات کا امتیاز باقی نہیں رہتا اور سرخود بخود بارگاہ سید الشہداء میں جھک جاتا ہے۔

اسیروں کا پہلا جلوس، جب کربلا کو فہ اور کوفہ سے شام گیا تھا تو سنگدل شامیوں کے قلوب خود اٹ کر رہ گئے تھے اور یزید نے گھبرا کر سارا الزام لشکر کے سرداروں پر لگادیا تھا۔ اب یزید کے پیرواسکی تقلید کرتے ہیں۔ جلوس بدعت ہے، تعزیه بدعت ہے لیکن حسین کی عظمت نہ یزید کے مٹانے سے کم ہوئی تھی اور نہ یزیدیوں کی کوششوں سے اس پر اثر پڑ سکتا ہے کیونکہ حسین صرف شیعوں ہی کے تو نہیں ہیں سنی اور ہندو بھی انہیں اس طرح ملتے ہیں چنانچہ مہاراجہ گوالیار کا واقعہ مشہور عالم ہے کہ:

جواں سال مہاراجہ کی شادی کا مہورت نکلوا یا گیا تو محرم کی نویں تاریخ کا نکلا۔ ہندو خود بھی محرم میں شادی بیاہ نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے پنڈتوں سے درخواست کی کہ کوئی دوسری شبہ گھڑی نکال دیں۔ بعض پنڈتوں نے بچار کیا مگر ایک پنڈت نے کہہ دیا کہ اگر یہ سے ٹل گیا تو چوبیس سال تک ایسی ساعت نہیں آئے گی لہذا شادی کا فیصلہ کر لیا گیا۔ انتظامات ہو گئے اور مہاراجہ بارات لے کر روانہ ہو گیا۔

گرمی کا موسم اپنے شباب پر تھا۔ کوہ و صحرا بھاڑ کی طرح تپ رہے تھے درودیوار سے آگ نکلنے محسوس ہوتی۔ مہاراجہ جیولہی اپنی رانی کی لیکر واپس ہوا تو اچانک کالے کالے بادل آسمان پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا، اتنا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہ دیتا۔ دن کو کالی رات کا سا منظر ہو گیا۔ اس طرف ستم یہ ہوا کہ آندھی آگئی، سخت طوفانی آندھی اور بجلی کی کڑک شروع ہو گئی، کڑک کا یہ عالم، گویا صدہا تو ہیں ایک ساتھ چھوٹ رہی ہوں۔ ہوا کے

قبائلی عزاداری کے اجراء میں تعزیه اور علم وغیرہ سب شامل ہوتے ہیں مگر بتوں کے بنے ہوئے جو صنعت کا ایک نمونہ بھی قرار دئے جاسکتے ہیں۔ نوے اور مرثیے سب انکی زبانوں میں ہوتے ہیں جگوسن کر زبان داں کے آنسو نہ نکلنا ممکن نہیں۔ پاروی نوحہ: محرم آگیا، تم نے بتایا نہیں۔ میں کالی کفنی پہنوں گا تاز کے پتے سے اونچا علم بناؤ گا پھر ماتم کروں گا۔

”یا علی دولہا، یا علی دولہا، یا علی دولہا!“

علی کے ساتھ دولہا کا استعمال سخن فہمی یا معنی آفرینی کا محتاج ہے کیونکہ یہ نعرہ دکن کے دوسرے حصوں میں بھی لگایا جاتا ہے۔

گو نڈوی نوحہ: ہر سال یہ مہمان آتا ہے مگر بچوں اور عورتوں کو ساتھ نہیں لاتا۔ ارے ٹھیک تو ہے اسکے بچے تو ندی کنارے مار ڈالے گئے ٹوٹ جائیں وہ کنارے جو ننھے بچوں کو بھی کاٹ ڈالتی ہیں۔ ارے سچ تو ہے اسکی عورتیں تو قید خانے میں ہیں ٹوٹ جائیں وہ سلاخیں جو بوزھی عورتوں کو بھی قید کر لیتی ہیں۔

لسبازوی نوحہ: عرب کی شہزادی کا لال تیروں سے چھلنی ہو گیا کیونکہ اسکے پاس تیر تھے کمان نہ تھی۔ وہ بہادر تھا ایک بہادر باپ کا بیٹا جسکے نام کا گنٹھا پہنا جاتا ہے۔ اس کا نام لے کر تیر چھوڑو، بندوق چلاؤ تو نشانہ اڑ جاتا ہے۔

وہ تو اس لئے تیروں سے چھلنی ہو گیا کہ اسکی گود میں چھ مہینے کا بچہ تھا، خون میں ڈوبا ہوا۔ اسکے کاندھے پر جوان بیٹے کی لاش تھی اسکے دامن سے پیاسے اور زخمی بچے لپٹے ہوئے تھے اسکی ستم رسیدہ عورتیں چیخ رہی تھیں اور ہزاروں بھیڑیے اس پر تیر چلا رہے تھے۔ ان پہاڑوں کے اس پار جہاں سے کالے کالے بادل آتے ہیں عرب کی شہزادی کا لال تیروں سے چھلنی ہو گیا!

دکن کے یہ قبائلی نوے ان مقامی زبانوں کے نوحوں سے ملتے جلتے ہیں جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں علاقائی طور پر بولی جاتی ہیں۔ ان کا جائزہ لیا جائے تو وہ قلب انسانی کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی، مرہٹی، گجراتی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں رسول کے نواسے کا ماتم نہ کیا گیا ہو اور جس نے ضمیر انسانیت کو بھونچھوڑ کر نہ رکھ دیا ہو۔



کر بلا کے شہید عظیم کیلئے سراپا عقیدت بنا ہوا تھا۔ اسکے ذہن میں بس امام حسین کا تصور تھا۔ حسن خاں کو اس نے بڑی احسانمندی سے دیکھا اور گوالیار کا عازم ہو گیا۔ جشن شادی کا ماحول سو گواری میں بدل گیا۔ گھنٹوں کے اندر ایک تعزیه بنایا گیا اور محل کے اندر چوک پر رکھا گیا۔ مہاراجہ نے جڑوزیورات، گنٹے، جوشن ہائے کنگن سب اتار کر فقیروں کا سہ لباس پہن لیا اور تعزے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا پھر رانیوں نے چوک بھری۔ ان میں وہ رانی بھی تھی جو ابھی عملی طور پر ازدولجی زندگی میں داخل نہیں ہوئی تھی اسکے بعد سے محل کا یہ حصہ مستقل عراخانہ بن گیا۔

پہلا روز عاشور گزر کر دوسرا محرم آیا تو گوالیار شغل عرا میں گونگنڈہ اور لکھنؤ کو شرمائے لگا اور اسکے بعد محل کا امام باڑہ قاعدے کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔ اسکی پشت پر رانیوں، مہارانیوں اور معزز مرہٹہ خواتین کے بیٹھنے کی جگہ بنوائی گئی۔ تعزیه بنانے کا خاص اہتمام کیا گیا۔ بانس اور ابرک کا تعزیه مرہٹہ شان و شوکت کا آئینہ دار تھا۔ اسکی آب و تاب سے آنکھوں میں چکچکوند پیدا ہو جاتی۔ سائز متناسب مگر استاذونی کہ تین سو کہا رمل کر اٹھاتے۔ سب سے آگے مہاراجہ سندھیا خود اسکو کاندھا دیتا۔

امام باڑے کی جگہ گاہٹ تعزیه سے کم نہ تھی۔ جھاڑ، فانوس، مانڈی، کنول اور شمعوں سے آراستہ چاروں طرف قد آدم آئینے آویزاں تھے۔ تزئین و آرائش کا یہ انداز ہر روز بدل دیا جاتا۔ تعزیه جب امام باڑے میں رکھ دیا جاتا تو مہاراجہ دست بستہ اسکے آگے ایستادہ ہوتا۔ زنانے حصے میں معزز خواتین رانیوں اور مہارانیوں سمیت سبز ساریوں میں ملبوس، پیشانیوں پر عود کی راکھ ملے سر جھکائے غم حسین میں بیٹھی نظر آتیں۔

عورتوں کے امام باڑے میں داخل ہونے کا منظر بھی بڑا درد آمیز ہوتا۔ روکھے اور بکھرے بالوں کے ساتھ وہ ایک طرف سے عراخانے کے سامنے آتیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر تعزے کے سامنے خم ہوتیں اور حدود امام بارگاہ شروع ہوتے ہی اسپر ماتھا کا دیتیں، بلا اس کا لحاظ کیے ہوئے کہ اس جگہ لوگوں کے پاؤں پڑے ہوں گے۔ فاتحہ ہوتا تو ایک پاؤں سے کھڑی رہتیں۔ فاتحہ ختم ہو جاتا تو حسین حسین کہتی

تھکے زے اتنے شدید تھے کہ چیزوں کے ساتھ آدمی بھی جگہ سے بے جگہ ہونے لگے۔ کھار اور سپاہیوں نے دوہن کی پاکی ایک جگہ رکھ دی پھر انکو خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں سے کہاں ہو رہے ایسے میں ایک مسلمان سردار پاؤں جما کر پاکی کے قریب رہ گیا۔ اس کا نام تھا: حسن خاں بھیا!

لتنے میں بڑے بڑے اولے گرنا شروع ہو گئے جن کی ضربوں سے حسن خاں سخت زخمی ہوا لیکن اس نے جگہ نہ چھوڑی۔ رانی نئی نوپلی دوہن تھی جو فرط حیا میں بولا نہیں کرتی لیکن جب اس نے حسن خاں کا یہ حال دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔ وہ بے اختیار بول اٹھی۔

”بھیا! تم بھی کسی آڑ میں ہو جاؤ۔“

”میں اپنی خاندانی شرافت کو بدنام نہ کروں گا۔ تمہیں تنہا چھوڑ دوں!“ کہہ کر حسن خاں اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

اس اثناء میں موسم کی شدت کچھ کم ہونے لگی اور اندھیرا بھی چھیننے لگا۔ مہاراجہ جیولجی بھی ایک مقام پر تنہا کھڑا ہوا تھا۔ اسکو کوئی خبر نہ تھی کہ رانی کا کیا حشر ہوا اور دوسرے لوگ کدھر گئے؟ بھیا تک تاریکی میں کچھ نظری نہ آتا تھا تو خبر کیا ہوتی لیکن اسکو رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ اس نے شب عاشور شادی کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔

سندھیا مرہٹہ رسول اسلام کی اولاد کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ مرہٹوں کا قدیمی تعلق شیعوں سے رہا تھا۔ جیولجی سندھیا بھی جانتا تھا کہ سبط رسول کی شب شہادت کی عظمت کیا ہوتی ہے اس نے خیال ہی خیال میں سیدہ کونین کو مخاطب کر لیا۔

”بی بی مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیں مجھے اور بچالیں اس مصیبت سے میں آپ کے بیٹے کی عزاداری کروں گا!“

بارگاہ ایزدی میں اسکی دعا قبول ہو گئی اور موسم اعتدال پر آنے لگا۔ اب جو راجہ نے دیکھا تو حسن خاں خون میں نہایا ہوا رانی کی پاکی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ عام حالات میں ہو سکتا تھا کہ مہاراجہ گوالیار بھاگ جانیا لوں کو سزائیں دیتا مگر وہ



پاؤں ننگے سر، سر سے پانک سبز پوش، گردوغبار میں اٹا ہوا، حسین حسین کہتا بڑھتا۔ قلعہ کے پھانک تک تعزیے کو پہنچا کر واپس ہوتا تو عقبی راستے سے دل پر پہنچ جاتا جہاں رانیاں قبل سے پہنچ جاتی تھیں اور تعزیہ کا انتظار کرتی رہتیں۔

قلعہ کی پشت پر نواب معتمد خاں لک بخش کا پکاتالاب واقع تھا جسے ساگر تال کہتے ہیں۔ اسکے جنوب میں ایک بہت بڑی دہل کھود کر تیار رکھی جاتی جسکے ایک طرف زنانہ بارگاہ ہے جس میں غم حسین میں اشکبار رانیاں فردکش ہوتی تھیں

تعزیہ دہل کے قریب رکھوا دیا جاتا تو زنانے حصے میں سوز کی قسم کے بین کیے جاتے اور جب سرکاری تعزیہ کرینوں کے ذریعہ دہل میں اتر جاتا تو ایک طشت میں اندر سے مٹی آتی مہاراجہ آنسو بہاتا ہوا دونوں ہاتھوں سے مٹی ڈالتا پھر رانیاں اندر سے برآمد ہوتیں، طشت کی باقی مٹی وہ اپنے ہاتھوں سے دیتیں اور ایک درد بھری کیفیت میں اس طرح اٹھ کھڑی ہوتیں جیسے اپنے کسی پیارے کو دفنا کر اٹھی ہوں۔

اسکے بعد توپوں کی سلامی دی جاتی جو تعزیہ دفن ہو جانے کا اعلان ہوتا۔

شہنشاہانہ تدفین کے یہ لوازمات سلاطین شرقیہ نے جو پور میں شروع کیے تھے جو دکن میں قلی قطب شاہ کے ہاتھوں نکھارے گئے پھر اودھ میں ان پر خلوص و عقیدت کے پھول چرمھائے گئے۔ رامپور و محمود آباد میں اب بھی انکی تھلک پائی جاتی ہے لیکن ان مقامات پر جو بھی مظاہرے کئے گئے وہ تعجب خیز نہیں، حیرت تو ہے مہاراجہ گوالیار پر جو اسلام کو نہیں مانتا تھا لیکن پیغمبر اسلام کے نواسے کیلئے اتنی عقیدت رکھتا تھا کہ سیدہ کو نین اسکو مشرف بہ اسلام ہو جانے کی دعا ضرور دیتی ہوں گی

امام حسین کیلئے اہل ہنود کی طرف سے یہ نذرانہ عقیدت عوامی سطح پر ہر جگہ پایا جاتا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے جنگی قیدی جب ہندوستان کے قلعہ گوالیار میں لے جا کر رکھے گئے تو ایام محرم میں ایک سکھ صوبدار نے بیان کیا۔

”میرے بچے پیدا ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد مرجایا کرتے تھے۔ اس طرح تین بچے ضائع ہو گئے۔ جن دنوں میں آلہ آباد میں تھا تو میری پتی (سردارنی) نے میرے پڑوسی شاہ صاحب کی بیوی سے ذکر کیا۔ وہ اسکو محرم کی نو تاریخ کو آلہ آباد کے

ہوئی چوک کے قریب بیٹھ جاتیں۔

پھر گوالیار، لشکر اور مرار میں تین امام باڑے بن گئے جو مرہٹہ عمائدین کے تھے۔ ان سب کی لگ بھگ ایسی ہی کیفیت تھی دس روز تک ہر گلی کوچے میں سہیلیں لنگر خانے جاری رہتے اور انکی اتنی کثرت ہوتی کہ لینے والے کم پڑ جاتے۔

مجلسوں میں سوز خوانی، نوحے اور مرثیے پڑھے جاتے۔ تقریر کرنے والے بھی باہر سے آتے۔ مجلس شروع ہوتی تو مہاراجہ اور تمام مرہٹہ اس طرح دوزانو ادب سے بیٹھتے جیسے کسی بڑے شہنشاہ کے دربار کے ادنیٰ فقیر ہوں۔ اندر رانیوں اور دوسری عورتوں کا بھی یہی عالم ہوتا۔ تحریزات تو یہ ہے کہ وہ مصائب کا بیان ہونے پر اس طرح روتے اور ہچکھاڑیں کھاتے کہ شیعوں کا تاثر ان کے سامنے قابل ذکر نہ رہتا۔

آہستہ آہستہ اکثر مرہٹہ سرداروں نے اپنے امام باڑے گھروں میں بنو لیے۔ وہ اسی طرح بارگاہ سید الشہداء سے متیں ملتے جس طرح شیعہ اور دوسرے مسلمان ملتے ہیں۔

ایام محرم میں ریاست کا تمام کاروبار عموماً بند رہتا۔ عام لوگ بھی محرم کی مصروفیات، علم اور تعزیوں کے جلوسوں میں جو گہما گہمی ہوتی ہے اسکے سبب عشرے کے آخر دنوں میں کام نہیں کرتے۔

عزاداری کی خصوصیات میں تعزیے کے جلوسوں کو ایک امتیاز حاصل تھا۔ مرہٹے اور مسلمان سب حسینی سپاہی معلوم ہوتے۔ جلوس میں لکڑی کی تلواروں سے مظاہرہ حرب و ضرب کیا جاتا۔ شیعہ یوں بھی گوالیار میں بہت ہی کم ہیں۔ وہ ان مظاہروں میں شرکت نہ کرتے۔

آٹھ محرم کو سرکاری علم اٹھتے جو شہر کا گشت کرتے تھے۔ ان میں فوجی دستے، ماہی مراتب، ہاتھی، بیل، گھوڑے، توپ خانہ پورے شاہی خدم و خشم کے ساتھ شامل ہوتے۔ ساز و سامان کی شوکت دیکھ کر محسوس ہوتا کہ جیسے کسی شہنشاہ عصر یا فاتح عالم کی سواری نکل رہی ہو۔

شب عاشور مہاراجہ کے تعزیے کے ساتھ عوام کے تعزیے مل کر شان جلوس کو دوبالا کر دیتے۔ مہاراجہ اپنے تعزیے کو کاندھادے کر جلوس کی قیادت کرتا، ننگے



سوفیائے کرام کی ریاضت مسلسل بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی جتنکی خانقاہوں سے آجک علی کی افضلیت کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔

مقابر سادات کی اعجاز نمائی بھی ایک اساسی حیثیت رکھتی ہے جس نے فلسفیانہ اور منطقی ذہنوں کی ہر دلیل کا بطلان کر دیا۔ معجزے بلاشبہ روز نہیں ہوتے اور نہ اشاعت اسلام کبھی اس طریقہ کی زمین منت رہی ہے لیکن ہندوستان کے جلوس تعزیه میں حسین کی عظمت کا کمال اور عباس علمدار کا جلال اکثر دیکھنے میں آیا ہے اور روضہ ہائے مقدس جہاں جہاں نہیں ہیں وہاں نقول روضہ اپنے منصب کو ادا کرتی رہی ہیں۔ ہماری مجلسیں اور جلوس پیغام حسین کو ایک سرے سے دوسرے تک پہنچا رہے ہیں اور ہماری صداقت کا ثبوت بن کر دلوں اور ذہنوں کو متقلب کر رہے ہیں۔ اسی میں ہماری بقاء ہے۔

اپنی بقا کا راز یہ ماتم ہے دوستو !  
آواز بازگشت شہیداں کہیں جسے

ایک تعزیه خانے میں لے گئی۔ وہاں میری پتی تعزیے کے سلمنے رات بھر لو بان سلگاتی رہی اور سویرے پر شاد وغیرہ چرمھا کر چلی آئی۔ واہگرو کی کرپا سے میرے بیٹا پیدا ہوا اور با نطل نکھیک ٹھاک رہا۔ اس سے میرا لڑکا (رندھیر) ملری اسکول جالندھر میں پڑھتا ہے۔ میری پتی ہر سال محرم کی نو تاریخ کو کسی قریبی تعزیے خانے میں جا کر رات بھر تعزیے کے سلمنے کھڑی رہتی ہے لو بان سلگاتی ہے پر شاد چرمھاتی ہے دوچار کھٹیاں بتائے وہاں سے لے کر آتی ہے اور رکھے رہتی ہے۔ رندھیر جب چھٹی پر گھر آتا ہے تو اسکو کھٹا کر پرار تھنا کرتی ہے، امام صاحب! یہ بچہ آپکی کرپا سے جیا ہے۔ اسکو آپکی کرپا کی سدا ضرورت ہے۔" (۱۱۷)

اس طرح کے واقعات گولیاری کے اکثر گھروں میں بیان کیے جاتے ہیں۔ مرہٹہ عورتیں کہتی ہیں کہ میرا فلاں بچہ امام صاحب کی دین ہے فلاں بچے کیلئے میں نے منت مانی تھی، وہ پیدا ہوا تو ہر سال اسکو لے جا کر تعزیے کے سلمنے دعا کرتی ہوں۔ کرامات و معجزات کی اس فضا میں ہندوؤں میں تعزیہ داری کا فروغ ہوا۔ فی زمانہ اس میں کچھ کمی آگئی ہے لیکن امام حسین کی معجز نمائی سے آج بھی کسی کو انکار نہیں۔

### خلاصہ کلام:

مہاراجہ گولیاری کی عقیدت ہندوستان میں ضرب المثل ہے لیکن اس سے قبل دکن اور اودھ میں بہت سے ایسے امراء گزرے ہیں جنہوں نے شغف عراء میں مسلمانوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ بالخصوص لکھنؤ میں تو درجنوں نام لیے جاسکتے ہیں جیسے مہاراجہ ٹکیت رائے، راجہ جھاؤ لال اور دوسرے لوگ۔ ان کے خلوص کی دلیل یہ ہے کہ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد بھی انکی اولاد میں تعزیہ داری مدتوں تک جاری رہی اور مالیات کی کمزوری کے ساتھ انحطاط پذیر ہوئی۔

ہمارے عقیدے میں یہ دعائے جناب سیدہ زہرا ہے کہ انکے لال کا ماتم دنیا کے گوشے گوشے میں کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس میں تعلیمات آئمہ برحق اور مساعی علمائے عظام کو بھی دخل ہے اور ان شیعہ حکومتوں کے جذبہ ایمان کو بھی جنہوں نے وقت کے دھاروں کا رخ بدل کر عزاداری کی اشاعت کی اور شیعیت کو فروغ دیا



## کتاب محولہ

- ۱- مسند احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۲۹۲ مطبوعہ مصر ۱۳۱۳ھ (عربی)
- ۲- مآخوذ از اصل و اصول شیعہ مترجمہ علامہ ابن حسن نجفی مطبوعہ ادارہ تدن اسلام کراچی ۱۹۸۶ء
- ۳- اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ) از جیش امیر علی ص ۵۹۹ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۲ء
- ۴- ہسٹری آف سیراسز (اردو ترجمہ) از جیش امیر علی ص ۸۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء
- ۵- اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ) از جیش امیر علی ص ۶۳۸ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۲ء
- ۶- نوح البلاغ ص ۷۰ مطبوعہ شیعہ جنرل بک پبلیشنگ لاہور ۱۹۷۶ء
- ۷- اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ) ص ۶۹۰ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۲ء
- ۸- اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ) ص ۳۹۸ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۲ء
- ۹- صحیح مسلم جلد ۳ ص ۱۳۲، ص ۱۳۳ مطبوعہ لیبائی الجلی مصر ۱۳۳۹ھ (عربی)
- ۱۰- عقد الفرید جلد ۲ ص ۳۳۱ مطبوعہ لیبائی مصر ۱۳۳۱ھ (عربی)
- ۱۱- تاریخ اسلام حصہ چہارم جلد دوم ص ۱۳ از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۲ء
- ۱۲- تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۱۳، ص ۹۳ از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۲ء
- ۱۳- تاریخ العلماہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الثاني ص ۵۲۰ مطبوعہ دار الکتب البعثی بیروت ۱۹۵۷ء (عربی)
- ۱۴- تاریخ العلماہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الثاني ص ۵۳۵ مطبوعہ دار الکتب البعثی بیروت ۱۹۵۷ء
- ۱۵- تاریخ العلماہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الثاني ص ۵۳۲ مطبوعہ دار الکتب البعثی بیروت ۱۹۵۷ء
- ۱۷- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ سوم جلد اول ص ۳۱۸، ص ۳۲۳، ص ۲۷۸
- ۱۸- مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۳۹ء
- ۱۹- تاریخ العلماہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الثالث ص ۳۱۸ مطبوعہ دار الکتب البعثی بیروت ۱۹۵۷ء
- ۲۰- تاریخ العلماہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الرابع ص ۷۲ مطبوعہ دار الکتب البعثی بیروت ۱۹۵۷ء
- ۲۱- تاریخ اسلام حصہ سوم جلد اول از شاہ معین الدین ندوی ص ۳۵۰ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۳۹ء
- ۲۲- تاریخ العلماہ ابن خلدون مجلد الرابع القسم الثالث ص ۵۹۵ مطبوعہ دار الکتب البعثی بیروت ۱۹۵۷ء
- ۲۳- تاریخ العلماہ ابن خلدون مجلد الرابع القسم الرابع ص ۷۱۵ مطبوعہ دار الکتب البعثی بیروت ۱۹۵۷ء
- ۲۴- تاریخ ابن خلدون جلد پنجم (ترجمہ) ص ۷۸ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۷ء
- ۲۵- تاریخ اسلام از ذاکر حسین ص ۸۷ مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ء
- ۲۶- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ سوم ص ۳۱۸ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۳۹ء
- ۲۷- تاریخ اسلام از ذاکر حسین ص ۹۰ مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ء
- ۲۸- تاریخ العلماہ ابن خلدون مجلد الرابع القسم الرابع ص ۹۲ مطبوعہ دار الکتب البعثی بیروت ۱۹۵۷ء
- ۲۹- انکامل (ابن امیر) الجزء السابع ص ۷ مطبوعہ منیرہ قاہرہ مصر ۱۳۵۳ھ (عربی)
- ۳۰- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ دوم ص ۱۲، ص ۱۳ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء
- ۳۱- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ چہارم جلد دوم ص ۱۷، مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء
- ۳۲- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ چہارم جلد دوم ص ۳۰، مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء
- ۳۳- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ چہارم جلد دوم ص ۳۶، مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء
- ۳۴- Shorter Islamic Shietes Encyclopedia P289, Beirut Libanon 1969
- ۳۵- Shorter Islamic Shietes Encyclopedia P290, Beirut Libanon 1969
- ۳۶- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ چہارم جلد دوم ص ۷، مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء
- ۳۷- انکامل (ابن امیر) الجزء التاسع ص ۸۳ مطبوعہ منیرہ قاہرہ مصر ۱۳۵۳ھ (عربی)
- ۳۸- تاریخ اسلام از ذاکر حسین ص ۱۸۰ مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ء
- ۳۹- ہسٹری آف سیراسز (اردو ترجمہ) ص ۵۳۳ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء
- ۴۰- مآخوذ از تاریخ اسلام از ذاکر حسین مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۲۶ء
- تاریخ ابن خلدون جلد پنجم و ششم مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۷۸ء
- تاریخ قاضی بن علی مصر از ذاکر زاید علی مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی
- ۴۱- مآخوذ از تزک تیموری اردو ترجمہ از قاضی عبدالکریم، مطبوعہ کریم بیسی
- امیر تیمور از ہیرالڈ لیمب ترجمہ گلزار احمد مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۶ء
- تاریخ فرشتہ (اردو) مطبوعہ نوٹکسور لکھنؤ
- تاریخ اسلام از ذاکر حسین مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ء
- ۴۲- تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۴۰ مطبوعہ نوٹکسور لکھنؤ ۱۹۳۳ء
- ۴۳- شیخان کشمیر از حکیم غلام صفدر ہمدانی ص ۳۵ مطبوعہ علی محمد اینڈ سز سری نگر کشمیر ۱۹۷۰ء



- ۷۸۱- ماخوذ از شہزادی زیب النساء بحوالہ عشرہ کاملہ ص ۱۲۵ از مولوی محمد رضا بلگرامی مطبوعہ  
الشیاعشری پریس ۱۳۱۰ھ، شہزادی زیب النساء از مولانا سید آغا ہمدی مطبوعہ جمعیت خدام عزا کراچی
- ۷۸۲- دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد ص ۳۲، مطبوعہ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور
- ۷۸۳- ہندوستان پر مغلیہ حکومت از مفتی شوکت علی فہمی ص ۳۷۹ مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
- ۷۸۴- تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۳۸، ص ۳۷۴ و جلد دوم مطبوعہ لوکسور لکھنؤ  
تاریخ جنوبی ہند از محمود بنگوری مطبوعہ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۱۹۳۷ع
- ۷۸۵- تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۳۷۷، جلد دوم ص ۱۶۰ و ۱۵۸ مطبوعہ لوکسور لکھنؤ
- ۷۸۶- ماخوذ از تاریخ فرشتہ اردو جلد دوم مطبوعہ لوکسور لکھنؤ
- ۷۸۷- ہندوستان پر مغلیہ حکومت از مفتی شوکت علی فہمی مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
- ۷۸۸- ہندوستان پر مغلیہ حکومت از مفتی شوکت علی فہمی مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
- ۷۸۹- ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند از محمود بنگوری مطبوعہ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۱۹۳۷ع
- ۷۹۰- A Handbook For Travellers In India, Pakistan etc.  
Pub. Williams London 1975 Page 395
- ۷۹۱- اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۸ جلد ۲، جلد ۲۰، جلد ۱۲
- ۷۹۲- سیاسی تاریخ ہند جلد دوم ص ۵ تا ۱۱ مولفہ سرجان مالک ترجمہ ابن حسن دارالطبع  
عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۳ع
- ۷۹۳- تاریخ لکھنؤ حصہ اول ص ۲۲ از محمد باقر شمس مطبوعہ دارالتصنیف رضویہ سوسائٹی کراچی
- ۷۹۴- تاریخ لکھنؤ ص ۸۲ از محمد باقر شمس مطبوعہ دارالتصنیف رضویہ سوسائٹی کراچی
- ۷۹۵- تاریخ لکھنؤ از محمد باقر شمس ص ۱۱۸ مطبوعہ دارالتصنیف رضویہ سوسائٹی کراچی
- ۷۹۶- اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۸ع
- ۷۹۷- سلاطین ترکیہ از اسٹینٹلین لین پول ترجمہ نصیب اختر مطبوعہ سعید کمپنی کراچی ۱۹۷۰ع
- ۷۹۸- تاریخ الشیخہ از سید طالب حسین رضوی مطبوعہ نیو چالی کراچی ص ۱۵۵
- ۷۹۹- ماخوذ از تاریخ مجدد و جاز از مفتی محمد عبدالقیوم قادری مطبوعہ ۳۲۵ یشا محل جامع مسجد دہلی ۱۳۰۸ھ
- ۸۰۰- تاریخ اسلام از ذاکر حسین دہلوی مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ع
- ۸۰۱- مضمون روضہ حسینی کا انہدام از مولانا سید محمد باقر مشمولہ ماہنامہ اصلاح لکھنؤ ۱۹۹۱ع، ص ۳۹
- ۸۰۲- اخبار الاخبار از علامہ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۵ مطبوعہ مہینہ پبلشنگ کمپنی کراچی
- ۸۰۳- مطلع انوار از مرتضیٰ حسین فاضل ص ۳۲۸ مطبوعہ خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی ۱۹۸۱ع
- ۸۰۴- تاریخ حدودین حدیث مطبوعہ پاکستان حسینی مشن راولپنڈی ۱۹۵۷ع، صفحہ ۲۰
- ۸۰۵- حدودین حدیث از علامہ سید علی نقی مطبوعہ امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ لاہور، صفحہ ۲۳
- ۸۰۶- تاریخ حدودین حدیث از سید مرتضیٰ حسین فاضل مطبوعہ پاکستان حسینی مشن راولپنڈی ۱۹۵۷ع، صفحہ ۸۳

- ۸۰۷- شیخان کشمیر از حکیم غلام صفدر ہمدانی ص ۹۱ مطبوعہ علی محمد اینڈ سز سری نگر کشمیر ۱۹۷۰ع
- ۸۰۸- شیخان کشمیر از حکیم غلام صفدر ہمدانی ص ۹۵ مطبوعہ علی محمد اینڈ سز سری نگر کشمیر ۱۹۷۰ع
- ۸۰۹- ماخوذ از تاریخ فرشتہ اردو حصہ دوم مطبوعہ لوکسور لکھنؤ ۱۹۳۳ع
- ۸۱۰- شیخان کشمیر از حکیم غلام صفدر ہمدانی مطبوعہ علی محمد اینڈ سز سری نگر کشمیر ۱۹۷۰ع
- ۸۱۱- اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۸ع
- ۸۱۲- تاریخ سندھ از مولانا ابوالقاسم ندوی ص ۲۲ مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۳۷ع
- ۸۱۳- تاریخ اسلام از ذاکر حسین دہلوی جلد ۳ ص ۲۲۲ مطبوعہ دہلی ۱۳۳۱ھ
- ۸۱۴- تاریخ فرشتہ مطبوعہ لوکسور لکھنؤ (اردو ترجمہ) ص ۹۰ بحوالہ منتخب التواریخ و تاریخ ابن حجر
- Shia's Islam in India Pub. By Harnam Publications  
New Delhi 1988 P198
- ۸۱۵- کتاب المعارف ابن آیتبہ دینوری ص ۶۶، ص ۷۳ مطبوعہ مصر (عربی)
- ۸۱۶- تاریخ سندھ از مولانا ابوالقاسم ندوی ص ۱۵۶ مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۳۷ع
- ۸۱۷- انکال (ابن حجر) الجزء الخامس ص ۳۰ مطبوعہ منیرہ قاہرہ مصر ۱۳۵۷ھ (عربی)
- ۸۱۸- تاریخ سندھ از مولانا ابوالقاسم ندوی ص ۲۶۹ مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۳۷ع
- ۸۱۹- تاریخ سندھ از مولانا ابوالقاسم ندوی ص ۲۷۳ مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۳۷ع
- ۸۲۰- تاریخ کامل ابن حجر جلد ۴ ص ۱۹۹ مطبوعہ مصر
- ۸۲۱- ۵۶- ماخوذ از تحفۃ الکرام سیر ترجمہ اختر رضوی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ ۱۹۵۹ع
- ۸۲۲- تاریخ سندھ از اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ع
- ۸۲۳- ۵۷- تحفۃ الکرام میر علی شیر خان ترجمہ اختر رضوی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۹ع
- ۸۲۴- تاریخ سندھ عہد کچوڑا از غلام رسول مہر مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۸ع
- ۸۲۵- تاریخ سندھ حصہ دوم از اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ع
- ۸۲۶- ۵۸- تاریخ فرشتہ اردو ص ۹۲ مطبوعہ لوکسور لکھنؤ
- ۸۲۷- ۶۰- ۵۹- تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۹۰ مطبوعہ لوکسور لکھنؤ ترک تیموری اردو مطبوعہ کریچی پریس  
بمبئی
- ۸۲۸- ۶۱- تاریخ فرشتہ اردو مطبوعہ لوکسور لکھنؤ
- ۸۲۹- جوہر نامہ از مرزا عباس علی بیگ ص ۱۲۹ اردو پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۷ع
- ۸۳۰- تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۳۳۷ مطبوعہ لوکسور لکھنؤ
- ۸۳۱- ہندوستان پر مغلیہ حکومت ص ۳۹ از مفتی شوکت علی فہمی مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
- ۸۳۲- ۶۵- ۶۴- دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص ۳۳۶، ص ۵۷ مطبوعہ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور
- ۸۳۳- ۶۶- ۶۵- ہندوستان پر مغلیہ حکومت از مفتی شوکت علی فہمی ص ۱۳۲، ص ۱۵۲، ص ۲۶۵ و ص ۲۸۹  
مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
- ۸۳۴- ۷۰- احیاء العلوم از امام محمد غزالی حصہ سوم ص ۳۳، ص ۳۴ ترجمہ محمد احسن مدنی  
اشاعت اول ۱۹۷۸ع، دارالاشاعت کراچی



- ۹۸۔ ماخوذ از تدوین حدیث از علامہ سید علی نقی و تاریخ تدوین حدیث از سید مرتضیٰ حسین فاضل
- ۹۹۔ تدوین حدیث از سید علی نقی مطبوعہ امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ لاہور، ص ۲۱، ۲۲
- ۱۰۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۷۳ء ص ۵۷
- ۱۰۱۔ اصل و اصول شیعہ ترجمہ علامہ ابن حسن نجفی مطبوعہ ادارہ قندن اسلام ۱۹۸۶ء ص ۵۵ تا ص ۶۶
- ۱۰۲۔ ماخوذ از اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور
- ۱۰۳۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالحوٰی الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقی ص ۶۳ مطبوعہ اصلاح کجھوہ بہار ۱۹۷۳ء بحوالہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔
- ۱۰۴۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالحوٰی الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقی ص ۷۱ مطبوعہ اصلاح کجھوہ بہار ۱۹۷۳ء
- ۱۰۵۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالحوٰی الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقی ص ۱۱۰ مطبوعہ اصلاح کجھوہ بہار ۱۹۷۳ء بحوالہ تحفۃ العالم
- ۱۰۶۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالحوٰی الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقی ص ۱۱۲ مطبوعہ کجھوہ بہار ۱۹۷۳ء بحوالہ تاریخ عراقی لونگریک
- ۱۰۷۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالحوٰی الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقی ص ۱۰۵ مطبوعہ کجھوہ بہار ۱۹۷۳ء
- ۱۰۸۔ ماخوذ از زیارت گاہیں مرتبہ اختر حسین رضوی مطبوعہ احباب پبلشرز لکھنؤ۔
- ۱۰۹۔ ماخوذ از اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور۔
- ۱۱۰۔ ماخوذ از کتبچہ عبدالمعظم حسینی مطبوعہ ایران (فارسی)
- ۱۱۱۔ بیہیان پاک و امنان ص ۳ از پروفیسر ڈاکٹر مسعود رضا خاکی مطبوعہ افتخار بک ڈپو اسلام پورہ لاہور
- ۱۱۲۔ بیہیان پاک و امنان ص ۱۲ از پروفیسر ڈاکٹر مسعود رضا خاکی مطبوعہ افتخار بک ڈپو اسلام پورہ لاہور
- ۱۱۳۔ ماخوذ از حسین حسین مولف محمد وصی خاں ص ۱۱۸ مضمون سرزمین ہند میں معجزات مطبوعہ محفل حیدری کراچی ۱۹۷۹ء
- ۱۱۴۔ تاریخ قندن انڈونیشیا از نور احمد قادری حصہ اول ص ۲۷۶ مطبوعہ سفارت خانہ انڈونیشیا کراچی ۱۹۵۶ء
- ۱۱۵۔ مضمون قدیم دلی کی عزاداری از علی جواد زیدی مشمولہ شیعہ لکھنؤ ۱۹۸۶ء، ص ۱۱ تا ص ۱۶
- ۱۱۷۔ مضمون "پاکستانی جنگی قیدی اور ذکر حسین" از شمسداد حسین رضوی مشمولہ رضا کار لاہور ص ۱۶
- "حسین حسین" مرتبہ محمد وصی خاں محفل حیدری کراچی ۱۹۷۹ء، مضمون گوالیار کا محرم ص ۱۴ تا ص ۱۶